خوبصورت کہانیوں کا مجموعہ
سسپنس ڈائجسٹ
ماہنامہ
نومبر 2016
READING SECTION
Online Library For Pakistan
WWW.PAKSOCIETY.COM
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام
www.paksociety.com
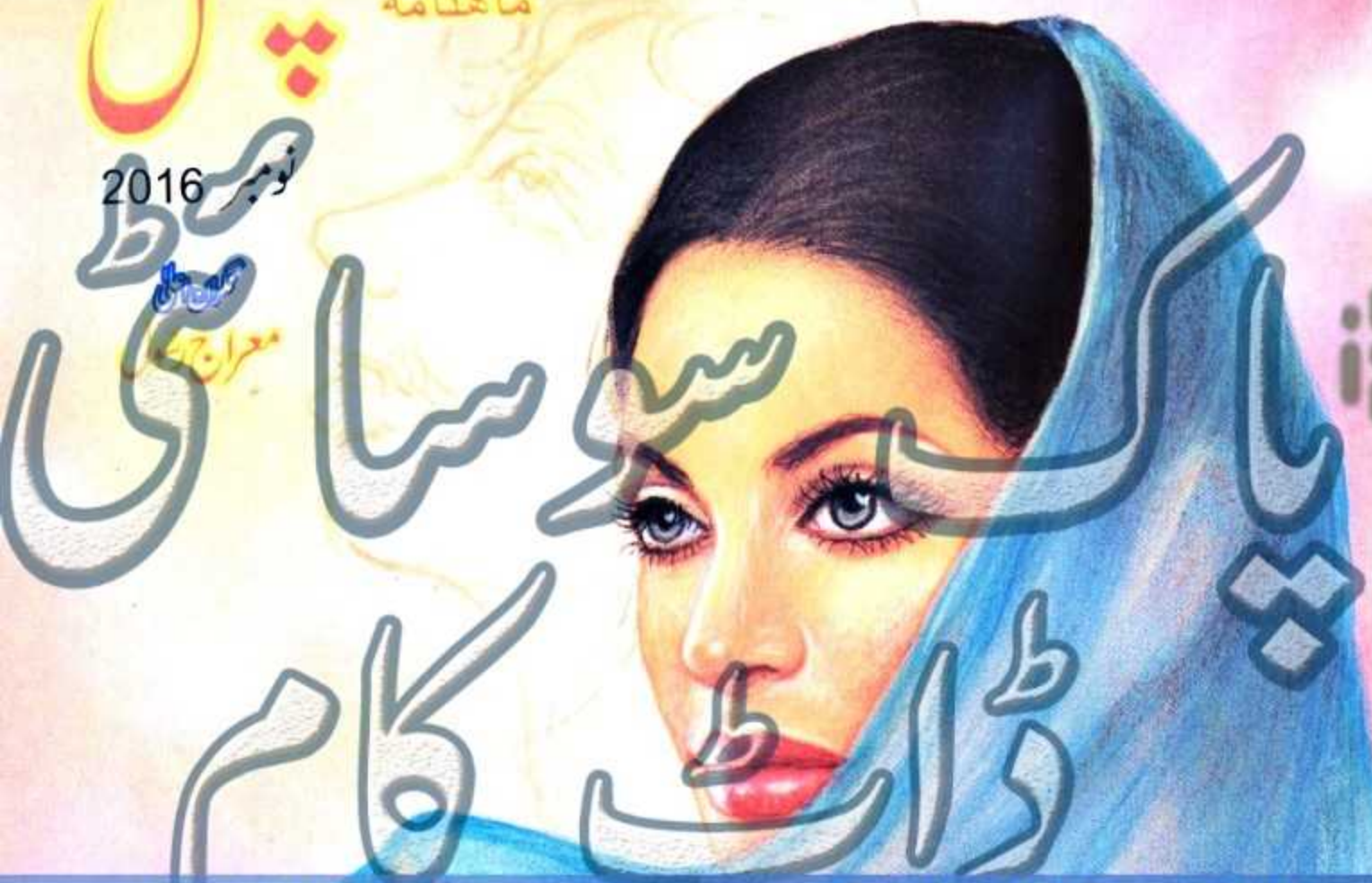
جلد 46 • شمارہ 11 نومبر 2016ء • زرسالانہ 800 روپے • قیمت فی پرچہ پاکستان 60 روپے •

خط کتابت کا پتا: پوسٹ بکس نمبر 215 کراچی 74200 • فون: 35895313 (021) فیکس 35802551 (021) E-mail:jdpgroup@hotmail.com

پبلشر و پروپرائٹر: ذیشان رسول مقام اشاعت: گراؤنڈ فلور C-63 فیز II ایکس ٹینشن ڈیفنس مین کورنگی روڈ کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

انشائیہ

جون ایلیا

مرض

ایک زمانے میں ہیضہ، تپ دق اور چیچک ناقابلِ علاج بیماریاں تھیں اور چیچک تو ہلاکت کی دیوی تھی۔ اسی لیے اسے ''ماتا'' کہا جاتا تھا اور طاعون تو امراض کا ''فرعون'' تھا اور اسے موت کے قہر و جبروت کے دیوتا کی حیثیت حاصل تھی۔ اپنے زمانے کے حکیم جالینوس اور حکیم بقراط اس کے قہر و جبروت کے سامنے عاجز تھے لیکن چند مستثنیٰ مثالوں کو چھوڑ کر اس عہد کی طبی دانش نے ان بیماریوں پر پوری طرح قابو پالیا ہے۔

یہ بات کتنی اداس اور مایوس کردینے والی ہے کہ انسانی دانش اپنی تمام تر معجز نمائی کے باوجود سب سے زیادہ مہیب اور مہلک بیماری یعنی نفرت کا علاج کرنے میں آج تک بُری طرح ناکام رہی ہے۔

انسان میں زندہ رہنے کی خواہش کے ساتھ ہی مرنے کا بھی ایک بہت پیچیدہ رجحان پایا جاتا ہے۔ انسانوں کی باہمی محبت زندہ رہنے کی خواہش کی علامت ہے اور ان کی باہمی نفرت مرنے کی خواہش بلکہ مرنے کی شہوت کی علامت۔ میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ محبت زندگی اور زندگی دوستی کا استعارہ ہے اور نفرت، موت اور موت پسندی کا۔

یہ ایک قابلِ شرم اور الم ناک حقیقت ہے کہ آج کا انسان بھی اپنے تمام تر علم اور تہذیب کے باوصف طرح طرح کی نفرتوں، غلیظ نفرتوں میں جتلا ہے۔ لسانی نفرت، نسلی نفرت، مذہبی نفرت، وطنی نفرت اور تہذیبی نفرت۔ ایک زمانے میں یا یوں سمجھ لو کہ دوسری جنگِ عظیم کے خاتمے کے چند سال بعد تک نفرتوں کی اتنی قسمیں نہیں پائی جاتی تھیں جتنی قسمیں آج یعنی علم اور تہذیب کے سب سے زیادہ ارجمند دور میں پائی جاتی ہیں۔ یہ کس قدر حیران کن اور ملال انگیز حقیقت ہے کہ انسان اپنے انتہائی شاندار اوج اور عروج کے عہد میں شاید پہلے سے کہیں زیادہ کھٹل، کٹھور اور سینہ زور ہوگیا ہے۔

سوچنا یہ ہے کہ ان انواع و اقسام کی نفرتوں کو جنم دینے اور پالنے پوسنے والے لوگ کون ہیں؟ وہ لوگ کون ہیں، جنہوں نے زبان اور تہذیب کے نام پر مختلف گروہوں کو ایک دوسرے کا جانی دشمن بنا دیا ہے۔ یہاں میں اپنی گفتگو کو پاکستان کے دائرے میں محدود رکھ کر اپنے احساس کا یا اپنے نفس کی اذیت کا اظہار کرنا چاہتا ہوں۔

وہ لوگ جنہوں نے زبان اور تہذیب کے نام پر مختلف گروہوں کے درمیان زہرناک نفرتوں کو فروغ دیا ہے، وہ عوام میں سے نہیں ہیں، خواص میں سے ہیں۔ بات کو ہیر پھیر سے کیا کہنا، سیدھی سچی اور کھری بات یہ ہے کہ وہ اس بدبخت ترین ملک کے شاعروں، ادیبوں، عالموں اور دانش وروں کے زمرے سے تعلق رکھتے ہیں اور وہ اس زمرے سے کوئی کم تعداد لوگ نہیں ہیں۔ یہاں یہ بات پوری طرح جان لی جانی چاہیے کہ اس ملک کے عوام (ونیز عوام الناس) کا جرم اور جنایت کے اس کاروبار سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اگر نہیں یہ لوگ بھی اس کاروبار اور بیوپار میں لگ جاتے تو یہ ملک باقی ہی نہ رہ سکتا۔ یہی تو وہ عالی مرتبت اور سامی منزلت لوگ ہیں جن کا ہر گروہ سے زیادہ احترام کیا جانا چاہیے۔

ایک عام آدمی، ایک مزدور، کاریگر اور کسان کا اس بے ہودہ بحث سے کوئی سروکار نہیں ہے کہ سندھ کی تہذیب زیادہ قدیم ہے یا سمیری تہذیب۔ پہیا بابل کی ایجاد ہے یا عیلام کی؟ آگے چلیے، وارث شاہ بڑے شاعر تھے یا شاہ لطیف؟ میر تقی میر بڑے شاعر تھے یا خوش حال خاں خٹک؟ ہماری تہذیب کے نمائندے صرف اسی قبیل کے افراد کے درمیان موازنہ فرمائی تک محدود نہیں رہتے، ان کی قوم پرستی یا قومیت پرستی کی معاملہ فہمی، اس نوع کے بے حد اہم قضیے بھی فیصل کرلینا چاہتی ہے کہ سلطانہ ڈاکو زیادہ جیالا تھا یا مبین ڈاہری؟

تہذیب اور نفرت میں تضاد پایا جاتا ہے۔ یہ دونوں کبھی جمع نہیں ہوسکتے۔ اگر کوئی شخص تہذیب کے تنوع کی بنیاد پر یعنی تہذیبوں کی گوناں گونی کی نسبت سے انسانوں کے درمیان تفرقہ پیدا کرتا ہے تو وہ شخص ہرگز دانش ور نہیں ہوسکتا۔ اسے صرف ایک لقندرا اور لفنگا سمجھا جانا چاہیے۔ اگر تہذیب اپنے صحیح النسب مفہوم میں تہذیب ہو تو پھر وہ دانش کا ثمرہ ہے اور دانش انسانیت کے رشتے کو جوڑتی ہے، توڑتی نہیں، توڑ ہی نہیں سکتی ورنہ اسے دانش نہیں کہا جائے گا۔ پھر وہ بے دانشی ٹھہرے گی اور ہمیں اور تمہیں بے دانشی کی بے ہودہ کنشی اور بے ہودہ کوشی کے خلاف، نفرت کے خلاف فیصلہ کن لڑائی لڑنی ہے۔ ☆☆☆

عزیزانِ من!

السلام علیکم!

نومبر 2016ء کا شمارہ جاتے سال کا احساس دلاتے ہوئے آپ کے ہاتھوں کی زینت ہے۔ ہر ماہ کے تیس دنوں میں کوئی نہ کوئی ایک تاریخ کسی نہ کسی حوالے سے منسوب ہو کر تاریخ میں رقم ہے جیسے کہ اس ماہ 9 نومبر...... پاکستان کا خواب دیکھنے والے شاعرِ مشرق علامہ اقبالؒ کی تاریخ پیدائش...... مگر انہوں نے کبھی ریلیوں، اقتصادی اور سیاسی مسائل میں پسنے والے پاکستان کی نہ تو خواہش کی تھی اور نہ ہی خواب دیکھا تھا۔ کاش ہمارے سیاستدانوں اور عوامی نمائندوں کو اپنے وسائل اور وقت کے صحیح استعمال کا ادراک ہو جائے تو شاید پاکستان کے عوامی مسائل کا کوئی اچھا ساحل بھی نکل آئے۔ جبکہ موجودہ صورتِ حال میں اس کی ضرورت شدت سے محسوس بھی کی جارہی ہے...... کیونکہ آج کل پاک، بھارت سرحدوں پر جو کشیدگی بڑھتی جارہی ہے اس نے ہر پاکستانی کو فکر میں مبتلا کر دیا ہے اور کچھ نہیں تو ہمیں دشمن ملک کی سیاست سے ہی سبق سیکھنا چاہیے جہاں ہزاروں اختلافات کے باوجود تمام سیاسی قوتیں پاکستان کے خلاف متحد ہو گئیں۔ گزشتہ دنوں اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں جب وزیر اعظم نواز شریف نے کشمیر میں ہونے والے ظلم و بربریت کے خلاف آواز اٹھائی تو جیسے نریندر مودی کے حواسوں پر بجلی سی گر گئی اور مودی سرکار نے بے وقوفانہ انداز میں حواس باختہ ہو کر غلط سلط فیصلے کر کے ہر محاذ پر شکست کھاتے ہوئے اب پاکستان کو معاشی نقصان پہنچانے کا ارادہ ظاہر کیا ہے اور 56 سالہ سندھ طاس معاہدہ ختم کر کے پانی کی فراہمی کو بند کرنے کی دھمکی بھی دے ڈالی۔ شاید جلد بازی میں اسے یہ احساس نہیں رہا کہ وہ یہ معاہدہ ختم کرنے کا اہل ہی نہیں ہے جبکہ چین بھارت کو پہلے ہی خبردار کر چکا ہے کہ پاکستان کو نقصان پہنچانے والے کو برے نتائج بھگتنا ہوں گے۔ اس کے علاوہ معاہدہ توڑنے کی صورت میں بھارت بین الاقوامی سطح پر بھی معاہدوں کی پاسداری کے سلسلے میں ناقابلِ اعتبار ٹھہرے گا۔ تاہم کسی بھی بھارتی کارروائی کے خلاف پاکستان بھی اپنی بقا کے لیے جوابی اقدام کا بھرپور حق رکھتا ہے۔ پاک بھارت سیاسی کشیدگی اپنی جگہ جبکہ مسلمانانِ عالم کے لیے محرم الحرام سے نئے اسلامی سال کا آغاز ہو چکا ہے اور پورے پاکستان میں قانون نافذ کرنے والے ادارے سیکیورٹی کے حوالے سے جلوس کی گزرگاہوں پر سخت نگرانی کے مؤثر اقدامات میں مصروف ہیں۔ اگرچہ ٹارگٹڈ آپریشن کے باوجود پچھلے ایک ہفتے میں تقریباً 600 اسٹریٹ کرائمز کی وارداتوں نے سب کو چونکا دیا ہے تاہم دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہماری سیاسی قوتوں کو عقلِ سلیم اور عوام کے درد کا احساس دے اور پاکستان کے چپے چپے کی حفاظت کرے اور اپنی رحمتوں کا سایہ ہمیشہ پاک سرزمین پر قائم رکھے (الٰہی آمین) اور اب اپنی دعاؤں، نیک تمناؤں کے سہارے ہمیں بھی اپنی محفل کی جانب چلنا چاہیے جہاں منتظر ہیں ہمارے اپنے......

✠ بینش صدیقی، حیدرآباد سے بھرپور تبصرے کے ساتھ محفل میں شریک ہیں ”اپنا تبصرہ پڑھ کر مجھے سسپنس ڈائجسٹ کی انتظامیہ کے انصاف پر یقین ہو گیا۔ اکتوبر سسپنس ڈبل مزہ، ایک تو میرا تبصرہ پبلش ہوا۔ دوسرا 12 ستمبر کو ہی ڈائجسٹ مل گیا۔ ویلڈن سسپنس ڈائجسٹ اسٹاف (نوازش)۔ ٹائٹل خوب صورت لگا، عید مبارک کے ساتھ۔ کہانیوں کی فہرست دیکھ کر دل خوش ہو گیا۔ جون ایلیا پتا نہیں ہم سے کیا کہنا چاہتے ہیں مجھے تو کچھ سمجھ نہیں آتی۔ (یہ آپ کی سمجھ کا قصور ہے) محفلِ دوستاں میں انٹری دی تو خوشی سے چیخ نکل گئی۔ ایک تو زرین پیاری صدارت پر قبضہ کیے ہوئے تھیں، سیکنڈ بینش صدیقی بھی اس محفل کا حصہ تھیں۔ طاہرہ گلزار جی، اشفاق شاہین، محمد صفدر، رمضان پاشا اور عبدالجبار رومی یہ سب پرانے تبصرہ نگار ہیں، نئے تبصرہ نگار بھی اچھا لکھتے ہیں۔ مسز صدیقی جگت امی کا خطاب حاصل کر چکی ہیں اور میں بھی صدیقی ہونے کے ناتے ان کی بیٹی جیسی ہوں۔ مہتاب احمد بھائی کا تبصرہ بھی بہت اعلیٰ رہا، حیدرآباد کا پانی ہی پُرتاثیر ہے۔ کہانیاں پڑھنے کی ابتدا تنویر ریاض صاحب کی انگوٹھی کا راز سے کی۔ بھوت نما عورت زندہ سلامت ڈیبورا نکلی۔ انسان جس ماحول میں رہتا ہے اس کو ہر طرف وہی کچھ نظر آتا ہے۔ کہانی کا اینڈ چونکا دینے والا تھا۔ آگے دم اور منتظر امام، طنز و مزاح کا خوب صورت امتزاج، چرسی بابا اور تغلق بہت خوب۔ کہانی میں ہمارے ملک کے المیے کی عکاسی کی گئی۔ بے روزگاری، کلاس کا فرق، افسوس۔ جناب ملک صفدر حیات، سرکاری درباری لے کر آئے، یہ سچ ہے کہ دل میں خواہشات کی موجودگی بہت اچھی بات ہے کیونکہ اس سے انسان کی زندگی کو تحرک ملتا ہے لیکن یہ خواہشات اندھی اور بے لگام نہیں ہونا چاہئیں، ورنہ اس کا انجام تباہی اور بربادی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ جس طرح پروین، نواز اور چودھری تبارک تینوں ختم ہو گئے وحید حرام موت

مرا۔ ایسی سبق آموز کہانی صرف ٹائم پاس کرنے کے لیے نہیں ہوتی بلکہ ہمیں ایسے لوگوں کے انجام سے نصیحت پکڑنی چاہیے۔ نہ خدا ہی ملا، ڈاکٹر ساجد امجد صاحب کی عبرت اثر کہانی رہی۔ انتقام اور بدلہ لینے کا جذبہ کتنی زندگیاں تباہ کرتا ہے۔ شہریار خاں کے انتقام سے شروع ہونے والی کہانی مریم کی تباہی پر ختم ہوئی۔ ہسٹری میرا پسندیدہ مضمون رہا ہے۔ الیاس سیتاپوری جی، ننگ وناموس کی داستان میں بہترین عراق وبغداد اور منگولوں کی تباہ کاریوں پر قلم اٹھا رہے ہیں۔ ابن علقمی جیسے غدار ہی مسلمانوں کے زوال کا سبب بنتے ہیں۔ بھرم، عمر عبداللہ نے آج کل کی معاشرتی بے اعتدالیوں پر بہترین اسٹوری دی۔ کہیں انسان مجبور ہے تو کہیں دولت کی ہوس نے لوگوں کو اندھا کر دیا۔ دوسروں کے ساتھ برا کرنے والوں کے ساتھ بھی کبھی اچھا نہیں ہوتا۔ سرحامد کی بے راہ روی اور انا پرستی نے سارہ جیسی معصوم لڑکی کی جان لے لی۔ محبوب اور سلیم کی اپنی مجبوریاں، سارہ کے شوہر کی لالچ اس کو اور اس کے باپ کو بھی لے ڈوبی۔ ویلڈن عمر عبداللہ۔ ماروی اور نواب صاحب کے کیا کہنے۔ یہ داستان پڑھتے پڑھتے انسان کسی اور دنیا میں پہنچ جاتا ہے۔ بہرحال دلچسپی کا بہت سا سامان اس داستان میں ہے۔ شیش محل میں اسما قادری جی، آخر کار اصل ہیرو اور ہیروئن کو ایکشن میں لے ہی آئیں۔ فاروق نے تو ایکشن میں آتے ہی بندہ پھڑکا دیا، ادھر جولیٹ کا رویہ بھی حیدر آباد کے نوابوں سے جارحانہ ہے۔ آپا پی سے تو وہ بدلہ لے رہی ہے، کہانی بہت شاندار طریقے سے آگے بڑھ رہی ہے۔ بہت خوب۔ مکین شلوم میں ڈاکٹر شیر شاہ سید نے ہمیں پرانے کراچی کی سیر کرائی۔ کہانی پڑھ کر مجھ پر تو ایک سحر طاری ہو گیا، جانوروں کے لیے پانی کا انتظام، ٹرام کی ٹن ٹن اور پہلے والے کراچی میں انسان اور انسانیت تھی، تو میں نہیں۔ بوڑھے سولومن کی یادیں، کراچی کے بارے میں بہت خوب صورت تھیں، ڈاکٹر شیر شاہ سید نے ہمیں یروشلم اور مسجد اقصیٰ کی بھی سیر کروائی۔ بہت اچھا لگا۔ میں نے یہ کہانی دو بار پڑھی۔ ویلڈن ڈاکٹر صاحب۔ مراسلے لاجواب رہے۔ محفل شعروسخن تو اپنے جوبن پر ہے۔ داؤد اشفاق کا شعر واقعی بیسٹ تھا۔ ایک التماس ہے کہ زرین آفریدی کو ایک حادثے میں انجری ہوئی ہے جس کی وجہ سے وہ محفل میں حاضر نہیں ہو سکیں، ان کے لیے دعائے صحت وتندرستی کی اپیل ہے۔‘‘ (اللہ تعالیٰ زرین آفریدی کو صحت کاملہ عطا فرمائے۔ آمین)

❋ مرحا گل، درابن کلاں، ضلع ڈی آئی خان سے تشریف لائی ہیں ’’اکتوبر کا شمارہ ہمارے سامنے ہے اور کورا کاغذ جو بتدریج نیلگوں ہوتا جا رہا ہے، میرے قلم کے نیچے ہے۔ نیلی روشنائی اس طرح صفحۂ قرطاس پر جڑیں پکڑتی جا رہی ہے جس طرح شمارے کے سرورق نے ہمارے دماغ کی جڑوں کو پکڑ رکھا ہے۔ آپ کے جلووں کا شمارہ چاند کی سولہویں کو رات 9 بجے چاند بن کر ہمارے آنگن میں چمکا۔ مایوں کی دلہن سے سجا ٹائٹل بہت زیادہ پسند آیا۔ یلو کلر ہمارا فیورٹ ہے۔ اس دفعہ کافی محنت کی ہے نیا چہرہ تلاش کرنے میں، سو بیوٹی فل رہا۔ انشائیہ پڑھ کر ہم لرز گئے اور یہ لرزاہٹ اس وقت تھمی جب محفل میں اپنا لیٹر دیکھا، تھینکس۔ صدارت پر اپنی برادری کی زرین آفریدی براجمان تھیں۔ بھئی بہت مبارکباد۔ تبصرے کی اولین لائنیں بہت زیادہ پسند آئیں۔ دوسرے نمبر پر بھی ہم موجود رہے...... ارے بھئی اپنی پیاری آنٹی طاہرہ گلزار اپنے تبصرے کے ساتھ گل گلزار نظر آئیں۔ تیسرے نمبر پر پیارے بھائی اشفاق شاہین ہمارے پسندیدہ شہر سے رونق بڑھا رہے تھے۔ بینش صدیقی دل کی گہرائیوں سے ویلکم...... بھئی پتا چلا کہ ہمارا ڈائجسٹ کتنا زبردست ہے۔ محفل میں دو ہم نام صدیقی پہنچ چکی ہیں، اچھی بات ہے۔ رمضان پاشا کا مختصر مگر پُراثر تبصرہ مسکراہٹ دے گیا۔ بلیک کار لاک کے...... مسز صدیقی ایک بار پھر گلشن کا پھول بن کر چمکیں۔ ڈی آئی خان سے عبادت راج کاظمی کا تبصرہ آج کل اداسی سے نکل آیا، شکر ہے ویسے آپ صرف مسکراتے چہروں پر کیوں فدا ہیں؟ اور آپ کا حصہ نجانے کون ہضم کر جاتا ہے، ہمارے ہاں آ کر لے جائیں۔ مائی عزیز برادر صادق معاویہ آپ کی حاضری سر آنکھوں پر۔ معاویہ تو ہمارا پسندیدہ نام ہے اس لیے نوٹس لیا اگر آپ کو کوئی بات بری لگی ہے تو معاف کر دیجیے گا۔ کہانیوں پر تبصرہ کرنا ایسا ہی ہے جیسے ملکۂ حسن کے حسن کی تعریف کرنا...... سب سے پہلے نظریں شیش محل سے ٹکرائیں جہاں ٹکراؤ کافی زبردست رہا۔ امید ہے کہ آگے کہانی کراچی کے حالات تک آ جائے گی۔ جلد ہی پاکستان لائیں اسٹوری کو...... دوسری اڑان آخری صفحات کی طرف لگائی اور یہ اڑان جلد ہی اڑن چھو ہو گئی۔ مردوں کے بے حس معاشرے میں پھنسی عورت پر کافی افسوس ہوا۔ کافی سازش بھری تحریر تھی۔ منظر امام کی تحریر پڑھ کر کچھ اثر زائل ہوا۔ ماروی میں نیلماں کی موت کا دکھ ہوا۔ لگتا ہے ماروی کا اختتام نہیں ہے، کافی آگے چلے گی۔ کار رفتہ میں فرانسس کی بے وقوفی پر کافی غصہ آیا، بنی بنائی جنت اجڑ گئی۔ دکھ بھی ہوا۔ ایک یاد رہ جانے والی تحریر تھی۔ شیر شاہ سید زبردست تحریر لے کر حاضر تھے۔ واقعی کراچی کا کیا ہو گا؟ ’’نہ خدا ہی ملا‘‘ ایک سفاک تحریر تھی۔ سرکاری درباری ایک شرمناک تحریر تھی، اچھا ہوا انجام کو پہنچ گئی۔ بانجھ ایک شاہکار کہانی تھی۔ ویلڈن جناب! انگوٹھی کا راز یہ کہانی ہمیں کاشف زبیر کی یاد دلا گئی۔ میں نے ہر کہانی میں کاشف زبیر اور مریم کے خان کو ڈھونڈنا چاہا اس لیے مجھے کوئی اور بمشکل پسند آ رہا ہے۔ مریم جی کافی ظلم کر رہی ہیں ہمارے ساتھ۔ تاریخی کہانی پڑھتے ہوئے دل چاہتا ہے کہ پڑھتے ہی جاؤ، کوئی ڈسٹرب نہ کرے۔ اس دفعہ تو سارے ڈائجسٹ نے میلا لوٹ لیا۔ رسالے میں شامل ہر کہانی زبردست رہی۔ سسپنس جاسوسی نے ہمیں صرف انیس سال کی عمر میں بہت زیادہ اعتماد بخشا...... اس کے ہر ایک لفظ نے ہماری راہنمائی کی جس کی وجہ سے ہم کبھی بھی نہیں ڈگمگائے۔ (بہت شکریہ جناب......

کوئی بھی چیز اپنی افادیت اور اس کے درست استعمال پر اچھی یا بری ثابت ہوتی ہے۔ آپ نے جس جذبے سے ان رسالوں کو پڑھا لائقِ تحسین ہے) شاعری کی دنیا میں پہلے تین اشعار بہت زیادہ پسند آئے۔ اس کے علاوہ ریاض بٹ، رمضان پاشا، ناہید یوسف، ثانیہ کاظمی، صفدر معاویہ، عبادت راج کاظمی کے اشعار پسند آئے۔ خوب صورت اقتباس، زبردست لطائف سب کچھ سسپنس کے عین مطابق تھا۔ آخر میں ان سب دوستوں کی کمی محسوس ہوئی۔ مشال نوال، بلقیس خان، انعم شیر فلک، نادر سیال، انور یوسف، شیخ وقار، عمران جونانی، معراج محبوب عباسی، چوہدری سرفراز وغیرہ۔"

✠ **اشفاق شاہین**، لاہور سے محفل میں شریک ہیں "پرچے نے عید کی خوشی دوبالا کردی۔ کچھ افسوس اگر تھا بھی عید کے تیسرے دن چھٹی نہ ہونے کا، وہ سسپنس کی آمد سے خوشی میں بدل گیا۔ سرورق عمدہ تھا۔ جون ایلیا کے انشائیے سے ہوکر اپنی محفل میں پہنچے جہاں زرین آفریدی کرسی صدارت پر براجمان تھیں، بہت مبارک ہو۔ مہتاب احمد، بینش صدیقی .... محفل کا حصہ بننے پر جی آیاں نوں، ہمیشہ رونق بڑھایئے گا۔ طاہرہ گلزار، رانا بشیر، مرحا گل، صفدر معاویہ، جبار انصاری، صادق سعیدی بہترین تبصروں کے ساتھ رونق بزم تھے۔ خواجہ نعیم، طاہر بیگ، عبادت کاظمی، مسز صدیقی، شہباز ناز، ادریس خان بھی عمدہ خطوط سے محفل کی شان بڑھاتے نظر آئے۔ چلتے ہیں تبصرے کی طرف۔ الیاس سیتاپوری کی تاریخی کہانی "ننگ وناموس کی داستان" تاریخ کے کئی خفیہ گوشوں سے آگاہی ہوئی۔ "شیش محل" بہترین جارہی ہے۔ ہنوز فاروق کی تلاش ابھی ختم نہیں ہوئی بلکہ اب اسے حقیقت سے آگاہی ہوئی۔ اب دیکھو اس کی تلاش کب ختم ہوتی ہے اور جولیٹ بڑی محنت اور عقل سے اپنی ماں کے بدلے لے رہی ہے لیکن خلاف توقع اپنے باپ کے عمدہ امیج کی وجہ سے حیران ہوئی، دلچسپی سے بھرپور داستان کی اگلی قسط کا انتظار رہے گا۔ ماروی کے چاہنے والے بھی بہت ہیں، جیسے آغاز ہوا تھا ماروی کا، اب اس سے قطعی مختلف ہوگئی ہے۔ تاریک وروشن دنیاؤں اور ٹیلی پیتھی کے ساتھ کہانی کی رفتار نے ہمیں بھی گھما کر رکھ دیا۔ عمر عبداللہ کی آخری صفحات کی تحریر "بھرم" لاجواب ٹھہری۔ آخر تک سسپنس برقرار رہا کہ اصل مجرم کون ہے۔ سنسنی سے بھرپور تحریر بہت اچھی لگی۔ ملک صفدر حیات کی سرکاری درباری بھی خوب رہی، ہم نے بھی وحید کے مجرم ہونے کا قیاس لگایا تھا۔ اچھی تحریر تھی گڈ۔ مختصر کہانیاں اس بار تو مجھے کچھ زیادہ اچھی نہیں لگیں۔ محبوب الٰہی حضرت نظام الدین اولیا کی زندگی کے نشیب وفراز سے آگاہی ہوئی۔ محفل شعروسخن میں انتخاب لاجواب تھا۔ خصوصاً داؤد اشفاق، ریاض بٹ، زرین آفریدی، صبا سحر اور مدحت کا انتخاب کمال کا تھا۔"

✠ **محمد خواجہ**، کورنگی، کراچی سے تبصرہ کررہے ہیں "اس دفعہ اکتوبر کا شمارہ بہت جلد موصول ہوگیا۔ سرورق اچھا اور عید سے متصل ہے۔ خاتون عید کی تیاری کیے ہوئے سفید اور رنگین پھولوں کے گجرے نے اور بھی نکھار دیا ہے۔ جون ایلیا کی تحریریں ہمیشہ باعث تحسین ہوتی ہیں۔ یہ دل سے اور بہت غور سے پڑھنے والی ہوتی ہیں۔ اس دفعہ وحشی جانوروں اور وحشی انسانوں پر بڑا دلدوز مقالہ لکھا ہے۔ جب پاکستان بنا تو اس کی قدر اس وقت کے لوگوں سے پوچھو۔ ہر تکلیف اور دلوں کے زخم ہنس کر برداشت کیے۔ اس وقت کس کے پاس کیا تھا۔ آج کے پاکستان میں ضرورت زندگی کی ہر آسائش ہے مگر نہ وہ قدردان رہے، نہ پس منظر یاد ہے۔ عیاشی، گاڑیاں، لوٹ کھسوٹ۔ عوام کا بڑا حصہ مظلوم ہے۔ وہ حکمرانوں کے عذاب اور قدرت کی عنایتوں کو بھی عذاب کے طور پر قبول کررہے ہیں۔ نہ بند باندھے گئے۔ سیلاب زیادہ، بجلی کی انتہائی کمی، معیشت تباہ، روزگار ختم، آسان روزگار، چوری ڈکیتی۔ اس سے کتنے خاندان سالوں کی کمائی لٹا کر زندہ درگور ہوئے۔ ہمارے مولوی اللہ کے قہر سے ڈرانے میں مشغول ہیں اور دنیا کو عذاب کی جگہ بتاتے ہیں۔ خدا کی مخلوق سے بے پناہ محبت، سورۂ رحمان کا ترجمہ تو پڑھ لیں۔ اس نے زمین پر انسان کو کیا کچھ نہیں دیا۔ ہم انسانوں نے یقیناً اس کو جہنم بنانے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ مقدس مہینوں میں مہنگائی کا طوفان، غریب خوف زدہ اور منافع خور خوش۔ درندے شکار کو مل کر یا لڑ کر کھاتے ہیں۔ عوام بالکل ویسا ہی شکار ہیں۔ جو گندگی اس دفعہ شہر قائد میں دیکھی ...... کبھی نہ دیکھی۔ اوپر سے بارش نے رہی سہی کسر نکال دی۔ بارش تو خدا کی رحمت ہے مگر شہر قائد کا حال سب کو معلوم ہے، کچھ نہ ہی لکھنا بہتر ہے۔ دوستوں کی جگمگاتی محفل، زرین آفریدی کو صدارت مبارک ہو۔ تبصرے بہت اچھے اور کچھ تو بے مثال۔ ہر خط اپنی مثال۔ گران میں طاہرہ گلزار، رانا بشیر احمد، مرحا گل، محمد صفدر معاویہ اور عبدالجبار رومی انصاری کے خطوط بہت مفصل اور منفرد تحریریں ہیں۔ لبنیٰ خیال کے شوہر کی وفات پر بہت رنج ہوا۔ ان کی بے پناہ خصوصیات کا علم بھی ہوا۔ اللہ ان کو جنت فردوس میں جگہ عطا فرمائے (آمین) اب اس ماہ کی شاندار کہانیوں کی طرف چلتے ہیں۔ ننگ وناموس کی داستان، الیاس سیتاپوری کے قلم سے جو بھی تاریخی داستان ہوتی ہے، اس کو ریکارڈ رکھنا چاہیے۔ چنگیز دور کی بہت ہی معلوماتی اور دلچسپ داستان۔ مسلمانوں کے عزم اور کوتاہیوں کو بڑی تفصیل سے اور تحقیق سے لکھا گیا۔ سرکاری درباری، ملک صفدر کا زبردست کارنامہ۔ قتل کی عبرت ناک داستان۔ قدم قدم تجسس، آخر ایک طاقت ور مجرم کو بے نقاب کردیا اور معما حل کردیا۔ بہت عمدہ کہانی۔ شیش محل، بڑی پُراثر داستان۔ 14 قسط۔ منظر اور حالات اتنی تیزی سے تبدیل ہورہے ہیں لیکن تسلسل باقی رہتا ہے۔ فاروق آخر کب تک صحت یاب ہوگا۔ لگتا ہے اب شاید وہ ایکشن میں آنے والا ہے۔ کہانی ایک نئے دور میں داخل ہونا ہی چاہتی ہے۔ اسماء قادری کے لکھنے کا فن

بڑا منفرد ہے۔ نہ خدا ہی ملا، بہت اچھی کہانی۔ ماضی کی غلطی کی تلخی لیے ایک خاندان کا دوسرے سے انتقام۔ ایک ناعاقبت اور بے صبر لڑکی جس کی غلطیاں انتقام لینے والوں کے لیے مددثابت ہوئی۔ کسی کا کچھ نہ بگڑا وہ لڑکی خود ہی انتقام کا شکار ہوکر برباد ہوگئی۔ بجائے انتقام کے معاف کردینے سے ایک پورا خاندان تباہی سے بچ جاتا۔ اللہ معافی، دو دوستوں نے اپنی ساری زندگی الٹے سیدھے کاموں سے دولت کمائی۔ اپنے بال بچوں کو اونچے مقام تک پہنچایا۔ اف آخری عمر میں عجیب مطلب پورے ہوگئے تو کہہ دیا اللہ معافی، وہ بھی بے شرمی سے۔ کار رفتہ، مغربی معاشرے سے تعلق رکھتی کہانی۔ مدت پہلے کا قتل، بہت دن خیریت سے گزر کرنئی زندگی کی شروعات واپس وہیں چل پڑی جہاں سے بچ کر بھاگی تھی۔ لگے دم، بہت مزاحیہ کہانی۔ ایک شخص محبت حاصل کرنے کے لیے بجائے کچھ بن کر دکھانے کے الٹے حربے نے اس کو ہر چیز سے دور کردیا اور نشے کے زہر میں ڈوب گیا۔ کہانی بڑی دلچسپ اور انداز بڑا مزاحیہ۔ تمکین شلوم، بڑا دلچسپ سفرنامہ۔ ایک یہودی کی کراچی سے محبت جبکہ وہ سالوں پہلے کراچی چھوڑ کر اسرائیل میں بس گیا مگر اس کا دل کراچی میں تھا۔ وہ کراچی کو اس وقت کی نظر سے دیکھتا رہا۔ وہ ساون کا اندھا تھا لیکن ایک آج کل کے کراچی کا شخص جو شرمندہ تھا، اس یہودی کی محبت کے سامنے۔ بہت ہی سبق آموز کہانی۔ پڑھنے والا خود شرمندگی محسوس کرتا ہے۔ محبوب الٰہی، حضرت خواجہ نظام الدین کا دوسرا حصہ، انتہائی معلومات اور ایمان افروز زندگی کے حالات، بہت بڑے ولی جن کی دشمنی بادشاہ کو مہنگی پڑی۔ گورکن، بھوک افلاس کی انتہائی درد بھری داستان۔ ایک گورکن بجائے اولاد کو مارنے کے کوئی بھی مزدوری اور پیشہ اختیار کرسکتا ہے تاکہ بچوں کی بھوک مٹا سکے۔ لیکن وہ تو کوئی کام ہی نہ کرسکا، اگر خدا کا بھروسا کر کے روزی تلاش کرتا۔ بھرم، انسانی نفسیات پر لکھی گئی کہانی۔ ایسا لگا کئی ٹکڑوں کو اکٹھا کر کے لکھی گئی کہانی۔ دنیا میں بہت سے لوگوں کی مجبوری، دکھ اور ہر طرف تاریکی ہے مگر ایک تعلیم یافتہ شخص جو شاید نفسیاتی مریض تھا۔ بہت گھٹیا پلان جس میں بہت سے مجبوروں کو استعمال کیا۔ کہانی کیا تھی ایک، انوکھی داستان جو سمجھ سے بالاتر۔ اشعار کی محفل اچھی سجی رہی۔ کترنیں اور حکایتیں بہت اچھی رہیں۔ بہت چیدہ، معلوماتی رسالے کو ایک الگ ہی تڑکا لگاتی ہیں۔" (بہت شکریہ جناب...... بہت عمدہ تبصرہ رہا)

✠ اور لیس احمد خان، ناظم آباد، کراچی سے محفل میں شریک ہیں "اکتوبر کا سسپنس گوناگوں خوبیوں اور رنگوں سے جا نظر نواز ہوا۔ سرورق کو سراہتے ہوئے شعور اور دانائی سے سجی بزم میں پہنچے۔ پھر اداریے سے مستفیض ہوئے۔ پھر ناموں کی فہرست میں زرین آفریدی کے سرفہرست نام پر نظر پڑی مبارکباد۔ بعد دیگر دوستوں کے ناموں پر پڑی۔ سب ہی اپنی اپنی آرا سے آگاہ کررہے تھے۔ عید الضحیٰ آئی اور چلی گئی۔ سچ کہتے ہیں لوگ کہ خوشی کے لمحات کم اور دکھوں کے بیکراں ہوتے ہیں۔ بندے کو ہر حال میں رب کی خوشی میں خوش رہنا چاہیے۔ الیاس سیتاپوری کی ننگ وناموس کی داستان پڑھ کر تاریخ کے بہت سے سربستہ رازوں سے آگاہ ہوئے۔ انگوٹھی کا راز، بانجھ اچھی تحریریں تھیں۔ پھر اسما قادری کی شیش محل تھی۔ شیش محل کے کیا کہنے بندہ آخری سطر تک مبہوت ہوجاتا ہے اور الفاظ کے پیچ وخم میں اپنے آپ کو گم پاتا ہے۔ لاجواب تحریر ہے جس میں کسی قسم کا احساس تک نہیں ہوتا۔ یہی کسی تحریر کی کامیابی کی دلیل ہے۔ نہ خدا ہی ملا، ڈاکٹر ساجد امجد کی ایک اچھی تحریر تھی اگر ایک انسان کے دل میں دوسرے کے لیے کینہ آجائے تو وہ کیا کیا اور کیسے کیسے جتن کرتا ہے۔ اپنے دشمن کو نیچا دکھانے کے لیے کہ انسانیت بھی اپنا منہ چھپا لے۔ اقوال زریں پر مشتمل کترنیں بھی آگاہی کا سبب بنیں۔ اللہ معافی اور کار رفتہ بھی دلچسپی سے پڑھی گئیں۔ محفل شعر وسخن نے بھی مزہ دیا۔ منظر امام کی لگے دم بھی مختصر کہانیوں میں اچھی لگی۔ منظر امام اپنی ہر تحریر میں معاشرے کی کمزوریوں کی طرف لطیف پیرائے میں اشارہ کرجاتے ہیں کہ تحریر یادرہ جاتی ہے۔ گمان بھی ایک تاثر انگیز کہانی تھی۔ وقت کے ساتھ ساتھ انسانی رویے اتنے بے حس وبے پروا ہوگئے ہیں کہ الامان الحفیظ۔ انسان اپنے پیاروں کے ساتھ ایسی بے حسی کا مظاہرہ کرتے ہوئے شاید بھول جاتا ہے کہ کل وہ بھی اس مقام پر کھڑا ہوگا اور اس کے ساتھ بھی وہی سلوک ہوسکتا ہے جو اس نے اپنے حقیقی رشتوں کے ساتھ کیا کیونکہ دنیا مکافاتِ عمل ہے۔ تمکین شلوم بھی اچھے انداز میں لکھی گئی۔ محبوب الٰہی پڑھ کر دل ایمان کی روشنی سے بھر گیا۔ حضرت نظام الدین اولیا بہت بڑے پائے کے ولی تھے۔ ان کے سلسلے کے ہزاروں مرید اس دنیا میں ہیں۔ آخری صفحات کی دونوں تحریریں بھی بے مثال تھیں۔"

✠ تحریم شاہ، لاہور کینٹ سے شریک محفل ہیں "اس دفعہ سرورق کچھ خاص اچھا نہیں لگا لیکن فہرست دلچسپ تھی۔ انشائیہ بھی زبردست رہا ہمیشہ کی طرح ہماری سوچ کو جھنجوڑتے ہوئے درست فرمایا جون ایلیا نے، آج کا انسان تو جانور سے بھی بدتر ہوگیا ہے۔ جانور بھی ایک وقت کو اپنے نسل کی حفاظت کرتا ہے یہاں تک کہ شیر کو تو سب سے زیادہ سوشل جانور مانا جاتا ہے جو بارہ، پندرہ شیروں کا خاندان لے کر چلتا ہے لیکن انسانوں میں تو سب سے مقدم خونی رشتوں میں بھی احساس آج کل آٹے میں نمک کے برابر ہی پایا جاتا ہے۔ انشائیہ کے بعد اپنی محفل میں قدم رکھا۔ سب سے پہلے تمام نگران سسپنس اور عزیز قارئین کو بہت دعاؤں کے ساتھ عید مبارک۔ اداریے میں بالکل درست فرمایا۔ یہ ریلیوں کا کھیل جو ملک کی سڑکوں پر کھیلا جارہا ہے یہ ختم ہو تو کچھ لوگ فارغ ہوکر ملک کے لیے کچھ سوچیں اور کریں۔ زرین آفریدی کو کرسی صدارت کی بہت مبارکباد۔ میں پچھلے چند مہینوں سے محفل میں حاضر نہ ہوسکی، اس کی معذرت چاہتی ہوں۔ یہ سمسٹر سسٹم جتنا آسان ہوتا ہے اتنا ہی جلد باز بھی ہے۔ کہنے کو تو چھ مہینے کا سمسٹر

ہوتا ہے لیکن ہر دو مہینے بعد پیپرز آجاتے ہیں۔ خیر میرا پہلا سال ختم ہو گیا ہے اور رزلٹ بھی آ گیا ہے اور آپ کی دعاؤں سے اچھے نمبروں سے پاس بھی ہوئی ہوں۔ (مبارک ہو بیٹی...... مٹھائی کہاں ہے پھر؟) طاہرہ گلزار جی! آپ کا خط پڑھ کے مزہ آجاتا ہے۔ اندازِ بیان بہت زبردست ہے۔ خاص طور پر جب آپ ہمارے بھائیوں کی کھنچائی کرتی ہیں اور جو آپ نے شوہروں کا فلسفہ بیان کیا ہے بالکل درست فرمایا۔ بینش صدیقی کو خوش آمدید۔ بشیر احمد سرورق کی آنکھوں کی کیا خوب تشریح کی ہے "سیکیورٹی کیمرے" واہ میں تو آج تک ان کا مقصد سمجھ ہی نہ سکی تھی۔ آج پتا چلا کہ وہ سرورق کی حسینہ کی سیکیورٹی کے لیے ہوتی ہیں۔ مرحا گل، مسز صدیقی اور تمام تبصرہ نگاروں کے تبصرے کہانیوں کی طرح ہی پر لطف ہوتے ہیں۔ ماروی میں اس بار بہت دکھ ہوا۔ نیلماں کو نہیں مرنا چاہیے تھا۔ مجھے بہت اچھی لگتی تھی اور عابی کے لیے بہترین شریک حیات تھی۔ پتا نہیں کیوں مار دیا۔ شیش محل اچھی رہی۔ اپنی تیز رفتاری سے انجام کی طرف گامزن ہے۔ فاروق اور جولیٹ پھر نہیں مل سکے لیکن لگتا ہے فاروق بھی حقیقت میں کوئی نواب زادہ ہے۔ گمان، بس سادی سی کہانی تھی اور نہ خدا ہی ملا میں مریم کو اپنے اور باپ کے کیے کی سزا ملی۔ باقی شمارہ ابھی زیرِ مطالعہ ہے۔ دیکھیے خط ضرور شائع کیجیے گا، پچھلے مہینوں کی سزا مت دیجیے گا۔" (ہم کسی کو سزا نہیں دیتے...... یہ محبتوں کی محفل ہے...... سزاؤں کی نہیں)

⌘ وارث علی، سندیلیانوالی سے چلے آرہے ہیں "سسپنس اس دفعہ 18 تاریخ کو مل گیا جو کہ بالکل ہی غیر متوقع تھا۔ خیر پا کر بہت خوشی ہوئی۔ سرورق کی حسینہ شرمانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے ایسی دکھ رہی تھی جیسے بلی کو دیکھ کر کبوتر...... جون ایلیا کی شعور، دانائی اور دانش کی باتیں پڑھ کر بے اختیار جھرجھری سی لی کیونکہ واقعتاً ہم انسان ہی انسانیت کے دشمن ہیں۔ انکل کا اداریہ پڑھا۔ ایک سو ایک فیصد سچائی بیان کی انکل جی نے کہ ایک کھیل ہی تو کھیلا جا رہا ہے ہمارے ساتھ...... جیسا کہ بھارت نے کچھ دنوں سے اڑی والا واقعہ بنا کے پاکستان کو بدنام اور تنہا کرنے کی دھمکی دی ہے جو ہمیشہ سے گیدڑ بھبکی ثابت ہوتی آرہی ہے اور انشاء اللہ ہر جگہ بھارت کو ناکامی کا منہ دیکھنا ہوگا۔ طاہرہ گلزار کو وزارتِ عظمیٰ اور زرین آفریدی کو کرسی صدارت کی ڈھیروں مبارکباد...... اس دفعہ کہانیاں مغربی کم اور مشرقی زیادہ تھیں جو کہ بہت ہی اچھا تاثر لے آئیں کیونکہ زیادہ مغربی کہانیاں ہوں تو پڑھنے کو بھی دل نہیں کرتا...... سب سے پہلے شیش محل میں داخل ہوئے۔ فاروق ابھی تک جولیٹ سے نہیں ملا۔ الٹا بیگی کو بھی گم کر بیٹھا۔ یہ تو شکر ہے کہ وہ ہوٹل سے ہی مل گئی۔ باہر لے جاتے تو ڈھونڈنے میں دیر لگتی۔ اسما قادری جی! فاروق کی جولیٹ سے خدارا جلدی ایک ملاقات تو کروا ہی دیں پلیز...... ادھر حویلی میں جولیٹ اپنے باپ کے گھر زبردست معرکہ سر کر رہی ہے لیکن آصف نجان کا اس میں دلچسپی لینا ذرا پسند نہیں آیا۔ مجموعی طور پر اچھی قسط تھی۔ اب دیکھو فاروق اس اچانک افتاد سے کیسے نکل پاتا ہے۔ جو نیش کی لاش کی صورت اس کے گلے پڑ گئی۔ ماروی کے بارے میں کیا کہیں؟ ملک صفدر حیات کی سرکاری درباری پڑھی، بہت سبق آموز کہانی تھی۔ پچو نے جب ہر حد ہی عبور کر لی تھی تو اس کا انجام یہی ہونا تھا۔ قاتل وحید پر تو شروع سے ہی شک تھا لیکن وجہ چودھری تبارک کی شکل میں بالکل الٹ طرح سے آئی۔ وحید نے حنیف کو پھنسانے کی کوششیں تو بہت کیں مگر قدرت کو اپنا آپ بھی تو دکھانا تھا، سو حنیف بچ گیا۔ نگین شلوم پڑھی۔ انسانوں کے تلخ رویوں اور معاشرے کی بے حسی اور ناانصافی کی بھینٹ چڑھتے نئے کراچی کی لہولہو داستان آنکھوں کو نم کرتی رہی۔ ساتھ ساتھ فلسطین کے اہم واقعات کو نمایاں کرتی زبردست تحریر ڈاکٹر شیر شاہ سید نے لکھی تھی۔ لگے دم، منظر امام کی ہلکی پھلکی مزاح کا تاثر دیتی معاشرتی ناہمواریوں میں بے روزگاری کا پردہ چاک کرتی اہم تحریر تھی۔ کاش حکمران اس بے روزگاری کی لعنت نما مصیبت کو ہی کم کروا دیں اے کاش...... بھرم، آخری صفحات پر عمر عبداللہ کی تحریر تھی لیکن معذرت کے ساتھ کہ یہ تحریر آخری صفحات کے لیے کچھ ٹھیک نہیں لگی مجھے...... بے چاری سارہ مفت میں جان سے گئی اور اصل مجرم سارہ کا شوہر اور سسر نکلے۔ ڈاکٹر ساجد امجد کی نہ خدا ہی ملا، شہریار نے بائیس سال بعد بھی اپنی خصلت نہ بدلی اور نہ اس نے کسی کو معاف کیا، نہ وقت نے کسی کو معاف کیا۔ شہریار بدلے کی آگ میں جھلستا رہا کیونکہ اس کو بہن کا بدلہ لینے کا کوئی موقع نہ ملا اور یہی خصلت اس کے بیٹے میں بھی آئی۔ شرجیل نے ٹھکرائے جانے کا بدلہ مریم سے لے کر ہی چھوڑا...... جبکہ مریم! مریم جیسی ہوس پرست عورتوں کے ساتھ ایسا ہی ہونا تھا۔ جو لوگ اپنی ذاتی تسکین کے لیے دوسروں کو بے آرام کرتے ہیں، وہ خود کب آرام سے رہ سکتے ہیں۔ علی اختر کی بانجھ پڑھی جہاں اس کو صرف سچ بولنے کی سزا دی گئی۔ عبدالستار چوہان کی کاررفتہ پڑھی، دو محبت کرنے والے دلوں کی روح کو چھیدتی تحریر...... فرانسس اور مچل کی کہانی۔ فرانسس نے ایک ممتا کی ماری ماں کو اس کے بچے کا شوہر واپس دلوانے کے لیے وہ سچ بول دیا جو خود اس کو ہی فنا کر گیا، کاش وہ صبر کر لیتی۔"

⌘ عبدالجبار رومی انصاری، چوہنگ لاہور سے تشریف لائے ہیں "شعور، دانش اور دانائی جون ایلیا نے جانوروں اور انسانوں کے مابین ایک بحث کی ہے جو بہت اچھی ہے۔ واقعی انسان تو ان سب سے اوپر ہے، اسے اشرف المخلوقات کا درجہ حاصل ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ یہ انسان اپنے جیسے انسانوں کے لیے کیا شعور، دانش و دانائی رکھتا ہے، یہ بحث بھی بہت لمبی ہے، دور نہ جائیں بس اپنے عوام اور حکمرانوں سے ہی اس کا موازنہ کرلیں۔ عوام شروع دن سے ہی ملک کی حالتِ زار دیکھ کر

ماہنامہ داستانِ دل ساہیوال

ادب کی دنیا میں ایک نیا نام

نئے لکھنے والوں کے لئے ایک بہترین پلیٹ فارم

اگر آپ لکھاری ہیں اور تحریر کسی مستند ادارے میں بھیجنا چاہتے ہیں تو ابھی داستانِ دل کو بھیجیں۔ آپ کی تحریر قریب کے شمارے میں پبلش کی جائے گی۔ آپ اپنے افسانے، ناولٹ، ناولز، کہانیاں، جگ بیتیاں، آپ بیتیاں، غزلیں یا پھر نظمیں ہمیں ای میل کے ذریعے، ڈاک کے ذریعے یہاں تک کہ وٹس ایپ کے ذریعے بھی بھیج سکتے ہیں۔ بس آپ کی تحریر اردو میں لکھی ہونی چاہیئے۔ اگر آپ نئے لکھاری ہیں تو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، آپ اپنی تحریر ہمیں بھیجیں ہم اس کو صحیح کر کے اپنے شمارے کا حصہ بنائیں گے۔ اگر آپ لکھنا نہیں جانتے تب بھی آپ کو فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں آپ ہمیں کوئی بھی اچھی سی غزل یا اقوال زریں انتخاب کے لئے بھیج سکتے ہیں۔ وہ بھی داستانِ دل کا حصہ بنے گا۔ اس کے علاوہ آپ اپنی تحریر موبائل پر بھی میسج کر سکتے ہیں بس اردو میں تحریر ہو۔

ہمارے داستانِ دل کے سلسلے کچھ اس طرح سے ہیں

محبت نامے، ملک کی ممتاز شخصیات کا انٹرویو، افسانے ناولز، ناولٹ، غزلیں، نظمیں، حمد، نعت اور انتخاب

اس کے علاوہ آپ کی ہر تحریر کو ہمارے شمارے میں خاص جگہ دی جائے گی۔ آپ ہمارے سارے شمارے پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر پڑھ سکتے ہیں اور پڑھ کر اپنی رائے دے سکتے ہیں

ہمارا ایڈریس ہے۔

ندیم عباس ڈھکو چک نمبر L-5/79 ڈاکخانہ L.5/78 تحصیل و ضلع ساہیوال

وٹس ایپ نمبر: 03225494228

ای میل ایڈریس ہے abbasnadeem283@gmail.com

کڑھتے چلے آرہے ہیں اور اپنے شعور، دانش و دانائی سے بھی مجبوراً کچھ نہیں کر سکتے اور حکمرانوں نے اپنی من مرضی سے شعور، دانش کا استعمال صرف اپنے لیے کیا اور اپنے ہی پیٹ بھرے اور پیارے وطن کو لوٹ مار، کرپشن اور دہشت گردی میں جھونک دیا۔ دو دن کے بھوکے مستعصم باللہ کو جب بھوک لگی تو ہلاکو خان نے اسے ہیرے جواہرات کھانے کو پیش کیے تو اس کی آنکھیں کھل گئیں اور ہلاکو خان نے بہت اچھا جواب دیا کہ اگر یہی ہیرے جواہرات خرچ کر کے اپنی سپاہ بنائی ہوتی تو آج مجھ سے شکست نہ کھاتے۔ بس شعور، دانش و دانائی کی بات ہوتی ہے نا اور پھر ہلاکو خان نے بغداد کو تہس نہس کر دیا۔ درداغ بھی کبھی ہلاکو کے ساتھ رہا تھا، اسے بھی کچھ دانش و دانائی کا پتا تھا۔ وہ صفیہ اور علیہ کو لے کر پہلے ہی عازم سفر ہو گیا۔ اسے کہتے ہیں داستان ننگ و ناموس کی۔ خطوط کی محفل سے صنفِ نازک سندھ جو ناری زندہ باد، مبارک ہو۔ بہت اچھا تبصرہ لکھا ہے اسی طرح طاہرہ گلزار بھی سیکنڈ نمبر پہ آ کے بازی لے گئیں، زبردست۔ اشفاق شاہین کے پاس شاید ٹائم کم تھا۔ پیاری بزم کی نئی ساتھی بینش صدیقی کو خوش آمدید۔ ہوئے کا شعور، دانش و دانائی سلب ہوئی تو اسے چوکیدار کی بیوی ہی بھوت لگنے لگی۔ انگوٹھی کا راز کھلا تو اس کی جان میں جان آئی، ویلڈن تنویر ریاض۔ سر حامد کی اپنے ٹائم پہ شادی ہوئی ہوتی تو وہ سارہ کی باتوں کو انا کا مسئلہ نہ بناتا اور نہ اسے سزا دیتا۔ اوپر سے اس کا شوہر زبیر بھی ظالم بن گیا سب کی عقل و شعور پہ پردہ پڑ گیا اور بیچاری سارہ کی جان لے لی۔ ہمیں تو لگا تھا کہیں سے بھرم رہ جائے گا اور عمر عبداللہ اینڈ میں سارہ کو کہیں سے زندہ نکال لیں گے...... نر اور مادہ چیل کو اپنا گھر بنانے کا شعور ہے اور شعور تو اس ملک کے عوام کو بھی ہے جن کے اندر ملکی تعمیر کا جذبہ موجود ہے لیکن ان کے سروں پہ جو بیٹھے ہیں، وہی بانجھ ہیں وہاں بیچاری ریمونہ اور جواد کا کیا قصور؟ ملک بابا زندہ باد۔ لگے دم تو بنے غم یہ کوئی چائنا تھوڑی ہے جہاں کی حکومتیں بھی اپنے عوام کے لیے روزگار مہیا کرتی ہیں۔ یہ تو پاکستان ہے بابا، لگے دم تو بنے غم، منظر دیکھو اور بھگو عمدہ تحریر ہے۔ ہر شے اعتدال کے دائرے میں ہی اچھی لگتی ہے اور کسی کو پرکھنا ہو تو آنکھیں کھلی اور عقل و شعور کا استعمال کرنا چاہیے۔ سرکاری درباری بھی اعتدال سے باہر نکلے تو ملک صفدر حیات صاحب کی پرکھتی آنکھوں نے انجام تک پہنچا دیا۔ ماروی ایک نام ہے سچائی کا، پارسائی کا، مراد تو مراد تھا۔ اس کی اولاد اس سے بھی دو ہاتھ آگے ہے۔ منی ماروی کا شعور بھی زبردست ہے۔ جب کچھ ہونا ہوتا ہے تو کسی کے بھی دماغ میں جا کے ہلچل مچا دیتی ہے۔ عالی کی منکوحہ بننے والی نیلماں بھی چل بسی، عجیب و غریب ہی ہیں ماروی اور اس کی باتیں۔ واہ جولیٹ نے تو کمال کر دیا۔ کہاں تو جوزفین اس گھر میں دبی دبی رہتی تھی اور کہاں اس کی بیٹی نے اپنی ذات پر حویلی کے احکام لاگو کرنا بھی گوارا نہیں کیا۔ نواب زادی جو ٹھہریں، ادھر شہزادے فاروق نے چاند بانو کے حملہ آور نتیش کی گوشمالی کرنا چاہی تو وہ جان سے ہی ہاتھ دھو بیٹھا۔ اب شپٹائے فاروق کیا کرتے ہیں یہ تو اسما قادری ہی بتائیں گی۔ انسان کے پیدا ہوتے ہی دنیا کا کٹھن سفر شروع ہو جاتا ہے اور اس کی آسانی کے لیے اپنے خالق اور معبود کو اپنے سامنے اور ہر دم یاد رکھیں یہی اولیا اللہ کی تعلیمات ہیں۔ خواجہ نظام الدین اولیا کی زندگی کے نشیب و فراز کا دوسرا حصہ بھی انتہائی دلچسپ اور ایمان افروز تھا۔ اف لمبا سانس کھینچ گیا آہ، سائے کو ختم تو کر دیا مگر کیا ملا؟ تین نوٹ۔ شیطان کو خوش کر دیا اور خود پاتال کی گہرائیوں میں گر گیا۔ اپنے ہی بیٹے کو ختم کر کے ابراہیم جمالی کی گورکن نے تو دہلا کے رکھ دیا۔ بس معاشرے کی ایسی تلخ حقیقتیں بھی دیکھنی پڑتی ہیں، اللہ رحم فرمائے انسانوں پر۔ محفل شعر و سخن کے ستاروں میں مہوش لاہور، بینش صدیقی اور مسز اینڈ مسٹر محمد صفدر معاویہ کے اشعار بہت اچھے لگے۔‘‘

✠ محمد شہباز ناز، گجر کالونی، سرگودھا سے محفل میں شریک ہیں ’’آپ نے میرا خط شائع کیا، میں شکر گزار ہوں۔ ٹائٹل گرل عید کی طرح چار چاند لگائے بالوں میں پھول سجائے، آنکھیں جھکائے دلہن کی طرح مسکرا رہی تھی۔ جون ایلیا کا انشائیہ پڑھا تو انہوں نے بہت ہی پیاری پیاری باتیں کیں۔ تنویر ریاض کی کہانی انگوٹھی کا راز پڑھی، دلچسپ تھی۔ اس میں طالب علم نے کمال کر دیا۔ اسما قادری کی کہانی شیش محل پہلے کی طرح بہت شاندار تھی۔ ثمر عباس کی کہانی گمان اور منظر امام کی کہانی لگے دم پڑھی، اچھی کہانیاں تھیں۔ ابراہیم جمالی کی کہانی گورکن پڑھی، اچھی کہانی تھی۔ نہ جانے ہمیں کیا ہو گیا ہے۔ گورکن کہانی پڑھنے میں تو صرف کہانی تھی لیکن اس کے اندر بہت پیغام تھے۔ ایک باپ اپنے بیوی بچوں کی خاطر تین دن لگاتار قبرستان میں بیٹھ کر اپنی روزی کا انتظار کرتا رہا۔ آخر کار مجبور ہو کر ایک سائے کے پیچھے بھاگتا ہے اور اس کو کدال سے مار دیتا ہے۔ ماروی اچھی تھی۔ چھوٹی بچی بھی عجوبہ بن گئی، اپنے بھائی کی طرح۔ عمر عبداللہ کی کہانی بیسٹ کہانی تھی بھرم۔ تمام دوستوں کے تبصرے بہت اچھے تھے۔‘‘

✠ خواجہ نعیم جاوید، بھلوال سے تبصرہ کر رہے ہیں ’’ماہ اکتوبر کا سسپنس 25 ستمبر کو ملا۔ خوبصورت ٹائٹل اور مہندی کے کپڑوں سے سنورا کپڑوں کے درمیان بند آنکھوں والی دوشیزہ بھی تھی۔ موتیے کے پھولوں کا ہار پہنے ہوئے جانے کس کے انتظار میں...... شاید ڈاکر انکل کو بھی معلوم ہو گیا ہوگا کہ اب عید کے بعد شادیوں کا سیزن شروع ہو رہا ہے لیکن پنجاب میں اس دفعہ گرمی بہت زیادہ ہے اور تاحال شادیاں بہت کم ہیں۔ انشائیہ سے ابتدا کرتے ہیں۔ اس دفعہ جون ایلیا شعور، دانائی و دانش کے ساتھ حاضر ہوئے۔ بہت گہری بات کہنے والے جون ایلیا کی تحریریں ہر دفعہ بہت گہرے گھاؤ لگا جاتی ہیں دل پر۔ کوئی سمجھے تو۔ خطوط کی محفل

میں زرین آفریدی نے کرسی صدارت پر قبضہ جمایا اور وہ اس صدارت کی حقدار بھی ہیں کہ بہت اچھا تبصرہ لکھا۔ باقی تبصروں میں طاہرہ گلزار، دانا بشیر احمد ایاز، مرحا گل، صفدر معاویہ، رمضان پاشا، مسز صدیقی کے تبصرے اچھے لگے۔ آہ...... مختار آزاد کے بارے میں پڑھ کر دل دکھی ہوگیا۔ اللہ پاک ان کو جنت الفردوس میں جگہ دے۔ کہانیوں میں سب سے پہلے شیش محل پڑھی۔ کہانی اب ساری کھلتی جارہی ہے اور پورے جوبن پر نظر آرہی ہے۔ اسما قادری صاحبہ کو مبارک باد، اتنی زبردست کہانی سسپنس کو دینے پر...... تاریخی کہانی ننگ وناموس کی داستان، الیاس سیتاپوری کی محنت کا ثبوت ہے۔ پڑھ کر تاریخ کے حوالے سے علم میں اضافہ ہوا کہ کس طرح مسلمانوں نے آپس میں بھی ایک دوسرے کی جڑیں کاٹیں اور آج بھی کام بڑے زور شور سے جاری ہے۔ اللہ پاک ہمیں ہدایت دے اور ہم لوگ فرقہ پرستی سے نکل کر ایک قوم ہوجائیں۔ کافی ٹائم کے بعد ڈاکٹر ساجد امجد صاحب کی تحریر نہ خدا ہی ملا، پڑھی۔ میرے حساب سے اس کا نام زہریلے رشتے ہونا چاہیے تھا۔ (یہ تو مصنف کی پسند ہے) ملک صاحب کی سرکاری درباری پڑھنے کے لائق کہانی تھی۔ باقی کہانیوں میں اللہ معافی، کاررفتہ، گمان، کرامات، نگین شلوم، گزارے لائق رہیں۔ ابراہیم جمالی کی گورکن نے سکتے میں ڈال دیا۔ دل خون کے آنسو رویا۔ دل کی زبان سے پڑھنے والی تحریر تھی۔ اس دفعہ منظر امام نے لگے دم میں اپنے کردار کو ہی چرسی بنادیا لیکن حقیقت بھی بتادی کہ آج پیسا ہی سب کچھ ہے لوگوں کی نظر میں۔ عمر عبداللہ کی تحریر بھرم آخری صفحات کے لیے اچھی تحریر رہی۔ اپنوں نے ہی اپنوں پر ظلم کیا۔“

✠ رضوانہ قریشی، راولپنڈی سے چلی آرہی ہیں ”کہانیوں کی لسٹ دیکھ کر ہی اندازہ ہوگیا کہ کہانیاں بھی ہمیشہ کی طرح خوب صورت اور سسپنس سے بھری ہوں گی۔ علی اختر نے بانجھ لکھ کر بعض سوئے ہوئے مسلمانوں کو جگانے کی خوب صورت مثال دی ہے۔ رب کائنات نے انسانوں کو اپنی عبادت کے لیے بنایا لیکن جب عبادت کا وقت آتا ہے تو انسانوں کی ہی کا احساس ہوتا ہے۔ اس کے برعکس یہ معصوم پرندے جب سے دنیا بنی ہے ہزاروں تکلیفیں اٹھا کر بھی صبح سویرے انسانوں سے پہلے رب کائنات کی حمد وثنا کرتے ہیں۔ ڈاکٹر ساجد امجد نے پرانے موضوع کو ایک نیا اور خوب صورت رنگ دیا ہے۔ مریم نے شرجیل کو ٹھکرا کر راشد کو اپنایا۔ راشد برا نہیں تھا لیکن مریم زیادہ سے زیادہ کی تلاش میں تھی۔ اس قسم کی کہانیاں واقعی کسی نہ کسی صورت میں پڑھنے کو ملنی چاہئیں تاکہ سب اپنا بچاؤ کرسکیں۔ محمد الیاس کی اللہ معافی ہم سب مسلمانوں کے لیے ایک بہت بڑی نعمت ہے۔ ہم مسلمان بڑی بڑی عبادات کو بنیاد بنا کر بے شمار چھوٹے بڑے گناہ کرتے ہیں کہ ان کو پورا کرکے معافی مانگ لیں گے۔ آپ نے بہت ہی اچھے موضوع کی طرف سب کو بلایا۔ تنویر ریاض کی انگوٹھی کا راز نے مصنف کی خوبی کو اجاگر کیا ہے کہ کس طرح ایک مصنف اپنے کردار کو جاندار بنانے کے لیے خود کو بھی بھول جاتا ہے لیکن شکر ہے کہ معاملہ زیادہ نہیں بگڑا۔ ڈیورا نے اچھے کام کے لیے رات کا وقت چنا۔ عبدالستار چوہان کی کاررفتہ ایک چونکا دینے والی دکھ بھری کہانی تھی۔ اگر چل پہلے ہی اعتراف کرلیتا تو یہ جانیں بے موت نہ مرتیں۔ ایک بے حد خوب صورت کہانی تھی جس کا انجام مدتوں یاد رہے گا۔ شیر شاہ سید کی نگین شلوم نے ہمارے ملک کے خوب صورت شہر کراچی کی موجودہ حالت کی درست عکاسی کی ہے۔ خاص کر اس وقت وہاں جو کچرے کی صورت حال ہے۔ وہاں پر موجودہ لیڈروں نے اور ان کے ماننے والوں کو بھی اتنے عرصے میں اس بات کا خیال نہیں آیا کہ رمضان المبارک میں پورا پاکستان ایک عبادت گاہ بن جاتا ہے۔ سب کو معلوم ہے صفائی نصف ایمان ہے۔ ثمر عباس کی گمان اچھی کہانی ہونے پر بھی اپنے اندر ایک ان کہا پیغام اور راز لیے ہوئے تھی۔ سلیم انور کی کرامات بھی سب سے بچنے کا درس دے رہی تھی کہ دنیا میں سب کسی نہ کسی سے بڑھ کر ہیں۔ ابراہیم جمالی نے گورکن لکھ کر سب کو اس بات کا احساس دلایا ہے کہ جو دن رات ہمارے مُردوں کا خیال کرتا ہے، اس کا بھی ہمیں خیال کرنا چاہیے۔ عمر عبداللہ آپ کی کہانی بھرم نے کسی کا بھرم رکھا کسی کا نہیں۔ یہ کہانی آخر تک اپنے اندر سسپنس لیے ہوئے تھی لیکن زبیر نے پیسوں کے لیے سارہ کو مروادیا، پیسے تو اس کو ویسے بھی مل جاتے۔ سارہ زبیر کے لیے تو سرحامد سے لڑی تھی۔ باقی سلسلے وار کہانیوں کی ہر مہینے تعریف کرنا پچھلی تعریفوں کو کمزور کردیتا ہے۔ منظر امام کی کہانی لگے دم اس ماہ کی دکھی کہانیوں میں خوشگوار اضافہ تھی۔ میں اکیلے میں اپنی ہنسی نہیں روک سکی لیکن کہانی کے انجام نے بہت زیادہ دکھی بھی کردیا۔ حکمرانوں کو واقعی نوجوانوں کا بے حد خیال کرنا چاہیے جو ملک کا مستقبل ہیں۔ عبدالجبار رومی انصاری آپ کو میرے تبصرے بہت اچھے لگتے ہیں، پڑھ کر بہت ہی خوشی ہوتی ہے۔ اشفاق شاہین قومی زبان کے لیے تعریف کا بہت شکریہ۔ محمد صفدر معاویہ رب کائنات نے سب فوجیوں کو چن لیا ہے۔ میرے اچھے بھائیوں میں آپ کا بھی اضافہ ہوگیا ہے۔ گھر والوں نے آپ تمام فوجی بھائیوں کو پیغام دیا ہے جب بھی انڈیا کے جہنم جانے کا وقت آتا ہے وہ ہماری پاک فوج کو للکارتا ہے۔ رب کائنات ہمارے تمام فوجی بھائیوں کو سلامت رکھے۔“ (آمین)

✠ طاہر منیر، چکوال سے شریک محفل ہیں ”آپ کی محفل میں شرکت کا پہلا موقع ہے۔ (اچھا...... پھر تو ویلکم بنتا ہے نا) سسپنس ڈائجسٹ اپنے منفرد اسلوب اور مخصوص شان کے حوالے سے اپنا ایک الگ مقام قائم کیے ہوئے ہے۔ سسپنس کا پہلا شمارہ مجھے آج بھی یاد ہے جس کے آغاز یا اداریہ میں ایک مثال دی گئی کہ سسپنس کسے کہتے ہیں۔ ایک آدمی کے ہاتھ میں کاغذ کا ٹکڑا ہوتا ہے جس پہ کوئی چیز تحریر ہوتی ہے۔ وہ کسی دوسرے شخص کو وہ تحریر دیتا ہے اور ایک جانب دوڑ پڑتا ہے۔ دوسرا آدمی بھی ایسا ہی کرتا ہے کہ وہ

کاغذ کا ٹکڑا تیسرے آدمی کو دیتا ہے اور خود اسی جانب بھاگنے لگتا ہے جس طرف پہلا شخص بھاگا تھا۔ حتیٰ کہ یہ سلسلہ چلتا رہتا ہے۔ اب قارئین کے لیے دریافت طلب یہ بات ہے کہ آخر اس کاغذ پہ کیا چیز تحریر تھی، لیکن سارا سسپنس اسی میں ہے کہ وہ تحریر پوشیدہ ہی رکھی جائے۔ سسپنس ڈائجسٹ کے حوالے سے بات روز اول سے ذہن میں مرتسم ہے اور بھولی نہیں (پھر تو آپ کی یادداشت اور سسپنس دوستی پر ہمیں ناز ہے) محترم الیاس سیتاپوری کی تاریخی کہانیاں اور ضیا تسنیم بلگرامی کی اولیا کرام پر لکھی گئی تحریریں اپنی الگ شان رکھتی ہیں۔ اب ایک نظر اکتوبر کے شمارے پر جون ایلیا کا انشائیہ بعنوان شعور، دانائی اور دانش انسانیت کی فضیلت پر ایک بھرپور آگاہی کا گلدستہ ہے۔ عوام سے زیادہ اسے سیاستدانوں کو پڑھنے کی ضرورت ہے بلکہ اقوام عالم کے راہنماؤں کو تو ضرور اس کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ محفل شعر و سخن کے پہلے شعر ہی نے اپنی طرف توجہ مبذول کرائی۔ محفل شعر و سخن کا ایک ایک شعر انتخاب کی داد دیتا نظر آتا ہے۔ اقوال زریں کا تسلسل برقرار رہنا چاہیے، اس میں ہر آدمی کو کوئی نہ کوئی حل اپنے مسئلے کا نظر آجاتا ہے۔ اقوال زریں کا انتخاب بہترین تھا۔ اللہ معافی ایک معلوماتی کہانی ہے۔ فریب، فراڈ اور دھوکا دہی کے حربوں سے آگاہی ہوئی۔ سلسلہ وار کہانیاں ٹھیک جارہی ہیں۔ تبصرہ نگاروں کی بے لاگ آرا قابل تحسین ہیں۔ خصوصاً طاہرہ گلزار صاحبہ اور عبدالجبار رومی انصاری صاحب کا جائزہ، جائزوں کا عطر ہوتا ہے۔" (بہت شکریہ)

✠ رمضان پاشا، گلشن اقبال، کراچی سے تشریف لائے ہیں "اس دفعہ خط نہ چھپنے پر کوئی گلہ شکوہ نہیں کیا تھا، اس کے باوجود آپ نے ایک میٹھی سی سرزنش کر ہی ڈالی جسے پڑھ کر میں بہت خجل ہوا۔ آئندہ احتیاط کروں گا۔ (یہ مثبت سوچ ہے) دوسری اہم بات یہ کہ مرحوم نواب صاحب ماروی کی کتنی قسطیں پیشگی لکھ کر گئے ہیں، کیا اب مرحوم کے صاحب زادے لکھ رہے ہیں؟ (نہیں، ایسا نہیں ہے) اکتوبر 2016ء کے سسپنس کا گیٹ اپ پسند آیا، فہرست بہت ہی سادہ اور اچھی تھی۔ انشائیہ کا شعور، دانائی اور دانش کا ادراک، کہانی گمان پڑھ کر ہوا۔ خطوط کی محفل میں اول نمبر پر آنے والی زرین صاحبہ کو مبارکباد۔ موصوفہ تیسری مرتبہ اس رتبے پر فائز ہوئی ہیں۔ اشفاق شاہین کافی عرصے بعد محفل میں تشریف لائے ہیں، ویلکم کم بیک طاہرہ گلزار کا تبصرہ قابل ستائش تھا۔ مرزا طاہر الدین بیگ کا تبصرہ بھی دل کو بھایا۔ اشعار کی محفل میں ریاض بٹ، مرزا طاہر الدین بیگ اور محمد شہباز ناز کے اشعار قابل داد تھے۔ کہانیوں میں بانجھ ذہن پر کافی مثبت اثر چھوڑ گئی۔ اس کی تشبیہات اور اشارے قابل تحسین تھے، کہانی کا عنوان بذات خود ایک تشبیہ ہی تھا۔ بہت خوب مسٹر علی اختر۔ شیش محل اور ماروی بہت تیز بھاگ رہی ہیں اور بہت ہی دلچسپ ہوتی جارہی ہیں۔ سکے دم، لگے دم مٹے غم...... منظر امام نے دوسرا مصرع تو لکھا ہی نہیں، کمائے گی دنیا کھائیں گے ہم۔ کرامات تسلیم انور، کہانی لکھو کر کرامات کرو ہو...... گورکن دل کو تڑپانے والی کہانی تھی۔ یہ المناک کہانی ذہن پر کافی عرصے سوار رہے گی۔ غیر ملکی کہانیوں میں کار رفتہ بہترین کہانی تھی۔ کیمین شلوم ڈاکٹر صاحب نے ایک بار پھر ایک معلوماتی مضمون ہمیں پڑھنے کو دیا۔ ملک صفدر حیات کی کہانی سرکاری درباری پڑھ کر خوب لطف آیا۔ اللہ معافی گزارے لائق تھی۔ طویل عرصے تک یاد رہ جانے والی کہانی بھرم نے کافی متاثر کیا۔ جان توڑ کوششوں سے جمع کی ہوئی رقم کا کیا ہوا۔ وہ بائیک والا کون تھا جو رقم لے کر فرار ہو گیا۔ آخر میں بھی اس ایک کروڑ کا کوئی ذکر ہی نہیں تھا۔ اختتام کر کرا ہو گیا۔"

✠ مرزا طاہر الدین بیگ، میرپور خاص سے محفل میں شریک ہوئے ہیں "جون ایلیا صاحب نے کیا خوب لکھا ہے شعور، دانائی اور دانش۔ چلتے ہیں محفل میں۔ خوب صورت خطوط سے آراستہ محفل جہاں زرین آفریدی، حیدرآباد اور طاہرہ گلزار، پشاور نے بہت زبردست لکھا۔ اسی لیے پہلے اور دوسرے نمبر پر ہیں اور بھی خطوط عمدہ رہے۔ مہتاب احمد صاحب نے بھی اچھا تبصرہ کیا۔ الیاس سیتاپوری، ننگ و ناموس کی داستان اختتام پذیر ہوئی۔ اب دیکھتے ہیں الیاس صاحب کا قلم کیا لے کر آتا ہے۔ تاریخ کے جھروکوں میں داستان اثر انگیز اور عبرت انگیز بھری پڑی ہیں۔ عرض ہے کہ کچھ معظم علی پر بھی ہو جائے۔ شیش محل آہستہ آہستہ بڑھ رہی ہے اور خوب بڑھ رہی ہے۔ اب انجام اس کا کیا ہوتا ہے۔ ڈاکٹر ساجد امجد کی نہ خدا ہی ملا بہت عبرت انگیز کہانی سمجھنے کی اور سمجھانے کی۔ شرجیل کا کردار منگنی توڑنے کا بدلہ کچھ اچھا نہیں لگا۔ عمر عبداللہ بھٹی کی تحریر بھرم اچھی تحریر تھی پروفیسر کا کردار اور کالج میں ہونے والے حالات کے تانے بانے پر عبداللہ صاحب کی تحریر زبردست تھی۔ سسپنس کا یہی کمال ہے کہ ایک زبردست تحریر سامنے آتی ہے اور خوب آتی ہے اب جمالی صاحب کی گورکن، اس تحریر کی جتنی بھی تعریف کی جائے وہ کم ہے آغاز سے لے کر انجام تک بہت ہی سنسنی خیز تحریر اور انجام کی کیا تعریف کی جائے اتنی اچھی تحریر لکھنے پر جمالی صاحب کو مبارک باد۔ صفدر صاحب کی...... سرکاری اور درباری زبردست کارنامہ، قتل جس طرح ہوا اور جن حالات میں لاشیں دریافت ہوئیں نشان عبرت ہے۔ اور توبہ توبہ کر بھیا اللہ سے ڈر بھیا۔"

اب ان قارئین کے نام جن کے نامے محفل میں شامل نہ ہو سکے۔

ظہیر الدین، کراچی۔ مہتاب احمد، حیدرآباد۔ انجم کمال، کراچی۔ ناہید یوسف، اسلام آباد۔ وسیم خان، کوئٹہ۔ فرحانہ عاصم، سکھر۔ جنید احمد ملک، کراچی۔ نعیم احمد، بہاولپور۔ ثاقب خان، لاہور۔

غلام بادشاہ

الیاس سیتا پوری

زیرِ نظر صفحات ماضی کا ایسا تسلسل جو اپنی مخصوص شناخت اور منفرد حالات و واقعات کی روشنی میں ترتیب دیے گئے... منگولوں کا بغداد میں طوفان برپانے کرنے کے بعد مصر کی جانب اٹھنے والا قدم انسانیت اور تہذیب کو بہاتا چلا گیا۔ بڑی بڑی قوتیں خس و خاشاک ہوگئیں۔ بغداد میں خون کی بارش، اونچے اونچے سروں کے مینار اور آبادیوں کو راکھ میں منتقل کر دینے والوں کو کامیابی کے نشے میں شکستگی کا خیال تک نہ آیا... انسان کو چیونٹی کے مانند مسلنے والے ہاتھیوں کو اپنے انجام کی ذرا خبر نہ تھی... حتیٰ کہ مصر میں جب فاتح بادشاہ کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا تو نہ صرف منگول خود حیران ہوئے بلکہ تاریخ بھی ششدر رہ گئی۔ خونخواروں کا وہ سیلاب جو قراقرم سے اٹھا تھا رفتہ رفتہ بلندی سے پستی کی جانب گامزن ہوگیا کیونکہ قدرت کبھی کسی ظالم کو معاف نہیں کرتی۔ کئی محاذوں پر لڑی جانے والی یہ جنگ کہیں حرص و طمع اور کہیں بغاوت کے ہاتھوں بالآخر تاریخی صفحات پر بے شمار داستانیں رقم کرگئی۔

ماضی کا آئینہ۔ بااختیار اور بے اختیار انسانوں کے عبرت اثر واقعات

ابن علقمی اور نصیر الدین طوسی کی سازش مسلمانانِ بغداد کی نااہلی، نااتفاقی اور مستعصم باللہ آخری عباسی خلیفۂ بغداد کی عدم لیاقت نے بغداد کو تباہ و برباد کر دیا تھا۔ منگولوں کی تلواروں سے بچ جانے والوں نے حلب، دمشق اور مصر کی راہ لی۔ ان میں اکثریت مصر چلی گئی تھی کیونکہ مصر، حلب اور دمشق کے مقابلے میں بہت زیادہ دور تھا۔

قاہرہ کے گلی کوچوں میں بھگوڑے بغدادیوں کا شاندار اجتماع تھا۔ تارتار میلے کپڑوں میں ملبوس مسلمان اللہ سے توبہ واستغفار اور رسول اللہ ﷺ سے غیبی امداد کی درخواست کررہے تھے۔ ادھر بغداد میں ابن علقمی ہلاکو خان کے آگے پیچھے پھر کر اپنی اس خواہش کا کئی بار اعادہ کر چکا تھا کہ ایل خان (ہلاکو خان) اپنی نگرانی اور سرپرستی میں علویوں کی حکومت قائم کرنے کی اجازت دے دے لیکن ہلاکو خان کی نظرِ التفات پھر چکی تھی۔ وہ ابن علقمی کو نہ تو جھڑکتا تھا اور نہ ہی اس پر خاص توجہ دیتا تھا۔ وہ چاہتا تو ابن علقمی سے یہ کہہ سکتا تھا کہ میں غداروں پر بھروسا نہیں کرسکتا لیکن دانا و بینا اور چالاک اور عیارترین منگول فاتح یہ کہہ کر اپنے اردگرد موجود بہت سارے غداروں کو چوکنا اور ہوشیار نہیں کرنا چاہتا تھا۔ یہ وہ غدار تھے جن سے حلب، دمشق اور قاہرہ کی تسخیر میں مدد لی جاسکتی تھی۔

ابن علقمی نے نسطوری مسیحی جاثلیق کے توسط سے ہلاکو خان کی مسیحی بیوی دوقوز سے ملاقات کرنا چاہی جو اپنے چوبی اور سنہری چیپل میں مصروف عبادت رہتی تھی لیکن وہ اس میں بھی ناکام رہا۔ دوقوز نے جاثلیق سے صاف صاف کہہ دیا۔ ''منگول فاتح کو جو میرا شوہر بھی ہے، یہ پسند نہیں کہ کوئی عورت اس کے کاروبارِ سیادت اور سیاست میں دخل انداز ہو۔ بغداد اور مسلمانوں پر جو کچھ بیت چکا اسے تقدیرِ الٰہی سمجھ کر ابن علقمی صبر کرے۔ مسلمانوں نے بغداد سے دور دراز دنیا تک صدیوں تک حکومت کی ہے اب جبکہ اللہ نے نااہلوں سے زمامِ حکومت چھین کر غیرمسلموں کے ہاتھ میں دے دی ہے، مسلمانوں کو اس پر صبر کرنا چاہیے اور اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔''

ابن علقمی کی آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا، وہ اپنے گھر میں روپوش ہوگیا اور اپنے مربی خلیفہ مستعصم باللہ کی موت کے دو ماہ بعد خود بھی مر گیا۔

وہ شاہراہ جو بغداد سے دمشق اور دمشق سے صحرائے سینائی کی مغربی حدود سے گزرتی ہوئی مصر میں داخل ہوجاتی تھی، ان دنوں خاصی آباد تھی۔ اہلِ بغداد پناہ کی تلاش میں اپنے گھوڑوں کو سرپٹ بھگائے چلے جارہے تھے۔ یہ لوگ قاہرہ کے گلی کوچوں میں پھیل گئے اور رو رو کر اپنے مصری بھائیوں کو بغداد کی تباہی اور بربادی کی داستانیں سنانے لگے۔ قاہرہ میں کہرام بپا ہوگیا۔ مصری اپنے گھروں سے نکل کر سڑکوں پر آگئے اور خانماں بربادوں کے چاروں طرف جمع ہوکر ان کی سرگزشت سننے لگے۔ آوارۂ وطن افراد کی فریاد میں بڑا درد تھا۔ سوز تھا، کرب تھا، تڑپ تھی۔ اس نے مصریوں کو بھی رلا دیا۔ مکانات کی کھڑکیوں، دروازوں، دیواروں اور چھتوں سے مصری عورتیں اور بچے جھانک اور دیکھ رہے تھے۔ تباہ حال مردوں کی نظریں بار بار در و دیوار پر نظر آنے والی مصری دوشیزاؤں اور عورتوں کی طرف اٹھ جاتیں اور ان کے دل دھڑکنے لگتے۔

اہلِ استطاعت اور صاحبِ مقدرت مصریوں نے اپنے گھروں کے دروازے کھول دیے اور اپنے مکانات کے کچھ حصے ان کے حوالے کر دیے۔ مصری مسلمان حکومت نے میدانوں میں خیمے نصب کرا دیے اور بقیہ کو ان میں منتقل کر دیا گیا۔ ان کے لیے پتھروں کے چولہے بنوا کر ان میں آگ جلائی گئی اور ان پر گوشت کی دیگیں چڑھا دی گئیں۔ بہت سارے چولہوں سے اٹھنے والا دھواں اوپر موٹی دھار کی طرح اٹھ کر فضا میں پھیل گیا۔

ان مہاجروں میں درداغ بھی شامل تھا۔ جب وہ علیہ اور صفیہ کو لے کر قاہرہ کی طرف بڑھ رہا تھا تو راستے میں لٹیروں کے ایک گروہ نے دونوں ہی کو چھین لیا۔ وہ اپنی جان بچا کے تنہا قاہرہ تک پہنچ گیا۔ ناکامیوں نے اس کے دل کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا تھا۔ حوصلے پست ہوچکے تھے۔ وہ دوسروں کی طرح اپنی داستان بھی نہیں سنا رہا تھا۔ اسے ان خانماں بربادوں پر غصہ آرہا تھا جو لڑے بھڑے بغیر اپنے ہم وطنوں اور ہم مذہبوں کو کٹوا کر اور اپنی حکومت گنوا کر چپ چاپ دم دبا کے بھاگ کھڑے ہوئے تھے۔

رات کو الاؤ جلائے گئے اور اس کے چاروں طرف مصری سامعین بیٹھ کر کسی نہ کسی بغدادی سے داستانِ عبرت و موعظت سننے لگے۔ چند مصریوں نے درداغ سے بھی درخواست کی کہ وہ کیوں چپ ہے؟ اپنی داستان کیوں نہیں سناتا؟

درداغ نے جواب دیا۔ ''دوستو! جس گھر کو گھر کے چراغ ہی نے جلا ڈالا ہو، اس کی داستان ہی کیا۔ افسوس کہ میں کچھ بھی نہیں سنا سکتا۔''

رات کو اس کے خیمے کے سامنے بہت بھیڑ اکٹھا

ہوگئی۔ وہاں ہنسی مذاق کی باتیں ہو رہی تھیں، قہقہے بلند ہو رہے تھے۔ درداغ کو ان ہنسنے والوں پر بڑا غصہ آرہا تھا۔ وہ دیر تک ہنسی اور قہقہوں کو برداشت کرتا رہا لیکن جب بات ناقابلِ برداشت ہوگئی تو وہ غصے میں بھرا ہوا ان مسخروں میں پہنچ گیا۔ یہاں بھی الاؤ کے چاروں طرف لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ اس ہجوم میں ایک عجیب وضع قطع کا آدمی بھی موجود تھا۔ تقریباً چھ فٹ کا یہ دیوقامت خود بھی ہنس رہا تھا اور دوسروں کو بھی ہنسا رہا تھا۔ اس کے بال سرخ تھے۔ کشادہ چہرہ دھوپ کا سنولایا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ ایک آنکھ کھلی ہوئی جس کی پتلی ادھر ادھر حرکت میں تھی۔ دوسری آنکھ پر گہرے زخم کا نشان تھا اور اس زخم میں اس کی آنکھ غائب ہوگئی تھی۔ جسم پر ریشمی لباس تھا۔ مخمل کی صدری، چوڑا کمربند، کمربند میں خنجر اڑسا ہوا۔

ان بیٹھے ہوؤں میں درداغ کھڑا ہوگیا۔ ان سب کی نظریں درداغ کی طرف اٹھ گئیں۔ سرخ بالوں والے ٹھوس جسم کے حامل شخص نے درداغ کی طرف دیکھ کر تالی بجائی۔

"لو ایک بھگوڑا اور آگیا۔"

اس کا لہجہ اتنا تمسخر آمیز تھا کہ سب کو ہنسی آگئی اور وہ سب درداغ کو دیکھ کر ہنسنے لگے۔

درداغ نے دانت پیستے ہوئے جواب دیا۔ "میں بھگوڑا نہیں، مہاجر ہوں اور ناساعد حالات میں رسول اللہ ﷺ نے بھی مکے سے مدینے کی طرف ہجرت کی تھی۔"

سرخ بالوں والے مسخرے نے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔ "لوگو! سنا تم نے، یہ بھگوڑا نہیں ہے، جبکہ میں نے اس کی بابت یہاں تک سنا ہے کہ اس کی تیز رفتار بھگائی تھی۔ اس کی دونوں محبوبائیں پیچھے رہ گئیں۔" اس نے سامعین کی طرف داد طلب نظریں ڈالیں اور قہقہہ لگا کر بولا۔ "دوڑ میں عورتیں مردوں کا مقابلہ نہیں کرسکتیں۔ اس کی دونوں محبوبائیں پیچھے رہ گئیں، جب اس کو ذرا ہوش آیا اور اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو پتا چلا کہ ان دونوں کو تو لے گئے ڈاکو اور یہ شخص اپنی قسمت کو روتا ہوا قاہرہ چلا آیا۔"

درداغ نے آگے بڑھ کر اس کا گریبان پکڑ لیا اور ایک جھٹکا دے کر بولا۔ "بند کر اپنی بکواس۔ ورنہ میں تجھے قتل کردوں گا۔"

سرخ بالوں والا زور زور سے ہنسنے لگا۔ "سبحان اللہ، خوب! دشمنوں کو چھوڑ کے یہ مجھے قتل کرنے قاہرہ چلا آیا۔ تیری غیرت مندی کی میں کس زبان سے تعریف کروں۔"

درداغ نے کوشش کی کہ اس مسخرے کو گرا دے مگر مسخرے نے درداغ کو ایک زوردار دھکا جو دیا تو درداغ آدمیوں کے سروں پر گر گیا۔ ایک زوردار قہقہہ بلند ہوا۔

مسخرے نے سب سے ایک ہی سوال کیا۔ "بھائیو! مقابلہ کیسا رہا؟ کون جیتا، کون ہارا؟ اور اب کون لڑے گا؟"

سرخ بالوں والے نے پھر ہنسی مذاق شروع کردیا، پوچھا..... "او دھکا مار نوجوان! تو کہاں سے آیا ہے؟"

درداغ نے اس کی طاقت کا اندازہ تو لگا ہی لیا تھا، بولا۔ "بھائی صاحب! میں بہت دل جلا شخص ہوں، مجھے ڈر ہے کہ کہیں میں......"

مسخرے نے پوچھا۔ "کہیں میں، کہیں میں تجھ کو پریشان تو نہیں کررہا ہوں؟"

درداغ نے اس کو ڈانٹ دیا۔ "بند کر اپنی بکواس ورنہ میں اٹھ کر دو چار لگا دوں گا۔"

مسخرہ بدستور ہنستا رہا۔ "اف خدایا! یہ مجھے دو چار لگا دے گا مگر میرا قصور؟ میری غلطی؟"

درداغ نے جواب دیا۔ "تیری غلطی یہ ہے کہ تو دوسروں کا مذاق اڑاتا ہے اور جہاں رونا چاہیے وہاں تو ہنستا ہے، قہقہے لگاتا ہے۔"

مسخرے نے ہنستے ہوئے کہا۔ "اگر میں نے کوئی غلطی کی ہے تو یہ سزا دینے کا اختیار تجھ کو کس نے دے دیا اور تیرا فیصلہ میں ماننے کیوں لگا؟"

درداغ اس سے عاجز آچکا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کس ڈھیٹ بے حس سے پالا پڑا ہے جو اپنے آگے کسی کی سنتا ہی نہیں۔ وہ عاجز آکر اپنے خیمے میں واپس جانے لگا تو مسخرے نے اس کا گریبان پکڑ لیا، بولا۔ "تو اس وقت تک یہاں سے نہیں جائے گا جب تک یہ نہ بتادے کہ تجھ کو سزا دینے کا اختیار کس نے دیا ہے؟"

درداغ نے اپنا گریبان چھڑانے کی کوشش کی، بولا۔ "معلوم نہیں تو کیسا جنگلی انسان ہے۔ خدا کے لیے مجھے معاف کردے، میرے پاس تیری کسی بات کا جواب نہیں۔"

مسخرے کی گرفت اور زیادہ مضبوط ہوگئی۔ "میں تجھ کو یوں نہیں جانے دوں گا۔ آخر تو کیا سمجھ کر میرے پاس آیا تھا؟"

درداغ نے چھڑانے کی کوشش کی تو پتا چلا اس کی گرفت بہت زیادہ مضبوط ہے اور اپنا گریبان چھڑا لینا اتنا آسان نہیں ہے۔

مسخرے اجنبی نے الاؤ کی روشنی میں اعلان کردیا۔ "لوگو! اس کا چہرہ غور سے دیکھو، یہ بغدادی نہیں ہے، یہ منگول ہے۔ اس کا چہرہ مہرہ تو دیکھو۔ میں نے سنا ہے کہ ہلاکو

خان نے بغداد پر حملے سے پہلے اپنا ایک ہراول دستہ بغداد میں داخل کر دیا تھا۔ اس ہراول دستے کا کام یہ تھا کہ بغداد میں یہ مشہور کرتا پھرے کہ ہلاکو خان اپنے تایا زاد بھائی برقائی کی طرح مسلمان ہو جانا چاہتا ہے اور اپنی بیٹی کی شادی امیر المومنین یا ان کے بیٹے ابوبکر سے کر دینا چاہتا ہے۔ اس طرح بغداد کے مسلمان اور خلیفہ خوش فہمی میں مبتلا ہو کر غافل ہو گئے اور دھوکے اور غفلت میں مبتلا بغداد کو تباہ و برباد کر دیا گیا۔ میرا خیال ہے یہ بھی منگول ہے اور ہلاکو خان اسی انداز اور ڈھنگ سے قاہرہ کو بھی فتح کرنا چاہتا ہے۔''

درداغ کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی، گھبرا کر بولا۔ ''میں منگول تو ہوں مگر میں ہلاکو خان کا بھیجا ہوا نہیں ہوں، میں مسلمان ہو چکا ہوں۔ اگر میں بغداد میں رہ جاتا تو ہلاکو خان مجھ کو بھی قتل کرا دیتا۔''

الاؤ کے گرد بیٹھے ہوئے لوگ مشتعل ہو کر کھڑے ہو گئے۔ بولے۔ ''تو یہ بات ہے، تو منگول ہے اور ہلاکو خان کا مخبر ہے تو یہاں بھی انتشار پھیلانے آ گیا ہے...... مارو......''

سب نے درداغ کو گھیر لیا اور اس پر ہر طرف سے حملہ ہونے ہی والا تھا کہ سرخ بالوں والا مسخرہ آڑے آیا، بولا۔ ''دوستو! اس کو مارنے میں عجلت سے کام نہ لو، ہو سکتا ہے یہ سچا ہو اور مسلمان ہو چکا ہو۔'' اس نے درداغ کا گریبان چھوڑ دیا، بولا۔ ''جا میں نے تجھے چھوڑ دیا لیکن یہ تجھ کو ثابت کرنا ہوگا کہ تو نے جو کچھ کہا سچ ہے۔ اگر تو یہ ثابت نہ کر سکا، تو یہاں کے لوگ تجھے ہلاک کر دیں گے۔''

درداغ کی تیزی طراری رخصت ہو چکی تھی، بالکل نرم پڑ گیا، آہستہ سے بولا۔ ''لیکن میں یہ ثابت کس طرح کروں گا کہ میں نے جو کچھ کہا سچ ہے، حالانکہ میں سچا ہوں۔''

سرخ بالوں والے اجنبی نے طنز کیا۔ ''سچا تو ہلاکو خان بھی تھا۔ جس نے سب کو دھوکا دیا اور ہلاک کر دیا۔ سچا تو بھی ہے۔ یہاں جھوٹا کون ہے، شاید کوئی بھی نہیں۔''

درداغ کے پاؤں زمین نے پکڑ لیے تھے۔ وہ جہاں کھڑا تھا، وہیں کھڑا رہ گیا۔

سرخ بالوں والا شخص پھر ہنسی مذاق میں مشغول ہو گیا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ''دوستو! یہ بغداد کے لوگ تو بالکل بے وقوف اور بزدل نکلے اگر میں وہاں ہوتا تو ہلاکو خان اور اس کی فوج کو وہ سزا دیتا کہ پھر کبھی ادھر کا رخ ہی نہ کرتا۔ پستو کی طرح مسل کے رکھ دیتا۔ یوں، یوں اس طرح۔'' اس نے انگلی سے مسل کر عملی مظاہرہ کیا۔

درداغ کو سن کر غصہ آ رہا تھا۔ اس کے جی میں آئی کہ کہہ دے ہلاکو خان اور منگول اتنے کمزور نہیں ہیں کہ تجھ جیسا مسخرہ اس کو مسل دے لیکن وہ یہ بات کہہ نہیں سکا محض اس لیے کہ یہ مسخرہ کہیں دوبارہ اس کو کسی مشکل میں نہ مبتلا کر دے۔

کسی نے سوال کیا۔ ''جناب والا! کیا ہلاکو خان اور اس کی فوج کو واقعی پستو کی طرح مسلا جا سکتا ہے؟''

مسخرے نے حیرت سے اس سوال کرنے والے کو دیکھا۔ ''اس واقعی کا کیا مطلب ہے صاحبزادے! اللہ نے چاہا تو میں یہ کر کے دکھاؤں گا۔ تم فکر نہ کرو۔ میں جو کہتا ہوں کر دکھاتا ہوں کیونکہ یہ کام اتنا مشکل بھی نہیں جتنا مشکل سمجھا گیا ہے۔''

درداغ کا خون کھول رہا تھا۔ وہ اپنے خیمے میں واپس جانا چاہتا تھا لیکن مسخرے کی موجودگی میں ہمت نہیں پڑ رہی تھی۔

مسخرہ شیخیاں بگھارتا رہا۔ سب لطف اندوز ہوتے رہے۔ درداغ موقع کی تلاش میں تھا۔ وہ اس مسخرے کو بتانا چاہتا تھا کہ باتیں بنانا الگ ہے اور کام کر دکھانا الگ۔ مسخرہ باتیں بنا کے ایک طرف چل دیا۔ درداغ نے اس کا پیچھا کیا۔ وہ دونوں آگے پیچھے چلتے رہے۔ راستے کے دونوں طرف مکانات کے سلسلے تھے۔ جب ان مکانات کا سلسلہ ختم ہو گیا تو وہ دونوں ذرا فاصلے پر ایک میدان میں سفر کرنے لگے۔ اس سنسان میدان میں کئی جگہ درداغ نے یہ سوچا کہ وہ اپنے گھوڑے کو تیزی سے آگے بڑھا کے اس مسخرے کو روک لے اور دعوتِ مبارزت دے دے لیکن پھر ٹال گیا۔ آخر یہ دونوں درختوں کے سائے میں پہنچ گئے۔ یہاں مسخرہ اچانک مڑا اور اپنے گھوڑے کو درداغ کے پاس لے گیا، پوچھا۔ ''تو میرا پیچھا کیوں کر رہا ہے؟''

درداغ نے جواب دیا۔ ''تو نے یہ اچھا کیا جو خود میرے پاس آ گیا ورنہ میں خود اپنا گھوڑا تیرے سامنے لے آتا۔''

مسخرے نے ہنستے ہوئے پوچھا۔ ''وہ کیوں...... وجہ؟ مجھ سے کوئی کام؟''

درداغ نے جواب دیا۔ ''تو نے ایک ہجوم کے سامنے میری بے عزتی کی ہے، میں تجھ کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ میں نے اپنی زندگی میں باتیں کم اور کام زیادہ کیا ہے۔ میں نے خطرناک ترین جنگیں لڑی ہیں۔ میں تجھ کو قتل نہیں کروں گا مگر مقابلہ کر کے یہ ضرور بتاؤں گا کہ میں کوئی معمولی آدمی نہیں ہوں۔''

مسخرے نے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔ ''مجھ سے

مقابلہ کرے گا؟ خوب! میں تیار ہوں لیکن میں تجھ کو قتل بھی کرسکتا ہوں۔ میں معاف نہیں کروں گا اور میں تجھ سے بھی یہی کہوں گا کہ تو مجھے رعایتیں نہیں دے گا۔''

درداغ کو غصہ تو بہت آرہا تھا مگر بڑے تحمل سے جواب دیا۔''مسخرے! میں واقعی مسلمان ہوچکا ہوں اور اپنے ہاتھ سے کسی مسلمان کو قتل نہیں کرنا چاہتا۔''

مسخرے نے تلوار کھینچ لی، بولا۔''واہ وا! چاندنی میں تلواروں کی شپاشپ اور چھنا چھن۔ کیا مزہ آئے گا، خوب!''

درداغ نے بھی تلوار کھینچ لی، بولا۔''تو ضرورت سے زیادہ خوش فہم ہے۔ سنبھال میرا وار اور چکھ موت کا مزہ۔''

مسخرے نے وار خالی دیا اور درداغ پر جوابی حملہ کردیا۔ درداغ بھی ایک طرف ہٹ گیا۔

درداغ نے گھوڑے کی پشت پر لیٹ کر گھوڑے کو ایڑ لگائی اور اپنی تلوار کی نوک مسخرے کے پیٹ میں اتار دینی چاہی لیکن مسخرے نے کافی پیچھے ہٹ کر خود کو محفوظ رکھا اور درداغ کی تلوار پر ایک ایسی ضرب لگائی کہ وہ درداغ کے ہاتھ سے چھوٹ کر دور جاگری۔ درداغ نہتا رہ گیا۔ مسخرہ برق سرعت سے درداغ کے سر پر پہنچ گیا اور اپنی تلوار کی نوک درداغ کی گردن پر رکھ دی، بولا۔''میں چاہوں تو تیرے اسی وقت دو ٹکڑے کردوں۔'' وہ دونوں گھوڑوں سے نیچے اتر آئے۔

درداغ بڑے کرب سے چلایا۔''او مسخرے! تو رعایت نہ کر، مجھے قتل کردے کیونکہ اب یوں بھی زندگی میں مزہ باقی نہیں رہا۔''

مسخرے نے اپنی تلوار بھی پھینک دی اور درداغ سے ہاتھا پائی کرنے لگا، بولا۔''میں تجھ کو یوں بھی زیر کرسکتا ہوں۔''

درداغ بھی اس سے کشتی لڑنے لگا، دونوں کچھ دیر تو کشتم کشتا رہے، اس کے بعد درداغ مسخرے سے ہار گیا۔ مسخرے نے اپنے دونوں ہاتھ درداغ کے گلے پر رکھ دیے، بولا۔''میں چاہوں تو گلا گھونٹ کر تجھ کو ہلاک کردوں لیکن جیسا کہ میں نے فیصلہ کیا تھا، اس پر عمل نہیں کرسکوں گا۔''

درداغ کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ اس نے مسخرے کی انگلیوں میں لوہے جیسی سختی محسوس کی۔

مسخرے نے اسے چھوڑ دیا اور کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔''میں چاہوں تو اسی طرح ہلاکو خان کو بھی پچھاڑ دوں۔''

درداغ شرمندہ تھا، وہ مسخرے کو اتنا طاقتور نہیں سمجھتا تھا۔

مسخرہ ایک دم سنجیدہ ہوگیا، پوچھا۔''تیرا نام کیا ہے؟''

شاید درداغ۔ میں تجھ سے ایک بار پھر ملوں گا، اپنی تلوار اٹھا اور اپنے خیمے کی راہ لے۔ میں تجھ کو اور زیادہ شرمندہ نہیں کروں گا۔''

درداغ نے تلوار تو اٹھالی لیکن اب وہ بہت زیادہ شرمسار تھا۔ اس نے مسخرے کے آگے سر جھکا دیا، بولا۔''تو تلوار کا دھنی اور طاقت کا پیکر ہے۔ میں ناکامی کا داغ لے کر زندہ نہیں رہ سکوں گا۔''

مسخرے نے جواب دیا۔''میں تجھ سے ایک بار اور ملوں گا۔ تو زندہ رہ کیونکہ میں تجھ کو منگولوں کے سامنے لے جاؤں گا اور تجھ کو یہ بتاؤں گا کہ انسانوں کو شکست دی جاسکتی ہے۔ منگول بھی انسان ہیں ہمارے تمہارے جیسے۔''

اس کے بعد مسخرے نے تلوار کو ہوا میں اچھالا اور جب وہ کافی بلندی سے واپس آئی تو اسے اپنے دانتوں پر روک لیا، بولا۔''تلوار میری کنیز ہے، میرا کوئی بھی عضو اس کے لیے اجنبی نہیں۔''

درداغ کو شاید پہلی بار یہ احساس ہوا کہ مسخرہ کوئی معمولی آدمی نہیں ہے۔ مسخرے نے اپنے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور پلک جھپکتے ہی نظروں سے اوجھل ہوگیا۔ درداغ غبارِ پس سوار پر اس وقت تک نظریں جمائے رہا جب تک وہ نظر آتا رہا۔ پھر وہ بھی اپنے خیمے کی طرف واپس چل پڑا۔ لیکن اس کے گھوڑے کی رفتار میں تیزی نہیں تھی۔ وہ آہستہ آہستہ اپنے خیمے کی طرف جارہا تھا۔ اس کے گھوڑے کی سست رفتار میں شرمندگی تھی۔

جب وہ اپنے خیمے کے پاس پہنچا تو دیکھا لوگ اس کا انتظار کررہے ہیں۔ اس ہجوم میں چند وہ بھی تھے جو درداغ سے اچھی طرح واقف تھے اور یہ بھی بغداد سے بچ بچا کے قاہرہ تک پہنچنے میں کامیاب ہوگئے تھے۔ ان لوگوں نے ہجوم کو بتایا کہ درداغ نومسلم منگول ہے اور اس کے اسلام کو شک وشبہے سے نہیں دیکھا جاسکتا۔ انہیں بغداد کی بربادی نے دولتِ یقین سے محروم کردیا تھا۔ وہ درداغ پر یقین کرنے کو تیار نہ تھے۔

درداغ اپنے شناساؤں کو خیمے میں لے گیا اور ان سے مشورہ طلب کیا کہ ان حالات میں اسے کیا کرنا چاہیے؟

درداغ نے خود ہی جواب دیا۔''میرے سامنے دو راستے ہیں۔ میں یہاں کے سلطان سے ملاقات کرکے اس کو منگولوں کے خلاف لشکر کشی پر آمادہ کروں۔ دوسری تجویز یہ ہے کہ میں ہر طرف سے مایوس ہوکر خودکشی کرلوں۔''

اس کے ایک شناسا نے درداغ کے منہ پر ہاتھ رکھ

دیا۔ ''بزدلی کی بات نہیں کرتے۔ ہم ایک بار فیصلہ کن جنگ ضرور کریں گے۔''

دوسرے نے مشورہ دیا۔ ''ہمیں جلد از جلد سلطان سے مل کر اس کا عندیہ معلوم کرنا ہے کہ وہ منگولوں سے خوفزدہ ہے یا پھر مقابلہ کرنا چاہتا ہے؟ جب تک اس سوال کا ہمیں جواب نہ مل جائے۔''

درداغ کی نیند اڑ چکی تھی۔ وہ رات بھر جاگتا رہا۔ جب صبح آئینے میں اپنی شکل دیکھی تو اس نے خود کو بھتوں کا بیمار محسوس کیا۔ وہ جامع قاہرہ میں ظہر کی نماز پڑھنے گیا تو مسلمانوں کے عظیم الشان اجتماع نے اس کو بہت خوش کر دیا۔ یہ ڈرے سہمے لوگ خود کو یہاں محفوظ سمجھ رہے تھے۔ نماز کے بعد وہ لکڑی کے ایک صندوق پر کھڑا ہو گیا، بولا۔ ''حضرات! آپ لوگ ابھی رکیں، میں آپ سے چند باتیں کرنا چاہتا ہوں۔''

بڑھتے چلتے قدم رک گئے۔ درداغ نے کہا۔ ''جیسا کہ آپ لوگ خود بھی یہ محسوس کر رہے ہوں گے کہ میں ایک نو مسلم ہوں......''

ایک متمول مصری نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''بس بس، میں تیرا مقصد پا گیا۔'' اس نے اپنے پیچھے کھڑے ہوئے غلام سے کہا۔ ''یہ اپنے اسلام کے نام پر غالباً مالی امداد چاہتا ہے۔ اس کو میری طرف سے ہزار دینار دے دینا۔''

درداغ نے غصہ پی لیا، بولا۔ ''میں بھکاری نہیں ہوں۔ تم لوگ میری پوری بات تو سن لو۔''

متمول مصری نے حقارت سے کہا۔ ''تو اپنی بات پوری کر، کیوں ہمارا قیمتی وقت برباد کر رہا ہے۔''

درداغ نے کہا۔ ''میں اس شہر میں اجنبی نو وارد ہوں، میں سلطان سے ملنا چاہتا ہوں۔''

لوگ ہنسنے لگے، بولے۔ ''بس اس ذرا سی بات کے لیے تو نے ہمیں روکا تھا، خوب!''

اس پر اور زیادہ قہقہہ پڑا۔ ایک نے کہا۔ ''باتیں ایسی کرتا ہے گویا بہت بڑا فلسفی ہے کہ ہم اس کی باتیں سمجھ ہی نہیں سکتے۔ سلطان سے ملنا ہے تو اس کے محل میں جا، ملاقات ہو جائے گی۔''

درداغ نے جواب دیا۔ ''وہاں میں کس سے بات کروں گا۔ محل کے دربان شاید مجھ کو وہاں کھڑا بھی نہ ہونے دیں۔''

ایک نے پوچھا۔ ''اگر تجھ کو سلطان سے ملوا بھی دیا جائے تو، تو اس سے بات کیا کرے گا؟''

درداغ نے کہا۔ ''لوگو! میری باتیں غور سے سنو۔ تم نے بغداد کو تباہی سے پہلے اور بربادی کے بعد نہیں دیکھا۔ اب منگول ادھر کا رخ کرنے والے ہیں۔ اگر عجلت اور ہوشیاری سے کام نہ لیا گیا تو بغداد کی بربادی اور تباہی یہاں تک آ جائے گی اور ہنستے مسکراتے، قہقہے لگاتے شہر کو نظرِ بد کھا جائے گی۔''

متمول مصری نے پوچھا۔ ''تو ٹھہرا کہاں ہے؟''

درداغ نے جواب دیا۔ ''شہر خیام (خیموں کے شہر) میں۔''

متمول مصری نے کہا۔ ''میں تجھے سلطان سے ملوا دوں گا۔ میرا غلام تیرا ٹھکانا دیکھ لے گا اور پھر میں تجھ کو بلوا لوں گا۔''

درداغ نے اس کا شکریہ ادا کیا اور اس کے غلام کو اپنے خیمے تک لے گیا۔ اس نے غلام کے ساتھ بڑی خوش اخلاقی برتی تاکہ وہ دوبارہ خوش خوش اس کے پاس آئے۔

درداغ کو چار دن اور چار راتیں بڑے کرب میں گزارنا پڑیں۔ شاید متمول مصری اسے بھول چکا تھا۔ پانچویں دن دوپہر سے ذرا پہلے اس کا غلام اچانک درداغ کے پاس پہنچ گیا، بولا۔ ''فوراً چلیے، میرا آقا آپ کو یاد کر رہا ہے۔''

درداغ جس حال میں تھا، اسی میں چل پڑا۔ غلام اس کو ایک شاندار محل میں لے گیا۔ یہاں صدر دروازے پر کئی دربان پہرا دے رہے تھے۔ ان دربانوں کا لباس سرخ تھا۔ حبش سے تعلق رکھنے والے سیاہ فام دربان جن کے موٹے موٹے سیاہ ہونٹوں کے بیچ سفید دانت یوں چمک رہے تھے گویا افیون کے گولے میں روئی کے پھائے چپکا دیے گئے ہوں۔ ان سیاہ فام سرخ لباس دربانوں نے درداغ کو روک لیا اور جب تک اندر سے متمول مصری کی اجازت حاصل نہ کر لی گئی، اس کو اندر نہیں جانے دیا گیا۔

متمول مصری ایک کمرے میں قیمتی قالین پر غالیچہ بچھائے اس پر براجمان تھا۔ اس نے درداغ کو دیکھ کر اپنے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ پیدا کی اور پوچھا۔ ''ہاں اے نو مسلم! اب بتا بغداد پر تباہی سے پہلے اور بربادی کے بعد کیا بیتی؟''

درداغ نے بغداد میں جو اتار چڑھاؤ، نشیب و فراز اور بزدلی اور بہادری دیکھی تھی، بڑے دل نشین پیرائے میں بیان کر دی۔ مصری متمول بڑے انہماک سے سنتا رہا پھر پوچھا۔ ''کیا یہ درست ہے کہ وہ وحشی قوم جس نے بغداد کو برباد کر دیا، ہماری طرف آ رہی ہے؟''

درداغ نے جواب دیا۔ ''میں جھوٹ کیوں بولوں گا۔''

متمول مصری خوفزدہ نظر آ رہا تھا۔ پھر اس وحشی قوم کو

روکا کس طرح جائے؟"

درداغ نے جواب دیا۔ "میں سلطان مصر سے اسی لیے ملنا چاہتا ہوں کہ وہ ان وحشیوں کا مقابلہ کرے اور ان کے کسی قول اور قرار پر یقین نہ کرے۔"

متمول مصری نے بڑی عاجزی سے کہا۔ "بہر حال میں تو بس اتنی سی بات جانتا ہوں کہ ان وحشیوں کو یہاں آنے نہ دیا جائے۔ ورنہ یہ آنے والے آگ اور دھوئیں میں سے اس وقت نکلیں گے جب قاہرہ جل کر برباد ہو چکا ہوگا۔"

درداغ نے اس سے پورا پورا اتفاق کیا۔ متمول مصری نے درداغ کو خوب خوب کھلایا پلایا، اس کے بعد اس نے بتایا۔ "سلطان نے آج مغرب کے بعد کا وقت ملاقات کے لیے دیا ہے۔"

درمیانی وقت گزارنا بہت مشکل تھا مگر متمول مصری نے یہ مشکل بھی آسان کر دی اور حسین ترین رقاصاؤں کا ایک طائفہ اس کے سامنے لا کھڑا کیا۔ درداغ نے انہیں دیکھا تو اسے علیہ اور صفیہ یاد آ گئیں۔ اس کے دل پر ایک گھونسا سا لگا اور وہ سر جھکا کر بیٹھ گیا۔

متمول مصری نے ایک رقاصہ کو اشارے سے حکم دیا۔ "اس نوجوان کے پاس جا اور اس کو اس محفل میں واپس لا۔"

درداغ نے اس یونانی رقاصہ کے بے داغ روشن چہرے پر ایک پرکشش سحر سا محسوس کیا۔ اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور متمول مصری سے احتجاج کیا۔ "مصری دوست! میں یہاں یہ سب دیکھنے نہیں آیا۔ یہ سب کیا ہو رہا ہے؟"

متمول مصری کو درداغ کی گھبراہٹ مزہ دے رہی تھی، بولا۔ "نومسلم نوجوان! اگر تو نے اس محفل میں میرا ساتھ نہ دیا تو میں بھی تجھ سے ناراض ہو کے تجھ کو نکال باہر کروں گا۔"

درداغ نے اپنا سر پکڑ لیا۔ "آپ لوگ میری بات سمجھتے کیوں نہیں۔ میں کہتا ہوں انہی باتوں نے، اسی ماحول نے یہ گل کھلایا ہے کہ بقیۃ السیف دربدر کی ٹھوکریں کھاتے، خاک چھانتے پھر رہے ہیں۔"

متمول مصری کی تیوریوں پر بل پڑ گئے۔ اس نے تالی بجا کر آواز دی۔ "اس نے حد کر دی، ہر لحظہ خوشی کو یہ شخص اداس اور پریشان کن بنا دیتا ہے۔ یہ اس کو ہو کیا گیا ہے۔"

پھر اپنی جگہ سے اٹھا اور درداغ کی ٹھوڑی کو اوپر اٹھا کر پوچھا۔ "کیا بات ہے جوان؟ ابھی وحشی نہیں آئے جاتے۔ ابھی تو اپنا غم غلط کر۔ بعد میں وحشیوں کے غم کا مداوا بھی ہو جائے گا۔"

درداغ نے جواب دیا۔ "میں تکلفاً کچھ کھا تو لوں گا مگر پیوں گا نہیں۔"

اس دوران یونانی رقاصہ نے اپنے ہاتھ کا جام ایک ادائے دل نشیں سے درداغ کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ مسکراتی ہوئی بولی۔ "پی لے جوان! اس میں وہی کچھ بھرا ہے جس کا جنت میں دیے جانے کا وعدہ کیا گیا ہے۔"

درداغ نے سوچا۔ میں کس مصیبت میں پھنس گیا۔ ہاتھ سے جام کو ایک طرف کر دیا۔ "میں نہیں پیتا، ایک عرصے سے نہیں پیتا۔"

رقاصہ نے اپنے ہاتھ کا جام دوبارہ درداغ کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ "بس ایک بار اور۔ زیادہ نہیں، بس ایک۔"

درداغ نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ "میں جانا چاہتا ہوں۔ اب میں یہاں نہیں رکوں گا۔"

مصری متمول نے رقاصہ کے ہاتھ کا جام لیا اور غٹا غٹ چڑھا گیا، بولا۔ "میرا تیرا ساتھ نہیں ہو سکتا۔ ساتھ کے لیے... ہم مشربی ضروری ہے اور تو میرا ہم مشرب بن نہیں سکتا۔"

درداغ جہاں تھا وہیں سجدے میں گر گیا، بولا۔ "اے میرے رب! انہیں ہوش و حواس میں لا۔ کہیں یہ لوگ مصر اور قاہرہ کو فروخت نہ کر دیں۔ انہیں عقل و شعور دے تاکہ اچھے برے کی تمیز کر سکیں۔"

مصری متمول نے بہکتے ہوئے درداغ کی طرف دیکھا اور محبت سے اپنے گلے لگا لیا، بولا۔ "جان من! یہ تمہارے چہرے پر مونچھ کہاں سے آ گئی؟ خوب، بڑی اچھی لگ رہی ہے۔"

درداغ نے بمشکل اپنے آپ کو آزاد کرایا اور وہاں سے اٹھ کر ایک گوشے میں الگ تھلگ جا بیٹھا۔ مست و بے خود ہونے کے بعد سب ڈھے گئے۔ درداغ نے تالی بجا کر ایک غلام کو طلب کیا جو فوراً ہی آ گیا اور پوچھا۔ "کوئی حکم؟"

درداغ نے جواب دیا۔ "مجھ کو یہاں سے نکال لے چل، میں تھک سا گیا ہوں۔"

غلام نے کہا۔ "اپنے آقا سے پوچھ لوں پہلے...... اس کے بعد......"

وہ نشے میں بدمست اپنے آقا کے پاس گیا اور اس نے درداغ کی بابت اجازت طلب کی مگر وہ اس لائق ہی کہاں تھا کہ کوئی بات سمجھتا اور انکار کر دیتا یا اجازت دے دیتا۔ غلام نے کہا۔ "جناب! میں مجبور ہوں۔"

درداغ نے پوچھا۔ "پھر میں کب تک یہاں رہوں گا؟"

غلام نے جواب دیا۔ "اس وقت تک، جب تک میرا

آقا ہوش میں نہ آجائے اور یہاں سے جانے کی آپ کو اجازت نہ دے دے۔''

درداغ نے بے بسی سے پوچھا۔''اس وقت تک میں کیا کروں؟''

غلام نے جواب دیا۔''بے پیے ہی ان میں شامل ہوجایئے۔''

درداغ نے غلام کے جواب پر غور کیا اور پھر خود بھی سر نیوڑا کر پڑ رہا۔ ایسا لگتا تھا، گویا وہ خود بھی نشے میں بدمست، حال سے بے حال فرش پر ڈھیر ہو چکا ہے۔ وہ سو گیا، اسے ایسی گہری نیند آئی کہ جب اس کے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے گئے اور اس نے بیدار ہونے کی کوشش کی تو بڑی تکلیف محسوس کی۔ مصری متمول اس کے پاس بیٹھا تھا اور پوچھ رہا تھا۔''اجنبی نوجوان! یہ تو نے کب پی تھی؟''

درداغ جاگ گیا اور اپنے میزبان کو دیکھ کر شرما سا گیا۔ مصری متمول نے پوچھا۔''تو نے بتایا نہیں کہ تو نے کب پی تھی؟''

درداغ نے جواب دیا۔''مجھے یاد نہیں آرہا کہ میں نے کب پی تھی، بس پی لی تھی میں نے۔''

مصری متمول نے اس کے کاندھے پر اپنا ہاتھ رکھ دیا اور اس کو اپنے ساتھ ایک دوسرے کمرے میں لے گیا، بولا۔''بخدا میں نے اپنے دل میں یہ عہد کرلیا تھا کہ اگر میرے کہنے سے پیے گا نہیں، تو میں بھی تجھ کو سلطان سے نہیں ملواؤں گا، مگر خدا کا شکر ہے کہ تو نے میری بات مان لی۔ اب میں تجھ کو سلطان کے پاس لے جاؤں گا اور تیری ملاقات سلطان سے کرادوں گا۔''

شام کو مغرب کے بعد مصری متمول درداغ کو سلطان کے محل لے گیا۔ یہاں دربانوں نے انہیں روکا لیکن پھر اندر چلا جانے دیا۔ محل کے اندر کی شان و شوکت اور آرائش و زیبائش دیکھنے والوں کو اپنے رعب میں لے لیتی تھی۔

اندر ایک سبزہ زار تھا اور اس سبزہ زار میں جگہ جگہ فوارے نصب تھے۔ مختلف جانوروں کی شکل میں اور ان کے منہ سے پانی مینہ کی طرح برس رہا تھا۔ ایک جگہ اس نے ایک گھڑسوار کو حرکت میں دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں نیزہ تھا اور ایسا لگتا تھا کہ وہ اپنے دشمن پر نیزے سے حملہ کرنے ہی والا ہے۔ وہ دونوں اس سوار کے پاس سے گزرتے ہوئے ایک دیوان کے سامنے جا کھڑے ہوئے۔ دیوان کے اندر سامنے کی دیوار میں روشن دان سے بنے ہوئے تھے۔ متمول مصری نے سرگوشی میں کہا۔''ان سوراخوں کے پیچھے سے سلطان کے آدمی ہمیں دیکھ رہے ہوں گے اور جب وہ بالکل مطمئن ہوجائیں گے تو ہمیں دیوان میں داخلے کی اجازت مل جائے گی۔''

ان دونوں کو بڑی دیر تک باہر ہی رکنا پڑا۔ شمعیں روشن تھیں اور ان کی تیز روشنی میں اپنے گرد و پیش کی ہر شے بہ آسانی دیکھی جاسکتی تھی۔ محل کے در و دیوار سے اس طرح روشنی پھوٹ رہی تھی جس طرح ہر بن مو سے پسینے کی بوندیں پھوٹ نکلتی ہیں۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد انہیں دیوان میں داخلے کی اجازت دے دی گئی۔ اندر پھول دار فرش پر شاندار قیمتی قالین اور غالیچے بچھے ہوئے تھے اور دیواروں کو مشجر پردوں سے ڈھانپ دیا گیا تھا۔ ان مشجر پردوں پر مختلف پرندوں کی شبیہیں بڑی استادانہ مہارت سے بنائی گئی تھیں، درداغ ان میں کھو گیا۔

مصری متمول نے اپنا شانہ درداغ سے ٹکرا دیا اور سرگوشی میں کہا۔''اپنے ہوش و حواس میں رہ۔ مبادا سلطان کسی طرف سے نمودار ہوجائے اور تو اپنی محویت میں اس کا احترام بھی نہ کرسکے۔''

درداغ ہوش میں آگیا۔ کچھ دیر بعد فرش کے اندر سے انسان نمودار ہونے لگے اور انہوں نے دونوں کو بتایا کہ سلطان تشریف لا رہے ہیں، آپ دونوں مودب کھڑے ہوجائیں۔

مصری متمول اور درداغ مودبانہ کھڑے ہوگئے، بالآخر سلطان بھی نمودار ہوگیا۔ درداغ کن انکھیوں سے سلطان کو دیکھ رہا تھا۔ اس نے پہلی ہی نظر میں یہ تو اندازہ لگالیا کہ یہ سلطان بغداد کے خلیفہ مستعصم باللہ جیسا ہرگز نہیں۔

دو آدمی سلطان اور ان دونوں کے درمیان کھڑے ہوگئے۔ سکوت اتنی دیر طاری رہا کہ درداغ کو شبہ گزرا کہ شاید پورا وقت خاموشی ہی میں گزر جائے گا۔

آخر ایک آدمی نے بہ آوازِ بلند پوچھا۔''سلطان معظم دریافت فرما رہے ہیں کہ بغداد کا مفرور مجھ سے کیوں ملنا چاہتا ہے؟''

مصری متمول نے درداغ کو کہنی ماری۔''جواب ذرا ہوشیاری سے دینا، کم سے کم لفظوں میں۔''

درداغ نے جواب دیا۔''سلطان معظم! اس ناچیز نے بغداد کو کئی سال پہلے سے برباد ہوتے دیکھا ہے، اہالیانِ بغداد کاہل، غافل اور قانع تھے۔ ان کی ہمتیں ان کا ساتھ چھوڑ چکی تھیں اور ان کے حکمران عقلوں سے محروم تھے۔''

ترجمان نے ٹوک دیا۔ ”اختصار...... اختصار۔“
مصری متمول نے ایک بار پھر کہنی ماری۔ ”اختصار۔ کیا تو سن نہیں رہا؟“

درداغ نے جواب دیا۔ ”سن لیا بھائی سن لیا بلکہ سن رہا ہوں۔“

ترجمان نے کہا۔ ”بیان جاری رہے۔“

درداغ نے کہنا شروع کر دیا۔ ”سلطان عالی مقام! وہاں دو جنگیں لڑی گئیں۔ ایک خاموش جنگ، دوسری ہتھیاروں کی جنگ۔ خاموش جنگ غداروں اور ہراول دستوں کی مدد سے لڑی اور جیتی گئی اور پھر آخری ضرب ہتھیاروں سے لگائی گئی اور دیکھتے ہی دیکھتے اندرونی اور بیرونی بغداد خاک و خون اور آگ اور دھوئیں میں ڈوب گیا۔“

ترجمان نے پوچھا۔ ”تو کون ہے؟“

درداغ نے جواب دیا۔ ”میں نسلاً اور نسباً منگول ہوں مگر مذہباً مسلمان۔ میری ساری ہمدردیاں مسلمانانِ عالم اور اسلام سے ہیں۔“

متمول مصری دونوں ترجمانوں کے درمیان کسی مجسمے کی طرح ساکت و صامت کھڑا... ان کی باتیں سن رہا تھا۔

اس نے دونوں ترجمانوں کے اس پار موجود سلطان کو دیکھنے کی کوشش کی مگر نہیں دیکھ سکا کیونکہ وہاں اتنی زیادہ روشنی نہیں تھی۔

سلطان کے ایک ترجمان نے درداغ سے پوچھا۔ ”سلطان معظم یہ جاننا چاہتے ہیں کہ تو یہاں کیوں آیا ہے؟“

درداغ نے جواب دیا۔ ”اس سے پہلے میں نے امیر المومنین مستعصم باللہ کو چند مشورے دیے تھے مگر افسوس کہ ان پر توجہ نہیں دی گئی۔ اگر ان پر توجہ دی جاتی اور عمل کیا جاتا تو شاید مسلمانانِ بغداد کا یہ حشر نہ ہوتا۔“

ترجمان نے ان دونوں کو وہیں کھڑا رکھا اور سلطان کچھ بتائے بغیر چلا گیا۔ بعد میں ترجمان نے ان دونوں کو مطلع کیا کہ سلطان ان دونوں سے ایک بار اور ملے گا اور پھر یہ فیصلہ کرے گا کہ اسے درداغ کی کوئی ضرورت ہے یا نہیں۔

جب یہ دونوں محل سے باہر نکلے تو راستے میں ان دونوں نے منگولوں کے ایک وفد کو محل کی طرف جاتے ہوئے دیکھا۔ بھورے سمور کی ٹوپیاں ان کے سروں پر تھیں اور بھیڑ کی کھالوں کا لباس پہنے جسم پر ہتھیار سجائے نہایت اطمینان اور بے پروائی سے سلطان کے محل کی طرف چلے جا رہے تھے۔

درداغ نے انہیں دیکھا تو مشتعل ہو گیا۔ اس نے وفد سے کہا۔ ”بغداد کو تو تباہ و برباد کر چکے، اب یہاں کیا لینے آئے ہو؟“

وفد کا سردار مسکرایا۔ جواب دیا۔ ”ناقابلِ شکست ایل خان (ہلاکو خان) کا تم لوگوں کے لیے نام ہی کافی ہے مگر ہمیشہ......“

وہیں کسی طرف سے مسخرہ بھی نمودار ہو گیا۔ وہ اپنے گھوڑے پر سوار اچانک سامنے آ گیا تھا۔ اس نے منگولوں سے پوچھا۔ ”تم لوگ کس کے پاس آئے ہو؟“

وفد کے سردار نے جواب دیا۔ ”ہم ایل خان کے نمائندے ہیں اور تجھ سے یہ خواہش کریں گے کہ ہمارے سردار کی کسی جگہ بھی اہانت نہ ہو۔“

مسخرے نے کہا۔ ”میں مصر کے سلطان کا ایک ادنیٰ فرماں بردار ہوں، جب مجھے حاضری کا حکم دیا جاتا ہے تو میں حاضر ہو جاتا ہوں۔ اس وقت بھی مجھے طلب کیا گیا ہے، آپ لوگوں کے ساتھ میں بھی وہیں چلتا ہوں۔“

شاید ہلاکو خان کے وفد کے لوگ اس مسخرے سے بات کرنے میں اپنی سبکی محسوس کر رہے تھے۔ وفد کے سردار نے اس پر سرسری سی نظر ڈالی اور درداغ سے کہا۔ ”درداغ! تو بدنام زمانہ انسان ہے۔ تو بغداد سے بھاگ کر مصر چلا آیا۔ کل جب ہم مصر بھی فتح کر لیں گے تو، تو کہاں جائے گا؟“

مسخرے نے درداغ کو غور سے دیکھا، پوچھا۔ ”کیا واقعی تو بھگوڑا ہے؟“

درداغ نے غصے میں جواب دیا۔ ”میں بھگوڑا نہیں ہوں۔ اس بار اللہ نے چاہا تو میں ان لوگوں کا مقابلہ کروں گا اور وہ سبق دوں گا......“

لیکن وفد کے منگول سردار نے اس کی بات ہنسی میں اڑا دی۔

مسخرے کو غصہ آ گیا، بولا۔ ”اے سردار! اس وقت تم مصر کی سرزمین پر ہو اور تمہیں یہ حق نہیں دیا جائے گا کہ تم یہاں کے کسی آدمی کا مذاق اڑاؤ۔“

وفد کے سردار نے ایک قہقہہ لگایا، بولا۔ ”مسخرے! ہم لوگ وہ ہیں جو حق مانگتے نہیں، چھین لیتے ہیں اور تجھ سے یہ کس نے کہہ دیا کہ سرزمین مصر تیری ہے، یہ بھی ہماری ہے اس پر تم لوگ اسی وقت تک آباد اور قابض ہو جب تک ہم تمہیں اس کی اجازت دیے ہوئے ہیں پھر جس دن ہم چاہیں گے، تم لوگوں کو یہاں کی بساط سے اٹھا کر بساطِ عدم میں پھینک دیں گے۔“

مسخرے کو نو واردان سے اس قسم کی بات چیت کی توقع نہیں تھی۔ وہ وفد کے سردار کو حیرت و تعجب سے دیکھتا رہ گیا پھر بولا۔ ”مصر کے سلطان! تجھ کو اس بڑبولے منگول کی

بات کا جواب دینا پڑے گا۔ ورنہ اس کا جواب میں دوں گا اور ان مغروروں اور احمقوں کو یہ بتادوں گا کہ میں سرزمین مصر کا باشندہ نہ تو بزدل ہوں اور نہ بے غیرت۔ مجھے بھی جواب دینا آتا ہے۔''

وفد کا سردار تلملا کر رہ گیا، بولا۔''میں تیری سلطان سے شکایت کروں گا اور پھر تیرے کان کھنچواؤں گا۔''

مسخرے نے جواب دیا۔''یہ بھی دیکھ لوں گا کہ کون کس کے کان کھنچواتا ہے۔''

اس کے بعد مسخرہ ایک دم درداغ سے مخاطب ہوا، بولا۔ ''تو بھی میرے ساتھ چل اور تجھے سلطان کے روبرو میری گواہی دینا ہوگی۔ میں ان بے ادبوں کو ادب سکھاؤں گا۔''

مصری متمول دم بخود ان کی باتیں سن رہا تھا۔ اس کو ہر کوئی نظر انداز کر رہا تھا، اس نے مسخرے سے کہا۔''میں بھی تیری گواہی دے سکتا ہوں۔ مجھے بھی اپنے ساتھ لے چل، میں بھی بڑے کام کا آدمی ہوں۔''

لیکن مسخرے نے مصری متمول پر کوئی خاص توجہ نہیں دی، بولا۔''تو اپنے گھر جا۔ جب تیری ضرورت محسوس کروں گا تو تجھ کو بھی بلوالوں گا۔''

درداغ نے مصری متمول کا ساتھ دینا چاہا، بولا۔''اگر تو مجھ کو اپنے ساتھ بطور گواہ لے جانا چاہتا ہے تو تجھے میرے اس ساتھی کو بھی اپنے ساتھ لے کر چلنا پڑے گا ورنہ میں بھی نہیں جاؤں گا۔''

مسخرے کو غصہ آگیا، بولا۔''مجھ کو یہ بات ذرا بھی پسند نہیں کہ کوئی اپنی رائے کو میری رائے پر مسلط کرنے کی کوشش کرے۔ میں اس کو اپنے ساتھ نہیں لے جاؤں گا۔''

مصری متمول نے درداغ کی طرف دیکھا، درداغ اس کے ساتھ ہولیا، بولا۔''پھر میں بھی نہیں جاؤں گا۔''

مسخرے نے درشت لہجے میں کہا۔''بہتری اسی میں ہے کہ تو اسی وقت میرے ساتھ چل، ورنہ اس وقت مزہ نہیں آئے گا کہ سلطان کے آدمی تجھ کو زبردستی اٹھالے جائیں۔''

درداغ نے جواب دیا۔''دیکھا جائے گا لیکن میں اپنے مربی اور محسن کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔''

درداغ اور مصری متمول ان سے الگ ہوگئے۔ مسخرہ بہت برہم تھا۔ اس نے درداغ کو متنبہ کیا۔''تو نے اپنے لیے غلط راہ اختیار کی ہے۔ ابھی نہیں، بعد میں اس کا احساس ہوجائے گا۔''

درداغ اور متمول مصری ابھی گھر میں داخل بھی نہیں ہوئے تھے کہ سلطانی سپاہ نے درداغ کو گرفتار کرلیا اور اپنے ساتھ لے گئی۔

اس بار درداغ کو سلطانی محل کے بجائے ایک کمرے میں رکھا گیا۔ سلطانی سپاہ نے اس پر سختی نہیں کی۔ بس بند کر کے کہیں چلے گئے۔ درداغ نے سوچا معلوم نہیں اس مسخرے نے سلطان سے کیا شکایت کی ہوگی جو اس پر اتنی تیزی سے عملدرآمد ہوا۔

کچھ دیر بعد کمرے کا دروازہ کھلا اور اس کو بہترین کھانا پیش کیا گیا۔ درداغ نے سوچا، بہرحال کچھ بھی ہو مسخرہ برا آدمی نہیں لگتا۔ اس نے پوری رات فکروں اور اندیشوں میں گزار دی۔ اس کے خیال میں بہرحال ایک بات ٹھیک تھی۔ مسخرہ جس طرح منگول وفد سے باتیں کر رہا تھا، وہ اچھی نہیں تھیں۔ مسخرے کی باتوں میں شیخی تھی، تکبر تھا۔ اس کو معلوم تھا کہ اسی قسم کے بڑبولے پن نے سلطان علاؤالدین خوارزم شاہ کو تباہ و برباد کر ڈالا تھا اور چنگیز خان کے خونخوار سپاہی اس کو ڈھونڈتے پھر رہے تھے اور آخر میں خوارزم شاہ نے خود بھی اس کا اقرار کیا تھا کہ زمین کے اوپر اور آسمان کے نیچے ایسی جگہ موجود نہیں جہاں اسے چنگیز خان سے پناہ مل جائے۔

صبح اس کو سلطان کے دربار میں پیش کر دیا گیا۔ یہ دربار بھی کچھ عجیب سا تھا، منگول وفد اپنے گھوڑوں سمیت دربار میں کھڑا تھا۔ سلطان ایک اونچے تخت پر بیٹھا ہوا تھا، اس کا رعب دار چہرہ صاف نظر آرہا تھا۔ اس نے اپنے سر پر چوکور خانے دار رومال ڈال رکھا تھا۔ اس کے آس پاس تقریباً پندرہ سولہ مشیر بیٹھے تھے۔ دبلے، موٹے، متوسط، کوتاہ قامت، لمبے، درمیانی۔ ان میں کسی کا رنگ سرخ وسفید تھا، کسی کا گندم گوں اور کسی کا سانولا۔ ڈاڑھیاں بھی کی تھیں۔ درداغ نے ان میں مسخرے کو تلاش کیا مگر وہ کہیں بھی نہیں تھا۔

اتنے میں ایک سیاہ فام شخص درداغ کے قریب گیا اور پوچھا۔''کیا یہ درست ہے کہ تجھ کو گواہی کے لیے یہاں لانے کی کوشش کی گئی اور تو نے ساتھ آنے سے انکار کردیا؟''

درداغ نے جواب دیا۔''میں اس الزام کا جواب تو بعد میں دوں گا مگر اس سے پہلے اس مسخرے کو میرے سامنے لایا جائے جس نے میرے خلاف یہ جھوٹی شکایت کی ہے۔''

سیاہ فام شخص نے منگول وفد کے گھوڑوں کی طرف اشارہ کیا۔''وہ رہا مستغیث اور مدعی۔'' پھر مسخرے سے کہا۔ ''تو نے سنا یہ کیا کہہ رہا ہے، شاید مکرنے کی کوشش کر رہا ہے۔''

ورداغ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ مسخرہ ہلاکو خان کے وفد کے گھوڑے سنبھالے کھڑا تھا۔ شاید وہ سائیس تھا۔ اس کو بے اختیار ہنسی آگئی کہ اس مغرور اور بے وقوف کو سلطان کے روبرو کیسی شرمندگی اٹھانی پڑ رہی ہے۔

مسخرے نے دبے سہمے لہجے میں جواب دیا۔ ''نہیں، میں نے اس کی جھوٹی شکایت نہیں کی، میں سچا ہوں۔ میں اس کو تنہا لانا چاہتا تھا مگر یہ اپنے ساتھ ایک فوج بھی لانا چاہتا تھا۔''

سلطان نے سیاہ فام شخص کو ہاتھ کے اشارے سے منع کر دیا کہ فی الحال اس مسئلے کو موخر کر دیا جائے اور منگول وفد سے بات کر لی جائے۔

اس کے بعد سلطان نے پوچھا۔ ''تم میں وفد کا سردار کون ہے؟''

منگول سردار ایک قدم آگے بڑھ گیا، بولا۔ ''میں ہوں۔''

سلطان نے پوچھا۔ ''تو کیا پیغام لایا ہے؟''

منگول سردار نے نہایت رعونت سے جواب دیا۔ ''مصر کے سلطان! یہ اس کا فرمان ہے جو ساری دنیا کا آقا ہے۔ اپنی فصیلیں منہدم کر دو اور اطاعت قبول کر لو۔ اگر تم یہ بات مان لو گے تو تمہیں امن و چین سے زندہ رہنے دیا جائے گا لیکن اگر تم نے یہ بات نہ مانی تو پھر جو پیش آنا ہے پیش آئے گا اور ہم کیا جانیں کہ کیا پیش آئے گا۔ اس کا علم تو صرف جاودانی آسمان کو ہے۔''

سلطان اور حاضرین دربار پر ان باتوں کا کوئی اثر نہ ہوا۔ سلطان نے پوچھا۔ ''بس یا کچھ اور بھی؟''

وفد کے سردار نے جواب دیا۔ ''اصل پیغام تو اتنا ہی ہے، مگر مجھ کو حکم دیا گیا تھا کہ اگر یہ باتیں بے اثر ہو جائیں تو اس میں یہ حصہ بھی شامل کر دیا جائے۔ اے سلطان! تجھ کو معلوم ہونا چاہیے کہ جب ہم عراق کی طرف متوجہ ہوئے تو ان کی فوجوں نے ہمارا مقابلہ کیا مگر ہم نے ان سب کو خدائی قہر و غضب کی تلوار کے گھاٹ اتار دیا۔ پھر ہمارے پاس شہر کے رئیس آئے اور یہ دوغلے بھی ہلاک کر دیے گئے۔ رؤسا کے بعد شہر والے ہماری خدمت میں آئے اور وہ حد درجہ خوشامد پر اتر آئے اور ہماری عبودیت کا دم بھرنے لگے۔ ہم نے ان سے چند سوالات کیے تو ان کا جھوٹ ہم پر کھل گیا۔ پھر انہوں نے بھی اپنے کیے کی سزا پائی۔ اے سلطان! ان باتوں کا ماحصل یہ ہے کہ تو وقت نہ ضائع کر اور ہماری اطاعت کر۔ اپنے دل میں اس بات کا خیال تک نہ لا کہ تیرے قبضے میں بچانے والے قلعے اور شمشیر زن آدمی ہیں۔ ہمیں معتبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ بغداد اور عراق کے بھگوڑے تیرے ہاں پناہ گزین ہیں۔ حالانکہ انہیں یہ معلوم ہونا چاہیے کہ وہ ہم سے بھاگ کر کہاں جا سکتے ہیں۔''

سلطان نے اپنے مشیروں کی طرف دیکھا۔ ''اس کا کیا جواب دیا جائے؟''

ایک نے جواب دیا۔ ''آخر ہلاکو خان کو اتنی ہمت کیونکر ہوئی کہ وہ ہم سے تو اور تم سے مخاطب ہو۔ اس کو ہم سے معافی مانگنی چاہیے اور اگر اس نے معافی مانگنے میں ہچر مچر سے کام لیا تو پچھتائے گا۔''

سلطان نے وفد کے سردار کو آگاہ کیا۔ ''ہلاکو خان نے اپنے خط میں جو لب و لہجہ اختیار کیا ہے وہ حد سے زیادہ گستاخانہ ہے۔ اس کے جواب میں، میں بھی وہی لب و لہجہ اختیار کر سکتا ہوں۔''

وفد کے سردار نے جواب دیا۔ ''سلطان! احتیاط سے کام لے، ایسا نہ ہو کہ تو چوہے کی طرح ادھر ادھر چھپتا پھرے اور زمین اور آسمان کے درمیان کوئی پناہ گاہ بھی نہ ملے۔''

ایک قوی ہیکل سلطانی مشیر اپنی جگہ پر کھڑا ہو گیا، بولا۔ ''اپنے خان سے جا کر کہہ دو کہ وہ ہمارے سلطان کو دوسرا خط لکھے اور اس خط میں تہدید اور فہمائش کے بجائے خیر سگالی اور دوستی کی بات کی جائے۔ اس کو بتا دو کہ منگولوں کے سیلاب کو جہاں تک چڑھنا تھا، چڑھ چکا۔ اب اس کو سمٹنا ہے، اپنی جگہ پر واپس جانا ہے۔''

منگول سردار چراغ پا ہو گیا، بولا۔ ''کم حیثیت سلطان! ہم تیرے پاس اس فاتح کا حکم نامہ لے کر آئے ہیں جو بحر و بر کا مالک ہے۔''

اب مسخرہ سائیس گھوڑوں کو چھوڑ کر سلطان اور منگول وفد کے درمیان آ کھڑا ہوا، بولا۔ ''سلطان! آپ وقت نہ ضائع کیجیے اور فی الفور اعلانِ جنگ کر دیجیے۔''

ہلاکو خان کا وفد حیرت زدہ رہ گیا کہ یہ کسی بادشاہ کا دربار ہے یا شہر کا چوراہا۔ سائیس تک اتنی آزادی سے بات کر رہا ہے کہ امرا بھی اس انداز میں بات نہیں کر سکتے۔ وفد کے سردار نے کہا۔ ''اب تمہیں اپنے برے انجام سے کوئی نہیں بچا سکتا۔ کیونکہ سلطان تیرا کوئی رعب ہی نہیں، ایک سائیس تجھ سے ذرا بھی خوفزدہ نہیں اور دربار میں اس طرح بول رہا ہے جس طرح کوئی دوست اپنے دوستوں میں بولتا ہے۔''

دربار پر سکوت طاری تھا۔ سلطان دم بخود سائیس کی طرف دیکھ رہا تھا اور سلطان کے مشیر ایک دوسرے کو دیکھ کر

نظروں ہی نظروں میں کچھ پوچھ رہے تھے۔

سائیس ایک بار پھر بولا۔ ”جنگ ناگزیر ہے کیونکہ بغداد کے نہتوں کو بہلا پھسلا کر شہر سے باہر بلوایا گیا اور جب یہ نہتے ہلاکو خان کے لشکر میں داخل ہوئے تو انہیں قتل کر دیا گیا۔ ہلاکو خان ناقابلِ اعتبار ہے۔ سلطان معظم! آپ انہیں صاف صاف بتا دیں کہ اب کسی قیمت پر بھی صلح نہیں ہوسکتی۔“

سلطان کو اس اعلان میں پس و پیش تھا، بولا۔ ”اپنے ہلاکو خان سے ہمارا اسلام کہنا کہ جنگ کوئی اچھی چیز نہیں ہے۔“

سائیس نے برہمی سے اعلان کیا۔ ”سلطان معظم! جنگ ناگزیر ہے۔ ہمیں اس کا آغاز کر دینا چاہیے، اس کی پہل ہماری طرف سے ہونا چاہیے۔“

سلطان نے پوچھا۔ ”وہ کس طرح؟“

سائیس نے جواب دیا۔ ”میں ان بڑبولے قاصدوں کے قتل سے اس جنگ کا اعلان کروں گا۔“

وفد کے لوگ گھبرا گئے، وہ سب کے سب نہتے تھے کیونکہ ان کے ہتھیار محل کے باہر ہی رکھوا لیے گئے تھے۔

سلطان نے پوچھا۔ ”تو نے یہ فیصلہ خوب سوچ سمجھ کر کیا ہے یا یوں ہی؟“

سائیس نے جواب دیا۔ ”یہ فیصلہ خوب سوچ سمجھ کر کیا گیا ہے۔ میں جنگ کو ناگزیر بنانے کے لیے انہیں قتل کر دینا چاہتا ہوں۔“

وفد کا سردار چلایا۔ ”بدطینت سائیس! کہیں تو نشے میں تو نہیں ہے؟“

سائیس نے جواب دیا۔ ”میں شراب نہیں پیتا۔“

وفد کا سردار بہت پریشان تھا۔ اس نے کہا۔ ”تم لوگ مجھے قتل کر سکتے ہو۔ میرے ساتھیوں کو ہلاک کر سکتے ہو مگر یہ نہ بھولنا کہ ہلاکو خان اس کا بہت خوفناک انتقام لے گا اور میرے ایک ایک ساتھی کے بدلے ایک ایک شہر برباد کر دیا جائے گا۔“

سائیس نے سلطانی مشیروں کو مخاطب کیا۔ ”دوستو! وہاں بیٹھے کیا کر رہے ہو۔ آؤ میرا ساتھ دو اور اس ضروری کام کو ایک ساتھ انجام دو۔ میں جنگ کو ناگزیر بنانے کے لیے ان سب کو قتل کر دینا چاہتا ہوں۔“

ہلاکو خان کا وفد ایک قطار میں کھڑا ہو گیا اور ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ لیا۔ وفد کے سردار نے کہا۔ ”مزہ تو جب تھا کہ ہمارے پاس بھی ہتھیار ہوتے۔“

سائیس نے جواب دیا۔ ”جب تم لوگوں نے بغداد کے نہتے شہریوں کو قتل کیا تھا تو مزہ لینے کے لیے ان کے ہاتھوں میں ہتھیار کیوں نہیں دیے تھے۔ تم نے تو عورتوں اور بچوں تک کو نہیں چھوڑا۔“

سائیس نے اپنی تلوار کا پہلا وار وفد کے سردار پر کیا۔ سردار چیخا۔ ”یہ تو بڑا ظلم ہے۔“

اور تلوار اس کی گردن کاٹ کر دوسری طرف نکل گئی۔ سلطانی مشیروں نے سائیس کی پیروی میں دوسرے منگولوں کو بھی قتل کر دیا۔

درداغ کو اس خون خرابے نے بہت پریشان کر دیا۔ اس کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ ”یہ کیا غضب کر دیا؟ یہ تو بہت برا ہوا اور اب قاہرہ کی بھی اینٹ سے اینٹ بج جائے گی۔“

سائیس غصے میں درداغ کی طرف مڑا۔ ”چپ رہ تو مسلم! اگر تو مسلمان نہ ہوتا تو میں ان کے ساتھ تجھے بھی قتل کر دیتا۔“

درداغ نے جواب دیا۔ ”میں تختۂ دار پر بھی سچ بولوں گا کہ تم نے انہیں قتل کر کے اچھا نہیں کیا۔ خوارزم اور بخارا کی طرح قاہرہ کی بربادی یقینی ہو چکی۔ ہلاکو خان اس کا انتہائی وحشت اور درندگی سے انتقام لے گا۔“

سائیس کا غصہ عروج پر تھا۔ ”میں کہتا ہوں، تو اپنی زبان اپنے قابو میں رکھ۔“

درداغ نے جواب دیا۔ ”میں کس طرح اپنی زبان کو قابو میں رکھوں۔ میں تو حیران ہوں کہ ایک سائیس اپنی مرضی سے سلطانی دربار میں یوں خون خرابا کس طرح کر سکتا ہے؟“

سائیس نے سلطان سے کہا۔ ”اس تو مسلم منگول کا دماغ میں درست کر دوں گا، آپ ان لاشوں کو باہر پھنکوا دیجیے۔“

سائیس وفد کے گھوڑوں کو لے کر محل سے باہر چلا گیا اور درداغ کو بھی اپنے ساتھ لے گیا۔ محل کے باہر سائیس کا گھوڑا ایک ستون سے بندھا کھڑا تھا اور اس کے قریب ہی سائیس نے وفد کے گھوڑے بھی کھڑے کر دیے اور درداغ سے کہا۔ ”تو ان میں سے اپنے لیے ایک گھوڑا چھانٹ لے پھر ہم دونوں کہیں چل کے اطمینان سے باتیں کریں گے۔“

درداغ نے اپنے لیے ایک گھوڑا الگ کیا اور اس پر سوار ہو کر سائیس کے ساتھ ایک طرف روانہ ہو گیا۔ سائیس اس کو مقطم کی پہاڑیوں میں لے گیا اور یہ وہ پہاڑی سلسلہ تھا جس کا پتھر قاہرہ کے مکانات میں بہت زیادہ استعمال کیا گیا تھا۔ اس کی ڈھلوان پر بڑے بڑے چیڑ کے درختوں کا سلسلہ پھیلا ہوا تھا اور خودرو جھاڑیاں جگہ جگہ اگی ہوئی تھیں۔

انہی میں سے ایک جھاڑی کے قریب سائیس اپنے گھوڑے سے اتر کر پیڑ کے درخت کی جڑ میں بیٹھ گیا اور درداغ سے مخاطب ہوا۔ "ہاں، اب بتا کہ یہ معاملہ کیا ہے جو تو بار بار ہمارے معاملات میں دخل دیتا رہتا ہے۔"

درداغ نے جواب دیا۔ "سائیس! تمہیں ان منگولوں کا کوئی تجربہ نہیں۔ ان کے قاصدوں کو قتل کر کے اچھا نہیں کیا گیا۔ عنقریب ان کے طوفانی لشکر قاہرہ کی طرف بڑھ رہے ہوں گے، تم اس وقت کیا کرو گے؟"

سائیس نے ایک لمحے تک درداغ کے چہرے پر نظریں جمائے رکھیں، بولا۔ "کیا تو نے میرے وہ الفاظ نہیں سنے تھے جو میں نے کئی بار منگول وفد کے سامنے ادا کیے تھے۔ میں جنگ کو ناگزیر بنانا چاہتا ہوں، میں منگولوں سے جنگ کرنا چاہتا ہوں۔"

درداغ نے پوچھا۔ "مگر کیوں؟ آخر کیوں؟"

سائیس نے جواب دیا۔ "اس لیے کہ انہیں اسی طرح سبق دیا جا سکتا ہے۔"

درداغ کو یقین ہو گیا کہ اس سائیس کا دماغی توازن درست نہیں ہے، بولا۔ "بہرحال میں نے جو کچھ بغداد میں دیکھا تھا، وہی یہاں قاہرہ میں دیکھ رہا ہوں۔ ہم سب پر اللہ رحم کرے۔"

سائیس نے کہا۔ "درداغ! تو منگول ہے میں تجھ پر اعتبار کرنے لگا ہوں، مجھ کو دھوکا نہیں دیا جا سکتا۔ میں خود بھی تاتاری ترک ہوں۔ مجھ کو وہ زمانہ اور وہ دن ہمیشہ یاد رہے گا جب مجھ کو دمشق کے بازار بردہ فروشاں میں بکنے کے لیے بٹھا دیا گیا تھا۔ میری آنکھ پر جو یہ زخم کا نشان ہے، اس وقت بھی موجود تھا، میرا ساتھی، میرا رفیق۔"

درداغ نے کہا۔ "تمہاری محبتوں کا شکریہ۔ تم بازار بردہ فروشاں میں بکنے کے لیے بٹھا دیے گئے تھے، وہ کس طرح؟"

سائیس نے جواب دیا۔ "میں جھوٹ نہیں بول رہا۔ شاید میری اچھی قیمت لگ جاتی لیکن میری آنکھ کے اس نشان نے میری قیمت کم کر دی تھی۔ میں چار سو سکوں میں بک گیا اور سلطانی محل کی حفاظت میرے سپرد کر دی گئی۔"

درداغ نے کہا۔ "اگر تو سلطانی محل کا محافظ ہے تو پھر سائیسی کیوں؟ کیا سلطان تجھ سے بہت زیادہ خوش ہے جو دربار میں تیرا حکم چلنے لگا۔"

سائیس نے جواب دیا۔ "میں سلطان کے لیے ہر وقت اپنی جان قربان کرنے کو تیار ہوں، پھر کیا سلطان میرا اتنا بھی خیال نہیں کرے گا۔"

درداغ نے کہا۔ "بہرحال جو کچھ بھی ہوا، خوب ہوا۔ اب میں قاہرہ سے افریقا چلا جاؤں گا کیونکہ شاید وہاں تک یہ پاگل منگول نہ پہنچ سکیں۔ میں بقیہ زندگی گمنامی میں گزار دینا چاہتا ہوں۔"

سائیس نے تلملا کر جواب دیا۔ "میں بزدلوں سے نفرت کرتا ہوں، میں تجھ کو میدانِ جنگ میں اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔"

درداغ کے لیے سائیس ایک معما تھا۔ وہ جتنی باتیں کر رہا تھا، اپنی حیثیت سے بڑھ کر کر رہا تھا۔ جنگ کرنے یا نہ کرنے کا اختیار سلطان کو تھا اور سلطان نے ایک بار بھی جنگ کی بات نہیں کی تھی۔

سائیس نے کہا۔ "میں جانتا ہوں تو کیا سوچ رہا ہے کہ مجھ جیسا کم مایہ، بلکہ فرومایہ شخص اتنی بڑی بڑی باتیں کس طرح کر رہا ہے۔ میرے پاس اس کا بھی جواب ہے۔ میں اس کا جواب دوں گا مگر ابھی نہیں...... وقت آنے پر۔"

درداغ اس احمق کے ساتھ اپنا زیادہ وقت نہیں گزارنا چاہتا تھا وہ بھاگنے کی سوچ ہی رہا تھا کہ سائیس نے کہا۔ "اور دیکھ، اب تو میرا ملازم ہے، اس متمول مصری سے دور رہ۔ وہ اچھا آدمی نہیں ہے، وہ کہاں تک بچے گا۔ ایک نہ ایک دن پکڑا جائے گا اور اپنے کیفرِ کردار کو پہنچے گا۔"

درداغ کو اب تو سائیس کے پاگل پن کا پورا پورا یقین ہو چکا تھا۔ سائیس درداغ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر ٹہلنے لگا۔ سائیس کی طبیعت میں مزاح بہت زیادہ تھا۔ وہ ہر ایک سے چھیڑ چھاڑ ضرور کرتا تھا۔ اس نے واپسی میں ایک چرواہے کو مویشیوں کا ریوڑ لے جاتے دیکھا۔ سائیس نے اپنا گھوڑا مویشیوں کے ریوڑ کے بیچ میں ڈال دیا۔ جب مویشی بدک کر ادھر ادھر بھاگے تو اسے بڑی ہنسی آئی، اس پر ہنسی کا دورہ سا پڑ گیا۔

درداغ کو سائیس نے تھکا ڈالا۔ جب وہ دونوں ایک دوسرے سے بچھڑے تو درداغ کو یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ وہ متمول مصری کے در پر کھڑا تھا۔

سائیس کے چلے جانے کے بعد وہ اس قصر میں داخل ہوا۔ مصری متمول اس کا بڑی بے چینی سے انتظار کر رہا تھا۔ پوچھا۔ "تو کل رات کہاں رہا؟"

درداغ نے ہلاکو خان کے وفد کا جو حشر ہوا تھا، مصری متمول کے سامنے دہرا دیا، بولا۔ "میرا خیال ہے اب قاہرہ پر بھی نحوستیں منڈلا رہی ہیں۔ میں حیران اور پریشان ہوں کہ آخر یہ مسلمانوں کو ہو کیا گیا ہے۔ کیا یہ خود اپنی بربادی

کے در پے ہیں۔"

متمول مصری نے کہا۔ "تب پھر ہمیں قاہرہ چھوڑ دینا چاہیے۔"

درداغ نے جواب دیا۔ "میرا ابھی یہی خیال ہے۔"

متمول مصری نے کہا۔ "میں اس کا فوراً ہی بندوبست کرتا ہوں۔ میں نے تیرے لیے ایک کام بھی سوچ لیا ہے اگر تو نے وہ کام پورے انہماک اور دلچسپی سے کیا تو چند دن بعد تو مصر کا متمول انسان ہوگا۔ میں بھی اسی طرح متمول بنا ہوں۔"

"لیکن شاید فی الحال میں کوئی اور کام نہیں کر سکوں گا کیونکہ مسخرے سائیس نے مجھے کسی کام پر لگا دیا ہے۔"

مصری متمول نے تعجب سے پوچھا۔ "کس کام پر؟ کیا مطلب؟"

درداغ نے جواب دیا۔ "مجھے خود نہیں معلوم کہ اس کا مطلب کیا ہے۔"

مصری متمول کچھ دیر بے چینی سے ادھر ادھر ٹہلتا رہا۔ ایک دم درداغ کی طرف مڑا، بولا۔ "تو مصری نہیں ہے اور سمجھدار ہونے کے ساتھ ساتھ تو بہادر بھی ہے، تو میرا... بہترین مددگار بن سکتا ہے۔ میرے پاس ایک ایسا کام موجود ہے کہ اگر میں اسے تیرے اشتراک سے شروع کردوں تو وارے نیارے ہوسکتے ہیں۔ میرے پاس تو دولت کی کوئی کمی نہیں، تو بھی میرے جیسا بن سکتا ہے۔"

درداغ نے جواب دیا۔ "مصری دولت مند! اگر مجھ کو اس سائیس کی اصل حیثیت کا علم ہوجائے تو میں اس سے علیحدگی اختیار کرسکتا ہوں۔ لیکن میں تو اس کو سلطان کا ہمسر دیکھ رہا ہوں۔"

مصری متمول نے پوچھا۔ "اب تجھ کو اس کے پاس کب جانا ہے؟"

درداغ نے جواب دیا۔ "کچھ پتا نہیں، جب بھی وہ مجھے بلائے گا جانا پڑے گا۔"

مصری دولت مند ایک کرسی پر بیٹھ گیا اور سر پکڑ کر کچھ سوچنے لگا، پھر اٹھا اور کہنے لگا۔ "اچھا ذرا میرے ساتھ تو چل۔ میں تیری ملاقات چند ایسے جوانوں سے کراؤں جو تیری ہی طرح آوارہ وسرگرداں ادھر ادھر بھٹکتے پھر رہے تھے۔ میں نے انہیں پہچانا۔ انہوں نے مجھے پہچانا۔ میں نے انہیں کام سے لگا دیا۔ اب وہ مزے کر رہے ہیں، امن و چین کی بنسری بجا رہے ہیں۔"

مصری دولت مند اسے مصر کے قدیم دارالخلافہ ممفس کی طرف لے گیا۔ قاہرہ سے چند میل دور صحرا میں، جہاں فراعنۂ مصر کے اہرام کھڑے تھے، یہاں اس نے بے آب وگیاہ ویرانے میں تکون عمارتیں کھڑی دیکھیں۔ شاہوں کے مقبرے، فراعنۂ مصر کے مزار، وہ ایک اہرام میں داخلے کا راستہ تلاش کرنے لگا۔ کچھ دیر بعد جب راستہ مل گیا تو یہ ایک تہ خانے میں داخل ہوگیا۔ اس کے ساتھ ساتھ درداغ بھی تھا۔ یہ باہر سے تو ایک عظیم الشان مقبرہ تھی مگر اندر سے اسی قدر شاندار عمارت تھی۔ یہاں دن کو مشعلیں روشن تھیں اور مرد ادھر ادھر آجا رہے تھے۔

مصری دولت مند نے آواز دی تو ایک جوان اس کے پاس آیا، اس نے پوچھا۔ "مراکش والا کام ہوگیا یا ابھی کچھ باقی ہے؟"

جوان نے جواب دیا۔ "ابھی کچھ کہا نہیں جاسکتا لیکن خیال یہی ہے کہ وہ کام بہت جلدی ہوجائے گا۔"

مصری دولت مند نے کہا۔ "میں تاخیر پسند نہیں کرتا۔ میں چاہتا ہوں کہ ہر کام اپنے وقت پر ہو۔ میں تم لوگوں میں ایک اولوالعزم جوان کا اضافہ کرنا چاہتا ہوں۔"

اتنی دیر میں وہاں کچھ اور جوان بھی آچکے تھے۔ مصری دولت مند ان سب کو لے کر ایک دوسرے تہ خانے میں چلا گیا۔ یہ زمین دوز حصہ زیادہ پُررونق تھا۔ یہاں شمعیں بھی زیادہ تھیں۔ انہوں نے دن جیسی کیفیت پیدا کردی تھی۔ یہاں ایک ستون سے ملا ہوا فرش بچھا تھا اور گولائی میں جگہ جگہ ریشمی گاؤ تکیے رکھے تھے۔ وہ ایک گاؤ تکیے سے پشت لگا کر بیٹھ گیا اور درداغ کو بھی اپنے پاس بٹھا لیا۔

کچھ دیر بعد یکے بعد دیگرے چار نوجوان لڑکیاں ایک طرف سے نمودار ہوئیں اور رقص میں مشغول ہوگئیں۔ ان میں ایک کے ہاتھ میں خنجری تھی؟ وہ اسے بڑے کمال احتیاط سے بجا رہی تھی۔ خنجری ہاتھوں میں تھرتھراتی ہوئی ایک دم ساکت ہوجاتی اور کچھ دیر بعد اسی طرح ندی چڑھ آتی۔

مصری دولت مند نے کہا۔ "درداغ! یہ سب کچھ اپنا ہے۔ بلاشرکت غیرے اپنا۔"

درداغ چاروں کے زور آور شباب اور سحر انگیز حسن میں کھویا ہوا تھا۔ اس کے دل کی دھڑکنیں تیز ہوگئیں اور خیالات ماضی کے بغداد میں چلے گئے جہاں علیہ تھی، صفیہ تھی اور ان کے عشق کی روداد۔

درداغ اس وقت چونک کر خواب سے بیدار ہوگیا جب اس نے ایک رقاصہ کو اپنے روبرو پایا۔ وہ اس کی آنکھوں میں مسکرا مسکرا کر جھانک رہی تھی۔ غالباً یہ شرارت

مصری دولت مند کے اشارے پر ہوئی تھی۔ درداغ نے لڑکی کی کلائی تھام کر اپنی طرف کھینچا۔ لڑکی نے خود کو چھڑانے کی کوشش کی مگر درداغ کی مضبوط گرفت نے اس کو بے بس کر دیا۔

مصری دولت مند اپنی جگہ سے اٹھا اور اپنے ہاتھوں سے لڑکی کا بازو آزاد کرا دیا، بولا۔ "درداغ! آداب محفل کا خیال کر۔ یہ جو کچھ ہو رہا ہے، محض یہ بتانے کے لیے کہ میں تجھ کو جس جگہ لگانا چاہتا ہوں وہ ہر اعتبار سے بہت اچھی اور پُرلطف ہے۔"

درداغ خاموش رہا۔

مصری دولت مند نے پوچھا۔ "تو خاموش کیوں ہے؟ بولتا کیوں نہیں؟"

درداغ نے جواب دیا۔ "وہی ایک بے بسی سائیس والی۔ وہ کوئی خطرناک شخص ہے۔ جب تک مجھے اس کی اصل حیثیت کا علم نہ ہو جائے، میں کوئی ایسا ویسا قدم اٹھا کر کسی قسم کی مصیبت نہیں مول لینا چاہتا۔"

لڑکیوں نے تھرکنا ناچنا بند کر دیا تھا۔ اس نے پوچھا۔ "یہ بند کیوں کر دیا؟"

مصری دولت مند نے جواب دیا۔ "جب میں شام تک یہاں بیٹھوں گا تو یہ مست و بے خود ہو کر خوب خوب ناچیں گی گائیں گی اور اس رات تو بھی......"

وہ اپنی بات پوری نہیں کر سکا۔ لڑکیاں جدھر سے آئی تھیں، اسی طرف واپس چلی گئیں۔

مصری دولت مند نے حکم دیا۔ "چند اور حاضر کی جائیں۔"

چنانچہ اس بار پانچ ایک ساتھ اور دو ایک ساتھ نمودار ہوئیں۔ ان کے حسین چہروں پر نظریں پھسل رہی تھیں۔

مصری دولت مند ان ساتوں لڑکیوں کو للچائی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ دولت مند نے کہا۔ "میری بدنصیبی تو ملاحظہ ہو کہ میں ہی انہیں جی بھر کے نہیں دیکھ سکتا۔" پھر لڑکیوں کی طرف منہ کیا اور بولا۔ "ہاں، اب تم میں سے وہ لڑکی اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے دے گی جو ذہنی طور پر میری ہو جانا چاہتی ہو۔"

ایک سناٹا طاری ہو گیا۔ کسی لڑکی نے مصری دولت مند کی طرف جانا پسند نہیں کیا۔

مصری دولت مند نے حسرت سے کہا۔ "اچھا، وہ لڑکی یہاں میرے پاس چلی آئے جس کو یہ منگول پسند ہو۔"

اس بار تین لڑکیاں مصری دولت مند کے پاس جا کھڑی ہوگئیں۔

مصری دولت نے تینوں لڑکیوں کو رشک و حسد کی نظر سے دیکھا اور درداغ سے کہا۔ "میں ان کا مالک ہوں مگر لڑکیوں نے تجھے پسند کر لیا۔ میں اس کو خوش قسمتی کے علاوہ اور کیا کہہ سکتا ہوں۔"

مصری دولت مند کے اشارے پر تینوں لڑکیاں درداغ کے آس پاس کھڑی ہوگئیں۔ ان کے کپڑوں کی خوشبو دل و جان کو سرور و کیف بخش رہی تھی۔ درداغ ان کے حسن و شباب میں کھو گیا۔ کچھ دیر بعد مصری دولت مند نے یہ کھیل ختم کر دیا۔ درداغ ہنوز تشنہ تھا۔ اس ماحول نے اس کے اندر آگ سی لگا دی تھی۔

جب وہ مصری دولت مند کے قصر میں داخل ہوا تو اس کے دل و دماغ میں سوالات کی بوچھاڑ ہو رہی تھی۔ اس نے مصری دولت مند سے پوچھا۔ "میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ اگر میں آپ کے کاروبار میں شریک ہو جاؤں تو مجھے کام کیا کرنا ہوگا؟"

مصری دولت مند نے جواب دیا۔ "یہ بات پہلے ہی مرحلے میں نہیں بتائی جا سکتی۔ اس سوال کا جواب تجھے کافی دنوں بعد ملے گا۔"

ابھی یہ باتیں جاری ہی تھیں کہ سائیس کا آدمی آ گیا، اس نے بتایا کہ میں کئی بار یہاں آ چکا ہوں، میں درداغ سے ملنا چاہتا ہوں۔

درداغ کو اس سے ملا دیا گیا۔ وہ درداغ کو لے کر سائیس کے پاس چلا گیا۔ اس وقت سائیس کی شان ہی کچھ اور تھی۔ وہ بغداد، اور پورے عراق سے آئے ہوئے آوارگانِ وطن کے خیموں کے درمیان سپاہیوں کا ایک دستہ لیے گھوم پھر رہا تھا۔ درداغ کو خیموں کے اس شہر میں پہنچا دیا گیا۔ وہ درداغ کو دیکھتے ہی برس پڑا۔ "جب تجھ کو کل یہ بتا دیا گیا تھا کہ اب تو ہمارے ساتھ کام کرے گا تو یہ تو غائب کہاں ہو گیا تھا؟"

درداغ نے جواب دیا۔ "میں جس دولت مند مصری کے ساتھ رہتا ہوں، مجھے اس کا بھی خیال رکھنا پڑتا ہے۔"

سائیس کے لہجے میں بڑی تلخی تھی۔ "تو منگول ہے، تو مسلم منگول۔ تجھ کو یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ میں نے ہلاکو خان کے قاصدوں کو قتل کر کے کتنا خطرناک کام کیا ہے۔ اب میں فوراً ایک طاقتور فوج تیار کرنا چاہتا ہوں۔ بڑی اور طاقتور فوج جو ہلاکو خان کا منہ پھیر دے۔"

درداغ شرمندہ تھا مگر وہ اس پر ذرا بھی یقین نہیں رکھتا تھا کہ مصری فوج ہلاکو خان کے جارحانہ حملے کا مقابلہ کر سکے گی۔

سائیس کے سپاہی خیموں میں اعلان کرتے پھر رہے تھے۔ ”سلطان کو ہلاکو خان کا مقابلہ کرنے کے لیے سپاہی درکار ہیں۔ جو لوگ اس فوج میں داخل ہونا چاہیں داخل ہو جائیں۔“

ان لوگوں نے اپنے اپنے خیموں کے دروازے بند کر لیے۔ ان کا خیال تھا کہ وہ ہلاکو خان کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔

سائیس ان کے چیخنے چلّانے سے ذرا بھی متاثر نہیں ہوا۔ وہ ہر خیمے کے در پر جا کر ایک ہی بات کہہ رہا تھا۔ ”دوستو! آؤ۔ میرے پاس آؤ۔ فوج میں بھرتی ہو جاؤ تاکہ میں ایک عظیم الشان فوج کی مدد سے ہلاکو خان کی یلغار کو روک دوں۔“

سائیس خیموں کے سامنے اپنا پیغام دہراتا پھر رہا تھا اور لوگ اپنے گالوں کو تھپتھپا کر خیموں کے اندر روپوش ہو جاتے تھے۔

سائیس نے اعلان کیا۔ ”لوگو! اچھی طرح کان کھول کر سن لو۔ جو صحت مند ہونے کے باوجود فوج میں بھرتی نہیں ہوگا، میں اس کو کوڑوں کی سزا دوں گا۔“

اس اعلان کے فوراً بعد اس نے ایک خیمے کے در پر آواز دی۔ ”جملہ مرد باہر آ جائیں۔“

اندر سے کچھ تامل اور توقف کے بعد تین مرد نمودار ہوئے۔ ان میں ایک بوڑھا تھا۔ دوسرا ادھیڑ عمر، تیسرا جوان۔

سائیس نے بوڑھے کو تو الگ کر کے ایک طرف کھڑا کر دیا اور بقیہ دونوں سے پوچھا۔ ”کیا تم نے میری آواز نہیں سنی تھی؟“

دونوں نے جواب دیا۔ ”سنی تھی۔“

سائیس نے درشت لہجے میں پوچھا۔ ”جب سنی تھی تو پھر باہر کیوں نہیں نکلے؟“

ادھیڑ عمر عراقی نے نہایت دلیری سے پوچھا۔ ”میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ آخر تم ہو کون؟ اور کیا تم بہت سارے آدمیوں کی فوج تیار کر کے جنگجو منگولوں کو شکست دے سکو گے؟ کیا بیکار آدمیوں کی بھیڑ تجربہ کار فوج کو دندان شکن جواب دے سکے گی؟“

سائیس نے اپنا کوڑا ہوا میں لہرایا۔ ”تیرے سارے سوالوں کا میرے پاس بس ایک ہی جواب ہے، یہ کوڑا...... یہ کوڑا......“

سائیس کی مضبوط کلائیوں نے ادھیڑ عمر عراقی کی کھال ادھیڑ ڈالی۔ جب ادھیڑ عمر عراقی بے ہوش ہو گیا تو اس نے نوجوان کی پٹائی شروع کر دی۔ نوجوان پٹ رہا تھا اور اعلان کرتا جا رہا تھا کہ میں فوج میں بھرتی ہونے کو تیار ہوں، مجھے اور نہ مارو۔

سائیس نے اس کو چھوڑ دیا اور وہ فوج میں بھرتی ہو گیا۔ اس روز سائیس کے کوڑے نے ہزاروں عراقیوں کو فوج میں بھرتی کرایا اور لوگ جوق در جوق اس کی طرف بڑھ رہے تھے۔

☆☆☆

درداغ کو ان لوگوں کی فوجی تربیت کا ذمے دار بنایا گیا۔ یہ کام خود اس نے مانگا تھا۔ سلطانی فوج میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ سائیس درداغ سے بہت خوش تھا۔ جس لگن اور ذوق وشوق سے درداغ انہیں تربیت دے رہا تھا، اس کی دوسری کوئی مثال نہیں تھی۔ درداغ اپنا یہ کام صبح اور شام کو انجام دیتا تھا اور رات مصری دولت مند کے قصر میں گزارتا تھا۔

مصری دولت مند کو درداغ کی مصروفیات کا صحیح علم نہیں تھا مگر وہ جب بھی موقع پاتا، آتا ضرور۔ مصری دولت مند کو یہ بات بہت زیادہ گراں گزر رہی تھی کہ سائیس مار مار کر ادھیڑ عمر اور جوان لوگوں کو فوج میں جبراً بھرتی کر رہا تھا لیکن وہ درداغ کے سامنے کوئی اعتراض بھی نہیں کر سکتا تھا کیونکہ وہ سائیس کے غصے سے ڈرتا تھا۔

سائیس اچانک کہیں غائب ہو گیا۔ ان غائب ہونے والوں میں کچھ اور لوگ بھی تھے اور ان میں درداغ کا نام سرِ فہرست تھا۔

☆☆☆

اس وقت سائیس نے پریشان حال سیاح کا لباس پہن رکھا تھا۔ اس کے پچاس ساتھی بھی اسی جیسے کپڑوں میں تھے۔ سائیس جو پہلے مسخرہ بنا تھا، اب سیاح بن چکا تھا۔ اس کے جسم پر بوسیدہ کپڑے تھے اور ایک بڑی سی گٹھری میں کچھ چیزیں بندھی ہوئی تھیں۔ وہ شب و روز منزلیں مارتا حلب کی طرف بڑھتا جا رہا تھا۔ اس نے اپنے ساتھیوں کو سمجھا دیا تھا اور وہ ہر جگہ اپنے آپ کو سیاح ظاہر کر رہے تھے۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب دمشق اور حلب پر ہلاکو خان کا قبضہ ہو چکا تھا اور یہ سب اونچی نیچی ہموار غیر ہموار راہیں عبور کرتے جا رہے تھے۔

حلب کے قریب اس نے منگولوں کی فوج پڑی دیکھی، ان کے خیموں کے رخ جنوبی سمت میں تھے۔

مسخرے سیاح نے کہا۔ ”میں ان لوگوں کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھانا چاہتا ہوں۔“

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

لیکن درداغ بہت زیادہ گھبرا گیا، بولا۔ ”لیکن مجھے تو وہ بہت آسانی سے پہچان کر گرفتار کر لیں گے۔“

سیاح بھائی نے درداغ کو سمجھانے کی کوشش کی۔ ”اب تجھ میں بہت زیادہ عقل پائی جاتی ہے اگر تو نے زیادہ بچر بچر سے کام لیا تو میں تجھے یہیں سب کے سامنے سزا دے دوں گا۔“

درداغ تلملا رہا تھا، بولا۔ ”میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کیا کہوں اور کیا کروں۔“

سیاح نے جواب دیا۔ ”تیری سمجھ میں بات آئے یا نہ آئے لیکن میری سمجھ میں ضرور آتی ہے۔“

درداغ نے اپنی تلوار کے دستے پر ہاتھ رکھ دیا، بولا۔ ”عام حالات میں جبکہ اعلانِ جنگ ہو چکا ہو، میں پیچھے نہیں ہٹوں گا۔ لیکن اس جگہ میں مجبور ہوں۔ میں پھر یہی کہوں گا کہ مجھ کو پہچان لیا جائے گا اور میں کتے کی موت مارا جاؤں گا۔“

سیاح نے درداغ کو گھوڑے سے نیچے اتار لیا اور اس کے چہرے پر دور دراز کی مسافت کرنے والے سیاح کا ڈھاٹا باندھ دیا۔ سیاح نے اس کے گال پر ہلکی سی چپت لگائی اور پوچھا۔ ”اب یہ کیسا لگ رہا ہے؟ کیا اب بھی اس کو پہچانا جاسکتا ہے؟“

درداغ نے آہستہ سے کہا۔ ”ہوسکتا ہے اب لوگ مجھے نہ پہچان سکیں لیکن اگر یہی حال رہا تو میں کہیں نہ کہیں پہچانا ضرور جاؤں گا۔“

سیاح نے منگولوں کی حدود میں داخل ہوتے ہی ہانپنا شروع کر دیا اور جب وہ بالکل ان کے سروں پر پہنچ گیا تو چکرا کر گھوڑے سے نیچے آگیا۔ اس وقت بہت سارے منگول کھانا پکانے میں مشغول تھے اور ان کے چولہوں سے اٹھنے والا دھواں بادل سا بنتا جا رہا تھا۔

منگولوں نے ایک شخص کو گھوڑے سے زمین پر گرتے جو دیکھا تو بے اختیار دوڑ پڑے اور سیاح کو ہاتھ پاؤں سے پکڑ کر اپنے ایک خیمے میں لٹا دیا اور منہ پر پانی کے چھینٹے مارنے لگے۔

سیاح کے ساتھیوں کو الگ ٹھہرایا گیا۔ ایک پستہ قامت چوڑے چہرے اور بڑے بڑے بالوں والا منگول درداغ کے پاس آیا اور پوچھا۔ ”تم لوگ کون ہو؟“

درداغ نے جواب دیا۔ ”میرا سردار تو آپ کے ہاں بستر مرگ پر پڑا ہے، اب میں اس کی عدم موجودگی یا مدہوشی میں کیا جواب دوں؟ میں بہت پریشان ہوں۔“

یہ پستہ قامت منگول غالباً سردار تھا، پوچھا۔

"نوجوان! گھبرا نہیں، بس یہ بتادے کہ تو ہے کون؟"

درداغ نے جواب دیا۔ "میں آپ کے ان سوالوں کے کیا جواب دوں؟ خدا میرے سردار کو صحت یاب کرے، جواب تو وہی دے گا اٹھ کر...... اگر خدانخواستہ یہ ہوش میں آکر برہم ہو گیا تو ہماری خیر نہیں۔ یہ اصول کا بڑا سخت ہے۔"

منگول سردار سیاح کے پاس ہی بیٹھ گیا اور اس کے ہوش میں آنے کا انتظار کرنے لگا۔

کافی دیر بعد سیاح نے آنکھیں کھول دیں، اس کے ساتھی اس کے آس پاس بیٹھے آنسو بہا رہے تھے۔

منگول سردار مسکرایا۔ سیاح نے پھٹی پھٹی نظروں سے ادھر ادھر دیکھا، پوچھا۔ "میں کہاں ہوں؟ تم لوگ کون ہو اور مجھے کیوں پکڑ رکھا ہے؟"

منگول سردار نے جواب دیا۔ "ہم لوگ منگول ہیں، ہلاکو خان کی فوج سے تعلق رکھتے ہیں۔ میں تجھ سے یہ پوچھتا ہوں کہ تو کون ہے اور تیرا یہ حال کیونکر ہوا؟"

سیاح کی آنکھیں بھر آئیں وہ رونے لگا، بولا۔ "سردار! میں ایک بدقسمت انسان ہوں۔ جب سے ہوش سنبھالا ہے، اسی طرح مارا مارا پھر رہا ہوں۔ مجھے اپنی منزل کا کوئی پتا نہیں، سیاحت میرا محبوب مشغلہ ہے۔"

منگول سردار نے پوچھا۔ "جب تو ہمارے لشکر کی حدود میں داخل ہوا تو نڈھال سا تھا اور میں نے دیکھا کہ تو چکرا کر گھوڑے سے زمین پر آرہا۔"

سیاح نے ایک سرد آہ بھری۔ "لوگ بہت ظالم ہوتے ہیں، اس وقت میں مصر سے چلا آرہا ہوں، ابھی میں قاہرہ ہی میں تھا کہ مجھے سلطانِ مصر نے جبراً طلب کر لیا۔ میں سمجھا وہ مجھے مہمان بنانا چاہتا ہے مگر وہ مجھ سے بہت بری طرح پیش آیا۔ اس نے مجھے اور میرے ساتھیوں کو قید خانے میں ڈال دیا۔ میں جاننا چاہتا تھا کہ آخر میری غلطی؟ میری خطا؟ لیکن وہاں میرے آس پاس تھا ہی کون، جس سے میں یہ سوال کرتا۔ ایک دن معلوم نہیں کیوں اور کس طرح سلطان کو ہمارا بھی خیال آگیا۔ اس نے ہمیں فوراً اپنے دربار میں طلب کر لیا اور میرا حال دریافت کیا۔ میں نے جواب دیا۔ سلطان میرا حال کیا پوچھتے ہو؟ میری پریشانیوں میں آپ کا بھی ہاتھ ہے۔"

سلطان کی تیوریوں پر بل پڑ گئے، پوچھا۔ "تیری پریشانیوں میں میرا ہاتھ کیونکر ہو سکتا ہے؟"

میں نے جواب دیا۔ "سلطان معظم! آپ ہی کے حکم سے ہم سب قید خانے میں داخل کیے گئے اور اب آپ ہی کے حکم سے باہر نکالے گئے۔"

"سلطان ہم سے مخاطب تھا اور ہم سب گلوخلاصی کی دعائیں مانگ رہے تھے۔ آخر اس نے اس شرط پر ہم کو رہا کیا کہ ہم اس کا ایک خط اور تحفہ ہلاکو خان کی خدمت میں پہنچا دیں۔ ہم سیاح لوگ شہروں اور ملکوں کے انتظامی یا مدنی معاملات میں دلچسپی نہیں لیتے۔ ہم نے سلطان کی شرط رہائی کو اس لیے مان لیا کہ اس طرح ہمیں رہائی مل جائے گی اور دنیا کے مشہور فاتح ہلاکو خان کا دیدار بھی میسر آجائے گا۔"

منگول سردار نے پوچھا۔ "وہ خط اور تحفہ کہاں ہے؟"

سیاح نے عرض کیا۔ "میرے پاس...... لیکن میں یہ دونوں چیزیں خود اپنے ہاتھوں سے ہلاکو خان کی خدمت میں پیش کرنا چاہتا ہوں۔"

منگول سردار نے وقت ضائع نہیں کیا۔ اس نے ان سیاحوں کو دریائے یرون کے کنارے بھیج دیا کیونکہ ہلاکو خان وہیں پڑاؤ ڈالے ہوئے تھا۔ سیاح، سلطان کا خط اور سامان کی گٹھری لے کر ہلاکو خان کے سامنے حاضر ہو گیا۔ سیاح کے ساتھ اس کے چند ساتھی بھی تھے۔ اس وقت ہلاکو کے آس پاس چند منگول سردار، نصیر الدین طوسی اور بغداد کے نسطوری مسیحی جاثلیق کے علاوہ وہ لوگ بھی موجود تھے جو گرد و پیش کی حکومتوں سے تعلق رکھتے تھے اور اب وہ ہلاکو خان کے وفاداروں اور نمک خواروں میں شامل ہو چکے تھے۔

سیاح سر جھکائے کھڑا تھا۔ ہلاکو خان نے سیاح سے سلطانِ مصر کا خط لے لیا۔ سیاح نے خط پیش کرتے ہوئے کہا۔ "معلوم دنیا کے سب سے بڑے فاتح! یہ میری خوش قسمتی ہے کہ میں آپ کا دیدار حاصل کر رہا ہوں۔"

ہلاکو خان نے یہ خط نصیر الدین طوسی کے حوالے کر دیا اور کہا کہ پڑھ کر سنائے۔

نصیر الدین قدرے تامل کے بعد خط پڑھ کر سنانے لگا۔ "محترم ایل خان! تمہارا دھمکی آمیز پیغام ملا۔ تم نے میری طرف دوستی کے بجائے دشمنی کا ہاتھ بڑھایا ہے۔ میں تیار ہوں۔ شاید تمہیں مصر تک آنے کی زحمت نہ اٹھانا پڑے۔ میں جنگ کو ناگزیر سمجھتا ہوں۔ میں تمہارے تمام آدمیوں کو قتل کر کے ان کے سر تحفے میں بھیج رہا ہوں کیونکہ میں چاہتا ہوں کہ تو مشتعل ہو کر آمادۂ پیکار ہو جائے۔ باقی باتیں جنگ میں ہوں گی۔"

ہلاکو خان نے گرج کر پوچھا۔ "وہ سر کہاں ہیں؟"

سیاح نے مذبذب لب و لہجہ میں جواب دیا۔ "سر! کس کے سر؟ میں بات نہیں سمجھا۔"

نصیرالدین طوسی نے کہا۔ ''وہ گٹھری کہاں ہے جسے تو اپنے ساتھ لایا ہے؟''

سیاح نے اپنے ایک ساتھی کو یہ گٹھری پکڑا رکھی تھی۔ اس آدمی نے سیاح کے حکم پر وہ گٹھری ہلاکو خان کے حوالے کر دی۔

خواجہ نصیرالدین نے پوچھا۔ ''کیا تو جانتا ہے کہ اس گٹھری میں کیا ہے؟''

سیاح نے جواب دیا۔ ''نہیں، میں نہیں جانتا کیونکہ میں ایک معمولی سیاح شاہی تحفے کو کس طرح کھول سکتا تھا۔''

گٹھری کو کھولا گیا۔ اس میں سے چھوٹے چھوٹے کئی صندوقچے نکلے اور جب ان صندوقچوں کو کھولا گیا تو ان میں سے منگول وفد کے ارکان کے کٹے ہوئے سر نمودار ہوئے۔

سیاح نے یہ دلدوز منظر دیکھا تو اس کے منہ سے ایک چیخ نکل گئی۔

ہلاکو خان مشتعل ہو کر کھڑا ہو گیا، بولا۔ ''میں اس کا انتقام لوں گا او مصر! تو برباد ہو گیا۔ تو تباہ ہو گیا۔'' پھر سیاح سے پوچھا۔ ''اے بدبخت سیاح! سچ بتا کیا تجھ کو یہ نہیں معلوم تھا کہ اس میں میرے وفد کے ارکان کے کٹے ہوئے سر رکھے ہیں؟''

سیاح نے جواب دیا۔ ''معزز خان! اگر مجھ کو پہلے ہی سے اس بات کا علم ہوتا کہ میرے ذریعے اتنا بڑا گناہ کیا جا رہا ہے تو میں خودکشی کر کے مر جاتا مگر یہ ذلیل کام نہ کرتا۔''

ہلاکو خان نے اپنے ایک امیر سے کہا۔ ''تویان بہادر! کیا اس شخص کو جو سیاح معلوم ہوتا ہے، کچھ اور بھی ثابت کیا جا سکتا ہے؟''

تویان بہادر نے جواب دیا۔ ''اگر یہ سیاح نہ ہوتا تو یہاں تک قطعی نہ آتا۔ کم از کم میں اس کے بیان پر یقین کر رہا ہوں۔''

ہلاکو خان نے کسی قدر پس و پیش سے کام لیا، بولا۔

''ان سب کو حراست میں لے لیا جائے۔''

ہلاکو خان کے حکم پر فوراً ہی عمل ہوا اور ان سبھوں کو ایک بہت بڑے خیمے میں نظربند کر دیا گیا۔

ایک نے پوچھا۔ ''اب کیا ہوگا؟''

سیاح نے ہنس کر جواب دیا۔ ''وہی ہوگا جو منظورِ خدا ہوگا۔''

انہیں قید خانے میں زیادہ دیر تک نہیں رہنا پڑا۔ ہلاکو خان کو یہ یقین دلایا جا چکا تھا کہ یہ لوگ بے قصور ہیں اور سلطانِ مصر نے ان کے ساتھ بڑی زیادتی کی ہے۔ ہلاکو خان نے ان سب کو اپنے دربار میں طلب کیا۔ جب یہ لوگ دربار میں پہنچے تو ہلاکو خان کے چہرے پر رنج و غم کے آثار نظر آئے۔ اس وقت ہلاکو خان کے پاس اس کی بیوی دوقوز بھی بیٹھی ہوئی تھی۔

ہلاکو خان نے سیاح کو بطورِ خاص مخاطب کیا۔ ''اے سادہ لوح سیاح! تو سلطانِ مصر کی طرف سے میرے نام جو تحفہ لایا تھا، وہ اتنا بھیانک اور افسوس ناک تھا کہ میں اشتعال میں تم سب کو قتل کرا سکتا تھا۔ آئندہ خبردار! جو کسی کے پاس اس قسم کا تحفہ لے کر گئے۔ اب تم لوگ جا سکتے ہو۔''

سیاح نے دیکھا ہلاکو خان کے دربار کا ہر شخص ملول اور غمزدہ تھا، اس نے عرض کیا۔ ''مجھ کو یقین تھا کہ سمجھ دار فاتح ہمیں ضرور رہا کر دے گا لیکن اس وقت میں دربار کے ہر شخص کے چہرے پر غم و اندوہ کے بادل محسوس کر رہا ہوں۔ ہم سب آپ کے غم میں برابر شریک ہونا چاہتے ہیں۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو اس میں شریک فرمائیں۔''

ہلاکو خان کی بیوی دوقوز نے نصیرالدین طوسی سے کہا۔ ''ان سے معلوم کیا جائے کہ ان کا دین کیا ہے؟''

جب نصیرالدین نے یہی سوال سیاح سے کیا تو اس نے جواب دیا۔ ''ملکہ عالیہ سے فرما دیجیے کہ اپنا کوئی دین نہیں، ہم قلندر لوگ اللہ کی مخلوق سے محبت کرتے ہیں۔ ہمیں حضرت مسیح اس لیے پسند ہیں کہ انہوں نے انسان کو اخلاق دیا اور تشدد کو عدم تشدد سے ختم کر دیا۔''

دوقوز نے پوچھا۔ ''اور تیرا حضرت محمد ﷺ کے بارے میں کیا عقیدہ ہے؟''

سیاح نے جواب دیا۔ ''ملکہ عالیہ! آپ مجھ سے میرا عقیدہ نہ پوچھیے، کسی بھی شخص یا چیز کی بابت میری رائے معلوم کیجیے۔''

دوقوز نے ہلاکو خان سے کہا۔ ''یہ لوگ فی الحال مست اور آزاد خیال معلوم ہوتے ہیں۔''

سیاح نے ایک بار پھر اپنا سوال دہرایا۔ ''منگول فاتح! آپ نے ہماری جان بخشی کر کے جو مہربانی کی ہے، ہم اس کا شکریہ ادا کرنے سے قاصر ہیں۔ آپ چاہیں تو ہمیں قتل کرا دیں لیکن ہم اس وقت تک یہاں سے نہیں جائیں گے جب تک کہ ہمیں یہ معلوم نہیں ہو جائے گا کہ آپ ملول کیوں ہیں؟ ہم آپ کے غم میں شریک ہونا چاہتے ہیں۔''

ہلاکو خان نے خواجہ نصیرالدین کی طرف دیکھا گویا اس نے خواجہ کو یہ اجازت دے دی تھی کہ سیاح کو اصل واقعہ غم بتا دیا جائے۔

خواجہ نے سیاح سے کہا۔ ''اے شخص! آج قراقرم سے یہ خبر آئی ہے کہ خاقان منگو خان اس دنیا سے کوچ کر گیا۔ ہمارے خان کو منگول قوانین کے مطابق قراقرم واپس چلا جانا چاہیے کیونکہ وہاں نئے خاقان کے انتخاب کے لیے قوریلتائی منعقد ہوگی جبکہ ہمارے خان کو یہاں کے ادھورے کام بھی انجام دینا ہیں۔''

سیاح روہانسا ہوگیا۔ ''بیشک یہ اندوہناک خبر ہے مگر میری رائے میں فاتح خان کو قراقرم کے بجائے مصر جانا چاہیے کیونکہ کام ادھورے چھوڑنا عقلمندی نہیں۔''

سیاح کی بات کئی منگول سرداروں اور خود دوقوز کو بہت اچھی لگی، ایک نے کہا۔ ''ان دنوں جب ہمارے خان اعظم چنگیز خان کا انتقال ہوا تھا، سوبودائی بہادر مشرقی یورپ میں الجھا ہوا تھا چنانچہ وہ قراقرم جانے کے بجائے اپنے ادھورے کام مکمل کرتا رہا۔''

دوقوز نے کہا۔ ''یہ لوگ سچی باتیں کر رہے ہیں، آپ اپنے ادھورے کام پورے کیجیے۔ مصر کو فتح کیجیے۔ قراقرم میں آپ کے دوسرے بھائی بھی موجود ہیں۔ برابر کے حق دار اور آپ ہی جتنے اختیار رکھنے والے بھائی، یہاں آپ کی ایک حیثیت ہے، ایک مقام ہے، مرتبہ ہے۔ یہاں جو آپ کے زیر نگیں ہے، وہ تو آپ کا ہے ہی اور مزید جو فتح کریں گے، وہ بھی آپ کی اولاد کے کام آئیں گے۔''

ہلاکو خان خاموش تھا۔ وہ کسی فیصلے پر پہنچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کے بعد اس نے اپنے ایک فوجی سردار کو آواز دی۔ ''قط بوغا! ذرا میرے قریب آ۔''

قط بوغا اگلی صف میں داہنی جانب بیٹھا تھا۔ وہ اپنی جگہ پر کھڑا ہوگیا۔

ہلاکو خان نے پوچھا۔ ''تو نے اب تک کتنی جنگیں لڑی ہیں؟''

قط بوغا نے جواب دیا۔ ''تقریباً سینتیس جنگیں۔''

ہلاکو خان نے پوچھا۔ ''اس میں سے کتنی جنگوں میں تو ہارا اور کتنی جنگوں میں فتح مند ہوا؟''

قط بوغا نے جواب دیا۔ ''میں نے آج تک شکست کا منہ نہیں دیکھا، ہمیشہ ہی فتح مند رہا ہوں۔''

ہلاکو خان نے اعلان کر دیا۔ ''میں قراقرم واپس جاؤں گا کیونکہ میں اپنے دادا چنگیز خان کی نافذ کی ہوئی رسم قوریلتائی سے انحراف نہیں کر سکتا۔ میں قوریلتائی میں شرکت کروں گا اور میری عدم موجودگی میں قط بوغا مصر پر لشکر کشی کرے گا اور بغداد کی طرح قاہرہ کی اینٹ سے اینٹ بجا دے گا۔''

قط بوغا نے تین بار احتراماً اپنا سر ہلاکو خان کے سامنے جھکایا اور اپنی جگہ پر واپس آگیا۔

سیاح نے ہلاکو خان کی خدمت میں ایک اور درخواست کی، بولا۔ ''خان محترم! میں نے آپ جیسا لشکر نہیں دیکھا۔ کیا میں گھوم پھر کر ان بہادروں اور جیالوں کی زیارت کر سکتا ہوں؟''

ہلاکو خان نے درشت لہجے میں پوچھا۔ ''سیاح! تو کیسا انسان ہے۔ جا میرے لشکر کے جیالوں کو بھی دیکھ لے اور اس کے بعد دفعان ہوجا۔''

سیاح اپنے ساتھیوں کے جھرمٹ سے باہر نکلا اور نہایت آزادی سے لشکر میں گھومنے لگا۔

منگول ان پریشان حال لوگوں کو حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ ان کے بوسیدہ کپڑوں کے اندر سے ان کے جسم جھانک رہے تھے۔ سیاح کہیں کہیں رک کر منگولوں سے سوال جواب بھی کرنے لگا۔ اس نے کئی منگولوں سے یہی کہا۔ ''دیکھو، مصر پر حملہ کرنا نہ بھولنا۔ وہاں کے سلطان نے تمہارے قاصدوں کو قتل کر کے ان کے سر ایل خان کی خدمت میں بھیج دیے ہیں۔''

منگولوں کی سمجھ میں یہ آدمی نہیں آرہا تھا۔ وہ سارا دن ادھر ادھر گھومتا پھرتا رہا۔ شام سے ذرا پہلے وہ دوقوز کے خیمے کے پاس سے گزرا۔ اس کا سرخ چوبی چھپل خیمہ سے ملحق دور ہی سے نظر آرہا تھا۔ دوقوز کے خیمے کے در پر ادھیڑ عمر اور بوڑھے پادری اذن باریابی کے لیے کھڑے تھے۔ وہ کچھ دیر کھڑا چوبی چھپل کو بغور دیکھتا رہا۔ اس دوران چھپل کا پردہ اٹھا۔ اس میں سے دوقوز نمودار ہوئی۔ دوقوز کے ساتھ چند حسین و جمیل لڑکیاں بھی تھیں اور یہ آہستہ آہستہ پادریوں کی طرف بڑھیں۔ اچانک دوقوز کی نظر سیاح پر پڑگئی۔ وہ ٹھٹک کر کھڑی ہوگئی اور ایک لڑکی کو سیاح کے پاس بھیجا۔ لڑکی نے کہا۔ ''ملکہ عالیہ پوچھ رہی ہیں کہ کیا مجھ سے کچھ کہنا ہے؟''

سیاح نے جواب دیا۔ ''ہاں، مجھے ملکہ عالیہ سے چند باتیں کرنا ہیں۔''

لڑکی جواب لے کر فوراً واپس آگئی۔ بولی۔ ''ملکہ عالیہ آپ کو بلا رہی ہیں۔''

سیاح نے اپنے ساتھیوں کو وہیں کھڑا رہنے دیا اور خود دوقوز کے پاس چلا گیا۔

دوقوز اس کو دیکھ کر مسکرائی۔ ''سادہ لوح سیاح! کیا بات ہے؟''

سیاح نے جواب دیا۔ ”اگر آپ میری سفارش نہ کرتیں تو شاید ہم سب قتل کر دیے جاتے۔ میں اپنی اور اپنے جملہ ساتھیوں کی طرف سے آپ کا شکریہ ادا کرنا چاہتا تھا۔“

دوقوز نے کہا۔ ”شکریہ ادا کرلیا...... بس یا کچھ اور؟“

سیاح نے جواب دیا۔ ”بس اب میں چلا جاؤں گا۔“

اب دوقوز بوڑھے پادریوں سے مخاطب ہوئی۔ ”آپ صاحبان کو مجھ سے کچھ کہنا ہے؟“

ایک پادری نے کہا۔ ”سنا ہے ہلاکو خان نے قوریلتائی میں شرکت کا فیصلہ کرلیا ہے اور مصر کی مہم کو قط بوغا کے سپرد کر دیا ہے۔“

دوقوز نے جواب دیا۔ ”میں ہلاکو خان کے اس فیصلے کو نہیں بدل سکتی لیکن میں یہ یقین دلاتی ہوں کہ قوریلتائی میں شرکت کے بعد وہ فوراً واپس آئے گا۔“

پادری نے کہا۔ ”ملکہ عالیہ! ہم لوگ آپ کو مسیحیت کی پشت پناہ اور سرپرست سمجھتے ہیں۔ یروشلم کی آزادی کا خواب ہنوز شرمندۂ تعبیر نہیں ہوا اور یہ سارے کام ہلاکو خان ہی انجام دے سکتا ہے۔“

دوقوز نے جواب دیا۔ ”آپ لوگ زیادہ فکر نہ کریں۔ دو ڈھائی سال پلک جھپکتے گزر جائیں گے۔“

ادھیڑ عمر پادری آگے بڑھا اور اپنے خدشات ظاہر کیے۔ ”ملکہ عالیہ! آپ نہیں جانتیں، آپ لوگ جیسے ہی یہاں سے جائیں گے مصر کا غلام بادشاہ ہمیں سزا دیے بغیر نہیں رہے گا کیونکہ وہ مسیحیوں پر آپ کی نوازشوں سے بہت برہم ہے۔“

دوقوز نے جواب دیا۔ ”آپ لوگ ذرا بھی نہ گھبرائیں، مصر کا غلام بادشاہ اتنی ہمت نہیں کر سکتا۔“

دوقوز نے دیکھا کہ سیاح اس کی باتیں بڑے انہماک سے سن رہا ہے، اس نے سیاح کو حکم دیا کہ وہ فوراً وہاں سے چلا جائے۔ سیاح اپنے ساتھیوں کو لے کر وہاں سے ہٹ گیا۔

جب یہ لوگ ہلاکو خان کے لشکر سے جدا ہو رہے تھے تو سیاح اپنے آدمیوں میں درداغ کی کمی محسوس کر رہا تھا۔ درداغ کا کہیں پتا نہ تھا۔ اس کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ وہ ڈرا کہ کہیں درداغ پکڑا تو نہیں گیا۔ وہ بعجلت ہلاکو خان کے لشکر سے نکلا اور قاہرہ کے لیے روانہ ہو گیا۔

ایک منزل دور نکل آنے کے بعد، جب وہ دم لینے کے لیے ایک پہاڑ کے دامن میں ٹھہرا تو یہاں اچانک درداغ سے بھی ملاقات ہو گئی۔

سیاح نے پوچھا۔ ”تو کہاں چلا گیا تھا؟ میری تو جان ہی نکل گئی تھی تجھ کو اپنوں میں نہ دیکھ کر۔“

درداغ نے جواب دیا۔ ”جب میں نے یہ دیکھا کہ میں پہچانا جاؤں گا تو چپ چاپ وہاں سے کھسک لیا اور یہاں آپ لوگوں کی واپسی کا انتظار کرتا رہا۔“

سیاح خوب قہقہے مار مار کر ہنس رہا تھا۔ ”ہلاکو خان بہت ہوشیار اور چالاک بنتا ہے، کہاں گئی اس کی چالاکی۔ میں نے اس کو بے وقوف بنا دیا۔ میں نے یہ بھی معلوم کرلیا کہ اب میرا مقابلہ قط بوغا سے ہوگا۔ مجھے یہ بات بھی معلوم ہوگئی کہ ہلاکو خان کی پشت پر مسیحی ہیں۔ میں اپنے دشمنوں کو اچھی طرح پہچان چکا ہوں۔“

درداغ نے اعتراض کیا۔ ”بہرحال میں اس کی چالاکیوں اور بھولے پن سے دور رہنا چاہتا ہوں کیونکہ میں جانتا ہوں کہ میری ذرا سی بھول چوک مجھے نقصان پہنچا سکتی ہے، آپ کو اتنا بڑا خطرہ نہیں مول لینا چاہیے تھا۔“

سیاح نے اس کو ڈانٹ دیا۔ ”چپ رہ بگوڑے منگول! اکام ای جرأت رندانہ سے انجام پاتے ہیں۔“

وہ شب و روز دھاوے مارتا قاہرہ پہنچ گیا۔ مصر کا مملوک سلطان قطز اس کی گمشدگی سے پریشان تھا۔ وہ سیدھا قصر سلطانی پہنچا اور سلطان قطز کو اپنی آمد کی خبر دی۔ درداغ اس وقت بھی اس کے ساتھ تھا۔ سیاح نے کہا۔ ”درداغ! میں کیا ہوں، کون ہوں اور یہاں میرا اصل منصب کیا ہے، آج میں تجھے سب کچھ بتا دوں گا۔“

سلطان سیف الدین قطز اپنے آراستہ پیراستہ کمرے میں اپنے ساتھی کا انتظار کر رہا تھا۔ جب وہ سلطانی کمرے میں درداغ کے ساتھ داخل ہوا تو سلطان نے اس پر اعتراض کیا، کہا۔ ”رکن الدین! بہرحال اتنی بے تکلفی ٹھیک نہیں۔“

سیاح رکن الدین نے جواب دیا۔ ”سلطان! کیا ٹھیک ہے اور کیا ٹھیک نہیں، میرے دل و دماغ اس کا فوراً فیصلہ کر لیتے ہیں۔ میں درداغ کو اپنا سمجھتا ہوں اور میں اپنوں کو دھوکا نہیں دے سکتا۔“

درداغ ان دونوں کی باتیں سن رہا تھا اور ایسا لگتا تھا گویا دو سلطان آپس میں الجھے ہوئے ہیں۔

سلطان قطز نے کہا۔ ”رکن الدین! تو کچھ بتائے بغیر ہی غائب ہو گیا تھا۔ میں بہت پریشان تھا اور یہ سوچ رہا تھا کہ اگر تیری عدم موجودگی میں ہلاکو خان نے حملہ کر دیا تو میں کیا کروں گا۔“

سیاح رکن الدین نے اپنی داستان مزے لے لے

کر سلطان قطز کو سنائی اور آخر میں کہا۔ ”مجھے ان شرارتوں میں مزہ آتا ہے۔“

سلطان قطز نے پوچھا۔ ”پھر اب کیا ہوگا؟“

سیاح رکن الدین نے جواب دیا۔ ”اب میں ہلاکو خان کے خلاف جنگ کروں گا اور میں منگولوں کو اتنا موقع نہیں دوں گا کہ وہ قاہرہ آئیں بلکہ میں خود ان کے سر پر پہنچ جاؤں گا۔ میں رکن الدین بیبرس ہوں، قاہرہ کی افواج کا سپہ سالارِ اعلیٰ۔“

درداغ کو اس تعارف سے چکر سا آ گیا۔ افواج مصر کا سپاہ سالار اعلیٰ جو کبھی مسخرہ بنا، کبھی سائیس اور کبھی سیاح۔

رکن الدین بیبرس نے سلطان سے کہا۔ ”سلطان! میں آپ کو پریشان نہیں کروں گا لیکن جنگ سے پہلے میں چند اصولی باتیں طے کر لینا چاہتا ہوں۔“

سلطان قطز نے پوچھا۔ ”کون سی اصولی باتیں؟ صاف صاف بات کرو۔“

رکن الدین بیبرس نے کہا۔ ”سلطان! کیا آپ تنہا ہلاکو خان اور اس کے لشکر کا مقابلہ کر سکتے ہیں؟“

سلطان قطز نے جواب دیا۔ ”نہیں، میں یہ جنگ تنہا نہیں لڑ سکتا۔“

رکن الدین بیبرس نے کہا۔ ”سلطان! میں شام کے کئی شہروں کو اپنی آنکھوں سے دیکھ آیا ہوں۔ اگر میں منگولوں کو شکست دینے میں کامیاب ہو جاؤں تو مجھے اس کا صلہ کیا ملے گا؟“

سلطان قطز نے نہایت فیاضی سے جواب دیا۔ ”میں ہر وہ چیز انعام میں دے دوں گا جس کا تم مطالبہ کرو گے۔“

رکن الدین بیبرس نے کہا۔ ”میں چاہتا ہوں کہ جب میں منگولوں کو شکست دے کر منتشر کر دوں تو آپ حلب کی حکومت مجھے بخش دیں۔ میں حلب پر حکومت کرنا چاہتا ہوں۔“

سلطان قطز نے جواب دیا۔ ”منظور۔ یہ میرا وعدہ ہے کہ جب منگول منتشر کر دیے جائیں گے تو حلب کی حکومت تمہارے نام کر دی جائے گی۔“

رکن الدین بیبرس نے کہا۔ ”بات ختم ہوئی، اب مجھے کوئی بھی بات نہیں کرنا۔“

وہ درداغ کو ساتھ لیے ہوئے باہر نکلا۔ رکن الدین بیبرس بہت خوش تھا، اس کا تیز طرار دماغ کچھ اور منصوبے بنا رہا تھا۔

☆☆☆

مصر میں لام بندی کا سلسلہ جاری تھا۔ رکن الدین بیبرس ان لوگوں کے خلاف بڑی سختیاں کرتا جو فوج میں نام لکھانے سے گھبراتے تھے۔ درداغ جب سے رکن الدین بیبرس سے متعارف ہوا تھا، وہ دولت مند مصری کے پاس نہیں جا سکا تھا۔ حالانکہ اس دوران کئی بار وہ رنگین محفل بہت یاد آئی جو وہ ممفس کے ایک اہرام کے اندر گزار چکا تھا۔ عورتوں اور لڑکیوں کی کشش درداغ کو ایک بار پھر مصری دولت مند کے پاس کھینچ لے گئی۔ مصری دولت مند اس کو دیکھتے ہی کھڑا ہو گیا، پوچھا۔ ”تو کہاں چلا گیا تھا؟“

درداغ نے جواب دیا۔ ”اس دوران میں بھی بہت زیادہ مصروف رہا۔ آپ کو شاید معلوم ہوگا کہ سلطان قطز نے ہلاکو خان کے وفد کو قتل کر کے ان کے سر ہلاکو خان کی خدمت میں روانہ کر دیے ہیں۔“

مصری دولت مند نے ایک سرد آہ بھری، بولا۔ ”تو بہت بدنصیب ہے۔ مجھ کو تو افسوس ہوتا ہے کہ تو میرے پاس رہا مگر بے کار۔ یہ بھی کوئی بات ہے۔ اگر تو میرے پاس اپنا زیادہ وقت گزارے گا تو تجھ کو بہت ساری باتیں بھی معلوم ہو جائیں گی۔“

اس روز مصری دولت مند درداغ کے ساتھ ایک بار پھر ممفس کے اہرام کی طرف گیا۔ مصری دولت مند نے اسی ترکیب سے اہرام میں داخل ہو کر اندر خوشبو جلائی اور ادھر ادھر سرگوشی میں آوازیں دے کر تین حسین لڑکیوں کا رقص دیکھنے اور گانا سننے لگا۔ یہ تینوں لڑکیاں پہلی ساتوں سے زیادہ حسین تھیں۔ اس نے سرگوشی میں درداغ سے کہا۔ ”یہ ساری لڑکیاں تجھ پر قربان، جو پسند آئے اپنے ساتھ لے جا۔“

درداغ نے جواب دیا۔ ”افسوس کہ مجھ کو جس لڑکی کی تلاش ہے وہ نہیں مل رہی اور شاید میں اس لڑکی کو زندگی بھر نہ پا سکوں۔“

مصری دولت مند نے کہا۔ ”درداغ! مایوسی کفر ہے۔ جس لڑکی کی تجھ کو تلاش ہے، وہ بھی تجھ کو مل سکتی ہے مگر تو ذرا صبر کر، میں تیرے ساتھ اس لڑکی کو تلاش کروں گا۔“

درداغ خاموش ہو گیا۔ تینوں لڑکیاں ان دونوں کو اپنے رقص و سرود سے لطف اندوز کر رہی تھیں لیکن مصری دولت مند کا دل نہیں لگ رہا تھا۔ وہ بہت بے چین تھا۔ وہ بار بار ایک ہی بات کہتا تھا۔ ”درداغ! تو میرے کاروبار میں میری مدد کر، پھر دیکھ تو کہاں سے کہاں جا پہنچے گا۔ تو کہاں سلطان مصر کے چکر میں پھنس گیا۔“

درداغ نے جواب دیا۔ ”آپ میرے محسن ہیں۔ میں کئی بار آپ سے یہ کہہ چکا ہوں کہ مجھے اپنے کاروبار کی

نوعیت تو بتائیں۔ میں آپ کی مدد ضرور کروں گا...... رہ گیا یہ
کہ میں سلطان کے لیے کوئی کام کر رہا ہوں تو اس میں
پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ وہ کام بھی بہت ضروری ہے۔
اگر منگول سیلاب کو پوری قوت سے روکا نہ گیا تو وہ بغداد کی
طرح قاہرہ کا بھی سب کچھ بہالے جائے گا۔"

مصری دولت مند نے اچانک سوال کیا۔ "اچھا یہ بتا
ان تینوں میں سے کوئی پسند ہے تجھ کو؟"

درداغ نے ایک لڑکی کی طرف اپنی انگلی اٹھادی،
بولا۔ "یہ بہت اچھی لگ رہی ہے مجھے۔"

مصری دولت مند نے اس لڑکی کا ہاتھ پکڑ کر درداغ کے
حوالے کردیا، بولا۔ "میں نے تجھے بخش دی لے جا لیکن اس کی
شرط بھی ہے کہ تو میرا ہاتھ بٹا، کاروبار میں تعاون کر۔"

درداغ نے لڑکی کا ہاتھ پکڑا اور اس کو اپنے ساتھ لے
جانے لگا۔ مصری دولت مند اچانک اپنی جگہ سے اٹھا اور
لڑکی کو اپنے قابو میں کیا، بولا۔ "نہیں، ابھی نہیں۔ یہ بات
غلط ہے۔ یہ لڑکی اس دن تیرے حوالے کردوں گا جس دن تو
میرے کاروبار میں میرا ہاتھ بٹائے گا۔ اگر میں محنت کے
بغیر لڑکی تیرے حوالے کردوں گا تو تو اس کا عادی ہو جائے گا
اور میں ایسا نہیں ہونے دوں گا۔"

درداغ نے بیزاری کا اظہار کیا، بولا۔ "افسوس کہ
میں آپ کو سمجھ نہیں سکا۔"

مصری دولت مند نے جواب دیا۔ "درداغ! میں اتنا
پیچیدہ بھی نہیں۔ میں سیدھا سادا انسان ہوں بس ذرا حجاب
مانع آجاتا ہے ورنہ میں اسی وقت یہ بتا سکتا ہوں کہ میرا کیا
کاروبار ہے اور تو اس میں میری کیا مدد کر سکتا ہے۔"

درداغ اٹھ کر اہرام سے نکلنے لگا، بولا۔ "یہ ہماری
آپ کی آخری ملاقات ہے۔ میں نے سلطان کی پیشکش
قبول کرلی ہے اور عنقریب وہاں بہت زیادہ مصروف
ہو جاؤں گا۔"

مصری تاجر نے دوڑ کر اس کا راستہ روک لیا، بولا۔
"میں تجھ کو نہیں جانے دوں گا۔ میں تجھ کو ناراض نہیں کروں
گا۔ تجھ کو یہ لڑکی پسند ہے، لے جا۔ اپنے ساتھ لے جا لیکن یہ
یاد رہے کہ تو میرے کاروبار میں میری مدد ضرور کرے گا۔"

درداغ نے جواب دیا۔ "جب تک مجھ کو یہ نہ معلوم
ہو جائے کہ آپ کا کاروبار کیا ہے اور مجھ کو اس میں کس قسم کی
مدد کرنی ہے، میں مدد کا وعدہ نہیں کر سکتا۔ رہ گئی یہ لڑکی، تو اس
کو اپنے پاس ہی رکھیے۔ جب ضرورت محسوس کروں گا،
مانگ لوں گا۔"

مصری دولت مند کی باچھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں، بولا۔
"ضرورت! یہ تو کیا کہہ رہا ہے؟ ارے کون ہے وہ جوان یا
نوجوان جس کو لڑکی کی ضرورت نہ ہو۔ میں نے یہ لڑکی
تیرے حوالے کی، اس کو اپنے ساتھ لے جا۔"

درداغ نے انکار کردیا۔ "نہیں، میں اس کو نہیں لوں گا۔"

مصری دولت مند نے لڑکی کی گدی میں ہاتھ دے دیا
اور اس کو دھکیلتا ہوا درداغ کے پاس تک لے گیا پھر اس کو
درداغ کے سامنے کھڑا کر کے بولا۔ "لے سنبھال اسے، تو
بھی کیا یاد کرے گا۔"

درداغ بے بس ہو گیا، وہ ثانیہ بھر اس کی صورت
دیکھتا رہا، بولا۔ "میں اس کو لے تو جا سکتا ہوں لیکن ڈر ہے
کہ آپ اس کو مجھ سے واپس لے کر شرمندہ نہ کردیں۔"

مصری دولت مند نے کہا۔ "لیکن میں ایسا کیوں
کروں گا، کیا میں پاگل ہوں، کیا میں دیوانہ ہوں؟"

درداغ نے آہستہ سے جواب دیا۔ "وہ تو مجھے پتا نہیں
کہ آپ پاگل ہیں یا دیوانے لیکن آپ کچھ نہ کچھ ہیں ضرور۔"

درداغ اس لڑکی کو لے کر اہرام سے باہر آگیا۔

اس نے لڑکی کو گھوڑے پر اپنے آگے بٹھا دیا اور اپنے
گھر کی طرف چل دیا۔ ابھی وہ زیادہ دور نہیں گیا تھا کہ مصری
دولت مند بھی اپنے گھوڑے کو دوڑاتا ہوا اس کے قریب پہنچ
گیا، پوچھا۔ "درداغ! تو اس کو کہاں لے جائے گا؟"

درداغ نے جواب دیا۔ "میں اس کو کہیں بھی لے
جاؤں، آپ کو کیا؟"

مصری دولت مند نے اس کا راستہ روک لیا، کہا۔
"اگر تو میرا مشورہ قبول کرے تو میں تجھ کو یہ رائے دوں گا کہ
میرے قصر میں چل اور کچھ دن میرے ساتھ رہ۔"

درداغ بھی مصری دولت مند کی بات ماننے پر مجبور تھا
کیونکہ وہ اس لڑکی کے ساتھ رکن الدین بیبرس کے پاس
نہیں جا سکتا تھا۔ وہ مصری تاجر کے ساتھ اس کے محل پہنچا۔
درداغ نے اس لڑکی کو بہت قریب سے تا دیر مصری دولت
مند کے محل میں جو دیکھا تو دنگ رہ گیا۔ وہ لڑکی سے تعارف
حاصل کرنا چاہتا تھا مگر مصری دولت مند اس کے پاس بیٹھ گیا
اور لگا ادھر ادھر کی باتیں کرنے۔ "ایک یہی کیا، میرے
پاس اس جیسی کتنی ہی لڑکیاں ہیں اور انہیں میں نے گراں
قیمتوں میں خریدا ہے اور جب میں کسی شخص کو کوئی لڑکی پیش
کرتا ہوں تو اس کا ایک ہی مطلب ہوتا ہے کہ میں اس شخص
سے کوئی بڑا کام نکالنا چاہتا ہوں۔"

درداغ نے گویا اس کی بات سنی ہی نہیں، بولا۔

"اچھا۔ اس وقت تو میں آرام کروں گا، بقیہ باتیں بعد میں ہوں گی۔"

مصری دولت مند نے بے رخی سے جواب دیا۔ "آرام کروں گا۔ کیا مطلب؟ لڑکی کو تو، تو نے دیکھ ہی لیا اور شاید تجھے یہ پسند بھی آگئی۔ اب میں معاملہ کرنا چاہتا ہوں۔"

درداغ نے جواب دیا۔ "میں اس وقت کوئی بات نہیں کروں گا۔"

مصری دولت مند نے لڑکی کا ہاتھ پکڑا اور اس کو ایک دوسرے کمرے کی طرف لے جاتے ہوئے کہا۔ "لڑکی تجھے پسند آگئی، بس یہی کافی ہے۔ یہ تیرے حوالے اس وقت کی جائے گی جب تو میرے لیے باقاعدہ کام شروع کردے گا، اس سے پہلے نہیں۔"

درداغ کی آتش شوق بھڑک چکی تھی، پوچھا۔ "اس لڑکی کا نام کیا ہے؟"

مصری دولت مند نے جواب دیا۔ "پتا نہیں، اس کا کیا نام ہے۔ پہلے کام، بعد میں نام۔"

درداغ نے پوچھا۔ "آپ کام کی نوعیت تو بتاتے نہیں، میں آپ کا کام کرنے کو تیار ہوں اگر مجھے کام کی نوعیت ضرور معلوم ہونی چاہیے۔"

مصری دولت مند نے جواب دیا۔ "میں تاجر ہوں، تجارت کرتا ہوں۔ تم میرے آدمیوں کے ساتھ چلے جاؤ اور کام میں ان کا ہاتھ بٹاؤ۔"

درداغ نے کہا۔ "مگر میں کہیں اور کام کی بات کر چکا ہوں......"

مصری دولت مند نے بات کاٹ دی۔ "تجھ پر پہلا حق میرا ہے۔ تو وہاں انکار بھی کرسکتا ہے اور پھر یہ کہ جو فائدہ تجھ کو مجھ سے حاصل ہوگا، کسی اور کام یا کسی اور شخص سے حاصل نہیں ہوسکتا۔"

اس لڑکی نے درداغ کے شوق کی ہوا کو بہت تیز کردیا تھا۔ اس وقت اسے نہ تو علیہ یاد رہی تھی اور نہ ہی صفیہ۔ یہ لڑکی آناً فاناً اس کے دل و دماغ پر چھا گئی تھی۔ اس کا دل ڈانواں ڈول ہو رہا تھا۔ وہ بے بس ہوتا جا رہا تھا۔ اگر اس کا واسطہ رکن الدین بیبرس کے بجائے کسی اور سے پڑا ہوتا تو شاید وہ اس سے پیچھا چھڑا لیتا۔

مصری دولت مند بھانپ چکا تھا کہ درداغ پسپا ہو چکا ہے۔

درداغ نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "میں آپ کا کام کروں گا مگر دو تین دن بعد سے کیونکہ مجھے اس دورانیے کی رخصت لینا پڑے گی۔"

مصری دولت مند نے کہا۔ "تب پھر یہ لڑکی بھی اسی وقت تیرے حوالے کی جائے گی اور میں یہ وعدہ بھی کرتا ہوں کہ اگر تو میرے لیے مفید ثابت ہوا تو میں تیری علیہ اور صفیہ کو بھی تیرے لیے ڈھونڈ نکالوں گا۔"

درداغ کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا، مایوسی سے بولا۔ "اب وہ دونوں کہاں ملیں گی؟ معلوم نہیں کہاں ہوں گی۔"

مصری دولت مند یہ سمجھ چکا تھا کہ درداغ زیر ہو چکا ہے اس نے ایک اور بھرپور وار کردیا۔ "یہ میں وعدہ کر رہا ہوں کہ میں علیہ اور صفیہ کو کہیں نہ کہیں سے تجھے فراہم کردوں گا اور میں کبھی بھی جھوٹا وعدہ نہیں کرتا۔"

درداغ نے بے چینی سے کہا۔ "میں یہ کب کہہ رہا ہوں کہ آپ جھوٹے وعدے کرتے ہیں۔ میں تو صرف یہ کہہ رہا ہوں کہ آپ مجھ کو ذرا سا موقع ضرور دیں کیونکہ میں نہیں چاہتا کہ اپنا اعتماد اور اپنا اعتبار مجروح کروں۔"

مصری دولت مند اس کو تنہا چھوڑ کر چلا گیا۔ درداغ کا خیال تھا کہ مصری دولت مند لڑکی کو دوبارہ اس کے پاس لے آئے گا لیکن وہ نہیں آیا۔ درداغ دل برداشتہ اٹھا اور باہر نکل کر اپنے گھوڑے کی پشت تھپتھپائی اور اس پر بیٹھ کر رکن الدین بیبرس کے پاس چلا گیا۔

☆☆☆

رکن الدین بیبرس کو عام طور پر کماندار کہا جاتا تھا۔

اس نے قاہرہ کے بازار بردہ فروشاں میں ایک بڑا ہجوم دیکھا، وہاں ایک میلا سا لگا ہوا تھا۔ درداغ نے اس کو کوئی اہمیت نہیں دی اور چپ چاپ نکل جانا چاہا مگر ایک گھڑسوار اس ہجوم سے نکلا اور درداغ کی طرف بھاگا چلا گیا...... درداغ نے اس کو اپنی طرف آتے دیکھا تو اپنے گھوڑے کی رفتار سست کردی۔

گھڑسوار نے اس کے قریب پہنچ کر یہ خبر سنائی کہ کماندار آپ کو یاد کر رہا ہے۔ درداغ نے اپنے گھوڑے کا رخ قاہرہ کے بردہ فروشاں کی طرف موڑ دیا۔

ہجوم میں ایک شخص زرق برق لباس پہنے ہاتھ میں کوڑا لیے ادھر ادھر ٹہل رہا تھا۔ اس نے درداغ کو دیکھتے ہی حقارت سے کہا۔ "کیا غفلت اور گمراہی کو دور کرنے کے لیے بغداد کی تباہی کافی نہیں؟"

درداغ نے بناوٹی سادہ لوحی سے کہا۔ "میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔"

کماندار بیبرس نے جواب دیا۔ ''وہ منگولوں کے خلاف تیرے سینے میں انتقامی آتش فشاں روشن ہونا چاہیے تھا مگر میں دیکھ رہا ہوں کہ تو عورتوں اور لڑکیوں کے چکر میں پڑا ہوا ہے حالانکہ ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا۔''

درداغ نے عرض کیا۔ ''میں نہیں جانتا کہ آپ کہنا کیا چاہتے ہیں۔''

کماندار بیبرس نے گرم ہو کر جواب دیا۔ ''مجھ کو اس شخص سے نفرت ہے جو باتیں بہت زیادہ بنا لیتا ہے اور میں اس شخص کو بالکل ناکارہ اور فضول سمجھتا ہوں جو اپنے مستقبل کو دور تک نہیں دیکھ سکتا اور جس کا مستقبل عورت اور لڑکیاں ہوں، اس کی عظمت اور بڑائی بھی مشکوک ہی ہوتی ہے۔''

کماندار بیبرس اس کو ذلیل کیے جا رہا تھا۔ درداغ کا پورا وجود غصے سے پھنکا جا رہا تھا۔ وہ اتنا آگ بگولا ہو رہا تھا کہ یہی جی میں آتا تھا کہ تلوار نکال کر اس کے دو ٹکڑے کر دے۔ اس نے غضب ناک نظروں سے بیبرس کماندار کی طرف دیکھا تو وہ مسکراتا ہوا نظر آیا۔ درداغ کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ اس نے ایک بار پھر کماندار بیبرس کی طرف دیکھا، وہ اب بھی مسکرا رہا تھا۔ اس نے اس بار بیبرس کی آواز بھی سنی، وہ کہہ رہا تھا۔ ''درداغ! بغداد کی سسکیاں سن، وہ تجھ پر ملامتیں کر رہا ہے۔ عورت مرد کی کمزوری ہے لیکن اب اتنی بھی نہیں۔ تو کس چکر میں پڑ گیا درداغ۔''

درداغ کا غصہ کافور ہو چکا تھا۔ اس نے کماندار بیبرس کے آگے اپنا سر جھکا دیا، بولا۔ ''میں اپنے کیے پر شرمندہ ہوں۔''

کماندار بیبرس نے ہجوم کی طرف اشارہ کیا۔ ''یہ وہ لوگ ہیں جو منگولوں کے خلاف صف آرا ہونا چاہتے ہیں۔ اب وقت نہیں رہا۔ انہیں تربیت دے کر دمشق یا حلب کی طرف لے جانا ہے کیونکہ میں منگولوں کا انتظار نہیں کروں گا۔ میں مدافعانہ نہیں جارحانہ جنگ کا قائل ہوں۔''

کماندار بیبرس نے درداغ کو ان کے سامنے سے گزارا اور اس کا شاندار تعارف کرایا۔ کماندار بیبرس نے درداغ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''لوگو! یہ شخص خود بھی منگول ہے۔ یہ مسلمان ہو چکا ہے اور جب میں منگولوں پر حملہ آور ہونے کا خیال کرتا ہوں تو اس میں درداغ کو سب سے آگے دیکھتا ہوں۔ میں اس پر فخر کرتا ہوں کہ اس نے اسلام کی خاطر اپنا سب کچھ چھوڑ دیا۔''

اب درداغ کے دل میں محبت اور رافت کا دریا موجزن ہو چکا تھا۔ وہ کماندار بیبرس کی صلاحیتوں کا قائل ہو چکا تھا جو جب چاہے دلوں میں نفرت اور غصے کی آگ روشن کر دے اور پھر انہی دلوں میں محبت اور مہربانی کے سوتے پیدا کر دے۔ درداغ ایک دم مجبور اور بے بس ہو چکا تھا۔

اس دن اس چوک بردہ فروشاں سے چھ ہزار سپاہی ملے۔ کماندار بیبرس اترایا پھر رہا تھا، ایسا لگتا تھا گویا اس نے کوئی بہت بڑا معرکہ سر کر لیا تھا۔ کماندار نے اس ہجوم کو ساتھ لیا اور سلطانی محل کی طرف چل پڑا۔ ان سب کو سلطانی محل کے سامنے والے میدان میں ٹھہرا دیا گیا۔ ان کے لیے خیمے نصب کرا دیے گئے اور دیکھتے ہی دیکھتے گویا ایک چھوٹا قصبہ آباد ہو گیا۔

کماندار بیبرس درداغ کو تخلیہ میں لے گیا اور پوچھا۔ ''کیا تو مجھ سے بہت زیادہ ناراض ہوا تھا؟''

درداغ نے جواب دیا۔ ''میں اتنا ذلیل کبھی نہیں ہوا تھا جتنا......''

کماندار بیبرس نے فوراً ہی دوسرا سوال کر دیا۔ ''پھر تو ایک دم نرم کیوں پڑ گیا؟''

درداغ نے جواب دیا۔ ''آپ کی نرم اور شفقت آمیز باتیں سن کر اور میں اس کا برملا اظہار کرتا ہوں کہ میں نے آپ جیسا انسان نہیں دیکھا۔ میں نے ہلاکو خان کو دیکھا، خواجہ طوسی کو دیکھا امیر المومنین مستعصم باللہ اور وزیر ابن علقمی کو دیکھا۔ ان سب کو دیکھنے کے بعد میں نے آپ کو دیکھا اور اب میں یہ بات پورے اعتماد سے کہہ سکتا ہوں کہ میں نے آپ جیسا انسان نہیں دیکھا۔''

بیبرس نے شاید اس کی پوری بات سنی ہی نہیں۔ وہ درداغ کے پاس سے جا چکا تھا۔ اس وقت کماندار بیبرس کی نظریں ان خیموں پر جمی ہوئی تھیں جنہیں اس نے آج ہی نصب اور آباد کرایا تھا۔

کماندار بیبرس نے مصر کی شمال مشرقی سرحدوں پر چوکیاں بنوا دی تھیں اور ان چوکیوں سے بھی آگے شام کی سرحدوں میں اپنے مخبر اور جاسوس پھیلا دیے تھے جن کا کام یہ تھا کہ وہ ہلاکو خان اور اس کے عساکر کی نقل و حرکت پر نظریں رکھیں اور وہ جیسے ہی مصر کی طرف پیش قدمی کریں، کماندار بیبرس کو فوراً اس سے مطلع کر دیا جائے۔

بیبرس کا تیز ذہن مستقل سوچ بچار میں لگا ہوا تھا۔ اس کو معلوم تھا کہ جب سے چنگیز خان کے پوتے برقائی خان نے اسلام قبول کر لیا تھا، قراقرم اور ہلاکو خان کے اثرات برقائی خان پر کم ہو چکے تھے۔ اب برقائی خان اپنی قوم منگولوں کے بجائے اسلام اور مسلمانوں پر مہربان تھا۔ برقائی

خان اور ہلاکو خان کی مملکتوں کی حدود آپس میں ملی ہوئی تھیں۔ بیبرس کا تیز اور شاطر ذہن جنگ کی بساط پر ایک نئی چال چلنا چاہتا تھا۔ وہ ایک ایسی شہ دینا چاہتا تھا کہ ہلاکو خان جارحانہ کارروائی کے بجائے مدافعانہ چال پر مجبور ہوجائے۔

اس نے درداغ سے پوچھا۔ ''کیا تو منگول زبان میں لکھ پڑھ سکتا ہے؟''

درداغ نے جواب دیا۔ ''کیوں نہیں، وہ تو میری مادری اور آبائی زبان ہے۔''

بیبرس نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر برقائی خان کے نام ایک خط لکھوایا۔ اس خط میں اس نے لکھ دیا تھا۔ ''منگول قوم نے آج تک کسی مذہب کی طرفداری نہیں کی۔ خاقان اعظم کی نظر میں اس کی رعایا یا دنیا اولاد کی طرح ہے اس کی یکساں شفقت اور محبت کی حقدار اور مستحق مگر یہاں عراق میں ہلاکو خان نے جو کچھ کیا وہ نہایت افسوس ناک ہے۔ یہاں منگولوں کے زیر سایہ اور زیر سرپرستی میں صلیب بلند ہورہی ہے اور پرچم اسلام سرنگوں ہوتا چلا جارہا ہے۔ اس حال میں عالم اسلام اور مسلمانان عالم کی نظریں آپ ہی کی طرف اٹھتی ہیں۔ ان نامساعد حالات میں اگر آپ ساتھ نہیں دیں گے تو اور کون دے گا۔ آپ ہلاکو خان سے پوچھیے کہ وہ ایسا کیوں کررہا ہے؟''

یہ خط اسی وقت برقائی خان کی خدمت میں روانہ کردیا گیا۔

اب کماندار بیبرس نے درداغ کو سمجھانا شروع کیا۔ ''تو مصری دولت مند کو کب سے جانتا ہے؟''

درداغ نے جواب دیا۔ ''قاہرہ میں داخل ہوتے ہی میں نے مصری دولت مند کو پیش پیش دیکھا۔ وہ شاید اتنا برا انسان نہیں ہے جتنا کہ اس کو سمجھا جاتا ہے۔''

کماندار بیبرس نے کہا۔ ''خدا مصری دولت مند کے سائے تک سے بچائے۔''

درداغ نے جواب دیا۔ ''ہر شخص اپنے ذاتی تجربات کی روشنی میں اپنے تعلقات استوار کرتا اور توڑتا ہے۔ میں نے مصری دولت مند کو جو کچھ پایا، اسی روشنی کے مطابق اس سے میرے تعلقات ہیں۔''

کماندار بیبرس کو ایک بار پھر غصہ آگیا، بولا۔ ''میں کہتا ہوں تو اس سے ابھی واقف نہیں۔ اس کو میں جانتا ہوں اور وہ وقت زیادہ دور نہیں ہے جب تو بھی یہ کہہ سکے گا کہ اب میں بھی اس سے واقف ہوچکا ہوں۔''

درداغ نے شاید اس کی باتیں سنی ہی نہیں، بولا۔ ''آج میں آپ کی خدمت میں ایک چھوٹی سی درخواست پیش کرنا چاہتا ہوں۔''

کماندار بیبرس نے درداغ کو بغور دیکھا اور پوچھا۔ ''کیسی درخواست؟''

درداغ نے جواب دیا۔ ''میں مصری دولت مند کے کاروبار میں اس کا ہاتھ بٹانا چاہتا ہوں، اس کا ساتھ دینا چاہتا ہوں۔''

کماندار بیبرس نے کہا۔ ''تو غلط راستے پر جارہا ہے۔ کاروبار تو ہوتے ہی رہیں گے لیکن مصر اور اسلام کو اس وقت تیری ضرورت ہے۔''

درداغ نے کہا۔ ''میں نے مصری دولت مند سے وعدہ کرلیا ہے۔''

کماندار بیبرس نے سختی سے کہا۔ ''مجھ پر کسی کا حکم نہیں چل سکتا۔ میں چاہوں تو تجھ کو جبراً اپنے پاس روک لوں اور مصری دولت مند کو قید خانے میں ڈال دوں۔ میں جو چاہوں کروں، مجھے کون روک سکتا ہے لیکن میں ایسا کرنا نہیں چاہتا۔ میں صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ کیا تو مصری دولت مند کے کاروبار سے واقف ہے؟''

درداغ نے جواب دیا۔ ''کاروبار تو کاروبار ہی ہوتا ہے۔ میرے لیے اتنا ہی جان لینا کافی ہے کہ وہ میرے محسن کا کاروبار ہے۔''

کماندار بیبرس نے خلاف توقع اجازت دے دی، کہا۔ ''اگر تیری یہی مرضی ہے تو میں کیوں روکوں لیکن درداغ! یہ قراقرم نہیں ہے، مصر ہے۔ یہاں کی دنیا تیری دنیا سے بالکل مختلف ہے۔''

درداغ نے کہا۔ ''میں آپ کا شکر گزار ہوں حالانکہ مجھے ذرا سی بھی امید نہیں تھی کہ آپ مجھے جانے کی اجازت دے دیں گے۔''

کماندار بیبرس مسکرایا۔ ''میں نے اس لیے اجازت دے دی ہے کہ میں جانتا ہوں کہ تو میرے پاس بہت جلد واپس آئے گا۔ میں تجھ سے مایوس نہیں ہوں۔''

درداغ اجازت ملنے کے بعد ذرا دیر بھی وہاں نہیں ٹھہرا۔ سیدھا بھاگا ہوا مصری دولت مند کے پاس پہنچا اور کہا۔ ''دوست! میں آپ کا احسان مند ہوں، اس لیے آپ کے کام آنا چاہتا ہوں۔''

مصری دولت مند بہت خوش تھا، بولا۔ ''مجھ کو یقین نہیں تھا کہ تو میرے پاس واپس آئے گا۔''

دروداغ نے کہا۔ ''اب بتایئے وہ کس قسم کا کاروبار ہے جس میں آپ کو میری مدد درکار ہے۔''

مصری دولت مند نے جواب دیا۔ ''عجلت نہ کر، میرا کاروبار بھی معلوم ہوجائے گا۔ پہلے قسم کھا کہ تو میرا ساتھ نہیں چھوڑے گا۔''

دروداغ نے کہا۔ ''دوست! میں قسم نہیں کھاؤں گا کیونکہ حالات اور قسمت بعض اوقات اتنا مجبور کردیتے ہیں کہ انسان ان کی پابندی نہیں کرپاتا۔''

مصری دولت مند برابر ہنسے جارہا تھا، بولا۔ ''حالات اور قسمت کی بات نہ کر دروداغ! عورت اور لڑکی کی بات کر۔ تو نے میرا ساتھ اس لیے نہیں دیا کہ میں نے تجھ پر احسان کیا تھا اور تو اس احسان کے بدلے میرا ساتھ دے رہا ہے۔ میں نے جس لڑکی کو تیرے روبرو پیش کیا تھا، اس کا حسن، اس کا شباب بڑے بڑوں کو مسخر کرسکتا ہے۔ اگر میں اس لڑکی کو پیش نہ کرتا تو تو بھی میری مدد پر آمادہ نہ ہوتا۔''

دروداغ کو مصری دولت مند کی باتیں ناگوار گزر رہی تھیں مگر علیہ اور صفیہ کے بعد جو لڑکی اسے دکھائی گئی تھی، اس میں جو سحر اور کشش تھی اس کا اثر لامحالہ اور قطعی تھا۔ اس نے بات بنانے کی کوشش کی، بولا۔ ''لیکن وہ لڑکی جس کا آپ ذکر کررہے ہیں، ابھی تک مجھے ملی تو نہیں۔''

مصری دولت مند نے جواب دیا۔ ''نہیں ملی تو کیا ہوا؟ مل تو جائے گی۔''

وہ مصری دولت مند کا کئی دن مہمان رہا۔ اس کی خاطر مدارات میں بڑی تن دہی اور جانفشانی سے کام لیا گیا۔ کئی بار وہ لڑکی بھی اس کے سامنے کردی گئی لیکن تخلیہ نہیں ہونے دیا گیا۔ آتشِ شوق میں شدت ہوتی جارہی تھی اور مصری دولت مند اس سے کوئی کام نہیں لے رہا تھا۔ اس کو حیرت تھی اور غصہ بھی کہ کہاں تو وہ اتنا بے چین تھا کہ دروداغ کو اٹھتے بیٹھتے تنگ کر مارا تھا اور اب یہ حال تھا کہ وہ اس کا مہمان بنا ہوا تھا اور مصری دولت مند خاموش تھا۔ آخر ایک دن تنگ آکر اس نے کہا۔ ''دوست! کیا بات ہے، مجھ کو وہ کام بتاؤ جو مجھے انجام دینا ہے۔''

مصری دولت مند نے جواب دیا۔ ''صبر کر، ذرا تحمل سے کام لے ایسی بھی کیا جلدی۔''

دروداغ نے کہا۔ ''دوست! اگر مجھے یہ معلوم ہوتا کہ یہاں کچھ دیر ہے تو میں مصر کی تازہ دم نو وارد سپاہ کو تربیت دیتا رہتا۔ میری انہیں بڑی ضرورت تھی۔''

مصری دولت مند نے منہ بنا کر کہا۔ ''زیادہ باتیں نہ بنا۔ اگر میرے پاس تیرا دل نہیں لگ رہا تو واپس چلا جا۔ میں عجلت پسند نہیں کرتا۔''

دروداغ کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی تھی کہ آخر یہ پس وپیش کیوں؟ یہ تامل کیوں...... یہ تاخیر کیوں؟

تقریباً سترہ دن بعد مصری دولت مند نے دروداغ کو یہ خوشخبری سنائی کہ عنقریب اس کا کاروباری قافلہ سفر کا آغاز کرنے والا ہے۔ وہ بھی ان کے ساتھ جانے کی تیاری کرلے۔

دروداغ اپنی تیاریوں میں لگ گیا۔ اس کو قافلے والوں سے بھی ملادیا گیا۔ شروع سے آخر تک جس بات نے دروداغ کو حیرت زدہ رکھا، وہ یہ تھی کہ آخر تک اشیائے تجارت کا کہیں کوئی پتا نہ تھا۔ اس نے مصری دولت مند سے پوچھا بھی کہ وہ سامان کہاں ہے جس کو باہر لے جانا ہے۔

مصری دولت مند نے جواب دیا۔ ''تو اتنا پریشان کیوں ہے؟''

دروداغ نے کہا۔ ''میں پریشان اس لیے ہوں کہ میں بیکار نہیں بیٹھ سکتا۔ بیکاری مجھے بے حد تنگ کررہی ہے۔ میں کیا کروں۔ میں بھی مجبور ہوں۔''

مصری دولت مند نے کئی دن بعد اس کو ایک قافلے میں پہنچا دیا اور کہا کہ اس قافلے کا سردار جو حکم دے اس کی تعمیل کرنا۔ یہ کاروبار، اس کی نوعیت کے بارے میں قافلے کا سردار تمہیں سب کچھ بتادے گا اور دیکھو خبردار جذبات اور اشتعال میں کہیں کوئی ایسا ویسا قدم نہ اٹھا بیٹھنا۔

اب دروداغ کی حیرت اپنی انتہا کو پہنچ چکی تھی۔ قافلے میں سامانِ تجارت بالکل نہ تھا، ہاں ہتھیار بہت تھے۔ ایسا لگتا تھا گویا قافلہ کسی پر حملہ کرنے جارہا ہے۔ یہ قافلہ شام کی طرف بڑھ رہا تھا۔ لمحہ بھر کے لیے اس کے دل ودماغ میں ایک شبہ سا ابھرا۔ کہیں یہ لوگ سلطانِ مصر کے تجربہ کار ہراول دستہ تو نہیں ہیں؟

جب یہ لوگ صحرائے سینائی کے اوپر شمال سے گزر رہے تھے تو انہیں لو کے تھپیڑوں سے مزہ آگیا۔ یہاں بلا کی گرمی تھی۔ ان لوگوں نے یہاں قیام کیا اور ان کے خیمے نصب کردیے گئے۔ دروداغ یہ جاننے کے لیے بے چین تھا کہ یہ لوگ آخر جا کہاں رہے ہیں اور انہیں کس قسم کی تجارت کرنا ہے۔

قافلے کا سردار عمر رسیدہ شخص تھا۔ اس کی ڈاڑھی بانگ کی طرح دو حصوں میں بٹ گئی تھی۔

شام کے وقت وہ خیمے کے در پر بیٹھا کچھ سوچ رہا تھا۔ دروداغ اس کے پاس پہنچ گیا اور پوچھا۔ ''سردار! آج کئی

دن سے ہم حالتِ سفر میں ہیں۔ کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ ہم کہاں اور کیوں جارہے ہیں؟"

سردار نے بے پروائی سے جواب دیا۔ "جا اپنا کام کر منگول نوجوان! پتا نہیں ہم کہاں جارہے ہیں اور کیوں جارہے ہیں؟"

سردار کے بے تکے جواب سے درداغ اور پریشان ہوگیا۔

اس بار اس نے ذرا سختی سے پوچھا۔ "جناب! میں آپ سے پوچھ رہا ہوں کہ ہم کہاں اور کیوں جارہے ہیں؟"

سردار پھر کر کھڑا ہوگیا، بولا۔ "تو یہ سوال مجھ سے کیوں کررہا ہے؟ تو نے قاہرہ میں اپنے دوست سے یہ سب کیوں نہیں پوچھ لیا تھا۔"

درداغ نے اپنی سختی برقرار رکھی۔ "جان کیا شے ہوتی ہے، میں جانتا ہوں اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ ہم سب جس مہم، جس کاروبار کے لیے نکلے ہیں اس میں جاں نثاری اور بہادری کو بڑی اہمیت حاصل ہے لیکن اگر اس کی بابت مجھے بتادیا جاتا تو میں بہت خوش ہوتا۔"

سردار نے جواب دیا۔ "جب تو نے اتنا سمجھ لیا ہے کہ یہ کام جاں نثاری اور بہادری کا ہے تو پھر اتنا اور سمجھ جا کہ یہ جاں نثاری اور بہادری کیوں اور کس کے مقابل دکھانا ہوگی۔"

درداغ نے پوچھا۔ "تو ہم ہی پوچھتے رہیں، تم نہیں بتاؤ گے کچھ۔"

سردار نے مغربی افق پر نظریں جمائے ہوئے جواب دیا۔ "ڈوبتے ہوئے سورج کا منظر دیکھ کتنا حسین لگ رہا ہے۔"

درداغ بیزار آیا ہوا تھا۔ سردار نے جب یہ دیکھا کہ درداغ کو مزید بہلانا بہت مشکل ہے تو وہ خلاف امید ہنسا، اس نے کہا۔ "درداغ! میرا خیال ہے اب تجھے کچھ نہ بتانا تجھ پر بڑا ظلم ہوگا ہم لوگ کیا ہیں، کیا کرتے ہیں، یہ ساری باتیں اب ہمیں بتادینی چاہئیں میرے ساتھ آ۔"

سردار درداغ کو اپنے ساتھ لیے ہوئے اس راستے پر چلتا رہا۔ جو تجارتی قافلے شام سے مصر کے لیے استعمال میں لاتے تھے۔ اس راستے پر کہیں کہیں درخت بھی لگے ہوئے تھے لیکن یہ زیادہ اونچے درخت تھے۔ بس ان کے سائے میں پانچ سات آدمی آرام سے اٹھ بیٹھ سکتے تھے۔ یہ راستہ سیدھا نہیں تھا بلکہ ندی کی طرح بل کھایا ہوا تھا۔ سردار درداغ کو اپنے خیموں سے دور ریت کے ایک تودے پر لے گیا۔ پہلے تودے پر خود بیٹھ گیا۔ اس کے بعد درداغ کو بیٹھ جانے کا اشارہ کیا۔

سردار نے کہا۔ "درداغ! تجھے یہ تو معلوم ہی ہے کہ ہمارے خیمے عام راستے سے دور ذرا ہٹا کر نصب کیے گئے ہیں۔"

درداغ نے جواب دیا۔ "ہاں، یہ تو معلوم ہے مجھے پھر؟"

سردار نے مزید کہا۔ "اور تو نے یہ بھی دیکھا ہوگا کہ ہمارے پاس سامانِ تجارت بھی نہیں۔"

درداغ نے جواب دیا۔ "ہاں، یہ بات بھی معلوم ہے مجھ کو۔"

سردار نے کہا۔ "جب ساری باتیں معلوم ہیں تجھ کو تو تجھ کو چوکنا ہوجانا چاہیے، درداغ! ہم لوگ لٹیرے ہیں، بردہ فروش، مصری دولت مند ہمارا سردار ہے اور ہم سب اس کے کارندے۔ ہم تجارت کے بہانے اپنے اپنے گھروں سے نکل کر ادھر ادھر پھیل جاتے ہیں اور قافلوں میں شامل ہوکر موقع پاکر انہیں لوٹ لیتے ہیں۔ قیمتی سامان ادھر ادھر بازاروں میں بک جاتا ہے اور عورتوں، لڑکیوں، بچوں اور مردوں کو مشرق و مغرب کے بردہ فروشوں کے بازاروں میں پہنچا کر دام کھرے کرلیے جاتے ہیں پھر ہم سب اس آمدنی کو آپس میں تقسیم کرلیتے ہیں۔ مصری دولت مند کل کا تہائی لے کر بقیہ دو تہائی بانٹ دیتا ہے۔ مصری دولت مند کو وہ آدمی بہت زیادہ پسند ہیں، جو تنہا ہوں اور اپنے پیچھے کوئی خاندان نہ رکھتے ہوں۔ تجھ کو بھی اسی لیے پسند کرلیا ہے۔"

درداغ کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آرہا تھا، پوچھا۔ "سردار! کہیں تو ہم سے مذاق تو نہیں کررہا۔"

سردار نے جواب دیا۔ "نہیں، میں مذاق نہیں کررہا۔ میں نے تجھے سب کچھ صاف صاف بتادیا۔"

درداغ نے کہا۔ "لیکن میں اس کاروبار میں تم لوگوں کا ساتھ نہیں دے سکتا۔"

سردار نے جواب دیا۔ "اگر تو ہمارا ساتھ نہیں دے سکتا تو نہ دے۔ تو ہم سے الگ ہوجا مگر یہاں سے تو جائے گا کہاں؟ اور کیا ہمارے آدمی تجھ کو چلے جانے کا موقع دے دیں گے؟"

درداغ نے بڑی بے مروتی سے کہا۔ "مجھ کو دھوکا دیا گیا ہے ورنہ میں یہاں تک آتا بھی نہیں۔"

سردار نے غیر جذباتی لہجے میں کہا۔ "درداغ! اب تو یہاں تک آچکا ہے تو میرا کہنا مان۔ ہمارے ساتھ رہ اور جو کچھ قسمت نے تجھے دیا ہے اس پر قناعت کر۔ یہ میں یقین دلا سکتا ہوں کہ تجھے قاہرہ میں نمایاں مقام حاصل رہے گا۔ وہاں کوئی تیرے کام کی بابت نہ جان سکے گا۔"

درداغ نے پوچھا۔ ''اور اگر میں اس کام میں تیرا ساتھ نہ دوں تو؟''

سردار نے جواب دیا۔ ''تب پھر میں تیری زندگی کی ضمانت نہیں دے سکتا۔ عموماً ان حالات میں انسان ہمیشہ کے لیے غائب ہوجاتا ہے۔''

درداغ نے جب ان حالات میں جملہ نشیب وفراز پر غور کیا تو اسے اس حقیقت کو مان لینا پڑا کہ وہ ان سب سے بغاوت کرکے زندہ نہیں رہے گا۔ اس کو نہایت سفاکی اور بے رحمی سے قتل کردیا جائے گا۔

سردار نے پوچھا۔ ''کیا سوچنے لگے؟ اگر تو یہ سمجھتا ہے کہ میں تیرا ہمدرد اور مخلص ہوں تو میرا یہی مشورہ ہے کہ قسمت نے تجھ کو جو کچھ دیا ہے اس پر قناعت کرلے۔ انحراف اور بغاوت میں ناقابلِ تلافی نقصان پہنچ جائے گا۔''

درداغ ہتھیار ڈال چکا تھا، نہایت نرمی سے بولا۔ ''میں نے اپنی ہار مان لی اور تیرا یہ مشورہ میرے دل میں اتر گیا کہ قسمت نے مجھ کو جو کچھ دیا ہے، اس پر قناعت کرلینا چاہیے۔''

سردار بہت خوش ہوا، بولا۔ ''تب پھر ہاتھ ملا مجھ سے۔ میں نے تجھے اپنا ساتھی بنالیا۔ مصری دولت مند جب میری اس کامیابی کا حال سنے گا تو بہت خوش ہوگا۔''

سردار اور درداغ ہاتھ میں ہاتھ ڈالے جب اپنے آدمیوں میں واپس پہنچے تو انہیں یہ اطلاع دی گئی کہ ایک قافلہ شام سے مصر کی طرف جارہا ہے اور اس میں کئی تاجر اپنی اشیائے تجارت کے ساتھ سفر کررہے ہیں اور ان میں کئی خاندان، عورتوں اور بچوں کے ساتھ شامل ہیں۔ سردار نے درداغ کی طرف دیکھ کر آنکھ ماری، بولا۔ ''آج اس قافلے پر تم چھاپا مارو گے اور میں یہ دیکھوں گا کہ تم میں اس کام کی کتنی صلاحیتیں ہیں۔''

درداغ نے معذرت کی۔ ''صاحبان! میں اس میدان میں نووارد ہوں۔ مجھے اپنے ساتھ شامل رکھیے اس کے بعد، دیکھ دیکھ کر میں بھی کچھ ہوجاؤں گا۔''

سردار نے بحث نہیں کی، بولا۔ ''چلو یہی سہی۔''

ان لوگوں نے قافلے کا تقریباً چھ گھنٹے انتظار کیا مگر وہ نہیں آیا۔ سردار کو شبہ گزرا کہ کہیں قافلے والوں نے اپنا راستہ تو نہیں بدل لیا۔

رات آگئی، سردار نے چند آدمیوں کو پہرے دار بنا دیا اور بقیہ کو سلادیا۔ سونے والوں کے ہتھیار ان کے پاس ہی رکھے ہوئے تھے تاکہ وقتِ ضرورت بیدار ہوتے ہی وہ اپنے ہتھیار سنبھال اور استعمال کرسکیں۔

رات کے پچھلے پہر پہرے داروں نے سب کو جگادیا کیونکہ انہوں نے گھوڑوں کی ٹاپوں کی آوازیں سن لی تھیں جو کہیں دور سے آرہی تھیں مگر وہ دم بدم قریب آتی جارہی تھیں۔

سردار اور درداغ اپنے خیموں سے باہر نکلے اور اپنے ساتھیوں کو ادھر ادھر چھپادیا۔ ان لوگوں نے اپنے خیمے خالی کردیے تھے۔ ان کا منصوبہ یہ تھا کہ جب قافلے والے ان خیموں کو دیکھ کر حیرت زدہ سوالیہ نشان بنے ادھر ادھر دیکھتے پھر رہے ہوں گے تو یہ ان پر اچانک حملہ کرکے تباہ وبرباد کردیں گے۔ مردوں کو قتل اور عورتوں، لڑکیوں اور بچوں کو غلام بنا کے سامان تجارت پر قبضہ جمالیں گے۔ اس کے بعد وہ کسی اور شکار کی تلاش میں آگے بڑھ جائیں گے۔

جب قافلے کے آنے میں دیر ہوئی اور گھوڑوں کی ٹاپوں کی آوازیں بند ہوگئیں تو سردار نے کہا۔ ''میرا خیال ہے قافلے نے کہیں اور پڑاؤ ڈال دیا ہے۔''

درداغ نے پوچھا۔ ''پھر اب کیا ہوگا؟''

سردار نے جواب دیا۔ ''ہوگا یہ کہ اب ہمیں ان کی تلاش میں کچھ آگے بڑھنا ہوگا۔''

درداغ سردار کی چالاکی اور ہوشیاری پر حیران ہورہا تھا۔ سردار نے منتخب ساتھیوں کو ساتھ لیا اور شکار کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ درداغ اس کے ساتھ چلا۔ سردار کا خیال درست نکلا۔ قافلے والے کچھ فاصلے پر ہی خیمہ زن ہوچکے تھے۔ سردار نے اپنے آدمیوں کو نیم دائرے میں پھیلا دیا اور انہیں حکم دیا کہ گھوڑا جیسے ہی ہنہنائے قافلے والوں پر حملہ کردیا جائے۔

ہر شخص تاک لگائے کھڑا ہوچکا تھا۔ درداغ اپنے ساتھیوں سے الگ ہوکر خیموں کی سن گن لینے آگے بڑھ گیا۔ وہاں بالکل سناٹا تھا۔ اس کو حیرت تھی کہ جس قافلے میں عورتیں اور بچے ہوں، اس میں قبرستان جیسی خاموشی نہیں ہوسکتی۔ اس نے سردار کو اپنی تشویش سے آگاہ کیا لیکن ابھی تشویش پر اچھی طرح بات بھی نہیں ہوئی تھی کہ ان پر رسیوں کے پھندے پھینکے گئے اور وہ اس میں پھنس کر رہ گئے۔ سردار اور درداغ بھی بندھ گئے۔ چند آدمی بچ بھی گئے تھے لیکن انہیں بھاگنے نہیں دیا گیا تھا۔ گھیر گھار کر گرفتار کرلیا گیا۔

ان سب کو رسیوں میں جکڑ کر ایک بڑے خیمے میں ڈال دیا گیا۔ درداغ اور سردار یہ سوچ سوچ کر ہلکان ہوئے جارہے تھے کہ یہ ہوکیا گیا اور یہ ہیں کون لوگ؟ یہ لوگ رات بھر بندھے پڑے رہے۔ صبح جب سورج دو چار ہاتھ

اوپر چڑھا، چند مضبوط اور توانا آدمیوں نے درداغ اور سردار کو سامان کی طرح گھسیٹ کر ایک خیمے میں پہنچا دیا۔ اس خیمے میں دو آدمی موجود تھے۔ ایک بیٹھا ہوا تھا دوسرا پشت پر ہاتھ باندھے ٹہل رہا تھا۔ یہ دونوں ہی بہت تندرست تھے۔

آخر چہل قدمی والا ان دونوں کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا، پوچھا۔ ”کیا تم لوگ مسلمان ہو؟“

سردار اور درداغ ایک دوسرے کو دیکھ تو رہے تھے مگر جواب کوئی بھی نہیں دے رہا تھا۔

اس بار اس نے ڈپٹ کر سوال کیا۔ ”میں کیا پوچھ رہا ہوں...... کیا تم نے میرا سوال نہیں سنا؟“

سردار نے جواب دیا۔ ”آپ کا سوال میں نے سن لیا۔ ہم لوگ مسلمان ہیں۔“

اس نے پوچھا۔ ”تمہارا پیشہ؟ تم کرتے کیا ہو؟“

سردار نے جواب دیا۔ ”ہم لوگ طالع آزما ہیں۔ سپاہ گری ہمارا پیشہ ہے۔ اس وقت بھی ہم مصر جا رہے تھے۔ وہاں سلطانِ مصر کو ہم اپنی خدمات پیش کر دیتے۔“

اس سے پھر ایک سوال کیا گیا۔ ”تو تم لوگ سپاہی ہو اور اپنی قسمت آزماتے پھرتے ہو؟“

سردار نے جواب دیا۔ ”بالکل یہی بات ہے جناب والا۔“

اس نے کہا۔ ”اور اس وقت بھی تم لوگ اپنی قسمت آزمانے ہمارے خیموں کی طرف آ گئے تھے۔ سنتا ہوں تم لوگ لوٹ مار بھی خوب کر لیتے ہو۔“

سردار سہم گیا۔ اس نے دیکھا یہ چہل قدمی کرنے والا شخص بہت زیادہ بارعب واقع ہوا ہے اور اس کی آواز کی درشتی کانوں پر خاصا اثر ڈالتی ہے۔ وہ شخص ان دونوں کو گھورے جا رہا تھا۔

سردار نے کہا۔ ”سردار محترم! آپ کو کسی نے ہمارے بارے میں غلط فہمی میں ڈال دیا ہے ورنہ ہم لوگ وہ نہیں ہیں جو آپ غلطی سے سمجھ بیٹھے ہیں۔“

اس نے کہا۔ ”تم لوگ شکار کرنا چاہتے تھے مگر شکار ہو گئے۔“ پھر درداغ سے بطورِ خاص کہا۔ ”اور تو، او منگول زادے! جب تو مسلمان ہو چکا ہے تو تجھے یہ گندا کام نہیں کرنا تھا۔“

درداغ نے پوچھا۔ ”کیا آپ مجھ سے واقف ہیں؟“

اس نے جواب دیا۔ ”خوب اچھی طرح...... تو ہمیں بھول سکتا ہے مگر میں نہیں بھول سکتا۔“

درداغ کا اب تو برا حال تھا۔ سردار بھی خاصا پریشان تھا کہ یہ کون ہے جو ان لوگوں سے اچھی خاصی واقفیت رکھتا ہے۔

ان سب کو باندھ کر گھوڑوں پر ڈال دیا گیا۔ یہ لوگ مصر کی طرف جا رہے تھے۔ آخر ان سب کو قاہرہ لے جایا گیا۔ وہاں انہیں ایک قید خانے میں ڈال دیا گیا۔ وہ دس دن تک قید خانے میں یوں پڑے رہے، گویا انہیں بھلا دیا گیا تھا، لاوارثوں کی طرح۔

آخر گیارھویں دن درداغ کو قید خانے سے نکال کر ایک مکان میں پہنچا دیا گیا۔ اس مکان میں تھوڑا سا سامان پڑا ہوا تھا لیکن جاندار کا کہیں کوئی پتا نہ تھا۔ جو شخص اس کو اپنے ساتھ لے گیا تھا، اس سے پوچھا۔ ”بھائی کیا بات ہے؟ کیا تو مجھے قتل کر دینا چاہتا ہے؟“

اس نے جواب دیا۔ ”میں آپ کو کیوں قتل کروں گا؟ کوئی وجہ؟ میں بھی تو کسی کا تابع ہوں۔“

درداغ نے پوچھا۔ ”کیا مجھ کو یہاں کہیں قید کر دیا جائے گا؟ آخر مجھ کو یہاں لایا کیوں گیا ہے؟“

اس نے جواب دیا۔ ”تو بھٹک گیا تھا، تجھ کو راہِ راست پر لانا مقصود تھا۔ سو لے آیا گیا۔“

درداغ لاجواب ہو کر چپ ہو گیا، لوگ اس سے اپنوں کی طرح مخاطب تھے۔ مگر وہ انہیں جانتا نہیں تھا۔

وہ اس مکان میں بھی پانچ دن تک قید رہا۔ چھٹے دن اس کو کماندار بیبرس کی خدمت میں پہنچا دیا گیا۔ اس کو مجرم کی طرح باندھ کر بیبرس کے قدموں میں ڈال دیا گیا۔ بیبرس نے اسے ایک نظر میں پہچان لیا تھا۔ بیبرس نے اپنے پاؤں ہٹا لیے اور کراہیت سے کہا۔ ”درداغ! یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں؟ کیا تجھ پر عائد کردہ الزام درست ہے؟“

درداغ اس سے نظریں نہیں ملا پا رہا تھا لیکن بیبرس اسے مسلسل گھورے جا رہا تھا، پوچھا۔ ”اچھا ایک سوال کا اور جواب دے دے۔ تو میں آئندہ کبھی بھی تجھ کو نہ تو...... کوئی سزا دوں گا اور نہ ہی......“

درداغ نے آہستہ سے کہا۔ ”آپ مجھ سے سوال کریں، میں جواب دوں گا۔ آپ مجھ پر جتنے مقدمے چاہیں چلائیں لیکن میں جھوٹ کسی حال میں بھی نہیں بولوں گا۔“

بیبرس کماندار نے پوچھا۔ ”کیا مصری دولت مند نے تجھ کو کبھی بھی نہیں بتایا تھا کہ وہ کام کیا کرتا ہے اور تجھ کو کس حیثیت سے اپنے کاروبار میں شامل اور داخل کرنا چاہتا ہے؟“

درداغ نے جواب دیا۔ ”مجھ کو آخر تک لاعلم رکھا گیا اور جب اس کے سردار نے مجھے مصری دولت مند کے اصل کاروبار سے آگاہ کیا تو اس وقت تک معاملہ میرے ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ اس وقت اگر میں اکڑ دکھاتا تو وہ لوگ مجھے

قتل کردیتے اور میری لاش تک کا پتا نہ چلتا۔"

بیبرس کماندار نے کہا۔" کیا میں نے تجھ کو منع نہیں کیا تھا کہ مصری دولت مند کے چکر میں نہ آ؟"

درداغ نے روہانسی آواز میں کہا۔" کماندار محترم! میں سادہ لوح منگول ہوں۔ مجھے شہری متمدن لوگوں کے ہتھکنڈے نہیں آتے۔ میں ہر اس سزا کا مستحق ہوں جو آپ میرے لیے تجویز کریں گے۔"

بیبرس کماندار نے جواب دیا۔" میں تیرے لیے سزا تجویز کرچکا ہوں، خطرناک سزا۔ بہت ممکن ہے تو اس سزا کے بعد زندہ ہی نہ رہے لیکن تو اسی سزا کا مستحق ہے۔"

درداغ نے پوچھا۔" کون سی سزا کماندار محترم!"

بیبرس کماندار نے جواب دیا۔" معلوم نہیں کب ہلاکو خان سے میری مڈبھیڑ ہوجائے، اس سے پہلے میں یہ چاہتا ہوں کہ برقائی خان سے میری خط کتابت کا سلسلہ شروع ہوجائے۔"

درداغ نے پوچھا۔" اس میں مجھے کیا کرنا ہوگا؟"

بیبرس کماندار نے جواب دیا۔" تجھ کو میری طرف سے برقائی کے دربار میں پہنچنا ہے۔ اس خط کتابت کا سب سے بڑا فائدہ یہ پہنچے گا کہ ہلاکو خان کی توجہ میری طرف سے ہٹ کر برقائی خان کی طرف ہوجائے گی۔ اس دوران میں ہلاکو خان کے خلاف زبردست تیاریاں کرسکوں گا۔"

درداغ نے جواب دیا۔" میں اس کے لیے تیار ہوں۔" پھر سوچ کر بولا۔" کماندار محترم! برقائی خان کی خدمت میں جانے سے پہلے میں بھی ایک چھوٹی سی درخواست آپ کی خدمت میں پیش کرنا چاہتا ہوں۔"

بیبرس مسکرایا۔" میں تیری درخواست کی بابت جانتا ہوں۔ اس کی کوئی ضرورت تو نہیں ہے اور پھر اس سے تجھے حاصل کیا ہوگا۔"

درداغ نے پوچھا۔" کیا آپ واقعی میری درخواست سے واقف ہیں؟"

بیبرس نے جواب دیا۔" ہاں میں واقف ہوں۔ تو مصری دولت مند سے ملاقات کرنا چاہے گا جبکہ وہ روپوش ہوچکا ہے۔ اس کا محل موجود ہے اس کی خواتین بھی ہیں لیکن وہ خود موجود نہیں ہے۔ میرا خیال ہے ان دنوں وہ مصر میں نہیں ہے۔"

درداغ نے پوچھا۔" اور اس کے جو آدمی میرے ساتھ پکڑے گئے ہیں ان کا کیا حشر ہوا؟"

بیبرس نے جواب دیا۔" میں چاہتا تو انہیں قتل کرادیتا لیکن میں نے ایسا نہیں کیا۔ میں نے انہیں فوج میں بھرتی کرلیا ہے۔ مجھے نفری قوت درکار ہے، مجھ کو سپاہی چاہئیں۔ میں یہ سپاہی کہاں سے لاؤں؟ چنانچہ جو شخص جہاں سے بھی مجھے مل جاتا ہے میں اس کو جانے نہیں دیتا، اپنے کام میں لے آتا ہوں۔"

درداغ کو اس غیر معمولی انسان کی اعلیٰ ترین صلاحیتوں کا اعتراف کرنا پڑا۔ وہ دیر تک دل ہی دل میں بیبرس کی تعریفیں کرتا رہا۔ اس کو اب یہ یقین ہو چلا تھا کہ بیبرس کچھ نہ کچھ کرکے دکھادے گا۔

☆☆☆

درداغ نے بیبرس کماندار کا خط لیا اور برقائی خان کی خدمت میں روانہ ہوگیا۔ ہلاکو خان قراقرم کے لیے روانہ ہوچکا تھا اور ان دنوں وہ آذربائیجان کے شہر مراغہ میں ٹھہرا ہوا تھا۔ شاید اس کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ درداغ کو آذربائیجان سے گزر کر سرائے خان پہنچنا تھا۔ سرائے خان، جہاں برقائی خان رہتا تھا۔ یہ خطرناک ترین راہ تھی جس پر ہر طرف منگولوں کی حکومت تھی اور اس کا کسی بھی جگہ پکڑا جانا مشکوک تھا۔ وہ مصر کی حدود سے نکل کر شام میں داخل ہوگیا۔ اس نے ڈاڑھی بڑھالی اور صوفی بن کر الشراہ کی ایک مسجد میں قیام کیا۔ یہاں قیس قبائل کے اجڈ اور کھرے لوگوں نے اس کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔

پہاڑیوں کے درمیان آباد یہ لوگ بیرونی دنیا سے برائے نام رسم وراہ رکھتے تھے۔ یہ لوگ منگولوں سے خوفزدہ تھے۔ الشراہ والوں کا کہنا تھا کہ ان کے ہاں کبھی کوئی صوفی نہیں آیا اور نہ ہی کسی صوفی کا مزار ہے۔ درداغ کو شبہ گزرا کہ وہ ان میں کچھ دن اور رک گیا تو قیسی قبائل کے لوگ اس کو قتل کرکے اس کا مزار بنادیں گے۔

وہ الشراہ سے بڑی خوب صورتی سے نکل بھاگا۔ قیسی قبائل کے نوجوان اپنے گھوڑوں پر درداغ کے تعاقب میں نکلے لیکن اس کو پا نہیں سکے جب وہ دمشق کی حدود میں داخل ہوا تو نارنگیوں کے درخت پھلوں سے لدے ہوئے تھے اور لوگ گھوڑوں اور گدھوں پر گردوغبار اڑاتے بھاگے چلے جارہے تھے۔ یہاں منگولوں کی افواج پڑاؤ ڈالے ہوئے تھیں۔ درداغ نے دمشق کی سرائے میں قیام کیا۔

وہ یہاں بھی صوفی بنا ہوا تھا۔ اس کی آواز میں سوز تھا۔ جب وہ صبح اور شام سورۂ رحمٰن کی آیات لحن سے بہ آوازِ بلند پڑھتا تو سننے والوں کا عجیب حال ہوجاتا۔ یہاں اس نے منگولوں کو گلیوں، بازاروں اور عام شاہراہوں پر گھومتے

پھرتے دیکھا۔ وہ ان سے دور دور رہتا۔ اس نے پھر بھی کماندار کا خط اپنے تکیے کی روئی کے اندر چھپا رکھا تھا۔ اس نے اپنے طور پر یہ معلوم کرنے کی کوشش کی کہ اب منگول کیا سوچ رہے ہیں اور وہ کیا ارادہ رکھتے ہیں۔

جب دنیا دار ارادت منداس کے پاس آئے تو وہ ان سے پوچھتا۔ ''کیا اس شہر پر امن و مان کا سایہ ہے؟''

ارادت مند جواب دیتے۔ ''پیرومرشد! ابھی تک تو امن و امان کا سایہ ہے لیکن اسی وقت تک جب تک کہ منگول ایسا چاہیں گے۔''

اس نے ایک سرد آہ بھری۔ ''آہ! یہ کیسے لوگ ہیں جو دنیا کو تباہ و برباد کر دینا چاہتے ہیں۔ خدایا! ان کے دلوں سے نفرت اور جذبۂ بربادی کو دور کر دے تاکہ دنیا سکون کی سانس لے۔''

کسی ارادت مند نے اس سے کہا۔ ''پیرومرشد! میں نے سنا ہے، اب منگول مصر کا ارادہ کر رہے ہیں حالانکہ ہلاکو خان قراقرم واپس جا رہا ہے مگر سنا ہے اس کی عدم موجودگی میں اس کے نامی گرامی فوجی سردار قط بوغا نے اس کی جگہ سنبھال لی ہے اور اب منگول مصر میں قط بوغا کی نگرانی میں جنگ کریں گے۔''

درداغ کے ہاتھ میں تسبیح تھی اور اس کی کلمۂ شہادت کی انگلی تیزی سے اس کے دانے کھسکانے میں مشغول تھی۔ ''اللہ نے چاہا، تو اب ان کا زور ٹوٹ جائے گا۔ باطل ہارے گا حق جیتے گا۔ بس مسلمانوں کو اتحاد کی سخت ضرورت ہے۔''

ایک تاجر نے عرض کیا۔ ''قبلہ! یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ کیا آپ کو پتا نہیں کہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ قط بوغا کے آدمی ارادت مندوں میں شامل ہو کر مخبری اور جاسوسی کرتے رہتے ہیں، کچھ ان کا خوف کیجیے۔''

اس نے جواب دیا۔ ''لوگو! میں نے کہہ جو دیا کہ حق جیتے گا اور باطل ہارے گا۔ میں نے یہ تو نہیں کہا کہ منگول ہاریں گے اور مسلمان جیتیں گے۔''

جب وہ چادر اوڑھے ہوئے تھا اور اس کا چہرہ صاف نظر نہیں آرہا تھا تو اس نے اپنے سامنے کئی منگولوں کو دوزانو بیٹھے دیکھا۔ وہ اس سے پوچھ رہے تھے کہ بتا ہماری قسمت میں کیا ہے؟

درداغ نے جواب دیا۔ ''تمہاری قسمتوں میں بڑا عروج لکھا ہے لیکن افسوس کہ تم اپنے مالکان اور فوجی سرداروں کی باتیں مان کر اپنے لیے بربادی اور تباہی خرید لوگے۔''

یہاں اس نے دمشق کی پہاڑیوں میں وہ جگہیں بھی دیکھیں جہاں مختلف مذہبوں کے درویش یکسوئی کی خاطر بیٹھتے اور عبادت کیا کرتے تھے۔ یہیں وہ غار بھی تھا جہاں اصحاب کہف اپنے کتے کے ساتھ محوخواب ہیں اور ربوہ نامی وہ جگہ بھی جہاں حضرت مسیح نے قیام فرمایا تھا۔

چند دنوں بعد اس نے دمشق بھی چھوڑ دیا اور حلب کی طرف روانہ ہو گیا۔ حلب ہی میں منگول سب سے زیادہ تھے۔ اس کو حلب میں ڈر سا لگا۔ وہ قویق ندی کو عبور کر کے حلب میں داخل ہوا۔ حلب والوں نے اس کی بڑی خاطر مدارات کی۔ اس نے یہاں کی پہاڑی کے قلعے پر منگولوں کا قبضہ دیکھا۔ انہوں نے جگہ جگہ یاک کی نودموں والے پرچم نصب کر رکھے تھے۔

وہ حلب کے بعد جبلِ رکام کی حدود میں داخل ہوا۔ اس کے آگے آذربائیجان میں ہلاکو خان اب بھی موجود تھا۔ وہ بچتا بچاتا قفقاز تک پہنچ گیا۔ برقائی خان یہاں موجود تھا۔ اس کو بڑی خوشی ہوئی کہ اسے دریائے والگا کے کنارے خان کے شہر تک نہیں جانا پڑا۔

برقائی خان درداغ سے مل کر بہت خوش ہوا۔ اس کے دربار میں مسلم علماء نہایت شان سے سر اٹھائے بیٹھے تھے۔ جب ان علماء کو یہ معلوم ہوا کہ مصر کے بادشاہ نے برقائی خان کے پاس ایک ایسے شخص کو قاصد بنا کے بھیجا ہے جو پہلے ہلاکو خان کی فوج میں اس کا اپنا ہم وطن، ہم قوم تھا اور بعد میں مسلمان ہو کر اس نے بغداد کی سکونت اختیار کر لی اور پھر بغداد کو برباد ہوتے اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے، تو وہ حیران کن حد تک خوش ہوئے۔

برقائی خان اور اس کے درباریوں کی نظر میں درداغ ایک تاریخی کردار بن چکا تھا۔

برقائی خان کی خدمت میں قرآن پاک کا ایک نسخہ تحفے کے طور پر پیش کیا گیا۔ یہ مقدس تحفہ ایک ریشمی جزدان میں رکھا ہوا تھا۔ برقائی نے اسے اپنی آنکھوں سے لگایا اور پوچھا۔ ''وہ خط کہاں ہے جو مصر کے بادشاہ نے مجھے بھیجا ہے؟''

درداغ نے تکیے کو ادھیڑ کر اس کی روئی میں سے خط نکالا اور برقائی کے حوالے کر دیا۔ اس میں لکھا گیا تھا۔

''ایک عاجز تاتاری کا خط زریں خیل کے خان کے نام۔ ہلاکو خان اپنے دادا کے مسلک سے ہٹ گیا ہے اور اب اس کے ارادوں پر اس کی بیوی دوقوز حکومت کر رہی ہے۔ دوقوز کے چاروں طرف مسیحی جمع رہتے ہیں اور غالباً یہ بتانا فضول ہے کہ عیسائیوں اور مسلمانوں میں ایک عرصے

سے ناچاقی اور لڑائی پائی جاتی ہے۔ سازشی عیسائیوں نے ملکہ دوقوز اور ہلاکو کو یہ باور کرا رکھا ہے کہ جب تک مسلمان موجود ہیں، ہلاکو خان کو امن و سکون سے بیٹھنا نصیب نہیں ہوگا۔ اب ہلاکو خان یا اس کا کوئی سردار مصر کی بربادی کا منصوبہ بنا رہا ہے۔

زریں خیل کے خان! میں بے دین منگولوں کے پاک کے نودموں والے پرچم کے زیر سایہ صلیب کو بلند ہوتے دیکھ رہا ہوں۔ دوقوز صبح شام اپنے چوبی چیپل میں گھنٹیاں بجواتی ہے اور نسطوری مسیحی راہبوں کے ہاتھوں کو بوسے دیتی ہے۔ ان حالات میں مجھ جیسے عاجز اور ناچیز نے یہ فیصلہ کرلیا ہے کہ غاصبوں کو سرزمین مصر سے دور رکھوں اور مسلمانوں کے چھنے ہوئے علاقوں کو آزاد کراؤں۔ آپ میری اس طرح مدد کرسکتے ہیں کہ ہلاکو خان کو ادھر میری طرف نہ آنے دیں، بقیہ کام میں خود کرلوں گا۔"

برقائی خان نے درداغ کو یقین دلایا کہ وہ ہلاکو خان سے اس کی زیادتیوں پر جواب طلب کرے گا اور اس کو جنگوں میں الجھا کر یہیں روک لے گا اور یوں بھی برقائی خان کو ہلاکو خان کی پیش قدمیاں اچھی نہیں لگ رہی تھیں۔ اس نے بارہا ہلاکو خان کے عساکر کے رتھوں کو اپنی سرحدوں کے پاس سے گزرتے دیکھا تھا۔ یہ عساکر اس کی حدود میں بھی گھس سکتے تھے۔

برقائی خان نے پوچھا۔ "مجھے اپنے درباری علماء سے معلوم ہوا ہے کہ وہاں مساجد کے خطبات میں مسلمان بادشاہوں کے نام بھی شامل کرلیے جاتے ہیں۔ کیا درست ہے؟"

درداغ بات کی تہ تک پہنچ گیا، بولا۔ "ہاں میں نے قاہرہ کی جامع مسجد میں جمعے کا خطبہ سنا ہے اور یہ سن کر حیران رہ گیا کہ اس میں زریں خیل کے خان برقائی کا نام بھی شامل تھا۔"

برقائی خان بہت خوش ہوا، بولا۔ "میں اس کا اثر یہاں محسوس کررہا ہوں۔ خدا مجھ پر مہربان ہے اور زمانے بھر کا عیش اور سکون مجھ کو حاصل ہوچکا ہے۔"

اس کے بعد برقائی خان اور درباری علماء نے اس سے ایک ہی سوال کیا، پوچھا۔ "جب تو بغداد میں موجود تھا تو ہلاکو خان نے اس پر کس طرح قبضہ کیا اور قبضے کے بعد مسلمانوں پر کیا مظالم ڈھائے؟"

درداغ نے جواب دیا۔ "خان! ہلاکو خان نے پہلے تو سازشیں کیں اور خلیفہ کے وزیر کو غداری سے ملالیا۔ پھر خلیفہ اور اس کی اولاد کو یہ یقین دلایا کہ وہ خود زریں خیل کے خان برقائی خان کی طرح مسلمان ہونا چاہتا ہے۔ اس نے یہ بھی یقین دلایا کہ وہ اپنی بیٹی کی شادی خلیفہ سے کردینا چاہتا ہے۔ پھر اس نے بغداد کے باہر اپنے خیمے نصب کردیے اور خلیفہ، شہزادگان، امرا اور رعایا کو دھوکے سے بلوا بلوا کر قتل کراتا رہا۔ پھر خون خرابا کرتا ہوا بغداد میں داخل ہوگیا اور بستی آبادی کو تہ تیغ کرڈالا۔ شہر کو آگ لگادی اور کتب خانے کو دریا برد کردیا۔ خلیفہ کو نمدے میں لپیٹ کر کچلوا کر ہلاک کردیا۔ اس سے پہلے خلیفہ کو کئی دن تک بھوکا پیاسا رکھا گیا تھا۔"

برقائی خان نے اپنے امراء اور درباری علماء کی طرف دیکھا۔ "آخر یہ ہلاکو خان کو ہو کیا گیا ہے؟"

ایک عالم نے جواب دیا۔ "جس حکومت میں عورتیں مشیر بن گئی ہوں، وہاں ایسا ہی ہوتا ہے۔ دوقوز جو چاہتی ہے ہلاکو خان وہی کرگزرتا ہے اور دوقوز وہی چاہتی ہے جو مسیحی چاہتے ہیں۔"

برقائی خان نے کہا۔ "اب تک جو ہوگیا، ہوگیا لیکن مزید کچھ نہیں ہونے دیا جائے گا۔ میں ہلاکو خان سے اس کا جواب طلب کروں گا۔"

درداغ نے کہا۔ "میرا بادشاہ اور اس کا نائب بس یہی چاہتے ہیں کہ شام کے منگولوں کو ہلاکو خان کی مدد نہ پہنچنے دی جائے، بقیہ کام اہل مصر انجام دے لیں گے۔"

برقائی خان نے درداغ کی بڑی تواضع کی۔ علماء نے اس کو دعائیں دیں۔

وہ یہاں ایک ہفتہ مہمان رہا اور جب وہ واپس ہوا تو اس نے یہ منظر اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ زریں خیل کا خان فوجی تیاریوں میں مشغول ہوچکا تھا۔ اس نے اپنی سرحدوں پر فوجیں لگادیں اور ہلاکو خان کو ایک دھمکی آمیز خط بھی لکھ دیا۔ اس خط میں ہلاکو خان کو سرزنش کی گئی تھی کہ تو نے بغداد اور خلیفۂ بغداد کے ساتھ جو کچھ کیا، میں اور تمام دنیا کے مسلمان اس سے خوش نہیں ہیں۔ آئندہ ان زیادتیوں سے باز رہ اور خدا نے تجھ کو جن علاقوں کی حکومت دے دی ہے، ان پر قانع رہ۔ ورنہ میں ایک مسلمان ہونے کے ناتے سے تجھ پر یلغار کروں گا اور تیری زیادتیوں کو جبراً روک دوں گا۔

بیبرس کمانداراپنا مقصد حاصل کرچکا تھا۔ اس نے ہلاکو خان کے مقابلے پر اسی جیتی طاقتور اور ہم قوم قوت کو کھڑا کردیا تھا۔

درداغ بعجلت واپس ہوا۔ وہ ایسے راستے سے واپس جانا چاہتا تھا جس میں منگولوں کا خوف نہ ہو۔ چونکہ سفر مسلسل جاری نہیں رکھا جاسکتا تھا، اس لیے وہ کسی سرائے کے بجائے

مسجدوں اور خانقاہوں میں قیام کرتا تھا۔ یہاں اس کی ان لوگوں سے بھی ملاقاتیں ہوئیں جو منگولوں کے ہاتھوں تباہ و برباد ہوکر گوشہ نشین ہو گئے تھے اور اپنی زندگی کے بقیہ ایامِ اللہ کی یاد میں گزار دینا چاہتے تھے۔ ان میں بعض امرا کی اولادیں بھی شامل تھیں۔

دورانِ سفر وہ ایک بار بڑی مشکل میں پھنس گیا۔ شام قریب تھی اور وہ ہنوز غیر آباد علاقے سے گزر رہا تھا۔ وہ کسی مسجد کی تلاش میں تھا۔ مغرب کا وقت ہو گیا لیکن اس کے کانوں میں اذان کی آواز تک نہیں پڑی۔ اس کے سامنے جنگلات تھے اور ان جنگلات میں درندے بھی ہو سکتے تھے۔ وہ بہت دل برداشتہ ہو رہا تھا کہ اس نے چند آدمیوں کی آوازیں سنیں جو آپس میں زور زور سے باتیں کر رہے تھے۔ یہ آوازیں قریب آتی جا رہی تھیں۔ جب وہ درداغ کے قریب آ گئے تو اس نے دیکھا یہ کُل پانچ تھے۔ انہوں نے درداغ کو اپنے گھیرے میں لے لیا اور ترکی زبان میں کچھ پوچھا لیکن درداغ کو ترکی زبان نہیں آتی تھی۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے ترکی زبان سے لاعلمی کا اظہار کیا۔

اس بار انہوں نے فارسی میں پوچھا۔ ”تو کون ہے اور کہاں جا رہا ہے؟“

درداغ نے جواب دیا۔ ”میں منگول ہوں اور اب مسلمان ہو چکا ہوں، مصر جا رہا ہوں۔“

انہوں نے پوچھا۔ ”مگر اس وقت رات کہاں گزارو گے؟“

درداغ نے جواب دیا۔ ”بھائیو! اسی پریشانی نے مجھے پریشان کر رکھا ہے۔“

ایک نے کہا۔ ”تب پھر آؤ میرے ساتھ، میں تمہاری شب بسری کا بندوبست کروں گا۔“

درداغ ان پر اعتبار نہیں کر سکتا تھا مگر اس کے علاوہ کوئی چارۂ کار بھی نہ تھا۔ وہ ان پانچوں کے ساتھ ہو لیا۔ وہ درداغ کو لیے ہوئے ایک جنگل میں گھس گئے۔ اندھیرا پھیل چکا تھا۔ درختوں کے جھنڈ میں ایک راستہ لہراتا ہوا دور تک چلا گیا تھا۔ یہ لوگ اس راستے پر چلتے رہے۔ باہر سے جنگل نظر آنے والا یہ باغ اندر بہت خوشنما ہو گیا تھا اور باغ کے درمیان میں ایک عمارت بنی ہوئی تھی۔ مضبوط پتھر کی عمارت۔ اس کا دروازہ بہت اونچا اور موٹائی میں تختے جیسا تھا جو اندر سے بند تھا۔ ایک نے موٹے ڈنڈے سے دستک دی اور کچھ دیر بعد دروازہ کھل گیا۔ یہ لوگ اندر داخل ہو گئے۔ اندر بڑی چہل پہل تھی اور اس عمارت پر قلعے کا گمان ہوتا تھا۔

پانچوں نے درداغ کا ایک مہمان کی حیثیت سے تعارف کرایا، کہا۔ ”یہ شخص ویرانے میں بھٹک رہا تھا، ہم اسے یہاں لے آئے۔“

یہاں کافی لوگ رہتے تھے۔ پوری عمارت میں چربی کے دیے جل رہے تھے۔ چھوٹے چھوٹے حجرے، کمرے اور ان کے سامنے صحن بنے ہوئے تھے۔ ان حجروں اور کمروں کے روشن دانوں سے چراغوں کی روشنی پھوٹ رہی تھی۔

عمارت کے درمیان ایک بہت بڑا ہال تھا، اس ہال میں فرش پر ٹاٹ اور دریاں بچھی ہوئی تھیں اور ادھر ادھر تکیے بکھرے ہوئے تھے۔ چھت سے فانوس لٹکے ہوئے تھے۔ عراقی شیشوں کے شاندار فانوس۔ جو جگہ نمایاں اور ہال میں سب سے مختلف اور الگ تھلگ تھی وہاں ایک شخص لکڑی کی چوکی پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے دائیں بائیں اور آگے چراغ دانوں کی کثرت تھی۔ ان کو وہ لوگ الفیوس کہتے تھے۔ مینارے کی طرح اونچا۔ ٹونٹی نما سوراخ میں سے بتی نکلی ہوئی تھی۔ اس بتی کو اندر کے ذخیرے میں سے چربی مل رہی تھی اور چراغ روشن تھے۔ ہر چراغ دان کے پاس چربی سے بھرا ہوا ایک ایک برتن موجود تھا۔ ان برتنوں میں چربی کے ساتھ ہی ایک ایک قینچی بھی رکھی تھی اور ان سب پر ایک شخص تعینات تھا۔ جس کو یہ لوگ الجراجی (الجراجی) کہتے تھے اور اس کا کام یہ تھا کہ چراغوں کو روشن رکھے۔ جس چراغ میں چربی کم ہو جائے اس کو چربی بہم پہنچائے۔ بتی میں خرابی پیدا ہو تو اس کو قینچی سے کاٹ کر ٹھیک کرے۔

درداغ کو اس ہال میں بٹھا دیا گیا۔ اس وقت تک ہال میں زیادہ آدمی نہیں تھے لیکن جو تھے وہ نوجوان تھے، پھر آہستہ آہستہ اور لوگ بھی آنے لگے لیکن یہ سب نوجوان تھے۔ سفید قبا پہنے ہوئے۔ پاؤں میں یکساں موزے تھے۔ کمر پیٹی سے کسی ہوئی تھیں اور ان میں چھری اڑسے ہوئے تھے۔ ان کے سروں پر سفید اونی ٹوپیاں تھیں اور ٹوپیوں کے اوپر بیچوں بیچ تقریباً ہاتھ بھر لمبا اور دو تین انگل چوڑا کپڑا لگا ہوا تھا۔

جن پانچ نوجوانوں نے درداغ کو اپنا مہمان بنایا تھا، ان میں سے ایک اپنی جگہ پر کھڑا ہو گیا اور اس نے حاضرین اور صدرِ مجلس سے درداغ کا تعارف بآوازِ بلند کرایا۔ اس نے کہا۔ ”ہمارا یہ مہمان منگول ہے مگر برقائی خان کی طرح مسلمان ہو چکا ہے، یہ مصر جا رہا ہے اور فی

الحال ہمارا مہمان ہے۔“

لوگوں نے نہایت اشتیاق سے درداغ کی طرف دیکھا اور باری باری مصافحہ کرنے لگے۔ صدرِ مجلس اپنی جگہ سے نہیں اٹھا اور درداغ سے کہا گیا کہ مصافحے کے لیے صدرِ مجلس کے پاس اس کو خود جانا پڑے گا۔

درداغ نے صدرِ مجلس سے ہاتھ ملایا تو اس نے درداغ کو اپنے پاس بٹھا لیا اور اعلان کیا۔ ”ہم اپنے اس مہمان کو اس وقت تک اپنے ساتھ رکھیں گے جب تک یہ خود رہنا چاہے۔“

ایک شخص نے کھڑے ہو کر اپنا شبہ ظاہر کیا، اس نے کہا۔ ”اخی! یہ منگول ہے جیسا کہ اس کا چہرہ مہرہ بھی ہمیں بھی بتاتا ہے، کیا یہ واقعی مسلمان ہو چکا ہے یا ہمیں مغالطے میں رکھ کر یہ کوئی اور مقصد حاصل کرنا چاہتا ہے۔“

صدرِ مجلس کو یہ لوگ اخی کہتے تھے، اس نے جواب دیا۔ ”مہمان، مہمان ہے...... وہ مسلمان ہو یا کوئی اور ہمیں اس سے کوئی سروکار نہیں۔ ہمیں اپنی مہمان نوازی کے فرائض انجام دیتا ہوں گے۔“

درداغ حاضرین کے سامنے کھڑا ہو گیا، اس نے کہا۔ ”دوستو! تم مجھ پر شبہ نہ کرو۔ میں مسلمان ہوں اور اللہ نے چاہا تو میرا خاتمہ بھی اسلام ہی پر ہوگا۔“

اخی نے آہستہ سے کہا۔ ”تو بیٹھ جا میرے بھائی! میں تجھ پر شبہ نہیں کروں گا۔ تو مسلمان ہے اور اللہ نے چاہا تو اسلام ہی پر تیرا خاتمہ بھی ہوگا۔ بہر حال ہم لوگ جھوٹ سے سخت نفرت کرتے ہیں۔“ پھر پوچھا۔ ”تو کیا کرتا ہے اور تیرے کیا ارادے ہیں؟“

درداغ نے جواب دیا۔ ”جیسا کہ میں بتا چکا ہوں، میں برقائی خان، زرین خیل کے خان سے ملنے گیا تھا اور اب میں مصر جا رہا ہوں۔ میں منگولوں کی خوں آشامی، بربریت اور سفاکی سے دل برداشتہ ہو کر تارکِ دنیا ہو چکا ہوں۔ دنیا اور افکارِ دنیا سے پیچھا چھڑا کے میں زیادہ پُرسکون ہوں۔“

اخی نے کہا۔ ”ہم بھی تیرے جیسے ہیں۔ ہم میں کوئی اصفہان کا امیر زادہ تھا، کوئی تبریز کا نوابزادہ، کوئی بغداد کے جوہری کا بیٹا۔ کسی کا تعلق موصل سے رہ چکا ہے۔ ہم سب زمانے کے ستائے ہوئے شریف زادے ہیں اور یہاں اکٹھے ایک خاندان کی طرح رہتے ہیں۔ ان سب نے مجھے اپنا بڑا بھائی بنا لیا ہے اور احتراماً اخی کہتے ہیں اور شام کو جو کچھ کما کے لاتے ہیں میرے پاس جمع کرا دیتے ہیں۔ میں اس رقم سے یہاں کا کام چلاتا ہوں۔ مسافروں اور پریشان حال لوگوں کی مدد کرتا ہوں۔“

اس کے بعد اخی نے حاضرین سے کہا۔ ”آج کی کمائی جمع کرا دو۔“

سبھوں نے اپنی اپنی ٹوپیاں اتار کر سامنے رکھ لیں تو پتا چلا کہ ان کے نیچے ایک اور ٹوپی تھی، زرد ٹوپی۔ پہلی ٹوپی کو الٹا تو اس میں سے سکے گرنے لگے۔ یہ رقوم اخی کو پیش کر دی گئیں۔ اخی نے ان کو ایک الماری میں رکھ دیا۔

کچھ دیر بعد برتنوں میں کھانا لایا جانے لگا۔ خالی برتن سلیقے سے ہر ایک کے سامنے رکھ دیے گئے اور ان کو شوربے اور روٹیوں سے پُر کر دیا گیا۔

اخی نے درداغ سے کہا۔ ”ثرید کا کھانا سنت ہے اس لیے پہلے پیالے میں تھوڑا سا ثرید لے کر پی لو تو اس کے بعد کھانا کھاؤ۔“

ثرید ایک قسم کا شوربا تھا، ہر ایک نے اپنے پیالے میں تھوڑا تھوڑا ثرید انڈیلا اور ہونٹوں سے لگا کر پی لیا۔ اس کے بعد باقاعدہ کھانے کا آغاز ہوا۔ یہ سلسلہ دیر تک جاری رہا۔ کھانا کھانے کے بعد انہوں نے برتن ہٹائے اور ہاتھ منہ صاف کر کے دوبارہ آکے بیٹھ گئے۔

اب رقص اور گانے کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ پہلے کئی نوجوانوں نے لَے سے لَے ملا کر ایک خوب صورت گیت سنایا۔ اس گیت میں دنیا کی بے ثباتی اور انسانی زندگی کی بے اعتباری کا رونا رویا گیا تھا۔ آوازوں کا سوز اور گیت کے بامعنی بولوں نے درداغ کو تڑپا دیا۔ اس کا دل بھر آیا۔

درداغ ان کی مہمان نوازی سے بے حد متاثر ہوا۔ دو نوجوان ہر وقت اس کے پاس اور ساتھ رہتے تھے تاکہ درداغ کو کسی قسم کی پریشانی نہ پیش آئے۔ اس نے ایک نوجوان سے پوچھا۔ ”جب تم لوگوں نے دنیا ترک کر دی ہے تو پھر تمہاری کمر میں یہ چھری کیوں اڑسی رہتی ہے؟“

نوجوان نے جواب دیا۔ ”ہم لوگ دنیا سے دور رہیں یا دنیا کے اندر ہتھیاروں کی ضرورت بہر حال رہتی ہے اور یہ چھرا ہمیشہ اپنے مہمانوں کی حمایت میں باہر نکلتا ہے۔“

ان تارک الدنیا نوجوانوں کو باہر کی دنیا کے بارے میں کوئی زیادہ معلومات حاصل نہیں تھیں۔ انہیں بس اتنا ہی اندازہ تھا کہ منگولوں نے پوری دنیا کو تہ و بالا کر کے رکھ دیا ہے۔ انہیں بغداد کی بربادی کا علم تھا لیکن نہایت سرسری۔ بغداد کے بعد عالم اسلام پر کیا گزری انہیں نہیں معلوم تھا۔ درداغ نے انہیں بتایا کہ اب منگول قاہرہ کی طرف جانے

والے ہیں اور مصر کا مملوک سپاہ سالار بیبرس کماندار بھی منگولوں سے نبرد آزما ہونے کا تہیہ کر چکا ہے۔

ان لوگوں نے درداغ کو تین دن تک مہمان بنائے رکھا لیکن تیسری شب وہ کہیں سے ایک مہمان اور لے آئے اور جب اس مہمان کو اس بڑے ہال میں لایا گیا جہاں پہلی بار درداغ کو بھی لایا گیا تھا تو درداغ نے اس مہمان کو پہچان لیا۔ یہ مصری دولت مند تھا۔ دونوں نے ایک دوسرے کو بہت غور سے دیکھا۔ مصری دولت مند نے حیرت سے پوچھا۔ ''درداغ! یہ تو، تو یہاں کیا کر رہا ہے؟''

درداغ نے جواب دیا۔ ''یہ تو میں آپ کو بتا ہی دوں گا کہ میں یہاں کیوں آیا اور کیا کر رہا ہوں مگر اس سے پہلے میں آپ سے یہ پوچھوں گا کہ آپ یہاں کہاں؟ مصر سے اتنی دور؟''

مصری دولت مند نے ایک سرد آہ بھری، بولا۔ ''درداغ! مجھ پر بڑا ظلم ہوا ہے۔''

تارکِ دنیا نوجوانوں کے اخی نے پوچھا۔ ''کیا تم دونوں ایک دوسرے سے واقف ہو؟''

مصری دولت مند نے جواب دیا۔ ''ہاں ہم دونوں ایک دوسرے سے اچھی طرح واقف ہیں۔''

درداغ نے اخی سے کہا۔ ''پھر بھی میں یہ جاننا چاہوں گا کہ یہ شخص جس کو میں مصری دولت مند کہہ رہا ہوں، یہاں کیوں آیا؟ میرے اس سوال کے جواب میں یہ جو کچھ بتائے گا، جھوٹ ہوگا۔''

اخی نے مصری دولت مند سے پوچھا۔ ''کیا یہ تیری بابت درست کہہ رہا ہے؟''

مصری دولت مند نے کہا۔ ''اب میں کیا کہوں دوستو! بہرحال یہ حقیقت ہے کہ مجھے مصر کے بیبرس کماندار نے بہت ستایا ہے اور آج جو میں دربدر کی خاک چھانتا پھر رہا ہوں، اس کا اصل ذمے دار بیبرس کماندار ہی ہے۔''

درداغ مصری دولت مند کے عزائم کا پتا چلانا چاہتا تھا، اس لیے نرم پڑ گیا، بولا۔ ''مصری دولت مند! میں کبھی تو یہ سوچتا ہوں کہ تجھ کو آپ کہہ کر مخاطب کروں اور کبھی تم اور تجھ سے بات کرنے کو جی چاہتا ہے۔ تم نے میرے سپرد جو کام کیا تھا، اگر اس کی بابت مجھ کو پہلے ہی سب کچھ معلوم ہو گیا ہوتا تو شاید اتنی نوبت نہ آتی۔''

مصری دولت مند نے برا سا منہ بنایا۔ ''میں تو اب یہ سوچ رہا ہوں کہ مصر کا حشر کیا ہوگا؟ بیبرس کماندار نے منگول وفد کے ارکان کو قتل کر کے اچھا نہیں کیا۔ اب وہ لوگ قاہرہ کی اینٹ سے اینٹ بجا دیں گے اور بیبرس کماندار پورے مصر کو برباد کرا کے خود کہیں فرار ہو جائے گا۔''

درداغ نے کہا۔ ''خدا ہم سب پر رحم فرمائے، دیکھیے کیا پیش آتا ہے۔''

مصری دولت مند نے پوچھا۔ ''یہ تو کہاں غائب ہو گیا تھا؟''

درداغ نے جواب دیا۔ ''میں کہاں غائب ہوتا۔ جب میں تمہارے آدمیوں کے ساتھ گرفتار ہو کر بیبرس کماندار کے سامنے پیش کیا گیا تو میں نے رو رو کر اس سے معافی مانگ لی اور پھر بیبرس کماندار کو یہ یقین دلایا کہ اگر اس بار مجھ کو معاف کر دیا جائے تو میں مصر چھوڑ کر کہیں اور چلا جاؤں گا اور اس سے یہ وعدہ بھی کیا کہ اب میں کسی خانقاہ میں بیٹھ کر اللہ اللہ کروں گا اور اپنی پوری زندگی رہبانیت میں گزار دوں گا۔''

مصری دولت مند نے جلدی جلدی سوال کیا۔ ''پھر؟ پھر کیا ہوا؟ بیبرس کماندار نے کیا کہا؟''

درداغ نے جواب دیا۔ ''معلوم نہیں کیوں وہ میری پیشکش پر مسکرایا اور اس نے کہا۔ جا، میں نے تجھ کو معاف کیا لیکن خبردار جو تو کاروبارِ دنیا میں کہیں نظر آیا۔ چنانچہ اب میں نے صوف اوڑھ لیا ہے اور دنیا کو ترک کر چکا ہوں۔''

مصری دولت مند نے کہا۔ ''لیکن میرے خیال میں تو نے یہ اچھا نہیں کیا۔''

درداغ نے پوچھا۔ ''پھر مجھے کیا کرنا چاہیے تھا؟''

مصری دولت مند نے پہلے تو ماحول کا جائزہ لیا۔ ہال کا ہر آدمی دونوں کی باتیں بڑی دلچسپی سے سن رہا تھا لیکن صبح فجر کی نماز کے بعد وہ دونوں ہوا خوری کرتے ہوئے دور نکل گئے اور ایک درخت کے نیچے بیٹھ کر آزادی سے باتیں کرنے لگے۔ درداغ نے پوچھا۔ ''ہاں اب بتاؤ، مجھے کیا کرنا چاہیے تھا؟''

مصری دولت مند نے سرگوشی میں جواب دیا۔ ''جو میں کرنے جا رہا ہوں۔''

درداغ نے پوچھا۔ ''تم کیا کرنے جا رہے ہو؟''

مصری دولت مند نے جواب دیا۔ ''تو جانتا ہے کہ میرے ساتھ کتنی زیادتی ہوئی ہے۔ مجھ پر بیبرس کماندار نے کتنا ظلم کیا ہے۔ میں جو کچھ بھی کر رہا تھا، وہ میرا پیشہ تھا اور پیشہ حبیب اللہ ہوتا ہے۔ بیبرس نے مجھے برباد کر دیا لیکن میں اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھوں گا جب تک بیبرس کو برباد نہیں کر لوں گا۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ ہلاکو خان قراقرم

واپس جارہا ہے۔ میں اس سے ملنے جارہا ہوں اور اس کو روکنے کی کوشش کروں گا۔"

درداغ نے پوچھا۔ "کیا خیال ہے، کیا تم ہلاکو خان کو روکنے میں کامیاب ہوجاؤ گے؟"

مصری دولت مند نے جواب دیا۔ "میں اپنی سی کوشش کر کے ضرور دیکھوں گا۔ میں خواجہ نصیر الدین طوسی سے ملوں گا اور اس کے ذریعے ہلاکو خان کو سمجھاؤں گا کہ مصر کی تسخیر زیادہ دشوار کام نہیں۔ اگر ہلاکو خان قراقرم واپس نہ جائے تو سارا مسئلہ حل ہوجائے گا۔"

درداغ نے کہا۔ "لیکن اس میں تمہیں کیا فائدہ پہنچے گا؟"

مصری دولت مند چہک کر بولا۔ "میں اپنا کاروبار آزادی سے چلاسکوں گا۔"

درداغ نے جواب دیا۔ "شاید، مجھے یقین نہیں کہ ایسا ممکن ہوسکے گا کیونکہ فاتح ہمیشہ اپنی کامیابی کے بعد اپنے قول وقرار سے پھر جاتے ہیں۔"

مصری دولت مند نے درداغ کو بھی ترغیب دی، کہا۔ "اگر تو بھی میرے ساتھ ہلاکو خان کے پاس چلے تو مزہ آجائے۔"

درداغ نے صاف جواب دے دیا۔ "افسوس کہ میں نے صوف اوڑھ لیا ہے اس لیے اب دنیاداری میں نہیں پڑنا چاہتا۔"

مصری دولت مند نے حیرت سے کہا۔ "تیری مرضی...... میں تجھے مجبور تو نہیں کرسکتا۔"

اس وقت درداغ کی حالت ہی کچھ اور تھی۔ بار بار اس کے جی میں یہی آتا کہ وہ اٹھے اور دوسرے نوجوانوں کو مصری دولت مند سے متعارف کرادے لیکن پھر یہ سوچ کر چپ ہورہا کہ مصری دولت مند جو کچھ کررہا ہے، اس کو کرنے دیا جائے۔ ہاں بیبرس کماندار کو مصری دولت مند کے عزائم سے ضرور واقف کرادیا جائے اور رہ گئی ہلاکو کی واپسی اور مصر پر حملہ آوری، تو اب یہ کام اتنا آسان نہیں رہا تھا۔ اب ہلاکو خان کو روکنے کے لیے برقائی خان ہی کافی تھا۔

درداغ کو جلد از جلد مصر واپس جانا تھا۔ اس نے مصری دولت مند سے اجازت لی اور تارک دنیا نوجوانوں کا ان کی مہمان نوازی پر شکریہ ادا کیا اور مصر کے لیے روانہ ہوگیا۔

واپسی میں اس نے حلب سے دمشق تک منگولوں کو تیاریاں کرتے دیکھا۔ وہ قط بوغا کی سرداری میں مصر پر حملہ آوری کے منصوبے بنارہے تھے۔ اس نے اونی پوشش میں خود کو چھپا رکھا تھا۔ جو بھی دیکھتا، اسے صوفی سمجھتا۔ جب وہ شام کی حدود پار کرکے مصر کی طرف بڑھا تو یہ دیکھ کر اس کی طبیعت خوش ہوگئی کہ بیبرس کماندار نے سرحدوں پر چوکیوں کا ایک جال سا پھیلا رکھا تھا۔

☆☆☆

وہ مملوکوں کی چوکیوں میں داخل ہونا ہی چاہتا تھا کہ منگولوں نے اس کا پیچھا کیا۔ انہوں نے درداغ پر تیر برسائے لیکن وہ بال بال بچ گیا۔ وہ جلد از جلد بیبرس کماندار کے پاس پہنچ جانا چاہتا تھا۔ وہ راہ گیروں، چراگاہوں، چھوٹے بڑے قصبوں اور دیہاتوں کو پیچھے چھوڑتا ہوا قاہرہ کے سامنے پہنچ گیا۔ اس نے یہاں بڑی گہما گہمی محسوس کی لیکن خاص قاہرہ میں اسے روک لیا گیا۔

انہیں درداغ پر شبہ تھا۔ یہ نئے لوگ درداغ کو منگول، کافر منگول سمجھتے تھے مگر وہ خود کو مسلمان کہتا تھا۔ جھگڑے نے اتنا طول کھینچا کہ ہر طرف شوروغل سا مچ گیا۔ سڑکوں پر لوگ یہ کہتے پھر رہے تھے کہ ایک منگول مسلمان بن کے گھر کے بھید حاصل کرنے آگیا ہے۔ یہ چہرے بالکل نئے تھے...... درداغ نے انہیں یقین دلایا کہ وہ ایک ضروری منصوبے کے ساتھ قفقاز گیا ہوا تھا۔ بس سلطان یا بیبرس کماندار کو اس کی آمد سے آگاہ کردیا جائے۔

جب ان کی آپس میں کچھ زیادہ ہی گرما گرمی ہوگئی تو ایک دکاندار نے ان دونوں کے بیچ میں کھڑے ہوکر بیچ بچاؤ کرایا۔ اس نے کہا۔ "جب یہ شخص کہتا ہے کہ اس کو بیبرس کماندار سے ملنا ہے تو تم لوگ اس کو کیوں روک رہے ہو؟"

ایک پہریدار نے جواب دیا۔ "اس وقت ہمارا سردار بیبرس کماندار بے حد اہم اور ضروری ہے۔ ہم نہیں چاہتے کہ کوئی اجنبی شخص ہمیں دھوکا دے کر وہاں تک پہنچ جائے۔"

دکاندار نے کہا۔ "ایسا نہیں ہوسکتا اور یہ شخص تو بیبرس کماندار کے لیے بہت اہم اور ضروری ہے۔"

دکاندار نے اپنے عمامے میں اپنا چہرہ چھپا رکھا تھا۔ اس نے ایک طرف کونے میں لے جاکر اپنا چہرہ دربان کو دکھایا۔ دربان پیچھے ہٹ گیا اور دکاندار درداغ کو اندر لے گیا۔ درداغ نے پوچھا۔ "دکاندار! تو اندر کس تقریب میں جارہا ہے؟ بیبرس کماندار تجھ کو معاف نہیں کرے گا۔ وہ بہت زیادہ سخت انسان ہے۔"

دکاندار نے جواب دیا۔ "میں بیبرس کماندار سے

نہیں ڈرتا۔ ہلاؤ کہاں ہے وہ؟"

درداغ کو دکاندار کی آواز پر کچھ شک گزرا۔ اس نے دکاندار کو غور سے جو دیکھا تو وہ مسکرانے لگا، بولا۔ "برقائی خان کا جواب کہاں ہے؟ ذرا میں بھی تو دیکھوں اس نے کیا جواب دیا۔"

دکاندار نے اپنے چہرے پر سے عمامہ ہٹا دیا۔ اب اس کے سامنے دکاندار کے بجائے خود بیبرس کماندار تھا۔ درداغ دھک سے رہ گیا، بولا۔ "مجھے تو یقین نہیں آتا کہ میں......"

لیکن بیبرس نے بات کاٹ دی، پوچھا۔ "اور کہہ برقائی خان کس طرح پیش آیا؟"

درداغ نے جواب دیا۔ "کماندار محترم! برقائی خان نے وعدہ کرلیا ہے کہ ہلاکو خان سے اس کی زیادتیوں کا جواب طلب کیا جائے گا اور اس نے یہ وعدہ بھی کیا ہے کہ اگر ہلاکو خان نے مصر پر حملہ کرنے کی کوشش کی تو پیچھے سے اس پر حملہ کردیا جائے گا اور اس کو اس کی حماقتوں کا مزہ چکھا دیا جائے گا۔"

اس کے بعد بیبرس کماندار نے زریں خیل کے خان برقائی خان کا جواب پڑھا اور بہت خوش ہوا۔ اس نے مساجد کے اماموں کو اسی وقت یہ فرمان بھیج دیا کہ آئندہ جمعے کے خطبے میں برقائی خان کا نام بھی شامل کرلیا جائے۔

اسی دوران بیبرس کماندار کو درداغ نے مصری دولت مند کی ملاقات اور اس کے عزائم کی خبر دی۔ بیبرس نے حیرت سے پوچھا۔ "تو وہ ہلاکو خان سے مدد حاصل کرنے گیا ہے، خوب!"

درداغ نے جو کارنامہ تن تنہا انجام دیا تھا، بیبرس کے دل پر وہ نقش ہوگیا تھا۔ درداغ کو سلطان سیف الدین قطز کی خدمت میں پیش کردیا گیا اور بیبرس کماندار نے اس کی سفارش کی۔ "درداغ اس کا مستحق ہے کہ اسے فتح مندی کے بعد کسی شہر کی حکومت عطا کی جائے۔"

شاید سلطان قطز کو اپنی کامیابی کا یقین نہیں تھا، اس نے کہا۔ "بیبرس! کیا تجھ کو یقین ہے کہ برقائی خان ہلاکو خان کے مقابلے میں ہمارا ساتھ دے گا؟"

بیبرس نے جواب دیا "صد فیصد، برقائی خان مسلمان ہے اور اس کا تعاون ہمارے لیے بہت ضروری ہے۔"

سلطان قطز نے کہا۔ "منگول وفد کے ارکان کا قتل کر دیا جانا میرے خیال میں مناسب نہیں تھا۔ ہم منگولوں کو کسی اور طرح بھی جنگ پر آمادہ کرسکتے تھے۔ میں سوچتا ہوں کہ کہیں ہماری یہ زیادتی ہمارے حق میں وبالِ جان نہ ثابت ہو۔"

بیبرس کو سلطان کی باتیں بہت گراں گزر رہی تھیں۔ اس کی تیوریوں پر بل پڑ گئے، بولا۔ "سلطان! میں نے جنگ جیتنے کی ذمے داری قبول کی ہے اور اللہ کی مدد سے میں اس مہم کو سر کرکے رہوں گا۔ آپ کو فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔ بس جب میں منگولوں کے پرخچے اڑا چکوں تو آپ اپنے وعدے کے بموجب حلب کی حکومت مجھے بخش دیجیے۔ میں اس سے زیادہ اور کچھ نہیں چاہوں گا۔"

جب سلطان سے باتیں کرکے بیبرس باہر نکلا تو وہ خاصا فکرمند نظر آرہا تھا۔ اس نے درداغ کو سمجھایا۔ "میرے منگول نومسلم! تم دل برداشتہ ہرگز نہ ہونا۔ سلطان کی ہمت جواب دے رہی ہے لیکن میں منگولوں کو زیادہ اہمیت دینے کو تیار نہیں۔ میں انہیں اس طرح اڑا دوں گا جس طرح کسی طوفان میں خس و خاشاک اڑ جایا کرتے ہیں۔"

درداغ نے جواب دیا۔ "کماندار محترم! میں ہر حال میں آپ کے ساتھ ہوں، میں یہ نہیں جانتا کہ......"

بیبرس نے اس کی بات کاٹ دی۔ "میں سلطان سے خوفزدہ ہوں، اگر اس نے عین دورانِ جنگ بزدلی دکھائی تو میرا کیا حشر ہوگا؟"

درداغ کو چند جملے رٹے ہوئے تھے، بولا۔ "بہرحال میں آپ کا ساتھ نہیں چھوڑوں گا۔ میں اس کے لیے حلف اٹھانے کو تیار ہوں۔"

درداغ کے دل میں مصری دولت مند کی حسین ترین لڑکی چٹکیاں لے رہی تھیں۔ اس کا خیال تھا کہ وہ لڑکی شاید اب بھی مصری دولت مند کے محل میں موجود ہوگی۔ وہ اس لڑکی کو ہر حال میں حاصل کرنا چاہتا تھا لیکن بیبرس سے بات کرنے کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی۔

بیبرس اس کے دل و دماغ میں اتر کر اس کی الجھنوں اور پریشانیوں میں اتر جانا چاہتا تھا۔ اس نے دبے لفظوں میں بیبرس سے کہا۔ "کماندار محترم! کیا میری ایک چھوٹی سی درخواست پر غور کیا جاسکتا ہے؟"

بیبرس نے جواب دیا۔ "کیوں؟ چھوٹی کیا تو بڑی درخواست پیش کرسکتا ہے اور اس پر بھی وہی خصوصی توجہ دی جائے گی، جس کے لیے تجھے اور تیری درخواست کو استحقاق پیدا ہوگیا ہے۔"

درداغ نے کہا۔ "میں اس کی شرعی حیثیت معلوم کرنا چاہتا تھا کہ کسی غدار کے مکان کی تلاشی اس کی عدم موجودگی

میں لی جاسکتی ہے یا نہیں؟"

ہبرس نے پوچھا۔ "وہ غدار ہے کون اور اس کے گھر کی تلاشی کا لیا جانا کیوں ضروری ہے؟"

درداغ جو بات کہنا چاہتا تھا، کہتے ہوئے ہچکچا رہا تھا پھر بھی کہہ دی۔ "میری مراد مصری دولت مند سے ہے۔ اس نے مجھ سے کچھ وعدہ کیا تھا لیکن بعد میں اس سے پھر گیا۔ کیا میں وہ چیز اس کی تلاشی کے بعد حاصل کرسکتا ہوں؟"

ہبرس سوچ میں پڑ گیا پھر بولا۔ "اصل بات کیا ہے صاف صاف بتا پھر میں کوئی جواب دوں گا۔"

درداغ نے جواب دیا۔ "اس نے مجھے ایک لڑکی پیش کی تھی۔ مجھے وہ لڑکی بہت پسند آ گئی تھی لیکن بعد میں وہ لڑکی اما تھا واپس لے لی۔ اس کے بعد وہ ملک ہی چھوڑ گیا۔ کیا میں اس لڑکی کو اس کی عدم موجودگی میں حاصل کرسکتا ہوں؟"

ہبرس نے پوچھا۔ "مصری دولت مند وہ لڑکی تیری کس خدمت کے عوض دے رہا تھا؟"

اب درداغ لاجواب ہو چکا تھا، بولا۔ "مصری دولت مند اگر موجود ہوتا تو وہ خود بتاتا۔ میں کیا بتاؤں۔"

ہبرس نے کہا۔ "درداغ! تو نے میرے لیے جو کارنامہ انجام دیا ہے، میں اس کے عوض تیرے لیے جو کچھ کروں کم ہے مگر تو نے مصری دولت مند کی اس کے علاوہ کیا خدمت کی ہے کہ اس کے لیے قافلے لوٹے ہوں اور عورتوں اور لڑکیوں کو اس کے حوالے کر دیا ہو۔"

درداغ شرما رہا تھا، بولا۔ "محترم کمانڈار! میں پہلی بار اس کام سے نکلا تھا کہ پکڑا گیا۔ اس سے پہلے میں نے ایسا ویسا کوئی کام نہیں کیا۔"

ہبرس نے کہا۔ "میں اس قصر کی تلاشی تو لے سکتا ہوں، لیکن اس کی کوئی چیز اس کی عدم موجودگی میں اس کی اجازت کے بغیر نہیں دے سکتا۔"

درداغ نے مایوسی سے کہا۔ "آپ کی مرضی، ویسے اگر آپ اس کے قصر کی تلاشی لے کر وہ لڑکی برآمد کرلیں تو لڑکی خود یہ گواہی دے گی کہ مصری دولت مند اس کو میرے حوالے کر چکا تھا۔"

ہبرس نے کہا۔ "درداغ! میں یہ نہیں کہہ رہا ہوں کہ تو جھوٹا ہے۔ میں تو یہ جاننا چاہتا ہوں کہ تجھ کو مذکورہ لڑکی تیری کس خدمت کے عوض دی گئی تھی۔"

درداغ نے بے بسی سے جواب دیا۔ "اس کا میرے پاس کوئی جواب نہیں، اب مجھے مصری دولت مند کا انتظار کرنا پڑے گا۔"

ہبرس نے کہا۔ "درداغ! میرے دل میں تیری بڑی عزت ہے۔ میں مصری دولت مند کے قصر کی تلاشی لوں گا اور جب تک وہ مصری دولت مند میرے قابو میں نہ آ جائے، اس کا قصر میرے قبضے میں رہے گا۔ رہ گئی وہ لڑکی تو میں اس کو پا جانے کے بعد بھی تیرے حوالے نہیں کرسکوں گا۔"

درداغ نے عرض کیا۔ "اچھا پھر یہی سہی پہلے یہ تو معلوم ہونا چاہیے کہ وہ لڑکی قصر میں موجود بھی ہے یا نہیں۔"

ہبرس نے جواب دیا۔ "اچھا اب تو آرام کر کیونکہ بہت تھکا ہوا ہے۔ میں جس دن قصر کی تلاشی لوں گا، تجھ کو اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔"

درداغ ہبرس سے زیادہ باتیں نہیں کرسکتا تھا کیونکہ ہبرس کے مزاج میں تضاد بہت زیادہ تھا۔ گھڑی میں کچھ گھڑی میں کچھ۔ وہ اپنے گھر چلا گیا۔ وہ انتہائی تھکا ہوا تھا مگر اس کے باوجود لڑکی کو پالینے کی امید نے اس کے رگ و پے میں خوشی اور امید کی گرمی پیدا کر دی تھی۔ لڑکی کا حسین تصور ساون کی پھوار کی طرح اس کے دل و دماغ پر برس رہا تھا۔ پھر اس پر نشہ سا طاری ہو گیا اور وہ سو گیا۔ اس نے دیکھا ہبرس مصری دولت مند کے قصر کی تلاشی لے رہا ہے۔ ابھی تلاشی جاری ہی تھی کہ لڑکی ایک طرف سے نمودار ہوئی اور دوڑ کر درداغ کے قریب آ گئی۔ جب وہ درداغ کے پاس پہنچی تو خوشی کے آنسو بہا رہی تھی۔ ایک طرف سے علیہ نمودار ہو گئی اور وہ درداغ کو شاکی نظروں سے دیکھنے لگی۔

علیہ کی آمد نے درداغ کو شرمندہ اور حیرت زدہ کر دیا۔ اس نے پوچھا۔ "علیہ! یہ تم! صفیہ کہاں ہے؟"

علیہ نے جواب دیا۔ "اب یہ لڑکی تو تمہیں مل ہی چکی ہے، اب میری یا صفیہ کی کیا ضرورت؟"

درداغ نے کہا۔ "ضرورت ہے، بخدا علیہ تیری عدم موجودگی میں میں نے اس پر قناعت کرلی تھی مگر......"

پھر اس کی اچانک آنکھ کھل گئی۔ وہ پریشاں پریشاں ادھر ادھر پھرنے لگا، وہ سوچ رہا تھا، اس کی تعبیر کیا ہو سکتی ہے۔

اس خواب نے اس کو کئی دن تک پریشان رکھا۔ اس نے اپنے اس خواب کا کسی سے ذکر بھی نہیں کیا۔ وہ جب زیادہ پریشان ہوا تو دیہات کی طرف نکل گیا۔ وہاں کھیتوں میں پانی دینے کے لیے رہٹ چل رہے تھے۔ کہیں کہیں ڈھینکلی بھی تھی جس کو اہل مصر 'شدوف' کہتے تھے۔ وہ عورتوں اور مردوں کو ساتھ ساتھ کھیتوں میں کام کرتے دیکھ رہا تھا۔

وہ بے مقصد دیر تک ادھر ادھر گھومتا پھرتا رہا پھر جب

وہ تھک کر اپنے مستقر پر واپس پہنچا تو دروازے پر ایک آدمی بیٹھا دیکھا۔ اس نے درواغ کو دیکھتے ہی کہنا شروع کیا۔ ”جناب! آپ کہاں چلے گئے تھے؟ میں تو آپ کو بڑی دیر سے تلاش کرتا پھر رہا ہوں۔“

درواغ نے سرد مہری سے پوچھا۔ ”وہ کیوں...... مجھ سے کوئی کام؟“

اس آدمی نے جواب دیا۔ ”میں کماندار کی طرف سے آپ کے پاس آیا تھا۔ شاید وہ کسی قصر کی تلاشی لینے جا رہے ہیں اور وہ چاہتے ہیں تلاشی کے دوران آپ بھی ان کے ساتھ اور پاس رہیں۔“

درواغ کی خوشی کی انتہا نہ رہی، بے چینی سے پوچھا۔ ”اس وقت کماندار محترم کہاں ہوں گے؟“

آدمی نے جواب دیا۔ ”میں انہیں آپ کی آمد کی اطلاع دیتا ہوں، بقیہ باتیں آپ دونوں خود کرلیں گے۔“

کچھ دیر بعد جب وہ واپس آیا تو یہ خوش خبری لیے ہوئے کہ کماندار تیار بیٹھا اس کی آمد کا انتظار کر رہا تھا۔ ہیبرس نے چار گھڑ سوار اپنے ساتھ لیے اور وہ مصری دولت مند کے قصر کی طرف روانہ ہو گئے۔ راستے بھر قہر خداوندی کی باتیں ہوتی رہیں۔ جب کچھ دیر بعد یہ لوگ مصری دولت مند کے قصر کے سامنے پہنچے تو درواغ کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ اس نے حسرت اور افسوس سے قصر کی طرف دیکھا پھر نظریں جھکالیں۔

درواغ نے قصر کے در پر زور زور سے دستک دی اور ہیبرس ذرا دور کھڑا گویا تماشا دیکھ رہا تھا۔

کچھ دیر بعد اندر سے کسی نے پوچھا۔ ”کون ہے؟ کیا بات ہے؟“

درواغ نے جواب دیا۔ ”محترم خواتین! آپ لوگ ایک طرف ہو جائیں تا کہ ہم بہ آسانی تلاشی لے سکیں۔“

کسی عمر رسیدہ عورت نے آڑ ہی سے سوال کیا۔ ”مگر یہ تلاشی کس خوشی میں لی جا رہی ہے؟“

درواغ نے آہستہ سے کہا۔ ”محترم خواتین! ہیبرس کماندار ہمارے ساتھ ہیں، انہی کے حکم پر یہ تلاشی لی جا رہی ہے۔“

عورت خاصی حوصلہ مند تھی، بولی۔ ”اپنے کماندار کو ادھر بلاؤ۔ میں ان سے بات کروں گی۔“

درواغ نے جواب دیا۔ ”محترم خاتون! بات کو پیچیدہ نہ کیجیے، آپ سے جو کہا جا رہا ہے اس پر عمل کیجیے۔“

عورت نے سختی سے کہا۔ ”تم جب تک کماندار کو نہیں بلاؤ گے میں یونہی باتیں کرتی رہوں گی۔“

ہیبرس ان دونوں کی باتیں سن رہا تھا، تیزی سے آگے بڑھا اور اپنے ساتھیوں کو حکم دیا۔ ”میری ذمے داری ختم ہوئی۔ میں نے قصر کی خواتین کو حکم دیا تھا کہ وہ ایک طرف ہو جائیں تا کہ قصر کی تلاشی لی جا سکے مگر میں دیکھ رہا ہوں کہ قصر کی کوئی بڑی بی رکاوٹ بنی کھڑی ہیں۔ اب میں اپنے آدمیوں کو حکم دیتا ہوں کہ وہ اندر گھس جائیں اور تلاشی لینا شروع کر دیں۔“

بڑی بی نے جو یہ حکم سنا تو بدحواس ہو گئیں، بولیں۔ ”چند لمحے، بس چند لمحے، ذرا ٹھہرو۔“

اس کے بعد چادروں میں لپٹی ہوئی خواتین قصر سے نکلنا شروع ہو گئیں۔ جب یہ ساری خواتین باہر آ گئیں تو ہیبرس نے پوچھا۔ ”ساری خواتین باہر آ گئیں یا ابھی اندر اور باقی ہیں؟“

بڑی بی نے جواب دیا۔ ”سب باہر آ چکی ہیں۔“

ہیبرس نے اپنے ایک ساتھی کو حکم دیا۔ ”ذرا گننا تو سہی یہ کل کتنی خواتین ہیں؟“

ساتھی نے انہیں گننا شروع کیا، یہ کل بائیس تھیں۔

ہیبرس نے حیرت سے کہا۔ ”بائیس عورتیں؟ واللہ اتنی بہت ساری عورتیں۔“ پھر بڑی بی سے کہا۔ ”محترم خاتون! آپ کو زحمت تو ہو گی، ذرا ان خواتین کا فرداً فرداً تعارف تو کرا دیں۔ میں صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ ہر عورت کا مصری دولت مند سے کیا رشتہ ہے؟“

بڑی بی نے جواب دیا۔ ”اب میں ان کے رشتے کیا بتاؤں گی اور یوں بھی ہر عورت کا اس سے رشتہ بھی نہیں ہے۔ گھر کی آزاد عورتیں تو بس چار ہی ہیں، باقی ساری کنیزیں ہیں۔“

ہیبرس نے پوچھا۔ ”کیا آپ بتا سکتی ہیں کہ ان کنیزوں کو خریدا گیا تھا یا انہیں قافلوں پر ڈاکا ڈال کے حاصل کیا گیا تھا؟“

ابھی بڑی بی کوئی جواب نہ دے سکی تھیں کہ کنیزوں نے رونا شروع کر دیا۔ وہ رو رہی تھیں اور بین کر رہی تھیں۔ ”رحم دل کماندار! ہم پر بڑا ظلم ہوا ہے، ہمیں قافلوں سے لوٹ کر حاصل کیا گیا ہے۔“

ہیبرس نے حکم دیا۔ ”وہ عورتیں اور لڑکیاں ایک طرف ہو جائیں جنہیں قتل و غارت گری سے حاصل کیا گیا ہے۔“

ہیبرس کے حکم کی تعمیل اس طرح ہوئی کہ اٹھارہ خواتین ایک طرف ہو گئیں۔

ہیبرس نے پوچھا۔ ”قصر کے اندر سے ساری خواتین

باہر آگئیں یا ابھی کچھ باقی ہیں؟“

ایک لڑکی نے جواب دیا۔ ”ابھی دو خواتین اندر ہی ہیں۔“

ہبیرس نے چیخ کر حکم دیا۔ ”انہیں بھی باہر لایا جائے۔“

بڑی بی نے گریہ وزاری کی۔ ”محترم کماندار! خدا کے لیے ہم پر رحم فرمائیں۔ میرا بیٹا ان دونوں لڑکیوں پر عاشق ہے۔ اگر انہیں آپ نے لے لیا تو میرا بیٹا خودکشی کرلے گا۔ وہ ان کی مفارقت نہیں برداشت کرسکے گا۔“

ہبیرس نے گویا بڑی بی کی بات سنی ہی نہیں۔ تحکمانہ کہا۔ ”میرے حکم کی تعمیل ہو ورنہ میں اندر گھس جاؤں گا۔“

اس بار حکم کی تعمیل میں درداغ اندر گھس گیا اور مضطربانہ دونوں لڑکیوں کو ادھر ادھر تلاش کرنے لگا۔ ان دونوں کا کہیں پتا نہ تھا، کچھ دیر بعد یہ کہتا ہوا باہر نکلا کہ اب اندر ایک لڑکی بھی نہیں۔

ایک لڑکی نے کہا۔ ”نوجوان! تو میرے ساتھ چل۔ میں ان دونوں کو ابھی برآمد کرادوں گی۔“

اس لڑکی کی آواز نے درداغ کو چونکا دیا، وہ اس کے ساتھ ہی اندر گھس گیا لیکن اندر جاتے ہی پہلا سوال یہ کیا۔ ”لڑکی! کیا تو وہی تو نہیں ہے جسے میں ایک بار مصری دولت مند سے انعام میں حاصل کرچکا ہوں؟“

لڑکی نے اپنے چہرے پر سے چادر ہٹا دی اور مسکراتے ہوئے شرما کر کہا۔ ”ہاں میں وہی ہوں، مجھے پہچان لے۔“

درداغ صبر نہیں کرسکا، بے صبری سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ ”آہ لڑکی! یہ جو کچھ بھی ہوا تیری تلاش میں ہوا ہے۔ بخدا جب سے میں نے تجھے دیکھا ہے سکون و چین سے نہیں ہوں۔“

لڑکی نے پلکیں جھکالیں، بولی۔ ”خود میرا ابھی یہی حال ہے مگر میں کسی سے کہہ نہیں سکتی۔“

درداغ خوشی سے پاگل ہورہا تھا، بولا۔ ”افسوس کہ میں زیادہ دیر تک یہاں رک بھی نہیں سکتا۔ اے کاش یہ لمحات امر ہوجائیں، منجمد ہوجائیں۔ وقت ٹھہر جائے اور میں اسی طرح تیرے نزدیک، تیرے سامنے کھڑا رہوں۔“

اسی وقت کسی نے درداغ کی پشت پر ایک دوہتڑ رسید کردیا۔ ”ارے بے وفا! یہ تو ہے، ہمیں لٹیروں کے حوالے کرکے اس لڑکی سے عشق لڑا رہا ہے۔“

درداغ نے گھبرا کر لڑکی کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ اس نے دیکھا، اس کے سامنے علیہ اور صفیہ کھڑی ہوئی تھیں۔

علیہ کی آنکھیں ڈبڈبائی ہوئی تھیں۔ ”درداغ! ایک مصری دولت مند ہمیں لوٹ کر یہاں لے آیا تھا۔ تو نے تو میری خبر ہی نہیں لی اور خبر بھی کسی کی لی تو اس لڑکی کی! جو ہم دونوں سے کمتر ہے۔“

صفیہ نے کہا۔ ”میں رو رو کر شب و روز درداغ کی زندگی کی دعائیں مانگتی رہتی تھی۔ جب مجھے یہ زندہ ملا بھی تو اس حال میں کہ ایک کمتر درجے کی لڑکی اس کے پاس تھی۔ خدایا یہ کیسا ظلم ہورہا ہے ہم پر۔“

درداغ کے پاس ان باتوں کا کوئی جواب نہ تھا۔ لڑکی ان دونوں کو حیران و پریشان دیکھ رہی تھی اور واقعہ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا بالآخر اس نے پوچھ ہی لیا۔ ”درداغ! یہ عورتیں کون ہیں؟“

درداغ نے لڑکی پر ایک نظر ڈالی اور سر جھکالیا، بولا۔ ”میں کتنا خوش قسمت ہوں اور کتنا بدقسمت۔ جب میں محروم ہوا تو ہر ایک سے محروم ہوگیا اور جب قسمت نے یاوری کی تو تینوں ایک ہی جگہ مل گئیں۔ پتا نہیں اب میں کس کو کھوؤں گا اور کس کو پاؤں گا۔“

باہر سے ہبیرس کی آواز سنائی دی۔ ”اندر کیا کرنے لگے درداغ! کیا دونوں لڑکیاں مل گئیں؟“

درداغ نے ان تینوں کو ساتھ لیا اور آہستہ آہستہ باہر نکلا۔ ہبیرس نے درداغ کے چہرے پر پھیلی ہوئی بدحواسی کی سیاہی محسوس کرلی، پوچھا۔ ”درداغ! ابھی جب تو اندر گیا تھا تو تیری چال میں بڑی تیزی تھی لیکن جب تو باہر آیا تو قدموں میں بوجھل پن پیدا ہوچکا ہے۔ آخر یہ کیوں؟“

درداغ نے جواب دیا۔ ”محترم کماندار! آپ کو یاد ہوگا کہ میں نے یہ بتایا تھا کہ میں جن دو لڑکیوں سے محبت کرتا تھا انہیں ڈاکوؤں نے مجھ سے چھین لیا تھا۔ آج میں یہاں جس لڑکی کی جستجو میں آیا تھا، وہ تو مل ہی گئی مگر اس کے ساتھ ہی وہ دونوں بھی مل گئیں جو ڈاکوؤں کے ہتھے چڑھ گئی تھیں۔“

ہبیرس نے ان دونوں کی طرف دیکھا اور اس سے پوچھا۔ ”کیا یہ وہی دونوں ہیں؟“

درداغ نے جواب دیا۔ ”ہاں، یہی وہ دونوں ہیں۔“

لڑکی درداغ سے ہٹ کر کھڑی ہوگئی مگر علیہ اور صفیہ اب بھی ذرا فاصلے پر دور کھڑی ہوئی تھیں اور دونوں ہی اس لڑکی کو رشک و حسد سے دیکھ رہی تھیں۔ پتا نہیں اس دوری میں شرم و حیا کارفرما تھی یا حسد اور غصہ۔

ماخذات

تاریخ تمدنِ اسلام، جرجی زیدان، الفہرست، ابنِ ندیم، طبقاتِ ناصری، منہاج سراج، الفخری، ابن طباطبا، تاریخ اسلام، شاہ معین الدین ندوی، تاریخ الخلفا، مولانا جلال الدین سیوطی

جھوٹا خواب

تنویر ریاض

کسی کے خوابوں پر حکومت تو کبھی کسی بادشاہ نے بھی نہیں کی مگر وہ عجیب لوگ تھے جو اپنی مرضی کے منظر اپنے مطلوب کی آنکھوں میں سجا دیتے تھے۔ گویا سحر انگیزی ہر جانب فتنے جگا رہی تھی مگر ساتھ ہی کہیں تجسس کی چنگاری بھی دھیرے دھیرے بہت سے نقاب جلاتی جا رہی تھی اور بالآخر ان جھوٹے خوابوں کا ڈھیر قبر میں دفن ہو گیا۔

یقین و اعتقاد سے کھیلنے والے چند بازیگروں کا عبرت اثر انجام

دنیا کے سات عجائبات دیکھنے کی غرض سے میں اور میرے معمر استاد انتھنی پیٹر یونان کے جزیرہ رہوڈز پہنچے تو ہم نے موسم سرما یہیں گزارنے کا فیصلہ کیا کیونکہ نومبر اور مارچ کے درمیان کشتی رانی کا موسم روایتی طور پر معطل ہو جاتا ہے۔ یہ فیصلہ ایک طرح سے ٹھیک ہی تھا کیونکہ اس موسم سرما میں شمال سے آنے والی ہوا غیر معمولی طور پر تیز چل رہی تھی اور سردی کی شدت میں اضافہ ہو گیا تھا۔ سمندر میں مدوجذر کی کیفیت تھی اور منہ زور لہریں سر اٹھا رہی تھیں جنہوں نے کئی مضبوط جہازوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ اس معروف بین الاقوامی شہر میں ہمارے دولت مند اور عالم فاضل میزبان پوپی ڈونیوس کا مکان ایک آرام دہ اور محفوظ جنت تھا جس کے کئی کمروں کو بہت سے آتش دانوں کے

ذریعے گرم رکھا جاتا تھا۔ جب باہر شدت کا طوفان ہوتا تو میں اس کی بڑی سی لائبریری میں اپنی پسندیدہ کتاب پڑھ کر لطف اندوز ہو رہا ہوتا تھا۔

میری تنہائی دور کرنے کے لیے ونڈوکس موجود تھا۔ گال سے واپس آتے ہوئے دیگر عجائبات کی طرح پوسی ڈونیوس یہ نمونہ بھی ساتھ لے آیا تھا۔ اس کا تعلق سیگوروِوی قبیلے سے تھا۔ لمبا قد، زرد سنہرے بال اور مونچھیں جو اس کی ٹھوڑی تک پہنچ رہی تھیں۔ میں اس موسم سرما میں اٹھارہ سال کا ہو گیا تھا اور ونڈوکس کی عمر بھی کچھ زیادہ نہیں تھی۔ ہم جلد ہی اچھے دوست بن گئے۔

ایک صبح میں لائبریری کے کونے میں تنہا بیٹھا مطالعہ کر رہا تھا کہ میں نے دروازہ کھلنے کی آواز سنی۔ میرے چاروں طرف کتابوں سے بھری الماریاں تھیں جو ایک طرح سے پردے کا کام کر رہی تھیں۔ ان کی وجہ سے میں مکمل طور پر پوسی ڈونیوس اور اس عورت کی نظروں سے اوجھل تھا جو اس سے ملنے آئی تھی۔ مجھے فوری طور پر اٹھ جانا چاہیے تھا لیکن میں نے اس میں ہچکچاہٹ سے کام لیا۔ میرا وہاں رکنا مناسب نہیں تھا کیونکہ بہت جلد یہ ظاہر ہو گیا کہ وہ عورت کسی نازک معاملے پر میرے میزبان سے بات کرنے آئی تھی۔

''زہر؟'' میں نے پوسی ڈونیوس کو کہتے ہوئے سنا تو میرے کان کھڑے ہو گئے۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ''لیکن کورینا! تمہارے بھائی کے گھر میں ایسا کون شخص ہے جو اسے زہر دے سکتا ہے۔ روزینڈر کی بیوی مر چکی ہے اور اس کا کوئی بچہ بھی نہیں ہے، کیا یہ درست نہیں ہے؟''

''ہاں۔'' کورینا نامی اس عورت نے کہا۔ ''اس کی بیوی دو سال پہلے زچگی کے دوران مر چکی ہے اور ساتھ ہی اس کا بچہ بھی مر گیا تھا۔''

''تمہارے والدین بھی اس دنیا سے جا چکے ہیں اور تم ہی اس کی واحد بہن ہو۔ میں فرض کر لیتا ہوں کہ تم ہی اس کی وارث ہو؟''

''شاید......'' اس عورت نے قدرے تامل سے کہا۔

''کیا روزینڈر نے کوئی وصیت لکھی ہے جس میں اس کے برعکس ہدایات دی گئی ہوں؟''

کورینا نے ضرور کندھے اچکائے ہوں گے جس پر پوسی بولا۔ ''یہ جاننا فائدہ مند ہو گا۔ میں نے ایسے کئی کیس دیکھے ہیں جن میں کچھ لوگ اپنے گھر والوں پر چھوڑ دیتے ہیں کہ وہ ان کے مرنے کے بعد خود ہی فیصلہ کر لیں۔ اگر روزینڈر نے ایسا کیا ہے تو میں فرض کر لیتا ہوں کہ گھر کا ہی کوئی فرد اسے زہر دے رہا ہے لیکن تم نے یہ کیسے سوچ لیا کہ اسے زہر دیا جا رہا ہے؟ تمہارا کہنا ہے کہ اس کی صحت ٹھیک نہیں رہتی لیکن اس کی اور بھی وجوہات ہو سکتی ہیں۔''

''روزینڈر بچپن سے لے کر آج تک کبھی بیمار نہیں ہوا۔ میرے مرحوم باپ کا کہنا تھا کہ اس کی اٹھان ایک بیل جیسی ہے۔ جوانی میں بھی اسے کوئی عارضہ لاحق نہیں ہوا۔ بیوی کے مرنے تک بھی وہ بالکل ٹھیک تھا۔ اس کے بعد اسے ایک کے بعد دوسری بیماری لگتی گئی۔ عام طور پر وہ معدے یا آنت میں تکلیف کی شکایت کرتا تھا۔ اس کا وزن بہت کم ہو چکا ہے۔ کسی کسی روز تو وہ بہ مشکل ہی بستر سے اٹھ پاتا ہے۔ ایسے زہر موجود ہیں جو آہستہ آہستہ اثر کرتے ہیں اور کئی ماہ یا سالوں تک ان کی مقدار جسم میں داخل کی جاتی ہے اور اس طرح انسان رفتہ رفتہ موت کی طرف بڑھتا جاتا ہے۔ میں اسی لیے تمہارے پاس آئی ہوں کہ تم ان معاملات کے ماہر ہو۔''

''میں زہر کے بارے میں ایک دو باتیں جانتا ہوں۔ میری تحقیق خالص سائنسی ہے۔ اسی طرح میں بیماریوں کے بارے میں بھی ایک دو باتیں جانتا ہوں۔''

وہ ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ میں جس جگہ بیٹھا ہوا تھا، وہاں میرے اردگرد ایسے مسودے رکھے ہوئے تھے جنہیں مشہور فزیشن ہپوکریٹس نے لکھا تھا۔ وہ کچھ عرصہ رہوڈز میں رہ چکا تھا۔ پوسی ڈونیوس کی لائبریری میں بیماریوں، علاج، زہر، تریاق، علم الاعضا، طویل عمری اور انسانی جسم کے ہر فعل سے متعلق کتابیں تھیں۔

''کیا تمہارے بھائی نے کسی ڈاکٹر کو دکھایا جو ان بیماریوں کا علاج کر سکے؟''

''پہلے اس نے کئی ڈاکٹروں سے علاج کروایا لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا پھر وہ مدد کے لیے ایسکلی پیوس کی طرف راغب ہوا جسے قدیم یونانی مذہب میں دواؤں کا دیوتا کہا جاتا ہے۔ چند راتیں اس نے مقدس احاطے کے ایک سادہ سے کمرے میں گزاریں۔ اس کا کہنا ہے کہ ایسکلی پیوس اس کے خوابوں میں آیا کرتا تھا۔''

''کیا دیوتا نے بہ آواز بلند اس سے بات کی تھی؟''

''غالباً نہیں۔ میں ٹھیک طرح سمجھ نہیں سکی جب روزینڈر مجھے بتانے کی کوشش کر رہا تھا۔ دیوتا نے اسے اپنی خیالی تصویر دکھائی یا معموں میں باتیں کیں۔ تم تو جانتے ہو کہ خواب کیسے ہوتے ہیں۔ یہ روزینڈر پر منحصر ہے کہ وہ اس کا کیا مطلب نکالتا ہے۔ وہاں کے پادری نے دیوتا کی

خواہش سمجھانے میں اس کی مدد کی۔ دیوتا نے میرے بھائی کے لیے کچھ مشکل کام یا صبر آزما آزمائشیں تجویز کی تھیں۔"

"کیسی آزمائش؟"

"گزشتہ موسم گرما میں ایک مرتبہ دیوتا نے اشارہ دیا کہ روزینڈر کو جزیرے کے سب سے اونچے مقام پر چڑھنا ہوگا۔ وہ پیدل چلتا ہوا ماؤنٹ ایٹا بائرس کی اونچائی پر پہنچا۔ میں اپنے کچھ نوکروں کے ہمراہ اس کے پیچھے تھی اور پادری بھی ہمارے ساتھ تھا۔ کیا تم کبھی بلندی پر گئے ہو؟"

"ہاں۔ ایک مرتبہ جب میں جوان تھا۔"

"تم جانتے ہو کہ وہ پہاڑی شہر سے کئی میل دور واقع ہے اور وہاں تک پیدل جانے میں کئی دن لگ جاتے ہیں اور بلندی کو جانے والا راستہ بھی بہت خطرناک تھا۔ میں ڈر رہی تھی کہ روزینڈر کسی موڑ پر گر نہ جائے لیکن بالآخر ہم چوٹی پر پہنچ گئے۔"

"جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، اس چوٹی پر ایک چھوٹا سا معبد بھی ہے جو زیوس دیوتا کے ماننے والوں کے لیے ایک مقدس مقام کا درجہ رکھتا ہے۔" پوسی ڈونیوس نے کہا۔ "وہاں سے تم کریٹ کو جانے والا راستہ دیکھ سکتی ہو۔"

"شاید روزینڈر وہاں یہ نظارہ کرنے نہیں گیا تھا۔ اسے خواب میں دیوتا نے ہدایت دی تھی کہ وہ سب سے اونچی چوٹی پر چڑھے اور کھلے آسمان کے نیچے سو جائے۔ اس رات سمندر میں بڑا خوفناک طوفان آیا۔ تیز آندھی، بجلی کی چمک اور بادلوں کی کڑک نے زمین کو ہلا دیا۔ پہلے بارش ہوئی پھر برف باری شروع ہوگئی۔ ہم سب نے معبد میں جا کر پناہ لی لیکن روزینڈر نے کھلے آسمان تلے رکنے پر اصرار کیا۔ بالآخر میں سو گئی۔ جب آنکھ کھلی تو ڈر رہی تھی کہ اسے کچھ نہ ہو گیا ہو لیکن وہ اپنے قدموں پر کھڑا مسکرا رہا تھا۔ میرا خیال تھا کہ بارش اور برف باری میں اس کی حالت غیر ہو گئی ہوگی لیکن میں نے اسے کئی مہینوں بعد پہلے سے زیادہ خوش اور صحت مند دیکھا۔ ہم پہاڑی سے اترے۔ گھوڑے اور ایک گاڑی کرائے پر لی اور شہر کے لیے واپس روانہ ہو گئے۔ روزینڈر سارے راستے مذاق کرتا اور قہقہے لگاتا رہا۔"

"یعنی دیوتا کے علاج سے فائدہ ہوا؟"

"بظاہر ایسا ہی لگ رہا تھا لیکن میرا خیال تھا کہ شاید وہ اس لیے بہتر نظر آ رہا ہے کہ اس نے گھر سے نکل کر سفر کیا تھا اور اس شخص سے دور ہو گیا جو اسے زہر دے رہا تھا کیونکہ جب وہ واپس گھر آیا تو اس کی بیماری بھی آہستہ آہستہ لوٹ آئی۔"

"بیماری میں عام طور پر ایسا ہوتا ہے، کبھی طبیعت بگڑنے لگتی ہے اور کبھی بہتر ہو جاتی ہے۔"

"ہاں لیکن میرے بھائی کے ساتھ بار بار یہ ہو رہا ہے۔ اس نے دیوتا کی جانب سے دی گئی آزمائش بھی قبول کرلی جبکہ اس میں بیمار ہونے بلکہ مرنے کا بھی امکان تھا۔ اس کے بجائے وہ بہتر نظر آنے لگا لیکن یہ کیفیت تھوڑے عرصے رہتی تھی، مثال کے طور پر ایک دفعہ دیوتا نے اشارہ دیا کہ روزینڈر کو اپنے جسم سے خون کی بڑی مقدار نکال دینی چاہیے۔ روزینڈر نے اس پر بھی عمل کیا اور یہ کام مقدس احاطے میں پادری کی معاونت سے ہوا۔"

"ایسقلی پیوس کے ماننے والوں کے لیے خون نکلوانا کوئی نئی بات نہیں ہے۔" پوسی ڈونیوس نے کہا۔ "پادریوں کو چیرا لگانے اور اسے بند کرنے میں مہارت ہوتی ہے جبکہ خون نکلوانے والا خاموشی سے ایک تختے پر پڑا رہتا ہے۔"

"خون نکلوانے کے بعد روزینڈر کچھ عرصہ ٹھیک رہا لیکن یہ شاید اس لیے ہوا کیونکہ اس کے جسم سے زہر نکل گیا، کیا تم ایسا نہیں سمجھتے؟ پھر ہمیشہ کی طرح اس کی بیماری لوٹ آئی کیونکہ زہر نے اپنا کام دکھانا شروع کر دیا تھا۔ شاید میں اس سے زیادہ وضاحت نہ کر سکوں کہ کیا ہو رہا ہے۔"

"شاید......" پوسی نے کہا۔ "تمہارے بھائی کا گھرانا کتنا بڑا ہے اور کون اس کے پاس باقاعدگی سے آتا رہتا ہے؟"

"بہت سے لوگ ہیں۔ جب اس کی بیوی زندہ تھی تو وہ ایک عالیشان مکان میں رہتے تھے جو اس مکان سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھا لیکن بیوی کے مرنے کے بعد روزینڈر نے کہا کہ وہ اس گھر میں مزید نہیں رہ سکتا۔ اس نے ساحل کے کنارے ایک عمارت میں منتقل ہونے کا فیصلہ کیا جہاں سے وہ اپنے کاروبار کی نگرانی کرتا تھا۔ اس کے گھر میں کئی ملازمین کے علاوہ بہت سے دفتری ملازمین، گودام میں کام کرنے والے مزدور اور جہازوں کا عملہ بھی ہے اور یہ سب لوگ اسی احاطے میں رہتے ہیں۔"

"گویا عام دنوں میں بھی بہت سے لوگوں کی تمہارے بھائی تک رسائی ہوتی ہے؟"

"بالکل۔"

"اور ان میں سے کوئی ایک یا زیادہ افراد تمہارے بھائی کو باقاعدگی سے اور بار بار زہر دے رہے ہیں؟"

"مجھے بھی خطرہ ہے۔"

"تمہارے باپ نے سارا کاروبار بھائی کو دے

دیا۔ تمہیں کچھ نہیں ملا؟"

"جب میری شادی ہوئی تو مجھے جہیز میں بہت کچھ ملا تھا۔ اس کے علاوہ ہمارا اپنا کاروبار ہے اور ہمارے کارخانے میں مشروب بنتا ہے۔"

"گویا تمہارے شوہر کے پاس کوئی وجہ نہیں کہ وہ اپنے برادرِ نسبتی کی بے وقت موت کی خواہش کرے۔ میں تمہارا چہرہ دیکھ کر بتا سکتا ہوں کہ تمہیں یہ بات اچھی نہیں لگی لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ فی الوقت تم ہی اپنے بھائی کی حقیقی وارث ہو اور اس کی موت سے براہِ راست فائدہ تمہیں اور تمہارے شوہر کو ہی ہوگا۔"

"نہیں۔ یہ انتہائی احمقانہ خیال ہے۔"

"شاید لیکن بعض اوقات کسی معمے کا حل ہونا سکون سے زیادہ تکلیف دہ ہوتا ہے۔ سچ بھی ایک زہریلے سانپ کی طرح ہے جو پلٹ کر تمہیں کاٹ سکتا ہے۔"

"میں سمجھ سکتی ہوں کہ تم کیا کہہ رہے ہو لیکن تم اس امکان کو اپنے ذہن تک ہی محدود رکھو۔ میرا شوہر کوئی ایسی حرکت نہیں کرے گا جس سے میرے بھائی کو نقصان پہنچے۔"

"چلو مان لیا پھر اس کے علاوہ کون ہوسکتا ہے جو اسے زہر دے رہا ہو؟ کوئی ایسا نوکر جس سے اس نے بدسلوکی کی ہو؟ کوئی دفتری ملازم، جہاز کا کپتان یا کوئی محبوبہ جس سے اس کی ناچاقی ہوگئی ہو؟"

"اس کی کوئی محبوبہ نہیں۔ شاید تم نہیں جانتے کہ میرا بھائی ابھی تک اپنی بیوی کا سوگ منا رہا ہے۔ وہ اپنے آپ کو اس کا مجرم سمجھتا ہے کیونکہ وہ اس کے بچے کی پیدائش کے دوران مری تھی۔ اس لیے وہ اپنے آپ کو اس کا الزام دیتا ہے۔"

"اوہ، میں سمجھا۔ اس کے باوجود کوئی بھی غمزدہ شخص کسی دوسری عورت کی بانہوں میں سکون تلاش کرسکتا ہے۔ گو کہ تم اپنے بھائی سے بہت قریب ہو پھر بھی تم نہیں جانتیں کہ وہ کیا کر رہا ہے۔ کیا سوچتا اور محسوس کرتا ہے۔ اگر اسے زہر دیا جارہا ہے تو کسی کے پاس اس کی بہت ہی مضبوط وجہ ہے۔"

"گویا تم سمجھتے ہو کہ زہر دینے کے بارے میں میرا اندازہ درست ہے؟"

"جو کچھ تم نے بتایا ہے، اس کی روشنی میں تمہارا خیال درست ہوسکتا ہے لیکن اس کی کوئی دوسری تشریح بھی ممکن ہے۔"

"وہ کیوں؟"

"کیونکہ جب تک سچ پوری طرح سامنے نہ آجائے، دوسری تشریح کی گنجائش ہمیشہ موجود رہتی ہے۔ جیسے اس گھر میں بھی یہ امکان ہے کہ کوئی ہماری باتیں سن رہا ہے۔"

میں دم سادھ کر بیٹھ گیا اور میں نے اپنا سانس روک لیا۔ ایک طویل وقفے کے بعد پوسی ڈونیوس نے دوبارہ کہا۔ "کیا یہ ٹھیک ہے گورڈی؟"

میں نے گلا صاف کیا اور باہر نکل کر اس کے سامنے آگیا۔ اس کی مہمان میرے تصور سے بھی زیادہ جوان اور خوب صورت تھی۔ مجھے دیکھ کر اس کی نیلی آنکھوں میں حیرت ابھر آئی۔ میں نے معذرت خواہانہ انداز اپناتے ہوئے کہا۔ "معاف کرنا پوسی، میرا خیال تھا کہ یہاں ہم دونوں کے سوا کوئی نہیں۔"

"میں بھی یہی سمجھ رہا تھا جب تک میں نے کسی کے زور سے سانس لینے کی آواز نہیں سنی تھی۔ تمہارا چہرہ کیوں سرخ ہو رہا ہے؟"

"میں معذرت خواہ ہوں پوسی۔"

"تمہیں میری مہمان سے معافی مانگنا چاہیے کیونکہ تم نے اس کے اعتماد کو مجروح کیا ہے۔"

"ہاں، بالکل۔ میں ان سے بھی معافی مانگتا ہوں۔"

"اب اس کا کوئی فائدہ نہیں۔" پوسی نے رکھائی سے کہا۔ "تم نے جو سننا تھا وہ سن لیا۔ کورینا، اس نوجوان کا نام گورڈیانس ہے لیکن سب اسے گورڈی کہتے ہیں۔ یہ رومن ہے اور سردیاں گزارنے میرے گھر میں ٹھہرا ہوا ہے اور یہ کورینا ہے جیسا کہ تم جان گئے ہوگے کہ یہ اور اس کا بھائی رہوڈز کے امیر ترین اور معزز گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس کمرے میں تم نے جو کچھ سنا، وہ کسی کے سامنے نہیں دہراؤ گے۔"

"میں سمجھتا ہوں پوسی۔ ان باتوں کو مکمل طور پر اپنے دماغ سے نکال دوں گا۔"

"تم ایسا نہیں کرو گے، ورنہ میں تمہیں کیسے استعمال کرسکوں گا۔"

"کیسا استعمال؟"

"اس مسئلے پر غور کرنے کے لیے۔ کرسی لو اور ہماری گفتگو میں شامل ہوجاؤ۔"

کورینا بولی۔ "پوسی! مجھے یقین نہیں ہے......"

"گورڈی نے ہماری باتیں ضرور سنی ہیں لیکن یہ محتاط رہ سکتا ہے۔ یہ کافی ہوشیار ہے اور رومن ہم یونانیوں سے مختلف ہوتے ہیں۔ ان کے پاس دنیا کو دیکھنے کا مختلف

طریقہ ہے۔ ہر مسئلے کے مختلف پہلو ہوتے ہیں اور کوئی بھی نتیجہ اخذ کرنے سے پہلے انہیں مختلف زاویوں سے دیکھنا چاہیے۔ گورڈی اس مسئلے کے کچھ پہلوؤں کو دیکھ سکتا ہے جنہیں میں اور تم سمجھنے میں ناکام ہیں...... کیوں گورڈی؟"

میری حالت اسکول کے اس طالب علم جیسی تھی جسے اس کے استاد نے اچانک ہی پکڑ لیا ہو۔ میں نے اپنا گلا صاف کرتے ہوئے کہا۔ "میں سوچ رہا تھا کہ تم دونوں میں سے کسی نے اس پر غور کیا......"

اسی لمحے دروازے پر دستک ہوئی اور کسی نے بہ آوازِ بلند کہا۔ "خاتون!"

"یہ سائمن ہے۔ میرا خاص ملازم۔" کورینا نے کہا۔ "ضرور کوئی اہم بات ہے، تبھی وہ یہاں آیا ہے۔"

"اندر آجاؤ۔" پوسی نے تقریباً چلاتے ہوئے کہا۔

ملازم نے دروازہ کھولا اور اندر جھانکتے ہوئے بولا۔ "مالکن، تم فوراً آجاؤ۔ ایسلی پیوس کے معبد سے ایک پیغام رساں تم سے ملنا چاہتا ہے۔ اس کے پاس تمہارے بھائی کا کوئی پیغام ہے۔"

"میرا بھائی؟" وہ پوسی سے مخاطب ہوتے ہوئے بولی۔ "وہ حال ہی میں کافی بیمار ہو گیا تھا۔ اس نے گزشتہ رات مقدس احاطے میں گزاری تا کہ خواب میں دیوتا سے کوئی اشارہ مل جائے۔ کیا خبر ہے سائمن؟"

"تھوڑی دیر پہلے تمہارا بھائی مقدس احاطے سے باہر آیا اور پیغام رساں کا کہنا ہے کہ......"

"آگے بولو، رک کیوں گئے؟"

"وہ بالکل برہنہ ہے۔ وہاں ایک مجمع اکٹھا ہو گیا ہے اور تمہارے بھائی کا کہنا ہے کہ وہ تیرنے جا رہا ہے۔"

"اس موسم میں تیرنے جا رہا ہے؟" کورینا روہانسی ہوتے ہوئے بولی۔ "مجھے فوراً اس کے پاس جانا چاہیے۔"

"ہم سب جائیں گے۔" پوسی نے کہا۔ "میرے پاس ایک بڑی گاڑی ہے جو ہم تینوں کو لے جائے گی، تمہاری گاڑی ہمارے پیچھے آجائے گی۔"

باہر کا موسم بہت سرد تھا، گو کہ گاڑی میں بھاری پردے پڑے ہوئے تھے اور ہم تینوں نے اپنی ٹانگوں کو فر کے موٹے کمبل سے ڈھانپ رکھا تھا۔ اس کے باوجود مجھ پر کپکپی طاری تھی۔ پوری سڑک پر برف کی ہلکی تہ جمی ہوئی تھی جس کی وجہ سے گاڑی کی رفتار میں فرق پڑ رہا تھا۔ بالآخر ہم پتھروں سے بنی ہوئی اس دیوار تک پہنچ گئے جس نے معبد اور مقدس احاطے کو گھیر رکھا تھا۔ میں نے پردے ہٹا کر باہر جھانکا۔ وہاں گیٹ کے باہر ایک مجمع اکٹھا ہو گیا تھا۔ سائمن جو ہم سے پہلے وہاں پہنچ گیا تھا، دوڑتا ہوا آیا اور بولا۔

"ہم وقت پر پہنچ گئے۔ وہ ابھی باہر نہیں آیا ہے۔"

ہم تینوں تیزی سے باہر نکلے۔ اچانک ہی برف پر میرا پاؤں پھسلا۔ میں گرنے ہی والا تھا کہ پوسی نے لپک کر میرا بازو پکڑ لیا۔ جب میں سیدھا کھڑا ہو گیا تو اس نے میرا بازو چھوڑ دیا اور کورینا کی طرف بڑھا۔ اس کا ایک ہاتھ پکڑ کر اپنا بازو اس کے کندھے پر رکھا تا کہ اسے مجمع میں سے لے جا سکے۔ میں بھی احتیاط سے قدم اٹھاتا ان کے پیچھے چل رہا تھا۔

ہجوم کے درمیان میں ایک برہنہ شخص کھڑا ہوا تھا، وہ طویل قامت اور مناسب جسامت کا مالک تھا لیکن بہت دبلا نظر آرہا تھا۔ اس کی جلد بھی بہت زرد ہو رہی تھی۔ چہرے کے نقوش بہن سے مل رہے تھے لیکن جھریوں اور سیاہ بالوں میں جھلکتی سفیدی کی وجہ سے وہ عمر میں زیادہ لگ رہا تھا۔ اس کے بال لمبے اور داڑھی بڑھی ہوئی تھی جس کی وجہ سے وہ تاجر کے بجائے کوئی فلاسفر یا بھکاری معلوم ہو رہا تھا۔ اس کا چہرہ تاثرات سے خالی تھا لیکن آنکھوں کی چمک بتا رہی تھی کہ وہ آنسوؤں سے لبریز ہیں۔

کورینا نے اس کی طرف دوڑ لگائی اور بولی۔ "یہ کیا ہو رہا ہے بھائی؟ تم برہنہ کیوں ہو؟"

"میں دیوتا کی ہدایات پر عمل کر رہا ہوں۔" روزینڈر نے خوابیدہ آواز میں کہا۔ "اگر چاہتی ہو تو میری تقلید کرو۔"

"تمہارے ساتھ چلوں...... کہاں؟"

"آؤ اور دیکھو۔" وہ آگے کی جانب بڑھا تو لوگوں نے اسے گزرنے کے لیے راستہ دے دیا اور سب اس کے پیچھے چل دیے۔ وہ ننگے بدن اور ننگے پاؤں تھا لیکن سرد پتھروں پر اس کی رفتار متوازن اور ہموار تھی۔ مجمع میں شامل دوسرے لوگوں کے برعکس وہ کپکپا رہا تھا اور نہ ہی دانت بھینچ رہا تھا۔ لگتا تھا جیسے اس پر سردی کا کوئی اثر نہیں ہو رہا۔

ٹھنڈی سڑک پر ایک برہنہ شخص کو چلتا دیکھ کر اور بھی تماشائی اس ہجوم میں شامل ہو گئے۔ وہ اس کے پیچھے اس طرح چل رہے تھے جیسے وہ کوئی جادوگر یا مذہبی راہنما ہے اور کوئی غیر معمولی کارنامہ دکھانے والا ہے۔ وہ سب یہ دیکھنے کے لیے بے تاب تھے کہ کیا ہونے والا ہے۔

ہم شہر سے باہر آکر شاہ بلوط کے درختوں کے ایک بڑے جھنڈ میں داخل ہو گئے۔ وہاں پر نصب بے ڈھنگے پن

سے تراشے ہوئے پتھر سے ظاہر ہورہا تھا کہ اس جگہ کو مقدس جگہ کا درجہ دے دیا گیا ہے۔ ذرا سا آگے بڑھنے پر ایک تالاب نظر آیا جو دائرے کی شکل میں تیس فٹ قطر کا تھا۔ اس کے چاروں طرف گہرا جنگل تھا۔

روزینڈر تالاب کے کنارے پر پہنچا جہاں برف کی تہ جمی ہوئی تھی۔ اس کی بہن نے اسے روکنے کی کوشش کی لیکن وہ اتنا کمزور نہیں تھا جتنا نظر آرہا تھا۔ وہ بہ آسانی اس کی گرفت سے نکلا اور پانی میں اتر گیا۔ پہلے اس کے گھٹنے پھر کمر اور چھاتی پانی میں ڈوب گئی۔ لوگ اسے دیکھ کر چلا رہے تھے لیکن وہ آگے بڑھتا رہا۔ یہاں تک کہ پانی کی تہ میں غائب ہوگیا۔

میں نے اپنی سانس روک لی اور دل کی دھڑکنیں گننے لگا۔ دسویں دھڑکن پر روزینڈر پانی سے باہر آیا۔ اس نے چاروں طرف دیکھا اور اتنے ہی اطمینان سے باہر آگیا، جس طرح تالاب میں گیا تھا۔ اس کے بے ترتیب بال اب ہموار طریقے سے کندھوں پر پھیلے ہوئے تھے۔ ڈاڑھی میں پانی کے قطرے چمک رہے تھے اور سورج کی روشنی میں اس کی سفید جلد پالش کیے ہوئے ہاتھی دانت کی طرح چمک رہی تھی۔

تالاب کے کنارے پر اس کی ملاقات ایک شخص سے ہوئی جو دیکھنے میں اس کا بھائی لگ رہا تھا۔ اسی کی طرح لمبا قد، دبلا جسم اور سیاہ ڈاڑھی لیکن اس نے پادریوں والا لبادہ پہن رکھا تھا جس پر چاندی کے تاروں سے کڑھائی کی گئی تھی۔ اس نے ایک ہاتھ میں ہاتھی دانت کی چھڑی پکڑی ہوئی تھی جس کے گرد چاندی کا سانپ لپٹا ہوا تھا۔ جس کا مطلب ہے کہ وہ ایسلی پیوس کے مقدس عملے میں شامل تھا۔ اس کے دوسرے ہاتھ میں ایک بھاری چغہ تھا جو اس نے روزینڈر کے کندھوں پر ڈال دیا جسے اس نے پوری طرح اپنے جسم پر لپیٹ لیا۔

”تم کیسا محسوس کر رہے ہو؟“ پادری نے پوچھا۔

”وہ خواب سچا تھا۔“ روزینڈر نے کہا۔ ”ایک بار پھر مجھ پر سے وہ وحشت ناک بوجھ ہٹ گیا ہے۔“

”تم نے کیا محسوس کیا؟“ مجمع میں سے کوئی شخص چلایا۔

روزینڈر نے اپنی ٹھوڑی اوپر اٹھائی۔ اب اس کی آنکھیں اپنی بہن کی طرح صاف، روشن اور نیلی نظر آرہی تھیں۔ ”میں نے ناقابلِ بیان اطمینان محسوس کیا۔ اس وقت میں تم سب لوگوں اور اردگرد کی ہر چیز کو دیکھ رہا ہوں لیکن جب میں تالاب میں تھا تو مجھے کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ دیوتا میرے ساتھ ہے۔ اس نے میری بیماری دور کردی اور مجھے دوبارہ تندرست کردیا۔“

”کیا تم ٹھیک ہو؟“ کورینا چلائی، اس نے دوڑ کر اس کا چغہ پکڑ لیا اور اسے اچھی طرح اس کے گرد لپیٹتے ہوئے بولی۔ ”کیا تم واقعی ٹھیک ہو؟ تمہاری خطرناک بیماری دور ہوگئی اور اب دوبارہ لوٹ کر نہیں آئے گی۔“

”یہ تو وقت ہی بتائے گا پیاری بہن یا جو دیوتا کی مرضی ہوگی۔“

پوسی اور میں کورینا کو چھوڑ کر اپنی گاڑی کی طرف واپس آگئے جو اپنے بھائی اور پادری کے پیچھے کھڑی ہوئی تھی۔ دورانِ سفر کچھ دیر خاموشی رہی۔ پوسی کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا پھر وہ بول ہی پڑا۔

”تم کچھ کہنے والے تھے جب کورینا کا ملازم آیا اور ہم یہاں دوڑے چلے آئے۔“

”اوہ کچھ نہیں۔ یونہی ایک بات ذہن میں آئی تھی جو میں بھول چکا ہوں۔“ حالانکہ یہ سچ نہیں تھا لیکن روزینڈر کا غیر معمولی کارنامہ دیکھنے کے بعد وہ سوچ غلط لگنے لگی اور پوسی کے سامنے اس کا اظہار کر کے میں اپنے آپ کو شرمندہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔

پوسی نے مجھے چبھنے والی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”میں اس بات کو ترجیح دوں گا کہ تم کورینا یا اس کے بھائی کے بارے میں اینٹی پیٹر، ونڈوکس یا کسی اور کو کچھ مت بتانا۔“

”میں سمجھ گیا پوسی، ایسا ہی ہوگا۔“

وقت گزرتا رہا۔ اس کے بعد میں نے کورینا کو نہیں دیکھا اور نہ ہی پوسی ڈونیوس نے کبھی اس کا تذکرہ کیا۔ وہ اور اس کا بھائی میرے خیالوں سے اوجھل ہوگئے۔ سخت موسم کے باوجود میرا بوڑھا ہم سفر اینٹی پیٹر اپنے ایک شاعر دوست سے ملنے جزیرے کے جنوب میں واقع لنڈوس کے شہر چلا گیا۔ میں سارا دن لائبریری میں بیٹھ کر وقت گزارتا یا ونڈوکس کے ساتھ کوئی انڈور گیم کھیلتا۔ اس کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ مسلسل ہارنے کے باوجود اس کے ماتھے پر کوئی شکن نمودار نہ ہوتی۔ اس پر میں نے سوچنا شروع کردیا کہ شاید وہ خود ہی مجھے جیتنے کا موقع دیتا ہے۔ جب موسم اچھا ہوتا تو ہم دونوں کشتی لڑتے اور پوسی ریفری کے فرائض انجام دیتا گو کہ ہم دونوں کا کوئی جوڑ نہیں تھا لیکن میں طویل قامت ونڈوکس کو رقص کرکے اور اس کی گرفت میں نہ آکر تھکا دیتا۔ یہ ترکیب میں نے اولمپکس میں کشتی کے

مقابلے دیکھ کر بیٹھی تھی۔

ایک صبح یوسی ڈونیوس نے مجھے لائبریری میں طلب کیا اور کہا۔

”تمہیں وہ دن یاد ہے جب کورینا یہاں آئی تھی؟“

”بالکل، میں کیسے بھول سکتا ہوں۔“

اس نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”وہ کل پھر یہاں آئی تھی۔“

”اچھا۔ مجھے معلوم نہیں۔“

”تم ونڈوکس کے ساتھ کسی کھیل میں مصروف تھے۔ ایسا لگتا ہے کہ اس کے بھائی کی بیماری کچھ عرصے کے لیے دور ہوئی تھی لیکن دوبارہ لوٹ آئی ہے۔“

”کیا اسے دوبارہ زہر دینے کا شبہ ہے؟“

”ہاں۔ چند روز قبل دیوتا نے روز بنڈر کے لیے ایک اور نسخہ تجویز کیا تھا جس کے مطابق اسے مختلف چیزوں کے اجزا سے بنے ہوئے محلول پینا تھے اور ان میں سب سے اہم بھیڑ کا دودھ تھا۔“

”موسم سرما کے وسط میں... میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ ان دنوں میں کوئی بھیڑ بچہ نہیں جنتی۔“

”حقیقت یہ ہے کہ اس جزیرے پر حال ہی میں ایک بھیڑ نے بچہ دیا ہے۔ روز بنڈر اسے تلاش کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ اس نے بھیڑ کا تازہ دودھ پینے کے لیے آدھا جزیرہ پیدل چل کر طے کیا۔ البتہ اس مرتبہ اس نے جوتے اور کپڑے پہن رکھے تھے۔“

”لیکن موسم......“

”ہاں۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، اس سے زیادہ سخت موسم سرما کبھی نہیں آیا۔ وہ اپنی بیماری اور سردی کی پروا کیے بغیر اس سفر پر گیا اور وہاں جا کر بھیڑ کا دودھ پیا اور بظاہر وہ بہت بہتر حالت میں واپس آیا۔ اس سے تم نے کیا نتیجہ اخذ کیا گورڈی؟“

”شاید اس کی بہن ٹھیک کہہ رہی ہے۔ ہر بار وہ اس مقدس سفر پر جاتا ہے اور کچھ عرصے کے لیے ٹھیک ہو جاتا ہے۔ شاید اس کی وجہ یہی ہے کہ وہ اس شخص سے دور ہو جاتا ہے جو اسے زہر دے رہا ہے۔“

”اور کوئی بات؟“

”شاید وہ صبر آزما علاج کامیاب ہو رہا ہے جو اسے وقتاً فوقتاً خواب میں دیوتا کی جانب سے بتایا جاتا ہے۔“

”اور کچھ؟“

میں نے کچھ نہیں کہا اور کندھے اچکا دیے۔ یوسی ڈونیوس اپنی ڈاڑھی کھجاتے ہوئے بولا۔ ”پہلی بار آنے کے بعد کورینا نے اپنے شبہات کے بارے میں مجھ پر کوئی زور نہیں دیا تھا لہٰذا میں نے بھی خاموشی اختیار کی البتہ تجسس کی وجہ سے اپنے طور پر تھوڑی بہت تحقیقات کرتا رہا اور اس طرح مجھے روز بنڈر کی وصیت کے بارے میں تفصیلات معلوم ہوگئیں۔“

”تم نے یہ کیسے کیا؟ وصیت عام طور پر کسی محفوظ جگہ رکھی جاتی ہے تاکہ کوئی نہ دیکھ سکے۔“

”میں نے ایک قابلِ اعتماد شخص سے معلومات کروائیں۔“

مجھے معلوم تھا کہ اس کے تعلقات بہت وسیع ہیں اور وہ اپنا کام نکلوانا جانتا ہے۔ لہٰذا میں نے پوچھا۔

”پھر کیا معلوم ہوا؟“

”روز بنڈر نے وصیت میں اپنی بہن کے لیے کچھ نہیں چھوڑا۔ نہ ہی گھر کے کسی فرد یا کاروباری دوست کا اس میں کوئی حصہ ہے۔“

”پھر اس نے اپنی جائداد کس کے نام کی ہے؟“

”تمہارے خیال میں وہ کون ہو سکتا ہے گورڈی؟“

میں نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”اسکلی پیوس کا مقامی معبد۔“

یوسی نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”تم مجھ سے کس شک کا اظہار کرنا چاہ رہے تھے جب کورینا پہلی بار یہاں آئی اور ہماری گفتگو کے دوران ہی اس کے ملازم نے مداخلت کی۔“

”میرے ذہن میں یہی بات آئی تھی کہ خون نکلوانا، ایک بیمار آدمی کو تکلیف دہ سفر کے لیے مجبور کرنا اور اسے یخ بستہ پانی میں ڈبکی لگانے کے لیے کہنا، دیوتا کی مرضی نہیں ہو سکتی۔ میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اس معبد کا پادری جس کا روز بنڈر پر کافی اثر رسوخ ہے، وہ اسے بہتر نہیں بلکہ مزید بیمار کرنے کی کوشش کر رہا ہے لیکن میرے پاس اس کا کوئی ثبوت نہیں تھا۔ اس لیے میں نے سوچا کہ اس شبہے کا اظہار کرنا گستاخی ہوگی بلکہ میں بے حرمتی کا مرتکب ٹھہرایا جاؤں گا۔“

یوسی نے تائید میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”کوئی بھی معقول شخص کسی ثبوت کے بغیر ایسی بات کہنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔“

”اب ہمیں کیا کرنا ہوگا؟“ میں نے پوچھا۔

”فی الحال کچھ نہیں، روز بنڈر شہر واپس آگیا ہے۔ بھیڑ کا دودھ پینے کے بعد وہ اپنے آپ کو بالکل ٹھیک محسوس کر رہا ہے لیکن مجھے شبہ ہے کہ جلد یا بدیر وہ دوبارہ بیمار ہو جائے گا اور

اسے دیوتا سے علاج کی طلب ہوگی۔ میں نے اس کی بہن سے کہہ دیا ہے کہ اگر ایسا ہوا تو وہ مجھے بتادے۔"

"پھر کیا ہوگا؟"

"اس کے بعد میں تمہیں کسی جرأت مندانہ کام کے لیے طلب کروں گا۔ اگر تمہارے اعصاب مضبوط ہیں۔"

"براہِ کرم اس کی وضاحت کردو۔"

اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "فی الحال اس معاملے کو اپنے دماغ سے دور رکھو اور اپنی معروفیات میں گم ہوجاؤ۔"

بالآخر سردی کی شدت میں کمی ہوئی اور موسم ٹھیک ہونے لگا۔ میں گھر میں بیٹھے بیٹھے تھک گیا تھا۔ اس لیے ونڈوکس کو ساتھ لے کر گھومنے نکل گیا۔ ہم شہر کا ایک بڑا چکر لگا کر واپس آئے تو میں نے پوسی کے گھر سے ایک گاڑی کو روانہ ہوتے دیکھا۔ میں نے کوچوان کو پہچان لیا۔ وہ سائمن تھا اور سمجھ گیا کہ یہ کورینا کی گاڑی تھی۔ گھر میں داخل ہوتے ہی مجھے پوسی نے لائبریری میں بلالیا۔

"تم کیسا محسوس کررہے ہو گورڈی؟"

"بالکل ٹھیک۔ کھلی فضا میں لمبی سیر کرنے کے بعد میری طبیعت ہشاش بشاش ہوگئی ہے۔"

"نہیں۔ میرا خیال ہے کہ تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔"

"یہ کیا کہہ رہے ہو؟" میں نے ناراض ہوتے ہوئے کہا۔

"نہیں۔ تم بالکل ٹھیک نہیں ہو۔ اپنی شکل دیکھو۔ اترا ہوا منہ اور بکھرے ہوئے بال۔" اس نے قریب آکر میرے بالوں پر ہاتھ پھیرا اور کہنے لگا۔ "شاید ہمیں تمہارے گالوں پر پاؤڈر لگانا پڑے تاکہ تمہاری رنگت تھوڑی سی زرد ہوجائے۔"

"تم کس بارے میں بات کررہے ہو پوسی؟" میں نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔

"تمہیں ایک گھنٹے کے اندر اسکلی پیوس کے معبد پہنچنا ہے۔ اس علاج کے سلسلے میں تم نے بہت کچھ سن رکھا ہے۔"

میں نے بھویں اچکاتے ہوئے کہا۔ "اس کے لیے اچھی خاصی رقم درکار ہوگی۔"

"ہاں۔ انہیں عطیہ دینے کے لیے یہ رکھ لو۔" اس نے مجھے ایک چمڑے کی چھوٹی تھیلی پکڑاتے ہوئے کہا جس میں چاندی کے سکے بھرے ہوئے تھے۔ "تم ایک نوجوان رومن ہو جو ہمارے خوب صورت جزیرے پر موسم سرما گزارنے آیا تھا لیکن یہاں آکر بیمار ہوگیا اور میزبان کے مشورے پر تم اپنے علاج کے لیے اس معبد سے رجوع کرنا چاہتے ہو۔"

"لیکن مجھے کیوں بھیج رہے ہو...... تم خود کیوں نہیں چلے جاتے؟"

"اس جزیرے میں ہر کوئی مجھے جانتا ہے۔ میں فوراً ہی پہچان لیا جاؤں گا لیکن تمہیں کوئی نہیں جانتا، شاید تمہیں کھانسی ہوگئی ہے۔"

"میں کوئی اداکار نہیں ہوں پوسی۔"

"کچھ بھی ہو، تمہیں وہاں مریض بن کر جانا ہوگا۔" اس نے قطعی لہجے میں کہا۔ "اپنے لیے مرض کا انتخاب تم خود کرسکتے ہو۔"

میں نے گلا صاف کیا۔ گہری سانس لی اور کھانسنے لگا۔

ایک گھنٹے بعد میں مقدس احاطے کے وسط میں کھڑا ہوا تھا۔ اس بار میں پادری کو اپنی جانب متوجہ کرنے کے لیے زور سے کھانسا۔ اس کا نام تھیوڈوٹس تھا۔ اس نے ایک چاندی کی پیالی میں میرے بلغم کا نمونہ لیا اور اس کا بغور معائنہ کرنے کے بعد اسے آتش دان کے شعلوں پر انڈیل دیا پھر آگے جھک کر وہاں سے اٹھنے والے دھوئیں کو دیکھنے لگا۔

"تمہارا کہنا ہے کہ یہ بیماری ایک مہینے سے ہے؟"

"ہاں۔" میں نے جھوٹ بولا۔ "ایسا لگتا ہے کہ میرے سینے پر کوئی بھاری چیز رکھی ہوئی ہے اور میں اسے باہر نہیں نکال سکتا۔ مجھے نیند نہیں آتی اور ہر وقت تھکن محسوس ہوتی ہے۔ میں کبھی اتنے طویل عرصے تک بیمار نہیں ہوا۔ اسی لیے میں یہاں دیوتا کی مدد لینے آیا ہوں۔"

"یہ تم نے اچھا کیا۔" وہ کچھ سوچتے ہوئے بولا۔ "تمہارے بلغم کو گرم کرنے سے معلوم ہورہا ہے کہ اس بیماری میں مزید شدت آئے گی۔"

"اوہ میرے خدا۔" میں نے گھبرانے کی اداکاری کرتے ہوئے کہا۔

"پریشان ہونے والی کوئی بات نہیں نوجوان۔ تم صحیح وقت پر یہاں آگئے۔" وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

"تم توقع کررہے ہو کہ خواب کے ذریعے تمہارا علاج ہوجائے؟"

"ہاں۔ میں نے سنا ہے کہ یہ بہت موثر ہے۔"

تھیوڈوٹس نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "ہاں لیکن مہنگا بھی ہے۔ تمہیں یہاں رات میں قیام کرنے کے لیے ایک معقول رقم ادا کرنا ہوگی۔ اس کے علاوہ دیوتا سے ملاقات میں مدد دینے کے لیے پادری کو بھی مناسب معاوضہ دینا ہوگا۔"

"میں سمجھ گیا۔"

"اس کے متبادل کے طور پر تم اخراجِ خون کے ذریعے بھی علاج کرواسکتے ہو۔ اس میں زیادہ دیر نہیں لگتی اور تم آج رات ہی اپنے میزبان کے گھر واپس جا کر سو سکتے ہو۔ کچھ لوگ ڈرتے ہیں کہ یہ تکلیف دہ علاج ہے لیکن زیادہ تر مریضوں کو کچھ محسوس نہیں ہوتا۔ ہم تمہیں کچھ دوائیں دیں گے جس سے تمہاری تکلیف میں کمی ہوگی اور آرام آجائے گا۔"

"نہیں۔ میں خواب کے ذریعے ہی علاج کروانا چاہتا ہوں۔"

"بہت اچھا۔"

وہ مجھے مقدس احاطے کے مختلف حصوں میں لے گیا۔ ہم نے ایک قربان گاہ پر اگربتیاں جلائیں پھر ماربل کے بنے ہوئے دیوتا کے مجسمے کے سامنے کچھ دیر عبادت کی۔ اس نے بھی ایک لبادہ اوڑھ رکھا تھا اور پادری کی طرح اس کے ہاتھ میں ایک چھڑی تھی جس کے گرد سانپ لپٹا ہوا تھا۔ ایک لمحے کے لیے مجھے یوں لگا کہ وہ زندہ سانپ ہے اور حملہ کر کے مجھے کاٹ سکتا ہے کیونکہ میں بے حرمتی کا مرتکب ہو رہا تھا۔

مجسمے سے دور جانے کے بعد میں اور پادری چند لمحات کے لیے معبد میں داخل ہوئے۔ یہاں دیوتا کا ایک اور شاندار کانسی سے بنا ہوا مجسمہ نصب تھا۔ جب پادری مجسمے کے سامنے فرش پر سجدہ ریز ہو کر ایسکلی پیوس سے التجا کر رہا تھا تو میں نے سکوں سے بھری ہوئی تھیلی ایک طاق میں رکھ دی اور باہر آگیا۔ اس کے کچھ دیر بعد پادری برآمد ہوا اور اس نے یہ خبر سنائی کہ دیوتا میرے نذرانے سے بہت خوش ہوئے۔ میں نے کسی چیز میں لپٹے ہوئے سکوں کی جھنکار سنی جو اس کے لبادے میں سے آرہی تھی۔

ہم مچھلیوں کے چھوٹے سے تالاب اور جڑی بوٹیوں کے باغ کے پاس سے گزرتے ہوئے ایک طویل عمارت تک آئے جس کی چھت کافی نیچی تھی۔ اس کے برآمدے میں بارہ کے قریب دروازے تھے جو چھوٹے چھوٹے کوٹھری نما کمروں میں کھلتے تھے۔ وہ سب کمرے ایک جیسے تھے۔ تھیوڈوٹس نے بتایا کہ ہر ایک میں سادہ بستر، کپڑے ٹانگنے کے لیے ایک کھونٹی، چھوٹی انگیٹھی اور دھوئیں کے اخراج کے لیے ایک گرل لگی ہوئی تھی۔ اس نے عمارت کے آخری سرے پر مجھے ایک کمرا دکھایا جس کے بستر پر ایک تہ کیا ہوا لینن کا سفید گاؤن پڑا ہوا تھا۔

"یہ گاؤن پہن کر بستر پر لیٹ جاؤ۔ اپنے دماغ کو خالی کرنے اور پُرسکون رہنے کی کوشش کرو۔ میں تھوڑی دیر میں واپس آتا ہوں۔"

میں نے سر ہلایا اور کھانستا ہوا بستر کی طرف بڑھ گیا۔ اس دوران پادری دروازہ بند کر کے جاچکا تھا۔ اندھیرا پھیلنا شروع ہو گیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد میں نے دروازے پر ایک آواز سنی اور دوبارہ زبردستی کھانسنا شروع کر دیا۔ کوئی ملازم انگیٹھی روشن کرنے آیا تھا۔ اس کے جانے کے فوراً بعد ہی پادری بھی آگیا۔ اس کے ہاتھ میں چاندی کا وہی پیالہ تھا جس میں اس نے میرے بلغم کا معائنہ کیا تھا۔ اب اس میں ایک گاڑھا سیاہ رنگ کا محلول تھا جس کے بارے میں اس نے بتایا کہ یہ ایک خواب آور دوا ہے۔ اس کو پینے سے مجھے بہت اچھی نیند آئے گی اور میں وہ خواب دیکھ سکوں گا جس کی خاطر یہاں آیا ہوں۔

میں نے پیالہ اس کے ہاتھ سے لے لیا اور زور زور سے کھانسنے لگا۔ "مجھے یقین نہیں کہ اسے ابھی پی سکوں گا۔" میں نے بہ مشکل سانس لیتے ہوئے کہا۔ "شاید تھوڑی دیر بعد۔"

"کوئی جلدی نہیں ہے۔" اس نے کہا۔ "بعد میں پی لینا۔ یہاں ایک اور مریض ہے۔ مجھے اس کے پاس بھی جانا ہے۔ آج کی رات مجھے دوبارہ تمہارے پاس آنے کی ضرورت نہیں۔ جب تم یہ محلول پی چکو تو بستر پر لیٹ جاؤ اور نیند آنے کا انتظار کرو۔ ہم صبح تمہارے خوابوں کے بارے میں بات کریں گے اور دیکھیں گے کہ دیوتا نے تمہارے لیے کیا پیغام دیا ہے۔"

اس نے جاتے ہوئے کمرے کا دروازہ بند کر دیا۔ میں نے وہ پیالہ فرش پر رکھا۔ پنجوں کے بل چلتا ہوا دروازے تک گیا۔ اسے آہستہ سے کھول کر باہر جھانکا۔ پادری برآمدے کے آخری سرے کی طرف جا رہا تھا۔ اس نے دروازہ کھولا۔ میں نے کان اسی جانب لگا دیے۔ اس نے روزینڈر کا نام لیا اور کمرے میں داخل ہو گیا۔ اس کا مطلب ہے کہ کورینا نے ٹھیک ہی بتایا تھا کہ اس کا بھائی ایک بار پھر دیوتا کو خواب میں دیکھنے کی خاطر معبد میں جا رہا ہے لیکن کورینا کے کہنے کے مطابق بھیڑ کا دودھ پینے کے بعد روزینڈر کی صحت بہتر ہو گئی تھی لہٰذا وہ یہاں علاج کروانے نہیں بلکہ فال نکلوانے آیا تھا۔ جہاز رانی کا موسم کسی وقت بھی شروع ہو سکتا تھا اور اپنی صحت یابی کا جشن منانے کے لیے روزینڈر نے ایک طویل سفر کا پروگرام بنایا تھا۔ وہ ہر شہر میں واقع ایسکلی پیوس کے معبد میں جاتا اور وہاں بھاری رقوم عطیے میں دیتا لیکن اس سفر پر جانے سے پہلے وہ دیوتا

سے فال نکلوانا چاہ رہا تھا۔

میں واپس کمرے میں آیا اور پیالہ اٹھا کر اسے سونگھا۔ اس کی بو عجیب سی تھی۔ ”شاید تمہیں کوئی خواب آور دوا دی جائے۔“ چلتے وقت پوسی نے مجھے خبردار کیا تھا۔ ”اس سے تمہیں کوئی نقصان نہیں ہوگا لیکن اس کو پینے کے بعد تم بے ہوش ہو جاؤ گے۔“

اس دوا سے پیچھا چھڑانے کے لیے میں بستر سے اترا اور کھڑکی کا معائنہ کرنے لگا۔ لوہے کی گرل قیفوں سے لگی ہوئی تھی۔ میں نے اس کی چٹخنی اوپر اٹھائی تو گرل کھل گئی۔ کھڑکی اتنی بڑی تھی کہ میں اپنا سر باہر نکال سکتا تھا۔ عمارت اور مقدس احاطے کی دیوار کے درمیان ایک تنگ سی گلی تھی۔ میں نے پیالے کا محلول اس گلی میں پھینک دیا پھر خالی پیالہ بستر پر رکھا اور دروازہ کھول کر باہر آیا۔ وہاں دور دور تک کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں دبے پاؤں چلتا ہوا عمارت کے عقبی حصے میں گیا اور اس طویل تنگ گلی کو عبور کرتا ہوا روزینڈر کے کمرے کی کھڑکی تک پہنچ گیا۔

میں نے پنجوں کے بل کھڑے ہو کر اندر جھانکنا چاہا لیکن کھڑکی بہت اونچائی پر تھی۔ میں نے ادھر ادھر دیکھا کہ کوئی ایسی چیز مل جائے جس پر کھڑا ہو سکوں لیکن ناکامی ہوئی۔ پھر میں نے پادری کے جوتوں کی آواز سنی۔ فوراً ہی میرے دماغ میں ایک ترکیب آئی۔ میں نے کھڑکی کا چھجا پکڑ کر اپنے آپ کو اوپر اٹھایا اور اپنی ٹھوڑی اس پر ٹکا دی۔ اب میں اندر کا منظر دیکھ سکتا تھا۔

روزینڈر ایک چھوٹے سے بستر پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ میں چاندی کا خالی پیالہ تھا۔ وہ غنودگی کے عالم میں تھا۔ اس کے سامنے ہی تھیوڈوٹس ہاتھی دانت کی بنی ہوئی چھڑی لیے ہوئے کھڑا تھا۔

”کیا تم مجھے سن سکتے ہو؟“ پادری نے کہا۔

”ہاں۔ میں تمہیں سن رہا ہوں۔“ روزینڈر نے جواب دیا۔

”آج رات تم خواب دیکھو گے۔“

”آج رات میں خواب دیکھوں گا۔“ اس نے کسی معمول کی طرح جواب دیا۔

”تم ایک سمندری سفر کا خواب دیکھو گے جس کا تم نے سیزن شروع ہونے پر پروگرام بنا رکھا ہے۔ تمہاری بہن رخصت کرنے آتی ہے جہاز روانہ ہو جاتا ہے۔ سورج نکلا ہوا ہے اور سمندر پُرسکون ہے۔ سب کچھ ٹھیک چل رہا ہے۔“

”سب کچھ ٹھیک چل رہا ہے۔“ روزینڈر نے آخری جملہ دہرایا۔

”پھر کچھ گڑبڑ شروع ہو جاتی ہے اور تمہاری تمام احتیاط کے باوجود جہاز میں نقص پیدا ہو جاتا ہے۔ تم ایک زوردار آواز سنتے ہو پھر دوسری...... اور جہاز ٹکڑے ہونا شروع ہو جاتا ہے۔“

”جہاز کے ٹکڑے ہو رہے ہیں۔“ روزینڈر نے دہرایا۔

”تم ایک ٹوٹے ہوئے تختے کا سہارا لیتے ہو لیکن وہ تمہاری گرفت سے نکل جاتا ہے۔ سمندر کا دیوتا تمہیں کہنیوں سے پکڑ کر نیچے کھینچتا ہے۔ تم سمندر کی تہ میں جا رہے ہو۔ تم سانس روکنے کی کوشش کرتے ہو لیکن زیادہ دیر ایسا نہیں کر سکتے اور پانی تمہارے پھیپھڑوں میں داخل ہو جاتا ہے......“

روزینڈر کو ایک جھٹکا لگا۔ خالی پیالہ اس کے ہاتھ سے گر گیا اور اس کے کندھے اکڑ گئے لیکن وہ اسی طرح بستر پر بیٹھا ادھ کھلی آنکھوں سے پادری کی چھڑی کے گرد لپٹے ہوئے سانپ کو دیکھتا رہا۔ ”پانی...... میرے پھیپھڑوں میں۔“ اس نے سپاٹ آواز میں کہا۔

”تم گہرائی میں ڈوب رہے ہو۔ تمہارے چاروں طرف گہری تاریکی ہے۔“

”تاریکی...... چاروں طرف۔“ روزینڈر نے دہرایا۔

”یہ وہ خواب ہے جو اسکلی پیوس نے تمہارے لیے بھیجا ہے۔ جب صبح اٹھو گے تو تمہیں تمام تفصیل یاد ہوگی۔ اب تم آنکھیں بند کرو اور سو جاؤ۔“

اس منظر نے مجھے حواس باختہ کر دیا اور کھڑکی پر میری گرفت کمزور پڑنے لگی۔ اس سے پہلے کہ میں اپنے آپ پر قابو پاتا، مجھے کھانسی ہونے لگی۔ کھڑکی کا چھجا میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور میں زمین پر گر پڑا۔ میں نے اپنا توازن برقرار رکھنے کی کوشش کی لیکن اس کے نتیجے میں سامنے والی دیوار سے ٹکرا گیا جس سے مزید آواز پیدا ہوئی۔

میں دل ہی دل میں دعا مانگنے لگا کہ پادری نے یہ آواز نہ سنی ہو۔ چند لمحے خاموشی رہی پھر اس نے کھڑکی سے جھانکتے ہوئے کہا۔ ”کون ہے؟“

میں نے تیزی سے پنجوں کے بل واپسی کا سفر شروع کیا۔ میری کوشش یہی تھی کہ کسی طرح اپنے کمرے تک پہنچ جاؤں لیکن جب گلی کے کونے پر پہنچا تو تھیوڈوٹس وہاں موجود تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ بولا۔

”تم وہاں کیا کر رہے تھے؟“

میں کوئی جواب دینے کے بجائے مڑا اور پوری رفتار سے مقدس احاطے کے داخلی دروازے کی طرف

دوڑنے لگا لیکن وہاں پہنچ کر دیکھا کہ لکڑی کا گیٹ بند ہو چکا تھا۔ میں نے دیوار پر نظر دوڑائی لیکن اوپر چڑھنے کا کوئی راستہ دکھائی نہیں دیا۔ پیچھے مڑ کر دیکھا تو پادری اپنی چھڑی لہراتا ہوا میری طرف ہی آ رہا تھا۔ میں نے دوبارہ گیٹ کی طرف دیکھا تو معلوم ہوا کہ اس کے دونوں دروازے ایک بولٹ سے بند کیے گئے تھے۔ میں نے وہ بولٹ ہٹا کر دروازہ کھولا اور پوری قوت سے بھاگنا شروع کر دیا۔

☆☆☆

میں لائبریری میں بیٹھا پوسی ڈونیوس کو پوری کہانی سنا رہا تھا۔ اپنی بات ختم کرنے کے بعد میں نے پوسی سے پوچھا۔ ”کیا یہ ممکن ہے کہ کوئی شخص کسی دوسرے کے خوابوں کو کنٹرول کر سکے؟“

”میرا خیال ہے کہ ایسا ہو سکتا ہے اگر وہ متاثرہ شخص پر سحر طاری کر دے۔“

”کیا وہ اس پر جادو کر رہا تھا...... پھر تو وہ جادوگر ہوا؟“

”بالکل ایسا ہی ہے۔ مجھے تو یہ جادو لگ رہا ہے۔ میں نے اس طرح کے بہت سے واقعات سنے ہیں جن میں تیز اور خیرہ کن روشنی کی مدد سے کسی مرد یا عورت کو مسحور کیا جا سکتا ہے اور اس کے دماغ میں ہر طرح کی شر انگیزی بھر دی جاتی ہے گو کہ میں نے کبھی اس کا عملی مظاہرہ نہیں دیکھا۔ کاش میں وہاں ہوتا لیکن میں نے تمہیں بھیج دیا تاکہ تم میری آنکھیں اور کان بن کر سب کچھ دیکھ اور سن سکو۔ مجھے یہ ساری تفصیلات فوراً لکھ لینی چاہئیں۔“

یہ کہہ کر وہ لکھنے کی میز کی طرف بڑھا گو کہ لیمپ کی روشنی ناکافی تھی لیکن اس نے اپنا کام شروع کر دیا۔

”اگر روزینڈر نے خواب میں جہاز کو ڈوبتے ہوئے دیکھ لیا تو وہ یقینی طور پر سمندری سفر کا ارادہ ملتوی کر دے گا۔“

”تھیوڈولس کی نیت بھی یہی ہے۔ وہ روزینڈر اور اس کی تمام دولت کو یہیں رکھنا چاہتا ہے تاکہ اس سے بھاری رقوم عطیے کے طور پر وصول کرتا رہے۔ وہ اس کے لیے دودھ دینے والی گائے ہے۔ اس دوران وہ اسے یکے بعد دیگرے خطرناک مہمات پر بھیجتا رہے گا جب تک ان میں سے کسی آزمائش کے دوران اس کی موت واقع نہ ہو جائے۔ کیا تم نے کبھی ایسی شیطانی اسکیم کے بارے میں سنا ہے؟“

میں نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”یقیناً اس سفلی علم کے بارے میں قوانین موجود ہوں گے؟“

”بالکل ہیں لیکن اس کا ثبوت کوئی نہیں ہے۔ تمہاری شہادت اس لیے قابلِ قبول نہیں ہوگی کہ تم ایک غیر ملکی ہو جو غلط بیانی کر کے وہاں داخل ہوا پھر فرار ہو گیا۔“

”لیکن ہمیں روزینڈر کو ضرور بتا دینا چاہیے۔“

”کسی عقیدت مند اور اس کے دیوتا کے درمیان حائل ہونا ٹھیک نہیں۔ مجھے شبہ ہے کہ وہ ہماری بات پر یقین نہیں کرے گا۔“

”ہم اس کی بہن کو تو بتا سکتے ہیں۔“

”ہاں لیکن شاید وہ بھی اپنے بھائی کو قائل نہ کر سکے کہ اس کے ساتھ دھوکا کیا جا رہا ہے۔ ہمیں صبر سے کام لینا چاہیے۔ دیکھتے ہیں کہ آگے کیا ہوتا ہے اب جبکہ ہمیں تھیوڈولس کی حقیقت کا علم ہو چکا ہے، ہمیں روزینڈر کی مدد کرنا چاہیے تاکہ وہ مزید نقصان سے بچ سکے۔ یہی ہماری ترجیح ہے۔“

”کیا یہ خواب دیکھنے کے بعد بھی وہ جہاز کے ذریعے سفر کرنے کی ہمت کر سکے گا؟“

”اس کا انحصار اس بات پر ہے کہ وہ سفر کرنے کا کتنا خواہش مند ہے اور ڈوبنے سے کتنا ڈرتا ہے۔“

”میرے ذہن میں ایک خیال آیا ہے۔“

”وہ کیا؟“

”اگر جہاز رانی کا موسم شروع ہونے سے پہلے روزینڈر کا خواب پورا ہو جائے؟“

”میں سمجھا نہیں کہ تم کیا کہہ رہے ہو؟“

”اگر ہم اس کا خواب پورا کر دیں، اگر روزینڈر لمبے سفر پر روانہ ہونے سے پہلے اس پیش گوئی کو پورا کر دے۔“

میں ڈر رہا تھا کہ پوسی اس خیال کو مسترد کر دے گا لیکن اس کے بجائے اس نے ایک گہری سانس لی اور سرگوشی میں کہا۔ ”شاندار!“ پھر اپنی ڈاڑھی کھجاتے ہوئے بولا۔ ”لیکن اس کیس میں پیش گوئی کس طرح پوری ہوگی اور ہم روزینڈر کو یہ کام کرنے کے لیے کس طرح قائل کر سکیں گے؟“

”اس کی بہن اسے یہ تجویز دے سکتی ہے۔ وہ اس کے دماغ میں یہ بات اس طرح بٹھائے جیسے روزینڈر نے خود اس طرح سوچا ہو۔“

”تم بہت ہوشیار ہو۔“ پوسی بولا۔ ”لیکن اس پر عمل کس طرح ہوگا؟“

”روزینڈر کے پاس جہاز بنانے کا سارا سامان اور اسے بنانے والے لوگ ہیں۔ کیا وہ اس کے لیے ایک چھوٹی کشتی نہیں بنا سکتے؟“

چند روز بعد کورینا نے پیغام رساں کے ذریعے

اطلاع دی کہ روز بنڈر کی کشتی تیار ہو گئی ہے اور وہ سمندر کی سیر کے لیے روانہ ہونے والا ہے۔ سورج ابھی طلوع نہیں ہوا تھا کہ میرے میزبان نے مجھے جگا دیا۔ ونڈوکس میرے کمرے میں ہی سوتا تھا۔ اس کی آنکھ بھی کھل گئی اور وہ میرے ساتھ چلنے پر اصرار کرنے لگا۔ میں نے اب تک اسے روز بنڈر یا کورینا کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔ راستے میں وہ بار بار مجھ سے پوچھتا رہا لیکن میں نے اسے ایک ہی جواب دیا کہ تھوڑی دیر بعد وہ خود اپنی آنکھوں سے سب کچھ دیکھ لے گا۔

ہم بندرگاہ پہنچے تو وہاں ایک چھوٹے سے مجمع کے درمیان روز بنڈر گاؤن پہنے کھڑا ہوا تھا۔ اس کے برابر کورینا اور پادری بھی موجود تھے۔ ایک کونے میں چھوٹی سی کشتی بندھی ہوئی کھڑی تھی جس میں بمشکل دو افراد سوار ہو سکتے تھے۔ ہم تینوں بھی اس مجمع میں شامل ہو گئے۔ کورینا نے بھائی کو گلے لگایا اور اسے آنسوؤں کے ساتھ رخصت کرنے لگی جیسے وہ واقعی کسی لمبے سفر پر جا رہا ہے۔ روز بنڈر نے اسے تسلی دی اور کشتی پر سوار ہو گیا۔ یہ منظر دیکھ کر پادری نے اپنی چھڑی مضبوطی سے پکڑ لی اور اس کے جبڑے سختی سے بھنچ گئے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اس کی ساری مشق ضائع چلی گئی اور اس خواب سے خوفزدہ ہو کر روز بنڈر نے سمندری سفر کا ارادہ ملتوی نہیں کیا۔

میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب میں نے اسے روز بنڈر کی تقلید میں کشتی پر سوار ہوتے دیکھا۔ روز بنڈر مستول کے پاس سے گزر کر کشتی کے اگلے حصے کی جانب بڑھا اور تھیوڈوٹس بہت آہستہ لیکن عجیب طریقے سے پچھلے حصے میں بیٹھ گیا۔ ان دونوں کے وزن سے کشتی نیچے بیٹھنے لگی۔

میرے برابر میں کھڑے ہوئے ونڈوکس نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ ”یوں لگتا ہے جیسے یہ دونوں بچوں کی طرح کھلونے پر قبضہ کرنا چاہ رہے ہیں۔“

”میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ یہ بچوں کا کھیل نہیں بلکہ سنجیدہ معاملہ ہے۔“ یوسی ڈونیوس نے کہا۔

جب وہ دونوں کشتی میں ٹھیک طرح سے بیٹھ گئے تو روز بنڈر کا ایک آدمی آگے بڑھا اور اس نے کشتی کو کھول کر سمندر میں دھکیل دیا اور وہ لہروں کے سہارے آگے بڑھنے لگی۔

”یہ دونوں کیا کر رہے ہیں؟“ ونڈوکس نے پوچھا۔

میں نے اس کا بازو پکڑا اور ایک جانب لے جاتے ہوئے کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ تمہیں پوری بات بتا دینی چاہیے۔ روز بنڈر کو دیوتا نے خواب میں بتایا تھا کہ اس کا جہاز دوران سفر سمندر میں تباہ ہو جائے گا۔ چنانچہ اس پیش گوئی کو پورا کرنے کے لیے اس نے یہ چھوٹی کشتی بنوائی۔ اب وہ اس کے مستول میں لگی ہوئی پن نکال دے گا اور کشتی کئی ٹکڑوں میں تقسیم ہو جائے گی۔“

”اور پھر کیا ہوگا؟“

”وہ تباہ شدہ حصے کو پکڑ کر چپو چلاتے ہوئے ساحل تک پہنچ جائیں گے اور اس طرح پیش گوئی پوری ہو جائے گی۔“

ونڈوکس نے اپنی بھویں اوپر اٹھائیں اور بولا۔ ”یونانی احمق ہیں لیکن پادری کو تو عقل ہونی چاہیے۔ وہ کیوں اس کے ساتھ جا رہا ہے؟“

میں نے غصے سے کہا۔ ”یہ پروگرام میں شامل نہیں تھا۔“

میں جانتا تھا کہ تھیوڈوٹس نے اس پروگرام پر اعتراض کیا ہوگا لیکن جب اس نے دیکھا کہ روز بنڈر اپنی بات پر قائم ہے تو اس نے بھی ساتھ جانے پر اصرار کیا۔ جب دیوتا نے خواب میں جہاز کے تباہ ہونے کی پیش گوئی کی تھی تو وہ کیوں نہ اس کے پورا ہونے میں حصہ لے۔ مجھے یقین تھا کہ اس خدمت کے عوض وہ روز بنڈر سے بھاری عطیہ وصول کرلے گا۔

وہ چھوٹی کشتی سبک رفتاری سے سمندر میں آگے بڑھ رہی تھی پھر گہری دھند نے اسے اپنی لپیٹ میں لے لیا اور وہ تقریباً نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ میں یہ دیکھنے سے قاصر تھا کہ کشتی پر کیا ہو رہا ہے پھر اچانک ہی ایک زوردار چھپاکے کی آواز آئی پھر مزید چھپاکے ہوئے۔ لگتا تھا کہ پانی میں ہلچل مچی ہوئی ہے جو ہمیں نظر نہیں آ رہی پھر سورج کی روشنی نے دھند کو ہٹا دیا اور ہمیں وہ دونوں پانی پر تیرنے کی جدوجہد کرتے نظر آئے۔

”کیا یہ بھی خواب کا حصہ ہے؟“ ونڈوکس نے پوچھا۔

”نہیں، یہ ٹھیک نہیں ہے۔“ میں نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”وہ دونوں ضرور کسی مشکل میں ہیں۔ کورینا کا کہنا ہے کہ روز بنڈر بہت اچھا تیراک ہے لیکن......“

ونڈوکس نے ساحل کے ساتھ دوڑنا شروع کیا اور پانی میں چھلانگ لگا دی۔ کافی دیر تک وہ زیر آب رہا پھر پانی کی سطح پر تیرنے لگا۔ کئی چھپاکے ہوئے اور پھر میں نے اسے واپس آتے دیکھا۔ وہ اکیلا نہیں تھا بلکہ اس کے کندھے پر ایک اور شخص کا بازو تھا جسے وہ کھینچتا ہوا ساحل کی طرف لا رہا تھا۔ جب وہ دونوں قریب آئے تو کورینا کے حلق سے بے اختیار ایک چیخ نکلی۔ لوگ اکٹھا ہونا شروع ہو گئے۔ میں ان کے عقب میں پنجوں کے بل کھڑا دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

البتہ پوپی کا قد لمبا تھا۔ وہ مجمع میں جھانکنے میں کامیاب ہو گیا۔

"اس نے روزینڈر اور پادری میں سے کس کو بچایا؟" میں نے پوچھا۔

"یہ بتانا مشکل ہے۔ دونوں کے ہی سیاہ بال اور داڑھی ہے لیکن یہ یقیناً روزینڈر ہوگا کیونکہ کورینا نے ابھی ابھی اس کے گلے میں بازو ڈالے ہیں اور اس کے چہرے سے خوشی ٹپک رہی ہے۔"

چند روز بعد ہی جہاز رانی کا موسم شروع ہو گیا۔ اینٹی پیٹر لنڈوس سے واپس آ گیا تھا اور ہم رہوڈز سے جانے کی تیاری کر رہے تھے تاکہ عجائباتِ عالم دیکھنے کے لیے اپنا سفر دوبارہ شروع کر سکیں۔ اسے اس بات کا قلق تھا کہ اس موقع پر وہ یہاں موجود نہیں تھا۔ اس نے ہم تینوں سے کہا کہ اسے یہ کہانی پوری تفصیل سے سنائی جائے چنانچہ ہم پوپی ڈونیوس کے خوب صورت باغ میں بیٹھ گئے اور مشروب کا دور شروع ہو گیا۔ اینٹی پیٹر اس کہانی کے انجام سے بہت متاثر ہوا۔

"یعنی پادری نے دراصل روزینڈر کو قتل کرنے کی کوشش کی تھی؟"

پوپی نے سنجیدگی سے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "جب کشتی سمندر میں کافی دور چلی گئی تو روزینڈر نے اسے تباہ کرنے کے لیے پن نکالنے کا فیصلہ کیا۔ وہ پلٹ کر مستول کو پکڑنے ہی والا تھا کہ اچانک تھیوڈوٹس نے اس کے سر پر چھڑی سے حملہ کر دیا۔ ہم جانتے ہیں کہ یہ پہلے سے سوچا ہوا تھا کیونکہ اس کے بعد کیا ہوا۔ روزینڈر بدحواس ہو گیا اور کشتی ڈگمگانے لگی۔ تھیوڈوٹس نے اپنے لبادے میں سے ایک لمبی زنجیر نکالی اور اسے ایک ہک میں لٹکا دیا جو بہت پہلے شاید اسی مقصد کے لیے روزینڈر کے لبادے میں لگایا گیا تھا۔ روزینڈر نے اپنے آپ کو بچانے کی کوشش کی اور اس جدوجہد کے نتیجے میں کندھوں سے پھسل کر نیچے آ گیا جبکہ وہ زنجیر کسی نہ کسی طرح پادری کے گرد لپٹ گئی۔ اس نے ٹھوکر مار کر زنجیر سے نجات حاصل کرنا چاہی لیکن توازن برقرار نہ رکھ سکا اور سمندر میں گر گیا۔ آخری بار روزینڈر نے اسے اس حالت میں دیکھا کہ وہ ایک ہاتھ سے چھڑی پکڑنے کی کوشش کر رہا تھا جو پانی کی سطح پر تیرتی ہوئی اس سے دور نکل گئی تھی اور بالآخر پانی کی تہ میں چلی گئی۔"

"پادری کی لاش ابھی تک ساحل پر نہیں آئی۔" میں نے کہا۔ "ایسا لگتا ہے کہ وزنی زنجیر کی وجہ سے وہ بھی سمندر کی تہ میں چلی گئی۔"

"چاندی کے سکوں کی ہوس بالآخر پادری کو موت کے منہ میں لے گئی۔" پوپی ڈونیوس نے کہا۔ "روزینڈر کو بھی اپنے ڈوبنے کا یقین ہو گیا تھا اگر ونڈوکس پھرتی نہ دکھاتا تو وہ بھی سمندر کی تہ میں گم ہو جاتا۔ اس کی قسمت اچھی تھی کہ یہ وہاں موجود تھا۔"

ونڈوکس مسکرا دیا۔ اسے بہت اچھا لگتا تھا جب کوئی دوسرا اس کی تعریف کرے۔

"میں تو اسے بھی قسمت کی خوبی کہوں گا کہ گورڈی کے دماغ میں اس چھوٹی کشتی کا خیال آیا۔" اینٹی پیٹر نے کہا۔

"اس طرح روزینڈر نے دیوتا کی پیشن گوئی بھی پوری کر دی اور لوگوں کو اس خبیث پادری سے بھی نجات مل گئی۔"

"لیکن وہ پیشن گوئی ایک فراڈ تھی۔" میں نے کہا۔

"یہ بات پادری نے اس کے دماغ میں ڈالی تھی۔"

"لیکن وہ درست ثابت ہوئی۔ روزینڈر کے لیے نہیں بلکہ تھیوڈوٹس کے لیے۔"

"پادری کا فریب دیکھنے کے بعد بھی روزینڈر کے دیوتا پر اعتقاد میں کوئی کمی نہیں آئی۔" پوپی ڈونیوس نے کہا۔ "کورینا اور میں نے اسے ایک ایک بات تفصیل سے بتا دی ہے لیکن وہ اب بھی اس کا سچا پیروکار ہے۔ وہ آج اپنے سمندری سفر پر روانہ ہو رہا ہے اور جہاں جہاں بھی اسے ایسلی پیوس کے معبد نظر آئے، وہ ان میں اپنی تمام دولت تقسیم کر دے گا۔ اس کے علاوہ اس نے ونڈوکس کو بھی ایک معقول انعام دینے کا وعدہ کیا ہے۔"

ونڈوکس کے چہرے پر مسکراہٹ دوڑ گئی لیکن اینٹی پیٹر نے ناک بھوں چڑھاتے ہوئے کہا۔ "میں سوچ رہا تھا کہ وہ تمہیں اور گورڈی کو بھی کچھ دے گا۔"

"درحقیقت وہ ایسا کر چکا ہے۔ اس نے میرے اسکول کے لیے ایک خطیر رقم عطیے میں دی ہے۔ اس نے تمہارے اور گورڈی کے لیے اپنے سب سے زیادہ پُرآسائش جہاز میں سفر کا انتظام کیا ہے جہاں تم جانا چاہو۔" پوپی نے مشروب کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔ "اب تمہارا کہاں جانے کا ارادہ ہے؟"

"میرا خیال ہے بابل کے باغات ہماری اگلی منزل ہوں گے۔"

"بشرطیکہ قتل، خوں ریزی یا کوئی اور پریشانی سامنے نہ آجائے۔" میں نے کہا۔

بوڑھے شاعر نے مجھے گھورا جیسے کہہ رہا ہو، اس کا امکان تو ہمیشہ رہتا ہے۔

■▼■

اسماء قادری

قسط:15

جہاں پر انسان کی بے بسی کی انتہا ہو... وہیں سے ربِّ جلیل کی رحمتوں کی ابتدا ہوتی ہے۔ یہ بات کبھی اس نے بچپن میں سنی تھی مگر حادثات و واقعات اور طبقاتی کشمکش میں گھری مختصر سی فانی زندگی کے پیچ وخم میں الجھ کر اسے کچھ یاد نہ رہا... اسے نہیں معلوم تھا کہ یکسانیت سے بےزار اور تنوع کے متلاشی لوگ معزز اور بلند مقام کے حصول کی خاطر خود کو کتنی پستی میں گرا لیتے ہیں۔ وہ ذہین وفطین نوجوان بھی آنکھوں میں خوش امیدی کے خواب لیے راہ میں پلکیں بچھائے اس کا منتظر رہتا تھا لیکن ناکام آرزوئوں اور ناآسودہ تمنائوں کے انجام نے اس کے مندمل زخموں کو لہو لہو کردیا... راکھ میں دبی چنگاری نے اس کے تمام ارادوں کو خاکستر کر ڈالا۔ دل کی بے ترتیب دھڑکنوں کے ساز کے درمیان جو خوش امیدی کبھی اس کی زندگی کا حصہ تھی اب، نہ تو وہ خوش دکھائی دیتا تھا اور نہ ہی کسی کی آنکھ میں اس کے لیے کوئی امید باقی تھی۔ جانے یہ زندگی کا کونسا موڑ تھا... وہ تو شیش محل کے ہر منظر میں محبوب کی مسکراتی آنکھوں کے جلتے دیپ میں اپنے عکس کو دیکھنے کا عادی تھا... کھلتے گلابوں اور محبتوں کی برستی پھوار میں خود کو بھیگا محسوس کرتا تھا کہ اچانک اس شیش محل میں ہر جانب لپکتے شعلوں کی جھلک دکھائی دی تو احساس ہوا کہ وہ لوگوں کے ہجوم میں کس قدر تنہا ہے... جسے وہ اپنا ہمسفر اور رفیق سمجھتا رہا اس سے بڑا رقیب کوئی نہ نکلا۔

اسرار و تحیر کے پردوں میں [illegible] داستان

گذشتہ اقساط کا خلاصہ

یہ قیامِ پاکستان سے قبل کا زمانہ ہے۔ جولیٹ ایک مقامی عیسائی لڑکی ہے جس کے والدین نے متوسط طبقے سے تعلق رکھنے کے باوجود اسے اعلیٰ تعلیم دلائی ہے اور وہ ایک اخبار کے دفتر میں ملازمت کر رہی ہے۔ اس کا محبوب اور کلاس فیلو عارف بھی اس کا کولیگ ہے۔ مذاہب کے فرق کے باوجود وہ ایک دوسرے سے شادی کے خواہش مند ہیں لیکن عارف پہلے اپنی بہنوں کے فرض سے فارغ ہونا چاہتا ہے۔ زمانہ طالب علمی میں ان کی ایک ساتھی شنا بھی رہی ہے جو عارف کو پسند کرتی ہے لیکن عارف کے جولیٹ کی طرف جھکاؤ اور طبقاتی فرق کی وجہ سے کھل کر اظہار نہیں کرتی اور ایک جاگیردار و سیاست داں ولدار آغا سے شادی کر لیتی ہے۔ ولدار آغا کانگریس سے تعلق رکھتا ہے۔ جولیٹ اپنے اخبار کی طرف سے ولدار آغا کا انٹرویو لینے جاتی ہے۔ ولدار آغا اچھے کردار کا مالک نہیں ہوتا۔ اس کے انٹرویو کے بعد جولیٹ مشکل میں پڑ جاتی ہے۔ آغا کی طرف سے پیغامات اور تحائف کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے اور ان حربوں میں ناکامی کے بعد بالآخر جولیٹ کو اغوا کر لیا جاتا ہے۔ حالت بے ہوشی میں اسے زیادتی کا نشانہ بنانے کے بعد اس بات پر مجبور کیا جاتا ہے کہ وہ آغا سے نکاح پر راضی ہو جائے۔ جولیٹ کے انکار کو خاطر میں لائے بغیر نکاح کے انتظامات جاری ہوتے ہیں کہ شنا اس کی مدد کے لیے پہنچ جاتی ہے اور اسے فرار کروا دیتی ہے۔ لٹی پٹی جولیٹ گھر پہنچتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کے لٹنے کی داستان اس سے پہلے گھر پہنچ چکی ہے اور اس کی ماں جوزفین حرکت قلب بند ہونے سے مر گئی ہے۔ باپ جوزف بھی بیٹی اور بیوی کے دکھ میں بستر سے لگ جاتا ہے۔ ان مشکل حالات میں جولیٹ عارف سے جذباتی اور اخلاقی سہارے کی خواہش مند ہوتی ہے لیکن عارف ایک روایتی مرد کی طرح داغ دار لڑکی کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ ان حالات میں جولیٹ اپنے مجرم سے انتقام لینے کا فیصلہ کرتی ہے اور اس سلسلے میں محلے کے ایک بدمعاش فاروق کی مدد لینے کا فیصلہ کرتی ہے۔ فاروق ربن دادا کے اڈے سے وابستہ ہے اور جولیٹ کے لیے پسندیدگی کے جذبات رکھتا ہے۔ جولیٹ اس کے جذبات سے واقف ہے لیکن ظاہر ہے ایک غنڈے کی محبت کو قبول نہیں کر سکتی۔ وہ اس کے ایک ساتھی سے ایک مہلک چاقو حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ اس چاقو کی مدد سے وہ ولدار آغا کو قتل کرنے کی خواہش مند ہوتی ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے وہ ان جلسے جلوس میں پابندی سے شرکت کرتی ہے جن میں آغا کی موجودگی کا امکان پایا جاتا ہے لیکن اسے تمام تر کوشش کے باوجود اپنے مقصد میں کامیابی حاصل نہیں ہو پاتی۔ کشمکش کے اس عرصے میں اس کے باپ جوزف کی حالت مزید خراب ہو جاتی ہے اور مرنے سے قبل وہ جولیٹ کو بتاتا ہے کہ اس کی ماں جوزفین نے اس کے لیے ایک صندوقچی میں کچھ چیزیں رکھ چھوڑی ہیں۔ جولیٹ صندوقچی کھولتی ہے تو اس میں سے ایک ڈائری، ہیرے جڑا ایک لاکٹ اور دھندلائی ہوئی ایک بلیک اینڈ وائٹ تصویر برآمد ہوتی ہے۔ تصویر جوزفین اور ایک اجنبی مرد کی جوانی کی ہے۔ جوزفین کی ڈائری پڑھنے کے بعد اسے علم ہوتا ہے کہ اس کی ماں ماضی میں ایک نواب خاندان کی گورنس کے طور پر ملازمت کرتی تھی۔ دوران ملازمت جوزفین اور نواب زادہ اسد اللہ کو ایک دوسرے سے محبت ہو جاتی ہے۔ ادھر فاروق سر میں چوٹ لگنے کے باعث اسپتال میں ایڈمٹ ہو جاتا ہے۔ وہاں ایک نرس کے ساتھ بدسلوکی کرنے پر فاروق ایک شخص کی مرمت کرتا ہے اور وہیں ان کی ملاقات سیٹھ بھابیہ سے ہو جاتی ہے۔ سیٹھ ربن دادا کی خدمات حاصل کر لیتا ہے۔ ڈاکٹر کے مشورے کے مطابق فاروق کو آب و ہوا کی تبدیلی کے لیے کشمیر بھیج دیا جاتا ہے اور وہ وہاں سیٹھ بھابیہ کی رہائش گاہ پر بطور مہمان قیام کرتے ہیں۔ وہیں اس کی ملاقات بھابیہ کی بیٹی ہملا سے ہوتی ہے جو بیوہ ہو گئی۔ ہملا اور فاروق میں دوستانہ تعلقات قائم ہو جاتے ہیں۔ ادھر طوائف زادی چاند بانو جو فاروق سے محبت کرتی ہے اور فاروق کے دل میں چاند بانو کی محبت نہیں مگر وہ چاند بانو کا دل سے احترام کرتا تھا، ہملا چاند بانو سے رقابت کے جذبات محسوس کرتی ہے۔ ربن دادا محلے کی ایک بیوہ ثریا بانو کی شادی کے انتظامات کرتا ہے۔ بجو دادا اپنی ناکامی کا بدلہ لینے کے لیے اپنے دو غنڈوں کے ذریعے ربن کے ایک آدمی کو قتل کرا دیتا ہے۔ ربن کو اب بجو کی تلاش ہوتی ہے۔ ربن جولیٹ سے ملاقات کے دوران کچھ سوالات کرتا ہے جس سے اسے جولیٹ کی زندگی تباہ کرنے والے کے بارے میں چھان بین کا موقع مل جاتا ہے۔ ہملا ایک غنڈے کے ذریعے چاند بانو کا ایکسیڈنٹ کرا دیتی ہے جس میں زمرد بائی جان سے جاتی ہے۔ فاروق ہملا سے حساب لینے کا سوچتا ہے۔ ادھر ربن فاروق کا حساب چکتا کرنے کے لیے ولیم کو اٹھا لیتا ہے اور اسے شدید تشدد کا نشانہ بناتا ہے۔ خفیہ اطلاع پر پولیس ربن کے پیچھے پڑ جاتی ہے۔ تاہم ربن اڈے سے نکل کر پنجاب روانہ ہو جاتا ہے۔ فاروق بمبئی لوٹ آتا ہے لیکن یہاں آتے ہی اسے پتا چلتا ہے کہ ربن پر ولیم نامی گورے افسر پر بدترین تشدد کا الزام ہے۔ ادھر ربن جولیٹ کا بدلہ لینے کے لیے پنجاب میں ولدار آغا کی رہائش گاہ پہنچتا ہے لیکن ولدار آغا ملک سے باہر تھا اس لیے ربن کو واپس آنا پڑتا ہے۔ ربن اور فاروق ولیم والے معاملے کو نمٹانے کے لیے وکیل اشوک بگن کی خدمات لیتے ہیں اور فاروق کو اسی سلسلے میں کلکتہ جانا پڑتا ہے۔ ادھر جولیٹ اپنی ماں کی ڈائری پڑھ لیتی ہے اور وہ اپنے دل میں انتقام کی آگ لیے خاموشی سے حیدرآباد جانے کے لیے نکل کھڑی ہوتی ہے۔ وہاں پہنچ کر وہ نواب سلیم اللہ کی حویلی پہنچ کر... ملازمت حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ اسد اللہ جولیٹ کو دیکھ کر شک و شبے میں پڑ جاتے ہیں کیونکہ اس میں جوزفین کی جھلک پائی جاتی ہے۔ فاروق جولیٹ کی غیر موجودگی سے پریشان ہو کر اس کی تلاش میں اسٹیشن پر معلومات حاصل کرتا ہے۔ وہیں وہ چاند بانو کے ایکسیڈنٹ کے ذمے دار گنیش کو دیکھ لیتا ہے۔ وہ گنیش کو بیت الخلا میں لے جاتا ہے۔ گنیش اس کے چنگل سے نکلنے کی کوشش میں اپنا گلا کٹوا بیٹھتا ہے اور جان سے جاتا ہے اسی دوران بیت الخلا کے دروازے پر دستک اسے چونکا دیتی ہے۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

بیت الخلا کے دروازے پر ہونے والی دستک زوردار تھی۔ ساتھ ہی کسی نے بلند آواز میں پکار بھی لگائی تھی۔ ظاہر ہے یہ عوامی جگہ تھی اور کئی بیت الخلا ہونے کے باوجود ان کی تعداد کم ہی پڑتی تھی اس لیے کسی ایک کو بہت دیر تک مصروف رکھنے کی گنجائش کم ہی نکلتی تھی۔ اب بھی لگتا تھا کہ باہر منتظر کسی شخص کا پیمانہ صبر لبریز ہوگیا تھا لیکن فاروق کے لیے صورتِ حال بڑی مخدوش ہوگئی تھی۔ وہ گنیش کی خون اگلتی لاش کے ساتھ اندر بند تھا اور لازم تھا کہ جیسے ہی دروازہ کھول کر باہر نکلتا، باہر منتظر شخص کو اندر کی صورتِ حال کا علم ہوجاتا اور نتیجہ اس کی گرفتاری کی صورت میں نکلتا لیکن وہ فی الحال پابندِ سلاسل ہونے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ اسے بہت سے کام نمٹانے تھے جن میں سرفہرست جولیٹ کی تلاش، اس کے مجرموں کو کیفرِ کردار تک پہنچانا اور بملا سے چاند بانو کا حساب لینے کے کام تھے۔ ان سب کاموں کے لیے اس کا آزاد رہنا ضروری تھا۔ اس نے فیصلہ کرلیا کہ کچھ بھی ہوجائے، وہ کسی صورت پولیس کی گرفت میں نہیں آئے گا۔ اس فیصلے کو کرنے کے بعد اس نے خود کو سنبھالا اور تیزی سے دروازہ کھول کر باہر نکلا۔ باہر نکلتے ہوئے اس نے پھرتی کا مظاہرہ کیا اور اپنی پشت پر دروازے کو بند کرڈالا۔ اس نے یہ عمل اتنے قلیل وقت میں کیا تھا کہ باہر انتظار میں کھڑے شخص کو ٹھیک سے اندر کا منظر دیکھنے کا موقع ملنے کا کوئی امکان نہیں تھا البتہ وہ شخص اس کی اس حرکت پر بہ آوازِ بلند بڑبڑایا ضرور لیکن فاروق کے پاس رک کر اس کی بڑبڑاہٹ سننے کی فرصت ہی کہاں تھی۔

وہ رخ موڑ کر تیز تیز قدموں سے وہاں سے نکلتا چلا گیا۔ ابھی کچھ دور ہی گیا تھا کہ پیچھے سے چیخ و پکار سنائی دی۔ وہ سمجھ گیا کہ گنیش کی لاش دیکھ لی گئی ہے اور دیکھنے والا شور مچا کر اوروں کو متوجہ کررہا ہے۔ کچھ دیر نہیں گزرتی کہ لوگ اس کے پیچھے دوڑ پڑتے۔ ایسا ہونے سے قبل ہی اس نے خود دوڑ لگادی۔ اس پل وہ اپنے ساتھ آئے منو اور اکبر کو بھی فراموش کرچکا تھا۔ لوگوں کے درمیان سے راستہ بناتا وہ بہت تیزی سے اسٹیشن کے خارجی راستے کی طرف بھاگتا چلا جارہا تھا۔ اسے اپنے پیچھے بھاگو، پکڑو کی آوازیں مسلسل سنائی دے رہی تھیں۔ جو لوگ صورتِ حال سے واقف نہیں تھے، وہ بھی اسے بھاگتے دیکھ کر اس کی طرف متوجہ ہونے لگے تھے۔ اسے احساس ہوا کہ اس طرح بھاگنا بھی اس کے حق میں نقصان دہ ثابت ہورہا ہے لیکن اس کے پاس کوئی اور چارہ بھی نہیں تھا۔ اس پریشانی کے عالم میں اس نے محسوس کیا کہ اس کے پیچھے شور میں مزید اضافہ ہوگیا ہے لیکن اب یہ شور مچاتا ہجوم اس کی طرف نہیں لپک رہا تھا۔ نہ ہی بھاگو پکڑو کی صدائیں سنائی دے رہی تھیں، بس یوں لگتا تھا کہ کچھ لوگ آپس میں متصادم ہوگئے ہوں۔ وہ اصل معاملہ جاننے کے لیے کہاں ٹھہرتا بس اس صورتِ حال کو اپنے لیے غنیمت جان کر بھاگتے قدموں کی رفتار ذرا کم کی اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا یوں چلنے لگا جیسے عجلت میں جتلا کوئی شخص چلتا ہے۔ اسٹیشن پر بہت سے لوگ عجلت کی کیفیت میں دکھائی دیتے ہیں چنانچہ اس کا یوں چلنا کسی کو اپنی طرف متوجہ نہیں کرسکتا تھا۔ اچھی بات یہ تھی کہ اس کے لباس پر گنیش کے خون کے چھینٹے بہت کم آئے تھے اور زیادہ نمایاں بھی نہیں تھے اس لیے حلیے سے وہ مشکوک نظر نہیں آرہا تھا۔ چہرے پر آنے والے خون کے چھینٹوں کو وہ بیت الخلا سے نکلنے سے قبل ہی صاف کرچکا تھا چنانچہ جب ایک ٹیکسی میں سوار ہوکر ڈرائیور کو چلنے کے لیے کہا تو اسے بھی اس پر کسی قسم کا شک نہیں گزرا۔ فاروق نے پھر بھی احتیاط پسندی سے کام لیا اور ٹیکسی ڈرائیور کو سیدھا اڈے کا پتا بتانے کے بجائے ایک قریبی علاقے تک چلنے کے لیے کہا۔

ٹیکسی اسٹیشن کی حدود سے نکل گئی تو وہ پرسکون ہونے لگا اور خیال آیا کہ منو اور اکبر تو وہیں اسٹیشن پر رہ گئے ہیں۔ بہرحال یہ کوئی اتنی تشویش کی بات نہیں تھی۔ وہ دونوں بالغ تھے اور اس مختصر عرصے میں بمبئی کی خاصی سیر کرچکے تھے۔ خصوصاً منو کو بمبئی میں گھومنے کا خوب موقع ملا تھا اس لیے وہ خود سے بھی اڈے واپس آسکتے تھے۔ بصورت دیگر وہ اڈے سے کسی کو ان کی تلاش میں بھیج دیتا۔ فی الحال تو خود اس کا وہاں سے نکل کر محفوظ ٹھکانے پر پہنچنا ضروری تھا۔ ٹیکسی سے اتر کر وہ ایک تانگے میں بیٹھا اور اڈے پہنچ گیا۔ ربن کی اڈے پر غیر موجودگی کو اس نے اپنے لیے بہتر جانا اور سیدھا اپنے کمرے کا رخ کیا۔ کمرے میں جانے سے قبل وہ گولو کو سختی سے حکم دے گیا تھا کہ کوئی وہاں نہ آئے، وہ کچھ دیر آرام کرنا چاہتا ہے اس لیے کوئی اس کی تنہائی میں مخل نہیں ہوا۔ وہ کپڑے تبدیل کیے بغیر بستر پر دراز ہوگیا۔ گنیش کی خون اگلتی لاش ہنوز اس کے ذہن کے پردے پر موجود تھی۔ کیسے دیکھتے ہی دیکھتے وہ شخص زندگی کی بازی ہار گیا تھا جو منہ مانگی قیمت پر دوسروں کی زندگیوں کے چراغ گل کیا کرتا تھا اور ستم یہ تھا کہ اس کے ناپاک خون کا بوجھ اس کی ذات پر آپڑا تھا۔ وہ نااہل نہیں تھا اور نہ ہی چاقو تھامنے میں اس کی مہارت میں کوئی کمی تھی، بس گنیش کی موت ہی آئی

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

تھی جو وہ ایسی حرکت کر بیٹھا کہ اس کی شہ رگ ہی کٹ گئی۔

اس کی اتنی اچانک موت نے اسے دم بخود کر دیا تھا۔ اگر اسے جولیٹ کی فکر نہیں ہوتی تو شاید وہاں سے بھاگنے کی تحریک بھی نہ پیدا ہو پاتی۔ کیسے نازک لمحات تھے وہ، جب وہ لوگوں کے ہجوم میں سے راستہ بناتا ہوا بھاگتا چلا جا رہا تھا اور اس کے پیچھے پکڑو، بھاگنے نہ پائے جیسی صدائیں لگاتے لوگوں کا ایک گروہ بھاگتا چلا آ رہا تھا۔ ان کی صداؤں پر آس پاس موجود لوگوں میں سے شاید کچھ اسے پکڑنے کی کوشش کرتے لیکن پھر اچانک ہی پیچھے نہ جانے کیا ہو گیا تھا کہ لوگوں کی توجہ اس پر سے ہٹ گئی تھی اور وہ وہاں سے نکلنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ اس سارے منظر کو سوچتے ہوئے اسے ایک بار پھر منو اور اکبر کا خیال آیا۔ افراتفری میں وہ انہیں وہیں اسٹیشن پر چھوڑ آیا تھا۔ پتا نہیں وہ واپس لوٹے بھی تھے یا ابھی تک وہیں اسٹیشن پر اس کی تلاش میں بھٹک رہے تھے۔ ان دونوں کا خیال آنے پر وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اپنی جگہ سے اٹھا اور کمرے سے نکل کر سیڑھیوں پر آ کھڑا ہوا۔

''گولو......'' اوپری سیڑھی پر کھڑے کھڑے ہی اس نے پکارا تو گولو بوتل کے جن کی طرح فوراً حاضر ہو گیا۔

''جی فاروق بھائی، چائے پئیں گے کیا؟'' اس نے مستعدی سے پوچھا۔

''نہیں۔ تم دیکھو کہ نیچے کون کون فارغ ہے؟ دو بندوں کو ذرا اسٹیشن بھیجو اور بولو کہ منو اور اکبر کی خبر لے کر آئیں۔ وہ دونوں وہاں گھومنے کے لیے رکے تھے، ابھی تک واپس نہیں آئے۔''

اس نے گولو کو کام بتایا اور واپس اپنے کمرے میں آ گیا۔ اب اس کے خیال کی رو دوسری طرف بہہ رہی تھی۔ اسٹیشن پر اس نے جو معلومات حاصل کی تھیں، ان کی روشنی میں جولیٹ حیدرآباد جانے والی ٹرین میں سوار ہوئی تھی۔ بمبئی سے حیدرآباد کا فاصلہ کوئی کم نہیں تھا۔ راستے میں ......کتنے ہی دوسرے مقامات پڑتے تھے۔ کچھ پتا نہیں تھا کہ جولیٹ راستے میں کہیں اتری تھی یا سیدھی حیدرآباد گئی تھی۔ اگر وہ حیدرآباد میں تھی تو اسے ڈھونڈنا فاروق کے لیے آسان بھی تھا اور بہت مشکل بھی۔ حیدرآباد میں جولیٹ کی موجودگی کے امکان پر غور کرتے ہوئے اس کا دھیان کنیش کے اعتراف کی طرف چلا گیا۔ اس نے مرنے سے پہلے قبول کر لیا تھا کہ اس نے بملا بھابیہ کے حکم پر چاند بانو کی گاڑی کو نشانہ بنایا تھا۔ خود سے بے پناہ محبت کرنے والی چاند بانو کا اس پر یہ حق تھا کہ وہ اس کے ساتھ ہونے والے ظلم کا بملا سے حساب لیتا۔ اس امیر زادی نے اپنے اختیار کے زعم میں چاند بانو کو محض اس لیے نشانہ بنوایا تھا کہ وہ اسے اپنے اور فاروق کے درمیان حائل محسوس کر رہی تھی۔ حالانکہ ایسا کچھ نہیں تھا۔ چاند بانو بھی فاروق سے محبت کر کے اتنی ہی تشنہ تھی جتنی بملا بھابیہ لیکن دونوں کی محبت میں یہ فرق تھا کہ بملا بھابیہ ہر حال میں فاروق کو حاصل کر لینا چاہتی تھی اور چاند بانو اپنی بے لوث محبت پر ہی قانع ہو گئی تھی۔ وہ طوائف زادی ہو کر بھی محبت کی نزاکت و لطافت سے واقف تھی اور جانتی تھی کہ محبت اصل میں لینے نہیں، دینے کا نام ہے سو بنا بدلے کی چاہ کے مسلسل فاروق کو چاہے جا رہی تھی۔ فاروق اس کی اس بے لوث محبت کے جواب میں اس سے ویسی ہی محبت تو نہیں کر سکتا تھا لیکن بہرحال اس کے دل میں چاند بانو کے جذبے کی عزت و قدر تھی اور وہ محسوس کرتا تھا کہ چاند بانو کے ساتھ ہونے والے ظلم کا حساب لینا اس کا فرض ہے۔ اس نے دل میں فیصلہ کیا کہ وہ جولیٹ کی تلاش میں جانے سے قبل یہ فرض ادا کر کے جائے گا کیونکہ کچھ پتا نہیں تھا کہ جولیٹ کی تلاش میں کتنا وقت لگ جاتا اور اسے واپس آنا نصیب بھی ہوتا یا نہیں۔

''فاروق بھائی...... آپ کو دادا بلاتے ہیں۔'' خیالات کے سلسلے کو دستک کے ساتھ لگائی جانے والی گولو کی صدا نے توڑا۔

''ابھی آتا ہوں۔'' وہ ربن کے بلاوے کو کیسے ٹالتا چنانچہ فوراً بستر سے اٹھ کھڑا ہوا۔ نیچے پہنچا تو ربن اس کا منتظر تھا۔ اس کے آس پاس کوئی دوسرا موجود نہیں تھا جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ تنہائی میں اس سے بات کرنا چاہتا ہے۔ فاروق کو بے چینی سی ہونے لگی۔ تنہائی میں بات کرنے کا مطلب تھا کہ ربن اس سے کوئی خاص بات کرنا چاہتا ہے۔

''بیٹھ جا۔ میرے چہرے کو ٹٹول کر کیا معلوم کر سکے گا۔'' ربن نے قدرے خفا سے لہجے میں اسے حکم دیا تو وہ کھسیایا ہوا اس کے سامنے بیٹھ گیا۔

''اب بتا کیا ہوا ہے؟'' اس نے اب بھی ذرا خفگی سے فاروق سے سوال کیا۔

''کیا ہوا ہے......؟'' فاروق نے حیرت سے اس کا سوال دہرایا۔ اسے ربن کے اس سوال کا مقصد سمجھ نہیں آیا تھا۔

''تو نے وہ جو دو حرام کے جنے اسٹیشن بھیجے تھے، وہ لوٹ آئے ہیں اور اپنے ساتھ بہت سی خبریں بھی لائے ہیں۔''

''کیسی خبریں......؟'' ربن کی اطلاع پر وہ چونکا۔

"ادھر اسٹیشن پر کسی نے بھایا سیٹھ کے پالتو غنڈے گنیش کو قتل کر دیا ہے اور وہ دونوں جو تیرے ساتھ اسٹیشن گئے تھے، وہاں دنگا فساد کرتے ہوئے پکڑے گئے ہیں۔ کہنے والے کہتے ہیں گنیش کا خونی پکڑا جاتا اگر بیچ میں ان دونوں نے تماشا شروع نہ کر دیا ہوتا۔ اب وہ دونوں تھانے میں ہیں۔ تو اپن کو سارا آگا پیچھا بول دے تاکہ اپن انہیں چھڑانے کا کوئی راستہ نکال سکے۔" ربن نے اپنے اسی لہجے میں اسے حالات سے آگاہ کیا تو اس کے پاس کل احوال سنا دینے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہا۔ دائی سے پیٹ چھپا کر حاصل بھی کچھ نہیں تھا۔ ربن سے بڑھ کر ان حالات میں کوئی اس کا ہمدرد اور مددگار ہو بھی نہیں سکتا تھا۔

"حرام کا جنا تھا۔ حرام موت مارا گیا تو اس میں تیرا کیا دوش۔ تیرے کو دماغ پر زور دینے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ باقی اپن دیکھ لیتے ہیں کہ ان دونوں کا کیا معاملہ ہے۔ نکال لائیں گے انہیں سلاخوں کے پیچھے سے۔ پر اپن تیرے کو اتنا ضرور بولیں گے کہ ابھی حالات اپنے لیے اچھے نہیں ہیں، اس واسطے تیرے میرے سمیت سب کو چاروں کھونٹ دیکھ کر چلنا لازم ہے۔ سالے پولیس والے جو کل تک اپنے یار بنے پھرتے تھے، اب ماتھے پر آنکھیں رکھ کر بیٹھے ہیں۔ یہ تو اچھا ہوا کہ تو اسٹیشن پر کسی کے ہاتھ نہیں آیا ورنہ بڑی مصیبت کھڑی ہو جاتی۔" اس سے سارا احوال سن کر ربن نے اسے تسلی دی لیکن ساتھ ہی نصیحت کرنا بھی نہیں بھولا۔

"مجھے احساس ہے دادا کہ حالات ٹھیک نہیں ہیں، بس گنیش کو دیکھ کر میں خود کو روک نہیں سکا اور بعد میں جو کچھ ہوا، اس میں میرے ارادے کا کوئی دخل نہیں تھا لیکن اب تم کیا کرو گے۔ پولیس والوں سے جا کر ان دونوں کے لیے بات کرنا کہیں ان کے لیے اور مشکل نہ کھڑی کر دے۔" وہ بیتی ہوئی کے اثر سے ابھی تک نہیں نکلا تھا۔ ساتھ ہی اسے منو اور اکبر کی طرف سے بھی تشویش تھی۔ ربن کے اڈے سے ان کا تعلق سامنے آنے پر پولیس کا رویہ ان کے ساتھ مزید سخت ہو سکتا تھا۔

"وہ اپنا وکیل اشوک بچن ہے نا۔ اس کو بولتے ہیں۔ اس کی کھوپڑی میں پولیس والوں سے نمٹنے کے واسطے بڑی ترکیبیں ہوتی ہیں۔ وہ دیکھ لے گا اس معاملے کو۔" ربن مطمئن تھا اور اس کا یہ اطمینان غلط بھی ثابت نہیں ہوا۔ اگلے دن دوپہر کے کھانے سے پہلے منو اور اکبر ان کے درمیان موجود تھے اور منو انہیں تفصیل سے سارا قصہ سنا رہا تھا۔

"اسیں تو ادھر ٹیشن (اسٹیشن) کی رونقیں ویکھنے میں مگن تھے۔ شور اٹھا تو پہلے یہ اپنے اکبر کی نظر پڑی۔ ہن دیکھ کر مینوں دسا کہ لوگ فاروق بھرا کے پیچھے بھاگ رہے ہیں۔ لوگوں کی ہکاروں پکاروں سے اپنے کو لگا کہ معاملہ وڈا گڑبڑ ہے ہور اگر فاروق بھرا پکڑا گیا تو وڈی مشکل نوں پڑ جائے گا بس فیر اپن اکبر کو ساتھ لے کر بیچ میں گھس گئے۔ کسی نوں کہنی ماری تے کسی نوں ٹانگ وچ اڑنگی لگائی۔ فیر کیا تھا، لوگ فاروق بھرانوں بھول بھال ہمارے سے الجھ گئے۔ ہنگامہ بڑھا پولیس آئی اور ہم دونوں سمیت ہور بندے بھی گرفتار کر ڈالے۔ اسیں اپنے بیان وچ ادھر کا کچھ نہیں بولے ہور پولیس کو بس یہ بتایا کہ اسیں چندی گڑھ سے بمبئی گھومنے کے واسطے آئے ہیں۔ اسٹیشن پر اپنا تماشا اس لیے ہوا کہ ان لوگوں نے بھاگتے ہوئے اپنے کو زور سے دھکا دیا تھا جس کی وجہ سے اساں دا قیمتی تے نازک سامان گر کر ٹوٹ گیا۔ پولیس والے سالے اپنے کو بہت گالیاں دیے۔ تھوڑی چھترول بھی کی کہ اپنی وجہ سے ایک خونی بھاگ نکلا پر اپن بھی پروں پر پانی نہیں پڑنے دیے نہ پولیس والوں کے کہنے پر یہ مانے کہ ہم خونی کے ساتھی ہیں اور ہم نے اپنے ساتھی کو بھگانے کے لیے سارا ناٹک کیا تھا۔ باقی کام ربن دادا کے بھیجے وکیل نے کر دکھایا ہور اسیں ادھر واپس آ گئے۔"

منو سمجھتا تھا کہ بمبئی کے باسی اس کی پنجابی نہیں سمجھ سکتے اس لیے پورا قصہ سناتے ہوئے کوشش کی تھی کہ پنجابی کا استعمال کم ہو لیکن بہرحال وہ اس سے بالکل باز نہیں رہ سکتا تھا۔ سب نے اس کی ملی جلی بولی میں پورا قصہ بھرپور دلچسپی کے ساتھ سنا۔ سامعین کی تعداد محدود تھی۔ اڈے کے ہر فرد پر بھرپور اعتماد کے باوجود ربن نے یہ قصہ رامو کے سوا کسی کے علم میں نہیں آنے دیا تھا۔ اعتماد اپنی جگہ تھا اور احتیاط اپنی جگہ۔ اس وقت سامعین میں بھی صرف رامو، فاروق، اشوک بچن اور وہ خود شامل تھا۔ منو کے سنائے قصے کا باقی حصہ اشوک بچن نے سنایا۔

حالات کو دیکھتے ہوئے اس نے بھی چالاکی سے کام لیا تھا اور خود منو اور اکبر کی وکالت کے لیے تھانے پہنچنے کے بجائے اپنے ایک دوست وکیل سے یہ کام لیا تھا۔ اس موقع پر شکنتلا کے باپ سیٹھ انوپم اگروال کا حوالہ کام آیا تھا۔ انوپم اگروال چندی گڑھ میں قیام کے عرصے میں منو سے غائبانہ متعارف ہو چکا تھا اس لیے اس نے ربن کے ایک فون پر فوراً پولیس والوں کے سامنے یہ بیان دینے کی حامی

بھرلی کہ منو اس کا مہمان ہے اور چندی گڑھ سے اپنے دوست کے ساتھ بمبئی گھومنے آیا ہوا ہے۔ اشوک کا دوست وکیل سیٹھ انوپم اگروال کا حوالہ ساتھ لے کر تھانے پہنچا تھا اس لیے بہ آسانی منو اور اکبر کی رہائی عمل میں آ گئی تھی۔ بھاٹیہ کے بجائے سیٹھ انوپم اگروال کا انتخاب ربن نے سوچ سمجھ کر کیا تھا۔ وہ پولیس یا بھاٹیہ سیٹھ کو ایسا کوئی سرا نہیں پکڑانا چاہتا تھا کہ انہیں یہ اندازہ ہو سکے کہ اس سارے قصے کا اڈے سے کوئی تعلق ہے۔ اگر منو اور اکبر کا اڈے سے تعلق ثابت ہو جاتا تو پھر پولیس کو اندازہ کرنے میں دیر نہیں لگتی کہ گنیش کے قتل سے اڈے کے کسی فرد کا تعلق ہے۔

انوپم اگروال ایک غیر متعلقہ شخص تھا جس کی ربن سے واقفیت بھی کسی کے علم میں نہیں تھی۔ اصل میں تو یہ واقفیت بھی اتفاقاً ہی ہوئی تھی۔ بمبئی سے چندی گڑھ جاتے ہوئے سیٹھ کی بیٹی شکنتلا سے ان لوگوں کی ریل میں ملاقات ہوئی تھی۔ وہ ماجد علی نامی شخص کے بہکاوے میں آ کر زر و زیور سمیت اپنا گھر چھوڑ کر چندی گڑھ جا رہی تھی۔ ربن نے صورت حال کو بھانپ لیا اور ماجد علی کی بے ایمانی و بدنیتی کو شکنتلا کے سامنے کھول کر رکھ دیا پھر شکنتلا کو اس کے باپ کے حوالے کرنے کی کارروائی بھی ربن ہی نے احسن طریقے سے نمٹائی۔ بیٹی کی بربادی اور اپنی بدنامی سے بچ جانے والا سیٹھ انوپم اگروال ربن کی اس مہربانی کے لیے اس کا احسان مند تھا۔ اس لیے ایک ہی فون کال پر نہ صرف اس کا کام کر ڈالا بلکہ اسے فاروق سمیت اپنی کوٹھی پر آنے کی دعوت بھی دی۔ ربن نے اس سے آنے کا وعدہ کر لیا تھا لیکن فی الحال کوئی دن طے نہیں کیا تھا۔

فاروق خاموشی سے بیٹھا سب کی سنتا رہا اور اپنے لیے ان کا خلوص محسوس کرتا رہا۔ ربن کی اپنے لیے محبت تو اس کے لیے کوئی نئی بات نہیں تھی۔ وہ جانتا تھا کہ ربن اس کی خاطر ہر حد تک جا سکتا ہے لیکن کچھ دن کے شناسا منو اور اکبر نے کیسی مثالی محبت کا ثبوت دیا تھا۔ اسے وہ لمحات کیسے بھول سکتے تھے جب وہ گنیش کے مرنے کے بعد اپنی جان بچانے کے لیے اسٹیشن سے نکل جانے کی فکر میں تھا اور لوگوں کا ایک ہجوم اس کے پیچھے لپکا چلا آ رہا تھا۔ اس وقت .... منو اور اکبر اپنی پروا نہ کرتے ہوئے اگر وہاں ہنگامہ نہ کھڑا کر دیتے تو اس کے لیے اپنی جان بچا کر نکل جانا آسان نہ ہوتا۔ ربن اور اشوک بچن کے ساتھ جمی وہ محفل برخاست ہوئی تو اس نے منو اور اکبر کے روبرو اس حقیقت کا اعتراف بھی کیا اور انہیں گلے لگا کر ان کے خلوص کے لیے شکریہ بھی ادا کیا۔

”شکریے کی کیا بات ہے فاروق بھائی۔ میں نے تو آپ کا احسان اتارنے کی ایک معمولی سی کوشش کی تھی۔ میں کیسے اس رات کو بھول سکتا ہوں جب پارو کے باپ اور بھائی میری جان لینے پر تلے ہوئے تھے اور آپ نے مجھ سے کوئی تعلق، کوئی واقفیت نہ ہوتے ہوئے بھی میری جان بچائی تھی اور پھر آپ کیسے مجھے میرے شہر کی قاتل فضاؤں سے نکال کر یہاں لے آئے۔ یہ بھلا کوئی بھولنے کی بات ہے۔ یہ آپ کا پرخلوص ساتھ ہی تو ہے جو میں پارو سے بچھڑ کر بھی زندہ ہوں اور ایک نئی زندگی جینے کی کوشش کر رہا ہوں۔“ اس کے شکریے کے جواب میں یہ سب کہتے ہوئے اکبر کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ وہ محبت کا مارا ہوا نوجوان تھا جس کی محبت مذہب کی تفریق کی نذر ہو گئی تھی اور وہ اپنی محبوبہ کی خواہش پر سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر بس اس کی یادوں کو دل میں بسائے فاروق کے ساتھ بمبئی آ گیا تھا۔

”انشاء اللہ تم بہت بہترین زندگی جیو گے۔ بس میں ذرا اپنے چند مسائل سے نمٹ لوں پھر تمہارے لیے کسی اچھے بندوبست کا سوچتا ہوں۔“ فاروق نے اس کی پیٹھ تھپکتے ہوئے اسے تسلی دی اور پھر منو کی طرف رخ کر کے بولا۔

”اپنا منو تو ہے ہی یاروں کا یار۔ چندی گڑھ جانے کا مجھے سب سے بڑا فائدہ یہی ہوا کہ منو جیسا دوست مل گیا۔ اس دوستی پر میں جتنا فخر کروں کم ہے۔“

”شرمندہ نہ کرو فاروق بھرا۔ اسیں تو بہت مومولی (معمولی) بندے ہیں۔“ چندی گڑھ شہر میں اپنے نام کے جھنڈے گاڑتے والا منو اس وقت شرمیلے سے لہجے میں بولا تو فاروق ہنس دیا اور بولا۔

”تمہیں دیکھ کر لگتا ہی نہیں ہے یار کہ تم کسی اڈے کی چوکی پر بیٹھے دادا ہو اور سارے شہر میں تمہارے نام کی دہشت ہے۔“

”وہ دوجی گل ہے بھرا۔ اساں دے سر وچ چاچاجی دا ہتھ ہے۔“ اس نے سارا کریڈٹ اپنے چاچا کپل داس کو دے دیا لیکن فاروق جانتا تھا کہ کپل داس کی سرپرستی اپنی جگہ لیکن اگر منو میں ہی گن نہ ہوتے تو یہ سرپرستی کسی کام نہیں آتی۔ آدمی کے اپنے اندر بھی کچھ ہوتا ہے تو ہی استاد کی محنت بھی رنگ لاتی ہے۔

”ساری باتیں چھوڑیں اور یہ بتائیں کہ اب کیا کرنا ہے۔ آپ جس مقصد کے لیے اسٹیشن گئے تھے، وہ حاصل ہوا یا نہیں؟“ یکدم ہی اکبر نے گفتگو کا موضوع بدل دیا۔

اس نے اپنی پارو کو کھویا تھا اس لیے فاروق کا درد سمجھتا تھا اور پورے دل سے خواہاں تھا کہ فاروق کو جولیٹ مل جائے۔

"کچھ نہ کچھ کام تو بنا ہے۔" اس نے حاصل ہونے والی معلومات سے ان دونوں کو آگاہ کیا۔ "دادا کا کہنا ہے کہ وہ محلے والوں سے معلوم کرنے کی کوشش کرے گا کہ حیدرآباد یا اس کے آس پاس کسی علاقے میں جولیٹ اور اس کے والدین کے کوئی رشتے دار وغیرہ رہتے ہیں یا نہیں۔ اگر کسی کا پتا چل گیا تو میرا کام آسان ہوجائے گا ورنہ جولیٹ کی تلاش میں مجھے بہرصورت نکلنا تو ہے ہی۔"

"میں آپ کا پورا پورا ساتھ دوں گا۔" اکبر نے اعلان کیا۔

"اور میں بھی۔" منو نے بھی اس کے ساتھ اپنی آواز شامل کی۔

"تم دونوں کے خلوص کا شکریہ لیکن میں سوچ رہا ہوں کہ جولیٹ کی تلاش میں نکلنے سے پہلے میں ایک دوسرا کام نمٹا لوں تاکہ میری جان پر کسی کا قرض باقی نہ رہے۔" فاروق کا لہجہ سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔

"کیسا کام بھرا؟ ذرا کھل کر بولو۔" منو نے اس سے وضاحت چاہی۔ جواب میں اس نے چاند بانو سے بملا کی مخاصمت، بملا کی گنیش کے ذریعے چاند بانو کے قتل کی کوشش اور ریلوے اسٹیشن پر گنیش سے حاصل ہونے والی تمام معلومات سے انہیں آگاہ کردیا۔

"یہ تو واقعی بڑا ظلم کیا اس امیر زادی نے۔ اس سے حساب لینا واقعی آپ کا فرض بنتا ہے۔" سب سن کر اکبر نے اس کی تائید کرنے میں پہل کی اور مزید بولا۔ "اس سلسلے میں بھی میں آپ کا ساتھ دینے کے لیے تیار ہوں۔"

"یہ کوئی اتنا مشکل کام نہیں ہے۔ میں اکیلا بھی بملا سے مل کر سارا حساب بے باق کرسکتا ہوں۔ بس پہلے مجھے یہ معلوم کرنا ہے کہ وہ بمبئی میں ہے یا اپنی ملازمت پر اپنے کالج کے ہاسٹل میں۔" اس نے اکبر کو جواب دیا۔

"گنیش کے مرنے پر وہ کہیں ہوشیار نہ ہوگئی ہو۔" اکبر نے نکتہ اٹھایا۔

"میرے خیال میں ایسا نہیں ہوا ہوگا۔ گنیش ایک غنڈا تھا اور اس کے اس طرح مارے جانے پر کسی کو تشویش نہیں ہوسکتی کیونکہ سب جانتے ہیں کہ ایسے لوگوں کی بے شمار دشمنیاں ہوتی ہیں۔" فاروق نے اس کے خیال کو رد کیا۔

"تسی ٹھیک دس رہے ہو بھرا پر ایسا کرو اب تسی تھوڑے سے آرام کرلو۔ تساں دی طبیعت چنگی ہوئی ہے پر ابھی دماغ پہ اتنا زور ڈالنا ٹھیک نہیں ہے۔ چل اکبر! اسیں چل دیے ہیں۔ فاروق بھرا نوں آرام کرن دے۔" منو کو بالکل اچانک ہی یاد آگیا کہ فاروق ابھی تو ایک لمبی بیماری کو بھگتا کر بیٹھا ہے اور ڈاکٹروں نے اس کے بارے میں اطمینان کا اظہار کرنے کے باوجود احتیاط کی ہدایت کی ہے اس لیے گفتگو کے سلسلے کو وہیں موقوف کردیا۔ ان دونوں کے اپنے کمرے سے جانے کے بعد بھی فاروق ان کے بارے میں سوچتا رہا۔ اپنے اڈے کے ساتھیوں پر اس کا اعتماد کم نہیں تھا لیکن نہ جانے کیوں وہ انہیں اپنے معاملات سے الگ رکھنا چاہتا تھا اور ایسے میں ان دونوں کا ساتھ کسی نعمت سے کم نہیں تھا۔

☆☆☆

آج کل حویلی کی فضا بدلی بدلی سی تھی۔ اپنے کمرے تک محدود رہنے والی بدر جہاں عرف آپا بیگم بھی کبھی کمرے سے باہر دکھائی دینے لگی تھیں۔ ان کے ساتھ نواب زادی عالیہ بھی خاصی سرگرم دکھائی دیتی تھیں لیکن جولیٹ نے بارہا انہیں کسی گوشے میں خاموش اور گم صم بیٹھے ہوئے بھی دیکھا تھا۔ مالکاؤں کی سرگرمی کے ساتھ ملازماؤں کی مصروفیت بھی لازماً بڑھ گئی تھی اور وہ یوں ہر وقت کام میں جتی دکھائی دیتی تھیں جیسے عید آنے والی ہو۔ یہ سارا غلغلہ بدر جہاں کے اکلوتے بیٹے اور نواب زادی عالیہ کے شوہر اختر کی لندن سے آمد کے سلسلے میں تھا۔ وہ گھر والوں سے ملاقات کے لیے جلد پہنچنے والے تھے اور یہاں بڑے جوش وخروش سے ان کے استقبال کی تیاریاں کی جارہی تھیں۔ جولیٹ ہونٹوں پر ایک زہرخندی مسکراہٹ لیے ان تیاریوں کو دیکھتی رہتی تھی۔ کیسا ستم تھا کہ وہ جو اس حویلی کا ہی خون تھی اور اسے نواب زادہ اسد اللہ کی اکلوتی اولاد ہونے کا شرف حاصل تھا، اس حویلی میں یوں داخل ہوئی تھی کہ اس کی حیثیت محض ایک تنخواہ دار ملازمہ کی تھی۔ وہ اپنے دل میں نواب زادہ اسد اللہ سے احتساب کا عزم لے کر اس حویلی میں وارد ہوئی تھی لیکن نہ جانے کیوں ابھی تک ان کے مقابل کھڑے ہونے کی جرأت نہیں کرسکی تھی۔ ان کی شخصیت میں کوئی ایسا سحر ضرور تھا کہ وہ ان سے کسی گستاخی کی جرأت نہیں کر پاتی تھی۔ اپنی یہ کیفیت اسے جھنجلاہٹ میں بھی مبتلا کردیتی تھی لیکن بے بسی اپنی جگہ تھی۔ اس وقت بھی وہ پائیں باغ میں بیٹھی اسی سلسلے میں غور وخوض کررہی تھی کہ آصف خان وہاں چلا آیا۔

"ہیلو! آج پھر آپ یہاں اکیلی بیٹھی ہیں؟" اس نے

مسکراتے ہوئے جولیٹ کو مخاطب کیا۔

"ظاہر ہے۔ حویلی کی معزز خواتین میں سے تو کوئی مجھے کمپنی دینے سے رہا۔" اس نے اپنے موڈ کے باعث تلخ لہجے میں جواب دیا۔

"لگتا ہے مزاج برہم ہے۔ کوئی بات نہیں۔ میں آپ کو کمپنی دے دیتا ہوں۔" آصف خان کہتے ہوئے اس کے سامنے والی کرسی پر براجمان ہوگیا۔ وہ اچھی شخصیت کا مالک تھا اور انگریزی بھی عمدہ بولتا تھا۔

"حویلی کے ضابطۂ اخلاق کے مطابق یہ ایک قابلِ اعتراض عمل ہوگا۔" اس نے آصف خان کو آگاہ کیا۔

"کیا مطلب؟" وہ حیران ہوا۔

"مطلب یہ کہ مجھے بتایا گیا ہے کہ یہاں مردوزن کا آزادانہ میل جول ناپسندیدہ ہے۔" اس نے وضاحت کی۔

"یہ پابندی حویلی کے افراد پر لگائی جاسکتی ہے۔ ہم دونوں ہی اس سے آزاد ہیں۔" آصف خان نے شانے جھٹکے۔

"یہ بات میں نے بھی کہی تھی لیکن مجھے بتایا گیا کہ آپ ایک خطرناک قاتل ہیں اس لیے مجھے آپ سے ملنے میں احتیاط کرنی چاہیے۔" اس نے بدرجہاں کے الفاظ زیادہ سخت پیرائے میں آصف خان کے سامنے دہرائے۔ ان الفاظ کو سن کر اس کا گوری رنگت والا چہرہ سرخ پڑ گیا اور وہ بولا۔

"یہ الفاظ اسد انکل کے نہیں ہوسکتے۔ نہ ہی انہوں نے میرے متعلق ایسی کوئی بات اپنے اہل خانہ سے کہی ہوگی البتہ میں یہ اندازہ لگاسکتا ہوں کہ زنان خانے کی جاسوس ملازماؤں نے کچھ سن گن لے کر اس طرح کی معلومات اپنی مالکاؤں کو پہنچائی ہوں گی اور اسی کی روشنی میں ان میں سے کسی نے آپ کو تنبیہ کی ہوگی۔" غصے کے باوجود آصف خان نے حالات کا بالکل درست تجزیہ کیا تھا۔

"میں آپ کی طرح کوئی اندازہ لگانے سے قاصر ہوں۔" جولیٹ نے شانے اچکائے۔

"میرے خطرناک قاتل ہونے پر آپ کو کس حد تک یقین ہے؟" آصف خان نے اسے ٹٹولا۔

"میں نے اس بارے میں کچھ نہیں سوچا۔ آپ کے قاتل ہونے یا نہ ہونے سے مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔"

"لیکن میں اپنے بارے میں آپ کی رائے کو بہتر رکھنا چاہتا ہوں اس لیے آپ کو حقائق سے آگاہ کردینا ضروری سمجھتا ہوں۔" آصف خان کی آنکھیں جیسے خلا میں کچھ دیکھنے لگیں۔ "ہم روایتی پٹھان ہیں جن کی دوستی اور مہمان نوازی کی مثالیں دی جاتی ہیں تو نسلوں تک دشمنی نبھانے کی ریت بھی کسی سے ڈھکی چھپی نہیں۔ ہماری بھی ایک قبیلے سے نسلوں سے دشمنی چلی آرہی ہے۔ اس دشمنی کے باوجود میرے چچازاد بھائی کو اس قبیلے کی ایک لڑکی سے محبت ہوگئی۔ وہ میرا ہم عمر اور گہرا دوست تھا۔ اس نے مجھے اپنی محبت کے بارے میں بتایا تو میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی لیکن آدمی جب عشق میں مبتلا ہو تو کب کسی کی سنتا اور سمجھتا ہے۔ اسے بھی میری بات سمجھ نہیں آئی لیکن اتنا بہر حال وہ سمجھتا تھا کہ نہ تو ہمارے ہاں سے کوئی رشتہ لے کر جائے گا اور نہ ہی وہاں سے کبھی ہاں ہوگی اس لیے وہ دونوں نارمل طریقے سے کبھی ایک دوسرے کی زندگی کے ساتھی نہیں بن سکتے۔ میرے کزن شاہ زیب نے مجھ سے مدد مانگی اور مجھے دوستی کی خاطر اس کا ساتھ دینے کی ہامی بھرنی پڑی۔ طے یہ ہوا تھا کہ رات کے آخری پہر جب وہ دونوں علاقے سے نکلیں گے تو میں اپنی جیپ میں انہیں وہاں سے لے جاؤں گا۔ میں انہیں ایک دوسرے علاقے کے ریلوے اسٹیشن تک چھوڑنے کے بعد اپنے گھر واپس آجاتا۔ آگے ان کی مرضی ہوتی کہ وہ کس شہر کا رخ کرتے۔ مجھے اپنی منزل کے بارے میں انہوں نے اس لیے نہیں بتایا تھا کہ کہیں بعد میں، میں بزرگوں کے دباؤ پر انہیں ان کے بارے میں نہ بتادوں۔ میں نے شاہ زیب کی اس احتیاط کا برا نہ مانا اور اس روز سرِ شام شکار کے لیے جانے کا بہانہ بنا کر اپنے گھر سے نکل گیا۔ رات کے آخری پہر تک انتظار کا وقت ہم نے ایک مشترکہ دوست کے گھر چھپ کر گزارا اور جب ہم مقررہ وقت پر مقررہ جگہ پہنچے تو وہ بھی وہاں آگئی تھی جس کی خاطر شاہ زیب زندگی بھر کے لیے پورا خاندان چھوڑنے کے لیے تیار ہوگیا تھا۔

"نئی زندگی کی ابتدا کے لیے شاہ زیب حویلی سے خاصی بڑی رقم لے کر چلا تھا۔ وہ بھی یقیناً زیور وغیرہ کی شکل میں کافی کچھ لائی ہوگی۔ میں نے انہیں اپنی جیپ میں بٹھایا اور ہم وہاں سے چل پڑے۔ ہم تینوں ہی کے اعصاب کشیدہ تھے اس لیے ہم آپس میں بات چیت بھی نہیں کر رہے تھے اور ہمارا سفر خاموشی سے جاری تھا۔ میں نے انہیں علاقے سے بہت دور ایک ریلوے اسٹیشن پر چھوڑنے کا فیصلہ اس لیے کیا تھا کہ وہاں کسی شناسا سے سامنا نہ ہو اور وہ بہ آسانی وہاں سے نکل جائیں۔ بعد میں بے شک لوگوں کو اندازہ ہوجاتا کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ فرار ہوئے ہیں لیکن فوری طور پر

بچت ہوجاتی اور انہیں کسی محفوظ مقام تک پہنچنے کے لیے مہلت مل جاتی۔ اپنی طرف سے ہم نے مکمل منصوبہ بندی کی تھی لیکن قسمت کی ستم ظریفی تھی کہ گل جنت کی وفادار ملازمہ جو اسے شاہ زیب تک چھوڑنے کے لیے آئی تھی، واپسی میں پکڑی گئی۔ ایک کمزور سی عورت وحشیانہ تشدد کے سامنے کہاں تک ٹھہر سکتی تھی۔ اس نے سب اگل دیا اور نتیجے میں موت کے ہرکارے ہماری تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔ ہم بہت دور نہیں گئے تھے کہ انہوں نے ہمیں آلیا۔ ہم اپنی اچھی منصوبہ بندی کے باوجود خطرے کے لیے تیار تھے اور میری جیپ میں اچھا خاصا اسلحہ موجود تھا۔ یوں بھی ہم شکار کے بہانے گھر سے نکلے تھے تو اسلحہ تو ہمارے ساتھ ہونا تھا۔ خطرے کو اپنے سر پر دیکھ کر ہم نے اپنے ہتھیار سنبھال لیے اور دشمنوں کو بھرپور جواب دینے لگے۔ اس کارروائی کے لیے مجھے جیپ ایک پہاڑی موڑ پر روکنی پڑی تھی۔

''پیچھے آنے والوں کو بھرپور جواب دیتے ہوئے ہم مطمئن تھے کہ ہم انہیں جلد پسپا ہونے پر مجبور کردیں گے اور پھر یہاں سے روانہ ہوجائیں گے لیکن انہوں نے ہم سے زیادہ ہوشیاری کا ثبوت دیا اور کچھ لوگ دوسری طرف سے گھوم کر پہنچ گئے۔ اب ہم دو طرف سے گھر چکے تھے اور بڑی مشکل سے دوچار تھے۔ میں نے اور شاہ زیب نے پیٹھ سے پیٹھ ملائی اور دونوں نے ایک ایک طرف کا محاذ سنبھال لیا۔ گل جنت کو ہم نے جیپ کے فرش پر جھک کر بیٹھنے کی ہدایت کررکھی تھی، سو وہ وہاں تھی۔

''جب گولیاں چلتی ہیں تو پھر کسی نہ کسی جسم میں اپنی جگہ بنانے میں کامیاب ہوہی جاتی ہیں۔ ہماری چلائی گولیاں کتنوں کو لگیں۔ ہمارے پاس حساب کتاب کرنے یا اندازہ لگانے کی مہلت نہیں تھی لیکن جب دشمن کی طرف سے چلائی گئی ایک گولی شاہ زیب کے شانے میں لگی تو جیسے سب کچھ پلٹ کر رہ گیا۔ اس کے منہ سے بے ساختہ ہی ایک چیخ نکل گئی۔ گل جنت اس کی چیخ پہچان کر بوکھلا گئی اور گھبراہٹ میں کھڑی ہوگئی۔ کھلی جیپ میں یوں کھڑے ہوکر اس نے خود اپنی موت کو دعوت دی تھی۔ موت کے ہرکارے اس موقعے سے کیسے فائدہ نہ اٹھاتے، کئی گولیاں تابڑتوڑ اس کے جسم میں داخل ہوئیں اور وہ لہرا کر گری۔ اسے گرتے دیکھ کر شاہ زیب اپنے حواس کھو بیٹھا اور ہتھیار چھوڑ کر اس کی طرف بھاگا۔ وہ گل جنت کو کیا سنبھالتا خود اس کے جسم میں کئی گولیاں لگیں اور وہ زندگی کی بازی ہار گیا۔ ایک تو اپنے بھائی جیسے دوست کی موت، دوسرے دشمنوں کے گھیرے میں تمہارہ جانے کا احساس...... میرے اندر وحشت اتر آئی اور میں نے شاہ زیب کی گری ہوئی گن بھی خود سنبھال لی۔ اس روز میں جس بے جگری سے مخالفین کے سامنے ڈٹا رہا، وہ خود میرے لیے حیرت کا سبب ہے۔ میری اسی جرأت نے مجھے اتنی مہلت دے دی کہ میرے اپنے خاندان والے مدد کے لیے وہاں پہنچ گئے۔ ہم دشمنیاں پالتے ہیں تو حالات سے باخبر رہنے کی بھی کوشش کرتے ہیں اسی لیے میرے خاندان تک بہت جلد خبر پہنچ گئی تھی اور یوں میں دو طرف سے دشمنوں میں گھرے ہوئے ہونے کے باوجود بچ جانے میں کامیاب ہوگیا تھا لیکن مجھے خود تین گولیاں لگی تھیں جن کا مجھے عالم جنون میں احساس نہیں ہوا تھا۔

اسپتال میں علاج کے دوران پتا چلا کہ اس روز گل جنت کے دونوں بھائی بھی مارے گئے اور ان کے قبیلے کا ایک اور آدمی بھی۔ دونوں طرف سے زخمی ہونے والوں کی تعداد بھی اچھی خاصی تھی اور ان حالات سے ظاہر تھا کہ دشمنی کی یہ آگ مزید بھڑکے گی اور اپنے ساتھ بہت کچھ جلا کر خاکستر کردے گی۔ میرا علاج ایک بہت بڑے اسپتال میں ہورہا تھا۔ خوش قسمتی سے مجھے لگنے والی گولیاں کسی بھی حساس مقام پر نہیں لگی تھیں اس لیے میں بہت تیزی سے سنبھل گیا تھا۔

''میں جس اسپتال میں تھا، وہاں بابا نے محافظوں کی پوری فوج کھڑی کررکھی تھی۔ وہ مجھ سے ناراض تھے کہ میں نے شاہ زیب کی حماقت میں اس کا ساتھ دینے کی غلطی کیوں کی لیکن اس کے باوجود اپنی پدرانہ محبت سے مجبور تھے۔ انہیں نظر آرہا تھا کہ میری جان سخت خطرے میں ہے۔ دشمن خود سے بدلہ لینے کے لیے میدان میں اترتا تو بھی اس کا سب سے پہلا نشانہ میں ہوتا اور اگر جرگہ بٹھایا جاتا تو بھی میری بچت نہ ہوتی کہ میں نے گل جنت کو شاہ زیب کے ساتھ فرار کروانے کے سنگین جرم میں عملی حصہ لیا تھا۔ بابا نے میری زندگی بچانے کے لیے یہی مناسب سمجھا کہ مجھے دشمنی کے اس ماحول سے نکال دیں۔ انہوں نے اسد انکل سے اپنی دوستی کا فائدہ اٹھایا اور میں اسپتال سے ہی بہت خاموشی سے نکال کر یہاں پہنچا دیا گیا۔ یہاں میرا کچھ نہیں ہے۔ میں اپنوں سے دوری کا عذاب سہہ رہا ہوں لیکن پھر بھی یہاں رکے رہنے پر مجبور ہوں کہ میرے ماں باپ کے دل اس خیال سے کہ ان کا بیٹا ان کی نظروں سے دور سہی زندہ تو ہے، ٹھنڈے ہیں۔ یہاں آنے کے بعد میں نے بابا کا لکھا خط اسد انکل کے حوالے کیا تھا اور خود اپنی زبان سے بھی انہیں حالات سے آگاہ کیا تھا۔ میری سنائی داستان شاید

حویلی کے کسی ملازم کے کانوں میں بھی پڑ گئی ہوگی اور گھومتی گھماتی زنان خانے تک بھی پہنچ گئی ہوگی اس لیے مجھے ''خطرناک قاتل'' کے ٹائٹل سے نواز کر آپ کو ہوشیار کرنے کی کوشش کی گئی۔''

آصف خان نے اسے اپنی پوری داستان سنائی اور آخر میں اداس مسکراہٹ کے ساتھ بولا تو جولیٹ کے ساکت وجود نے ایک جھرجھری سی لی۔ آصف خان نے اسے جو ہولناک داستان سنائی تھی، وہ اس کے لیے بالکل انوکھی تھی اور وہ سوچ رہی تھی کہ وہ کیسے لوگ ہوں گے جو آن کی آن میں لاشوں کے انبار لگا دیتے تھے جبکہ وہ تو کوشش کے باوجود نہ تو دلدار آغا کو اس کے انجام تک پہنچا سکی تھی اور نہ ہی ابھی تک اسد اللہ کا ہی احتساب کر پائی تھی۔

''میری داستان سن کر آپ نے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔'' اس کی خاموشی پر آصف خان نے پہلو بدلتے ہوئے اس سے کہا۔

''میں کیا کہہ سکتی ہوں۔ اس دنیا کے اسٹیج پر ہم سب اپنے اپنے طے شدہ کردار یوں انجام دے رہے ہیں کہ ہمارے پاس اپنی مرضی کی پرفارمنس کا اختیار شاید ہے ہی نہیں یا پھر ہے بھی تو بہت کم۔'' اس نے ایک سرد آہ کے ساتھ آصف خان کو جواب دیا تو وہ اس کی صورت تکتا رہ گیا اور پھر ہولے سے بولا۔

''کبھی کبھی مجھے آپ ایک نہایت پراسرار کردار لگتی ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ آپ کی نازک سی ہستی میں کوئی بڑا طوفان چھپا ہوا ہے جو ایک دن ہر طرف تباہی پھیلا دے گا اور کبھی کبھی آپ مجھے کسی پہاڑ جیسے دکھ کے بوجھ تلے دبی مظلوم لڑکی دکھائی دیتی ہیں جس کی مدد کے لیے میرا دل بے قرار ہو جاتا ہے۔ اگر آپ مجھے ایک ہمدرد دوست مانیں تو مجھ سے اپنے راز کہہ سکتی ہیں۔ آپ کا ہر راز میرے سینے میں دفن رہے گا اور میں رسمِ دوستی نبھانے کے لیے ہر مشکل میں آپ کا ساتھ دوں گا۔ یہ ایک پٹھان کا وعدہ ہے جو کبھی اپنے قول سے نہیں پھرتا۔''

''آپ کی پیشکش کا شکریہ لیکن مجھے اپنی جنگ خود لڑنی ہے۔'' جولیٹ نے مضبوط لہجے میں کہا اور یکدم ہی وہاں سے اٹھ کر حویلی کے رہائشی حصے کی طرف چل پڑی۔ آصف خان خاموشی سے اسے جاتا ہوا دیکھتا رہا۔

☆☆☆

''ولیم کے اغوا کا کیس تو نمٹا ہی سمجھو۔ وکیل اشوک بچن کہہ رہا تھا کہ اپنی پوزیشن مضبوط ہے۔ آگے کی ایک دو پیشیوں میں ہی کیس ختم ہو جائے گا۔ پولیس والے بھی تھوڑا جامے میں آ گئے ہیں اور دن رات اڈے کی نگرانی چھوڑ دی ہے۔ دیکھ لیے ہوں گے نا کہ نگرانی کر کے بھی کچھ نہیں ملنے والا۔ سالا ادھر کوئی کچا لوگ نہیں بیٹھا ہے کہ ایسے کسی کے گھیرے میں آ جائے۔'' ربن اطمینان سے حقہ گڑگڑاتا رامو سے مخاطب تھا۔

''ٹھیک بولتے ہو دادا پر اپنی مشکلیں اتنی آسانی سے ختم ہونے والی نہیں۔ سب سے بڑھ کر تو فاروق استاد کی چنتا ہے۔ پتا نہیں من میں کیا کیا سمائے بیٹھا ہے اور کیا کچھ کرتا پھر رہا ہے۔ گنیش کی موت والا لفڑا تو قسمت سے خود ہی نمٹ گیا ورنہ پولیس کے ساتھ ساتھ بھاٹیہ سیٹھ کی دشمنی بھی گلے پڑ جاتی۔ فاروق استاد آج کل جس حال میں ہے، اس کا کوئی پتا نہیں کہ کب کیا کر بیٹھے۔ اپنے کو تو اس کی طبیعت کی بھی فکر ہے۔ بھگوان کی کرپا سے اچھا ہو گیا ہے پر ڈاکٹر نے احتیاط کا تو بولا ہوا ہے نا۔'' رامو نے فکرمندی کا اظہار کیا۔

''اس کے دل پر ہاتھ پڑا ہے رامو! وہ جو کرتا ہے کرنے دے۔ اپن بیٹھے ہیں نا اس کے بگاڑے کو بنانے کے لیے۔'' ربن کے انداز میں کوئی فرق نہیں آیا اور وہ ہنوز حقہ گڑگڑاتا رہا۔

''وہ تو ٹھیک ہے بس ذرا من کو دھڑکا لگا رہتا ہے۔ یوں بھی حالات اچھے نہیں ہیں۔ کہیں نہ کہیں فساد کی خبر سننے کو مل جاتی ہے۔ صاف لگتا ہے کہ اب ہندوستان تقسیم ہو کر ہی رہے گا۔ سمجھ نہیں آتا کہ ایسا ہو گیا تو اپن کیا کریں گے؟'' رامو کی تشویش برقرار تھی۔

''اپنے کو کیا کرنے کا ہے رے۔ اپن جہاں بیٹھے ہیں، وہیں بیٹھے رہیں گے۔ اپنا جینا مرنا اس بمبئی میں ہی ہے۔ مر کر اس کی مٹی کے نیچے تو جا سکتے ہیں پر اسے چھوڑ کر کدھری جانے والے نہیں ہیں۔'' ربن نے اپنا فیصلہ سنایا اور پھر فوراً ہی بات بدلتے ہوئے بولا۔ ''اپن سوچ رہا ہے کہ مجو کا مٹکا بھی اب نمٹا ہی لے۔ سالے نے بہت ناک میں دم کر دیا ہے۔ جنے کس بل میں گھس کر بیٹھا ہے۔ اسے اس کے بل سے نکالنے کے لیے وکرم کا ہی منہ کھلوانا پڑے گا۔''

''وہ تو تم پہلے بھی بولے تھے دادا پر بیچ میں حالات ہی ایسے ہو گئے کہ اپن وکرم پر ہاتھ نہیں ڈال سکے۔ سالا بڑا ہی بدمعاش ہے۔ برسوں اڈے کا نمک کھایا ہے پر اب اپنے ہی کو آنکھیں دکھاتا ہے۔ اپن تمھیں بتایا تھا نا کہ اپنے کو تمہارے سے بھڑانے کے واسطے اپنے بیچ ہندو مسلم جھگڑا کھڑا کرنے کی سازش کرتا تھا۔ اس کے جسم پر چڑھی چربی

اتارنے کو اپنے ہاتھ بھی چل رہے ہیں۔"

"بس تو پھر انتظار کاہے کو کرتا ہے۔ دیکھ بھال کر ہاتھ ڈال دے حرام خور پر اور اب تک کا سارا کھلایا پلایا اگلوالے۔" ربن نے اسے حتمی اجازت دے دی۔

"سمجھو کام ہو گیا دادا۔" رامو نے اسے یقین دہانی کروائی۔ اسی وقت فاروق اوپر سے سیڑھیاں اتر کر نیچے آیا۔ اس کی تیاری بتا رہی تھی کہ وہ کہیں جا رہا ہے۔

"کدھر جاتا ہے شہزادے؟" رامو نے اسے دیکھ کر ہانک لگائی۔

"ذرا لائبریری تک جا رہا ہوں۔ اتنے دنوں سے جانا ہی نہیں ہوا۔" اس نے سادگی سے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے جا پر جا۔ کتابوں میں مگج (مغز) ماری مت کرنا۔ ابھی تیرے کو احتیاط کرنے کی ہے۔" رامو نے اسے ہدایت دی۔

"فکر نہیں کرو استاد۔ میں خیال رکھوں گا۔" اس نے اسے تسلی دی اور باہر کی طرف قدم بڑھائے۔

"اکیلا جا رہا ہے۔ کسی کو ساتھ لے جاتا۔" ربن نے پیچھے سے آواز دے کر اسے مشورہ دیا۔ وہ بہت گہری ٹٹولنے والی نظروں سے فاروق کا جائزہ لے رہا تھا۔

"میں تو ہمیشہ اکیلا ہی لائبریری جاتا ہوں۔ آج تمہیں ایسا خیال کیوں آیا؟" فاروق نے اس کے مشورے پر حیرت کا اظہار کیا۔

"تو بیماری سے اٹھا ہے نا اس لیے دادا احتیاط کو بولتا ہے۔" رامو نے فوراً ربن کی حمایت کی۔

"بہت ہو گئی یہ بیماری ویماری۔ اب تم لوگ مجھے ایک نارمل آدمی کی طرح جینے دو۔ اگر اسی طرح مجھے ہتھیلی کا چھالا بنائے رکھا تو میں خود کو کبھی تندرست نہیں محسوس کر سکوں گا۔" اس نے جھنجلائے ہوئے لہجے میں کہا۔

"اچھا چل۔ ناراض مت ہو، جیسا تو چاہتا ہے کر۔" ربن نے اس کا موڈ دیکھتے ہوئے اسے اجازت دے دی تو وہ فوراً ہی باہر نکل گیا۔ ربن کی پُرخیال نظریں اس کے پیچھے گئیں۔

"اب تو کدھر جاتا ہے؟" فاروق کے فوراً بعد اکبر باہر جاتا دکھائی دیا تو رامو نے اسے ٹوکا۔

"وہ سنا تھا فاروق بھائی لائبریری جا رہے ہیں تو سوچا میں بھی چلا جاؤں۔ مجھے بھی بہت شوق ہے کتابوں کا۔" اس طرح پکارے جانے پر اکبر نے بوکھلا کر جواب دیا۔

"اس کے ساتھ ہی نکل جانا تھا نا۔" رامو بولا۔

"مجھے ابھی پتا چلا۔ اچھا، اب میں چلتا ہوں ورنہ وہ دور نکل جائیں گے۔" اکبر عجلت میں کہتا ہوا باہر کی طرف لپکا۔

"کیا بولتے ہو دادا؟" رامو نے ربن کے پُرخیال چہرے کی طرف دیکھا۔

"گڑبڑ ہے۔ وجے کو بول پیچھے جا کر دیکھے۔" ربن نے اسے حکم دیا تو رامو فوراً حرکت میں آ گیا۔

فاروق کو اڈے سے نکلتے ہوئے اچھی طرح اندازہ تھا کہ وہ لوگ اسے یونہی نہیں چھوڑیں گے اس لیے اپنے تعاقب میں آنے والوں کی طرف سے ہوشیار تھا۔ سب سے پہلے اس نے اکبر کو اپنے پیچھے نمودار ہوتے ہوئے دیکھا اور حیران رہ گیا۔ وہ اڈے کے کسی فرد کے پیچھے آنے کی توقع کر رہا تھا۔ اکبر کے بارے میں تو سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا کہ اسے ربن نے بھیجا ہوگا لیکن اکبر کا انداز ایسا تھا جیسے وہ اس کی لاعلمی میں اس کا پیچھا کرنا چاہتا ہے۔ اسے تھوڑی سی جھنجلاہٹ محسوس ہوئی۔ اس وقت وہ ایک اہم کام سے جا رہا تھا۔ اس نے بالا ہی بالا یہ معلوم کر لیا تھا کہ ان دنوں بملا بمبئی آئی ہوئی ہے۔ اس کے بعد بملا سے رابطہ کرنا اور اسے ملاقات کے لیے اپنی مرضی کی جگہ پر بلوانا اس کے لیے کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ بملا تو خود اس سے ملاقات کی مشتاق تھی چنانچہ فاروق کے رابطہ کرنے پر خود ہی ملاقات کی خواہش ظاہر کر دی اور اپنی کوٹھی پر آنے کی دعوت دی لیکن فاروق نے اس کی یہ دعوت مسترد کر کے اسے ایک ہوٹل میں آنے کو کہا۔ بملا فوراً راضی ہو گئی۔ اس وقت وہ بملا سے ملاقات کے لیے ہی جا رہا تھا اور ایسے میں اکبر کا اپنے پیچھے آنا اسے بری طرح کھٹکا تھا۔ پہلے اس نے اکبر کو ڈاج دے کر نکل جانے کا سوچا پھر فیصلہ بدل کر اس سے دوبدو بات کر لینا ہی مناسب سمجھا اور چلتے چلتے مڑ کر یوں اچانک اکبر کے سامنے آ گیا کہ اس کے پاس کوئی جائے فرار نہیں رہی۔ یوں بھی وہ ایک عام سا لڑکا تھا اور فاروق کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ اب بھی گڑبڑا گیا۔

"کدھر......؟" فاروق نے ایک لفظی سوال کرتے ہوئے اسے گھورا۔

"وہ......" اکبر نے اپنی گھبراہٹ پر قابو پانے کی کوشش کی اور بولا۔ "میں آپ کے پیچھے ہی آ رہا تھا۔ پتا چلا تھا کہ آپ لائبریری جا رہے ہیں تو میں نے سوچا کہ میں بھی چلا جاتا ہوں۔ میں بھی کوئی کتاب لے آؤں گا پڑھنے کے لیے۔ سارا دن فارغ پڑا بور ہوتا رہتا ہوں۔"

"تو مجھے آواز دے کر روک لیا ہوتا۔ یوں چوروں کی طرح پیچھا کیوں کر رہے تھے۔" اس کے نہایت سلیقے سے بنائے گئے بہانے کے باوجود فاروق نے اپنی ناراضگی کا اظہار کیا۔

"بس...... میں نے سوچا سڑک پر آواز دینا کچھ اچھا نہیں لگے گا۔" اکبر اس کے ناراض ہونے پر شپٹایا۔ وہ یہ اعتراف تو کر نہیں سکتا تھا کہ اپنے تئیں وہ چوری چھپے فاروق کا تعاقب کر رہا تھا کہ اسے بھی اندازہ ہو گیا تھا کہ فاروق کسی اہم کام سے نکلا ہے اور وہ اپنے طور پر اس کی مدد کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔

"اچھا چلو آؤ ساتھ چلتے ہیں۔ اچھا ہے تم لائبریری دیکھ لو تو بعد میں جب چاہو اپنی مرضی سے وہاں جا سکتے ہو۔" وہ بملا سے طے کردہ وقت سے کافی پہلے نکلا تھا چنانچہ لائبریری کا رخ کرنے میں حرج نہیں سمجھا۔ اپنے موڈ کے حساب سے وہ پہلے بھی اکثر پیدل لائبریری آیا جایا کرتا تھا چنانچہ اس وقت بھی پیدل ہی چلنے کو ترجیح دی۔

"ارے فاروق صاحب آپ۔ بہت طویل عرصے بعد آنا ہوا۔" لائبریرین اسے دیکھ کر دوستانہ انداز میں اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا اور اس سے مصافحہ کیا۔ فاروق کی وہاں اکثر و بیشتر آمدورفت کی وجہ سے وہ اسے پہچانتا تھا۔

"جی بس ذرا طبیعت ناساز تھی۔ ڈاکٹرز نے زیادہ مطالعہ کرنے پر بھی پابندی لگائی ہوئی تھی اس لیے یہاں آنا نہیں ہو سکا۔" اس نے مختصراً اپنے نہ آنے کی وجہ بیان کی۔

"اوہو...... اب کیسی طبیعت ہے آپ کی؟" اس نے فکرمندی سے دریافت کیا۔

"بالکل ٹھیک ہوں جب ہی تو یہاں نظر آرہا ہوں۔ میرے ساتھ میرے یہ عزیز بھی آئے ہیں۔ انہیں بھی کتابیں پڑھنے کا بہت شوق ہے۔ آپ میری ضمانت پر انہیں کتب جاری کر سکتے ہیں۔ پہلے ذرا یہ گھوم پھر کر کتب خانے کا جائزہ لے لیں۔" اس نے اپنا حال بتانے کے ساتھ ہی اکبر کو لائبریرین سے متعارف کروایا۔

"کیوں نہیں۔ اس کتب خانے میں کتابوں کا اتنا شاندار ذخیرہ ہے کہ یہ حضرت یقیناً خوش ہو جائیں گے۔" لائبریرین نے خوش اخلاقی کا مظاہرہ کیا۔

"میں آج کے اخبارات دیکھتا ہوں تب تک تم کتابیں دیکھو۔"

فاروق نے اکبر سے کہا اور خود اس سیکشن کی طرف بڑھ گیا جو اخبارات کے لیے مختص تھا۔ اکبر نے بھی قدم بڑھائے اور شیلفس میں رکھی کتابوں کی طرف متوجہ ہو گیا۔

اب اسے بھی یہی لگ رہا تھا کہ اس کا اندازہ غلط تھا اور فاروق سچ مچ لائبریری کے لیے اڈے سے نکلا تھا۔ ایک اخبار سامنے کھول کر اس کی آڑ سے فاروق اس کا جائزہ لے رہا تھا۔ اکبر کتابیں دیکھتا ہوا ایک دیوقامت شیلف کے پیچھے گیا تو اسے موقع مل گیا۔ اس نے فوراً ہی ہاتھ سے اخبار رکھا اور وہاں سے نکل کھڑا ہوا۔ اس نے بے حد پھرتی کا مظاہرہ کیا تھا اور لائبریری سے نکلتے ہی ایک تانگے میں بیٹھ کر اسے آگے بڑھنے کا اشارہ کر دیا تھا۔ اکبر کو جھانسا دے کر نکلنے کے چکر میں اس کی توجہ بٹ گئی تھی اور اسے اندازہ نہیں ہو سکا تھا کہ وجے اور جانی بھی اس کے پیچھے ہیں۔ اکبر کو خود سے دور کرنے کے پیچھے اس کا صرف یہ مقصد تھا کہ وہ اس کی جنگ سے دور رہے۔ منو کو چندی گڑھ سے اپنے ساتھ لاتے ہوئے اس کے ذہن میں تھا کہ وہ اسے اپنے ساتھ رکھ کر وقتِ ضرورت اس کی مدد لے گا لیکن اسٹیشن پر جس طرح منو اور اکبر نے اس کی خاطر قربانی دینے کی کوشش کی تھی اس کے بعد اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ اپنے چاہنے والوں کو اپنی وجہ سے کسی مشکل میں نہیں ڈالے گا۔ اکبر سے جان چھڑا کر نکل جانے میں کامیاب ہو کر وہ خاصا مطمئن تھا۔ اپنے مطلوبہ ہوٹل کے سامنے پہنچ کر اس نے تانگا رکوایا اور نیچے اترا۔ اسی وقت بملا بھی اپنی گاڑی خود چلاتے ہوئے وہاں پہنچی۔

"آپ سے دوبارہ ملاقات ہونے پر بہت خوشی ہو رہی ہے۔" کتھئی رنگ کی ٹی شرٹ کے ساتھ سیاہ پتلون پہنے وہ بہت اسمارٹ لگ رہی تھی۔ بالوں کو اس نے پونی ٹیل کی شکل میں سنوارا ہوا تھا۔ اس ہیئر اسٹائل میں وہ کسی کالج گرل کی طرح کم عمر نظر آتی تھی۔ سلیقے سے کیے میک اپ نے اس کے تیکھے نقوش کو اور بھی جاذبِ نظر بنا دیا تھا اور لوگ اس کی طرف متوجہ ہو رہے تھے۔ فاروق نے اپنے دل میں چاند بانو سے اس کا موازنہ کیا۔ بملا خوب صورت دکھائی دے رہی تھی لیکن اتنا خوب صورت دکھائی دینے کے لیے اسے کافی جتن بھی کرنے پڑتے تھے جبکہ چاند بانو قدرت کی صناعی کا بے مثال نمونہ تھی جس کی سادگی میں بھی پرکاری کا نمونہ فاروق ملاحظہ کر چکا تھا۔ بے داغ حسن کی مالک چاند بانو کے حسن کو بملا کی حسد کی آگ نے گہن لگا دیا تھا اور یہ تو چاند بانو کی قسمت تھی کہ اس کی جان بچ گئی تھی ورنہ بملا نے تو اس کی زندگی کا چراغ گل کرنے ہی کی منصوبہ بندی کی تھی۔ خوب صورت و پرکشش بملا کا یہ مکروہ روپ دیکھ لینے والے فاروق کو اس کے خوب صورت

چہرے سے نفرت محسوس ہوئی لیکن وہ چہرے پر جبری مسکراہٹ سجا کر اس سے مخاطب ہوا اور بولا۔

"قسمت میں اپنی ملاقات طے تھی تو ملنا ہی تھا۔ آیئے اندر چلتے ہیں تاکہ آرام سے بات چیت کر سکیں۔"

"اوہ شیور۔" بملا نے مسکرا کر اس سے اتفاق کیا۔

فاروق اسے ساتھ لے کر ہال میں رکھی میزوں کے بجائے استقبالیہ کاؤنٹر کی طرف بڑھا اور کمرا نمبر بتا کر چابی طلب کی۔

بملا حیران لیکن خاموشی سے یہ سب دیکھتی رہی۔ چابی لے کر فاروق نے اوپری منزل کا رخ کیا اور بملا کے کچھ پوچھنے سے قبل خود ہی بتانے لگا۔

"میں آپ سے تنہائی میں ذرا اطمینان سے گفتگو کرنا چاہتا تھا اس لیے کمرے کی بکنگ کروالی۔ امید ہے آپ کو برا محسوس نہیں ہوا ہوگا۔"

"برا ماننے کی تو کوئی بات نہیں بس میں تھوڑی سی حیران ہوں۔" بملا نے مسکرا کر اسے جواب دیا۔ وہ ساتھ ساتھ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اوپری منزل کی طرف جارہے تھے۔

"اتنی چھوٹی سی بات پر حیران ہو کر کیا کیجیے گا۔ یہاں تو حیران ہونے کو بہت بڑی بڑی باتیں ہیں۔" فاروق ذومعنی لہجے میں بولا اور بملا سے چند قدم آگے نکل کر اپنے بک کروائے ہوئے کمرے کے دروازے کے سامنے پہنچ کر اس کے قفل میں چابی ڈال کر گھمائی۔ دروازہ کھول کر اس نے پہلے بملا کو اندر جانے کا موقع دیا پھر اس کے پیچھے خود بھی اندر داخل ہو کر دروازہ بند کرلیا۔

"مجھے کتنی شدت سے تم سے ملنے کی چاہ تھی۔ کاش میں تمہیں شبدوں (الفاظ) میں یہ بات بتا سکتی۔" فاروق دروازہ بند کر کے پلٹا نہیں تھا کہ بملا اس کی پشت سے آلگی اور مخمور لہجے میں بولی۔

"اچھا...... لیکن ملاقات کی کوئی کوشش تو نہیں کی تم نے۔ یہ تو میں نے تم سے رابطہ کیا ہے۔" فاروق نے بھی اس بار آپ جناب کا تکلف چھوڑ دیا اور غیر محسوس طور پر بملا کو خود سے الگ کیا۔ اب وہ کمرے میں رکھے صوفوں پر آبیٹھے تھے۔

"میرا بمبئی آنا تم سے ملنے کی کوشش نہیں تو اور کیا ہے۔ تمہارے خیال میں کیا میں اپنے پتا کے درشن کے لیے یہاں آئی ہوئی ہوں؟" بملا نے لگاوٹ سے بولتے ہوئے اپنی سریلی ہنسی بکھیری۔

"مجھ سے ملنا تھا لیکن مجھ سے رابطہ نہیں کیا۔ وہ تو خود میں نے ہی رابطہ کرلیا ورنہ تم تو شاید ملے بغیر ہی واپس چلی جاتیں۔" فاروق نے شکوہ کیا۔

"ایسا نہیں ہے بس میں تم سے کونٹیکٹ کرنے کی راہ ڈھونڈ رہی تھی۔ مجھے پتا چل گیا تھا کہ تم شملہ سے واپس بمبئی آچکے ہو اس لیے میں یہاں آئی ہوں لیکن میں ڈیڈ سے تو یہ فرمائش نہیں کرسکتی تھی کہ مجھے تم سے ملنا ہے۔ ان کے پاس میرے بھروسے کا ایک آدمی گنیش تھا جس سے میں ہر کام لے لیتی تھی لیکن یہاں آکر معلوم پڑا کہ گنیش کا مرڈر ہوگیا ہے۔ میں اس سوچ میں تھی کہ گنیش کی جگہ کس پر بھروسا کرسکتی ہوں کہ تم نے خود ہی کونٹیکٹ کرلیا۔" اس بار بملا نے بہت سنجیدگی سے وضاحت پیش کی۔

"گنیش کا مجھے بھی معلوم ہے۔ واقعی تمہارے ہاتھ سے ایک کام کا بندہ نکل گیا ہے۔" فاروق کا لہجہ اس بار بھی ذومعنی تھا لیکن بملا محسوس نہیں کرسکی اور شانے اچکا کر بولی۔

"سو تو ہے پر کوئی بات نہیں۔ اس کی جگہ کوئی اور مل جائے گا۔"

"تم بہت آسانی سے ایک انسان کی جگہ دوسرے کو دینے کے لیے تیار ہوجاتی ہو۔" فاروق کے لہجے میں طنز کی کاٹ کو بملا محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکی اور چونک کر بولی۔

"کیا مطلب؟ میں تمہاری اس بات کا مطلب نہیں سمجھ سکی۔"

"میں تمہارے سابقہ شوہر کی بات کر رہا ہوں۔ تم نے اپنے پتا کے خلاف جا کر اس سے شادی کی تھی لیکن اب ایسا لگتا ہے کہ تمہیں اسے کھونے کا کوئی دکھ ہی نہیں ہے اور تم اس کا خلا پُر کرنے کے لیے بے چین ہو۔" فاروق گفتگو کو اس نہج پر لے آیا جہاں سے اسے بملا کی پکڑ کرنی تھی۔

"وہ شخص میرے پریم کے قابل تھا ہی نہیں۔ بس میں اس کی چالاکی سے دھوکا کھا گئی تھی۔" بملا نے لب بھینچتے ہوئے جواب دیا تو اس بار فاروق چونک گیا۔

"کیا مطلب...... کیسا دھوکا؟ جہاں تک مجھے معلوم ہے اسے تو سیٹھ صاحب کی دولت سے بھی کوئی غرض نہیں تھی اور اس نے تمہارے پتا کے تمہیں عاق کردینے کے اعلان کے باوجود تمہیں اپنایا تھا اور تم سے اپنا رشتہ نبھا رہا تھا۔"

"سب کو یہی دکھائی دیتا ہے، خود مجھے بھی ایسا ہی لگا تھا لیکن بعد میں جانا کہ اصل میں اس نے لانگ ٹرم پلاننگ کی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ کبھی نہ کبھی ڈیڈ مجھ سے اپنی ناراضگی ختم کرلیں گے اور انہیں یہ وشواس بھی ہوجائے گا کہ اس نے مجھ سے دولت کے لالچ میں بیاہ نہیں کیا ہے تو پھر وہ

اپنے اکلوتے بھائی کو سویکار (قبول) کرلیں گے اور میرے اپنے ڈیڈی کی اکلوتی بیٹی ہونے کی وجہ سے سب کچھ اس کا ہو جائے گا لیکن اس کی بیڈ لک کہ مجھے اس کی اس پلاننگ کا پتا چل گیا۔"

"اور پھر تم نے اسے اس کے کیے کی سزا دینے کے لیے گنیش کے ہاتھوں قتل کروا دیا۔" بملا کی کہانی کا آخری جملہ فاروق نے ادا کیا تو حیرت کی زیادتی سے اس کی آنکھیں پھٹ گئیں۔

"تت...... تم...... یہ کیسے کہہ سکتے ہو؟" اس نے وحشت زدہ سے لہجے میں پوچھا۔

"مرنے سے پہلے گنیش نے خود میرے سامنے اس حقیقت کا اعتراف کیا تھا۔" فاروق نے نہایت اطمینان سے اسے بتایا تو وہ اپنی جگہ بیٹھی نہ رہ سکی۔

"یہ...... یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ مرنے سے پہلے تم گنیش سے کہاں ملے تھے......؟" وہ ناقابلِ یقین نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"ریلوے اسٹیشن کے اسی باتھ روم میں جہاں سے اس کی لاش ملی ہے۔ اس اعتراف کے علاوہ اس نے میرے سامنے یہ بھی قبول کیا تھا کہ اس نے تمہارے کہنے پر ہی چاند بانو کی گاڑی کو حادثے کا نشانہ بنایا تھا۔ تم چاند بانو کو قتل کروانا چاہتی تھیں لیکن قسمت سے وہ بچ گئی اور اس کی ماں ماری گئی لیکن پھر بھی اس کا کم نقصان نہیں ہوا ہے۔ اس کے حسن کو داغ لگ گیا ہے اور اس حادثے کے بعد وہ کبھی فلمی ہیروئن نہیں بن سکتی۔ تمہاری وجہ سے اس کا کیریئر شروع ہونے سے پہلے ہی ختم ہو گیا ہے۔" فاروق اس کی حیرت اور خوف کو خاطر میں لائے بغیر بولتا چلا جا رہا تھا۔ اس کے ایک ایک جملے کے ساتھ ساتھ بملا کا چہرہ کئی رنگ بدل رہا تھا۔

"واٹ ربش؟ میں اس ساری بکواس کو نہیں مانتی۔ شاید تم میرے ساتھ جوک کر رہے ہو۔" بملا نے خود کو سنبھال کر چہرے پر پھیکی سی مسکراہٹ سجانے کی کوشش کی۔

"بالکل نہیں۔ میں تو تمہاری اور گنیش کی اس ملاقات کا بھی گواہ ہوں جو تم نے شملہ کے جنگل میں اس سے کی تھی۔ اس ملاقات میں ہی تم نے اسے چاند بانو کو مارنے کا حکم دیا تھا لیکن افسوس اس روز میں تم دونوں کی پوری گفتگو نہیں سن سکا تھا اور نہ ہی مجھے اندازہ ہوا تھا کہ تم چاند بانو کے خلاف اس حد تک جا سکتی ہو ورنہ میں پہلے ہی تمہاری روک تھام کے لیے کوئی قدم اٹھا لیتا اور وہ بے چاری اتنے بڑے نقصان سے بچ جاتی۔" فاروق کی آنکھوں میں اب بملا کے لیے نفرت کی چنگاریاں تھیں جنہیں محسوس کر کے اس نے ایک ہذیانی قہقہہ لگایا اور بولی۔

"میں بملا بھاٹیہ ہوں۔ میرا مقابلہ کوئی نہیں کر سکتا۔ وہ طوائف زادی میرے اور تمہارے بیچ آنے کی کوشش کر رہی تھی اس لیے اس کا یہی انجام ہونا تھا۔ کیا تم اسے مجھ پر اہمیت دے سکتے ہو؟ بھول جاؤ اس کے قصے کو اور یہ یاد رکھو کہ بملا بھاٹیہ تم سے محبت کرتی ہے جو چاند بانو کی طرح بمبئی کے کسی غلیظ بازار کے کوٹھے پر نہیں بلکہ بھاٹیہ سیٹھ کے محل میں رہتی ہے۔ تم میرے بن جاؤ، میں تمہیں بمبئی کی گندی گلیوں سے اٹھا کر اپنے ساتھ اپنے محل میں لے جاؤں گی۔" اپنی بات کہہ کر وہ فاروق کے ساتھ کسی جونک کی طرح چمٹ گئی۔

"میں لعنت بھیجتا ہوں تمہارے محل پر۔ میں حق کی خاطر محلوں کو ٹھوکر میں رکھنے والا آدمی ہوں۔ تم مجھے ایسے کسی لالچ میں نہیں پھنسا سکتیں۔" تنفر سے کہتے ہوئے فاروق نے اسے خود سے دور دھکیلا۔

"اگر تم نے میری بات نہ مانی تو میں شور مچا دوں گی کہ تم دھوکے سے مجھے یہاں بلا کر میری عزت پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کر رہے ہو۔ میں یہ بھی بتا سکتی ہوں کہ پولیس گنیش کے جس خونی کو ڈھونڈ رہی ہے، وہ تم ہی ہو۔" وہ فاروق کے دھکا دینے سے فرش پر گر گئی تھی لیکن اس نے فوراً ہی خود کو سنبھال لیا اور فرش سے اٹھتے ہوئے اسے دھمکی دی۔ ان لمحات میں وہ بالکل بدل گئی تھی اور کہیں سے بھی خوب صورت دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ اس وقت تو وہ بس بل کھاتی ہوئی ایک سیاہ ناگن تھی جو فاروق کو ڈسنے کے لیے تیار تھی۔

"تم تو مجھ سے محبت کی دعوے دار تھیں۔ اتنی جلدی اپنا دعویٰ بھول کر دشمنی پر اتر آئیں۔" فاروق نے استہزائیہ لہجے میں اس سے کہا۔

"تم میرے نہ بن سکے تو میرے لیے بے کار ہو اور بے کار چیزوں کے ساتھ جو برتاؤ کیا جاتا ہے، وہی میں تمہارے ساتھ بھی کروں گی۔" اس نے طراری سے جواب دیا تو فاروق ہنس دیا اور بولا۔

"سوچ کے اسی فرق کی وجہ سے چاند بانو طوائف زادی ہو کر بھی تم سے بلند ہے۔ وہ محبت کو پانے نہیں بلکہ چاہنے اور چاہتے رہنے کی قائل ہے۔ اس کی مجھ سے محبت اتنی بے لوث ہے کہ وہ اپنی محبت کے جواب میں مجھ سے کچھ بھی طلب نہیں کرتی۔ تمہارے نزدیک میں وہ کھلونا ہوں جو نہ ملنے پر تم توڑ کر سکون چاہتی ہو اور وہ بس یہ خواہش رکھتی

ہے کہ میں جہاں بھی رہوں، خوش اور سکھی رہوں۔ تم جو ایک طوائف زادی سے بھی بہت پست ہو، میں تمہارا ساتھ کیسے قبول کرسکتا ہوں مس بملا بھاٹیہ......" بملا کے نام کو چبا چبا کر ادا کرتے ہوئے فاروق کے لہجے میں جو تنفر تھا، اس نے بملا کو سلگا کر رکھ دیا اور اس نے قریب رکھی ایک ایش ٹرے اٹھا کر فاروق کو دے ماری۔ فاروق پھرتی سے جھکائی نہ دے گیا ہوتا تو شیشے کی بھاری ایش ٹرے اس کا سر پھاڑ ڈالتی۔ اپنا وار خالی جاتا دیکھ کر بملا چیل کی طرح اس کی طرف جھپٹی اور اپنے لمبے ناخنوں سے اس کا منہ نوچنے کی کوشش کی۔ اس کی یہ کوشش بھلا فاروق کے آگے کیا حیثیت رکھتی تھی۔ اس نے ایک ہاتھ سے بملا کو پرے دھکیلا اور دوسرے سے اس کی پونی ٹیل کو جکڑ لیا۔ گرفت اتنی مضبوط تھی کہ بملا کے ہونٹوں سے چیخ نکل گئی لیکن چیخ کے بلند ہونے سے قبل ہی فاروق نے اس کے ہونٹوں پر اپنا ہاتھ جما دیا۔ بملا اس کی گرفت میں پھڑپھڑانے لگی۔

"تم خود کو بہت اونچی شے سمجھتی ہونا۔ تمہیں لگتا ہے کہ تم ساری دنیا کو اپنی انگلی کے اشارے پر نچا سکتی ہو لیکن آج کے بعد تم کسی کو اپنی یہ خوب صورت شکل دکھانے کے لائق نہیں رہو گی۔ تم نے چاند بانو سے اس کا خوب صورت چہرہ چھینا ہے اس لیے تمہیں بھی خوب صورت چہرے کے ساتھ جینے کا حق حاصل نہیں۔ میں اپنے چاقو سے تمہارے چہرے پر اتنے نقش ونگار بناؤں گا کہ تم اپنی اصل صورت بھول جاؤ گی۔"

اس نے بملا پر اپنے ارادے کو ظاہر کیا اور اسے دھکیلتا ہوا بستر تک لے گیا۔ بملا نے مزاحمت کی کوشش کی لیکن فاروق کے سامنے بملا اس کی کوشش کیا رنگ لاتی۔ ایک منٹ کے اندر اندر فاروق نے تکیے کا غلاف کھینچ کر اتارا اور اسے بملا کے منہ میں ٹھونس دیا۔ وہ ہاتھ پاؤں پٹخ کر احتجاج کرتی رہی لیکن فاروق اسے خاطر میں نہیں لایا اور اپنی جیب سے چاقو نکال کر اس کے چہرے کے سامنے لہرایا۔ چمکدار پھل والے چاقو کو دیکھ کر بملا کی آنکھیں خوف سے پھٹ گئیں۔ شاید اسے پہلی بار یقین آیا کہ فاروق جو کچھ کہہ رہا ہے، اس پر عمل کرنے کا بھی ارادہ رکھتا ہے۔ خود کو بچانے کے لیے وہ چھلانگ مار کر بستر سے نیچے اتری۔ فاروق نے اسے روکنے کی کوشش نہیں کی البتہ بملا کے دروازے کی طرف جانے کے راستے میں مزاحم ہوگیا۔ بملا کا حال کسی بند کمرے میں پھنس جانے والی بلی کا سا تھا۔ دروازے کی طرف سے مایوس ہوکر وہ پیچھے مڑ کر کھڑکی کی طرف بھاگی اور اس کے پٹ کھولے۔ فاروق اطمینان سے اپنی جگہ کھڑا رہا۔ اسے معلوم تھا کہ اوپری منزل کی کھڑکی سے بملا نیچے نہیں جاسکتی۔ یہی ہوا۔ بملا نے کھڑکی تو کھول لی لیکن نیچے کودنے کی ہمت نہیں کرسکی۔ فاروق اس کی.... بےبسی پر مسکرایا اور آہستہ روی سے اس کی طرف قدم بڑھانے لگا۔ ہاتھ میں کھلا چاقو لیے فاروق کو اپنی طرف بڑھتا دیکھ کر بملا کی سٹی گم ہوگئی اور وہ اپنی ساری اکڑ بھول کر اس کے سامنے ہاتھ جوڑنے لگی۔

"تم جیسی عورت رحم کی بھیک مانگتی اچھی نہیں لگتی بملا۔ ذرا اپنے ظلم کے بارے میں سوچو۔ اپنے حسد کی آگ میں تم نے بےقصور چاند بانو کے ساتھ کیا کیا۔ وہ بےچاری تو سوچ بھی نہیں سکی ہوگی کہ تم اپنی رقابت میں اس حد تک بھی جاسکتی ہو۔ دولت کے نشے میں تم نے خود کو خدا سمجھ لیا تھا۔ اب اپنی اس طاقت کو استعمال کرو اور خود کو مجھ سے بچا کر دکھاؤ۔" بولتے بولتے فاروق کا لہجہ بے حد خوف ناک ہوگیا۔ اس نے اپنا چاقو والا ہاتھ بلند کیا اور ایک جھٹکے سے بملا کے چہرے کی طرف لایا۔ بملا کے منہ میں کپڑا نہ ٹھنسا ہوا ہوتا تو یقیناً وہ بہت زوردار چیخ مارتی۔ فی الوقت اس کی آنکھیں دہشت سے پھٹ گئیں اور اگلے ہی لمحے وہ تیورا کر گرگئی۔ فاروق جو اپنے چاقو کو اس کے چہرے سے ایک ڈیڑھ انچ کے فاصلے پر روک چکا تھا، اس کی یہ حالت دیکھ کر استہزائیہ انداز میں مسکرایا پھر چاقو بند کر کے واپس جیب میں رکھنے کے بعد نیچے گری بملا کو اٹھا کر بستر پر ڈالا۔ گرنے سے اس کی پیشانی پر چوٹ لگی تھی اور اچھا خاصا گومڑا ابھر آیا تھا۔ فاروق نے سرہانے کی میز پر رکھے جگ میں سے تھوڑا سا پانی اس کے منہ پر چھڑکا تو وہ کسمسا کر ہوش میں آگئی اور ہوش میں آتے ہی اپنے چہرے کو ٹٹولنے لگی۔

"کچھ نہیں ہوا تمہارے چہرے کو۔ کاش میں تمہارے جتنا ظالم اور بے رحم ہوتا تو تم سے چاند بانو کے ساتھ کی گئی زیادتی کا بدلہ لے پاتا۔ تم جاؤ اور جاکر اپنے غرور و تکبر کے ساتھ جیتی رہو پر یاد رکھنا کہ دولت سے سب کچھ نہیں خریدا جاسکتا۔ دولت لوگوں کو تمہارا غلام تو بنا سکتی ہے لیکن تمہیں کسی کا دل جیت کر نہیں دے سکتی۔ تم نے اپنی دولت اور اختیار کے زعم میں چاند بانو کے ساتھ وہ سب نہ کیا ہوتا تو میں آج بھی تمہارا دوست ہوتا۔ اب تو تم سے کچھ دن کے تعلق پر افسوس ہوتا ہے۔" زہر آلود لہجے میں بملا سے یہ سب کہتے ہوئے اس نے بملا کے منہ میں ٹھونسا گیا کپڑا نکالا اور خود اس کی طرف سے منہ پھیر کر کھڑا ہوگیا۔ بملا بستر سے نیچے اتری اور اس کی پشت پر آکھڑی ہوئی۔ اس کے

کپکپاتے لبوں کو دیکھ کر یوں لگتا تھا جیسے وہ کچھ کہنے کی خواہش مند ہو لیکن پھر وہ کچھ نہیں بولی اور پلٹ کر تیزی سے باہر نکل گئی۔ اس کے جاتے ہی فاروق ایک کرسی پر سر تھام کر بیٹھ گیا۔ اس وقت اس کے تصور میں چاند بانو کا چہرہ تھا۔

''مجھے معاف کر دینا چاند بانو! میں چاہ کر بھی تمہاری مجرم کو سزا نہیں دے سکا۔'' وہ تصور میں ہی اس سے مخاطب ہوا۔ اسی وقت کمرے کے دروازے پر دستک کی آواز ابھری اور پھر دروازہ آہستہ سے کھلا۔ کھلے دروازے سے وجے اور جانی اندر داخل ہوئے۔

''آپ ٹھیک ہو فاروق بھائی۔'' جانی دروازے کے پاس ہی رک گیا اور وجے نے اس کے قریب آ کر اس سے اس کا حال دریافت کیا۔

''دادا نے تم دونوں کو میری جاسوسی کے لیے بھیجا ہے؟'' فاروق اپنا حال بتانے کے بجائے اس سے مستفسر ہوا۔

''دادا کو آپ سے محبت ہے اس لیے آپ کی فکر کرتا ہے۔'' وجے نے نرمی سے اسے جواب دیا۔

''عجب زندگی ہے میری...... اتنے چاہنے والے ہیں پھر بھی سکون نہیں ملتا۔'' وہ قنوطیت سے بڑبڑایا۔

''چلیں اڈے واپس چلتے ہیں۔'' وجے اس کی بڑبڑاہٹ کا کیا جواب دیتا۔ اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر نرمی سے اسے اٹھانے کی کوشش کی۔ فاروق بھی بغیر مزاحمت کے کھڑا ہو گیا۔ وہ تینوں آگے پیچھے چلتے ہوئے نچلی منزل پر پہنچے۔ فاروق نے استقبالیہ پر کمرے کی چابی واپس کی۔ بل وہ پیشگی ادا کر چکا تھا۔ باہر وجے اور جانی نے ایک تانگا روک رکھا تھا۔ تینوں تانگے میں سوار ہو کر اڈے واپس پہنچ گئے۔ اکبر دروازے کے باہر ہی بے چینی سے ٹہل رہا تھا۔ فاروق کی شکل دیکھی تو لپک کر اس کے قریب پہنچا۔

''آپ مجھے لائبریری میں چھوڑ کر کہاں چلے گئے تھے فاروق بھائی؟'' اس نے بے قراری سے فاروق کے گلے لگتے ہوئے اس سے استفسار کیا۔

''ذرا کام سے گیا تھا۔'' اس نے اکبر کی پیٹھ تھپکتے ہوئے مختصر جواب دیا۔

''سب ٹھیک تو ہے نا؟'' اکبر نے اس کا بجھا ہوا انداز دیکھ کر تشویش سے پوچھا۔

فاروق زبان سے کچھ نہیں بولا البتہ جانی نے ہولے سے اکبر کا ہاتھ دبا کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور پھر وہ سب اندر پہنچ گئے۔ فاروق نے اندر پہنچتے ہی سیڑھیوں کا رخ کیا اور اپنے کمرے میں جا کر بستر پر دراز ہو گیا۔

اچھا اور برا

''خالہ جان سنائیں، آپ کا بیٹا کیسا ہے؟''

''بیٹے! اس کا نام نہ لو، وہ بہت برا نکلا۔''

''کیوں خالہ، کیا ہوا؟''

''کچھ نہ پوچھو بیٹا...... جو کماتا ہے، بیوی کو ہی دے دیتا ہے۔''

''اور خالہ جان آپ کا داماد؟''

''ارے بیٹا خدا اسے زندگی دے، بہت ہی اچھا ہے۔ وہ یکم کو تنخواہ لا کر ساری کی ساری میری بیٹی کے ہاتھ میں دے دیتا ہے۔''

مرسلہ۔ وزیر محمد خان، بٹل ہزارہ

پالش

ایک دفعہ ایک امریکی صدر اپنے جوتے پالش کر رہے تھے۔ ایک معزز آدمی ان سے ملاقات کے لیے آئے اور حیرت سے پوچھا۔ ''مسٹر صدر! آپ اپنے جوتے پالش کر رہے ہیں؟''

صدر نے برجستہ جواب دیا۔ ''تو آپ کس کے جوتے پالش کرتے ہیں۔''

مرسلہ۔ وزیر محمد خان، بٹل ہزارہ

''میں کیسا ناکام آدمی ہوں اور کیسی سیاہ نصیبی ہے میری کہ جس سے جڑ جاؤں، اس کا بھی نقصان کر ڈالتا ہوں۔ جولیٹ کو چاہا تو وہ دربدر ہو گئی، چاند بانو مجھے چاہ کر برباد ہو گئی اور اب بھی جانے کس کس کے ساتھ کیا کیا ہونا ہے۔'' یہ اعصابی دباؤ تھا جو وہ اس انداز میں سوچ رہا تھا ورنہ وہ ایسی قنوطی سوچ رکھنے والا آدمی نہیں تھا۔ اسے ایسا لگ رہا تھا کہ اس کے شانوں پر اپنے ہر پیارے کی محبتوں کا قرض بڑھتا جا رہا ہے اور وہ کسی ایک کا قرض بھی ادا کرنے کا اہل نہیں ہے۔ اپنی ان گنجلک سوچوں میں اسے معلوم بھی نہیں ہوا کہ کب ربن اس کے کمرے میں چلا آیا اور آ کر اس کے سرہانے بیٹھ گیا۔ ربن نے اس کے سر پر اپنا ہاتھ پھیرا تو اسے اس کی موجودگی کا احساس ہوا۔

''دادا تم...... مجھے بلوا لیا ہوتا۔'' وہ فوراً اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ربن اس سے جتنی محبت کرتا تھا، وہ بھی اس کا اتنا ہی احترام کرتا تھا۔

''تو آئے یا اپن، کیا فرق پڑتا ہے۔ فرق تو بس

اس سے پڑتا ہے کہ تو کیسا ہے اور تیرے من کا کیا حال ہے۔" ربن کے لہجے میں محبت گھلی ہوئی تھی۔ عموماً وہ ذرا اکھڑ لہجے میں گفتگو کرتا تھا لیکن اس وقت اس کا لہجہ ریشم کی طرح نرم تھا۔

"میں ٹھیک ہوں دادا۔ میری اتنی فکر مت کرو۔" فاروق نے اسے تسلی دینے کی کوشش کی۔

"اور اپن تجھ سے کہتا ہے کہ اپنی جان پر اتنا بوجھ مت ڈال۔ اپن جانتا ہے کہ تو کتنا نازک مزاج ہے۔ اتنا بوجھ تیری جان سے اٹھایا نہیں جائے گا۔" وجے اور جانی نے اسے سارا احوال سنا ڈالا تھا۔ جو کچھ وہ نہیں جان سکے تھے، وہ ربن نے اپنی بصیرت سے خود سمجھ لیا تھا اسی لیے اسے حوصلہ دینے اس کے پاس چلا آیا تھا۔

"اب کونسا بوجھ رہ گیا ہے جو مجھ سے نہیں اٹھایا جائے گا۔ سارے ہی بوجھ تو اٹھا رہا ہوں میں۔" اس کے لہجے میں تھکن ہی تھکن تھی۔

"قسمت کے دیے بوجھ تو سب کو ہی اٹھانے ہوتے ہیں۔ اپن تو ان بوجھوں کی بات کر رہا ہے جو تو خود اپنی جان پر ڈالنے چلا ہے۔ دیکھ میرے شہزادے! اپن جانتا ہے تو اور مزاج کا آدمی ہے۔ بدلہ، انتقام، قتل وغارت تیری لائن نہیں ہے۔ تیرے کو جس جس سے حساب کتاب کرنا ہے، اپنے کو اس کا نام بول۔ اپن سب نمٹا دے گا۔ تو کاہے کو ان سارے چکروں میں پڑتا ہے۔ دیکھ جانی......! ان سب کاموں کا بوجھ بہت بھاری ہوتا ہے، تو اس بوجھ تلے دب کر رہ جائے گا۔ تیرے لیے اچھا ہے کہ اپنی ساری توانائی جولیٹ کی تلاش کے لیے بچا رکھ۔ اس مظلوم لڑکی کو تیری ضرورت ہے۔ تو اسے ڈھونڈ اور سہارا دے، اس کام کے لیے اپن تیرے کو نہیں روکتا پر باقی سارے حساب کتاب اپنے لیے چھوڑ دے۔ اپن ہے نا سب دیکھنے کو پھر کیوں تو اتنا کشٹ اٹھاتا ہے۔" ربن بہت پیار سے اسے سمجھا رہا تھا۔

"پر کیوں......؟ تم کیوں اٹھاؤ گے سارے بوجھ؟ تم نے کیا سب کا ٹھیکا لے رکھا ہے؟" فاروق جھنجلایا۔

"کسی اور کا لیا ہو یا نہ لیا ہو، تیرا اور گولو کا ٹھیکا اپن نے اٹھا رکھا ہے۔ تم دونوں اپنے کو کتنے پیارے ہو، اپن زبان سے نہیں بولتا پر سمجھ تو آتا ہے نا......" ربن کے دعوے سے انکار نہیں کیا جا سکتا تھا۔ واقعی وہ دونوں اس کے ایسے ہی لاڈلے تھے۔

"تم دونوں کو اپن ایسے ہی چاہتا ہے جیسے آدمی اپنے آپ کو چاہے۔ تم دونوں اپنے کو اپنی ہی پرچھائیں دکھائی پڑتے ہو۔ اپنے کو خبر ہے ان سارے عذابوں کی جو تم دونوں نے سہے کہ اپن خود بھی ایسے ہی عذاب سہہ کر رب نواز سے ربن دادا بنا ہے۔" وہ جیسے کہیں کسی دوسری دنیا میں پہنچا ہوا تھا اور زندگی میں پہلی بار کسی کے سامنے خود پر بیتی سنا رہا تھا۔

"اپن کسی چوڑی چمار کے گھر پیدا نہیں ہوا تھا۔ اپن کا باپ بڑا زمیندار تھا۔ پورے گاؤں میں اپن کے خاندان کی بڑی عزت تھی۔ اوپر والے نے اپنی ماں کو دل بھی بہت بڑا دیا تھا۔ ہر ضرورت مند کو دل کھول کر دیتی تھی۔ نماز روزے کی بھی بڑی پابند تھی۔ اب اپن اسے سوچتا ہے تو خیال آتا ہے کہ اوپر والے نے اسے تھوڑی زندگی دی تھی اس لیے وہ آپ ہی آپ جلدی جلدی اپنے اعمال نامے میں نیکیاں جمع کرتی رہتی تھی۔ مجھے اور میری چھوٹی بہن بانو کو بھی اچھی اچھی باتیں سکھاتی تھی۔ اپن سالا اس زمانے میں دنیا کا سب سے خوش قسمت انسان تھا لیکن پھر اپنی دنیا ہی بدل گئی۔ ماں اپنے تیسرے بچے کو جنم دیتے ہوئے اس سمیت اپنی جان سے چلی گئی۔ باپ نے تین مہینے اپنی وفادار بیوی کے مرنے کا غم منایا پھر بچوں کو ماں دینے کے بہانے اپنے لیے نئی نویلی دلہن لے آیا۔ نئی بیوی زیادہ خوب صورت اور جوان تھی۔ اس نے باپ کی ساری باگیں اپنے ہاتھ میں لے لیں اور وہ ہم دونوں بہن بھائی کو ایسا بھولا کہ جیسے ہم بھی تھے ہی نہیں۔ نئی بیوی سے اسے نئے بچے بھی مل گئے تھے اور ہم پہلی بیوی کے بچے اس کی دوسری بیوی کے رحم وکرم پر تھے۔ اپن چھوٹا تھا لیکن مرد بچہ تھا اس لیے سوتیلی ماں کی ساری سختیاں بھی سہہ گیا لیکن چھوٹی بانو بڑی نازک تھی۔ وہ بیمار رہنے لگی۔ بیمار بچی کے واسطے نہ کوئی دوا تھی اور نہ ہی کوئی تیماردار۔ وہ کہاں تک کمزور اور بے اختیار بھائی کے سہارے زندگی سے چمٹی رہتی۔ ایک دن چپکے سے ماں کے پاس چلی گئی۔ اپن اس دن بہت رویا۔ باپ بھی تھوڑا دکھی دکھائی دیا پر دوسرے بچوں میں کھو کر اس کا دکھ جلد ہی مٹ گیا۔ اپنے پاس ایسا کوئی بہلاوا نہیں تھا اس واسطے بہن کا غم جان کے ساتھ لگا رہا۔ اس غم نے دل کو غصے اور انتقام کے جذبوں سے آشنا کیا اور اپن نے سوچ لیا کہ اپنی سوتیلی ماں سے اس کے کیے کا بدلہ ضرور لینا ہے۔ اسے بھی ویسے ہی تڑپانا ہے جیسے اپنا دل اپنی بہن کے لیے تڑپ رہا ہے۔ بدلے کے جوش میں اپن ایک روز اپنی سوتیلی بہن کو اٹھا کر ندی پر لے گیا۔ دل میں خیال تھا کہ اسے ندی میں بہا دوں گا پر ندی پر پہنچ کر اس کی معصوم صورت پر نظر پڑی تو دل

تڑپ گیا۔ ایسی پیاری صورت کی بچی کو ندی کے بے رحم پانی میں ڈالنے کا حوصلہ نہ ہو سکا۔ اسے واپس گھر لے جا کر چھوڑا اور خود گھر چھوڑ کر نکل گیا۔ گھر سے نکلا تو پتا چلا کہ ایک بے سہارا بچے کے لیے ساری دنیا ہی سوتیلی ماں ہوتی ہے۔ اپن دنیا کے تھپیڑے سہتے سہتے کیسے رب نواز سے ربن دادا بنا، اپنا دل ہی جانتا ہے پر اتنا سب سہہ کر بھی اپنے دل میں کبھی باپ کے گھر لوٹ کر جانے کا خیال نہیں آیا۔ آ ہی نہیں سکتا تھا کہ دل دماغ میں ہمیشہ مرنے والی اور سوتیلی بہن کی صورتیں بسی رہیں۔ مرنے والی بہن کی صورت کہتی کہ اس کی ناحق موت کا بدلہ لوں پر سوتیلی بہن کی صورت روک بن جاتی۔ اپن انتقام کی کوئی بھی صورت اختیار کرتا، اس معصوم کا نقصان ضرور ہوتا اس لیے اپن سارا انصاف اور حساب کتاب اوپر والے پر چھوڑ کر اپنی اس زندگی میں مگن ہو گیا ہے۔ خاندان، حویلی، گاؤں سب بھول بھال گیا ہے اور اب اپن بس اس بمبئی کا ہی باسی ہے۔ تم لوگ اپن کا پریوار ہے۔ اپنا ہنسنا رونا، جینا مرنا سب تم لوگوں کے ساتھ ہے۔"

مختصراً اپنی داستانِ حیات سناتے ہوئے اس نے واضح کر دیا تھا کہ گولو اور فاروق کے حالات سے مماثلت کی وجہ سے وہ ان سے زیادہ قلبی لگاؤ محسوس کرتا ہے۔ فاروق کی طرح اس نے اپنی مرضی سے اپنا گھر چھوڑا تھا اور دربدری کے عذاب سے گزرا تھا۔ دوسری طرف اس نے گولو کی طرح سوتیلی ماں کے مظالم بھی سہے تھے۔ وہ اپنی داستان سنا کر خاموشی سے سر جھکا کر بیٹھ گیا۔ اس پل فاروق کو اس میں وہی کم سن بچہ دکھائی دیا جو حالات کے جبر کے تحت اپنا گھر چھوڑنے کے بعد زمانے کے رحم و کرم پر آ گیا تھا۔ محبت فاروق نے ہمیشہ ہی اس سے محسوس کی تھی لیکن اس وقت کچھ اور ہی طرح سے اس پر پیار آیا۔ اسے لگا کہ ربن کے بجائے وہ خود عمر میں بڑا ہے اور اسے کم سن ربن کو سہارا دینا ہے۔ بے ساختہ ہی اس نے اپنی بانہیں وا کر کے ربن کے وجود کو اپنی آغوش میں لے لیا اور بھینچ بھینچ کر اسے پیار کرنے لگا۔ ربن بھی میلے میں باپ سے بچھڑ کر ملنے والے بچے کی طرح اس کی بانہوں میں سمٹا رہا۔ آدمی تھا، پتھر نہیں کہ کبھی جذباتی ہی نہ ہوتا۔ دل پگھلا تو آنکھوں سے آنسو بھی ٹپک پڑے۔

"تم نے ہمیں اپنا خاندان سمجھا ہے دادا تو یاد رکھنا ہم بھی تمہیں اس خاندان کا سربراہ ہی مانتے ہیں۔ ہمارا جینا مرنا بھی تمہارے ساتھ ہی ہے اور تم اداس ہو، مجھ سمیت ہم میں سے کوئی بھی برداشت نہیں کر سکتا۔" اس کے آنسوؤں کو اپنی انگلیوں سے صاف کرتا فاروق اس کے لیے اپنے جذبات کا اظہار کرتا رہا۔

"تم میرے لیے کوئی عام آدمی نہیں ہو۔ تمہاری ذات میں، میں نے بیک وقت باپ اور بڑے بھائی کا پیار پایا ہے۔ میں تم سے نخرے کرتا ہوں تو اس لیے کہ مجھے معلوم ہے تم میرے سارے ناز اٹھاؤ گے۔ میں بھی تمہیں چھوڑ کر کہیں نہیں جانا چاہتا۔ مجبوری میں کہیں جاؤں گا بھی تو لوٹ کر تمہارے پاس ضرور آؤں گا۔" وہ جیسے ربن سے عہد و پیمان کر رہا تھا، خود اس کی آنکھوں سے بھی آنسو جاری ہو گئے تھے۔ ربن نے اس کے آنسو دیکھے تو خود فوراً سنبھل گیا اور اس کی پیٹھ پر ایک زوردار تھپکی دیتے ہوئے اس سے الگ ہو گیا۔

"اب بس کر دے رے، بے کار میں مجھے بھی رلا دیا۔" کچھ دیر پہلے کی کیفیت سے نکل کر اب وہ اسی دبنگ لہجے میں فاروق سے مخاطب تھا۔ اس کے انداز پر فاروق ہنس پڑا۔ "بس تو ایسے ہی ہنستا رہا کر۔ فکریں پریشانیاں سب اپنے لیے چھوڑ دے۔" ربن نے اسے محبت بھری نگاہوں سے دیکھا۔

"جیسا تم چاہو پر جولیٹ کی تلاش میں جانے کی اجازت تو دو گے نا؟"

"وہ تو اپن خود تجھ سے بولا ہے کہ تو جا اور اسے ڈھونڈ۔ اپنے کو بھی اس کی فکر ہے۔ ادھر محلے میں بھی کسی کو خبر نہیں کہ وہ کدھر گئی ہوگی۔ ادھر سب پرانے رہنے والے ہیں اور یہی بولتے ہیں کہ حیدرآباد یا اس کے دور نزدیک کیا ذکر...... انہوں نے تو بمبئی میں بھی جوزف کے خاندان کے کسی فرد کو نہیں دیکھا۔ جوزف اور جوزفین سالوں سے ادھر رہ رہے تھے لیکن اتنے برسوں میں نہ تو کوئی رشتے دار ان کے گھر آیا اور نہ ہی وہ خود کہیں گئے۔ ان دونوں نے محلے والوں کو بتایا بھی یہی تھا کہ وہ اپنے اپنے ماں باپ کی اکلوتی اولاد تھے اس لیے ان کے بعد اب دنیا میں تنہا ہیں۔"

"شاید انہوں نے اپنے بارے میں سچائی چھپائی تھی ورنہ آدمی کے قریبی نہ سہی، دور کے رشتے دار تو ہوتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ وہ لوگ ساری دنیا سے چھپ کر یہاں بیٹھے تھے۔" فاروق نے ربن کی بات پر تبصرہ کیا۔

"شاید ایسا ہو پر ابھی اپن کو لگتا ہے کہ جولیٹ کے حیدرآباد جانے میں کوئی راز ہے۔ اپن تیرے کو پہلے بولے نہیں پر ایک بات اپنے دماغ میں کھٹک رہی ہے۔" ربن کا انداز پرسوچ ہو گیا۔

"کیا بات دادا۔ جلدی سے بتاؤ۔" فاروق بے تاب ہوا۔

"ایک بار اپن جولیٹ سے ملنے کے واسطے گیا تھا تو اپن نے اس کے گلے میں ایک لاکٹ دیکھا تھا۔ اپن کی نظروں نے اسی وقت بھانپ لیا تھا کہ اس لاکٹ میں ہیرے جڑے ہوئے ہیں۔ اپن حیران بھی ہوا تھا کہ اس گلی میں رہنے والی جولیٹ کے پاس ایسا قیمتی لاکٹ کہاں سے آیا...... لیکن اپن کو سوال کرنا ٹھیک نہیں لگا۔ جولیٹ نے فوراً ہی وہ لاکٹ اپنے سے چھپا لیا تھا۔ اس لیے بھی اپن اور چپ ہو گیا پر دل میں سوچا ضرور تھا کہ ایسا قیمتی زیور تو محلوں میں رہنے والیوں کو ہی نصیب ہوتا ہے۔ اب وہ حیدرآباد کی طرف گئی ہے تو خیال آرہا ہے کہ ادھر تو بڑے بڑے خاندانی نواب رہتے ہیں۔ کہیں جولیٹ کا ان نوابوں میں سے کسی سے تو کوئی ناتا نہیں ہے؟" ربن کے الفاظ فاروق کی پیشانی پر شکنوں کا جال پھیلاتے جارہے تھے۔

"دیکھنے میں کیسا تھا وہ لاکٹ......؟" اس نے کھوئے کھوئے لہجے میں ربن سے دریافت کیا۔

"بولا نا ہیرے کا جڑاؤ لاکٹ تھا۔ بیچ میں بڑا سا چوکور ہرے رنگ کا ہیرا لگا ہوا تھا اور اس کے گرد چھوٹے چھوٹے ست رنگی ہیرے تھے۔ اپن نے بس ایک جھلک ہی دیکھی تھی اس لاکٹ کی۔ جولیٹ اسے بہت بھاری سونے کی زنجیر میں پہنے ہوئے تھی اور اپنے کو بالکل ایسا لگا تھا کہ کسی مغل شہزادی کا زیور پہنے ہوئے ہے۔" ربن بولتا جارہا تھا اور فاروق کا دماغ چکر پھیریاں کھا رہا تھا۔ اسے یوں لگ رہا تھا کہ کوئی بہت بڑا راز ہے جو اس پر افشا ہونے کو ہے۔ اس نے اپنا آپ آندھیوں کی زد پر محسوس کیا۔ ماضی اسے آواز دے رہا تھا۔

☆☆☆

آج حویلی میں خوشیوں کی برات اتری ہوئی تھی۔ ندرت جہاں عرف آپا بیگم کا چہرہ کھلا ہوا تھا اور وہ اپنی ضعیفی کو بھول کر اس بڑے سے ہال نما کمرے میں موجود تھیں جہاں حویلی کے تمام مکین جمع تھے۔ نواب زادی عالیہ کے تن پر بھی معمول سے زیادہ قیمتی اور روپہلا لباس مع بیش قیمت زیورات کے موجود تھا اور باقی لوگ بھی خوب چمک رہے تھے۔ یہ سارا اہتمام ندرت جہاں کے اکلوتے بیٹے اور نواب سلیم اللہ کے اکلوتے داماد اختر کی آمد کی وجہ سے تھا کہ حویلی کے فرد ہوتے ہوئے بھی وہ سال دو سال میں کبھی یہاں والوں کو اپنی شکل دکھایا کرتے تھے اور اسی لیے کسی شہزادے کی طرح سب کے درمیان براجمان تھے۔

جولیٹ کو آج چھٹی کی پیشگی ہی اطلاع دے دی گئی تھی اس لیے وہ اپنے کمرے میں ہی محدود تھی لیکن پھر اسے نواب زادہ اسد اللہ کا پیغام ملا اور ملازمہ نے اطلاع دی کہ وہ بڑے کمرے میں اسے سب کے درمیان طلب فرما رہے ہیں۔ حیرت زدہ سی جولیٹ اپنا حلیہ درست کر کے وہاں پہنچ گئی۔ آج اس نے آسمانی رنگ کی ساڑی زیب تن کر رکھی تھی۔ ساڑی کے پلو پر ننھے ننھے ستارے جھلملا رہے تھے۔ لچک دار و مہین کپڑے کی ساڑی اس کی سرو قامت اور متناسب جسم پر خوب جچ رہی تھی۔ وہ اجازت لے کر بڑے کمرے میں داخل ہوئی تو گویا چراغوں میں روشنی نہ رہی۔ حویلی کی جملہ خواتین کی تیاری اور حسن کو فاش شکست ہوگئی۔ کسی اور نے حسن کی اس جولانی کو محسوس کیا ہو نہ کیا ہو، آپا بیگم کے سپوت اختر مرزا کی نظریں یوں اس پر جمیں کہ واپس پلٹنا بھول گئیں۔ آپا بیگم بیٹے کے پہلو میں بیٹھی اس حرکت کو محسوس کر کے ہولے سے کھنکھاریں تو اسے اپنی بے اختیاری کو لگام ڈالنے کا خیال آیا۔ ادھر آپا بیگم بیٹے سے زیادہ جولیٹ پر برہم اسے ناگواری سے گھورتی رہیں۔ جولیٹ نے ماں اور بیٹے دونوں کی نظروں کی زبان پڑھی لیکن شان بے نیازی سے نظر انداز کر گئی اور حسیب اللہ کی بیگم کے اشارے پر اس کے ساتھ جا بیٹھی۔ اس نے دیکھا کہ حویلی کے مکینوں کے علاوہ وہاں آصف خان بھی موجود تھا مگر کچھ ایسے رخ سے بیٹھا ہوا تھا کہ اس کی نظریں حویلی کی خواتین کو نہیں دیکھ سکتی تھیں۔

جولیٹ کے ہونٹوں پر ایک استہزائیہ مسکراہٹ دوڑ گئی۔ خوب چلن تھا کہ اپنے گھر کی عورتوں پر تو کسی غیر کی نگاہ گوارا نہیں تھی اور خود حویلی ہی کا ایک سپوت اسے گھور گھور کر دیکھتا رہا تھا۔ وہ اختر کی نظروں کا بار بار بہک کر اپنی طرف اٹھنا مسلسل محسوس کر رہی تھی لیکن خود نواب زادی عالیہ کی طرف متوجہ تھی جو اسے بتا رہی تھیں کہ نواب زادہ اسد اللہ کی خواہش پر اسے طعام میں شرکت کی دعوت دی گئی ہے۔ آصف خان بھی یقیناً اسی وجہ سے وہاں موجود تھا لیکن اس کی بات اور تھی۔ وہ اسد اللہ کے دوست کا بیٹا تھا جبکہ وہ تو بس ایک استانی یا گورنس ہی تھی جسے یہ عزت ملنا حیران کن تھا۔ حیرانی کے اس عالم میں ہی اس نے حویلی والوں کے ساتھ کھانا تناول کیا اور پھر جلد اجازت لے کر اپنے کمرے میں آگئی۔ اسد اللہ کے رویے بھی کبھار اسے حیران کر دیتے تھے۔ یہ وہی تھے جن کی وجہ سے وہ آپا بیگم کی ناپسندیدگی کے باوجود حویلی میں موجود تھی

ورنہ اسے کب کا برطرف کیا جا چکا ہوتا۔ اسد اللہ اس کی غیر معمولی طرف داری کرتے تھے اور اب بھی انہوں نے اسے غیر معمولی ہی عزت دی تھی کیوں......؟ اس سوال کا جواب ڈھونڈنے میں ناکام ہو کر وہ کب نیند کی آغوش میں چلی گئی، خود اسے بھی معلوم نہیں ہو سکا۔

نیند گہری تھی اور نہ جانے رات کا کونسا پہر تھا کہ اس نے اپنے وجود پر ایک ناگوار بوجھ محسوس کیا۔ ساتھ ہی سانسوں نے بھی بدبو کا ایک بھبکا وصول کیا۔ وہ ہڑبڑا کر نیند سے جاگی اور بے ساختہ ہی اس کے ہونٹوں سے ایک بلند آہنگ چیخ بلند ہوئی۔ اس چیخ کے فوراً بعد ہی اس کے ہونٹوں پر ایک وزنی ہاتھ جم گیا۔ ایک لمحے کو جولیٹ کا وجود سن ہو گیا۔ پہلے بھی ایک بار اس کے وجود پر یہ ظلم توڑا گیا تھا۔ ایک درندے کی بربریت کا شکار ہو کر وہ اپنی زندگی کی ساری خوشیاں کھو چکی تھی لیکن فرق یہ تھا کہ پہلے جب یہ حادثہ ہوا تھا تو وہ بے ہوشی کی کیفیت میں تھی اور اپنے بچاؤ کے لیے کچھ نہیں کر سکی تھی۔ آج جاگتے حواس کے ساتھ وہ ایک بار پھر خود پر وہی ظلم بیتنے دیتی، یہ کیسے ممکن تھا۔

اس کے اندر احتجاج کی ایک زبردست لہر اٹھی اور اس کے نازک سے وجود میں ایسی توانائی پیدا ہوئی کہ اس نے اندھیرے کمرے میں خود سے چمٹے عفریت کو جھٹک ڈالنے کی خواہش میں پہلے دونوں ہاتھوں کے ناخن اس کے چہرے کی جلد میں اتار دیے اور پھر یکے بعد دیگرے کچھ ایسی جنونی کیفیت میں ہاتھ پیر چلائے کہ مقابل کے لیے اسے سنبھالنا مشکل ہو گیا۔ جولیٹ کو قابو میں کرنے کے لیے اس نے اپنے ہاتھوں کو استعمال کرنے کی کوشش کی تو اس کے ہونٹ آزاد ہو گئے۔ آزاد ہو جانے والے ہونٹوں کو صدائے احتجاج بلند کرنے سے کون روک سکتا تھا۔ بلند آہنگ چیخوں کا سلسلہ شروع ہوا تو اونچے نام و نسب والوں کی حویلی کے در و دیوار لرز اٹھے۔ ام الخبائث کے نشے میں چور وجود کو بھی اپنی نازک پوزیشن کا احساس ہوا اور اس نے جائے فرار اختیار کرنے کی کوشش کی لیکن جولیٹ نے پیچھے سے اس کی قمیص دبوچ لی۔ وہ جولیٹ کو دھکا دے کر بھاگ جاتا لیکن اس سے پہلے ہی بھاگتے قدم جولیٹ کے کمرے کے دروازے پر آ رکے اور روشنیاں جل اٹھیں۔ روشنی میں اختر مرزا کا چہرہ اور وہاں بیتی روداد خود بخود عیاں ہو گئی۔ جولیٹ کی پکار سن کر وہاں آنے والوں میں اسد اللہ سب سے آگے تھے۔ انہوں نے بے ساختہ ہی اختر کا گریبان پکڑ لیا اور زور سے جھنجوڑا دیا۔

''آرام سے اسد اللہ!'' اسد اللہ کے پیچھے موجود ان کے بڑے بھائی صفی اللہ نے ان کے شانے پر ہاتھ رکھ کر انہیں تلقین کی۔

''ہمارے لیے یہ صورتِ حال ناقابلِ برداشت ہے بھائی جان!'' اسد اللہ کا لہجہ آتش بار تھا۔

''ہم سمجھ رہے ہیں لیکن صورتِ حال کی نزاکت کا تقاضا ہے کہ تحمل سے کام لیا جائے۔'' صفی اللہ کا اشارہ وہاں موجود ملازمین کی طرف تھا جو صورتِ حال کو بھانپ کر پیچھے ہی رک گئے تھے کہ انہیں بھی اندازہ تھا۔ مالکان ان کی اس معاملے میں شمولیت کو برداشت نہیں کر سکتے لیکن بہرحال تھے تو وہ انسان ہی جن کی آنکھیں اور کان کھلے ہوئے تھے اور ان کا دیکھا سنا حویلی کی حدود سے نکل کر کہیں اور پہنچ جاتا تو حویلی والوں کی سخت سبکی ہوتی۔

''ہم اطمینان سے اندر بیٹھ کر اس معاملے کو نمٹاتے ہیں چچا جان۔'' حبیب اللہ نے بھی باپ کا ساتھ دیتے ہوئے اسد اللہ کو سمجھانے کی کوشش کی اور ان کے شانوں کے گرد اپنے بازو کا حلقہ بنا کر انہیں آہستگی سے کمرے کے اندر لے گیا۔ اختر کا گریبان صفی اللہ چھڑوا چکے تھے۔ اختر سمیت وہ چاروں اندر پہنچے تو جولیٹ کمرے کے درمیان ساکت کھڑی تھی۔ اسے اپنے بے ترتیب ہو جانے والے لباس کا بھی احساس نہیں تھا۔ اپنے بچ جانے کے احساس کے ساتھ ہی اس نے چیخنا تو بند کر دیا تھا لیکن اب ایک ٹک اسد اللہ کے چہرے کو تک رہی تھی۔ حویلی کے افراد میں اسد اللہ سے اس کا جو تعلق اور رشتہ تھا، وہ خود کو دا سے امید دلا رہا تھا کہ وہ اختر کو اس کے ساتھ کی جانے والی گستاخی پر کڑی سزا دیں گے۔ ان کا ابتدائی ردِعمل بھی اس کے لیے حوصلہ افزا تھا لیکن اب اسے دیکھنا تھا کہ اونچے نام والے اپنے ناموس کو بچانے کے لیے کیا کرتے ہیں۔ وہ گویا سانس روکے فیصلے کی منتظر تھی۔

''ہماری کوئی غلطی نہیں ہے بھائی جان۔ اس لڑکی نے خود بہانے سے ہمیں اپنے کمرے میں بلوایا تھا اور ہمیں اپنے جال میں پھانسنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ہم نے اس کا ساتھ دینے سے انکار کیا تو یہ مکاری پر اتر آئی اور کہنے لگی تم نے مجھے ٹھکرایا ہے، میں تمہیں تمہارے خاندان میں بدنام کر دوں گی۔'' اختر جو ابتدا میں حواس باختہ ہو گیا تھا، ذرا سی مہلت مل جانے پر اس کا دماغ خوب کام کرنے لگا اور اس نے اپنے بچاؤ کے لیے داستان بنا ڈالی۔

''جو کچھ آپ کہہ رہے ہیں، اس میں اگر سچائی بھی

ہے تو آپ کو رات کے اس پہر ایک نامحرم لڑکی کے کمرے میں نہیں ہونا چاہیے تھا۔ کیا آپ نے یہاں آنے سے قبل عالیہ کو اطلاع دی تھی؟" صفی اللہ کے لب و لہجے سے ظاہر تھا کہ وہ بہت برداشت سے کام لے رہے ہیں۔

"عالیہ سو چکی تھیں اس لیے ہم نے ان کی نیند میں خلل ڈالنا مناسب نہیں سمجھا۔" اختر نے ڈھٹائی سے ان کے سوال کا جواب دیا۔

"اس صورت میں آپ کو صبح کا انتظار کرنا چاہیے تھا۔ ان محترمہ کو آپ سے جو بھی کام تھا، یہ صبح بھی کہہ سکتی تھیں۔" صفی اللہ نے اختر کے بہانے کو رد کیا۔

"ہم ایسا ہی کرتے بھائی جان لیکن اس لڑکی نے کہا کہ بہت فوری نوعیت کا کام ہے۔ ہم نے سوچا پتا نہیں کیا مسئلہ ہے اس لیے ہم فوراً ہی چلے آئے۔ ہمیں کیا معلوم تھا کہ یہ ہمارے خلاف ایسی سازش کرے گی۔" اختر کا نشہ ہرن ہو چکا تھا اور وہ اپنے دفاع کی پوری پوری کوشش کر رہا تھا۔

"بس کر دیجیے اختر۔ آپ کے ان بہانوں کو وہ تسلیم کر سکتا ہے جو آپ سے واقف نہ ہو۔ آپ کیا سمجھتے ہیں کہ ہم لندن میں آپ کے شب و روز سے واقف نہیں ہیں۔ ہم سب کچھ جانتے بوجھتے آپ کی طرف سے صرف اس لیے چشم پوشی کرتے رہے ہیں کہ ہمارے لب کھولنے سے اس حویلی کے مکین دکھی ہوں گے۔ ہم تو یہ چاہتے تھے کہ ایک بھرم ہے جو قائم رہے اور ہماری معصوم بہن کو آپ کے ہرجائی پن کا علم نہ ہو سکے۔ ہماری روایات میں اگر نواب زادی عالیہ کا دامن آپ سے چھڑا لینے کی گنجائش ہوتی تو ہم کبھی خاموش نہیں رہتے۔" اختر کے بہانوں کو سنتے اسد اللہ کا ضبط جواب دے گیا اور وہ پھٹ پڑے۔

"آپ ایک غیر لڑکی کے لیے ہمارے بیٹے کے ساتھ زیادتی کر رہے ہیں اسد اللہ۔" اسی لمحے ندرت جہاں، نواب زادی عالیہ کے سہارے کمرے میں داخل ہوئیں اور خفگی کا اظہار کیا۔

"ہم صرف سچ بیان کر رہے ہیں۔" اسد اللہ نے بھی جوابی خفگی کا مظاہرہ کیا۔

"سچ تو یہ ہے کہ یہ لڑکی خود بدکردار ہے۔ رات آپ نے اس کا انداز نہیں دیکھا تھا۔ اتنے مردوں کی موجودگی میں کیسے یہ سولہ سنگار کیے کھلے سر کے ساتھ آ پہنچی تھی۔ ایسی عورتیں مردوں کو لبھا کر بعد میں الزام ان ہی کے سر رکھ دیتی ہیں۔"

ندرت جہاں نے بیٹے کی حمایت میں جولیٹ کے بخیے ادھیڑ ڈالے۔ جوشِ غضب میں ان کا نحیف سا وجود کانپنے لگا تھا اور لب بستہ عالیہ کو انہیں سنبھالنے میں مشکل پیش آ رہی تھی۔ حبیب اللہ نے یہ صورتِ حال دیکھی تو انہیں سہارا دے کر مسہری پر بٹھایا۔ پھر بھی ان کی حالت سنبھلنے میں نہیں آ رہی تھی۔ اصل میں غصے سے بھی زیادہ وہ اپنے بیٹے کی فکر میں ادھ موئی ہوئی جا رہی تھیں۔ اختر کے حق میں لاکھ صفائیاں دینے کے باوجود وہ سمجھتی تھیں کہ اختر کی جولیٹ کے کمرے میں موجودگی ان کی دسیوں دلیلوں پر بھاری ہے۔ رات کے آخری پہر جاگنے والے اس ہنگامے کی اطلاع انہیں سروری نے دی تھی۔ حویلی کی دوسری خواتین تک بھی خبر تو پہنچ گئی ہوگی لیکن کسی اور میں یہ ہمت نہیں تھی کہ وہ اس طرف آنے کا قصد کر پاتیں۔ یہ صرف آپا بیگم تھیں جو نواب زادی عالیہ کے ساتھ یہاں آ پہنچی تھیں۔ عالیہ کو بھی وہ فقط اپنے سہارے کے لیے ساتھ لائی تھیں۔ ایسے موقع پر کسی ملازمہ کو یہاں تک لانا مناسب نہیں تھا۔ دل میں وہ اس بات پر بھی شکر کر رہی تھیں کہ بڑے نواب سلیم اللہ صاحب رات اپنے چند دوستوں کے ساتھ شکار کے لیے روانہ ہو گئے تھے ورنہ نہ جانے کیا ہوتا۔ وہ ایسے معاملات میں بہت سخت تھے اور اپنے خاندان کے افراد کے کردار کی پختگی پر کوئی سمجھوتا نہیں کر سکتے تھے۔ اپنے بھائی کی فطرت سے واقف وہ جانتی تھیں کہ ان کی موجودگی میں انہیں جولیٹ کو برا بھلا کہنے کا موقع کم ہی ملتا اور پہلے وہ اختر کا احتساب کرتے۔

"آپ ذہن پر بوجھ مت ڈالیے پھپھی جان۔ ہم ہیں نا...... ہم اس معاملے کو نمٹا لیں گے۔" ان کی حالت بگڑتی محسوس کر کے صفی اللہ انہیں دلاسا دینے لگے۔ اسد اللہ کو بھی انہوں نے اشارے سے مزید کچھ کہنے سے روک دیا تھا۔ اسد اللہ کو اس موقع پر خاموش رہنے کے لیے خود پر بہت جبر کرنا پڑا لیکن جس طرح ندرت جہاں کی حالت بگڑ رہی تھی، مصلحت کا تقاضا یہی تھا کہ وہ خاموش ہو جائیں ورنہ ان کی طبیعت کی خرابی کا سارا الزام اسد اللہ کی گستاخی پر آ جاتا۔

"ہم سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ اپنے بھائی کی چھت کے نیچے کبھی ایسی صورتِ حال سے دوچار ہوں گے کہ ہم اور ہمارا بیٹا ایک مجرم کی طرح سب کے سامنے شرمسار نظر آئے اور ہمارے اپنے مشکل میں ہمارا ساتھ دینے کے بجائے غیروں کے ہم نوا بنے بیٹھے ہوں۔" نواب زادی عالیہ اور حبیب اللہ ان کے ہاتھ پیر سہلا کر ان کی طبیعت بحال کرنے کی کوشش کر رہے تھے اور وہ آنسو بہاتے ہوئے مسلسل بولتی جا رہی تھیں۔

"ہم نے آپ سے کہا ہے نا کہ آپ فکر نہ کریں۔ ہم آپ اور اختر پر کسی غیر کو ترجیح دیں، ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔ آپ ہمارے لیے واجب الاحترام ہیں اور ہم آپ کو مجرم قرار دینے کی ہرگز بھی جرأت نہیں کر سکتے۔" ندرت جہاں کی حویلی میں بے پناہ مستحکم حیثیت تھی۔ بچپن سے ان کی اجارہ داری دیکھتے چلے آ رہے صفی اللہ نے اس موقع پر بھی ان کی دلجوئی کرنا مناسب سمجھا۔ جولیٹ جواب تک بالکل خاموش کھڑی اپنے ساتھ انصاف کی منتظر تھی، اس صورتِ حال پر اپنے اندر ابلتے آتش فشاں پر قابو نہ پا سکی اور یکدم ہی پھٹ پڑی اور بولی۔

"اس حویلی کا یہی رواج ہے۔ یہاں مجرموں کو سزا نہیں دی جاتی اور بے قصوروں کو دربدر کر دیا جاتا ہے۔ دیکھنے میں یہاں بہت عزت دار لوگ بستے ہیں لیکن یہ لٹیروں کی حویلی ہے۔ یہاں اپنے گھر کی عورتوں کے سوا کسی کی عزت کا احترام نہیں کیا جاتا۔ برسوں پہلے میری ماں بھی محبت کے نام پر یہاں لوٹی گئی تھی اور الٹا اسے ہی سازش کر کے یہاں سے نکال دیا گیا تھا۔ آج میرے ساتھ بھی یہی سب کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے لیکن یاد رکھو کہ میں برسوں پہلے خاموشی سے یہاں سے نکل جانے والی جوزفین نہیں ہوں۔ جوزفین اس حویلی کے مکینوں کا مقابلہ نہیں کر سکی تھی لیکن میں مقابلہ کروں گی کیونکہ میری رگوں میں بھی اسی نواب خاندان کا خون ہے۔ میں نواب زادی جولیٹ اسداللہ ہوں۔"

وہ جملہ جو وہ یہاں آمد کے پہلے دن نواب سلیم اللہ کے روبرو ادا کرنا چاہتی تھی لیکن خود کو روک گئی تھی، آج جوشِ غضب میں ادا کر گئی۔ اس کے الفاظ نے وہاں موجود ہر شخص کو دم بخود کر دیا۔ وہ جوزفین کی بیٹی ہے اس بات کا اندازہ تو اسداللہ خود بھی لگا چکے تھے لیکن جو انکشاف اس نے کیا تھا، وہ ہلا دینے والا تھا۔ وہ ان کا خون ہونے کی دعوے دار تھی اور وہ اس کے دعوے کو اس لیے یکسر رد نہیں کر سکتے تھے کہ جوزفین سے تعلق کے عرصے میں ان کی محبت کئی نازک مراحل طے کر گئی تھی۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے جولیٹ کو دیکھنے لگے۔ "کیوں نواب زادہ اسداللہ صاحب...... کیا آپ میرے دعوے کو رد کر سکتے ہیں؟" اس نے اسداللہ کی حالت کو ملاحظہ کرتے ہوئے نہایت طنز کے ساتھ ان سے دریافت کیا۔

"چپ ہو جاؤ گستاخ لڑکی! اچھا ہوا کہ تم نے بتا دیا کہ تم کس نیچ عورت کی اولاد ہو۔ برسوں پہلے تمہاری ماں اس حویلی میں بسنے کی تمنا میں ناکام ہو کر یہاں سے نکلی تھی اور اب اس نے تمہیں اپنے ناکام ارادوں کی تکمیل کے لیے یہاں بھیج دیا ہے۔ وہ بھی اتنے بے ہودہ الزام کے ساتھ۔" ندرت جہاں جو کچھ دیر قبل حال سے بے حال ہو رہی تھیں، ایک بار پھر خم ٹھونک کر میدان میں اتر آئیں۔

"میری ماں کے دل میں تمنا پیدا کرنے والوں کا تعلق بھی یہیں سے ہے ورنہ وہ بے چاری تو صرف اپنی روزی روٹی کمانے کے چکر میں یہاں آئی تھی۔ اسے کیا معلوم تھا کہ اونچی حویلی والوں کے دل اتنے چھوٹے ہیں کہ وہ اسے قبول کرنے کے بجائے اس پر چوری کا جھوٹا الزام لگا کر اسے یہاں سے نکال دیں گے۔" جولیٹ نے دوبدو انہیں جواب دیا۔

"اسی الزام کا بدلہ لینے کے لیے آج تم نے اختر میاں پر اتنا بے ہودہ الزام لگایا ہے نا؟" ندرت جہاں نے بات کو بالکل الگ رخ دینے کی کوشش کی۔

"میری رگوں میں اس خاندان کا خون ضرور ہے لیکن میری تربیت میری ماں نے کی ہے اس لیے مجھے یہاں والوں کی طرح جھوٹ بولنے اور سازشیں کرنے کا ہنر نہیں آتا۔" جولیٹ کو آج سچ بولنے سے کوئی نہیں روک سکتا تھا۔ اس کے اندر لاوا بھرا ہوا تھا جو آج بہت کچھ بھسم کر دینے والا تھا۔

"آپ کیوں خاموش کھڑے ہیں نواب زادہ اسداللہ صاحب! آپ اپنی بیٹی ہونے کی دعوے دار اس لڑکی کی باتوں پر کچھ کیوں نہیں بولتے۔ ہمارے کردار پر تو آپ نے بہت سے الزامات رکھ دیے، اب اپنے بارے میں بھی کچھ بولیے۔ اگر آپ ایسے ہی صاحبِ کردار ہیں تو اس لڑکی کے دعوے کو جھٹلا کر اس کا منہ کیوں بند نہیں کرتے؟" ماں کے بعد اختر کا دماغ بھی کام کرنے لگا۔ ابھی تک تو اس کی پوزیشن نازک تھی لیکن جولیٹ کے دعوے کے بعد اسداللہ بھی اسی کی صف میں آ کھڑے ہوئے تھے۔ اس لیے وہ بڑے استہزائیہ لہجے میں ان سے مخاطب تھا۔

اسداللہ اسے کیا جواب دیتے۔ وہ تو زلزلوں کی زد میں تھے۔ ان کی اور جوزفین کی محبت کی نشانی جولیٹ کی صورت میں موجود ہوگی، اس بارے میں تو انہوں نے کبھی سوچا ہی نہیں تھا۔ جوانی کے جوش میں ان کے قدم بہکے ضرور تھے لیکن وہ جوزفین سے محبت کے معاملے میں بالکل سچے تھے۔ وہ اتنے برسوں بعد بھی ان کے دل پر حکمراں تھی اور اگر انہیں معلوم ہوتا کہ ان کی محبت کی کوئی نشانی اس دنیا

میں موجود ہے تو وہ ہرگز بھی اسے زمانے کے رحم و کرم پر ٹھوکریں کھانے کے لیے نہیں چھوڑتے۔ وہ اپنی ذات پر لوگوں کی انگلیاں اٹھنا سہہ لیتے لیکن اسے ضرور تحفظ دیتے جو آج ان کی بیٹی ہونے کا دعویٰ تو ضرور کر رہی تھی لیکن جس کی آنکھوں میں ان کے لیے نفرت اور اجنبیت تھی۔

''یہ وقت ان فضول باتوں کا نہیں ہے اختر۔ ہم کہتے ہیں کہ ملازمین کو بلوائیں اور اس لڑکی کو دھکے دے کر یہاں سے نکلوا دیں۔ بھائی صاحب کی حویلی واپسی سے قبل یہ قصہ نمٹ جائے تو اچھا ہے۔'' ندرت جہاں کا دماغ اپنے مفادات کے لیے کوشاں تھا۔ اسد اللہ کی ایک کمزوری کا ہاتھ آجانا الگ بات تھی لیکن انہیں نواب سلیم اللہ کے مزاج سے بھی خوب واقفیت تھی اور معلوم تھا کہ وہ نہ اختر کو بخشیں گے، نہ اپنے سگے بیٹے کو۔ اختر کہنے کو لندن میں رہتا تھا لیکن وہاں اس کی ایسی کوئی خاص آمدنی نہیں تھی اور اخراجات کے لیے وہ آئے بہانے یہاں سے رقوم ارسال کرتی رہتی تھیں۔ سلیم اللہ ناراض ہوتے تو یہاں کی حکمرانی ان کے ہاتھوں سے جاتی اور بیٹے کی مالی مدد کرنا تو دور کی بات، وہ خود اپنا ٹھکانا نہ کرپاتیں۔ اس لیے انہیں یہی بہتر لگ رہا تھا کہ نواب سلیم اللہ کے علم میں آنے سے قبل ہی سارا معاملہ دبا دیا جائے لیکن ان کی اس خواہش کی راہ میں نواب زادی عالیہ حائل ہو گئیں۔ وہ جو اب تک بالکل خاموش تھیں چیخ پڑیں اور بولیں۔

''بس کر دیجیے پھپھی جان...... بس کر دیجیے۔ ظلم کے سلسلے کو مزید دراز مت کیجیے ورنہ اس حویلی پر رب کا قہر نازل ہو جائے گا۔ برسوں پہلے جو کچھ ہوا تھا، اس کی سزا ہم آج تک بھگت رہے ہیں۔ ہمیں اچھی طرح اندازہ ہے کہ جوزفین کے دل کی آہ نے کبھی ہمارے دل کو آباد نہیں ہونے دیا۔ اس کے ساتھ کیے گئے ظلم ہی کا نتیجہ ہے کہ نہ تو ہم کبھی ماں بن سکے اور نہ ہی کبھی اختر ہمارے ہوئے حالانکہ ان ہی کو پانے کے لیے تو ہم آپ کی سازش کا حصہ بنے تھے۔''

اپنی بات کہہ کر انہوں نے زار و قطار رونا شروع کر دیا۔ کمرے میں موجود تمام نفوس انہیں حیرت سے دیکھنے لگے۔ عالیہ کو سب نے ہمیشہ بہت نرم دل اور نرم خو پایا تھا اور ان کے بارے میں سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا کہ وہ کبھی کسی کو زیادتی کا نشانہ بنا سکتی ہیں لیکن آج وہ اعتراف کر رہی تھیں کہ جوزفین کے خلاف کی جانے والی سازش میں وہ شامل رہی تھیں۔

''خاموش رہیے عالیہ! آپ کا ذہنی توازن شاید بگڑ گیا ہے جو یوں اول فول بک رہی ہیں۔'' ندرت جہاں نے ڈانٹ کر انہیں خاموش کروانے کی کوشش کی۔ ماضی کے راز کھلتے تو خود ان کی بھی سبکی ہوتی لیکن ہمیشہ ان کی غلامی اور جی حضوری کرنے والی عالیہ آج خاموش رہنے کا ارادہ نہیں رکھتی تھیں چنانچہ ان کی ڈانٹ کو نظر انداز کر کے جولیٹ کی طرف بڑھیں اور اس کے گرد اپنا بازو پھیلاتے ہوئے بولیں۔

''کسی اور کو اس لڑکی کی سچائی پر یقین ہو یا نہ ہو لیکن ہم اس کی سچائی پر یقین رکھتے ہیں کیونکہ یہ جوزفین کی بیٹی ہے اور اسے بجا طور پر اپنی ماں کی تربیت پر فخر ہے۔ جوزفین بے شک غریب لڑکی تھی لیکن لالچی یا بدکردار نہیں تھی۔ یہ تو ہم اونچے نام و نسب والے تھے جنہوں نے اپنے اپنے مفادات پر اس غریب کی محبت کو قربان کر ڈالا۔ ہم، مرحومہ امی جان اور پھپھی جان سب اس کے خلاف سازش میں شامل تھے کیونکہ ہم لوگوں کو اسد بھائی جان کی اس میں دلچسپی کا علم ہو گیا تھا۔ امی جان کو اپنے چہیتے اور لاڈلے بیٹے کے لیے ایک کم حیثیت اور غیر مہذب لڑکی قبول نہیں تھی تو پھپھی جان عشرت جہاں کو اسد بھائی کی دلہن بنانے کے خواب دیکھ رہی تھیں۔ زندگی میں پہلی بار ہم نے ان دونوں خواتین کو دلی طور پر کسی بات پر متفق ہوتے ہوئے دیکھا اور پھپھی جان کی اس دھمکی میں آ گئے کہ اگر اسد بھائی جان عشرت جہاں کو چھوڑ کر جوزفین کے ہو گئے تو وہ اختر کو بھی ہمارا مقدر نہیں بننے دیں گی۔ ہم بچپن سے اپنے نام کے ساتھ اختر کا نام سنتے آئے تھے اس لیے ان کو کھونے کی ہمت نہیں کر سکے اور جوزفین کے خلاف ہونے والی سازش کا حصہ بننے کے لیے تیار ہو گئے۔ ہم نے اپنے ہاتھ سے اپنے زیورات سروری کو جوزفین کی الماری میں رکھنے کے لیے دیے اور بعد میں وہ زیورات جوزفین پر چوری کا الزام لگا کر برآمد کروا لیے گئے۔ اس سازش کے لیے اسد بھائی کی حویلی میں غیر حاضری کو یقینی بنایا گیا تھا اور اس موقع کا فائدہ اٹھا کر جوزفین کو نہایت آسانی سے حویلی سے نکلوا دیا گیا۔ وہ یہاں سے نکل کر اپنی کسی واقف کار خاتون کی وساطت سے نواب ثروت بیگ کی حویلی میں پناہ گزین ہوئی تو وہاں بھی اسے ٹکنے نہیں دیا گیا۔ ساتھ ہی اس بات کا بھی انتظام کر لیا گیا کہ اسد بھائی جان جوزفین کی تلاش میں اس کے پیچھے نہیں جانے پائیں۔ انہیں لندن میں اختر کے ساتھ حادثے کی غلط اطلاع دے کر وہاں روانہ کر دیا گیا اور بعد میں ابا جان کے ذریعے انہیں مجبور کیا گیا کہ وہ لندن میں اپنے قیام کو بڑھا کر وہاں مزید اعلیٰ تعلیم حاصل کریں۔ حالات سے

ناواقف اسد بھائی جان اپنی فرمانبرداری کے ہاتھوں مجبور کر دیے گئے۔ بعد میں جوزفین کے بارے میں اسد بھائی جان کو غلط اطلاع پہنچانے کا ناگوار فریضہ بھی ہمیں ہی انجام دینا پڑا کیونکہ سب جانتے تھے کہ اسد بھائی جان ہمیں بہت عزیز رکھتے ہیں اور انہیں ہم پر بہت اعتماد ہے لیکن افسوس کہ ہم نے اپنے پیارے بھائی کے اعتماد کا قتل کر ڈالا اور اس کی سزا بھی خوب پائی۔ اختر ہمارے بن کر بھی ہمارے نہیں ہوئے۔ پھپھی جان اسد بھائی کے طویل عرصے لندن میں رہنے کی وجہ سے عشرت جہاں کو ان کی دلہن بنانے میں کامیاب نہیں ہو سکیں اور امی جان اپنی مرضی کی بہو بیاہ لانے کے باوجود اسے اس حویلی میں ہنستا بستا نہیں دیکھ سکیں اور وہ بے چاری مختصر مدت میں ہی اللہ کو پیاری ہو گئیں۔ عقل کی آنکھ سے دیکھا جائے تو یہ اللہ کا انصاف تھا کہ جوزفین کے خلاف سازش کرنے والوں میں سے کوئی بھی اپنے مقاصد میں کامیاب نہیں ہو سکا لیکن ہم وہ لوگ ہی نہیں ہیں جو قدرت کے انصاف کو سمجھ سکیں جب ہی تو اس حویلی میں ناانصافیوں اور سازشوں کا سلسلہ آج بھی جاری ہے لیکن اب ہم مزید ان سازشوں کا حصہ نہیں بن سکتے۔ ہم نے حق کا ساتھ دینے کا فیصلہ کر لیا ہے اسی لیے آج اپنے ہر گناہ کا اعتراف کر رہے ہیں۔"

نواب زادی عالیہ بولنے پر آئیں تو ایک سانس میں ماضی کی ہر بات سنا ڈالی اور پھر سسک سسک کر رونے لگیں۔ خون کی کشش تھی یا انسانی ہمدردی، جولیٹ نے ان کے لیے اپنے دل میں نرمی محسوس کی اور خود بھی ان کے گرد اپنی بانہیں پھیلا دیں۔ باقی افراد تو کسی ردعمل کے قابل ہی نہیں تھے۔ کسی کو حیرت نے تو کسی کو شرمندگی نے گنگ کر رکھا تھا۔ اسد اللہ کی حالت سب سے دگرگوں تھی۔ ایک طرف ان کے زخم ادھڑ گئے تھے تو دوسری طرف ان کے سامنے ان کی جوان بیٹی کھڑی ان کا احتساب کر رہی تھی۔ جوانی کے جوش میں بہک جانے والے جذبات کا آج حساب دینا بہت مشکل عمل تھا لیکن انہیں اس مشکل سے بہرحال گزرنا تھا چنانچہ سب سے پہلے انہوں نے ہی اپنے لب کھولے اور برسوں کے تھکے ماندے کسی مسافر کی طرح گویا ہوئے۔

"ہمیں عالیہ پر سچ مچ بہت اعتبار تھا اس لیے ان کی زبانی جوزفین پر لگنے والا الزام سن کر ہم نے یہ تو یقین کر لیا تھا کہ عالیہ نے ہمیں وہی کچھ بتایا ہوگا جو ان کی دانست میں سچ تھا لیکن ہمیں اتنا اعتبار ضرور تھا کہ جوزفین جیسی لڑکی چوری جیسے عمل میں ملوث نہیں ہو سکتی اور جو کچھ پیش آیا، اس میں کسی غلط فہمی یا پھر سازش کا دخل ہے۔ حویلی والوں سے اصل حقیقت جاننے اور کھوجنے کی کوشش بے کار ہوتی اس لیے ہم نے جوزفین کی تلاش میں نکلنے کا فیصلہ کیا۔ ہمیں احساس تھا کہ ہمیں بہت تاخیر ہو گئی ہے لیکن پھر بھی اپنی محبت کے بھروسے پر ہم پُرامید تھے کہ جوزفین ہمارا انتظار کر رہی ہو گی۔ بمبئی میں اس کی رہائش گاہ تلاش کر کے وہاں پہنچنے پر ہماری یہ امید ٹوٹ گئی اور آس پڑوس والوں سے ہمیں معلوم ہوا کہ جوزفین نے اپنے بچپن کے ساتھی جوزف سے شادی کر لی ہے۔ شادی کے بعد وہ لوگ محلہ چھوڑ گئے تھے اور پرانے محلے داروں کو ان کی نئی رہائش گاہ کا علم نہیں تھا اس لیے ہم ناکام اور نامراد واپس لوٹ آئے۔ رہائش گاہ معلوم بھی ہوتی تو وہاں تک جانے کی ہمت کیسے کرتے؟ نہ جوزفین کو کسی اور کا دیکھ سکتے تھے اور نہ ہی اس کے سامنے جا کر اس کی زندگی میں خلل ڈال سکتے تھے اس لیے دل پر پتھر رکھ لینا ہی مناسب تھا۔ دل پر رکھے اس پتھر کے بوجھ کے ساتھ ہم نے زندگی کے دن کیسے گزارے ہیں، یہ بس ہم ہی جانتے ہیں لیکن باخدا اپنی زندگی کی اس ویرانی کے باوجود ہم نے ہمیشہ جوزفین کی خوشیوں ہی کی تمنا کی ہے۔ وہ ہم سے دور رہ کر خوش رہتی تو بھی سودا مہنگا نہیں تھا۔"

انہوں نے ہمیشہ اپنے دل کی بات دل میں ہی رکھی تھی لیکن آج سب کے روبرو اپنا دل کھول کر رکھ دیا۔ جو دردمند دل رکھتے تھے، وہ ان کی تکلیف اور جذبے کی گہرائی کو محسوس کر کے تڑپ گئے لیکن ندرت جہاں اور اختر کے تاثرات سے ظاہر تھا کہ انہیں اس داستان سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ ندرت جہاں کی تیوریوں پر بل پڑے ہوئے تھے اور اختر کے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ تھی۔

"اگر درمیان میں میرا سلسلہ نہ ہوتا تو مام ساری لائف آپ کے انتظار میں گزار سکتی تھیں۔ میری خاطر انہیں ڈیڈ کا سہارا لینا پڑا۔ ڈیڈ ان سے بے حد محبت کرتے تھے اور انہوں نے مشکل وقت میں مام کو اپنا کر اپنی محبت کا ثبوت بھی دیا۔ اگر مام میرے لیے اپنی ڈائری نہ چھوڑ جاتیں تو مجھے کبھی پتا ہی نہیں چلتا کہ وہ میرے رئیل فادر نہیں تھے۔" اسد اللہ کے بیان نے اس پر واضح کر دیا تھا کہ وہ اتنے بھی قصوروار نہیں تھے، جتنا وہ انہیں قرار دیتی رہی تھی۔ وہ تو خود سازش کا شکار ہوئے تھے اور یہ تو جوزفین کی ڈائری سے بھی واضح تھا کہ انہیں جولیٹ کے بارے میں کوئی علم نہیں تھا۔ جوزفین کو خود اس کے بارے میں اس وقت علم ہوا تھا جب وہ نواب سلیم اللہ کی حویلی سے نکالی جا چکی تھی چنانچہ خود بخود ہی انہیں معاف کر بیٹھی اور جوزفین کے شادی

کر لینے کی وجہ بیان کی۔

"ہم نے جوزفین سے جوزف کے بارے میں سن رکھا تھا۔ کاش ہم بھی اس عظیم انسان سے مل پاتے جس کے بارے میں ہمیں یقین ہے کہ وہ ہم سے بہت اچھا تھا جب ہی تو اللہ نے جوزفین کو اس کی زندگی کا ساتھی بنایا۔" جولیٹ کی زبانی جوزف کی تعریف سن کر اسد اللہ نے بھی اس کے لیے اپنے جذبات کا اظہار کیا۔ شدتِ جذبات کے باعث ان کی آنکھوں میں نمی اُمڈ آئی تھی جسے انہوں نے آنسوؤں کی شکل اختیار کرنے سے بہ مشکل روکا تھا۔

"باقی سب باتیں بعد میں کرتے رہیے گا بھائی جان۔ پہلے اتنے برسوں بعد ملنے والی جوزفین کی نشانی کو تو گلے سے لگائیں۔ اس بچی کے دل میں آپ کی لگن تھی جب ہی تو یہاں اتنی دور آئی ہے۔ جوزفین لوٹ کر نہیں آسکتی لیکن اسے اب جانے مت دیجیے گا۔" نواب زادی عالیہ نے درمیان میں دخل دے کر گفتگو کا سلسلہ منقطع کیا اور جولیٹ کو بازوؤں میں لیے اسد اللہ کے قریب لے آئیں۔ اسد اللہ نے فوراً ہی بانہیں اس کے لیے وا کردیں۔ جولیٹ باپ کے سینے سے لگی تو آنسوؤں کا سیلاب اُمڈ آیا۔ اس بار اسد اللہ بھی اپنے آنسوؤں پر قابو نہ رکھ سکے اور جولیٹ کے سر پر ہاتھ رکھ کر خود بھی رو پڑے۔

"واہ بھئی واہ۔ کیا صاحب کردار اور باعزت لوگ ہیں جو اپنی ناجائز اولاد کو بھی یوں کھل کر گلے لگانے کی ہمت رکھتے ہیں۔ ایسے کھلاڑیوں کے مقابلے میں تو ہم بالکل اناڑی ہی ہیں۔" ایسے نازک موقع پر اختر طنز کے تیر چلانے سے باز نہیں آیا۔

"آپ اپنی بکواس بند کیجیے ورنہ ہم عالیہ کا لحاظ بھی بھول جائیں گے۔" اسد اللہ بری طرح طیش میں آگئے۔

"تحمل سے اسد اللہ!" بڑے بھائی صفی اللہ نے انہیں ٹوکا اور پھر عالیہ سے مخاطب ہو کر بولے۔

"عالیہ! آپ اختر کو خواب گاہ میں لے جائیں۔ ابھی یہ مکمل طور پر ہوش و حواس میں نہیں ہیں اس لیے ان سے کوئی بات کرنا بے کار ہوگا۔"

"جو آپ کا حکم بھائی جان۔" عالیہ نے بڑے بھائی کے حکم پر فرماں برداری کا مظاہرہ کیا اور اختر کی طرف رخ کر کے ان سے بولیں۔

"یہاں سے تشریف لے چلیے۔" الفاظ مہذب ہونے کے باوجود ان کے لہجے میں محسوس کیا جانے والا روکھا پن تھا۔

"ہمارے جانے سے بات ختم تو نہیں ہو جائے گی۔ آپ کے بھائی صاحب کو ماموں جان کی خدمت میں بھی جواب دہی کرنی ہوگی۔" اختر نے قہقہہ لگا کر کہا لیکن بہر حال عالیہ کی ہمراہی میں چل پڑا۔ اس کے حساب سے تو اس کی آسانی سے ہی گلو خلاصی ہو رہی تھی۔ جولیٹ کے انکشافات نے اس کی مکروہ حرکت کو فی الحال پسِ پشت ڈال دیا تھا۔

"اختر کی بات سولہ آنے درست ہے اسد اللہ۔ آپ کیسے بھائی جان کے روبرو اس شرم ناک حقیقت کا اعتراف کریں گے۔ آپ کے اعتراف سے حویلی کی بنیادیں ہل جائیں گی۔" اب ندرت جہاں نے بیٹے کی جگہ سنبھالی۔

"ہم اپنی لغزش کی سزا سو کوڑوں کی صورت میں کھانے کو تیار ہیں لیکن اب اپنی بیٹی کو خود سے جدا نہیں کریں گے، چاہے ابا جان ہمیں اس حویلی سے باہر ہی کیوں نہ نکال دیں۔" اسد اللہ نے اپنے عزائم کا اظہار کیا۔

"کاہے کی بیٹی میاں۔ اس لڑکی نے آکر دعویٰ کیا اور آپ بغیر کسی ثبوت اور گواہ کے اسے سچا مان بیٹھے۔ پہلے اس کے دعوے کو پرکھ تو لیجیے۔" ندرت جہاں چمک کر بولیں۔

"پرکھنے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ ہم نے پہلے ہی روز اس کے نقوش میں جوزفین کے نقوش کو کھوج لیا تھا۔ بس منتظر تھے کہ یہ خود اپنی زبان سے اعتراف کرلے۔ اسے جوزفین کی بیٹی سمجھ کر ہی تو ہم اس کی اتنی حمایت کرتے تھے۔ ہمیں کیا معلوم تھا کہ یہ ہماری بھی بیٹی ہے۔ حالانکہ اس نے ہمارے بھی تو کتنے رنگ چرائے ہیں لیکن ہم اس میں جوزفین کے رنگ دیکھنے میں اتنے محو تھے کہ ہمارا اس طرف دھیان ہی نہیں جاسکا۔" وہ جولیٹ کے اپنی بیٹی ہونے کے معاملے میں پُریقین تھے۔

"اب اس عمر میں آپ کو لیلیٰ مجنوں کی داستان دہراتے ہوئے حیا نہیں آئے گی اسد اللہ...... کچھ تو خیال کیجیے۔ اس حویلی میں نوجوان نسل بھی موجود ہے۔ وہ آپ سے کیا سبق سیکھیں گے۔" ندرت جہاں کا بس نہیں چل رہا تھا کہ کیسے جولیٹ کو اس منظر بلکہ حویلی سے ہی غائب کردیں۔

"نوجوان نسل ہم سے زیادہ باشعور ہے پھپھی جان۔ وہ حقائق کو زیادہ بہتر طور پر سمجھ کر ہماری لغزشوں کو معاف کردے گی۔" اسد اللہ نے انہیں جواب دیا۔

"آپ جو بھی کہیں میاں، یہ بات اتنی سیدھی نہیں ہے۔ ہم آپ کو جتنا سمجھا سکتے تھے سمجھا دیا۔ اب تو بھائی صاحب ہی اس مقدمے کا فیصلہ کریں گے۔" وہ تنتناتی ہوئی

اپنی جگہ سے کھڑی ہوئیں لیکن ان کے وجود میں استادم نہیں تھا کہ بغیر سہارے کے اپنے کمرے تک واپس چلی جاتیں۔ بڑوں کے درمیان خاموش کردار ادا کرتے حسیب اللہ نے فوراً انہیں سہارا دیا۔

"ہمارے خیال میں اب آرام کرنا چاہیے۔ صبح اس معاملے پر صبح سے غور کریں گے۔" صفی اللہ نے رائے دینے والے انداز میں کہا۔ وہ بڑے تھے لیکن جو حقائق سامنے آئے تھے، وہ ایسے انوکھے تھے کہ فی الحال وہ خود کو کچھ کہنے کے لائق نہیں پارہے تھے۔ کوئی فیصلہ سنانا تو بالکل ہی ناممکن تھا۔

"آپ جاکر آرام کیجیے بھائی جان! ہم باپ بیٹی کو تو ابھی آپس میں بہت کچھ کہنا سننا ہے، کیوں جولیٹ...... آپ کا کیا خیال ہے؟" صفی اللہ کو جواب دیتے دیتے انہوں نے جولیٹ سے اس کی رائے مانگی۔ جواب میں وہ ان کی بات پر اثبات میں سرہلاتے ہوئے مسکرادی۔ کیسی کشش تھی خون کے رشتے کی کہ ساری نفرت وعداوت لمحوں میں غائب ہوگئی تھی اور اب وہ ایک مان رکھنے والی بیٹی کی طرح ان کی تائید کررہی تھی۔

☆☆☆

"آداب۔ آیئے تشریف لایئے۔" زمرد بائی کے کوٹھے پر اس کا استقبال کرنے والی کاجل تھی۔ اسی نے اڈے پر ملازم بھیج کر اطلاع دی تھی کہ چاند بانو چندی گڑھ سے واپس آچکی ہے اگر ہوسکے تو فاروق ملاقات کے لیے آجائے۔ فاروق جولیٹ کی وجہ سے بہت الجھا ہوا تھا پھر بھی اس پیغام کو نظرانداز نہیں کرسکا اور اگلے ہی دن زمرد بائی کے کوٹھے پر جا پہنچا جہاں کاجل اس کی منتظر تھی۔ فاروق پہلے بھی یہاں آچکا تھا اور چاند بانو کے کمرے سے واقف تھا لیکن کاجل اسے چاند بانو کے کمرے میں لے جانے کے بجائے ایک دوسرے کمرے میں لے آئی اور نہایت ادب سے اسے بیٹھنے کی پیشکش کی۔ فاروق الجھا ہوا سا بیٹھ گیا۔

"چاند بانو کا کیا حال ہے؟ وہ کب بمبئی واپس پہنچی؟" اس نے کاجل سے دریافت کیا۔

"چار دن ہوگئے ہیں اسے واپس آئے اور حال کیا بتاؤں؟ کسی سے اپنے دل کی بات کہتی سنتی ہی نہیں ہے وہ۔ ظاہری زخم تو تقریباً بھر چلے ہیں لیکن دل کا حال وہ کہے تو کوئی جان سکے اسی لیے میں نے آپ کو یہاں آنے کی زحمت دی ہے۔ آپ کو بہت اہمیت دیتی ہے وہ شاید آپ ہی سے دل کی کچھ کہہ سن لے۔" کاجل نے دھیمے سے لہجے میں اسے چاند بانو کی کیفیت کے بارے میں آگاہ کیا۔

"آپ نے بہت اچھا کیا کہ مجھے بلوا بھیجا لیکن مجھے حیرت اس بات پر ہے کہ خود چاند بانو نے اپنی واپسی کی اطلاع مجھے کیوں نہیں بھجوائی؟"

"میں نے اس سے کہا بھی تھا لیکن کہنے لگی رہنے دو خوامخواہ کسی کو کیا زحمت دینی۔" کاجل نے اسے چاند بانو کے خیالات سے آگاہ کیا۔

"ایسا کیوں سوچ رہی ہے وہ۔ وہ میرے لیے زحمت کیسے ہوسکتی ہے؟" فاروق حیران ہوا۔

"شاید دنیا والوں کے رویوں نے اس کے اندر بے یقینی پیدا کردی ہے۔ کل تک سب اس کے حسن کے پجاری تھے اور اس کے ایک اشارے پر جان دینے کو تیار رہتے تھے لیکن اب وہ کوئی بھولی بسری داستان ہوگئی ہے۔ فلم والوں نے سب سے پہلے نظریں بدلی ہیں۔ انیل کمار اس کی خیریت تک معلوم کرنے نہیں آیا حالانکہ پہلے پروانوں کی طرح اس کے گرد گھومتا تھا۔ الٹا اس نے پیغام بھیجا تھا کہ چاند بانو کی وجہ سے اسے بہت نقصان اٹھانا پڑا ہے۔ فلم کے جن مناظر کی عکس بندی ہوگئی تھی ان پر بہت خرچہ آیا تھا اور اب نئی ہیروئن تلاش کرکے نئے سرے سے فلم بندی کروانے میں اس کا مزید خرچہ ہوجائے گا اس لیے چاند بانو اس کے عیادت کے لیے نہ آنے پر برا نہ مانے۔ یہاں پر ملنے جلنے والیاں بھی بے چاری کو بہت تنگ کرتی ہیں اور ہمدردی کی آڑ میں طنز کے تیر چلاتی ہیں کہ بے چاری اتنی اونچی ہواؤں میں اڑ رہی تھی اور اب یہ حال ہے کہ کوٹھے پر بیٹھنے کے لائق بھی نہیں رہی۔ اب اسے دو ٹکے کے چرسی موالیوں کے علاوہ کوئی منہ نہ لگائے گا۔ ان حالات میں آپ سمجھ ہی سکتے ہیں کہ وہ کس کرب میں مبتلا ہوگی۔ میں اسی لیے براہ راست آپ کو اس کے کمرے میں نہیں لے گئی کہ پہلے آپ کو اس کی کیفیت سے آگاہ کردوں۔" کاجل نے اسے تفصیلات سے آگاہ کیا۔

"یہ تو آپ نے بہت اچھا کیا۔ اب بھی آپ اسے یہ نہیں بتایئے گا کہ آپ نے پیغام بھیج کر مجھے بلوایا ہے۔ میں خود ہی کوئی مناسب بہانہ بنادوں گا۔" فاروق نے اسے تاکید کی۔

"جی بہتر۔ چلیں آیئے پھر میں آپ کو اس کے کمرے تک لے چلتی ہوں۔" کاجل اپنی جگہ سے کھڑی ہوئی تو فاروق نے اس کی تقلید کی۔ وہ دونوں آگے پیچھے چلتے ہوئے چاند بانو کے کمرے کے دروازے تک پہنچے اور کاجل

نے دروازے پر دستک دی۔

''کون ہے؟ دروازہ کھلا ہے، اندر آجایئے۔'' لمحہ بھر کے توقف کے بعد چاند بانو کی آواز سنائی دی۔ اس کی آواز میں وہی خوبصورتی اور لوچ برقرار تھا لیکن ساتھ ہی حزنیہ سی کیفیت بھی جھلکتی تھی۔ اجازت ملنے پر کاجل نے دروازے کو دھکیل کر کھولا تو وہ فاروق کو سامنے ہی بیٹھی ہوئی نظر آگئی۔ سیاہ لباس میں ملبوس وہ ہاتھ میں ستار تھامے ہوئے بیٹھی تھی اور اس کا صرف آدھا چہرہ نظر آرہا تھا اور یہ چہرے کا صحیح حصہ تھا چنانچہ وہ آنکھیں موند کر بیٹھی ہوئی اب بھی مجسم حسن ہی نظر آرہی تھی۔ اس نے دروازہ کھلنے پر بھی آنکھیں کھول کر یہ دیکھنے کی زحمت نہیں کی تھی کہ کون آیا ہے۔

''چاند بانو......! دیکھو تو ذرا کون آیا ہے۔'' کاجل نے کھنکتی آواز میں ازخود اسے مخاطب کیا۔ چاند بانو نے آنکھیں کھولیں اور رخ موڑ کر دروازے کی طرف دیکھا۔ اس عمل میں اس کے چہرے کا بدنما حصہ سامنے آگیا۔ اس کے داغ دار حسن کو دیکھ کر فاروق نے اپنے دل میں کسک سی محسوس کی لیکن ہونٹوں پر مسکراہٹ سجا کر اس کی جانب دیکھا۔

''آپ......! آداب۔'' چاند بانو پہلے تو حیران ہوئی پھر ستار چھوڑ کر فوراً ہی اس کے استقبال کے لیے کھڑی ہوگئی۔

''جیتی رہیں اور آرام سے بیٹھیں۔'' فاروق نے اپنے ہونٹوں کی مسکراہٹ برقرار رکھی۔

''جیتے بھی رہے تو کیا کریں گے۔ ہمارا وجود کون سا کسی کے لیے کارآمد ہے۔'' اس نے اداسی سے جواب دیا۔

''ایسی باتیں مت کرو چاند بانو! تمہاری ایسی باتیں میرے اندر احساسِ جرم کو بڑھا دیتی ہیں۔'' فاروق نے اسے ٹوکا۔

''بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں فاروق صاحب! یہ ہمارے مہمان ہیں۔ انہیں عزت سے بٹھا کر اچھی اچھی باتیں کرو۔'' کاجل نے بھی اس کی حمایت کی۔

''اچھا بابا غلطی ہوگئی، معاف کردیجیے۔'' چاند بانو نے فوراً ہی اپنے کان پکڑے اور پھر فاروق کو بیٹھنے کی دعوت دی۔

''آپ لوگ باتیں کیجیے۔ میں فاروق صاحب کی خاطر کے لیے کچھ بھجواتی ہوں۔'' کاجل بہانے سے وہاں سے چلی گئی۔

''آپ کو کاجل نے ہماری آمد کے بارے میں اطلاع دی ہوگی؟'' اس کے جاتے ہی چاند بانو نے فاروق سے پوچھا۔

''وہ اطلاع بھجوا دیتی تو میں اس کا شکر گزار ہوتا لیکن فی الحال تو میں نے اپنے ذرائع استعمال کیے ہیں۔ چندی گڑھ رابطہ کرنے پر معلوم ہوا کہ تم وہاں سے روانہ ہوچکی ہو اس لیے میں تم سے ملاقات کے لیے یہاں آپہنچا۔ ویسے تو اصولاً تمہیں خود ہی مجھے اپنی واپسی کی اطلاع بھجوانی چاہیے تھی۔'' فاروق نے قرینے سے کاجل کا بھرم رکھ لیا۔

''بس ہم نے آپ کو زحمت دینا مناسب نہیں سمجھا۔ ویسے آپ یہ فرمایئے کہ ابھی آپ کس احساسِ جرم کی بات کررہے تھے۔ ہمارے ساتھ ہونے والے حادثے میں آپ کا تو کوئی قصور نہیں تھا۔'' چاند بانو نے موضوع بدلا۔

''قصور ہو نہ ہو، اس حادثے کا سبب میری ذات ہی تھی۔ مجھے یاد نہیں کہ میں نے تمہیں اس سلسلے میں کچھ بتایا تھا یا نہیں۔ اصل میں مجھے شروع ہی سے شک تھا کہ اس حادثے کے پیچھے بملا بھابیہ کا ہاتھ ہے۔ میری وجہ سے وہ تم سے حسد کرنے لگی تھی اور تمہیں مجھ تک پہنچنے کی راہ میں رکاوٹ سمجھتی تھی چنانچہ اس نے اپنے روپے کی طاقت کو استعمال کیا اور کرائے کے ایک آدمی کے ذریعے تمہیں مروانے کی کوشش کی۔'' فاروق اسے شملہ سے لے کر بمبئی تک کے تمام واقعات کی تفصیل سناتا چلا گیا۔ گنیش کی موت اور بملا سے ہوٹل میں ہونے والی ملاقات کا احوال تک کہہ سنایا۔ چاند بانو سینے پر ہاتھ رکھے سب سنتی رہی۔

''یا اللہ! ایک ہماری ذات کے پیچھے اتنا ہنگامہ۔ بملا بھابیہ نے جو کیا سو کیا، آپ کو کیا ضرورت پڑی تھی کسی غنڈے موالی کے منہ لگنے کی اور بملا بھابیہ سے حساب کتاب لینے کی۔ اس چکر میں خدانخواستہ آپ کو کوئی نقصان پہنچ جاتا تو ہم کیا کرتے۔ ہم اتنے اہم تو نہیں ہیں کہ آپ ہمارے لیے اتنا کشٹ اٹھاتے۔'' چاند بانو کی پلکیں بھیگنے لگیں۔

''تم اہم نہیں ہو یہ کس نے کہا اور پھر اصل بات تو میرے احساس کی تھی۔ میری وجہ سے تمہارا اتنا بڑا نقصان ہوا اور میں مجرموں سے جواب دہی بھی نہ کرتا، یہ کیسے ممکن تھا۔''

''ہمارا اصل نقصان اس صورت میں ہوتا کہ اللہ نہ کرے آپ پر کوئی آنچ آجاتی۔ آپ صحیح سلامت ہیں، ہمارے دل کے سکون کے لیے یہی کافی ہے۔'' چاند بانو کے لہجے میں سچائی ہی سچائی تھی۔

''اپنے نقصان کا دکھ نہیں ہے تو پھر تمہارے انداز میں مایوسی اور دل گرفتگی کیوں اتر آئی ہے۔ تم پہلے جیسی چاند بانو کیوں نہیں رہیں۔'' فاروق نے فوراً اسے ٹوکا۔

''آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ ہم ناشکری کے مرتکب ہو رہے تھے۔ شاید لوگوں کی باتیں ہمارے حواس پر طاری

ہو گئی تھیں ورنہ ہم تو خود اپنے حسن کے داغ دار ہو جانے پر مطمئن تھے کہ اب ہم پر کسی کی ہوس بھری نظر نہیں پڑے گی۔'' اس نے جیسے اپنی غلطی تسلیم کر لی۔

''زندگی کیسے گزارو گی چاند بانو! تمہارے پاس تو کوئی سہارا بھی نہیں ہے؟'' اپنے ذہن میں ابھرنے والا سوال فاروق بے ساختہ ہی اس سے کر بیٹھا۔

''جس نے زندگی دی ہے، وہی سہارے بھی بنا دے گا۔'' اس نے مختصر جواب دیا۔

''تم ٹھیک کہہ رہی ہو لیکن ہمارے معاشرے میں تنہا عورت کا جینا آسان نہیں ہے اور تم تو اپنی اس دنیا سے پہلے ہی نالاں تھیں۔ اسے چھوڑ کر باعزت زندگی گزارنے کا خواب کیسے پورا کرو گی؟'' وہ اس کی فکر میں مبتلا تھا۔

''خواب تو خواب ہوتے ہیں، ہر خواب کو تعبیر مل جائے یہ ضروری تو نہیں ہوتا۔'' وہ اداسی سے مسکرائی۔

''اگر میں تمہارا سہارا بن جاؤں......'' فاروق کی زبان سے نہ جانے کیسے یہ بات پھسل گئی۔ چاند بانو گنگ سی اسے دیکھتی رہی پھر اداسی سے مسکرا کر بولی۔

''ہم پر ترس کھا رہے ہیں؟''

''نہیں۔ دوستی نبھانے کی کوشش کر رہا ہوں۔''

''جانے دیجیے۔ کیوں خود کو اتنے بڑے امتحان میں ڈالتے ہیں۔ آپ تو خود اپنے بھی نہیں ہیں، ہمارے کیا بنیں گے۔ ہم جہاں ہیں وہیں ٹھیک ہیں اور آپ کے لیے دعا کرتے رہیں گے کہ آپ کو آپ کے دل کی خوشی مل جائے۔'' چاند بانو نے اس کی پیشکش رد کر دی۔

''تمہاری دعاؤں کا شکریہ لیکن میں اتنا خوش نصیب نہیں ہوں۔ اسی لیے تو سوچ رہا تھا زندگی کسی کام آ جائے اور کچھ نہیں تو میرے دل سے احساسِ شرمندگی ہی مٹ جائے گا۔'' چاند بانو کو ہمت دلانے والے کے اپنے لہجے میں شکستگی تھی۔

''ہمیں یقین ہے کہ ہماری دعائیں ضرور قبول ہوں گی اور آپ اپنے دل کی خوشی کو اپنی زندگی میں شامل کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ ایسے میں ہمارا وجود تو بے کار ہی ہوگا نا۔'' اس نے لہجے میں شوخی بھری۔

''میں سنجیدگی سے تمہیں اپنانے کی پیشکش کر رہا ہوں چاند بانو۔'' فاروق نے اسے سمجھایا۔

''لیکن ہم اسے قبول نہیں کر سکتے۔ بات اگر آپ کے قدموں میں رہ کر ساری زندگی آپ کی خدمت کرنے کی ہوتی تو ہم منظور کر لیتے لیکن ہم جانتے ہیں کہ آپ خوامخواہ ہی خود کو مجرم گردان کر کفارہ ادا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔'' چاند بانو کسی طرح قائل ہونے کے لیے راضی نہیں تھی۔ اس کا یہ انکار بھی اس کی محبت کی سچائی کی دلیل تھی۔ وہ فاروق کو اس کی روح تک جانتی تھی اور سمجھتی تھی کہ ایسا کوئی تعلق اس کے لیے بوجھ بن جائے گا۔ فاروق بھی اسے جھٹلا نہ سکا کہ واقعی وہ اس پر گزری کا سبب اپنی ذات کو جان کر اسے ایسی پیشکش کر رہا تھا۔

''آپ اپنے دل و دماغ پر بوجھ مت ڈالیے۔ ابھی ابھی ہمیں مسئلے کا ایک حل سوجھا ہے۔ مانا کہ ہم سے ہماری حسین صورت چھن گئی ہے لیکن گلے کا سُر تو سلامت ہے نا.... ہم اسے اپنی روزی روٹی کا ذریعہ بنا لیں گے۔ ویسے بھی زمرد بائی کے بعد کوٹھے کا انتظام کاجل کے ہاتھ میں ہے۔ وہ ہم سے اتنی محبت تو کرتی ہے کہ ہمیں اسی خصوصیت کی بنا پر اس کوٹھے پر پڑا رہنے دے گی۔''

''تم نے میری محبت کا اندازہ درست نہیں لگایا ہے چاند بانو! اگر تم کچھ بھی نہ کرو اور یونہی ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھی رہو تب بھی جب تک میرے جسم میں جان ہے، میں تمہیں بنا بوجھ سمجھے ساری زندگی اپنے ساتھ رکھ سکتی ہوں۔ مجھے تمہاری کمائی نہیں لبوں پر مسکراہٹ چاہیے۔ تم میری بہن نہیں لیکن سگی بہن جیسی ہی ہو۔'' کاجل پتا نہیں کب وہاں آ گئی تھی اور ان دونوں کی گفتگو سن لی تھی چنانچہ اب بڑے خلوص سے بول رہی تھی۔ اس کے خلوص پر چاند بانو کی آنکھیں بھر آئیں اور وہ لپک کر کاجل کے گلے لگ گئی۔

''ہم بھی کتنے پاگل تھے جو اتنے چاہنے والوں کے ہوتے ہوئے بھی مایوسی کا شکار ہونے لگے تھے۔ آج کے بعد ہم سے کبھی ایسی ناشکری نہیں ہوگی۔'' وہ بول رہی تھی اور فاروق سوچ رہا تھا۔

''ہم کون ہوتے ہیں مسئلوں کو حل کرنے والے۔ جس نے کائنات بنائی ہے وہ اس کا انتظام کرنا بھی خوب جانتا ہے۔''

اس روز وہ چاند بانو کے ساتھ بہت سا وقت باتوں میں گزار کر وہاں سے روانہ ہوا۔ وہ شام سے ذرا پہلے وہاں آیا تھا اور رات کے کھانے کے بعد ہی واپسی کی اجازت مل سکی تھی۔ کھانا لذیذ تھا اور بہت اصرار کے ساتھ کھلایا گیا تھا اس لیے اسے اپنی خواہش کے برخلاف سیر ہو کر کھانا پڑا تھا۔ اس بھاری کھانے کو ہضم کرنے کے لیے اس نے کوئی سواری کرنے کے بجائے پیدل ہی چلنے کا فیصلہ کیا۔ دل میں یہی خیال تھا کہ جہاں تک پیروں نے ساتھ دیا، پیدل چلے

گا پھر کوئی سواری لے لے گا۔ وہ اپنے خیالوں میں مگن چلا جا رہا تھا۔ چاند بانو کے سلسلے میں دل پر جو بوجھ تھا، وہ کسی حد تک کم ہو گیا تھا۔ چاند بانو نے اپنی مرضی سے اپنے لیے زندگی کی ایک راہ متعین کر لی تھی اور وہ ایک طرح سے اس کا ممنون تھا کہ اس نے اس کی پیشکش قبول نہیں کی تھی۔ اس کی زندگی میں جولیٹ کے سوا کسی کی گنجائش تھی ہی کہاں؟ چاند بانو یا کسی دوسری لڑکی سے ناتا جوڑنا تو محض سمجھوتا ہوتا اور چاند بانو کی محبت کسی سمجھوتے کی حق دار کہاں تھی۔ اسے تو خود پر حیرت تھی کہ وہ کس رو میں چاند بانو کو ایسی پیشکش کر گیا تھا۔ اس کے رویں رویں میں جولیٹ بسی ہوئی تھی۔ وہ جولیٹ جو ہمیشہ ناقابلِ حصول نظر آتی تھی اور اب ایسی جگہ چلی گئی تھی کہ وہ اس کی تلاش میں نکلتے ہوئے بھی جھجک اور تذبذب کا شکار تھا۔ دل کا ایک گوشہ کہتا تھا کہ جولیٹ کی خاطر وہ کچھ بھی کر سکتا ہے۔ وہ جہنم میں بھی ہے تو وہاں جا سکتا ہے لیکن پھر انا دامن پکڑتی تھی۔ جولیٹ کی تلاش میں جہنم تک جانا اتنا مشکل نہیں تھا جتنا وہاں جانا جہاں اس کے جانے کا اسے اشارہ ملا تھا۔ انا اسے دلیل دیتی تھی کہ جولیٹ اگر اپنی مرضی سے وہاں گئی تھی تو اس کے پاس اس کی یقیناً کوئی معقول وجہ ہوگی اور وہ خود کو وہاں محفوظ و مامون سمجھتی ہوگی جب ہی وہاں کا رخ کیا تھا لیکن اگلے ہی پل یہ بے چینی ہونے لگتی تھی کہ آخر جولیٹ کا وہاں سے تعلق ہی کیا تھا جو وہ وہاں گئی تھی؟ کسی بہت معقول وجہ کے بغیر اس کا وہاں جانا اس کے لیے نقصان کا باعث بھی بن سکتا تھا۔

اپنی ان سوچوں میں الجھا وہ ارد گرد سے اتنا بے خبر تھا کہ اپنے گھیرے جانے کا بھی احساس نہ ہو سکا۔ وہ چار افراد تھے جو آن کی آن میں اس پر آ پڑے تھے اور اسے سنبھلنے تک کا موقع نہیں دیا تھا۔ وہ کون تھے اور ان کی تعداد کتنی تھی، وہ تو یہ بھی نہیں دیکھ پایا تھا کیونکہ انہوں نے کوئی بہت بھاری چادر یا پھر کمبل وغیرہ ڈال کر سر اور منہ سمیت اس کا آدھے سے زیادہ وجود اس میں لپیٹ دیا تھا اور پھر خود بھی اس کے ساتھ کسی عفریت کی طرح ایسے لپٹ گئے تھے کہ اس کے لیے اپنے ہاتھ پیروں کو حرکت دینا ممکن نہیں رہا تھا پھر اسے چادر کے اوپر سے ہی کسی لکڑی کے گٹھے کی طرح رسی لپیٹ کر باندھ دیا گیا اور بے دردی سے کسی سواری میں ڈال دیا گیا۔ سواری مشینی تھی، اس کے حواس نے اتنا تو بتا دیا لیکن کون سی وہ اس کا صحیح اندازہ نہیں لگا سکا۔ اسے یہ بھی اندازہ نہیں تھا کہ اسے اس طرح اغوا کرنے والوں کا تعلق کس سے ہو سکتا ہے...... بس اپنے دو مخالفین کے نام ذہن میں گونج رہے تھے۔ مجو دادا اور سلا بھائی......

☆☆☆

"کیا آپ نے اچھی طرح سوچ سمجھ کر جولیٹ کو اپنی بیٹی تسلیم کیا ہے اسد اللہ؟" اگلی صبح ہی ناشتے کے فوراً بعد صفی اللہ نے انہیں اپنے کمرے میں طلب کر لیا تھا اور نہایت گمبھیر سنجیدگی کے ساتھ ان سے دریافت کر رہے تھے۔

"ہم آپ کی بات کا مطلب نہیں سمجھے بھائی جان؟"

اسد اللہ نے ان کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"ہم رات سے مسلسل اس معاملے پر غور کر رہے ہیں اور ہم نے محسوس کیا ہے کہ اپنی جذباتی کیفیت میں آپ نے اس معاملے کے بہت سے پہلوؤں کو نظر انداز کر دیا ہے۔ پہلی بات تو یہ کہ آپ اباجان کا سامنا کیسے کریں گے اور ان کے شدید ردعمل کو کس طرح برداشت کر پائیں گے؟ خاندان کی جگ ہنسائی جو ہوگی، وہ الگ ہے اور یہ سب اس صورت میں ہوگا کہ ہم حتمی طور پر یقین نہیں کر سکتے کہ جولیٹ نے جو کچھ کہا، وہ سو فیصد سچ ہے بھی یا نہیں۔ یہ بات ماننے میں تو خیر کوئی مضائقہ نہیں کہ وہ جوزفین کی بیٹی ہے لیکن وہ آپ کی بھی بیٹی ہے، اس پر کیسے یقین کر لیا جائے۔ کمپھی جان کا یہ اندازہ درست بھی تو ہو سکتا ہے کہ جوزفین نے خود آپ کے لیے یہ جال تیار کیا ہو اور وہ خود حویلی میں جگہ نہ بنا سکنے کے بعد اب اپنی بیٹی کو یہاں جگہ دلوانا چاہتی ہو اس لیے یہ داستان تیار کی گئی ہو۔"

"بس کیجیے بھائی جان! ہم مزید جوزفین پر اتنے رکیک الزامات برداشت نہیں کر سکتے۔"

اسد اللہ کو اپنی آواز پست رکھنے کے لیے بڑی جدوجہد کرنی پڑی تھی اور اس کوشش میں ان کے ہاتھوں کی انگلیاں بھنچ گئی تھیں۔ وہ بڑوں کا احترام کرنے والے آدمی تھے لیکن اپنی جوزفین پر کیسے کوئی الزام برداشت کرتے۔

کل رات کے بقیہ حصے میں وہ جولیٹ سے جوزفین کی زندگی کے ایک ایک دور کی تفصیل سنتے رہے تھے۔ وہ تو اتنی صاحبِ کردار تھی کہ ان سے شدید محبت کرنے کے باوجود جب جوزف کی زندگی میں شامل ہوئی تو پھر کبھی پلٹ کر ان کی طرف آنے کا نہیں سوچا اور ہر لمحے جوزف کی محبت اور خلوص کی قدر کرتی رہی۔ وہ محلوں کے خواب دیکھنے والی ہوتی تو کیا ساری زندگی جوزف کے چھوٹے سے گھر کو جنت بنانے میں لگی رہتی، وہ تو وہاں ایسے رہی تھی کہ جوزف کو کبھی اس سے کسی شکایت کا موقع نہیں ملا تھا۔

جولیٹ کے مطابق وہ ایک بہترین ماں اور بہترین

www.paksociety.com
دلکش موضوعات پر رنگارنگ تحریریں لیے نومبر 2016ء کا دل خوش کن پاکیزہ
ماہنامہ
پاکیزہ
کراچی
رفعت سراج اور انجم انصار ...... کے ماہرانہ قلم کے شاہکار ناولوں کی نئی اقساط
حیران کن حقیقتوں کا آئینہ...... سحر ساجد کا دل پزیر ناولٹ...... من جانبازم
زیست کے تلخ و شیریں رنگ لیے...... سیما رضا ردا کی انوکھی تحریر
شیریں حیدر ، اُمِ طیفور اور ثمینہ عظمت علی کی خصوصی تحریریں
پاکیزہ کے اولین دنوں کی ساتھی
معروف و ہر دلعزیز مصنفہ
نگہت سیما سے بھرپور گفتگو
نسرین جمیل ستّال کے قلم سے ایک انوکھے عشق کی داستان...... مکمل ناول کی صورت
اس کے علاوہ
قانتہ رابعہ، هما بیگ، تسنیم منیر علوی ، فاطمہ چوهدری، ہاجرہ ریحان،
کائنات غزل، ماہ وش طالب، مریم جہانگیر و دیگر ممتاز لکھاریوں کے پُرلطف افسانے
دلچسپ معلوماتی و تفریحی مستقل مضامین و حسین شاعری صرف آپ کی اعلیٰ ذوق کی نذر
WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1
PAKSOCIETY

بیوی تھی جس نے اپنے خاندان کے لیے وہ سب کچھ کیا تھا جو ایک اچھی عورت کرتی ہے۔ ایسی زندگی گزارنے والی عورت پر اس کے مرنے کے بعد کوئی الزام بھلا کیسے برداشت کیا جاسکتا تھا۔ وہ لالچی اور سازشی ہوتی تو کیا ساری زندگی اس خاموشی سے گزار کر خاموشی کے ساتھ دنیا سے چلی جاتی؟ اسے تو اپنی زندگی میں ہی اسد اللہ کو بلیک میل کرنے کے لیے پہنچ جانا چاہیے تھا نہ کہ وہ اپنے مرنے کے بعد اپنی بیٹی کی صوابدید پر یہ معاملہ چھوڑ دیتی کہ وہ چاہے تو اپنے باپ سے مل لے اور جولیٹ کونسا ان کی محبت میں ان سے ملنے چلی آئی تھی۔ وہ تو ان کا احتساب کرنے آئی تھی لیکن یہ جان کر کہ سازش کا شکار صرف جوزفین ہی نہیں اسد اللہ بھی ہوئے تھے، اس نے اپنے دل کی کدورت دور کرلی تھی۔ وہ ان کی بیٹی نہ ہوتی تو اتنی جلدی ان کی طرف سے اپنا دل کیسے صاف کرلیتی پھر اس کی تاریخ پیدائش بھی اس کی سچائی کا ثبوت تھی۔ جوزفین کے یہاں سے جانے کے چند ماہ بعد کی اس کی تاریخ پیدائش اس بات کا ثبوت تھی کہ وہ اپنے دعوے میں سچی ہے۔ اس کے نقوش بھی اس کے دعوے کی تصدیق کرتے تھے۔ جوزفین کی ڈائری بھی ایک بڑی گواہی تھی۔ اس ڈائری میں جتنے بھی واقعات درج تھے، وہ سچے تھے تو پھر ایک جولیٹ کے معاملے میں جوزفین جھوٹ کیسے بول سکتی تھی۔

اسد اللہ نے اس کے ساتھ زندگی کے بہت تھوڑے دن گزار کر باقی کی پوری زندگی اس کی یاد میں گزاری تھی تو یہ سب یونہی تو نہیں تھا۔ جوزفین میں کچھ تو ایسا تھا کہ اس پر زندگی نچھاور کی جاسکتی تھی۔ وہ کوئی عام سی لالچی عورت ہوتی تو ان کی طرف سے تحفے میں دیے گئے قیمتی لاکٹ کو ساری زندگی ایک نشانی اور امانت کے طور پر سنبھال کر رکھنے کے بجائے اسے فروخت کرکے اپنی زندگی بدل ڈالتی لیکن اس نے ساری زندگی بمبئی کی ایک تنگ گلی کے چھوٹے سے گھر میں قناعت اور خوش اسلوبی کے ساتھ گزار دی تھی۔ جولیٹ نے ان سے کہا تھا۔

"مجھے آج احساس ہوتا ہے کہ انہوں نے ساری زندگی ڈیڈ کا احترام کیا اور ان سے وفادار بھی رہیں لیکن محبت ہمیشہ آپ سے ہی کرتی رہیں تو یہ یونہی نہیں تھا۔ آپ کے دل میں جلتی محبت کی شمع نے ہمیشہ ان کے دل کو بھی روشن رکھا لیکن انہوں نے اس روشنی کو ہمیشہ کسی مقدس راز کی طرح چھپا کر رکھا ہوا تھا۔"

تو کیا وہ ساری زندگی اپنی محبت کی مقدس راز کی طرح حفاظت کرنے والی جوزفین کی اس کے مرنے کے بعد توہین برداشت کرسکتے تھے؟ وہ تو اتنی جلدی اور اتنی خاموشی سے اس دنیا سے چلی گئی تھی کہ انہیں اس سے اس کے ساتھ ہونے والی ناانصافیوں پر معافی مانگنے کی بھی مہلت نہیں ملی تھی۔ برسوں پہلے اس سے جدائی کا صدمہ سہہ لینے کے بعد وہ اس کے ملکِ عدم سدھار جانے کا صدمہ بھی بہت خاموشی سے اپنے دل پر سہہ رہے تھے لیکن یہ کیسے سہہ سکتے تھے کہ کوئی جوزفین کو جھوٹا قرار دیتا۔ صفی اللہ نے بھی ان کی کیفیت کو محسوس کرلیا اور نرمی سے بولے۔

"ہمیں آپ کے جذبات کا احساس ہے اسد اللہ لیکن ہم آپ کو آئندہ درپیش حالات کے بارے میں کوئی خوش امیدی نہیں دلاسکتے۔"

"ہم بھی اس بات کو سمجھتے ہیں بھائی جان اور ذہنی طور پر ہر طرح کے حالات کے لیے تیار ہیں۔ اگر ابا جان نے جولیٹ کو قبول نہیں کیا تو ہم اپنی بیٹی کو لے کر ہمیشہ کے لیے اس حویلی سے چلے جائیں گے۔" اسد اللہ نے اپنا فیصلہ سنایا۔

"ایسی باتیں مت کہیے اسد اللہ! اس عمر میں آپ ابا جان کو اپنی جدائی کا صدمہ دیں گے۔ اس صدمے کو آپ ہم سے پوچھیے۔ ہم جو ہر دن سانس تو لیتے ہیں لیکن کیسے مر مر کے جیتے ہیں، یہ ہم ہی جانتے ہیں۔" صفی اللہ کی آنکھوں سے یکدم ہی آنسو رواں ہوگئے۔ ان کے آنسوؤں نے اسد اللہ کا دل تڑپا دیا اور وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر بڑے بھائی کے قریب پہنچ گئے۔

"ہمیں ہماری گستاخی کے لیے معاف کردیں بھائی جان۔ ہم ہرگز بھی آپ کی دل آزاری نہیں چاہتے تھے۔ آپ کا غم ہمارا بھی غم ہے۔ ہم بھی آپ کے درد کو روح کی شدت سے محسوس کرتے ہیں لیکن آپ کو بھی ہماری کیفیت سمجھنی چاہیے۔ اولاد تو ہر ایک کو جان سے پیاری ہوتی ہے، چاہے جائز ہو یا ناجائز۔ ہم اپنی غلطی کو چھپانے کے لیے جولیٹ کے ساتھ ناانصافی نہیں کرسکتے۔ آپ ہی بتائیں کہ ہم کیسے اسے دھتکار سکتے ہیں۔ ہمیں تو پہلے ہی بڑے کفارے ادا کرنے ہیں۔ اس کے ساتھ ظلم کیا تو اپنی روح پر بے حد وحساب بوجھ جمع کرلیں گے۔" دونوں بھائی ایک دوسرے کے گلے لگ کر رونے لگے۔

> زندگی کے تلخ و ترش حقائق اور
> محبت کی فریب کاریوں کا مزید
> احوال اگلے ماہ ملاحظہ فرمائیں

ماما لوسی پوسی مریا

ڈاکٹر شیر شاہ سید

اس کائنات کو عجیب انسانی فطرت سے آراستہ کرنے میں جانے اس خالق کا کیا راز تھا... کہیں اتنا درد انسان کے دل میں ڈال دیا کہ اپنی تمام جمع پونجی جانوروں کی دیکھ ریکھ میں لگا کر اطمینانِ قلب حاصل کرتا ہے اور کہیں اتنا شقیق القلب ہوگیا ہے یہ انسان کہ جیتی جاگتی زندگیوں کو محض تماشا بنا کر دل خوش کرتا ہے اور انسانیت گلی گلی شرم سے چہرہ چھپائے پھرتی ہے۔

دلوں میں چٹکی لیتی ایک پرفکر اور لاجواب تحریر

وہ مجھے عید کی نماز میں مل گیا تھا۔ پہلے تو میں اسے نہیں پہچانا مگر جب اس نے اسکول کے بیتے دنوں کی باتیں کیں تو مجھے فوراً ہی یاد آ گیا۔ ہم دونوں ہی بی ایم بی اسکول کے پڑھے ہوئے تھے۔ پانچ سال تک ساتھ رہا تھا ہمارا۔ چھٹی کلاس میں ہم دونوں ساتھ ہی داخل ہوئے تھے۔ میرا تو داخلہ ہی چھٹی کلاس میں ہوا تھا۔ پہلے تو ہیڈ ماسٹر صاحب نے داخلہ دینے سے صاف انکار کر دیا تھا مگر جب میرے والد نے کسی ذریعے سے

ان سے بات کی تو وہ ٹیسٹ لینے پر راضی ہو گئے تھے۔ میں پڑھنے لکھنے میں بہت اچھا تھا۔ ٹیسٹ میرے لیے بالکل حلوا ثابت ہوا پھر انہوں نے بڑی خوشی خوشی مجھے اسکول میں داخلہ دے دیا تھا۔ وہ بڑے شفیق انسان تھے، بڑے محنتی۔ ایسے ہیڈ ماسٹر اسکولوں کو کم ہی ملتے ہیں۔ صبح سے شام تک وہ اسکول میں ہی رہتے تھے۔ نہ ان کا کوئی کوچنگ سینٹر تھا، نہ وہ لڑکوں کو گھر پر بلا کر ٹیوشن پڑھاتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اگر لڑکوں کو کوچنگ سینٹر میں جانا پڑ جائے تو ایسے اسکولوں کو بند کر دینا چاہیے۔ انہیں میں نے صرف محنت ہی کرتے دیکھا تھا۔ ان کا غصہ بھی بہت غضب کا تھا۔ صبح اسمبلی لائن میں وہ ہر ایک کلاس کو دیکھا کرتے تھے۔ کسی کے بال بڑھے ہوئے ہیں، کسی کے ناخن نہیں کٹے ہوئے، کسی کا جوتا پالش نہیں کیا ہوا، کسی کی قمیص پر نشان پڑا ہوا ہے، کسی کی پینٹ پر روشنائی گری ہوئی ہے ہر ایک چیز پر ان کی نگاہ ہوتی تھی۔ لمبے بالوں سے تو انہیں بلا کی چڑ تھی اگر ہم میں سے کسی کے بال کانوں سے نیچے آجاتے تو وہ گھر خط لکھتے تھے کہ اپنے بچے کے بال کٹوالیں اور اگر دوسرے دن بال نہیں کٹے ہوں تو اسکول میں ایک حجام آکر بال کاٹ دیا کرتا تھا۔ میں اب پیچھے مڑ کر دیکھتا ہوں تو مجھے ایسا لگتا ہے کہ پانچ سال اسکول میں جس طرح سے میری تربیت ہوئی تھی، وہ اب میری شخصیت کا حصہ بن چکی ہے۔ ہمارے اسکول کے ہر لڑکے کا یہی حال تھا۔ آج کل کے مہنگے اسکولوں کے مقابلے میں وہاں صرف تعلیم نہیں ملتی تھی بلکہ انسانیت کے ہنر بھی سکھائے جاتے تھے۔

زاہد کا داخلہ بھی چھٹی کلاس میں ہوا تھا۔ وہ میرے بعد کلاس میں آیا تھا۔ میرا نمبر اکتالیس تھا اور اس کا بیالیس اور ہم دونوں کو آخر میں سیٹ ملی تھی۔ شروع میں پوری کلاس ہمارے خلاف تھی لہٰذا ہم دونوں کی دوستی فوراً ہی ہوگئی تھی مگر آہستہ آہستہ ہم دونوں کلاس میں گھل مل گئے تھے۔

میں آگرہ تاج کالونی میں رہتا تھا۔ غازی اسکول کے بس اسٹاپ سے اتر کر اسکول کے پیچھے ہی ہم لوگوں کا گھر تھا۔ میرے والد پاکستان ٹوبیکو کمپنی میں کام کرتے تھے اور سگریٹ بہت شوق سے پیتے تھے۔ میں کالج میں تھا کہ انہیں خون کی الٹیاں شروع ہوگئیں۔ سول اسپتال سے ڈاکٹروں نے بجلی لگانے کے لیے جناح اسپتال بھیجا۔ تھوڑے دنوں بعد ہی ان کا انتقال ہوگیا۔ مجھے سگریٹ سے شاید نفرت اسی لیے ہوگئی تھی۔ سگریٹ کے ساتھ ہی مجھے خون کی الٹیاں کرتے ہوئے میرے والد صاحب نظر آتے ہیں۔

زاہد کھارادر میں رہتا تھا۔ ایک دن جب میں دس نمبر کی بس پکڑ کر بجائے ٹاور جانے کے کھارادر پر اتر گیا تو وہ مجھے میمن مسجد کی طرف جانے والی سڑک پر مل گیا تھا۔ میں اکثر ایسا کرتا تھا۔ مجھے روزانہ پانچ آنے یا چھ آنے ملا کرتے تھے جو میرے کرائے اور جیب خرچ کے لیے ہوتے تھے۔ اکثر میں صبح سویرے نکلا کرتا تھا اور بجائے ٹاور جانے کے کھارادر پر اتر جاتا تھا۔ کھارادر سے ایک شارٹ راستہ تھا جس سے ہوتے ہوئے میمن مسجد کے گیٹ سے نکل کر بولٹن مارکیٹ میں بندر روڈ پر راستہ نکلتا تھا۔ بولٹن مارکیٹ سے ٹرام لے کر جامعہ کلاتھ مارکیٹ پہنچنا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ فائدہ یہ ہوتا تھا کہ ٹرام میں بغیر ٹکٹ سفر ہوسکتا تھا اور اس طرح سے ایک آنے کی بچت ہوجاتی تھی۔ میں اپنے چھوٹے موٹے کاموں کے لیے اسی طرح سے پیسے جمع کرلیا کرتا تھا۔ سستا زمانہ تھا، ایک آنے میں آدھا سیر امرود یا تین کریم رول مل جایا کرتے تھے۔ اسکول کے باہر بنگالی کے ٹھیلے سے چورن یا بابا سے جنگل جلیبی لے کر کھانے میں بہت مزہ آتا تھا۔

پھر تو میرا یہ معمول ہی بن گیا تھا کہ کھارادر پر زاہد سے مل کر اس کے ساتھ بولٹن مارکیٹ جانا پھر وہاں سے ٹرام پر بیٹھ کر جامعہ کلاتھ جانا اور پیسے بچانا اور نئی نئی وہ تمام چیزیں کھانا جن سے میرے گھر والے منع کیا کرتے تھے۔ زاہد کو ہر چیز کا پتا تھا۔ وہ ہماری کلاس کا سب سے سیانا بندہ تھا۔ ٹاور سے مرچوں والے چھولے وغیرہ وغیرہ میٹرک تک پہنچتے پہنچتے ان سب چیزوں کا مزہ ہم لوگ لوٹ چکے تھے۔ گھر سے چھپ کر پہلی فلم ''ارمان'' میں نے زاہد کے ہی ساتھ ناز سینما میں دیکھی تھی۔ شمیم آرا کی ''سہیلی'' بھی سب سے چھپ کر دیکھی تھی۔

میٹرک کے بعد ساری کلاس جیسے غائب ہوگئی تھی۔ میں نے ایس ایم کالج کامرس میں داخلہ لیا تھا جہاں سے بی کام پاس کرلیا تھا۔ بی کام کے دوران ہی میرے والد صاحب کا انتقال ہوگیا تھا جس کے بعد مجھے نوکری پر بھی توجہ دینی پڑی تھی۔ مجھے پارسیوں کی ایک پرانی اکاؤنٹنگ فرم میں نوکری مل گئی اور زندگی کی اس دوڑ میں

بہت سی چیزیں بچھڑ گئیں، زاہد بھی ان میں سے ایک تھا۔

میں نے بڑی محنت سے کام کیا تھا۔ میرا بڈھا پارسی باس جس کے دونوں بیٹے امریکا میں آباد ہو گئے تھے اور ایک بیٹی اپنے شوہر کے ساتھ کینیڈا چلی گئی تھی، مجھ پر بڑا مہربان تھا۔ اس نے نہ صرف میری مالی مدد کی تھی بلکہ اس طرح سے راہنمائی بھی کی کہ میں بغیر وقت ضائع کیے ہوئے چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ بن گیا تھا۔

اب میری اپنی اکاؤنٹنگ کی فرم ہے۔ رہائش بھی بدل گئی۔

اس عید پر ڈیفنس کی بڑی مسجد میں زاہد سے ملاقات ہوئی تھی۔ عید ملنے کے بعد ہم لوگوں نے اپنے فون نمبروں کا تبادلہ کیا تھا۔ میں نے اسے بتایا تھا کہ اب میں اکاؤنٹنٹ ہو گیا ہوں۔ مجھے یاد نہیں تھا کہ اس نے اپنے بارے میں کیا بتایا تھا۔ میں نے سوچا تھا کہ اسے ضرور فون کروں گا مگر اس کا نمبر مجھ سے کھو گیا۔

ایک دن آفس میں اس کا فون آیا۔ میں آواز سے ہی پہچان گیا تھا۔ اس نے مجھے اپنے آفس میں بلایا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ اسے مجھ سے کام بھی ہے۔ وہ اپنے اکاؤنٹنٹ کو بدلنا چاہ رہا تھا اور اس سلسلے میں اسے کچھ مشورہ چاہیے تھا۔ ہم نے کچھ پرانی باتیں کی تھیں پھر میں نے اسے بتایا تھا کہ میں کب اس کے آفس آؤں گا۔

تین دن کے بعد میں اس کے آفس پہنچ گیا۔ کلفٹن کی اس بلڈنگ میں تیسری منزل پر اس کا آفس تھا۔ آفس میں داخل ہوتے ہی جو چیز سامنے آئی وہ تھی ایک بڑی سی خوب صورت بلی کی تصویر۔ یہ اس کا ادارہ تھا ادارہ تحفظ حقوق بلیاں اور وہ اس ادارے کا ڈائریکٹر تھا۔ اس کے کمرے کے باہر کچھ لوگ مختلف ٹیبلوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ دربان نے مجھے اس کے کمرے کے باہر ایک چھوٹے کمرے میں پہنچا دیا تھا، جہاں اس کی سیکریٹری اپنے کمپیوٹر پر بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ مجھے دیکھ کر مسکرائی تھی۔

”اچھا آپ احسان صاحب ہیں؟ جی ہاں زاہد صاحب آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔“ وہ مجھے لے کر سیدھے زاہد کے کمرے میں چلی گئی تھی۔

اس کا کمرا خوب صورت تھا۔ بڑے سلیقے سے سجایا گیا تھا۔ دیواروں پر خوب صورت تصویروں کے ساتھ بلیوں کی تصاویر مختلف انداز میں لگی ہوئی تھیں۔ اس کے بالکل پیچھے دیوار پر تین بلیوں کی تصویر تھی جن کی دم کو آپس میں باندھ دیا گیا تھا۔ ساتھ میں ایک تیر کی طرح کا ہتھیار

ماہنامہ داستانِ دل ساہیوال

ادب کی دنیا میں ایک نیا نام

نئے لکھنے والوں کے لئے ایک بہترین پلیٹ فارم

اگر آپ لکھاری ہیں اور تحریر کسی مستند ادارے میں بھیجنا چاہتے ہیں تو ابھی داستانِ دل کو بھیجیں۔ آپ کی تحریر قریب کے شمارے میں پبلش کی جائے گی۔ آپ اپنے افسانے، ناولٹ، ناولز، کہانیاں، جگ بیتیاں، آپ بیتیاں، غزلیں یا پھر نظمیں ہمیں ای میل کے ذریعے، ڈاک کے ذریعے یہاں تک کہ وٹس ایپ کے ذریعے بھی بھیج سکتے ہیں۔ بس آپ کی تحریر اردو میں لکھی ہونی چاہیئے۔ اگر آپ نئے لکھاری ہیں تو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، آپ اپنی تحریر ہمیں بھیجیں ہم اس کو صحیح کر کے اپنے شمارے کا حصہ بنائیں گے۔ اگر آپ لکھنا نہیں جانتے تب بھی آپ کو فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں آپ ہمیں کوئی بھی اچھی سی غزل یا اقوال زریں انتخاب کے لئے بھیج سکتے ہیں۔ وہ بھی داستانِ دل کا حصہ بنے گا۔ اس کے علاوہ آپ اپنی تحریر موبائل پر بھی میسج کر سکتے ہیں بس اردو میں تحریر ہو۔

ہمارے داستانِ دل کے سلسلے کچھ اس طرح سے ہیں

محبت نامے، ملک کی ممتاز شخصیات کا انٹرویو، افسانے ناولز، ناولٹ، غزلیں، نظمیں، حمد، نعت اور انتخاب

اس کے علاوہ آپ کی ہر تحریر کو ہمارے شمارے میں خاص جگہ دی جائے گی۔ آپ ہمارے سارے شمارے پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر پڑھ سکتے ہیں اور پڑھ کر اپنی رائے دے سکتے ہیں

ہمارا ایڈریس ہے۔

ندیم عباس ڈھکو چک نمبر 5-L / 79 ڈاکخانہ 5.L / 78 تحصیل و ضلع ساہیوال

وٹس ایپ نمبر: 03225494228

ای میل ایڈریس ہے abbasnadeem283@gmail.com

تھا جو دُموں کی گرہ کو الگ کر رہا تھا۔ اس تیر کے اوپر ادارہ تحفظ حقوقِ بلیاں کا نشان بنا ہوا تھا۔ اس کی ٹیبل کے دائیں جانب ایک بوڑھی یورپین عورت کی تصویر تھی جو بہت ساری بلیوں کے درمیان بیٹھی ہوئی تھی۔

وہ مجھے دیکھ کر کھڑا ہو گیا، بڑے خلوص سے ملا تھا۔

دیر تک ہم دونوں اسکول کی باتیں کرتے رہے۔ ماسٹر فضل دین کی کہانیاں اور پی ٹی ماسٹر کی مختلف سزائیں۔ ہمارا اسکول سے بھاگنا یا خوامخواہ بوہری بازار میں پھیرے لگانا۔ اسے ہر کلاس کی بہت ساری چھوٹی چھوٹی باتیں یاد تھیں۔ ہم گپ مارتے رہے اور چائے پیتے رہے، وہ شام میری بھی فارغ تھی اور شاید اس نے بھی اپنے آپ کو فارغ رکھا ہوا تھا۔ ہم دونوں بچھڑے دنوں کی باتیں کرتے رہے۔ اس نے ہی بتایا تھا کہ ہیڈ ماسٹر صاحب کا انتقال ہو گیا تھا اور کچھ اور کلاس ٹیچروں کے بارے میں بھی اسے پتا تھا۔ وہ ایک اچھی شام ثابت ہوئی۔

رخصت ہوتے ہوئے اس نے مجھ سے وقت مانگا تھا تاکہ کچھ کام کی باتیں کرے۔ دو دن بعد میں نے اسے اپنے آفس بلا لیا تھا۔

اس کا ادارہ دنیا بھر میں بلیوں کے حقوق کا تحفظ کرتا تھا۔ پاکستان میں اس نے ہی اس ادارے کی بنیاد رکھی تھی، اب اس کا کام بہت بڑھ گیا تھا۔ لاکھوں ڈالرز کا بجٹ تھا اور بقول اس کے اگلے سال سے کتوں کے حقوق کے لیے بھی انہیں کام کرنا تھا۔ اس صورت میں کام مزید بڑھ جانا تھا اسے سارے کام کے اکاؤنٹس کو صحیح رکھنے میں مشکل ہو رہی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ اکاؤنٹس کی دیکھ بھال کے لیے میں اسے کوئی آدمی دوں اور ہر سال اس کا آڈٹ بھی کروں تاکہ بین الاقوامی میٹنگوں میں مشکل نہ ہو۔ اس نے کہا تھا کہ جو بھی ہماری فیس ہوگی، اسے ادا کرنے میں ادارے کو کسی بھی قسم کی مشکلات کا سامنا نہیں کرنا ہوگا۔

میں نے ہامی بھر لی کہ ایک اکاؤنٹنٹ میں بھیج دوں گا اور اس کی ابتدائی رپورٹ کے مطابق فیصلہ کروں گا کہ ہماری فرم کے لیے کام کرنا ممکن ہوگا کہ نہیں۔

جلد ہی مجھے پتا چل گیا کہ ادارے کا نظام اطمینان بخش ہے۔ لاکھوں ڈالرز کا فنڈ ہر سال یورپ اور امریکا سے آتا ہے۔ ادارے کا مرکز درحقیقت سوئٹزر لینڈ میں تھا۔ زاہد پاکستان کی برانچ کا بانی بھی تھا اور ڈائریکٹر بھی، جسے پاکستان میں تمام اختیارات حاصل تھے۔ ادارہ ہی اس کی تنخواہ دیتا تھا اور اس کے بتائے ہوئے طریقوں پر مختلف مہمیں چلاتا تھا۔ ہر سال جنیوا میں ادارے کی مختلف برانچوں کی میٹنگ ہوتی تھی اور ہر تین سال بعد دنیا کے مختلف حصوں میں ادارے کا کنونشن ہوتا تھا۔ آمدنی اور اخراجات کا حساب کتاب بہت مناسب تھا اور میری فرم نے اس کے ادارے کے آڈٹ کا کام سنبھال لیا تھا۔

زاہد خیابانِ توحید پر دو ہزار گز کے پلاٹ پر ایک خوب صورت سے بنگلے میں رہتا تھا۔ اس بنگلے میں وسیع و عریض لان تھا جس کے ساتھ ہی ایک خوب صورت سا سوئمنگ پول تھا جس کے کنارے پر باربی کیو کے لوازمات بھی موجود تھے۔ اندر کشادہ سا ڈرائنگ روم تھا جہاں ایک بڑی سی تصویر تھی۔ بیچ میں وہی یورپین بوڑھی سی عورت بہت ساری بلیوں کے درمیان بیٹھی ہوئی تھی۔

آہستہ آہستہ ہم دونوں کی پرانی دوستی مزید مستحکم ہو گئی، ساتھ ہی مجھے اس کے ادارے کی سرگرمیوں کا اندازہ بھی ہو گیا تھا۔ بلیوں کے حقوق سے متعلق اس کے ادارے کی سرگرمیوں کا دائرہ بہت وسیع تھا۔ مثلاً انہوں نے ”بلیوں کے حقوق اور انسان“ نام کی کتاب چھاپی ہوئی تھی جس میں انسان اور بلیوں کے صدیوں پرانے تعلقات پر روشنی ڈالی گئی تھی اور بلیوں کے ان حقوق کا ذکر کیا تھا جن کا انسان بالکل خیال نہیں کر رہا تھا۔

”بلی کی ذاتی رائے“ نامی کتاب میں بلی کے احساسات اور جذبات کا احترام کرنے کی ہدایت کی گئی تھی۔ بچوں کے لیے ایک خوب صورت باتصویر کتاب تھی ”بلیاں ہم سب کی دوست“۔ بلیوں کے بارے میں ہی ایک کارٹون کہانی تھی جو کسی انگریزی کتاب کا ترجمہ تھا۔ اسی طرح سے چھوٹے چھوٹے کئی پمفلٹ تھے جن میں بلیوں پر ہونے والے ظلم سے لے کر بلیوں کے ساتھ ہونے والے عجیب و غریب واقعات کی نشان دہی کی گئی تھی۔ ایک پمفلٹ میں مختلف مذاہب میں بلیوں کے مقام کے بارے میں اطلاعات فراہم کی گئی تھیں۔ اسی پمفلٹ سے مجھے پتا لگا تھا کہ حضرت ابوہریرہؓ کا نام ابوہریرہ اس لیے رکھا گیا تھا کہ وہ مکے کی بلیوں کی حفاظت و نگہداشت کیا کرتے تھے۔

ادارہ تحفظ حقوقِ بلیاں کے حساب کتاب دیکھنے سے جلد ہی مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ زاہد ہی اس سارے نظام کا بانی بھی ہے اور اس ادارے کے چلانے کی ذمے داری بھی اسی پر ہے۔ ادارے میں کام کرنے والے تمام لوگ تنخواہ دار ملازم تھے اور بہت اچھی تنخواہوں پر کام

کررہے تھے۔ زاہد بھی تنخواہ دار ڈائریکٹر تھا۔ ادارے کا مرکزی دفتر جنیوا میں تھا، وہاں کی ہدایات پر وہ کام کرتے تھے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ زاہد نے یہ سلسلہ شروع کیسے کیا تھا۔ اس کی بھی تفصیل ایک دن مل گئی تھی۔

اس شام میں زاہد کے خوب صورت ڈرائنگ روم میں بیٹھا اس سے گپ مار رہا تھا۔ زاہد پچھلی شام ہی جنیوا سے واپس آیا تھا اور اپنے ساتھ نیچر کی کچھ بوتلیں بھی لے آیا تھا۔ نیچر مجھے بھی بہت پسند ہے۔ یہ مشروب ایک مہربان استاد کی طرح ہے جس کی اچھی باتوں کا نشہ کبھی نہیں اترتا۔ ترش ترش، دھیمی دھیمی اور بہت گداز۔ اس نے ایک ساتھ شام گزارنے کے لیے مجھے بلایا تھا۔ میں عادی پینے والا نہیں تھا مگر کبھی کبھار ضرور پی لیتا تھا۔ یہ بھی میں نے اپنے پارسی باس سے سیکھا تھا۔ جب کبھی کبھار وہ مجھے اپنے گھر بلاتے تھے، پی آئی ڈی سی بلڈنگ کے پیچھے پتھروں کے بنے ہوئے گھر کے کشادہ لان پر جب کیماڑی سے آنے والی ہوا اپنے سرور میں چلتی تھی تو اس مشروب کا سرور کچھ اور ہی مزہ دیتا تھا۔ نہ جانے یہ مجھے کیوں بہت اچھی لگتی تھی۔ اس دن بھی ہم موسیقی کے دھیمے سروں میں لطف اندوز ہو رہے تھے تو نہ جانے کیوں یکایک میں اس سے پوچھ بیٹھا کہ یار یہ بلیوں کے چکر میں تو کب سے پڑ گیا؟

زاہد زور سے ہنسا تھا۔ ”یار پرانا قصہ ہے، کہاں سے شروع کروں؟ چلو شروع سے شروع کرتا ہوں۔ ہوا یہ کہ میٹرک میں میری سیکنڈ ڈویژن آئی تھی اور میں نے داخلہ اسلامیہ کالج میں لیا تھا اور وہاں ہی میں سیاست میں حصہ لینے لگا تھا اس طرح سیاسی لیڈروں سے دوستی ہوگئی۔ ساتھ ہی میں تقریریں وقریریں بھی کرنے لگا تھا۔ پھر پابندی سے سیاسی جماعت کا وظیفہ بھی ملتا تھا۔ ایوب خان کے الیکشن میں تو میں نے کام بھی کیا تھا پھر الیکشن ہوئے اور پاکستان ٹوٹ گیا..... بھٹو صاحب کے وزیراعظم بنتے وقت میں بی اے کرکے لاء کالج میں قانون پڑھ رہا تھا۔ ایل ایل بی تو جیسے تیسے میں نے پاس کرلیا تھا مگر وکالت کرنا بڑا مشکل تھا۔ میں کام کی تلاش کے ساتھ ساتھ سیاسی پارٹی کے آفس میں کام کرتا تھا جس میں پیداگیری بھی ہوتی تھی۔ بہت سے لوگوں کے بہت سے کام کرائے تھے۔ میڈیکل انجینئرنگ کالج میں داخلے سے لے کر پلاٹوں کے الاٹمنٹ تک ہر کام کا کوئی نہ کوئی وزیر تھا اور پیسوں سے سارے کام ہوجاتے تھے۔ جس بلڈنگ میں میرا آفس ہے، اس بلڈنگ کا وہ فلور میری ملکیت ہے۔ وہ بھی مجھے ایسے ہی ملا تھا۔ اس کے بلڈر کا سارا کام میں نے کرایا تھا۔ اس پلاٹ کا کمرشلائزیشن، پھر اس کا نقشہ اور اس نقشے کے پاس ہونے کے بعد اس میں دو منزلوں کا اضافہ۔ ہر جگہ یہ کام ہوگیا تھا۔ میں اپنے دھندوں میں لگا ہوا تھا کہ پھر مارشل لاء آگیا۔ مارشل لاء کے ساتھ ہی میں نے بھی وہ سیاسی پارٹی چھوڑ دی تھی۔ فوجی حکومت میں تو بڑی آسانی ہوگئی تھی۔ جلد ہی میری دوستی صحیح لوگوں سے ہوگئی اور بیچ کے آدمی کی حیثیت سے میں نے بھی کافی کمایا۔ یہ والا پلاٹ مجھے اسی زمانے میں کوڑیوں کے بھاؤ مل گیا تھا۔ اسی زمانے کی بات ہے ایک دن اخبار میں، میں نے پڑھا کہ سوئٹزرلینڈ میں ایک میٹنگ ہوئی ہے جس میں دنیا بھر کی بلیوں پر ہونے والے مظالم پر شدید غم و غصے کا اظہار کیا گیا ہے اور اس سلسلے میں ایک تنظیم بنائی گئی ہے جو بلیوں کے حقوق کا تحفظ کرے گی اور ساری دنیا میں کام کرے گی۔ میں نے ایسے ہی انہیں خط لکھ دیا کہ میں بھی اس جدوجہد میں شامل ہونا چاہتا ہوں۔ فوراً ہی مجھے جواب آگیا تھا کہ اس سلسلے میں ایک کانفرنس کا انعقاد ہو رہا ہے جس میں مجھے بھی بلایا گیا تھا۔ یہ میرا پاکستان سے باہر کا پہلا دورہ تھا۔ اس میٹنگ میں ایک بوڑھی خاتون جنہوں نے لاکھوں ڈالرز اس مقصد کے لیے دیے تھے، انہوں نے بڑی شاندار تقریر کی تھی۔ ان کی کہانی بھی خوب ہے۔“

یہ کہہ کر وہ رکا اپنے اور میرے خالی گلاس کو مشروب اور برف سے لبریز کرکے پھر بولا۔ ”یہ بڑی بی اپنی سیاحی کے دوران ہندوستان کے کسی پہاڑی علاقے میں پہنچ گئی تھیں۔ وہاں انہوں نے دیکھا تھا کہ بچے اور بڑے سب شوق سے بلیوں کا کھیل کھیلتے ہیں۔ اس کھیل میں پانچ بلیوں کی دم کو تختی سے باندھ کر میدان میں چھوڑ دیا جاتا ہے اور جس کی بلی سب سے پہلے دم چھڑا کر یا تڑا کر بھاگتی ہے اسے انعام ملتا ہے۔ بلیوں کا یہ کھیل ان سے برداشت نہیں ہوسکا تھا۔ ہماری تنظیم کا یہ نشان وہیں سے آیا ہے، یہ تیر ہم لوگوں کی نشان دہی کرتا ہے۔ ہم دنیا کی تمام بلیوں کو آزاد کرانا چاہتے ہیں۔ اس کانفرنس میں اسلامی اور ایشیا افریقا کے ملکوں سے میں واحد نمائندہ تھا۔ مادام نے مجھے اپنے گھر خصوصی طور پر

بلایا تھا۔ مجھے ابھی تک یاد ہے جنیوا شہر سے تھوڑا باہر ایک بڑے سے ولا کے ایک بڑے سے ہال میں وہ اپنی کئی بلیوں کے درمیان کھڑی تھیں جب میں پہنچا تھا۔ یہ ہال میں لگی ہوئی تصویر اسی وقت کی تھی۔ کائنات کا سارا پیار ان کے چہرے پر عیاں ہے جو صرف بلیوں کے لیے تھا۔ یہ تھیں ماما لوسی پوسی مریا۔ ان کا نام تو لوسی مریا تھا مگر بلیوں کی محبت کی وجہ سے انہیں ماما لوسی پوسی مریا کہا جاتا تھا۔ ان کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ ارب پتی شوہر کے مرنے کے بعد تمام دولت انہیں مل گئی تھی، جس سے انہوں نے بلی فاؤنڈیشن بنایا تھا۔ مجھے بہت اہمیت دی گئی تھی اور پھر میں نے بھی فیصلہ کرلیا تھا کہ اب زندگی بلیوں کی مد میں ہی گزاروں گا۔ اس علاقے کا ڈائریکٹر مجھے بنایا گیا تھا۔ میں نے بھی عقل مندی سے کام لیتے ہوئے اپنا آفس ادارہ تحفظ بلیاں کو کرائے پر دے دیا تھا اور وہیں سے ہی آپریٹ کرتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ رکا، دھیرے سے مسکرایا اور چڑھی چڑھی آنکھوں کے ساتھ بولا۔ "یار! بلی دی تو اپنی جگہ پر خیر ہے مگر ہوا یہ ہے کہ بہترین آفس ہے، بہترین تنخواہ ہے اور ہر سال کا بجٹ ہے اور بلیوں کے حقوق کا مسئلہ ہے۔ ساتھ میں دنیا گھومنے کو الگ ملتی ہے۔ زندگی مزے میں گزر رہی ہے اور مجھے نہیں لگتا کہ میری زندگی میں بلیوں کا مسئلہ حل ہو سکے گا۔"

زندگی مزے میں ہی گزر رہی تھی۔ اس کا اکاؤنٹنٹ ہونے کے ناتے مجھے پتا لگ گیا تھا کہ یہ کام کبھی بھی ختم نہیں ہوگا۔ یورپ امریکا میں مرنے والے ارب پتی، کروڑ پتی لوگ اور پیٹ کے مسائل سے آزاد قومیں دنیا بھر کی بلیوں، کتوں اور جانوروں کے لیے رقم دیتے رہیں گے اور زاہد جیسے پروفیشنل لوگ یہ کام خوب طریقے سے کرتے رہیں گے۔ مشروب کی آخری بوند کے بعد وہ محفل برخواست ہوگئی تھی۔

ایک دن شام کو زاہد کا فون آیا۔ "اب کام بڑھ جائے گا کیونکہ یہ تنظیم دوسرے جانوروں کے حقوق کے لیے بھی کام کرے گی۔ پچھلی ڈائریکٹرز کی میٹنگ میں بڑے بحث و مباحثے کے بعد اب ہمارے مینڈیٹ یعنی دائرۂ عمل کو بڑھا دیا گیا ہے۔ کتوں سے غیر انسانی سلوک، گدھوں گھوڑوں کا استعمال اور دیگر جانوروں سے غیر معیاری رویہ قابلِ قبول نہیں ہے۔" یہ کہہ کر وہ رکا تھا پھر بولا "تمہارا ابھی کام بڑھ جائے گا کیونکہ میرا بجٹ تقریباً تین گنا بڑھ جائے گا۔" مجھے ٹیلی فون کے دوسری جانب اس کے چہرے پر کھلی ہوئی مسکراہٹ صاف نظر آرہی تھی۔ پھر یکایک وہ بولا "یار کیا کر رہے ہو۔ آجاؤ پول پہ کباب لگ رہے ہیں اور مشروب کی بوتل کھلی ہوئی ہے آؤ اور غم غلط کرو۔"

میں بھی فارغ ہی تھا، فوراً ہی ہامی بھر بیٹھا۔ جب میں پہنچا تو وہ بڑے سے ڈرائنگ روم میں ماما لوسی پوسی مریا کی تصویر کے نیچے بیٹھا تھا۔ ماما لوسی پوسی مریا کا بلیوں کے لیے پیار اس کے چہرے پر عیاں تھا۔ یہ پیار ہی تو تھا کہ جس کی وجہ سے اس نے اپنی زندگی، جائداد اور دولت ان بلیوں کے لیے تیاگ دی تھی۔ یہ آج کی دنیا کا عجب معاملہ ہے۔ وہ جن کے پاس بے انتہا دولت تھی، وہ کچھ نہ کچھ کر رہے ہیں اور ان کے کچھ نہ کچھ میں بھی ہم لوگ اپنی ذاتی دنیاؤں کو آباد کر رہے تھے۔ وہ مجھے دیکھ کر زور سے چیخا۔

"یار آگئے، آجاؤ آج خوشی کا دن ہے۔" مشروب کی بوتل کسی مہربان استاد کی طرح بڑے شاطرانہ انداز سے مسکرا رہی تھی۔

ہم دونوں نے پینا شروع کردیا تھا۔ جب پی پی کر بھوک لگی تو نوکر نے خبر دی کہ سوئمنگ پول پر کباب لگا دیے گئے ہیں۔ پھر یکایک وہ واقعہ ہوگیا تھا۔ ہم دونوں جب جھومتے ہوئے سوئمنگ پول پر پہنچے تو دیکھا کہ ٹیبل پہ لگے ہوئے چکن تکوں سے ایک بلی بڑے انہماک سے شوق کر رہی تھی۔ زاہد زور سے چیخا۔ "حرام زادی۔ اندھوں دیکھتے نہیں ہو۔" اس نے ایک نوکر کو آواز دی اور زور کی لات بلی کو ماری۔ بلی کے منہ سے چکن تکا الگ جا گرا تھا اور وہ ہوا میں چکر کھا کر سوئمنگ پول کے بیچ میں جا گری۔

میرے سامنے یکایک ایمنسٹی انٹرنیشنل، ہیومن رائٹس کمیشن، انصاف برائے انسانی حقوق اور حق انسانیت کے بے شمار کارکن آگئے جو زاہد کے ساتھ کھڑے مجھے منہ چڑا رہے تھے۔

بلی سوئمنگ پول کے بیچوں بیچ غوطے کھا رہی تھی اور زندگی موت کی کشمکش میں مصروف...... اور میں سوچ رہا تھا کہ غریب اور مسائل میں گھرا انسان اور جانور شاید ان امیروں کے لیے ایک ہی صف میں کھڑے ہیں۔ کون سے حقوق اور کیسے ادارے...... سب کے مفاد الگ الگ ہیں۔

چُوک

سلیم انور

دنیا کا بڑے سے بڑا فریبی چاہے جتنی عقلمندی کا مظاہرہ کرلے مگر کہیں نہ کہیں ساری عقل تھوڑی سی "مندی" بھی پڑجاتی ہے اور بس یہی وہ لمحہ ہوتا ہے اس کی گرفت کا جب وہ اپنے ہی پھیلائے ہوئے جال میں الجھ کر گرتا ہے اور قانون کی ٹھوکر اسے اٹھنے نہیں دیتی۔

ایک چالباز حسینہ کی نادانستہ چوک کا دلچسپ احوال

سمانتھا کو شاپنگ سے عشق تھا۔ کانسی کے نفیس ونازک مجسموں سے لے کر جدید ترین فیشن کے ملبوسات کی خریداری کا، نت نئی چیزوں کا حصول اس کی زندگی تھا۔ اس کے علاوہ ایک اور شے تھی جو سمانتھا کو باقی تمام باتوں سے پیاری لگتی تھی۔ یہ وہ خواتین تھیں جو شاپنگ کے دوران اپنے کریڈٹ کارڈز کی حفاظت سے بے پروا دکھائی دیتی تھیں۔

سمانتھا جو کچھ بھی پہنتی تھی اور اس کے اپارٹمنٹ میں موجود عمدہ چیزوں میں سے بیشتر چوری شدہ کریڈٹ کارڈز

کے ذریعے خریدی گئی تھیں۔ وہ چوری شدہ کریڈٹ کارڈز کے ذریعے خریداری کو حقیقت میں کوئی چوری نہیں سمجھتی تھی۔ یہ اس کے لیے ایک طرح کا مشغلہ تھا۔ وہ ہر چوری کیے کریڈٹ کارڈ پر صرف ایک شے خریدتی تھی۔ پھر اس پلاسٹک کارڈ کو قریب ترین کوڑے دان میں پھینک دیتی تھی۔

یہ سنیچر کا ایک مصروف دن تھا۔ شاپنگ مال میں خریداروں کا ہجوم تھا۔ سمانتھا اپنے درست شکار کی تلاش میں مجمعے کا باریک بینی سے جائزہ لے رہی تھی۔ اسٹور کی چھت سے سرخ رنگ کے بڑے بڑے بینرز لٹکے ہوئے تھے جن پر ''سیل'' کے الفاظ نمایاں دکھائی دے رہے تھے۔ بڑے بڑے ڈبوں میں اشیا کا ڈھیر لگا ہوا تھا اور بے تاب خریداروں کی بھیڑ نے ان ڈبوں کو گھیرا ہوا تھا۔

ایسے ہی ایک بڑے سے ڈبے کے اطراف مجمعے میں سے ایک دراز قامت تومند عورت پیچھے ہٹی۔ اس کی عمر پچاس برس کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ اس نے اپنے ہاتھ میں چمک جمک والا ایک سنہری ہینڈ بیگ اس طرح سر سے اوپر پکڑا ہوا تھا جیسے وہ کوئی ٹرافی ہو جو اسے انعام میں ملی ہو۔

سمانتھا پوری توجہ سے اس عورت کا جائزہ لینے لگی۔ وہ عورت ایک قریب ترین سیلز ڈیسک کے پاس چلی گئی۔ اس نے اپنا کریڈٹ کارڈ اس طرح تھاما ہوا تھا جیسے کسی دیوتا سے التجا کر رہی ہو۔ سیلز کے عملے میں سے ایک کی توجہ حاصل کرنے میں اس عورت کو پانچ منٹ لگ گئے۔ پھر لین دین کی تکمیل میں مزید پانچ منٹ صرف ہوگئے۔

اس دوران سمانتھا کو کریڈٹ کارڈ کا نزدیک سے جائزہ لینے کا بھرپور موقع مل گیا تھا۔ اس عورت نے خریداری مکمل ہونے کے بعد وہ پلاسٹک کریڈٹ کارڈ عجلت میں اپنے کوٹ کی سامنے کی جیب میں ڈال دیا۔

سمانتھا خاموشی اور تیز قدموں کے ساتھ مجمعے میں راستہ بناتی آگے بڑھنے لگی حتیٰ کہ اس عورت کے ہم قدم ہوگئی۔ بعد میں اس عورت سے اس طرح ٹکرائی جیسے اس کے قدم لڑکھڑا گئے ہوں۔ دوسرے ہی لمحے اس عورت کا کریڈٹ کارڈ اس کے ہاتھ میں تھا۔ کریڈٹ کارڈ کے تیز دھار کناروں کی چبھن وہ اپنی انگلیوں پر محسوس کر رہی تھی۔

پھر وہ تیز قدموں سے چلتی ہوئی اسٹور سے نکل کر کھلی فضا میں آگئی۔ کریڈٹ کارڈ کی کامیاب چوری پر ہمیشہ اس کے جسم میں ایک سنسنی سی دوڑ جاتی تھی۔

سمانتھا کا دل کارڈ پر موجود اس کی مالکہ کا نام جاننے کے لیے بے تاب ہو رہا تھا لیکن پہلے وہ کسی محفوظ جگہ پہنچنا چاہتی تھی۔ دو بلاک کے فاصلے پر ایک جیولری اسٹور تھا جہاں وہ ہمیشہ سے جانے کی تمنا کیا کرتی تھی لیکن اس کو کبھی کریڈٹ کارڈ چوری کرنے کا ایسا درست موقع نہیں مل سکا تھا کہ وہ اس جیولری اسٹور میں کوئی خریداری کرسکتی۔

سمانتھا کبھی بھی ایک ہی اسٹور میں چوری شدہ کارڈ سے دو مرتبہ خریداری نہیں کرتی تھی۔ وہ کسی بھی مشکل میں مبتلا ہونے سے بچنے کے لیے یہ احتیاطی تدبیر اختیار کرتی تھی۔

کچھ فاصلہ طے کرنے کے بعد سمانتھا نے کارڈ پر ایک اچٹتی سی نگاہ ڈالی...... برنانس ایتھرج!

خدایا، لوگ اس طرح کے انوکھے نام کہاں سے لیتے ہیں۔

پھر اس نے کارڈ کو پلٹ کر دیکھا۔ اس پر برنانس ایتھرج نے اپنے دستخط نیلی روشنائی سے عجلت میں گھسیٹے ہوئے تھے۔ پھر سمانتھا ایک نزدیکی کونفیکشنری ڈونٹ شاپ میں جا گھسی۔ اس نے ویٹرس کو فریش ڈونٹ اور کافی کا آرڈر دیا اور ویٹرس کے واپس آنے کے انتظار کے دوران برنانس ایتھرج کے دستخط کی مشق اس چھوٹی سی کاپی پر کرنے لگی جو وہ اسی مقصد کے لیے اپنے ساتھ لیے پھرتی تھی۔

سمانتھا اس کاپی کے صفحات پلٹنے لگی۔ اسے ہر ایک دستخط دیکھ کر وہ خریداری یاد آتی رہی جو اس نے ہر ایک کارڈ پر الگ الگ کی تھی۔ اسے علم تھا کہ اگر کبھی وہ پکڑی گئی تو یہ کاپی اس کو مجرم ٹھہرانے کے لیے ایک ٹھوس ثبوت ثابت ہوگی۔ لیکن سمانتھا کا دل کبھی یہ گوارا نہیں کرتا تھا کہ اس کاپی کو پھینک دے یا ضائع کردے۔

پھر وہ کریڈٹ کارڈ کی مالکہ کے دستخط کی مشق کرنے لگی۔

برنانس ایتھرج...... برنانس ایتھرج...... برنانس ایتھرج، چند بار کی مشق کے بعد سمانتھا اس عورت کے دستخط اس سے بھی بہتر انداز میں کرنے لگی۔ تازہ ڈونٹ کی سویٹ ٹاپنگ کی خوشبو اسے بے حد فرحت بخش محسوس ہو رہی تھی۔ اسے ڈونٹ کھانے میں لطف آرہا تھا۔ ساتھ ہی وہ سوچ رہی تھی کہ اسے اس کریڈٹ کارڈ سے کون سی شے خریدنی چاہیے؟ کوئی عمدہ سی چیز! جیسے کہ جھالر والی سنہری چین!

ساتھ ہی سمانتھا نے خود کو یاد دلایا کہ خریداری حدود کے اندر ہونی چاہیے تاکہ شاپ کیپر کو کارڈ کی تصدیق کی ضرورت پیش نہ آئے۔ وہ اس معاملے میں ہمیشہ محتاط رہتی تھی۔ یہ وہ حقیقت تھی کہ جس کی بنا پر وہ کسی قسم کے شبہے سے بالاتر رہتی تھی۔

اسے یہ کھیل کھیلتے ہوئے اٹھارہ ماہ ہوچکے تھے اور اس پر ایک بار بھی شبہ نہیں کیا گیا تھا۔

سامنتھا ڈونٹ شاپ سے نکل کر خوشی خوشی جیولری اسٹور کی جانب چل پڑی۔ جیولری اسٹور میں داخل ہونے کے بعد اس نے اپنی پسندیدہ جیولری کے انتخاب میں زیادہ دیر نہیں لگائی۔

وہ سونے کی بنی ہوئی ایک عمدہ چین تھی جو اس کے سونے کے آویزوں کے ساتھ پرفیکٹ میچ کر رہی تھی۔ سامنتھا اپنے اس انتخاب پر مطمئن اور خوش تھی۔ اس نے کریڈٹ کارڈ سیلز لیڈی کے حوالے کر دیا اور بے تابی سے اس خاتون کی واپسی کا انتظار کرنے لگی تاکہ وہ خریداری کی رسید اور اس کی منتخب کردہ سنہری چین لے آئے۔

جب دو منٹ گزر گئے اور اس سیلز لیڈی کی واپسی نہیں ہوئی تو سامنتھا کھٹک گئی۔ اسے شبہ ہو گیا کہ معاملہ کچھ گڑبڑ ہے اور شاید اس کی جعلسازی نظروں میں آ گئی ہے۔ وہ اچانک کاؤنٹر سے پلٹی اور تیزی سے جیولری اسٹور سے باہر نکلنے کے لیے دروازے تک ہی پہنچی تھی کہ اس نے خود کو ایک دراز قامت بھاری بھرکم شخص کے بازوؤں میں پایا۔

''مجھے جانے دو۔ میرا راستہ مت روکو۔ تم اپنے آپ کو کیا سمجھ رہے ہو؟'' سامنتھا نے اسے ہٹانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

اس شخص نے سامنتھا کا بازو سختی سے جکڑا ہوا تھا۔ ''واپس اسٹور میں چلیں، مس!''

سامنتھا نے اس بھاری بھرکم شخص سے نبرد آزما ہونے کی کوشش کی لیکن خود کو اس کی گرفت سے چھڑانے میں کامیاب نہ ہو سکی۔ اسٹور میں اندر پہنچنے کے بعد اس بھاری بھرکم شخص نے سیلز لیڈی کو مخاطب کیا جو کاؤنٹر پر واپس آ چکی تھی۔ ''اٹ از آل رائٹ، الزبتھ۔ میں نے اسے دبوچ لیا ہے۔ تم پولیس کو فون کر دو۔''

سامنتھا نے ان سسکیوں پر قابو پانے کی کوشش کی جو اس کے حلق میں اٹکی ہوئی تھیں۔ ''تم پولیس کو کیوں طلب کر رہے ہو؟ میں نے کوئی غلط کام نہیں کیا ہے۔ اگر تم نے اسی لمحے مجھے نہیں چھوڑا تو میں جعلی حراست میں لینے اور ہراساں کرنے کے الزام میں تم پر مقدمہ کر دوں گی۔''

یہ سن کر وہ شخص بے ساختہ ہنس دیا۔ البتہ سامنتھا کا بازو بدستور اس کی مضبوط گرفت میں تھا۔ ''تم نے آج شاپنگ کے لیے غلط اسٹور کا انتخاب کیا ہے، لیڈی!'' اس تنومند شخص نے کہا۔

سامنتھا کو اپنا چہرہ تمتماتا ہوا محسوس ہوا۔ ''میں نے کوئی شے چوری نہیں کی۔ میں تمہیں یقین دلا رہی ہوں۔''

نوجوان تاجر

قافلہ ابھی شہر سے پیچھے تھا کہ بارش شروع ہو گئی اور اونٹوں پر لدا سامانِ تجارت بھیگنے لگا۔ محفوظ جگہ پہنچتے پہنچتے آدھا بھیگ چکا تھا۔ منڈی میں پہنچ کر تاجروں نے مال اتارا۔ ان تاجروں میں ایک معصوم چہرے والا نوجوان بھی تھا۔ اس نوجوان تاجر نے اپنے مال کو دو حصوں میں تقسیم کیا۔ خشک اناج ایک طرف، بھیگا اناج دوسری طرف۔

جب خرید و فروخت شروع ہوئی تو نوجوان تاجر بھیگے ہوئے مال کا بھاؤ کم بتاتے اور خشک مال کا بھاؤ پورا بتاتے۔ گاہک پوچھتا کہ ایک جیسے مال الگ الگ بھاؤ کیوں؟

وہ بتاتے کہ بھیگنے سے اس کا وزن زیادہ ہو گیا ہے۔ خشک ہونے پر اس کا وزن کم ہو جائے گا۔ یہ بددیانتی ہے۔

لوگوں کے لیے یہ نئی بات تھی۔ پوری منڈی میں ان کی دیانت داری کا چرچا ہو گیا۔ لوگ جوق در جوق تاجر کے گرد جمع ہونے لگے اور ان کے اخلاق اور ایمانداری کے گرویدہ ہو گئے۔

یہ معصوم اور خوش شکل نوجوان ہمارے نبی حضرت محمد ﷺ تھے۔

مرسلہ۔ اظہر حسین بچار، ہزاری، جتوئی

وہ شخص صرف سر ہلا کر رہ گیا۔ ''تم نے یہاں ایک بھلی صورت اور نیک سیرت خاتون ہونے کا ناٹک رچایا تھا لیکن اگلی مرتبہ جب تم اس قسم کا کوئی ناٹک رچانے کی کوشش کرو تو پہلے اسٹور کے نام کا غور سے جائزہ ضرور لے لینا۔''

سامنتھا نے نگاہ اٹھا کر دروازے کے شیشے پر اسٹور کے نام کے جلی حروف کو پڑھنے کی کوشش کی جو اندر کی جانب سے الٹے لکھے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ اس نے جب ان حروف کو سیدھا پڑھ لیا تو اسٹور کا نام سمجھ آنے پر اس کے پیروں کی جان نکل گئی۔ اگر اس تنومند شخص نے اس کا بازو نہ پکڑا ہوا ہوتا تو وہ نیچے گر جاتی۔

اسٹور کا نام تھا...... ایتھرج جیولرز!

آہنی گرفت

مرزا امجد بیگ

زمین کا رقبہ ہو یا انسان کا اختیار... اس دنیا میں لامحدود کچھ بھی نہیں ہوتا اور جہاں حدود کا پاس نہیں رکھا جاتا، اس پر یا تو غاصب قابض ہو جاتے ہیں یا پھر وہ دوسروں کی حدود میں دخل در اندازی کے مرتکب سمجھے جاتے ہیں... وہ بھی اپنی حدود اور اوقات دونوں ہی فراموش کر بیٹھا تھا، ایسے میں جب قدموں میں لغزش آئی تو نہ صرف اس کا منہ کے بل گرنا یقینی تھا بلکہ منہ توڑ جواب کا بھی وہ مستحق تھا لہٰذا ذرا سی دیر کی بے ایمانی پر قدرت کی سرزنش پر اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے... بہت اچھا ہوتا ہے انسان اگر جلد سنبھل جائے مگر یہ راہنمائی بھی قسمت والوں کو ہی ملتی ہے جیسے کہ اسے بیگ صاحب کے دبنگ دلائل اور معروف وکالت کا سہارا ملا۔ کہتے ہیں جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے مگر اس ڈور کا سرا ضرور ہوتا ہے جسے پکڑ کر مرزا امجد بیگ نے کئی مجرموں کو ان کے انجام تک پہنچا دیا۔ گویا قانون کی آہنی گرفت سے کوئی مجرم آزاد نہیں رہ پاتا۔

عدالت کے کٹہرے میں کھڑے مجرم کی

لغزشوں کا سبق آموز احوال

وہ ماہ نومبر کی ایک خوشگوار صبح تھی۔ گلابی جاڑے نے فضا کو خاصا دل خوش کن بنا رکھا تھا۔ میں عدالت جانے کے لیے تیار ہو رہا تھا کہ میرے رہائشی فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ میں نے ٹائی کی گرہ لگانے کے بعد تیسری گھنٹی پر فون ریسیو کر لیا۔

''ہیلو!'' میں نے معتدل انداز میں کہا۔

''بیگ صاحب! گڈ مارننگ۔'' دوسری جانب سے ایک شناسا آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ ''میں نے آپ کو کسی غلط وقت پر تو ڈسٹرب تو نہیں کر دیا؟''

''نہیں عثمانی صاحب۔'' میں نے جلدی سے کہا۔ ''کوئی بھی وقت غلط اور درست نہیں ہوتا، انسان کے اعمال اسے اچھا یا برا بنا دیتے ہیں۔''

''میرا مطلب تھا، آپ کسی ضروری کام میں مصروف ہوں اور میں نے فون کر کے آپ کو......''

عثمانی صاحب نے وضاحت کرنا چاہی تو میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔ ''ایسی کوئی بات نہیں۔ بس عدالت جانے کی تیاری کر رہا ہوں۔ آپ حکم کریں؟''

''حکم نہیں، عرض ہے بیگ صاحب!''

''ٹھیک ہے، عرض ہی کر دیں۔'' میں نے بے تکلفی سے کہا۔

عثمانی صاحب کا پورا نام وہاب عثمانی تھا اور وہ ایک فلاحی سماجی تنظیم کے روح رواں تھے۔ میری ان سے اچھی خاصی یاد اللہ...... بلکہ دوستی تھی۔ وہ سال میں دو تین کیس بھی میرے حوالے کر دیا کرتے تھے جن کے سلسلے میں مجھے اپنی فیس میں رعایت کرنا پڑتی تھی لہٰذا جب بھی عثمانی صاحب کا
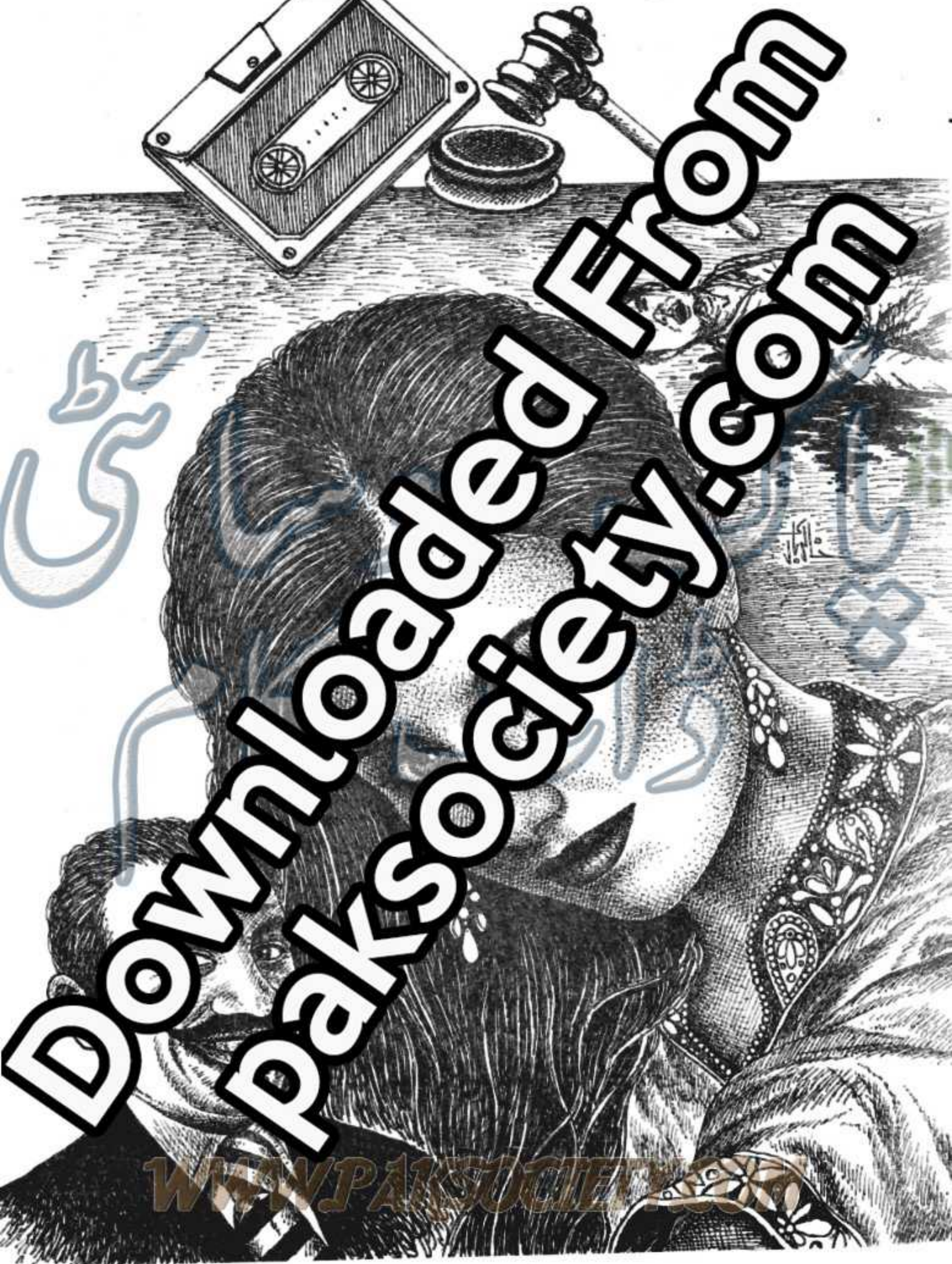
روٹین ٹائم سے ہٹ کر فون آتا تو میں فوراً سمجھ جاتا تھا کہ وہ کوئی کام میرے سپرد کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اس وقت بھی میں نے یہی اندازہ قائم کیا تھا جو آئندہ چند لمحات میں درست ثابت ہوگیا۔

''ایک مصیبت زدہ شخص کا کیس آپ کے حوالے کرنا چاہتا ہوں۔'' عثمانی صاحب نے بتایا۔

''عثمانی صاحب! ابھی تک تو میں نے یوہنی بھی نہیں کی......'' میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔

''یوہنی...... بہت خوب۔'' عثمانی صاحب نے ایک قہقہہ لگایا اور کہا۔ ''فکر نہ کریں بیگ صاحب......''

''فکر کیسے نہیں کروں۔'' میں نے ان کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی کہہ دیا۔ ''آپ کی فلاحی تنظیم کے پلیٹ فارم سے جتنے بھی کیس میرے سپرد کیے جاتے ہیں، ان میں نقصان ہی ہوتا ہے۔ آپ کبھی کیس میں غیر معمولی رعایت کراتے ہیں اور کبھی تو فیس کا ذکر سرے سے گول ہی ہوجاتا ہے۔''

''بیگ صاحب! فلاح و بہبود کے کاموں میں یہی ہوتا ہے۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولے۔ ''کیا فرق پڑتا ہے۔ میں تو پورا سال ہی معاشرے کی رفاہ و فلاح کے کام میں لگا رہتا ہوں۔ آپ بھی ایک دو ایسے کیس پکڑ لیا کریں، یہ سمجھتے ہوئے کہ اس طرح آپ کے پیشے کی زکوٰۃ نکلتی رہے گی۔''

''بہت خوب...... اچھی وضاحت ہے۔'' میں نے تیز آواز میں کہا۔ ''آپ کی اطلاع کے لیے عرض کردوں کہ میں ہر سال باقاعدگی کے ساتھ زکوٰۃ ادا کرتا ہوں۔''

''جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں ہے بیگ صاحب!'' انہوں نے کہا۔ ''آج میں جو کیس آپ کے حوالے کرنا چاہتا ہوں اس کا اسپانسر میرا ایک دوست ہے۔''

''اسپانسر...... کیا مطلب؟'' میں نے پوچھا۔

''مطلب یہ کہ...... میرے ایک دوست ہیں، سلیم اقبال۔'' عثمانی صاحب نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''ان کا چندری گر روڈ پر پرنٹنگ پریس ہے۔ صاحبِ ثروت انسان ہیں۔ یہ کیس ان کے حوالے سے مجھ تک پہنچا ہے۔ کیس واقعی ایک مجبور اور مصیبت زدہ شخص کا ہے لیکن اس کیس کے اخراجات سلیم صاحب اٹھانے کے لیے تیار ہیں۔ اگر آپ خود ہی اپنی فیس میں کچھ کمی کرکے اس کارِ خیر میں اپنا حصہ ڈالنا چاہیں تو یہ آپ کا بڑا پن ہوگا۔''

''او کے...... میں دیکھ لوں گا۔'' میں نے سرسری انداز میں کہا۔ ''اس وقت تو میرے پاس ٹائم بہت شارٹ ہے۔ آپ متعلقہ پارٹی کو میرے آفس میں بھیج دیں۔ میں موقع محل اور صورتِ حال کی مناسبت سے کیس کو ہینڈل کرلوں گا۔''

''تھینک یو بیگ صاحب۔'' عثمانی صاحب نے تشکر آمیز انداز میں کہا۔ ''خدا حافظ۔''

''اللہ حافظ......!'' یہ کہتے ہوئے میں نے ریسیور کریڈل کردیا۔

☆☆☆

اس روز جب میں عدالت سے فارغ ہوکر اپنے آفس پہنچا تو تھوڑی ہی دیر کے بعد میری سیکریٹری نے انٹرکام پر مجھے بتایا کہ کوئی شکیل صاحب مجھ سے ملنے آئے ہیں۔ میں نے کہا۔

''ٹھیک ہے، انہیں ان کی باری پر میرے پاس بھیج دیں۔''

''سر! وہ کہتے ہیں کہ صبح ان کی آپ سے بات ہوئی تھی۔'' سیکریٹری نے بتایا۔ ''وہ آپ کا زیادہ وقت نہیں لیں گے۔ پانچ دس منٹ کوئی ضروری بات کرکے واپس چلے جائیں گے۔''

میں نے اپنی یادداشت پر زور ڈالا لیکن فوری طور پر مجھے یاد نہ آسکا کہ صبح کسی شکیل نامی شخص سے میری بات ہوئی تھی۔ میں نے اپنی سیکریٹری سے کہا۔

''او کے...... آپ شکیل صاحب کو اندر بھیج دیں۔''

تھوڑی ہی دیر کے بعد محمد شکیل نامی وہ شخص میرے سامنے میز کی دوسری جانب بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے جدید تراش کا ایک عمدہ سوٹ زیبِ تن کر رکھا تھا۔ عمر چالیس اور پینتالیس کے درمیان رہی ہوگی۔ اس کے چہرے پر تازگی، آسودگی اور اطمینان پایا جاتا تھا۔ اس کو دیکھ کر بھی مجھے یاد نہ آسکا کہ صبح اس سے میری بات ہوئی ہوگی۔ میں اس شخص کو آج زندگی میں پہلی بار دیکھ رہا تھا۔

رسمی علیک سلیک کے بعد میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا اور پیشہ ورانہ انداز میں کہا۔ ''شکیل صاحب! فرمائیں، میں آپ کی کیا خدمت کرسکتا ہوں؟''

''مجھے سلیم صاحب نے آپ کے پاس بھیجا ہے۔'' وہ شائستہ لہجے میں بولا۔

''کون سلیم صاحب؟'' میں نے پوچھا۔ ''دراصل، میرے تعلق داروں میں پانچ چھ سلیم نامی افراد موجود ہیں۔ جب تک آپ وضاحت نہیں کریں گے، میں سمجھ نہیں پاؤں گا۔''

''میں سلیم اقبال کی بات کررہا ہوں۔'' وہ ٹھہرے

ہوئے لہجے میں بولا۔ ''اسٹار پرنٹنگ پریس والے سلیم صاحب۔ میں ان کا منیجر ہوں۔ صبح آپ سے بات ہوئی تھی نا......!''

''نہیں تو۔'' میں نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے کہا پھر ایک فوری خیال کے تحت پوچھ لیا۔ ''کہیں آپ عثمانی صاحب کے ریفرنس سے تو میرے پاس نہیں آئے؟''

''جی، آپ کا اندازہ درست ہے۔'' وہ زیرِلب مسکراتے ہوئے بولا۔ ''وہاب عثمانی صاحب میرے باس سلیم اقبال کے بہت گہرے دوست ہیں۔''

''اوہ...... مجھے یاد آگیا۔'' میں نے جلدی سے کہا۔ ''عثمانی صاحب کسی مصیبت زدہ شخص کا کیس میرے سپرد کرنا چاہتے تھے لیکن آپ تو......''

میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ کر ٹٹولنے والی نظر سے اپنے سامنے بیٹھے ہوئے محمد شکیل کو دیکھا۔ وہ میری نگاہ میں چھپے ہوئے سوال تک پہنچ گیا اور وضاحت کرنے والے انداز میں بولا۔

''وہ مصیبت زدہ شخص میں نہیں ہوں۔''

''پھر......؟'' میں نے بہ دستور سوالیہ انداز میں اسے دیکھا۔

''اس مصیبت زدہ شخص کا نام کامران ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''کامران کا ایک معاملہ ہمارے سپروائزر یعقوب کے ساتھ جڑ گیا ہے۔''

''کیا کامران اور یعقوب میں کسی قسم کا جھگڑا ہو گیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں جناب۔'' وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''ایسی کوئی بات نہیں۔''

''پھر کیسی بات ہے؟'' میں نے سوال کیا۔

''جناب! بات یہ ہے کہ کامران کی بیوی مہرالنسا اپنا مکان فروخت کرنا چاہتی ہے۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بتانے لگا۔ ''ہمارے سپروائزر صاحب اس مکان کو خریدنے میں دلچسپی رکھتے ہیں۔''

''تو اس میں پریشانی والی کون سی بات ہے؟'' اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی میں نے پوچھ لیا۔ ''اور آپ اصل بندے کا تو ذکر ہی نہیں کر رہے جس کا کیس ہے!''

''پریشانی والی بات یہ ہے کہ......'' وہ قطع کلامی کا برا منائے بغیر تحمل لہجے میں مجھے بتانے لگا۔ ''مسز کامران اصل قیمت سے بہت کم میں اپنا مکان فروخت کر رہی ہیں۔ ہمارے سپروائزر صاحب نے باس سے ایڈوانس رقم مانگی تو انہوں نے اس قرض کا مصرف پوچھ لیا جبھی یہ بات سامنے آئی کہ مہرالنسا ایک مجبوری کے تحت اپنا مکان مارکیٹ ویلیو سے بہت کم قیمت میں فروخت کر رہی ہیں کیونکہ اس کا شوہر یعنی کامران جیل میں ہے۔''

''اوہ......'' میں نے ایک گہری سانس خارج کی۔ ''کامران کس چکر میں جیل گیا ہے۔ میرا مطلب ہے، اسے کس جرم کی سزا میں جیل ہوئی ہے؟''

''ابھی اسے سزا نہیں سنائی گئی۔'' اس نے بتایا۔ ''اس کا کیس عدالت میں زیرِ سماعت ہے۔ وہ جوڈیشل ریمانڈ پر جیل گیا ہے۔''

''کامران پر کس قسم کا الزام ہے؟'' میں نے رف پیڈ اور قلم سنبھالتے ہوئے سوال کیا۔

''اس پر قتل کا الزام ہے۔'' محمد شکیل نے جواب دیا۔

''اس کے کیس کی پیروی کون کر رہا ہے؟''

''عدالت نے اسے ایک سرکاری وکیل مہیا کیا ہے جو ظاہر ہے، کسی کام کا نہیں۔'' محمد شکیل نے گمبھیر انداز میں بتایا۔ ''اسی لیے تو مسز کامران کوئی پرائیویٹ وکیل کر کے اپنے شوہر کو اس کیس سے باعزت بری کروانا چاہتی ہیں اور آپ جانتے ہیں کہ......'' وہ لمحے بھر کو سانس لینے کے لیے متوقف ہوا پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''پرائیویٹ وکیل کی فیس کوئی معمولی نہیں ہوتی اور کسی قتل کے ملزم کو عدالتی گرفت سے چھڑانے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگانا پڑتا ہے اور اس قسم کے معاملات میں پیسا پانی کی طرح بہانا پڑتا ہے جو کہ مہرالنسا کے پاس نہیں ہے۔ اسی لیے وہ اپنا مکان اونے پونے فروخت کرنے پر مجبور ہے۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''مہرالنسا کی مجبوری تو میری سمجھ میں آ گئی۔ اب ذرا یہ بھی بتا دیں کہ آپ کے باس اس کیس میں کیوں دلچسپی لے رہے ہیں؟ عثمانی صاحب نے مجھے بتایا تھا کہ سلیم صاحب اس کیس کے تمام تر اخراجات اٹھانے کو تیار ہیں؟''

''آپ کو بالکل ٹھیک بتایا گیا ہے۔'' وہ سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے بولا۔ ''مہرالنسا اپنی مجبوری کے ہاتھوں بہت ہی کم قیمت میں مکان فروخت کرنے کو تیار ہے اور ہمارے باس انسانی ہمدردی کے جذبات کے ہاتھوں مجبور ہیں۔ اگر آپ کے پاس ٹائم ہو تو میں آپ کو اس معاملے کی تفصیل بتاتا ہوں تاکہ آپ کو بات سمجھنے میں آسانی ہو جائے۔''

''میں یہاں پر لوگوں کی بات سننے کے لیے ہی بیٹھا

ہوں۔" میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

"آپ اطمینان سے مجھے ساری بات بتائیں۔"

یہ سچ ہے کہ مجھے اس کیس میں خصوصی دلچسپی محسوس ہونے لگی تھی کیونکہ سلیم اقبال انسانی ہمدردی کے ناتے بہت عظیم کام کررہے تھے۔ آج کل کی خودغرض دنیا میں بہت کم ایسے لوگ باقی ہیں جو دوسروں کی مجبوری کا احساس کر کے ان کی مدد کو تیار ہوتے ہیں۔ محمد شکیل کی تفصیلی بات سننے سے پہلے میں نے اپنی سیکریٹری سے اس بات کی تصدیق کر لی تھی کہ ابھی کسی کلائنٹ کا نمبر نہیں تھا۔ اس وقت جس کلائنٹ کا اپائنٹ منٹ تھا وہ نہیں آسکا تھا۔

محمد شکیل نے مجھے جو کہانی سنائی، میں اس کا خلاصہ آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں تاکہ آپ اس کیس کے پس منظر سے اچھی طرح آگاہ ہو جائیں۔

☆☆☆

کامران پر ایک شخص کے قتل کا الزام تھا۔ وہ خود کو بے گناہ سمجھتا تھا اس لیے اس نے اپنے لیے کسی پرائیویٹ وکیل کی خدمات حاصل کرنے کے بارے میں نہیں سوچا تھا۔ اس کی بیوی نے جب اس سے کہا کہ وہ کہیں سے قرض ادھار پکڑ کر اس کا کیس لڑنے کا انتظام کرتی ہے تو اس نے صاف انکار کر دیا اور واضح الفاظ میں کہہ دیا۔

"میں نے اپنا معاملہ اللہ پر چھوڑ دیا ہے۔ اس کی عدالت سے جو بھی فیصلہ آئے گا، مجھے منظور ہے۔"

کامران اپنے مختصر سے کنبے کا واحد کفیل تھا۔ اس کی فیملی تین افراد پر مشتمل تھی۔ یعنی وہ خود، اس کی بیوی مہرالنسا اور ان کی اکلوتی اولاد پانچ سالہ عمران۔ کامران جب قتل کے کیس میں گرفتار ہوا اور بعد ازاں وہ جوڈیشل ریمانڈ پر جیل چلا گیا تو گھر کے اندر بحرانی کیفیت پیدا ہوگئی۔ ایک پرانی سی موٹر سائیکل اور جو حاضر رقم تھی وہ تو ابتدائی مرحلے ہی میں پولیس والوں کے پیٹ میں چلی گئی تھی۔ جمع جوڑ کچھ تھا نہیں جو اس نازک صورت حال میں کام آسکتا، اسی لیے وہ باقاعدہ کوئی وکیل نہیں کرسکا تھا۔ بیوی کے اصرار پر اس نے دوٹوک الفاظ میں اپنا فیصلہ سنا دیا تھا۔ "مجھے کسی وکیل کی ضرورت نہیں۔ اگر اللہ کی نظر میں، میں قاتل نہیں تو دنیا کی کوئی عدالت مجھے سزا نہیں دے سکتی اور بہ فرضِ محال اگر مجھے پھانسی ہو جاتی ہے تو تم لوگ صبر کر لینا......!"

کسی بھی زیرِ حراست شخص کے ایسے بیان کو جذباتیت ہی کہا جاسکتا ہے اور اس کے لواحقین کسی بھی قیمت پر اسے بے یار و مددگار نہیں چھوڑ سکتے چنانچہ اس کی بیوی مہرالنسا بھی اپنے شوہر کی باعزت بریت کی خواہش مند تھی۔ اگرچہ عدالت کی طرف سے کامران کو ایک سرکاری وکیل مہیا کر دیا گیا تھا تاہم مہرالنسا اس وکیل کی کارکردگی سے مطمئن نہیں تھی اسی لیے وہ اپنا مکان بیچ کر شوہر کی رہائی کے لیے جنگ لڑنا چاہتی تھی۔ اس نے اپنے سہاگ کو ہر قیمت پر بچانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

کامران کا ایک دوست ہر قسم کی ٹھیکے داری کرتا تھا۔ وہ لوگوں سے پیسے لے کر سرکاری محکموں میں پھنسے ہوئے کام کرایا کرتا تھا۔ ہر سرکاری محکمے میں متعلقہ افسران سے اس کی اچھی خاصی جان پہچان، بہ الفاظِ دیگر "سیٹنگ" تھی۔ کچھ رشوت وہ ان کو کھلاتا اور کچھ اپنی جیب میں ڈالتا۔ اس طرح کام ہو جاتا۔ اس چلتا پرزہ قسم کے شخص کا نام فاروق تھا۔

جب مہرالنسا نے اپنی پریشانی فاروق کو بتائی تو اس نے بڑے اعتماد سے کہا۔ "مجھے بہت افسوس ہے بھابی! آج کل میرے مالی حالات ٹھیک نہیں ہیں ورنہ میں اپنے پاس سے آپ کی مدد کر دیتا اور آپ کو مکان فروخت کرنے کی ضرورت پیش نہ آتی۔"

"آپ کا یہی بہت احسان ہوگا کہ آپ جلد از جلد یہ مکان بکوا دیں۔" مہرالنسا نے پریشانی کے عالم میں کہا۔ "میں چاہتی ہوں اگلی پیشی پر سرکاری وکیل کو فارغ کر کے کامران کے لیے کوئی اچھا سا تجربہ کار وکیل کرلوں تاکہ کامران کو انصاف مل سکے۔"

"میں آپ کے جذبات کی قدر کرتا ہوں بھابی!" فاروق نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "آپ فکر نہ کریں۔ میرا ایک دوست پراپرٹی کی خرید و فروخت کا کاروبار کرتا ہے۔ میں آج ہی اس سے بات کرتا ہوں۔" لمحاتی توقف کر کے اس نے کچھ سوچا پھر ان الفاظ میں اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

"کامران کی اگلی پیشی کب ہے؟"

"پندرہ دن کے بعد۔" مہرالنسا نے بتایا۔

"یہ تو اچھا خاصا وقت ہے۔" وہ اطمینان بھرے انداز میں بولا۔ "آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ یہ کام میں نے اپنے ذمے لے لیا ہے۔ میں آج ہی سے اس مہم پر لگ جاتا ہوں اور ایک ہفتے کے اندر اندر آپ کو کوئی خوش خبری سناتا ہوں۔"

"آپ کا بہت شکریہ بھائی صاحب۔" مہرالنسا نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"میں پہلے ہی بہت شرمندہ ہوں بھابی۔" وہ خجالت آمیز لہجے میں بولا۔ "آپ شکریہ ادا کر کے مجھے اور نادم نہ

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

کریں۔ کاش میں آپ کے لیے کچھ کر سکتا!''

''آپ جو کر رہے ہیں، یہ بھی بہت ہے۔'' مہرالنسا ممنونیت بھرے لہجے میں بولی۔ ''ورنہ آج کل کوئی کسی کی پروا نہیں کرتا۔''

''ایک بات تو بتائیں بھابی۔'' فاروق نے پُرسوچ انداز میں پوچھا۔ ''جب آپ کا مکان فروخت ہو جائے گا تو پھر آپ کی رہائش کا کیا ہوگا؟''

''میں نے یہی سوچا ہے کہ عارضی طور پر، جب تک یہ کیس عدالت میں چل رہا ہے، میں کسی کرائے کے گھر میں رہ لوں گی۔'' مہرالنسا نے اسے بتایا۔ ''بعد کی بعد میں دیکھی جائے گی۔ جب کامران باعزت رہا ہو کر ہمارے پاس آجائے گا تو مستقبل کے بارے میں پھر کوئی فیصلہ کریں گے۔''

''اچھی بات ہے۔'' فاروق نے تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''فی الحال تو وقت کو دھکا دینا ہے..... ٹھیک ہے بھابی! میں آپ کا مکان فروخت کرانے کے علاوہ آپ کے لیے چھوٹے سے کرائے کے گھر کا بھی بندوبست کرتا ہوں۔''

مہرالنسا نے اس کا شکریہ ادا کیا اور وہ بہت جلد کوئی خوش خبری سنانے کا وعدہ کر کے رخصت ہو گیا۔ فاروق کی دلائی ہوئی امید نے وقتی طور پر مہرالنسا کو مطمئن کر دیا تھا۔

فاروق، کامران کا دوست تھا اس لیے مہرالنسا بھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ وہ اس کی مجبوری سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرے گا لیکن فاروق جس قسم کے کاموں کا ماہر تھا، اس میں سب سے پہلے اپنا فائدہ دیکھا جاتا ہے۔ اس کے بعد ہی کسی دوسرے کو فائدہ پہنچانے کے بارے میں سوچا جاتا ہے۔ وہ مہرالنسا کے گھر کی فروخت والے پروجیکٹ سے اپنی جیب بھی گرم کرنا چاہتا تھا لہٰذا اس نے کسی بھی پراپرٹی ایجنٹ سے رابطہ کرنے کے بجائے اخبار میں مذکورہ مکان کے حوالے سے ایک اشتہار دے دیا۔ اشتہار کے اندر اس بات کی نشاندہی کی گئی تھی کہ مذکورہ مکان ایک ہفتے کے اندر ہی فروخت ہونا ہے۔ مہرالنسا اور پارٹی کا سامنا کرنے کے لیے اس نے اپنے ہی جیسے ایک چلتا پرزہ قسم کے شخص کو تیار کر لیا تھا اور اس سے وعدہ کیا تھا کہ کام کی تکمیل پر وہ اسے دو فیصد کمیشن ادا کرے گا۔ اس شخص کو پراپرٹی ایجنٹ کا کردار ادا کرنا تھا اور اپنی اداکاری کا معاوضہ لے کر اس پروجیکٹ سے الگ ہو جانا تھا۔ مذکورہ شخص کا نام فیاض تھا۔ فاروق نے فیاض کو مہرالنسا کے گھر لا کر اس سے ایک تفصیلی ملاقات بھی کرا دی تھی اور اس بات کی یقین دہانی کرائی تھی کہ چند روز میں یہ کام بخوبی اپنے انجام کو پہنچ جائے گا لہٰذا اسے فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔ مہرالنسا اس تعاون پر فاروق کی شکرگزار تھی۔

اشتہار شائع ہونے کے اگلے ہی روز سب سے پہلے یعقوب نے فیاض سے رابطہ کیا کیونکہ اشتہار میں فیاض ہی کا نمبر دیا گیا تھا۔ اسی روز شام میں فیاض نے یعقوب کو مہرالنسا کا مکان بھی دکھا دیا۔ تاہم مہرالنسا کی موجودگی میں مکان کی قیمت کے حوالے سے کوئی بات نہ ہوئی۔ ان دونوں کے بیچ ساری بات چیت فیاض کے ٹھکانے پر ہوئی۔

یعقوب کو وہ مکان پسند آگیا لیکن ایک بات اس کے ذہن کو پریشان کر رہی تھی۔ وہ اپنی پریشانی کو زبان پر لے آیا۔

''فیاض صاحب! کیا آپ واقعی یہ مکان مجھے دو لاکھ ستر ہزار میں دلوا دیں گے؟''

فیاض نے لوگوں سے ڈیل کرنے کے لیے ایک چھوٹا سا آفس بنا رکھا تھا جہاں وہ مختلف نوعیت کے معاملات نمٹایا کرتا تھا۔ فاروق نے بھی آسانی دیکھتے ہوئے فیاض کو اپنے منصوبے میں استعمال کیا تھا۔ اس وقت وہ اسی آفس میں بیٹھے ہوئے تھے۔

''یعقوب صاحب! آپ ماشاءاللہ خاصے سمجھدار انسان ہیں۔'' فیاض نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''اس بات کا اندازہ تو آپ بھی لگا سکتے ہیں کہ اس مکان کی قیمت کسی بھی طرح ساڑھے تین لاکھ سے کم نہیں ہے۔''

''جبھی تو.....'' یعقوب نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔ ''یہی بات میرے ذہن کو الجھا رہی ہے۔''

''آپ اپنے ذہن کو الجھن سے پاک کر دیں۔'' فیاض نے کمال ہوشیاری سے کہا۔ ''اس کا ایک خاص سبب ہے.....''

''کیسا سبب؟'' یعقوب نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ''میں بھی تو جاننا چاہتا ہوں۔''

''میں بتاتا ہوں۔'' فیاض نے ایک طویل سانس خارج کی اور پہلے سے طے شدہ منصوبے کے تحت کہا۔ ''اصل میں، مہرالنسا کا شوہر قتل کے الزام میں جیل میں بند ہے۔ یہ مکان فوری طور پر فروخت کرنا اس کی مجبوری ہے۔ اگر اس نے کسی قابل وکیل کے ذریعے اپنے شوہر کا کیس لڑنے کا بندوبست نہ کیا تو اس شخص کو موت کی سزا ہو جائے گی۔''

"کیا مہر النسا کے شوہر نے واقعی کوئی قتل کیا ہے؟"
فیاض کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی یعقوب نے سوال کر دیا۔
"نہیں صاحب، ایسی کوئی بات نہیں۔" فیاض نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "آپ تو اس ملک کی عدالتوں کے حال سے اچھی طرح واقف ہیں۔ وکیلوں اور ججوں کے معاملات آپ کے علم میں ہیں۔ ایک بے گناہ شخص کو بھی عدالت سے انصاف حاصل کرنے کے لیے لاکھوں روپے خرچ کرنا پڑتے ہیں۔"
"یہ تو آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔" وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے گمبھیر انداز میں بولا۔
"بس مہر النسا کی یہی مجبوری ہے کہ اسے دو دن کے اندر ایک بھاری رقم کی ضرورت ہے اور اس ضرورت کو فوری طور پر پورا کرنے کے لیے وہ اپنا مکان دو لاکھ ستر ہزار روپے میں فروخت کرنے کے لیے تیار ہے ورنہ......"
اس نے ڈرامائی انداز میں توقف کیا پھر اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے شاطرانہ لہجے میں بولا۔
"ورنہ، آپ بھی جانتے ہیں کہ اگر مہر النسا مجھے دس پندرہ دن کا وقت دے دے تو میں اسی مکان کو ساڑھے تین نہ سہی، کم از کم سوا تین لاکھ میں تو بیچ ہی دوں گا۔"
"جی مجھے اس بات کا اندازہ ہے۔" وہ جلدی سے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔
"پھر کیا ارادہ ہے یعقوب صاحب؟" فیاض اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے ہوشیاری سے بولا۔ "آپ کے پاس صرف دو دن کی مہلت ہے ورنہ یہ مکان کسی اور کے نصیب میں لکھ دیا جائے گا۔ آپ مجھے شریف اور سمجھ دار انسان لگے ہیں اور میری کوشش یہی ہوگی کہ یہ مکان آپ ہی خریدیں۔ باقی جو آپ کی مرضی......"
فیاض نے یعقوب کو ایسے موڑ پر لا کر کھڑا کر دیا تھا کہ اس کے پاس مکان خریدنے کے حق میں فیصلہ دینے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا لہٰذا وہ سرسراتی ہوئی آواز میں بولا۔
"آپ مجھے ایک دن کی مہلت دیں۔ میں آپ کو کل اسی وقت بتاتا ہوں۔ اصل میں اتنی رقم میرے ہاتھ میں نہیں ہے۔ مجھے اپنے باس سے بات کرنا ہوگی اور مجھے امید ہے، باس انکار نہیں کریں گے۔"
فیاض نے چالاکی سے کہا۔ "ایک نہیں، میں آپ کو دو دن کی مہلت دیتا ہوں۔ آپ پرسوں شام تک مجھے کنفرم کر دیں کہ مکان خرید رہے ہیں یا نہیں؟"
"او کے......" وہ بڑے اعتماد کے ساتھ بولا۔ "لیکن آپ کو بھی مجھ سے ایک وعدہ کرنا ہوگا۔"
فیاض نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور پوچھا۔
"کیسا وعدہ یعقوب صاحب؟"
"پرسوں شام تک آپ اس مکان کے حوالے سے کسی اور پارٹی سے بات نہیں کریں گے۔" یعقوب نے تاکیدی انداز اختیار کرتے ہوئے کہا۔ "دراصل میں اس مکان کو خریدنے کا ذہن بنا چکا ہوں اور...... میں اسے خرید کر ہی رہوں گا۔"
"مردوں کی ایک زبان ہوتی ہے یعقوب صاحب۔" فیاض نے ٹھوس انداز میں کہا۔ "پرسوں رات بارہ بجے تک یہ مکان آپ ہی کا ہے۔ تاریخ تبدیل ہونے کے بعد میں اپنے وعدے کا پابند نہیں رہوں گا، بس یہ بات ذہن میں رکھ لیجیے گا۔"
"میں سمجھ گیا فیاض صاحب!" وہ سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے بولا۔ "پرسوں کی رات تو بہت دور ہے، میں انشاء اللہ کل ہی ڈن کرتا ہوں۔"
"انشاء اللہ......!" فیاض نے دوستانہ انداز میں کہا۔
یعقوب اس کا شکریہ ادا کرنے کے بعد رخصت ہو گیا۔
انہی دو دنوں میں فاروق کی ہدایت پر فیاض نے چار پانچ اور "پارٹیوں" کو بھی مکان دکھا دیا تھا تاکہ مہر النسا مطمئن رہے کہ "کام" ہو رہا ہے۔ یہ "پارٹیاں" حقیقت سے بہت دور تھیں۔ ہر شخص اس ڈرامے میں اپنا اپنا کردار ادا کر رہا تھا۔ اس "کارکردگی" کی بنا پر فاروق، مہر النسا کو یہ یقین دلانا چاہتا تھا کہ وہ اس کا کتنا خیر خواہ ہے۔ اس کی ہمدردی اور تعاون کو دیکھتے ہوئے مہر النسا اپنا مکان مارکیٹ ویلیو سے کم قیمت میں فروخت کرنے کے لیے راضی ہو گئی تھی۔ مکان کی فروخت کے حوالے سے اس نے اپنے شوہر کامران کو کچھ نہیں بتایا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ یہ سنتے ہی کامران بھڑک اٹھے گا اور یہ معاملہ کھٹائی میں پڑ جائے گا اور وہ اپنے شوہر کی رہائی کے لیے کسی بھی معاملے کو کھٹائی میں پڑتے نہیں دیکھ سکتی تھی۔ اسے یہ آسانی حاصل تھی کہ مذکورہ مکان اسی کے نام پر تھا ورنہ فروخت کے حوالے سے ملکیت کے سلسلے میں پیچیدگی پیدا ہو جاتی۔
"اسٹار پرنٹنگ پریس" کا سپروائزر بے حد خوش تھا کہ ساڑھے تین لاکھ مالیت کا مکان اسے محض دو لاکھ ستر ہزار میں مل رہا تھا۔ گھر جا کر اس نے اپنی جمع پونجی کا حساب

لگایا تو پتا چلا کہ اس کے پاس ایک لاکھ بہتر ہزار روپے ہیں۔ مکان کو خریدنے کے لیے اسے ایک لاکھ روپے کی مزید ضرورت تھی اور یہ رقم اسے اس کا باس سلیم اقبال ہی دے سکتا تھا۔ وہ اگلے روز اپنے باس سے ملا اور ایک لاکھ کے قرضے کے لیے درخواست کی۔

سلیم اقبال ایک تجربہ کار اور جہاں دیدہ شخص تھا۔ یعقوب نے من وعن یہ معاملہ سلیم اقبال کے گوش گزار کردیا۔ پوری بات سننے کے بعد سلیم اقبال نے کہا۔

”یعقوب! مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ تم ذاتی گھر کے مالک بن جاؤ گے اس لیے تمہیں ایک لاکھ قرض دینے میں مجھے کوئی مسئلہ نہیں ہے لیکن ایک بات مجھے الجھا رہی ہے......“

”سر! کون سی بات؟“ یعقوب نے سوالیہ نظر سے اپنے باس کی طرف دیکھا۔

”جو مکان تم خریدنا چاہتے ہو اس کی مارکیٹ ویلیو اگر ساڑھے تین لاکھ ہے تو پھر پارٹی اسے دو لاکھ ستر ہزار میں کیوں فروخت کر رہی ہے؟“ سلیم اقبال نے اپنے خدشات کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ”کیا مکان کے کاغذات وغیرہ تو سب ٹھیک ہیں نا؟“

”جی سر...... کاغذات سب جینوئن ہیں۔“ یعقوب نے جواب دیا۔ ”میں نے خود دیکھے ہیں۔ ویسے میں کسی ماہر سے بھی چیک کرالوں گا۔“

”مکان پر کوئی لون یا کسی قسم کے واجباتی معاملات تو نہیں ہیں؟“ سلیم اقبال نے ایک اور اہم نکتے کی جانب اشارہ کیا۔

”نہیں سر۔“ یعقوب نے نفی میں گردن ہلائی۔ ”ایسی بھی کوئی بات نہیں۔“

سلیم اقبال کا تجربہ کار ذہن موجودہ صورت حال کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ جائداد کی خرید وفروخت کا اسے بھی کافی تجربہ تھا لیکن پھر بھی اپنی تسلی کے لیے اس نے یعقوب کی موجودگی میں ہی اپنے دو تین جاننے والے

بروکرز سے ٹیلی فونک رابطہ کرکے اس مکان کی بابت معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی اور اس تحقیق کے بعد وہ اپنے سپروائزر سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔

''یعقوب! اس مکان کے سستا ہونے کی تین میں سے کوئی ایک وجہ ہوسکتی ہے۔ نمبر ایک، مکان کی ملکیت میں کوئی گڑبڑ ہے۔ مطلب جو پارٹی مکان فروخت کررہی ہے، اسے مکان بیچنے کا قانونی اختیار حاصل نہیں اسی لیے وہ دو دن سے زیادہ مہلت دینے کو تیار نہیں۔ وہ جلد از جلد اپنا الو سیدھا کرکے تپلی گلی سے نکلنے کی فکر میں ہے۔'' اس نے لمحاتی توقف کرکے ایک گہری سانس خارج کی پھر سلسلۂ کلام کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

''نمبر دو، جہاں یہ مکان واقع ہے، کسی بھی معاشرتی اعتبار سے وہ محلہ ٹھیک نہیں ہے۔ نمبر تین، مالکِ مکان کسی انتہائی مجبوری کے تحت اپنا مکان فروخت کررہا ہے۔''

''جی سر......'' یعقوب نے جلدی سے کہا۔ ''یہ تیسری بات درست ہے۔''

''اوہ......'' سلیم اقبال نے متاسفانہ انداز میں پوچھا۔ ''مالکِ مکان کی کیا مجبوری ہے؟''

اپنے باس کے سوال کے جواب میں سپروائزر یعقوب نے مہرالنسا کی مجبوری کی مکمل داستان نہایت ہی مختصر اور جامع الفاظ میں بیان کردی۔ پوری بات توجہ سے سننے کے بعد سلیم اقبال نے سوال کیا۔

''کیا تم مہرالنسا سے ملاقات کرچکے ہو؟''

''جی ایک بار میں اس عورت سے ملا ہوں۔'' یعقوب نے بتایا۔ ''جب میں وہ مکان دیکھنے گیا تھا۔''

''کیا تم نے اس سے پوچھا کہ وہ مکان کو اتنا سستا کیوں بیچ رہی ہے؟'' سلیم اقبال نے استفسار کیا۔

''نہیں سر۔'' اس نے نفی میں گردن ہلائی اور بتانے لگا۔ ''مکان کی قیمت اور ادائیگی کی مہلت کے حوالے سے مہرالنسا سے میری کوئی بات نہیں ہوئی بلکہ ایجنٹ نے مجھے براہِ راست پارٹی سے بات کرنے سے منع کردیا تھا۔ وہ عورت کاروباری معاملات سے واقفیت نہیں رکھتی۔ اس نے سب کچھ پراپرٹی ایجنٹ پر چھوڑ رکھا ہے۔ میں نے آپ کو جو بھی تفصیلات فراہم کی ہیں، یہ مجھے اسی پراپرٹی ایجنٹ سے حاصل ہوئی ہیں۔'' اس نے ایک لمحے کو رک کر اپنے باس کی طرف امید بھری نظر سے دیکھا پھر کہا۔

''سر! اس نادر موقع سے فائدہ اٹھانے کے لیے میرے پاس بس اتنا ہی وقت ہے جو میں نے آپ کو بتایا ہے۔ اس کے بعد وہ پراپرٹی ایجنٹ اپنے وعدے کا پابند نہیں رہے گا۔''

''گرم گرم کھانا کھانے سے منہ جل جاتا ہے یعقوب!'' سلیم اقبال نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''تمہارے پاس ابھی کم از کم چھتیس گھنٹے کی مہلت باقی ہے۔ تمہیں ایک لاکھ قرض دینے میں مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے لیکن میں اپنی رقم کسی کنویں میں پھینک دینے کے حق میں بھی نہیں ہوں۔ تم کل صبح تک سکون سے بیٹھے رہو۔ کل اسی وقت ہم اس موضوع پر دوبارہ بات کریں گے۔ اگر میں اس فروخت کے حوالے سے مطمئن ہوگیا تو پھر میں کل ہی تمہیں ایک لاکھ روپے دے دوں گا......اوکے؟''

''اوکے سر!'' یعقوب نے فرماں برداری سے کہا اور باس کے کمرے سے نکل آیا۔

یعقوب کو رخصت کرنے کے بعد سلیم اقبال نے اپنے منیجر کو کمرے میں بلالیا۔ منیجر محمد شکیل، سلیم اقبال کا سب سے پرانا ملازم تھا اور وہ اپنے اس ملازم پر بہت بھروسا کرتا تھا۔ شکیل نے بھی کبھی اپنے مالک کے بھروسے کو ٹھیس نہیں پہنچائی تھی۔ سلیم نے شکیل کو مختصر الفاظ میں صورتِ حال سے آگاہ کیا اور کہا۔

''شکیل! تم آج ہی اس عورت سے جاکر ملو اور اگر ہوسکے تو اسے میرے پاس لے آؤ۔ یہ کوئی بہت ہی دکھی اور مجبور عورت ہے۔''

''جی سر! مجھے بھی یہی لگتا ہے۔'' شکیل نے تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''اور وہ پراپرٹی ایجنٹ اسے الو بنارہا ہے۔ اگر ہم براہِ راست مہرالنسا سے مکان کی خرید کے سلسلے میں بات کریں تو اصل صورتِ حال سامنے آجائے گی۔''

''میں بھی اسی لیے مہرالنسا کو یہاں لانے کی بات کررہا ہوں۔'' سلیم نے پُرسوچ انداز میں کہا۔

''آپ فکر نہ کریں سر۔'' شکیل نے اعتماد بھرے لہجے میں کہا۔ ''سمجھ لیں کہ یہ کام ہوگیا۔''

''لیکن سپروائزر یعقوب کو یہ پتا نہیں چلنا چاہیے کہ مہرالنسا یہاں مجھ سے ملنے آئی تھی۔''

''سمجھ گیا سر۔'' شکیل نے معنی خیز انداز میں گردن ہلائی۔

ٹھیک تین گھنٹے کے بعد، لنچ سے تھوڑی دیر پہلے مہرالنسا، سلیم اقبال کے آفس میں اس کے روبرو بیٹھی ہوئی تھی۔ رسمی علیک سلیک کے بعد سلیم اقبال نے اس سے پوچھا۔

''بی بی! میرا ایک ملازم تمہارا مکان خریدنے میں

دلچسپی رکھتا ہے۔ کیا آپ اسے جانتی ہیں؟"

"میں کسی بھی خریدار کو نہیں جانتی جناب۔" مہر النسا نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ "میں نے مکان والا معاملہ اپنے شوہر کے ایک دوست فاروق کے حوالے کیا ہوا ہے۔"

"کیا آپ کے شوہر کے اس دوست کا نام فیاض نہیں؟"

"جی نہیں۔" مہر النسا نے نفی میں گردن ہلائی پھر وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ "فیاض پراپرٹی ڈیلر ہے۔ فاروق نے فیاض ہی کو مکان بیچنے کی ذمے داری سونپ رکھی ہے۔"

"ٹھیک ہے...... لیکن ایک بات میری سمجھ میں نہیں آرہی کہ آپ اپنا مکان اتنا سستا کیوں فروخت کررہی ہیں؟" سلیم نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

"مجبوری ہے جناب......!" اس نے مختصراً کہا۔

یعقوب کی زبانی سلیم اقبال، مہر النسا کی مجبوری سے واقف ہو چکا تھا لیکن پھر بھی اس نے سوال کیا۔

"کیا مجبوری ہے...... اگر آپ کو برا محسوس نہ ہو تو مجھے بتائیں۔ ہوسکتا ہے، میں آپ کے کسی کام آجاؤں۔"

"میرے شوہر پر قتل کا مقدمہ چل رہا ہے۔" مہر النسا نے بوجھل لہجے میں بتایا۔ "مجھے وکیل کی فیس اور عدالتی اخراجات کے لیے فوری طور پر ایک بڑی رقم کی ضرورت ہے جو کہ میرے پاس نہیں ہے اور نہ ہی میں کہیں سے اتنی رقم کا بندوبست کرسکتی ہوں لہٰذا......" لمحاتی توقف کر کے اس نے ایک گہری سانس لی پھر بات مکمل کرتے ہوئے بولی۔ "لہٰذا میں اپنا مکان فروخت کرنے پر مجبور ہوں۔"

"مجبوری میں انسان نقصان اٹھانے کے لیے تیار ہوجاتا ہے۔" سلیم اقبال نے کہا۔ "لیکن اس نقصان کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ کیا آپ کو اپنے مکان کی مارکیٹ ویلیو معلوم ہے؟"

"جی، میں درست مارکیٹ ویلیو سے تو واقف نہیں لیکن میرا اندازہ ہے کہ کسی بھی طرح میرا مکان سوا تین لاکھ سے کم کا نہیں۔"

"آپ کا اندازہ درست ہے۔" سلیم اقبال نے کہا۔ "آپ کا مکان سوا تین سے ساڑھے تین لاکھ مالیت تک کا ہے اور آپ اسے محض دو لاکھ ستر ہزار میں فروخت کرنے جارہی ہیں۔"

"نہیں تو......" مہر النسا نے چونک کر سلیم اقبال کی طرف دیکھا۔ "مجھے تو اس مکان کا دو لاکھ سے زیادہ ایک پیسا نہیں مل رہا۔"

کرائے کا مکان

بیمار پڑنے کے صدہا نقصانات ہیں مگر ایک فائدہ بھی ہے، وہ یہ کہ اس بہانے اپنے بارے میں دوسروں کی رائے معلوم ہوجاتی ہے۔ بہت سی کڑوی کسیلی باتیں جو عام طور سے ہونٹوں پر لرز کر رہ جاتی ہیں، بے شمار دل آزار فقرے جو "خوفِ فسادِ خلق" سے حلق میں اٹک کر رہ جاتے ہیں، اس زمانے میں یار لوگ نصیحت کی آڑ میں "ہوالشافی" کہہ کر بڑی بے تکلفی سے داغ دیتے ہیں۔ پچھلے سنیچر کی بات ہے۔ میری عقل ڈاڑھ میں شدید درد تھا کہ ایک روٹھے ہوئے عزیز جن کے مکان پر حال ہی میں قرض کے روپے سے چھت پڑی تھی، لقا کبوتر کے مانند سینہ تانے آئے اور فرمانے لگے:

"ہیں آپ بھی ضدی آدمی! لاکھ سمجھایا کہ اپنا ذاتی مکان بنوا لیجیے مگر آپ کے کان پر جوں نہیں رینگتی۔"

طعنے کی کاٹ درد کی شدت پر غالب آئی اور میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ "بھائی! میری عقل تو اس وقت کام نہیں کرتی۔ خدارا! آپ ہی بتایئے۔ کیا یہ تکلیف صرف کرایہ داروں کو ہوتی ہے؟"

ہنس کر فرمایا۔ "بھلا یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ کرائے کے مکان میں تندرستی کیونکر ٹھیک رہ سکتی ہے۔"

کچھ دن بعد جب انہی حضرت نے میرے گھٹنے کے درد کو بے دودھ کی چائے پینے اور رمی کھیلنے کا شاخسانہ قرار دیا تو بے اختیار اُن کا سر پیٹنے کو جی چاہا۔

مشتاق احمد یوسفی کی کتاب چراغ تلے سے اقتباس

مرسلہ: امتیاز احمد، کراچی

اب سلیم اقبال کے چونکنے کی باری تھی۔ "دو لاکھ والی بات آپ کو کس نے بتائی ہے؟"

"فاروق بھائی نے۔" وہ سادگی سے بولی۔ "انہیں پراپرٹی ایجنٹ فیاض نے بتایا ہے کہ یہ مکان دو لاکھ سے زیادہ میں نہیں جاسکتا اور...... میں اپنی مجبوری کے پیشِ نظر راضی ہوگئی ہوں......" ایک لمحے کو رک کر اس نے متذبذب نظر سے سلیم اقبال کی طرف دیکھا اور پوچھا۔

"آپ نے میرے مکان کی قیمت کے حوالے سے

دولاکھ ستر ہزار کی بات کیوں کی؟"
سلیم اقبال صورتِ حال کو سمجھ چکا تھا۔ اس نے حقیقت مہرالنسا تک پہنچانے کا فیصلہ کرلیا اور گہری سنجیدگی سے بولا۔

"میں نے دولاکھ ستر ہزار روپے کی بات اس لیے کی ہے کہ یہ مکان میرا ایک ملازم سپروائزر یعقوب خرید رہا ہے اور پراپرٹی ایجنٹ فیاض نے اسے مکان کی آخری قیمت بھی بتائی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ فیاض اور فاروق آپس میں ملے ہوئے ہیں۔ وہ دو لاکھ آپ کو تھما کر ستر ہزار آپس میں بانٹنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔"

"اوہ......" مہرالنسا کے چہرے پر تشویش ابھر آئی۔

"میں تو فاروق بھائی کو بہت ایمان دار اور ہمدرد انسان سمجھ رہی تھی۔ وہ تو مجھے بڑی تسلیاں دے رہا تھا اور فیاض کی مدد سے میرے لیے کرائے کا مکان بھی ڈھونڈ رہا تھا۔ آپ میرا ایک کام کرسکتے ہیں؟"

آخری جملہ مہرالنسا نے درخواست گزار انداز میں ادا کیا تھا۔ سلیم اقبال نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا اور پوچھا۔

"کون سا کام؟"

"آپ اپنے ملازم سے کہیں کہ وہ میرا مکان مجھ سے براہِ راست ہی خرید لے۔" مہرالنسا نے امید بھرے لہجے میں کہا۔ "اگر میں پراپرٹی ایجنٹ کے چکر سے نکل جاؤں تو میرا ستر ہزار کا فائدہ ہوجائے گا۔"

"اگر آپ ضد کریں گی تو میں براہِ راست آپ کا یہ کام کروادوں گا۔" سلیم اقبال نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "لیکن میرا مشورہ یہی ہے کہ آپ ساڑھے تین لاکھ والا مکان دولاکھ ستر ہزار میں نہ بیچیں۔"

"پھر کیا کروں؟" مہرالنسا کے چہرے پر پریشانی نمودار ہوگئی۔ "مجھے فوری طور پر رقم کی ضرورت ہے۔"

"وکیل کی فیس کا انتظام ہوجائے گا۔" سلیم اقبال نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "آپ کو اس سلسلے میں فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔ اس کے بعد بھی جو عدالتی اخراجات ہوں گے، وہ میں دے دوں گا۔"

مہرالنسا کی آنکھیں اظہارِ تشکر سے بھیگ گئیں۔ اس نے جذبات سے بوجھل آواز میں پوچھا۔

"لیکن یہ سب آپ میرے لیے کیوں کریں گے......؟"

"آپ اسے انسانی ہمدردی کا نام دے لیں۔" سلیم اقبال نے کہا۔ "مکان بیچ کر آپ دربدر ہوجائیں گی۔ آپ کو اندازہ نہیں کہ عدالتی معاملات انسان کو کس کس در کی خاک چھاننے پر مجبور کردیتے ہیں۔"

"بہت شکریہ سلیم صاحب!" مہرالنسا نے ممنونیت بھرے لہجے میں کہا۔ "آپ کی یہی مہربانی بہت ہے کہ آپ اس کڑے وقت میں خلوصِ نیت سے میرے کام آرہے ہیں لیکن میں چاہوں گی کہ آپ میری یونہی مالی مدد نہ کریں بلکہ یہ رقم مجھے ادھار دے دیں۔ جب کامران باعزت بری ہوکر واپس آئے گا تو میں آپ کی پائی پائی لوٹادوں گی۔"

مہرالنسا کی خودداری نے سلیم اقبال کو متاثر کیا۔ وہ بھی یہی چاہتا تھا کہ اس کی عزتِ نفس مجروح نہ ہو چنانچہ اس نے معتدل لہجے میں کہا۔

"ٹھیک ہے، آپ اس رقم کو قرضِ حسنہ سمجھ لیں۔"

اب مہرالنسا کے پاس کہنے کے لیے کچھ نہیں بچا تھا۔ اس نے خاموشی سے گردن جھکالی اور دل ہی دل میں سلیم اقبال کو دعائیں دینے لگی۔

سلیم اقبال نے اپنے منیجر شکیل کو کمرے میں بلایا اور اسے کامران کے کیس کے حوالے سے مختلف نوعیت کی ہدایات دینے لگا۔ اس کے بعد ہی شکیل نے میرے آفس کا رخ کیا تھا۔

بات ختم کرنے کے بعد محمد شکیل نے ایک مناسب اماؤنٹ کا چیک میری جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔ "بیگ صاحب! یہ سلیم صاحب نے آپ کے لیے بھیجا ہے۔ اسے آپ ایڈوانس سمجھ لیں۔ مجھے نہیں معلوم کہ آپ کی فیس کتنی ہے۔ یہ حساب ہم بعد میں بھی کرسکتے ہیں۔" لمحاتی توقف کے بعد اس نے ان الفاظ میں اضافہ کیا۔

"میں نے ذاتی طور پر یہ محسوس کیا ہے کہ سلیم صاحب مہرالنسا کو اس مصیبت سے نجات دلانے کے لیے بہت سنجیدہ ہیں لہٰذا میں سمجھتا ہوں، وہ مہرالنسا کے شوہر کے کیس پر پیسا خرچ کرنے کے معاملے میں کنجوسی نہیں کریں گے۔ آپ اس حوالے سے مکمل اطمینان رکھیں اور اپنی بہترین پیشہ ورانہ صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے اس کیس کو جیتنے کی کوشش کریں۔"

"شکیل صاحب!" اس کے خاموش ہونے پر میں نے کہا۔ "میں ہر کیس میں پوری دیانت داری کے ساتھ اپنی بہترین صلاحیتوں ہی کو آزماتا ہوں اور جہاں تک میری فیس یا دیگر عدالتی اخراجات کا تعلق ہے تو ظاہر ہے، وہ سلیم صاحب کو اٹھانا ہی پڑیں گے۔ میں اپنی فیس میں تھوڑی بہت رعایت کردوں گا کیونکہ صبح وہاب عثمانی صاحب نے

خاص طور پر مجھے اس بات کی ہدایت کی تھی۔"

"آپ اتنا بھی کر دیں گے تو کافی ہے۔" وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ "اگر آپ کی اجازت ہو تو میں اب جانا چاہوں گا۔ مجھے سلیم صاحب کو آج کی کارکردگی کی رپورٹ بھی پیش کرنا ہے۔"

"آپ کو میری طرف سے جانے کی اجازت ہے لیکن ایک عرض ضرور کروں گا۔" میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

"جی ضرور۔" وہ سوالیہ نظر سے مجھے تکنے لگا۔

"میرے پیشے کا یہ اصول ہے کہ جب تک میں کسی شخص کی کہانی سے خود مطمئن نہ ہو جاؤں اس وقت تک میں اس کا کیس اپنے ہاتھ میں نہیں لیتا۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "ابھی تک آپ نے مجھے مہرالنسا کی مصیبت کی داستان سنائی ہے۔ مجھے کچھ پتا نہیں کہ اس کا شوہر کن حالات میں قتل کے الزام میں گرفتار ہوا ہے اور موجودہ کیس میں اس کی پوزیشن کیا ہے۔ اس حوالے سے مجھے مکمل معلومات چاہیے ہوں گی۔"

"بیگ صاحب! سچی بات تو یہ ہے کہ میں بھی کامران کے کیس کے بارے میں زیادہ نہیں جانتا۔" محمد شکیل نے کہا۔ "میں ایسا کرتا ہوں کہ اس کی بیوی کو آپ کے پاس بھیج دیتا ہوں۔ وہ پوری تفصیل سے آپ کو تمام حالات سے آگاہ کر دے گی۔"

"یہی مناسب رہے گا۔" میں نے کہا۔

اس نے اٹھ کر کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ "اب میں چلتا ہوں۔"

"ایک منٹ شکیل صاحب۔" میں نے کہا۔ "اس چیک کے حوالے سے رسید لیتے جائیں۔"

"بیگ صاحب! اس کی کیا ضرورت ہے؟" وہ جلدی سے بولا۔

"ضرورت ہے جبھی تو دے رہا ہوں۔" میں نے رسید تیار کرتے ہوئے کہا۔ "بعض کام ریکارڈ کی درستی کے لیے لازم ہوتے ہیں۔ جب قانون داں ہی اصولوں اور ضابطوں کی پیروی اور پابندی نہیں کریں گے تو عام لوگوں سے کیسی شکایت!"

وہ ستائشی نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے رسید بنا کر اس کے حوالے کی اور وہ میرا شکریہ ادا کر کے رخصت ہو گیا۔

☆☆☆

لازم کامران سے میری ملاقات آئندہ پیشی پر ہی ہو سکی تھی۔ شکیل نے حسب وعدہ اگلے روز مہرالنسا کو میرے آفس بھیجا تو تھا لیکن وہ بھی ان واقعات کے بارے میں زیادہ نہیں جانتی تھی۔ اس نے مجھے جو معلومات فراہم کیں وہ کیس کی اسٹڈی کے لیے ناکافی تھیں لہٰذا میں نے کامران سے ملاقات ضروری سمجھی۔

اس روز کامران عدالت میں حاضر تو ہوا مگر بعض ناگزیر وجوہ کی بنا پر عدالتی کارروائی نہ ہو سکی اور تاریخ پڑ گئی۔ میں نے اس موقع کو غنیمت جانا اور مہرالنسا کی معیت میں کامران سے تفصیلی ملاقات کر لی۔

کامران کی عمر چالیس کے قریب رہی ہو گی۔ اس کا شیو بڑھا ہوا تھا اور سر کے بال بھی بے ترتیب تھے۔ آنکھوں کے گرد پڑے حلقے بتاتے تھے کہ کافی دنوں سے اس کی نیند پوری نہیں ہوئی تھی۔ اس نے اپنی بیوی کے ہمراہ مجھے دیکھا تو چونک اٹھا۔

اس کا چونکنا اس لیے نہیں تھا کہ وہ مجھے جانتا تھا۔ ہم آج پہلی مرتبہ مل رہے تھے لہٰذا جان اور پہچان کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ جلد ہی اس کے چونکنے کا سبب سامنے آ گیا۔ اس نے مجھے اور مہرالنسا کو باری باری دیکھنے کے بعد اپنی بیوی سے کہا۔

"تم یہاں مت آیا کرو۔ یہ کوئی اچھی جگہ نہیں ہے۔"

بات ختم کر کے اس نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا۔

مجھے یہ سمجھنے میں کوئی دشواری محسوس نہ ہوئی کہ وہ اپنی بیوی سے بہت محبت کرتا تھا اور مہرالنسا کے نزدیک کسی نامحرم کو دیکھ کر اسے دکھ ہوتا تھا۔ میرے کالے کوٹ نے اس پر یہ تو واضح کر دیا تھا کہ میں ایک وکیل ہوں لیکن اس کی سوالیہ نگاہ یہ جاننا چاہتی تھی کہ میں اس کی بیوی کے ہمراہ کیوں ہوں؟ اس کا وکیل تو کوئی اور تھا جو اس وقت کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

"میں نے آپ کے لیے ایک پرائیویٹ وکیل کا بندوبست کیا ہے۔" مہرالنسا نے اس کی سوالیہ نظر کے جواب میں کہا پھر میری جانب اشارہ کرتے ہوئے بتایا۔ "یہ مرزا امجد بیگ ایڈووکیٹ ہیں۔ آج کے بعد بیگ صاحب آپ کے کیس کی پیروی کریں گے۔ یہ آپ سے چند ضروری کاغذات پر دستخط کرانا چاہتے ہیں۔"

کامران نے ایک سرسری سی نظر مجھ پر ڈالی اور اپنی بیوی سے مستفسر ہوا۔ "پرائیویٹ وکیل کی فیس بہت زیادہ ہوتی ہے۔ ہمارے گھر میں تو پہلے ہی کچھ نہیں بچا۔ ان وکیل صاحب کے اخراجات کون اٹھائے گا؟"

مہرالنسا نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ کامران نے سوال کردیا۔ ''عامی کیسا ہے؟''

عامی سے یقیناً اس کی مراد ان کا پانچ چھ سال کا بیٹا عمران تھی۔ مہرالنسا نے بتایا۔ ''عامی بالکل ٹھیک ہے۔ وہ عدالت آنے کی ضد کررہا تھا لیکن میں نے اس کی بات نہیں مانی اور اسے پڑوس میں چھوڑ کر اکیلی ہی یہاں آئی ہوں۔''

''تم نے بہت اچھا کیا۔'' وہ ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ ''بلکہ میں تو کہتا ہوں، تم بھی ادھر نہ آیا کرو۔ میرے اللہ کو جو منظور ہوگا، وہ ہوجائے گا۔''

''میں آپ کو بتا رہی تھی کہ آپ فیس اور عدالتی اخراجات کی فکر نہ کریں۔'' مہرالنسا نے اصل موضوع کی طرف آتے ہوئے کہا۔ ''اللہ کے ایک نیک بندے نے ہماری مدد کرنے کا وعدہ کیا ہے۔''

''کیا تم نے میرے کیس کے لیے اِدھر اُدھر ہاتھ پھیلانا شروع کردیے ہیں؟'' اس کے چہرے پر کرب کے تاثرات نمودار ہوئے۔

''ایسی کوئی بات نہیں۔'' وہ جلدی سے وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ''میں نے کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلائے۔ میں تو تمہارے لیے کوئی قابل اور چوٹی کا وکیل کرنا چاہتی تھی۔ اسی غرض سے میں نے اپنا مکان بیچنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ اب یہ اتفاق کہ جو پارٹی مکان خرید رہی تھی اس کے باس نے مجھے اپنے پاس بلا کر ساری صورتِ حال کے بارے میں پوچھا کہ میں ساڑھے تین لاکھ کا مکان دو لاکھ ستر ہزار میں کیوں بیچ رہی ہوں۔ جب میں نے اپنی مجبوری بتائی تو اس فرشتہ صفت انسان نے مجھے مکان فروخت کرنے سے منع کردیا اور کہا کہ وہ آپ کے کیس کا سارا خرچہ اٹھائے گا جو قرضِ حسنہ ہوگا۔ جب بعد میں ہماری گنجائش ہوگی، ہم اس کی رقم واپس کردیں گے۔''

''اوہ مائی گاڈ......'' کامران نے سٹپٹائے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''تم اتنی کم قیمت میں مکان بیچنے جارہی تھیں؟''

کامران کے اس سوال پر مہرالنسا پھٹ پڑی اور اس نے کامران کے دوست فاروق اور فاروق کے دوست پراپرٹی ایجنٹ فیاض کا کچا چٹھا اپنے شوہر کو بتادیا اور آخر میں کہا۔

''فاروق تو مجھے صرف دو لاکھ پر ٹرخانے کے بارے میں سوچ رہا تھا......''

''اللہ غارت کرے ایسے دوستوں کو۔'' کامران نے دانت کچکچاتے ہوئے کہا۔ ''آج کے زمانے میں کوئی کسی کا نہیں ہے۔ بہت برا وقت آگیا ہے۔''

''مسٹر کامران! وقت اور زمانے کو برا نہ کہیں۔'' میں نے پہلی مرتبہ ان میاں بیوی کی گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔ ''اسی زمانے میں سلیم اقبال جیسے نیک دل اور خداترس انسان بھی موجود ہیں جو کسی مجبور کی بے بسی سے فائدہ اٹھانے کے بجائے اسے نقصان سے بچاتے ہیں اور اس کی مصیبت کو رفع کرنے کے لیے اسے قرضِ حسنہ دینے کے لیے بھی تیار ہوجاتے ہیں۔''

اس کے چہرے کے تاثرات میں نمایاں تبدیلی رونما ہوئی۔ وہ ممنونیت بھرے انداز میں مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''یہ تو آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ میں جذبات میں کچھ زیادہ ہی بول گیا تھا۔ سوری وکیل صاحب......''

''سوری کی ضرورت نہیں۔'' میں نے زیرِلب مسکراتے ہوئے کہا۔ ''آپ ان دنوں جس نوعیت کی صورتِ حال سے گزر رہے ہیں، اس میں انسان کے ذہن کی ایسی ہی کیفیت ہوجاتی ہے......'' میں نے لمحاتی توقف کرکے ایک گہری سانس لی پھر چند کاغذات اس کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔

''باقی باتیں بعد میں ہوتی رہیں گی۔ پہلے آپ ان کاغذات پر دستخط کردیں۔''

اس نے ہتھکڑی لگے ہاتھ سے میری نشاندہی پر، وکالت نامے، درخواستِ ضمانت، موجودہ سرکاری وکیل کے وکالت نامے کی منسوخی اور چند دیگر کاغذات پر دستخط کردیے اور پوچھا۔

''وہ پہلے والے وکیل کا کیا ہوگا؟''

''دوسرا آگیا ہے تو پہلے والا واپس چلا جائے گا۔'' میں نے سادہ سے لہجے میں کہا۔ ''آپ اس سرکاری وکیل کے بارے میں سوچ کر اپنے ذہن کو نہ تھکائیں۔ میں اسے خود فارغ کردوں گا۔ آپ مجھے اپنے کیس کے بارے میں بتائیں۔''

کامران کا ہاتھ جس ہتھکڑی میں جکڑا ہوا تھا، اس کا دوسرا سرا ایک پولیس اہلکار کے ہاتھ میں تھا۔ وہ سپاہی کافی دیر سے ناگواری سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ جب میں نے کامران سے اس کی داستان سننے کی فرمائش کی تو اس کانسٹیبل نے بے حد بیزاری کے عالم میں کہا۔

''جناب! بہت ہوگئی بات چیت۔ قانون اس کی اجازت نہیں دیتا۔''

میں نے سپاہی کی طرف دیکھتے ہوئے طنزیہ لہجے میں

کہا۔ "بادشاہو! میں وکیل ہوں۔ سارا قانون میں نے گھول کر پی رکھا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ قانون کا ایک آرٹیکل اس قسم کی گفتگو کی اجازت دیتا ہے۔"

"کون سا آرٹیکل؟" وہ چونک کر مجھے دیکھنے لگا۔

"آرٹیکل تیس......" میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔

"میں نے تو اس آرٹیکل کے بارے میں کبھی نہیں سنا۔" اس کی الجھن میں حیرت بھی شامل ہوگئی۔

"میں آپ کو بتاتا ہوں۔" میں نے جیب سے بٹوا نکال کر کھولا اور دس دس والے تین کرارے نوٹ کانسٹیبل کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔ "یہ ہے آپ کے قانون کا آرٹیکل تیس جو عدالت کے احاطے میں ایک وکیل کو اس بات کی اجازت دیتا ہے کہ وہ اپنے موکل سے تفصیلی بات کرسکے۔ میری بات سمجھ میں آئی یا قانون کی کتاب بھی کھول کر دکھاؤں؟"

"جی سمجھ گیا۔" اس نے خجالت آمیز انداز میں دانت نکالتے ہوئے کہا۔

آپ کو اس بات پر حیرانی ہورہی ہوگی کہ کانسٹیبل تیس روپے لے کر بھی خوش تھا۔ زیادہ حیران ہونے کی ضرورت نہیں۔ یہ واقعہ آج سے کئی........ سال پہلے کا ہے۔ اس زمانے میں تیس روپے کی اچھی خاصی اہمیت ہوا کرتی تھی لیکن پولیس والوں کا آج بھی کم و بیش یہی معیار ہے۔ روڈ پر یہ لوگ آج بھی بیس تیس روپے لے کر خوش ہوجاتے ہیں۔ اسی کو کہتے ہیں، بھاگتے چور کی لنگوٹی ہی سہی......!

آئندہ بیس منٹ میں، میں نے بڑے تسلی آمیز انداز میں کامران کی دکھ بھری کہانی سن لی۔ اس نے جو واقعات بیان کیے ان کی روشنی میں مجھے یہ اندازہ لگانے میں کوئی وقت محسوس نہ ہوئی کہ وہ واقعی بے گناہ تھا۔ ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت کامران کو اس کیس میں پھنسایا گیا تھا۔ میں نے اس کا کیس لڑنے کا فیصلہ کرلیا اور اسی وقت میں متعلقہ عدالت کے کمرے میں گیا اور اپنے وکالت نامے کے ساتھ ہی پہلے وکیل کے وکالت نامے کی منسوخی اور دیگر اہم قانونی کاغذات جمع کرادیے۔ اب آئندہ پیشی پر کامران کے کیس کی پیروی مجھے کرنا تھی۔

جب میں عدالت کے کمرے سے واپس آیا تو میں نے کامران کے نزدیک ایک وکیل کو کھڑے دیکھا۔ ان دونوں میں شاید میرے ہی حوالے سے بات ہورہی تھی۔ بعدازاں میرا یہ اندازہ درست ثابت ہوا۔ جب میں ان کے قریب پہنچا تو کامران نے میری جانب اشارہ کرتے ہوئے مذکورہ وکیل سے کہا۔

"یہ ہیں بیگ صاحب۔ اب یہی میرے وکیل ہیں۔ آپ کو جو کچھ بھی کہنا ہے، انہی سے کہیں۔"

اسی دوران میں جیل وین کے جانے کا وقت ہوگیا۔ کانسٹیبل کامران کو اپنے ساتھ لے گیا۔ میں نے آئندہ پیشی پر ملاقات کا کہہ کر مہرالنسا کو بھی رخصت کردیا۔ وہ میرا شکریہ ادا کرکے چلی گئی۔ جب میں پارکنگ لاٹ کی جانب بڑھنے لگا تو کامران کے سابق وکیل نے شکایتی نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

"جناب! یہ آپ نے اچھا نہیں کیا......!"

میں نے انجان بنتے ہوئے کہا۔ "میں نے کیا کردیا بھائی؟"

"آپ کو مجھ سے مشورہ تو کرلینا چاہیے تھا۔" وہ بُرا سا منہ بناتے ہوئے بولا۔

"کس سلسلے میں؟" میں نے استفسار کیا۔

"کامران کے کیس میں ہاتھ ڈالنے کے سلسلے میں۔" اس نے کہا۔ "آج تک اس کا کیس میرے پاس تھا۔"

"اچھا......" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "آپ کتنے عرصے سے اس کیس کی پیروی کر رہے تھے؟"

"دو ماہ سے زیادہ عرصہ ہوگیا ہے۔" اس نے بتایا۔

"میرے محترم دوست!" میں نے ذو معنی انداز میں کہا۔ "آپ نے یہ کیس لینے سے پہلے مجھ سے مشورہ کیا تھا؟"

"نن نہیں......" وہ گڑبڑا گیا۔ "مگر.... مجھے آپ سے مشورہ کرنے کی کیا ضرورت تھی؟"

"جس طرح آپ کو مجھ سے مشورہ کرنے کی ضرورت نہیں تھی، اسی طرح میں نے بھی آپ سے مشورہ کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی......" لمحاتی توقف کرکے میں نے ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

"یہ عین، کسی اور وکیل کو جب یہ کیس لینا ہوگا تو وہ مجھ سے مشورہ کرنے کا پابند نہیں ہوگا۔"

"یہ تو آپ عجیب بات کر رہے ہیں۔" وہ برہمی سے بولا۔

"شکر کریں، میری بات صرف عجیب ہی ہے۔" میں نے گہری سنجیدگی کی اداکاری کرتے ہوئے کہا۔ "اگر یہ عجیب کے ساتھ ساتھ غریب بھی ہوتی تو آپ کے لیے کافی مسائل کھڑے ہوسکتے تھے۔"

وہ میری الجھے دار باتوں کے چکر میں آ گیا اور فکرمندی سے بولا۔ "مثلاً کون سے مسائل؟"

"رہنے دیں۔" میں نے تفریح لینے کی غرض سے کہا۔

"آپ پہلے ہی مجھے خاصے پریشان نظر آرہے ہیں۔ میں یہ پیچیدہ معاملات آپ کے سامنے پیش کر کے آپ کی پریشانی میں اضافہ نہیں کرنا چاہتا۔ بہتر یہ ہوگا کہ...... کہ ہم کام کی بات کریں۔"

میں نے آخری جملہ بڑے ڈرامائی انداز میں ادا کیا تھا۔ اس کے کان کھڑے ہوگئے اور اس نے اضطراری لہجے میں مجھ سے پوچھا۔

"کون سی کام کی بات؟"

"بھئی یہی کام کی بات کہ کامران کے کیس سے آپ الگ ہو چکے ہیں اور اب اس کیس کی پیروی میں کروں گا۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "آپ نے دو ماہ سے زیادہ عرصے میں جو کارکردگی دکھائی ہے اس سے کامران اور اس کی بیوی مطمئن نہیں تھے اس لیے انہوں نے آپ کو کٹ کر کے مجھے اپنا وکیل مقرر کرلیا ہے۔ اصولی طور پر مجھے بھی کم از کم دو ماہ تو ملنا ہی چاہئیں۔ اگر میں بھی ان کے حسبِ منشا کارکردگی نہ دکھا سکا تو میں خود ہی یہ کیس چھوڑ دوں گا......"

میری بات اس کی سمجھ میں تو آگئی تھی لیکن وہ دانستہ میرے الفاظ کو ہضم کرنے کے لیے تیار نہیں تھا اس لیے اتمامِ حجت کے طور پر اس نے کہا۔

"آپ نے یہ کیس پکڑ کر بہت بڑی غلطی کی ہے...... اپنی زندگی کی بھیانک غلطی!"

میں سمجھ رہا تھا کہ وہ محض مجھے بددل کرنے کے لیے اس قسم کی بات کر رہا تھا لیکن اس کے پراسرار انداز نے مجھے پوچھنے پر مجبور کردیا۔

"کون سی غلطی؟"

"اس کیس میں ذرا سی بھی جان نہیں ہے۔" وہ اردگرد نگاہ دوڑانے کے بعد رازدارانہ انداز میں بولا۔

"کیا مطلب ہے آپ کا؟" میں نے آنکھیں سکیڑ کر اس کی طرف دیکھا۔

"کامران کو موت کی سزا ہوجائے گی۔" وہ بدستور پراسرار لہجے میں بولا۔ "اس کے خلاف استغاثہ بہت مضبوط ہے۔ دو چار پیشیوں میں کامران کے خلاف اس کیس کا فیصلہ ہوجائے گا۔"

شاید میں اس سرکاری وکیل کی بات کو تھوڑی بہت اہمیت دے ہی دیتا مگر میں نے کامران کی کہانی پوری توجہ سے سنی تھی اور مجھے اس بات میں کوئی شک نہیں تھا کہ کامران کا کیس کافی جاندار تھا۔

"وکیل صاحب! پھر تو آپ کو میرا شکرگزار ہونا چاہیے۔" میں نے براہِ راست اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

وہ الجھ کر رہ گیا۔ "آپ کیا کہنا چاہ رہے ہیں؟"

"ویری سمپل...... میں نے یہ کیس اپنے ہاتھ میں لے کر آپ کو شکست کے صدمے سے بچالیا ہے۔" میں نے بدستور اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ "دو چار پیشیوں کے بعد جب آپ یہ کیس ہار جاتے تو آپ کی شاندار شہرت کو ایک دھچکا لگتا۔ میں نے آپ کو مستقبل کی ایک شکستِ فاش سے بال بال بچالیا ہے۔"

وہ پاؤں پٹخ کر آگے بڑھ گیا۔ میری چوٹ اتنی کاری اور گہری تھی کہ اس کی زبان پر تالا پڑ گیا تھا۔

کامران نے مجھے جو داستانِ غم سنائی تھی، میں اس میں سے غیر ضروری باتوں کو حذف کر کے خلاصہ آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں تاکہ عدالت کی کارروائی کے دوران میں آپ کا ذہن کسی الجھن کا شکار نہ ہو۔ ہاں، یہ بتاتا چلوں کہ اس میں سے بہت سی باتیں مجھے بعد میں دوسرے ذرائع سے پتا چلی تھیں لیکن واقعات کے تسلسل کو قائم رکھنے کے لیے میں نے انہیں شامل کرلیا ہے۔ اسی طرح بعض باتیں میں نے دانستہ آپ سے چھپا بھی لی ہیں جن کا ذکر عدالتی کارروائی کے دوران میں مناسب موقع پر آئے گا۔

☆☆☆

کامران ایک پرائیویٹ کمپنی میں ملازمت کرتا تھا۔ آپ اس کمپنی کا نام "سگما ٹریڈرز" فرض کرلیں۔ وہ سگما ٹریڈرز میں بطور اکاؤنٹنٹ بھرتی ہوا تھا۔ سگما ایک چھوٹی سی مقامی کمپنی تھی۔ یہ لوگ ماسکنگ ٹیپ تیار کرتے تھے۔ لوگ عموماً ماسکنگ ٹیپ کے نام سے آشنا نہیں ہیں اور اس ٹیپ کو "پیکنگ ٹیپ" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہ پیلے، بھورے اور آف وہائٹ رنگوں میں مارکیٹ میں دستیاب ہوتا ہے۔ جب کسی بھی قسم کا سامان کارٹنز میں پیک کیا جا رہا ہو تو اس ٹیپ کی اشد ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں یہ ٹیپ پینٹرز اور رنگ ساز بھی مختلف مواقع پر استعمال کرتے ہیں۔ اسپرے پینٹنگ میں جس حصے کو رنگ سے بچانا ہو، وہاں اس ٹیپ کو چسپاں کر دیا جاتا ہے گویا اس حصے کی "ماسکنگ" کر دی جاتی ہے۔ سگما ٹریڈرز کا کارخانہ اور

آفس کورنگی انڈسٹریل ایریا میں واقع تھا۔

سگما ٹریڈرز جیسی چھوٹی کمپنیوں میں عموماً ''سیٹھ داری'' سسٹم رائج ہوتا ہے یعنی مالی امور مالک (سیٹھ) اپنے ہاتھ میں رکھتا ہے۔ تمام پے منٹس وہی کرتا ہے البتہ حسابی امور کو ٹھیک رکھنے کے لیے اکاؤنٹنٹ کے نام پر ایک ایسے شخص کو رکھ لیا جاتا ہے جو منشی کی حیثیت سے کمپنی کے اکاؤنٹس کو مینٹین کرتا رہتا ہے۔

کامران بھی سگما ٹریڈرز میں اسی حیثیت سے آیا تھا لیکن کچھ ہی عرصے میں اس نے اپنے سیٹھ کریم بخش کی نظر میں بہت زیادہ اہمیت اختیار کرلی۔ وہ محنتی اور ایمان دار تھا لہٰذا اس کی ترقی کی راہ میں کوئی رکاوٹ کھڑی نہیں ہوسکتی تھی۔ کریم بخش کا اعتماد حاصل ہوتے ہی ایک طرف اس کی تنخواہ میں اضافہ ہوا تو دوسری جانب ذمے داریاں بھی بڑھ گئیں۔ اب وہ محض منشی گیری نہیں کررہا تھا بلکہ کیشیئر کا کام بھی اس کے ہاتھ میں آگیا تھا۔ اس کے علاوہ وہ کریم بخش کے ایما پر مختلف پارٹیوں سے ڈیلنگ بھی کرنے لگا تھا۔ اب کمپنی کا اچھا خاصا کیش اس کی کسٹڈی میں رہتا تھا۔ سگما ٹریڈرز کا بزنس زیادہ تر کیش پے منٹس پر چلتا تھا۔ اس زمانے میں صرف بھاری اماؤنٹس کی ادائیگی ہی چیک کے ذریعے کی جاتی تھی ورنہ پانچ، دس لاکھ تک کی رقم تو کیش ہی دے دی جاتی تھی چنانچہ سگما ٹریڈرز کا سارا کیش کامران کے ہاتھ سے ہوکر جاتا تھا۔ وہ اپنی سہولت اور مصروفیت کے مطابق کبھی، دو دن اور کبھی تین دن کے بعد بھی کیش کو بینک میں جمع کرادیا کرتا تھا اور کبھی اس سے بھی زیادہ دیر ہوجایا کرتی تھی۔ کریم بخش اس پر مکمل بھروسا کرتا تھا۔ کامران بڑے فخر کے ساتھ اپنے دوستوں کو بتایا کرتا تھا کہ اس کا سیٹھ اس پر اندھا اعتماد کرتا ہے۔ پھر ایک روز کامران کا یہی فخر اس کے لیے وبالِ جان بن گیا۔

سیٹھ کریم بخش کا ایک سسرالی رشتے دار تھا جس کا نام فرید خان تھا۔ وہ اکثر فیکٹری کا چکر لگالیا کرتا تھا۔ تمام اسٹاف اسے کریم بخش کا سالا سمجھتا تھا لیکن درحقیقت فرید خان، کریم بخش کا سگا سالا نہیں تھا بلکہ اس کی بیوی کا کزن تھا۔ فرید خان فیکٹری کے ورکرز سے گھل مل کر بات کرتا تھا اور کامران سے تو اس کی اچھی خاصی دوستی بھی ہوگئی تھی تاہم کامران نے ہمیشہ اس بات کا خیال رکھا تھا کہ وہ سیٹھ کریم بخش کا ملازم ہے اور فرید خان سیٹھ کا رشتے دار......!

''سگما ٹریڈرز'' کے اوقاتِ کار صبح نو بجے سے شام چھ بجے تک تھے یعنی وہاں ''نائن ٹو فائیو'' کا اطلاق نہیں ہوتا تھا اور جن دنوں کسی بڑے آرڈر کی تیاری کے سلسلے میں کام ہو رہا ہوتا تھا تو فیکٹری کی مشینیں رات دس بجے تک یا اس سے بھی زیادہ دیر تک آن رہتی تھیں تاہم شام چھ بجے کے بعد کام کرنے والوں کو باقاعدہ اوور ٹائم دیا جاتا تھا۔ کامران عموماً ساڑھے چھ یا زیادہ سے زیادہ سات بجے تک فیکٹری سے نکل جاتا تھا۔ اس کی رہائش محمود آباد کے علاقے میں تھی۔ آمدورفت کے لیے اس نے ایک بائیک رکھی ہوئی تھی۔

ایک روز وہ فیکٹری کے دفتر میں بیٹھا اپنا کام نمٹا رہا تھا کہ فرید خان کا فون آگیا۔

''ہیلو......'' اس نے ریسیور اٹھا کر ماؤتھ پیس میں کہا۔

''کامران! کیسے ہو یار؟'' فرید خان نے دوستانہ انداز میں پوچھا۔

فرید خان اس کے ساتھ ایسی ہی بے تکلفی سے بات کیا کرتا تھا لیکن کامران نے ''آپ جناب'' کا دامن بڑی مضبوطی سے تھام رکھا تھا۔ اس نے سرسری لہجے میں کہا۔

''اللہ کا کرم ہے فرید صاحب۔ آپ سنائیں؟''

''میں بھی ٹھیک ہوں۔'' وہ جلدی سے بولا پھر پوچھا۔ ''آج شام میں کیا مصروفیت ہے؟''

''ابھی تو پانچ بجے ہیں۔'' وہ دیوارگیر کلاک کو دیکھتے ہوئے بولا۔ ''چھ بجے تک فیکٹری سے نکلوں گا اور ظاہر ہے، اس کے بعد گھر ہی جاؤں گا۔''

''گھر تو تم روز ہی جاتے ہو یار۔'' فرید خان نے بہ دستور بے تکلفانہ انداز میں کہا۔ ''آج تھوڑا سا وقت ہمارے لیے بھی نکال لو...... اگر بھابی سے ڈر نہ لگتا ہو۔''

''نہیں فرید صاحب! ایسی کوئی بات نہیں۔'' کامران نے کہا۔ ''آپ حکم کریں، کیا کام ہے؟''

''بھابی سے ڈرنے والی بات میں نے اس لیے کی کہ اکثر شوہروں کو بیوی کے بتائے ہوئے ٹائم ٹیبل کے مطابق گھر پہنچنا ہوتا ہے اور اگر وہ مقررہ وقت سے لیٹ ہوجائیں تو بیوی کے ہاتھوں ان کی اچھی خاصی کھنچائی بھی ہوجاتی ہے۔''

''بعض شوہروں کے ساتھ یقیناً ایسا ہوتا ہے لیکن میں اس معاملے میں خاصا خوش قسمت واقع ہوا ہوں۔'' لمحاتی توقف کرکے اس نے ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''خیر...... آپ بتائیں، میں آپ کی کیا خدمت کرسکتا ہوں؟''

''میں اس وقت اپنی ایک دوست کے ساتھ کینٹ

کے ایک ہوٹل میں بیٹھا ہوں۔'' فرید خان نے بتایا پھر مذکورہ ہوٹل کا نام لینے کے بعد مزید کہا۔ ''آپ فوراً اس ہوٹل کے ریسٹورنٹ میں آجائیں۔ میں آپ کو اپنی دوست سے ملوانا چاہتا ہوں۔''

''خیریت...... میں سمجھا نہیں فرید صاحب۔'' کامران نے الجھن زدہ انداز میں کہا۔ ''آپ مجھے اپنی کسی دوست سے کیوں ملوانا چاہتے ہیں؟''

''آپ یہاں آئیں گے تو سب بتادوں گا۔'' فرید خان نے گول مول انداز میں کہا۔ ''اس قسم کی باتیں فون پر نہیں ہوسکتیں۔'' پھر لمحاتی توقف کرکے اس نے رازدارانہ انداز میں اضافہ کیا۔

''ویسے آپ کے فائدے کی بات ہے۔''

فائدے کی بات ہر شخص کو بھلی معلوم ہوتی ہے تاہم کامران نے کہا۔ ''ٹھیک ہے، میں چھ بجے فیکٹری سے نکلتا ہوں۔ ساڑھے چھ بجے تک آپ کے پاس ہوں گا۔''

''یار! خدا کا خوف کرو۔ ثمرین کو اتنا لمبا انتظار نہیں کراؤ۔'' وہ بے تکلفی سے بولا۔ ''بس تم ابھی نکل آؤ۔ آج کل ویسے بھی انکل کراچی میں نہیں ہیں۔ تم چھٹی کے وقت سے پہلے بھی نکل آؤ گے تو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔''

فرید خان، سیٹھ کریم بخش کو انکل کہا کرتا تھا۔ کریم بخش واقعی پچھلے دو دن سے کراچی سے باہر گیا ہوا تھا۔ کامران کو ثمرین کے نام پر یہ سمجھنے میں ذرا سی بھی دشواری محسوس نہ ہوئی کہ یہ وہی لڑکی ہے جس سے فرید خان اسے ملوانا چاہتا تھا۔ ایک تو فائدے کی بات، دوسرے لڑکی سے ملاقات کے ملاپ نے کامران کو اندر سے گدگدا دیا۔ ایک فوری خیال کے تحت اس نے کہا۔

''اوکے...... میں آرہا ہوں۔''

''گڈ!'' فرید خان نے یہ کہتے ہوئے ٹیلی فونک رابطہ ختم کردیا۔

ٹھیک چالیس منٹ کے بعد کامران مذکورہ ہوٹل واقع علاقہ کینٹ کے ریسٹورنٹ میں فرید خان اور ثمرین کے روبرو بیٹھا ہوا تھا۔

پہلی ہی نظر میں ثمرین کے سراپا اور شخصیت نے کامران کو دل وجان سے متاثر کیا تھا۔ وہ تیکھے نقوش والی ایک دلکش اور ماڈرن لڑکی تھی۔ اس کی عمر پچیس اور تیس کے درمیان رہی ہوگی۔ اس نے پینٹ شرٹ پہن رکھی تھی اور یہ لباس اس کے بدن پر جیسے پھنسا ہوا تھا یا وہ اس لباس کے اندر پھنسی ہوئی تھی۔ ثمرین نے بڑے دل آویز انداز میں اپنے بال کاندھوں تک کٹوا رکھے تھے جو اس وقت کھلے ہوئے تھے جو اس کی پرکشش شخصیت کی مقناطیسیت میں بے پناہ اضافہ کر رہے تھے۔ جب فرید خان نے اپنی دوست کا تعارف کرایا تو ثمرین نے کامران سے باقاعدہ شیک ہینڈ بھی کیا تھا۔ کامران کا کسی خاتون سے مصافحہ کرنے کا یہ پہلا تجربہ تھا جو اسے بہت خوشگوار محسوس ہوا۔ ثمرین کے ہاتھ کو چھوتے ہی کامران کے جسم میں ایک کرنٹ سا دوڑ گیا تھا۔ رسمی علیک سلیک کے بعد فرید خان نے کامران سے پوچھا۔

''باتیں تو ہوتی ہی رہیں گی۔ یہ بتاؤ، ٹھنڈا چلے گا یا گرم؟''

فرید خان کا یہی انداز تھا۔ کبھی وہ بے انتہا بے تکلفی پر اتر آتا اور کبھی بڑے احترام کے ساتھ آپ جناب کرنے لگتا لیکن کامران نے ہمیشہ اس کا احترام کیا تھا اور پاس کا سسرالی رشتے دار ہونے کے ناتے اس کی عزت کی تھی کیونکہ وہ اپنی فطرت سے مجبور تھا۔ بدلحاظی اور بدتمیزی اس کے خمیر میں شامل نہیں تھی۔

''فرید صاحب! میں تو آپ کے ڈسپوزل پر ہوں۔'' وہ ثمرین کی طرف دیکھتے ہوئے فرید سے مخاطب ہوا۔ ''آپ کا جو جی چاہے، منگوالیں۔''

وہ جب سے اس ریسٹورنٹ میں آیا تھا، گاہے بگاہے دلچسپی بھرے انداز میں ثمرین کے سراپا کا جائزہ بھی لیتا جارہا تھا۔ اس امر میں کسی شک وشبے کی گنجائش نہیں کہ ثمرین اسے بہت اچھی لگی تھی۔

''میں تو آئس کریم کھاؤں گا۔'' فرید نے کہا۔ ''آپ دونوں اپنی پسند کا اعلان کردیں۔''

کامران نے سوالیہ نظر سے ثمرین کی طرف دیکھا۔ وہ بڑے دل آویز انداز میں زیرلب مسکرائی اور کامران کی مشکل حل کرتے ہوئے بولی۔

''موسم کی مناسبت سے میں تو کافی پیوں گی اور آپ......؟''

ثمرین نے کامران کی جانب دیکھتے ہوئے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑا تو وہ کسی معمول کے مانند میکانکی انداز میں بولا۔ ''میں بھی کافی۔''

''اوکے......'' فرید خان نے سرسری لہجے میں کہا پھر ویٹر سے دو کافی اور ایک آئس کریم لانے کے لیے کہہ دیا۔

''بھئی! میں تو ''ڈائمنڈ کٹس ڈائمنڈ'' کا قائل ہوں۔'' فرید نے ان دونوں کی جانب دیکھتے ہوئے کاندھے اچکائے۔ ''مطلب یہ کہ لوہا لوہے کو کاٹتا ہے......

اس سرد موسم کی کاٹ آئس کریم ہی سے ہوسکتی ہے۔"

پھر ان کے بیچ خوشگوار ماحول میں ہلکی پھلکی گفتگو ہونے لگی۔ چند لمحات کے بعد کامران نے رسٹ واچ پر نگاہ دوڑاتے ہوئے کہا۔

"فرید صاحب! آپ نے مجھے یہاں کس لیے بلایا تھا؟"

فرید نے اس کے سوال کا جواب دینے کے بجائے مذاق کے رنگ میں کہا۔ "آپ جو بار بار گھڑی کو دیکھ رہے ہو اس سے آپ کی بے چینی ظاہر ہوتی ہے کیونکہ ابھی تک میں نے وہ بات نہیں کی جس کے لیے آپ کو یہاں بلایا گیا ہے...... ہیں نا؟"

"بالکل یہی بات ہے۔" کامران نے اثبات میں گردن ہلائی۔ "آپ نے میرے کسی فائدے کا ذکر کیا تھا شاید؟"

"شاید نہیں...... یقیناً!" فرید خان نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

"فرید! تم کامران صاحب کو بھول بھلیوں میں کیوں ڈال رہے ہو۔" ثمرین نے کامران کی حمایت میں فرید کو گھورا۔ "سیدھے اور صاف الفاظ میں انہیں بتاؤ کہ ان کا فائدہ کس طرح ہوسکتا ہے۔"

"کامران کے فائدے کا تعلق چونکہ تمہاری ذات سے جڑا ہوا ہے اس لیے تم ہی سے شروع کرتا ہوں۔" فرید نے ثمرین کی جانب دیکھتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا پھر کامران کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے بولا۔

"ثمرین میری بہت اچھی دوست ہے۔ اس کے تجربے سے میں نے بھی بہت سا مالی فائدہ اٹھایا ہے اور میں چاہتا ہوں کہ اس گنگا میں تم بھی ہاتھ دھولو۔" لمحاتی توقف کرکے اس نے ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے بتانے لگا۔

"دراصل ثمرین اسٹاک ایکسچینج سے تعلق رکھتی ہے اور "شیئرز" کی خرید و فروخت کا اسے بہت تجربہ ہے۔ شیئرز کے علاوہ بھی اسٹاک مارکیٹ میں انویسٹ منٹ کے بیسیوں راستے ہوتے ہیں جو ثمرین کو سب پتا ہیں۔ اس دنیا میں پل پل چیزوں کی قیمتوں میں کمی اور اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ ثمرین کی ان تمام معاملات پر گہری نظر ہے۔ ایک دو غیر ملکی "وائز سروسز" سے بھی اس کے روابط ہیں۔ اگر تم ثمرین کے ساتھ تعاون کے لیے آمادہ ہو جاؤ تو تمہارے وارے کے نیارے ہو جائیں گے۔"

کامران ایک تو ثمرین کے رعبِ حسن میں آچکا تھا،

دوسرے جب اس کی ذات کے حوالے سے مالی فائدے کا ذکر چھڑا تو کامران کی آنکھوں میں مخصوص قسم کی چمک نمودار ہوئی اور اس نے اضطراری لہجے میں پوچھا۔

"مثلاً کس قسم کا تعاون؟"

"مالی تعاون......!" اس مرتبہ ثمرین نے براہ راست کامران کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "مجھے اسٹاک مارکیٹ کا وسیع تجربہ ہے اور میں یہ کام کافی عرصے سے کر رہی ہوں۔ فرید خان گاہے بہ گاہے میرے اس بزنس میں رقم لگاتے رہتے ہیں اور میں چند دنوں میں ان کی رقم پرافٹ کے ساتھ انہیں واپس کر دیتی ہوں۔ انہوں نے پچھلے دنوں آپ کا ذکر کیا تھا......" اس نے ڈرامائی انداز میں توقف کرکے کامران کی آنکھوں میں جھانکا پھر بڑی لگاوٹ سے بولی۔

"میں نے فرید سے کہا کہ اگر ان کا دوست قابلِ بھروسا ہے تو مجھ سے ایک میٹنگ کرا دیں تاکہ میں بھی مطمئن ہو جاؤں۔ آج اسی سلسلے میں آپ کو یہاں بلایا گیا ہے اور......میں نے آپ کو اوکے کر دیا ہے۔"

آخری جملہ ثمرین نے اس انداز سے ادا کیا تھا جیسے کوئی حسینۂ عالم اس کے پروپوزل کے جواب میں "اوکے" کہہ رہی ہو۔ اس کے رگ و پے میں ایک سنسنی سی دوڑ گئی۔ وہ ثمرین کی طرف دیکھتے ہوئے جذبات سے مغلوب آواز میں بولا۔

"ثمرین جی! آپ کا شکریہ مگر......یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ میں آپ کے بزنس میں رقم کس طرح انویسٹ کر سکتا ہوں۔ میں تو ایک تنخواہ دار ملازم ہوں۔ مہینا بعد میں ختم ہوتا ہے اور میری تنخواہ اس سے پہلے ختم ہو چکی ہوتی ہے۔"

"اور میں چاہتا ہوں کہ تم اس کسمپرسی کی کیفیت سے باہر آ جاؤ۔" فرید نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "میں تمہیں اپنا دوست کہتا ہوں تو دل سے تمہیں دوست سمجھتا بھی ہوں اسی لیے تمہارے فائدے کی بات کر رہا ہوں۔"

"مگر انویسٹ منٹ کے لیے رقم نہیں ہے میرے پاس۔" فرید کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی کامران بول اٹھا۔

"ہے تمہارے پاس رقم......" فرید نے زور دیتے ہوئے کہا۔ "اور تم یہ نہ سمجھو کہ کوئی مہینوں یا سالوں کی مدت کی انویسٹ منٹ ہے۔ یہ دنوں کا کھیل ہے پیارے اور منافع کا تناسب فی دن ہے یعنی......" لحاتی توقف کرکے اس نے کامران کی آنکھوں میں دیکھا اور اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

"اگر تم ایک دن کے لیے رقم لگاؤ گے تو منافع ایک فیصد ملے گا۔ دس دن کے لیے لگاؤ گے تو دس فیصد اور اسی طرح اگر تین ماہ کے لیے رقم انویسٹ کرو گے تو تمہاری رقم تقریباً دوگنا ہو جائے گی......کیا سمجھے؟"

"یہ منافع والا حساب تو میری سمجھ میں آ رہا ہے۔" کامران نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ "لیکن اصل مسئلہ وہی ہے کہ میرے پاس رقم نہیں ہے اور آپ بضد ہیں کہ میرے پاس رقم موجود ہے۔"

"میں غلط نہیں کہہ رہا کامران!" وہ میز پر کہنیاں ٹکا کر گہری سنجیدگی سے بولا۔ "تمہارے پاس ذاتی نہ سہی مگر "سگما ٹریڈرز" کی رقم ہر وقت موجود ہوتی ہے۔"

"اوہ......" کامران نے ایک گہری سانس خارج کی پھر محتاط لہجے میں بولا۔ "مگر وہ رقم کریم صاحب کی ہے۔ میں اسے اپنے استعمال میں کیسے لا سکتا ہوں؟"

"ارے یار......انہیں کیسے پتا چلے گا کہ تم نے چند روز تک ایک خاص اماؤنٹ کمپنی کے اکاؤنٹ میں جمع نہیں کرایا اور اسے ذاتی استعمال میں لے آئے۔" فرید نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ "انکل نے سب کچھ تم پر چھوڑ رکھا ہے۔ کمپنی کے حساب سے اگر چند ہزار نکل جائیں گے یا چند ہزار کچھ دنوں کے لیے جمع ہی نہیں کرائے جائیں گے تو انکل کو کچھ پتا نہیں چلے گا۔"

فرید کی بات کامران کی سمجھ میں تو آ گئی تھی لیکن اس کے اندر کا ایمان دار اور شریف انسان مختلف نوعیت کے سوالات ابھار رہا تھا۔

"فرید صاحب! کریم صاحب مجھ پر اندھا اعتماد کرتے ہیں۔"

"اس اعتماد کی وجہ سے تمہارا کام بہت آسان ہو جائے گا۔" فرید نے کہا۔ "بس، تھوڑی سی ہمت کرنے کی ضرورت ہے......سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

"لیکن یہ تو کریم صاحب کے ساتھ دھوکا ہوگا۔" وہ تشویش بھرے لہجے میں بولا۔

"ہاں!" فرید خان نے عجیب سے لہجے میں کہا۔ "نوٹ درختوں پر نہیں اگتے۔ دولت کمانے کے لیے تھوڑا بہت رسک تو لینا ہی پڑتا ہے۔"

"ٹھیک ہے......" کامران نیم آمادہ ہوتے ہوئے بولا۔ "میں سوچ کر جواب دوں گا۔"

"میں تمہارے ساتھ زبردستی نہیں کر رہا۔" فرید نے سرسری انداز میں کہا۔ "تم اپنی مرضی کا فیصلہ کرنے کے لیے

آزاد ہو۔ بس، جو بھی سوچنا ہے جلدی سوچ لو۔'' پھر وہ ثمرین کی جانب دیکھتے ہوئے بولا۔

''ثمرین! میں نے تمہیں کامران سے ملوا دیا ہے اور تم نے اسے ''اوکے'' بھی کر دیا ہے۔ اب تم لوگ اپنے رابطہ نمبر شیئر کرلو۔ آئندہ تمہارے بیچ ڈائریکٹ ڈائلنگ ہو تو سب کے لیے آسانی رہے گی۔''

پھر وہ لوگ ریسٹورنٹ سے اٹھ گئے۔ بل ثمرین نے ادا کیا تھا۔

☆☆☆

کامران نے سوچنے کے لیے مقررہ دنوں کی مہلت نہیں لی تھی۔ بس، فرید کو یقین دلایا تھا کہ وہ بہت جلد انہیں اپنے فیصلے سے آگاہ کر دے گا۔ اگر صرف کامران کے ذہن کو اکیلے میں سوچنا ہوتا تو شاید کسی فیصلے تک پہنچنے کے لیے اسے ہفتوں لگ جاتے لیکن جب دو ذہن مل کر سوچنے اور سمجھنے لگے تو تین ہی دن میں فیصلہ ہو گیا۔ ان دو ذہنوں میں ایک ذہن کامران کا اور دوسرا ثمرین کا تھا۔

اس روز ریسٹورنٹ میں ہونے والی ملاقات میں فرید خان نے ثمرین اور کامران کو ڈائریکٹ کر دیا تھا لہٰذا اگلے ہی دن سے ثمرین اور کامران میں ٹیلی فونک رابطہ شروع ہو گیا تھا اور ان ہی تین دنوں میں انہوں نے دو مرتبہ مختلف ہوٹلز کے ریسٹورنٹس میں ملاقاتیں بھی کر لی تھیں اور...... ان ملاقاتوں میں فرید خان ان کے ساتھ نہیں تھا۔ اس بات میں کسی شک وشبہے کی گنجائش نہیں کہ کامران، ثمرین کے دلکش سراپا اور اس کی بے باکی پر مرمٹا تھا لہٰذا انویسٹمنٹ کے لیے رضامندی کا مرحلہ بہ آسانی اور بخیر وخوبی طے ہو گیا۔

ابتدائی مرحلے پر کامران نے کمپنی کے اکاؤنٹ میں سے پچاس ہزار روپے نکال کر صرف پانچ دن کے لیے ثمرین کے پاس انویسٹ کر دیے۔ اس وقت یہ کام کرتے ہوئے اس کے ذہن میں متعدد خدشات بھی موجود تھے جن کا تعلق اس کی چوری پکڑے جانے کے حوالے سے تھا لیکن کچھ بھی نہیں ہوا۔ اس انویسٹمنٹ کے چھٹے روز ثمرین نے ایک ریسٹورنٹ میں باون ہزار پانچ سو روپے اس کے سامنے رکھ دیے اور کہا۔

''کامران صاحب! اس میں پچاس ہزار روپے تو آپ کا اصل زر ہے اور دو ہزار پانچ سو آپ کا پرافٹ...... پانچ فیصد کے حساب سے۔''

''مبارک ہو میرے دوست!'' فرید خان نے اپنی خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا، آج وہ بھی ان کے ساتھ ہی تھا۔

''آئندہ کے لیے آپ کا کیا پروگرام ہے کامران صاحب؟'' ثمرین نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بڑی محبت سے پوچھا۔

''اب میں کچھ دن کے بعد انویسٹ کرنے کے بارے میں سوچوں گا۔'' اس کے اندر کے انسان نے کہا۔

''ڈر رہے ہو؟'' فرید نے اس کے اندر کے انسان کا گلا گھونٹتے ہوئے کہا۔ ''لگتا ہے، تم ثمرین پر پوری طرح اعتماد نہیں کر رہے ہو۔''

ثمرین سے ہونے والی ملاقاتوں میں کامران نے ایک دو مرتبہ ثمرین کا ہاتھ بھی پکڑا تھا اور ثمرین نے اس پر کوئی اعتراض نہیں کیا تھا بلکہ اس کے ردعمل سے کامران کو یوں محسوس ہوا تھا کہ اگر وہ مزید آگے بڑھنے کی کوشش کرے تو بھی ثمرین کو اس پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ اس معاملے میں وہ اس کی حوصلہ افزائی کرے گی۔ ایک مرد کو اور کیا چاہیے ہوتا ہے......!

''نہیں، ایسی کوئی بات نہیں۔'' وہ فرید کی بات کے جواب میں جلدی سے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''مجھے ثمرین جی پر مکمل بھروسا ہے۔''

''مکمل بھروسا ہے تو پھر کیسی سوچ بچار؟'' فرید نے اس کی نفسیات سے کھیلتے ہوئے کہا۔ ''جب مردوں والا کھیل شروع کیا ہے تو مرد بنو...... جو ڈر گیا، وہ مر گیا۔''

''وہ اصل میں، میں یہ چاہ رہا تھا کہ......'' وہ صورتِ حال کو سنبھالا دیتے ہوئے بولا۔ ''میں اب کی بار پورے ایک لاکھ کی انویسٹمنٹ کروں اور وہ بھی پورے دس دن کے لیے۔''

''واہ بھئی واہ......'' فرید خان نے تعریفی نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ ''پیسا آتے ہی عقل بھی آ گئی۔ اینی ہاؤ...... مجھے تمہارے اس فیصلے سے بہت خوشی ہوئی ہے۔''

پہلی انویسٹ پر صرف پانچ دن میں اسے ڈھائی ہزار کا منافع حاصل ہوا تھا جو اس کی پورے مہینے کی آمدنی سے بھی کچھ زیادہ ہی تھا اور اس منافع کے علاوہ اسے تنہائی میں ثمرین کے ساتھ یادگار لمحات گزارنے کا موقع بھی میسر آیا تھا جس کی کوئی قیمت نہیں لگائی جا سکتی تھی۔

''کامران صاحب! اگر آپ دس دن کے لیے ایک لاکھ انویسٹمنٹ کرنا چاہتے ہیں تو اس میں پرابلم کیا ہے؟'' ثمرین نے بڑی اپنائیت سے پوچھا۔ ''اس چھوٹے سے کام کے لیے اتنی زیادہ سوچ بچار کیوں؟''

''وہ دراصل، بات یہ ہے کہ اس وقت تو میرے پاس صرف پچاس ہزار ہی کی رقم موجود ہے۔'' وہ جلدی سے

وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''میں چاہ رہا تھا کہ کل یا ایک دو دن کے بعد میں بینک سے مزید پچاس ہزار نکلوا کر آپ کو پورے ایک لاکھ دے دوں گا۔''

''کامران صاحب!'' ثمرین اس کی آنکھوں میں ڈوبتے ہوئے بولی۔ ''کیا آپ مجھے اپنا سچا دوست نہیں سمجھتے؟''

یہ سوال ثمرین نے کافی آگے جھک کر کیا تھا اور اس جھکاؤ کے باعث اس کے جسم کا بالائی حصہ کامران کی نگاہ میں عیاں ہو گیا تھا۔ وہ ٹرانس کی سی کیفیت میں بولا۔ اس کی آواز جذبات کی شدت سے کپکپا رہی تھی۔

''بالکل سمجھتا ہوں جی...... آپ میری سچی خیر خواہ اور مخلص دوست ہیں۔''

''بس، تو پھر ایک بات اچھی طرح ذہن نشین کر لیں کہ میں بہت ہی کم چنیدہ افراد کو اپنا دوست بناتی ہوں اور یہ دوستی عارضی نہیں بلکہ مستقل بنیادوں پر ہوتی ہے۔'' وہ بہ دستور آگے جھکے جھکے گہری سنجیدگی سے بولی۔ ''آپ میرے حال ہی کے دوست نہیں ہیں بلکہ میں نے آپ کے مستقبل کے لیے بھی بہت کچھ سوچ رکھا ہے۔''

ثمرین نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑا تو کامران مرغ بسمل کے مانند تڑپ کر مستفسر ہوا۔ ''آپ نے میرے...... مستقبل کے بارے میں...... کیا سوچ رکھا ہے...... ثمرین جی......؟''

''وہ میں آپ کو بعد میں کسی وقت تنہائی میں بتاؤں گی۔'' وہ معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے بولی۔ ''فی الحال آپ یہ سن لیں کہ مجھے آپ پر مکمل اعتماد ہے۔ آپ باقی کے پچاس ہزار روپے کل یا ایک دو دن کے بعد بھی مجھے دیں گے تو میں آپ کا پرافٹ آج ہی سے کاؤنٹ کروں گی اور آج سے ٹھیک گیارھویں روز آپ کو ایک لاکھ دس ہزار روپے مل جائیں گے۔ ایک لاکھ آپ کی انویسٹمنٹ کے اور دس ہزار دس دن کا پرافٹ۔''

ثمرین کی اس وضاحت کے بعد کامران کے پاس کہنے کے لیے کچھ نہیں بچا تھا۔ اس نے فوری طور پر پچاس ہزار روپے ثمرین کے حوالے کر دیے اور اگلے روز مزید پچاس ہزار کمپنی کے اکاؤنٹ سے نکال کر ایک ریسٹورنٹ میں شام کے وقت ثمرین کو دے دیے۔ کریم بخش، کامران پر بہت زیادہ اعتماد کرتا تھا اور احتیاطاً اس نے چیک بک میں دو تین چیکس پر دستخط کر رکھے تھے تا کہ اس کی غیر موجودگی میں کامران کو رقم کی ضرورت پیش آ جائے تو فیکٹری کا کام چلتا رہے۔ اس شام ثمرین ہاتھ پکڑانے سے ایک قدم آگے بڑھ آئی تھی۔

اس واقعے کے ٹھیک دس دن بعد وہ دونوں ایک مرتبہ پھر تنہائی میں ملے اور ثمرین نے ایک لاکھ دس ہزار روپے کامران کے حوالے کر دیے لیکن اب کی بار اس نے مزید انویسٹمنٹ کے لیے اصرار نہیں کیا اور کامران کے ذہن کو انگاروں پر سلگتا چھوڑ کر رخصت ہو گئی۔

اگلے روز کامران نے خود اسے فون کیا اور کہا۔ ''ثمرین جی! میں نے ایک فیصلہ کیا ہے۔''

''کیسا فیصلہ؟'' ثمرین نے بڑی لگاوٹ سے پوچھا۔

''آپ جانتی ہیں، میں ایک ایمان دار اور شریف انسان ہوں اور سیٹھ کریم بخش مجھ پر کتنا اعتماد کرتے ہیں، یہ بھی آپ کو اچھی طرح معلوم ہے۔''

''کامران صاحب! یہ ساری باتیں میرے علم میں ہیں اور آپ کی اسی شرافت نے مجھے متاثر کیا ہے۔'' ثمرین نے تائیدی انداز میں کہا۔ ''لیکن میں سمجھ نہیں پائی کہ آپ نے کون سا فیصلہ کیا ہے؟''

''میں نے سوچا ہے کہ آئے دن کمپنی کے کیش میں سے اور بعض اوقات اکاؤنٹس میں سے رقم نکالنا ٹھیک نہیں ہے۔'' وہ اپنی بات کی وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''کیوں نہ میں ایک ہی بار کوئی بڑی رقم نکلوا کر اتنا پرافٹ کما لوں کہ پھر اس کے بعد میں اپنے پرافٹ ہی کو انویسٹ کر کے آگے بزنس کرتا رہوں۔''

''بہت اچھی بات ہے۔'' ثمرین نے سراہنے والے انداز میں کہا پھر رازدارانہ لہجے میں پوچھا۔ ''کیا کوئی بیس تیس لاکھ انویسٹ کرنے کا پروگرام ہے؟''

''ارے نہیں ثمرین جی۔'' وہ جلدی سے بولا۔ ''اتنی رقم تو کمپنی کے اکاؤنٹس میں ہوتی بھی نہیں۔''

''پھر......؟'' ثمرین نے استفسار کیا۔

''میں پانچ لاکھ تک آسانی سے نکال سکتا ہوں۔'' وہ بڑے اعتماد سے بولا۔

''چلیں، یہ بھی ٹھیک ہے۔'' ثمرین نے اسے گرین سگنل دیتے ہوئے کہا۔

''میں نے حساب لگایا ہے کہ اگر میں پانچ لاکھ روپے دس دن کے لیے آپ کے پاس انویسٹ کروں تو اس رقم پر دس فیصد منافع پچاس ہزار بنتا ہے۔'' کامران نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''کیا میرا یہ حساب درست ہے؟''

''کامران صاحب! آپ سکھا ٹریڈرز کے اکاؤنٹنٹ ہیں۔'' وہ چہک کر بولی۔ ''آپ کا لگایا ہوا حساب

غلط کیسے ہو سکتا ہے۔"

"جب میرے ہاتھ میں اپنے پچاس ہزار آجائیں گے تو پھر مجھے بار بار کمپنی کے اکاؤنٹس کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کرنے کی ضرورت نہیں رہے گی۔" کامران نے مستقبل کا لائحہ عمل ثمرین پر واضح کرتے ہوئے بتایا۔ "پھر میں اپنے یہ پچاس ہزار مستقل بنیادوں پر آپ کے پاس انویسٹ کردوں گا جس پر میرے حساب سے مجھے ماہانہ پندرہ ہزار کا پرافٹ ملتا رہے گا۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا؟"

"آپ کا حساب پرفیکٹ ہے کامران صاحب!" وہ توصیفی لہجے میں بولی۔ "پچاس ہزار کے اماؤنٹ پر تیس دن بعد تیس فیصد پرافٹ اتنا ہی بنتا ہے۔"

"او کے...... تو پھر یہی ڈن ہے۔" کامران کی مسرور آواز ثمرین کی سماعت تک پہنچی۔

ثمرین نے پوچھا۔ "تو پھر آپ پانچ لاکھ روپے مجھے کب دے رہے ہیں؟"

"آج شام میں آپ کی کیا مصروفیات ہیں؟" کامران نے پوچھا۔

"آپ کے لیے میں ہر وقت فری ہوں۔" وہ قربان ہو جانے والے انداز میں بولی۔

"بس تو پھر آج ہی ملتے ہیں۔" کامران نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

ثمرین نے بھی "ڈن" کہتے ہوئے ٹیلی فونک گفتگو کا سلسلہ موقوف کر دیا۔

کامران اس روز بہت خوش تھا۔ بس اسے دس دن کے لیے صبر کر کے بیٹھ جانا تھا۔ اس کے بعد اس کی قسمت کا ستارہ چمک اٹھتا پھر اسے زندگی میں کبھی فراڈ کرنے کی ضرورت پیش نہ آتی۔ ویسے تو وہ کمپنی کے اکاؤنٹس کے ساتھ جو ہیر پھیر کر رہا تھا، اسے وہ فراڈ نہیں سمجھتا تھا۔ بہر حال، وہ اس موقع پر جتنا بھی خوش ہوتا، کم تھا۔ جس شخص کی ماہانہ تنخواہ دو، سوا دو ہزار ہو، اگر اس کے لیے پندرہ ہزار ماہانہ آمدنی کا دروازہ کھل جائے تو یہ اس کے لیے شادیٔ مرگ کا موقع ہوگا۔

دس دن پر لگا کر گزر گئے۔ گیارھویں دن ثمرین نے اسے ساڑھے پانچ لاکھ روپے دینا تھے۔ پانچ لاکھ اس کی انویسٹ کی ہوئی رقم اور پچاس ہزار روپے منافع لیکن یہ گیارھواں دن پھر اس کی زندگی میں کبھی نہ آیا۔

جب گیارھویں روز ثمرین نے اس سے رابطہ نہیں کیا تو وہ پریشان ہو گیا۔ اس نے ثمرین کے نمبر پر فون کیا تو وہ فون بند ملا۔ متعدد بار کوشش کرنے کے بعد بھی جب ثمرین کا فون بند ہی پایا گیا تو اس نے فرید خان سے بات کی۔ فرید خان کی زبانی پتا چلا کہ اس کی بھی کافی دنوں سے ثمرین سے ملاقات نہیں ہوئی۔ یہ سن کر کامران کی پریشانی آسمان سے باتیں کرنے لگی۔

"فرید صاحب! پانچ لاکھ کوئی معمولی رقم نہیں ہوتی۔" اس نے فرید خان سے کہا۔ "اگر کریم صاحب کو اچانک ضرورت پیش آگئی تو میں کیا کروں گا؟"

"ارے یار! آپ نے اتنی بڑی رقم ثمرین کو دے دی اور مجھے بتایا تک نہیں۔" فرید خان نے خفگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"آپ کو تو سب پتا ہی ہے کہ میں ثمرین کے پاس رقم انویسٹ کر رہا تھا۔" کامران نے کہا۔ "اور یہ آپ ہی کا آئیڈیا تھا۔ ثمرین سے آپ ہی نے مجھے ملوایا تھا۔"

"میں نے تمہارے فائدے کے لیے ثمرین سے ملوایا تھا۔" فرید خان نے رکھائی سے کہا۔ "پھر آپ لوگوں نے آپس میں اتنے روابط بڑھا لیے کہ مجھے کوئی لفٹ ہی نہیں۔"

"فرید صاحب! گلے شکوے بعد میں کر لیجیے گا۔" وہ گھبرائے ہوئے لہجے میں بولا۔ "فی الحال مجھے اس مصیبت سے نکلنے کے لیے کوئی ترکیب بتائیں۔"

"مجھے سوچنے کے لیے تھوڑا ٹائم دو۔" فرید خان نے پرخیال انداز میں کہا۔ "میں ثمرین کو بھی ٹریس کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔"

"جو بھی کرنا ہے، بس جلدی کریں فرید صاحب!" کامران نے منت ریز لہجے میں کہا۔ "میں بہت بری طرح پھنسا ہوا ہوں۔"

فرید خان نے اس کی مدد کرنے کا وعدہ کر لیا۔

اگلے روز کامران کے پاؤں کے نیچے سے زمین نکل گئی جب فرید خان نے اسے بتایا کہ ثمرین کے گھر پر تو تالا پڑا ہوا ہے۔ آس پڑوس سے پتا چلا ہے کہ وہ لوگ یہاں پر کرائے دار تھے اور چند روز قبل وہ گھر چھوڑ کر کہیں اور چلے گئے تھے۔ کہاں گئے تھے، اس بارے میں کسی کو کچھ پتا نہیں تھا۔

"اب میں کیا کروں فرید صاحب؟" کامران روہانسا ہو گیا۔

"صبر کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔" فرید نے معنی خیز انداز میں کہا۔ "اگر میرے پاس اتنی رقم ہوتی تو میں اس موقع پر تمہیں ادھار دے دیتا مگر کیا بتاؤں......" اس نے

لمحاتی توقف کیا پھر بڑی فکرمندی سے بولا۔ ''میرے بھی اچھے خاصے پیسے ثمرین کے پاس لگے ہوئے تھے۔''

''اگر کریم صاحب کو اچانک رقم کی ضرورت پیش آگئی تو میں انہیں کیا جواب دوں گا؟'' کامران نے امداد طلب نظر سے فرید خان کی طرف دیکھا۔

''پریشان نہ ہو یار...... میں ہوں نا۔'' فرید خان نے تسلی آمیز انداز میں کہا۔ ''اگر وہ تم سے رقم کے بارے میں پوچھیں تو مجھے بتانا۔''

''آپ کیا کریں گے؟'' کامران نے الجھن زدہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

''اس مسئلے کا کوئی نہ کوئی حل نکالوں گا اور کیا کروں گا۔'' وہ مبہم سے انداز میں بولا۔ ''لیکن تمہیں مجھ سے ایک بات کا وعدہ کرنا ہوگا۔''

''کس بات کا وعدہ؟'' کامران نے پوچھا۔

''اگر کبھی انکل کے سامنے یہ بات کھل گئی کہ تم نے کمپنی کے اکاؤنٹس میں سے پانچ لاکھ روپے نکال کر ادھر ادھر کر دیے ہیں تو تم کسی بھی صورت میں میرا نام ان کے سامنے نہیں لو گے۔'' فرید خان نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''سمجھ گئے نا؟''

''جی، سمجھ گیا۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''لیکن اس وعدے سے میرا مسئلہ تو حل نہیں ہوگا نا......!''

''تم فکر نہیں کرو یار! تمہارا مسئلہ میں حل کروں گا۔'' فرید خان نے بڑے اعتماد کے ساتھ کہا۔ ''میں کوشش کرتا ہوں، دو چار دن میں کہیں سے پانچ لاکھ ارینج کر کے تمہیں دے دوں۔''

''اگر ایسا ہو جائے تو میری جان میں جان آجائے گی۔'' وہ ایک طویل سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ ''اور اگر ایسا نہ ہو سکا تو......؟'' جملہ ادھورا چھوڑ کر اس نے سوالیہ نظر سے فرید خان کی جانب دیکھا۔

''یار! ایک تو تم منفی انداز میں سوچنا چھوڑ دو۔'' فرید خان نے ڈانٹ سے مشابہ لہجے میں کہا۔ ''معاملے کے تاریک پہلو پر ہی تمہاری نظر کیوں جاتی ہے؟'' لمحاتی توقف کر کے اس نے کندھے اچکائے پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''میں ثمرین کو بھی ٹریس کرنے کی بھرپور کوشش کر رہا ہوں۔ تمہارے تو صرف پانچ لاکھ پھنسے ہوئے ہیں اور میرے تو......!''

''تو کیا آپ نے اس سے بھی زیادہ رقم ثمرین کو دے رکھی ہے؟'' فرید خان کے نامکمل جملے کے جواب میں کامران نے فوراً سوال کر دیا۔

فرید نے اس کے سوال کا جواب نہیں دیا اور اس کا کندھا تھپتھپاتے ہوئے بولا۔ ''مرد بنو یار...... مرد! جب اوکھلی میں سر دے دیا تو پھر موسلوں سے کیسا ڈرنا؟''

''دیکھتے ہیں...... اللہ مالک ہے۔'' کامران نے بوجھل لہجے میں کہا۔ ''جو نصیب میں لکھا ہوگا، وہ تو ہو کر ہی رہے گا۔''

کامران نے معاملہ نصیب پر چھوڑ دیا تھا مگر نصیب نے یاوری نہیں کی اور اگلے ہی روز کریم بخش نے اس سے بینک کا حساب مانگ لیا۔ اس نے کامران کو بتایا کہ وہ ایک اور فیکٹری لگانے کا فیصلہ کر چکا تھا اور بینک بیلنس کا اندازہ لگانا چاہتا تھا۔

''کامران! آج چھٹی سے پہلے تم بینک کے تمام معاملات لے کر میرے کمرے میں آجانا۔'' سیٹھ کریم نے اس سے کہا۔ ''مجھے کل ایک پارٹی کو کافی ہیوی پیمنٹ کرنا ہے۔''

''کریم صاحب! کتنی ہیوی پیمنٹ کرنا ہے؟'' کامران نے ڈرتے ڈرتے پوچھ لیا۔

''میرا خیال ہے، موجودہ بینک بیلنس تو سارا جائے گا۔'' کریم بخش نے بتایا۔ ''اس کے علاوہ بھی کچھ رقم ملانا پڑے گی۔''

''اوہ......'' بے ساختہ کامران کے منہ سے نکلا۔

کریم بخش نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ ''کیا کوئی پرابلم ہے تمہارے ساتھ؟''

''نن...... نہیں جناب۔'' وہ جلدی سے سنبھلتے ہوئے بولا۔ ''کوئی پرابلم نہیں ہے۔''

''ٹھیک ہے۔'' کریم بخش نے سرسری انداز میں کہا۔ ''میں آج دیر تک آفس میں بیٹھوں گا۔ تم گھر جانے سے پہلے ساری چیک بکس اور دیگر ضروری کاغذات لے کر میرے پاس آجانا۔''

''ٹھیک ہے باس۔'' کامران نے مریل سی آواز میں کہا اور کریم بخش کے کمرے سے نکل آیا۔

جب وہ اپنی سیٹ پر پہنچا تو اس کا برا حال تھا۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کے بدن سے جان نکل گئی ہو۔ اگر کریم بخش چیک بکس دیکھتا تو چند روز پہلے نکالے گئے پانچ لاکھ اس کی نگاہ سے چھپ نہیں سکتے تھے۔ وہ اس اماؤنٹ کے بارے میں ضرور سوال کرتا اور...... کامران کے پاس اس کے سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔

اس روز فرید خان نے بھی فیکٹری کا چکر نہیں لگایا تھا۔
کامران کی آخری آس اور امید فرید ہی تھا۔ دوپہر کے بعد جب فرید خان کی شکل نظر آئی تو کامران نے سکون کی سانس لی پھر پہلی فرصت میں اسے صورتِ حال سے آگاہ کر دیا۔

اس کی بات سن کر فرید خان ایک لمحے کے لیے الجھن کا شکار دکھائی دیا مگر اگلے ہی لمحے اس نے تسلی بھرے لہجے میں کہا۔

''فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں کوشش کروں گا کہ تمہاری چھٹی سے پہلے اس مسئلے کا کوئی حل نکل آئے۔'' پھر ایک لمحے کو رک کر اس نے سوال کیا۔ ''تم کتنے بجے تک انکل کے کمرے میں جاؤ گے؟''

''چھ بجے کے بعد ہی جاؤں گا۔'' اس نے بتایا۔

''بس تو پھر ٹھیک ہے۔'' فرید خان نے مطمئن انداز میں گردن ہلائی۔ ''پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں کچھ کرتا ہوں۔''

فرید خان نے بڑے اعتماد کے ساتھ اسے تسلی تو دی تھی تاہم اس کا دل مطمئن نہیں تھا۔ وہ دل ہی دل میں دعائیں مانگنے لگا کہ اگر آج وہ اس مصیبت سے نکل آیا تو پھر زندگی بھر کبھی فراڈ کے بارے میں نہیں سوچے گا۔

چھ بجے سے کچھ پہلے ہی کریم بخش نے اسے اپنے کمرے میں بلالیا۔ کامران تمام چیک بکس اور دیگر ضروری کاغذات لے کر اپنے باس کے پاس پہنچ گیا۔ ان میں وہ چیک بک بھی شامل تھی جس میں سے دس بارہ دن پہلے پانچ لاکھ کا ایک چیک کیش کرایا گیا تھا۔ یہ وہی رقم تھی جو کامران نے ثمرین کو دی تھی۔ ان لمحات میں کامران کا دل بلیوں اچھل رہا تھا۔ کسی لمحے کچھ بھی ہوسکتا تھا۔

کریم بخش چند لمحوں تک مختلف کاغذات کے ساتھ مصروف رہا پھر چیک بکس کا بغور جائزہ لینے لگا۔ بالآخر اس کے ہاتھ اس چیک بک پر رک گئے جس میں سے ایک چیک کے ذریعے کامران نے بینک میں سے پانچ لاکھ کی رقم نکالی تھی۔ یہ دیکھ کر کامران کے ہاتھوں اور پاؤں سے جیسے جان ہی نکل گئی۔ اسے یقین ہوگیا کہ کریم بخش نے اس کی چوری پکڑلی ہے اور بس، اب اس کی شامت آنے ہی والی ہے۔

ان کٹھن لمحات میں وہ خود کو کوس رہا تھا کہ اس نے لالچ میں آکر فرید خان کی بات کیوں مانی تھی۔

اس کے خدشات کے برعکس جب کریم بخش نے مذکورہ چیک بک کو ایک طرف رکھ کر بڑے میٹھے انداز میں گفتگو کا آغاز کیا تو کامران کو اپنی سماعت پر یقین نہیں آیا۔

''کامران! میری معلومات کے مطابق، تم شادی شدہ ہو اور تمہارا ایک بیٹا بھی ہے۔'' کریم بخش نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

''جج...... جی......'' وہ تھوک نگلتے ہوئے بولا۔

''آپ کی معلومات بالکل درست ہیں۔''

''کیا تمہارا اپنی بیوی کے ساتھ جھگڑا وغیرہ چل رہا ہے؟'' کریم بخش نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں جناب! ایسی تو کوئی بات نہیں۔'' کامران جلدی سے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''مہرالنسا تو بہت اچھی ہے۔ میرا بہت خیال رکھتی ہے۔''

''جب تمہاری بیوی بہت اچھی ہے تو پھر تم پرائی عورتوں کے ساتھ وقت کیوں گزار رہے ہو؟'' کریم بخش کے لہجے میں ہلکی سی سرزنش پوشیدہ تھی۔

''جناب...... میں نے تو ایسا کچھ نہیں کیا......'' وہ گھبرائے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''آپ کو یہ بات کس نے بتائی ہے؟''

''اس قسم کے اہم معاملات کی تہ تک رسائی حاصل کرنے کے لیے میرے اپنے مخصوص ذرائع ہیں۔'' کریم بخش نے گمبھیر لہجے میں کہا۔ ''ہاں یا نہ میں جواب دو...... تم اپنی بیوی سے بے وفائی کے مرتکب ہوئے ہو یا نہیں؟''

کامران نے متذبذب نظر سے اپنے باس کی طرف دیکھا لیکن منہ سے کچھ نہیں بولا۔ کریم بخش اس کی مشکل آسان کرتے ہوئے بولا۔

''اس خاتون کا نام ثمرین ہے اور تم لوگ آج کل چھپ چھپ کر مختلف ہوٹلز کے ریسٹورنٹس میں ملاقاتیں کر رہے ہو...... کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟''

کامران فوری طور پر یہی سمجھا کہ شاید کریم بخش نے اسے ثمرین کے ساتھ کسی ریسٹورنٹ میں بیٹھے دیکھ لیا ہے اور یہ سمجھا ہے کہ وہ ثمرین سے شادی کرنے والا ہے۔

''جناب! آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' وہ اطمینان بھری سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ ''لیکن ایسا کچھ نہیں ہے جیسا آپ سمجھ رہے ہیں۔''

''میں کیسا سمجھ رہا ہوں؟'' کریم بخش نے کریدنے والے انداز میں استفسار کیا۔

''شاید...... آپ سمجھ رہے ہیں کہ میں ثمرین سے شادی کرنے والا ہوں یا...... اس کے ساتھ میرے کوئی غلط نوعیت کے تعلقات ہیں۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''یہ ٹھیک ہے کہ میں نے ثمرین کے ساتھ دو تین ملاقاتیں کی

"ہاں...... بس، وہ مجھے اچھی لگتی ہے...... اتنی سی بات ہے۔"

"یہ اتنی سی بات نہیں ہے کامران!" کریم بخش کے لہجے میں سختی اتر آئی۔ "محض اچھا لگنے پر کوئی انسان اتنا خرچہ نہیں کرتا اور...... وہ بھی کسی دوسرے کے اکاؤنٹ سے......؟"

کامران کو یقین ہوگیا کہ کریم بخش کو پتا چل چکا ہے کہ اس نے "سگما ٹریڈرز" کے اکاؤنٹ میں سے پانچ لاکھ روپے نکال کر ثمرین کو دیے ہیں۔ اس کے اندر موجود "اچھے انسان" نے اسے مشورہ دیا کہ اسے سچ بولنا چاہیے۔ اپنے باس کو حقیقت سے آگاہ کردینا چاہیے۔ اس سے پہلے کہ وہ زبان کھولتا، کریم بخش کی برہمی بھری آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔

"کامران! میں نے تم پر اندھا اعتماد کیا اور تم نے میرے اعتماد کا خون کردیا؟"

"میں شرمندہ ہوں باس۔" کامران نے لجاجت آمیز لہجے میں کہا۔ "بس، مجھ سے غلطی ہوگئی۔"

"یہ غلطی نہیں...... کرائم ہے۔" کریم بخش نے اس چیک بک کو کامران کی آنکھوں کے سامنے لہراتے ہوئے غصیلے لہجے میں کہا۔ "سنگین جرم...... بتاؤ، تم نے ثمرین کو پانچ لاکھ کس مد میں دیے ہیں؟"

"ج...... جی...... میں بتاتا ہوں......" کامران نے لکنت زدہ انداز میں کہا۔

"جو بھی کہو، سو فیصد سچ کہنا۔" کریم بخش نے دھمکی آمیز لہجے میں کہا۔ "میں جھوٹ سننے کے موڈ میں بالکل نہیں ہوں۔ اگر مجھے تمہارے بیان میں جھوٹ کا شائبہ بھی محسوس ہوا تو میں ابھی تمہیں پولیس کے حوالے کردوں گا۔"

کامران نے اللہ کا نام لے کر اپنے ضمیر کا سارا بوجھ اتار پھینکا اور الف سے یے تک کا ماجرا کریم بخش کے گوش گزار کردیا۔ پوری بات سننے کے بعد کریم بخش نے پوچھا۔

"یہ کمبخت ثمرین تمہاری زندگی میں آ کیسے گئی......؟"

"جناب! آپ کے سالے صاحب نے مجھے ثمرین سے ملوایا تھا۔" کامران نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ "فرید صاحب نے مجھے بتایا تھا کہ ثمرین ان کی دوست ہیں اور اسٹاک ایکسچینج کے کام کو بہت اچھی طرح سمجھتی ہیں۔ انہوں نے مجھے اکسایا تھا کہ میں کمپنی کے اکاؤنٹس میں سے رقم نکال کر ثمرین کے پاس انویسٹ کروں اور ڈھیروں منافع کماؤں۔" لمحاتی توقف کرکے اس نے تھوک نگلا پھر اپنے خشک حلق کو تر کرنے کے بعد بولا۔

"مجھ سے غلطی ہوگئی جناب۔ میں فرید صاحب کی باتوں میں آ کر بہک گیا تھا۔"

کامران کے انکشاف پر سیٹھ کریم بخش کا چہرہ متغیر ہوگیا۔ اس نے کامران کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے ایک تیکھا سوال کیا۔

"تم فرید کا نام لے کر مجھے چکر دینے کی کوشش تو نہیں کررہے؟"

"نہیں جناب! میں بالکل سچ کہہ رہا ہوں۔" وہ گھگیایا۔

"یہ بات فرید کہہ ہی نہیں سکتا۔" کریم بخش نے زہریلے لہجے میں کہا۔ "وہ میرے اعتماد کا بندہ ہے اور اسی نے مجھے یہ رپورٹ دی تھی کہ تم کمپنی کے اکاؤنٹس میں سے رقم نکال کر کسی ثمرین نامی عورت پر لٹا رہے ہو۔"

"یہ نہیں ہوسکتا جناب۔" کامران نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "ثمرین کے پاس تو فرید صاحب کے بھی دس لاکھ روپے لگے ہوئے ہیں۔"

"بکواس نہیں کرو......" کریم بخش نے غصیلے لہجے میں کہا۔ "فرید اس وقت فیکٹری میں موجود ہے۔ میں ابھی اسے یہاں بلا کر دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ کرتا ہوں اور...... تمہیں پولیس کے حوالے کرتا ہوں۔"

ادھر کریم بخش کی بات ختم ہوئی، ادھر لائٹ چلی گئی۔ لائٹ جاتے ہی کمرے کے اندر گہری تاریکی چھا گئی۔ کامران نے محسوس کیا کہ کوئی شخص تیز قدموں سے چلتے ہوئے کمرے میں داخل ہوا تھا۔ اگلے ہی لمحے اس کے کانوں میں ایک گہری اور مدھم آواز آئی جیسے کسی فولادی شے سے کسی قدرے نرم چیز پر ضرب لگائی گئی ہو۔ اس کے فوراً بعد کسی بھاری چیز کے فرش پر گرنے کی مخصوص آواز ابھری اور واپس جاتے ہوئے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ اس صورت حال نے کامران کو بوکھلا کر رکھ دیا۔

"کون ہے......" اس نے اندھیرے میں چاروں جانب نگاہ دوڑاتے ہوئے سرسراتی آواز میں استفسار کیا۔ "کریم صاحب! آپ ٹھیک ہیں نا......؟"

گہری تاریکی میں کامران کے کسی سوال کا جواب نہیں ملا۔

وہ چشم زدن میں گھبرا کر کمرے سے باہر نکل آیا۔ فیکٹری والا پورا حصہ اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا لیکن اردگرد کے تمام ایریا میں لائٹس آن تھیں۔ اسی لمحے اس کے کان میں ایک مشین آپریٹر خالق کی آواز آئی۔

"کامران صاحب! لگتا ہے، صرف ہماری لائٹ گئی ہے۔ آس پاس تو سب جگہ روشنی نظر آرہی ہیں۔"

"ہاں، مجھے بھی یہی لگ رہا ہے۔" کامران نے تائیدی انداز میں کہا۔ "آؤ، ذرا سوئچ بورڈ کو دیکھتے ہیں۔ ہوسکتا ہے، ہمارا فیوز وغیرہ اڑ گیا ہو۔"

وہ دونوں چلتے ہوئے فیکٹری کے مین گیٹ تک آئے جہاں ایک دیوار پر بجلی کے میٹر اور سوئچ بورڈ نصب تھے۔ اسی لمحے خالق نے تیز آواز میں کہا۔

"کامران صاحب! مین سوئچ تو آف ہے......!"

"یہ کس نے آف کردیا؟" بے ساختہ کامران کے منہ سے نکلا۔

"مجھے کچھ پتا نہیں جناب۔" وہ سادگی سے بولا۔ "میں تو اندر مشین پر کام کررہا تھا کہ لائٹ چلی گئی اور میں جلدی سے باہر نکل آیا اور پھر آپ مجھے نظر آگئے......"

بات ختم کرتے ہی خالق نے مین سوئچ آن کردیا۔ اگلے ہی لمحے فیکٹری کی لائٹ بحال ہوگئی۔ کامران دوڑتے ہوئے قدموں کے ساتھ کریم بخش کے کمرے کی جانب بڑھا۔ مشین آپریٹر خالق بھی اس کے ساتھ تھا پھر جیسے ہی وہ کمرے کے اندر داخل ہوا، سناٹے میں آگیا۔

سیٹھ کریم اپنے ہی خون میں لت پت کمرے کے فرش پر اپنی کرسی کے قریب ہی پڑا تھا۔ اس کے نزدیک ہی ایک آہنی راڈ پڑی تھی۔ مذکورہ راڈ کی موٹائی ایک انچ اور لمبائی لگ بھگ ڈیڑھ فٹ تھی۔ کریم بخش کے سر پر اسی راڈ سے ضرب لگائی گئی تھی۔ اس کا سر پھٹ گیا تھا اور وہاں سے بہنے والا خون کمرے کے فرش پر پھیل رہا تھا۔

"صاحب کو کس نے قتل کردیا......" خالق نے گھبرائی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"مجھے نہیں معلوم۔" کامران ان لمحات میں بے پناہ الجھن کا شکار تھا۔ "کریم صاحب میرے ساتھ اچھے خاصے بیٹھے بات کررہے تھے کہ لائٹ چلی گئی۔ اس کے بعد کیا ہوا، میں کچھ نہیں جانتا۔"

خالق نے بے یقینی سے شک آمیز انداز میں کامران کی طرف دیکھا لیکن منہ سے کچھ نہیں بولا۔

اسی لمحے فرید خان بھی فیکٹری پہنچ گیا۔ جب صورت حال کا اسے پتا چلا تو اس نے فوراً فون کرکے پولیس کو بلالیا۔ پندرہ بیس منٹ میں پولیس موقع پر پہنچ گئی اور کامران کو سیٹھ کریم بخش کے قتل کے الزام میں گرفتار کرکے اپنے ساتھ لے گئی۔

☆☆☆

جیسا کہ آپ جانتے ہیں، اس کیس کو عدالت میں لگے دو ماہ سے زیادہ کا عرصہ ہو چکا تھا مگر ابھی تک کوئی قابلِ ذکر کارروائی نہیں ہوسکی تھی۔ عدالت کی جانب سے کامران کے لیے جس سرکاری وکیل کا بندوبست کیا گیا تھا، اس کی کارکردگی کا احوال آپ کو بتایا جاچکا ہے۔

استغاثہ کی جانب سے نصف درجن گواہوں کی فہرست عدالت میں پیش کی گئی تھی جن میں فرید خان، خالق اور دیگر افراد کے علاوہ دو آس پاس کے پڑوسیوں کے نام بھی شامل کرلیے گئے تھے۔ پولیس نے موقع کی کارروائی کرتے وقت انہیں بلاکر بیان لے لیا تھا۔

مشین آپریٹر اور فرید خان کا بیان سراسر میرے مؤکل کامران کے خلاف جاتا تھا۔ جہاں تک میں اس کیس کو سمجھ پایا تھا، کامران کو قتل کے اس مقدمے میں پھنسانے میں بالواسطہ یا بلاواسطہ فرید خان کا ہاتھ ہوسکتا تھا۔ جس روز ہمارے کیس کی پیشی تھی، میں نے عدالت کے کمرے میں وکیل استغاثہ کو ایک خوش پوش شخص کے ساتھ رازدارانہ انداز میں گفتگو کرتے دیکھا۔ بعدازاں مجھے پتا چلا کہ وہ مقتول کا سالا یا کوئی بھی رشتے دار فرید خان تھا۔

جج نے عدالتی کارروائی کا آغاز کیا۔ میں نے بے حد احترام سے کہا۔

"جنابِ عالی! جیسا کہ آپ کو معلوم ہے، اس کیس میں وکیلِ صفائی تبدیل ہوچکا ہے۔ میں نے ابھی دو ہفتے پہلے ہی اس کیس میں ہاتھ ڈالا ہے اور کیس فائل کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ملزم کی طرف سے پورے حقائق کو عدالت کے سامنے نہیں لایا گیا لہٰذا میری معزز عدالت سے استدعا ہے کہ اس کیس کے چھپے ہوئے پہلوؤں کو بھی سامنے لایا جائے تاکہ انصاف کے تقاضے پورے ہوسکیں۔"

جج نے ایک نگاہ کیس فائل پر ڈالی پھر مجھ سے پوچھا۔ "وکیل صاحب! یہ بات آپ محض تاریخ لینے کے لیے کہہ رہے ہیں یا آپ کے پاس کوئی ٹھوس دلیل بھی ہے؟"

"ایک نہیں، کئی دلیلیں ہیں میرے پاس، جناب عالی!" میں نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا۔

"عدالت سن رہی ہے......!" جج میری جانب متوجہ ہوتے ہوئے بولا۔

"جناب عالی! پہلی بات تو یہ کہ......" میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "میرے مؤکل پر کمپنی کے اکاؤنٹ سے جو پانچ لاکھ رقم خرد برد کرنے کا الزام ہے اس کے پس منظر کو توڑ موڑ کر استغاثہ میں شامل کیا گیا ہے تاکہ

میرا مؤکل اپنی صفائی پیش کرنے سے قاصر رہے۔ دوسری بات یہ کہ......'' میں نے لحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''عدالت کی جانب سے میرے مؤکل کو اس سے پہلے جو وکیل مہیا کیا گیا تھا، اس کے استغاثہ کے ایک گواہ کے ساتھ گہرے روابط ہیں لہٰذا مذکورہ وکیل نے ملزم کی وکالت کرنے کے بجائے اسے پھانسی کے پھندے تک پہنچانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ تیسری بات یہ کہ استغاثہ کے گواہوں میں بعض غیر ضروری افراد کو شامل کیا گیا ہے جبکہ ایک نہایت ہی اہم گواہ اور اس کیس میں کلیدی اہمیت کی حامل ثمرین کو نہ صرف نظر انداز کر دیا گیا ہے بلکہ پورے استغاثہ میں اس پراسرار عورت کا کہیں ذکر تک نہیں۔ علاوہ ازیں......'' میں ایک مرتبہ پھر رکا، ایک مطمئن سانس خارج کی پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''استغاثہ کے بعض گواہوں کا رویہ غیر منطقی اور ردعمل غیر فطری ہے۔ مجھے یقین ہے کہ جب میں ان پر جرح کروں گا تو ان کے جھوٹ کا پول کھل جائے گا اور میں یہ ثابت کرنے میں کامیاب ہو جاؤں گا کہ میرے مؤکل کو قتل کے اس کیس میں پھنسانے کے لیے ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت گہری سازش کی گئی ہے۔''

جج نے میری بات توجہ سے سنی اور پوچھا۔ ''سابق وکیل کے استغاثہ کے کس گواہ کے ساتھ گہرے روابط ہیں؟''

''جناب عالی! میرا اشارہ استغاثہ کے سب سے اہم گواہ اور مقتول کے نام نہاد سالے فرید خان کی جانب ہے۔'' بات کے اختتام پر میں نے باہر کی جانب اشارہ بھی کر دیا۔ ''فرید خان اس وقت عدالت سے باہر کوریڈور میں موجود ہے۔ میں نے خود اپنی آنکھوں سے تھوڑی دیر پہلے فرید خان اور وکیل استغاثہ کو رازداری سے باتیں کرتے دیکھا تھا۔''

''آپ کیا کہتے ہیں اس بارے میں؟'' جج نے وکیل استغاثہ سے استفسار کیا۔

''جناب عالی! وکیلِ صفائی کا بیان مہمل اور لایعنی معلوم ہوتا ہے۔ میرے فاضل دوست اس کیس کو الجھانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔''

''میں کیس کو الجھانے کی نہیں بلکہ سلجھانے کی کوشش کر رہا ہوں۔'' میں نے وکیل استغاثہ کے ریمارکس کے جواب میں ترکی بہ ترکی کہا پھر روئے سخن جج کی جانب موڑتے ہوئے ان الفاظ میں اضافہ کیا۔

''جناب عالی! اس مرحلے پر میں ان معاملات کی تفصیل بہ وجوہ بیان نہیں کرنا چاہتا جن کی طرف تھوڑی دیر پہلے میں نے اشارہ کیا ہے کیونکہ قبل از وقت یہ انکشافات استغاثہ کے گواہوں کے بیانات کو متاثر کر سکتے ہیں۔ آئندہ پیشی پر میں دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ کر کے دکھا دوں گا۔ فی الحال معزز عدالت سے میری درخواست ہے کہ ملزم کامران کی درخواستِ ضمانت کو منظور کیا جائے تاکہ وہ اپنی فیملی میں جا کر زندگی گزار سکے۔ وہ اس معاشرے کا ایک معزز شہری ہے۔ اس کیس کی وجہ سے اس کی ساکھ کو بہت نقصان پہنچ رہا ہے۔ میں آئندہ پیشی پر ملزم کا دوبارہ بیان لینے کی بھی استدعا کرتا ہوں جب تک مجھے بہت سے حقائق پر سے پردہ اٹھانے کا موقع مل جائے گا۔ دیٹس آل یور آنر......!''

جج نے کامران کی ضمانت کو مسترد کرتے ہوئے پندرہ دن بعد کی تاریخ دے دی۔ قتل کے ملزم کی ضمانت ناممکن کی حد تک مشکل ہوتی ہے لہٰذا میں اپنی کارکردگی سے مطمئن تھا۔

میں عدالت کے کمرے سے باہر نکلا تو مہرالنسا پر میری نگاہ پڑی اور میں چونک اٹھا۔ وہ آج کی کارروائی شروع ہونے تک عدالت نہیں پہنچی تھی ورنہ وہ بھی عدالت کے کمرے کے اندر موجود ہوتی۔ مہرالنسا کو عدالت سے باہر دیکھنا میرے لیے تعجب کی بات نہیں تھی۔ میرے چونکنے کا سبب یہ تھا کہ وہ اس خوش پوش شخص کے ساتھ محوِ گفتگو تھی جس کے بارے میں مجھے پتا چلا تھا کہ وہ فرید خان تھا...... مقتول کریم بخش کا نام نہاد سالا...... یعنی مقتول کی بیوی کا کزن!

میں جب ان دونوں کے پاس پہنچا تو وہ بات چیت کو موقوف کر کے میرے جانب متوجہ ہو گئے۔ میں نے سرسری انداز میں فرید خان کی طرف دیکھا پھر مہرالنسا سے کہا۔

''آپ یہاں سے فارغ ہونے کے بعد میرے پاس دفتر آ جائیں۔ آپ سے چند ضروری باتیں کرنا ہیں۔''

میں نے بادی النظر میں یہی تاثر دیا تھا کہ فرید خان میرے لیے ایک اجنبی شخص ہے حالانکہ آج عدالت میں، جج کے سامنے میں اس کا واضح ذکر کر چکا تھا لیکن وہ چونکہ اس وقت عدالت میں موجود نہیں تھا اس لیے وہ میری ''کارروائی'' سے آگاہ نہیں تھا۔ وکیل استغاثہ یقیناً اسے میرے بارے میں بتاتا لیکن یہ سب بعد کی باتیں تھیں۔

مہرالنسا نے میری بات کے جواب میں سر کو اثباتی جنبش دی پھر بولی۔ ''جی ضرور...... میں تھوڑی دیر میں حاضر ہوتی ہوں۔''

میں آگے بڑھنے لگا تو فرید خان خوش اخلاقی سے بولا۔ ”وکیل صاحب! مجھے ابھی کامران کی وائف نے بتایا ہے کہ اب اس کیس میں وکیل صفائی آپ ہوں گے؟“

”آپ کو بالکل صحیح بتایا گیا ہے۔“ میں نے گہری سنجیدگی سے جواب دیا پھر اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”آپ کون؟“

”میرا نام فرید خان ہے۔“ وہ مصافحے کے لیے اپنا ہاتھ آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ ”میں کامران کا خیر خواہ ہوں۔“

فرید خان انتہائی مکار اور چال باز شخص تھا۔ اس نے اپنا تعارف کراتے ہوئے مقتول کریم بخش سے رشتے داری کا حوالہ نہیں دیا تھا۔ میں نے بھی یہی تاثر دیا جیسے اس کی عیاری سے واقف نہیں ہوں۔

میں نے اس سے مصافحہ کرنے کے بعد کہا۔ ”آپ سے مل کر خوشی ہوئی۔“

”وکیل صاحب! میں آپ سے تنہائی میں چند باتیں کرنا چاہتا ہوں۔“ وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”اگر آپ مجھے تھوڑا سا وقت دے سکیں تو......“

”سوری......“ میں نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ”آپ کسی وقت میرے دفتر تشریف لے آئیں۔ یہاں بات کرنا مناسب نہیں۔“

”او کے......او کے......“ وہ جلدی سے بولا۔

میں اپنی گاڑی کی جانب بڑھ گیا۔ فرید خان جس رازداری کے ساتھ مہر النسا سے باتیں کر رہا تھا، اس سے مجھے یہ اندازہ لگانے میں کوئی دقت محسوس نہیں ہوئی کہ وہ مہر النسا کے ساتھ چپک کر میرے آفس تک چلا آئے گا اور میں چاہتا بھی یہی تھا کیونکہ وکیل استغاثہ کی زبانی جب اسے میرے عزائم کی خبر ہوتی تو پھر اس سے کسی دوسرے انداز میں بات ہو سکتی تھی۔

میں نے آفس پہنچ کر اپنی سیکریٹری کو ہدایت کردی کہ مہر النسا جس شخص کے ساتھ آئے، وہ اسے ویٹنگ روم میں روک کر پہلے صرف مہر النسا کو میرے پاس بھیجے۔ بعدازاں جب میں کہوں، تب وہ اس شخص کو اندر آنے کی اجازت دے۔ سیکریٹری نے میری ہدایت پر عمل کرنے کا یقین دلایا اور میں اپنے چیمبر میں داخل ہو گیا۔

سب سے پہلے میں نے وہاب عثمانی کو فون کیا۔ رسمی علیک سلیک کے بعد میں نے انہیں آج کی عدالتی کارروائی کے بارے میں بتایا۔ ”آپ نے مجھے جس مصیبت زدہ عورت کے لیے وکیل مقرر کیا ہے، ابھی اس کیس کی پہلی پیشی بھگت کر آرہا ہوں۔“

”بیگ صاحب! ایک نیک کام کیا ہے آپ نے۔ اللہ آپ کو اس کا اجر دے گا۔“

”اللہ مجھے ضرور اجر دے گا۔“ میرے لہجے میں وثوق کی قوت جھلکتی تھی۔ ”مگر میں اس اجر میں آپ کو بھی حصے دار بنانا چاہتا ہوں۔“

”میں سمجھا نہیں بیگ صاحب۔“ ان کی الجھن زدہ آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ ”آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟“

”آپ نے سلیم اقبال کی مدد سے میری فیس اور اس کیس کے اخراجات کا تو مناسب انتظام کردیا ہے۔“ میں نے اپنی بات کی وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ”اب مجھے بھی آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔“

”کس قسم کی مدد؟“ عثمانی صاحب نے پوچھا۔

”اس کیس کو منطقی انجام تک پہنچانے کے لیے دو کرداروں کو رگڑا دینا بہت ضروری ہے۔“ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”ان دونوں کرداروں کا آپس میں گہرا تعلق ہے اور میرے اندازے کے مطابق انہی لوگوں کی گہری سازش کے نتیجے میں کامران پر قتل کا الزام آیا ہے۔ ان میں سے ایک کردار منظر پر طلوع ہے اور دوسرا غروب ہو چکا ہے۔“

”ان کرداروں کے کیا نام ہیں؟“ میری بات مکمل ہونے سے پہلے ہی عثمانی صاحب نے پوچھ لیا۔

”ایک کا نام فرید خان اور دوسری کا نام ثمرین ہے۔“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا پھر نہایت ہی مختصر الفاظ میں انہیں فرید خان اور ثمرین کی ہسٹری بتادی۔

”ان میں سے کون طلوع ہے اور کون غروب؟“ میری بات مکمل ہونے پر عثمانی صاحب نے سوال کیا۔

”فرید خان اس کیس میں استغاثہ کے گواہ کی حیثیت رکھتا ہے۔“ میں نے بتایا۔ ”جبکہ ثمرین کافی دنوں سے غائب ہے۔ اگر مجھے ثمرین کے بارے میں معلومات حاصل ہو جائیں تو میں فرید خان کو گھیرے میں لے کر اس کیس کا پانسا پلٹ سکتا ہوں۔“

”آپ آج رات میں مجھے فون کریں اور مذکورہ کردار کے بارے میں تفصیلات سے آگاہ کریں۔“ عثمانی صاحب نے تعاون آمیز لہجے میں کہا۔ ”اگر وہ زندہ ہوئی تو میں اسے چند ہی روز میں کھوج نکالوں گا۔“

”او کے عثمانی صاحب! تو پھر رات میں تفصیلی بات

ہوتی ہے۔"

اختتامی کلمات کے بعد، ہمارے بیچ جاری اس ٹیلی فونک گفتگو کا سلسلہ موقوف ہوگیا۔

وہاب عثمانی جیسا کہ میں نے شروع میں بتایا، ایک سماجی تنظیم کے روحِ رواں تھے اور ان کا سوشل سرکل بہت وسیع تھا۔ مجھے امید تھی کہ وہ بہت جلد ثمرین کا سراغ لگانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ کامران ایک فراڈ کے نتیجے میں جیل کی سلاخوں کے پیچھے پہنچا تھا اور اس مالیاتی فراڈ کی اصل ذمے دار بھی ثمرین تھی۔ اگر وہ ہتھے چڑھ جاتی تو پھر دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ کرنے میں آسانی ہو جاتی۔

☆☆☆

میں اپنے کلائنٹس کے ساتھ مصروف تھا کہ میری سیکریٹری نے ان دونوں کی آمد کی اطلاع دی۔ میں نے سیکریٹری کی یاد کو تازہ کرنے کے لیے اشارتاً کہا۔ "ون بائی ون!"

"اوکے سر!" وہ مضبوط لہجے میں بولی۔

پچیس منٹ کے بعد مہر النسا میرے سامنے بیٹھی تھی۔ وہ خاصی پریشان دکھائی دیتی تھی۔ رسمی علیک سلیک کے بعد میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

"فرید خان آپ سے کیا کہہ رہا تھا؟"

"سچ بتاؤں!" وہ عجیب سے لہجے میں بولی۔

"اگر ڈاکٹر یا وکیل سے فیض یاب ہونا ہو تو ہمیشہ سچ بولنا چاہیے۔" میں نے بہ دستور اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

"فرید خان کا خیال ہے کہ آپ کامران کے کیس کو خراب کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔" وہ بے چارگی سے بولی۔

"اور آپ کا اپنا کیا خیال ہے؟" میں نے تیز لہجے میں استفسار کیا۔

"میں سخت پریشان ہوں۔" وہ بے بسی کے عالم میں بولی۔ "میری کچھ سمجھ میں نہیں آرہا کہ کس کی بات پر بھروسا کروں۔ اس نے مجھے دوسرا وکیل کرنے کا مشورہ دیا ہے۔"

"ہوں......" میں نے پُرسوچ لہجے میں کہا۔ "پھر آپ کا کیا ارادہ ہے؟"

مہر النسا نے فرید خان کے حوالے سے جو کچھ ابھی مجھے بتایا اس سے تو یہی ظاہر ہوتا تھا کہ فرید خان اس کیس میں میری اہمیت کے حوالے سے کافی وسیع معلومات رکھتا تھا، گویا وکیل استغاثہ نے یا سابق وکیل صفائی نے اسے میرے بارے میں اچھی طرح بریف کر دیا تھا ورنہ وہ مہر النسا کو وکیل تبدیل کرنے کا مشورہ نہ دیتا۔

وہ بے بسی سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ "میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آرہا، کیا کروں۔ میرا ذہن بری طرح الجھا ہوا ہے۔"

"کیا آپ اس شخص کو اچھی طرح جانتی ہیں جس کا نام فرید خان ہے؟" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

"کچھ زیادہ نہیں۔" وہ کمزور سی آواز میں بولی۔ "یہ خود کو کامران کا دوست کہتا ہے۔"

"بکواس کرتا ہے۔" میں نے زہرخند لہجے میں کہا۔ "یہ کامران کا سب سے بڑا دشمن ہے اور اسی کی تیار کی ہوئی سازش کی وجہ سے آپ کا شوہر اس مصیبت میں پھنسا ہے۔ ٹھہریں، میں آپ کو اس کی اصلیت دکھاتا ہوں۔ آپ ذرا ادھر جا کر بیٹھیں......"

میں نے اپنی سیٹ سے اٹھ کر مہر النسا کو ساتھ لیا اور اپنے چیمبر کے برابر والے کمرے میں بٹھا کر دروازہ نوے فیصد بھیڑ دیا پھر انٹرکام پر اپنی سیکریٹری سے کہا کہ وہ فرید خان کو اندر بھیج دے۔

میں نے مہر النسا کو جس کمرے میں بٹھایا تھا، میرے چیمبر میں ہونے والی تمام تر گفتگو وہاں سنی جا سکتی تھی۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد فرید خان میرے سامنے بیٹھا تھا۔ رسمی علیک سلیک کے بعد اس نے متلاشی نگاہ کمرے میں دوڑائی پھر مجھ سے پوچھا۔

"کامران کی بیوی کہاں چلی گئی؟"

"آپ غالباً مہر النسا کے بارے میں پوچھ رہے ہیں؟"

"جی...... بالکل۔" وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "ہم دونوں ایک ساتھ ہی یہاں آئے تھے۔ میں تو سمجھا تھا، وہ آپ کے کمرے میں موجود ہوگی......" بات ختم کرتے ہی اس نے ادھر ادھر نگاہ دوڑائی۔

"اچھا......!" میں نے مصنوعی حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ "مہر النسا نے تو آپ کی آمد کا ذکر نہیں کیا۔ اینی ہاؤ...... وہ پندرہ منٹ پہلے یہاں سے جا چکی ہیں۔"

"اوہ......" اس نے بے یقینی سے میری طرف دیکھا۔ "مگر میں تو ادھر انتظار گاہ ہی میں بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے تو اسے جاتے ہوئے نہیں دیکھا۔"

"آپ کی نگاہ چوک گئی ہوگی۔" میں نے سرسری انداز میں کہا پھر پوچھا۔ "فرمائیے، میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟"

"خدمت کے بارے میں، میں آپ کو بعد میں بتاؤں گا۔" وہ رازدارانہ انداز میں بولا۔ "پہلے میں اپنا تعارف کرادوں۔"

میں سب کچھ جانتے بوجھتے ہوئے بھی سوالیہ نظر سے اسے تکنے لگا جیسے وہ کوئی بہت ہی اہم انکشاف کرنے والا ہو۔ جب وہ اپنا تعارف مکمل کرچکا تو میں نے تشویش بھرے لہجے میں کہا۔

"فرید صاحب! آپ تو استغاثہ کے گواہ ہیں اور آپ کا بیان کامران کو پھانسی کے پھندے تک لے جاسکتا ہے پھر آپ مہرالنسا کے ساتھ......؟"

میں نے دانستہ سوالیہ انداز میں جملہ ادھورا چھوڑا تو وہ ایک آنکھ دبا کر پراسرار انداز میں بولا۔

"بیگ صاحب! میں یہی بات تو آپ کو سمجھانے آیا ہوں کہ اس کیس میں کوئی جان نہیں ہے۔ آپ خوامخواہ اپنا قیمتی وقت برباد کریں گے۔ آپ اس کیس سے الگ ہی ہوجائیں تو اچھا ہے۔"

چند روز قبل یہی بات سابق وکیل صفائی نے بھی مجھے سمجھانے کی کوشش کی تھی لیکن میں نے اس کی تھیوری پر دھیان نہیں دیا تھا۔

میں نے اسے گھیرنے کے ارادے سے پوچھ لیا۔ "فرید صاحب! آپ کی تجویز پر غور کیا جاسکتا ہے لیکن اس میں میرا کیا فائدہ ہوگا؟"

"اگر آپ اس کیس سے الگ ہوجائیں تو میں آپ کی ہر خدمت کے لیے تیار ہوں۔" اس نے کہا۔ "کامران کے بچنے کا کوئی امکان نہیں ہے۔ آپ خوامخواہ مجھے بھی اس کیس میں لپیٹنے کی کوشش کررہے ہیں۔"

"آپ نے جس خدمت کا ذکر کیا ہے اس کی وضاحت کریں۔" میں نے بظاہر اس کے منصوبے میں دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

"میری آفر تیس ہزار کی ہے۔" وہ میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔ "آپ اپنی ڈیمانڈ بتائیں؟"

"لیکن اس طرح تو میرا موکل مارا جائے گا۔" میں نے تامل کرتے ہوئے کہا۔ "اگر میں نے کیس چھوڑ دیا تو اس بے چارے کو سزائے موت ہوجائے گی۔"

"بیگ صاحب! لوگ تو آئے دن پھانسی چڑھتے ہی رہتے ہیں۔" وہ سفاکی سے بولا۔ "آپ کامران کی فکر چھوڑیں، اپنی ڈیمانڈ بتائیں؟"

"مجھے سوچنے کی مہلت دیں۔" میں نے نیم رضامند ہوتے ہوئے کہا۔

"مثلاً......" اس نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا۔

"آپ کو کتنے دن کی مہلت چاہیے؟"

"تین چار دن کی۔" میں نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے۔" وہ اٹھ کر کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔

"میں ٹھیک چار دن کے بعد آپ سے رابطہ کروں گا اور مجھے امید ہے جب تک آپ کوئی سودمند فیصلہ کرچکے ہوں گے۔" لمحاتی توقف کرکے اس نے ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

"پیسوں کی آپ ٹینشن نہیں لیجیے گا۔ آپ جتنی بھی ڈیمانڈ کریں گے، میں آپ کو مایوس نہیں کروں گا۔"

"اوکے......!" میں نے اثبات میں سرہلادیا۔

وہ رخصت ہوا اور جب میری سیکریٹری نے بتایا کہ وہ دفتر سے نکل چکا ہے تو میں نے مہرالنسا کو دوبارہ اپنے چیمبر میں بلالیا۔ وہ بے حد پریشان نظر آتی تھی۔ اس نے بیٹھتے ہی مجھ سے سوال کیا۔

"اگر عدالتوں کے اندر اور باہر اس نوعیت کی سودے بازیاں چلتی ہیں تو پھر غریب آدمی کو انصاف کیسے ملتا ہوگا؟" وہ لمحے بھر کو رکی پھر منت ریز لہجے میں بولی۔ "مجھے امید ہے، آپ فرید خان کی آفر کو قبول نہیں کریں گے۔"

"اگر مجھے دولت کا لالچ ہوتا تو فرید خان کی گفتگو آپ کو ہرگز نہیں سناتا۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "میں نے تو آپ کو فرید خان کا اصلی چہرہ دکھادیا ہے۔ آپ کو ہر لمحے اس شخص سے محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ یہ بندہ اپنی گردن بچا کر کامران کو پھانسی کے پھندے تک پہنچانے کی کوشش میں لگا ہوا ہے۔"

"خدا غارت کرے اس قسم کے لوگوں کو......" وہ نفرت آمیز لہجے میں بولی۔

میں نے اسے ضروری ہدایات دینے کے بعد رخصت کردیا۔

چار روز کے بعد فرید خان نے مجھ سے دوبارہ ملنے کی کوشش کی لیکن میں نے اسے اپنے دفتر بلانے کے بجائے ٹیلی فون پر ہی واضح الفاظ میں کہہ دیا۔ "سوری خان صاحب! میں آپ کی کوئی بھی آفر قبول نہیں کرسکتا۔"

وہ مجھے راضی کرنے کی بہت کوشش کرتا رہا لیکن جب میں نے اس کی ایک نہیں سنی تو جھلا کر اس نے فون بند کردیا۔

آئندہ پیشی سے ایک ہفتہ پہلے وہاب عثمانی صاحب

نے ثمرین کے حوالے سے میری مطلوبہ تمام معلومات مجھے فراہم کردیں۔ اب میں پوری طرح مطمئن تھا۔

☆☆☆

آئندہ پیشی پر میں نے ملزم کامران کا اضافی بیان عدالت میں داخل کردیا جس میں ثمرین کی مکمل کہانی شامل تھی جس کے مطابق ثمرین اور فرید خان نے کس طرح ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت میرے مؤکل کو اس کیس میں پھنسایا تھا۔ اس سے پہلے فرید خان کے ایما اور خواہش پر کامران نے اپنے بیان میں سے ثمرین کا ذکر بالکل گول کردیا تھا۔ فرید خان کے اس اقدام سے بھی سازش کی بو آتی تھی۔

وکیل استغاثہ نے اضافی بیان کی ایک کاپی جج سے لی اور اس کے صفحات الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔ یہ بیان کئی صفحات پر مشتمل تھا۔ جج نے وکیل استغاثہ کی مشکل آسان کرتے ہوئے اس بیان کا خلاصہ پڑھ کر سنا دیا اور اپنی بات کے اختتام پر کہا۔

''وکیل صاحب! ان اہم حقائق کو پہلے عدالت کے سامنے پیش کیوں نہیں کیا گیا؟''

''جناب عالی!'' وکیل استغاثہ نے جھنجلاہٹ بھرے لہجے میں کہا۔ ''ان واقعات کا زیر سماعت کیس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ میرے فاضل دوست ثمرین نامی کسی لڑکی کا کردار تخلیق کر کے خوانخواہ عدالتی معاملات کو الجھانے کی کوشش کررہے ہیں۔''

''یور آنر! ثمرین کوئی فرضی کردار نہیں ہے۔'' میں نے بڑے اعتماد سے کہا۔ ''بلکہ یہ خاتون اس کیس میں کلیدی حیثیت کی حامل ہے جسے استغاثہ نے منظر سے ہٹا کر کیس کا حلیہ بگاڑ دیا ہے۔''

''جناب عالی! اس عدالت میں کریم بخش مرڈر کیس کی سماعت ہورہی ہے۔'' وکیل استغاثہ نے اکھڑے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اور اس سلسلے میں ملزم کامران اس وقت عدالت میں موجود ہے۔ ملزم نے کمپنی کے حسابات میں پانچ لاکھ روپے کے خرد برد کو تسلیم کیا ہے۔ اسی ایشو پر جب مقتول نے باز پرس کے لیے ملزم کو اپنے کمرے میں بلایا تو ملزم نے اپنے باس کا کام تمام کردیا۔ دیٹس از آل اسٹوری یور آنر......!''

''ایک ذاتی سا سوال پوچھنا چاہوں گا میرے فاضل دوست۔'' میں نے روئے سخن وکیل استغاثہ کی جانب موڑتے ہوئے کہا۔ ''اگر آپ کی طبع نازک کو ناگوار نہ گزرے تو......؟''

وہ برہمی سے بولا۔ ''کیا پوچھیں...... آپ کیا پوچھنا چاہتے ہیں؟''

''جس وقت...... وقوعہ کی شام...... مقتول اور ملزم...... آپس میں بات چیت کررہے تھے......'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا آپ بھی اس کمرے میں موجود تھے؟''

''نن نہیں......'' وہ گڑبڑا کر بولا۔ ''میں وہاں کیوں موجود ہونے لگا...... میرا وہاں کیا کام......؟''

''آپ کی وہاں موجودگی کا سبب یا آپ کا وہاں کیا کام...... کے بارے میں تو میں کچھ نہیں جانتا لیکن......'' میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ کر توقف کیا پھر کہا۔

''لیکن آپ کے وثوق کو دیکھ کر تو یہی لگتا ہے کہ آپ جائے وقوعہ پر مقتول اور ملزم کے ساتھ موجود تھے۔''

''کون سا وثوق؟'' وہ حیرت بھرے لہجے میں بولا۔

''وہی وثوق...... جس کے بل بوتے پر آپ نے تھوڑی دیر پہلے یہ دعویٰ کیا ہے کہ جب مقتول نے ملزم سے پانچ لاکھ کے خرد برد کے حوالے سے پوچھ گچھ کی تو ملزم نے اسے قتل کردیا۔'' میں نے بدستور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''یہ بات اتنے اعتماد کے ساتھ تو وہی شخص کہہ سکتا ہے جو اس خطرناک واقعے کا عینی شاہد ہو۔ آئی مین تو سے...... آئی وٹنس!''

''آپ تو الفاظ پکڑ رہے ہیں۔'' وہ جھلاہٹ آمیز لہجے میں بولا۔

''اگر الفاظ کی ڈور پکڑ کر ہاتھ اصل مجرم کی گردن تک رسائی حاصل کرسکتے ہوں تو میرے خیال میں الفاظ کو پکڑنے میں کوئی حرج نہیں ہونا چاہیے۔'' میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''آپ اس بارے میں کیا کہتے ہیں میرے فاضل دوست؟''

''میں آپ کے ہر سوال کا جواب دینے کا پابند نہیں ہوں۔'' وہ خفگی آمیز لہجے میں بولا۔ ''ہاں، البتہ استغاثہ کے پاس ایسے گواہان موجود ہیں جن کے بیانات قتل کے محرکات اور قاتل کو بڑی آسانی سے بے نقاب کرتے ہیں۔''

''اوکے......'' میں نے سرسری انداز میں کہا۔ ''میں بھی سوالات آپ کے پیش کردہ اہم گواہان سے کرلوں گا۔''

اس کے بعد استغاثہ کے گواہوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ استغاثہ کی جانب سے کل چھ گواہوں کے ناموں کی فہرست داخلِ عدالت کی گئی تھی لیکن میں یہاں پر صرف اہم گواہوں کا ہی ذکر کروں گا یعنی مشین آپریٹر خالق اور مقتول کا سالا

فرید خان لیکن اس سے بھی پہلے انکوائری آفیسر، سب انسپکٹر وحید اللہ......!

''جناب عالی!'' میں نے جج کی طرف دیکھتے ہوئے معتدل انداز میں کہا۔ ''میں اس کیس کے تفتیشی افسر سے چند سوالات کرنا چاہتا ہوں۔''

کسی بھی کیس میں تفتیشی افسر کی حیثیت استغاثہ کے گواہ ایسی ہوتی ہے اور اسے ہر پیشی پر عدالت میں حاضر رہنا پڑتا ہے۔ جج کے اشارے پر انکوائری آفیسر وٹنس باکس میں آکر کھڑا ہوگیا۔ وہ ایک مستعد اور چاق و چوبند پولیس اہلکار تھا۔

''وحید اللہ صاحب!'' میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے شائستہ لہجے میں کہا۔ ''میں مختصر سی جرح میں آپ کو فارغ کردوں گا کیونکہ میں نہیں چاہتا کہ آپ تھک جائیں......!''

میرے معنی خیز آخری جملے کے جواب میں اس نے حیرت بھرے لہجے میں استفسار کیا۔ ''وکیل صاحب! آپ کو میری تھکن کا اس قدر احساس کیوں ہے؟''

''کیونکہ...... بہت جلد آپ کو اتنی زیادہ دوڑ دھوپ کرنا ہے کہ اگر آپ پہلے ہی تھکے ہوں گے تو پھر اصل مجرم آپ کی گرفت میں نہیں آئے گا۔'' میں نے لہجے کی معنی خیزی کو برقرار رکھتے ہوئے کہا۔ ''بہت جلد آپ کو اصل مجرم کے پیچھے دوڑ لگانا پڑے گی۔''

''دوڑ دھوپ...... اصل مجرم...... میں کچھ سمجھا نہیں؟'' اس کی حیرت دو چند ہوگئی۔

''وقت آنے پر سب سمجھ میں آجائے گا۔'' میں نے سرسری انداز میں کہا پھر پوچھا۔ ''کیا یہ درست ہے کہ اس افسوس ناک واقعے کی اطلاع آپ کو مقتول کی بیوی کے کزن اور استغاثہ کے گواہ فرید خان نے فون پر دی تھی؟''

''جی، یہ درست ہے۔'' اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ''لیکن اس وقت مجھے معلوم نہیں تھا کہ فرید خان کا مقتول سے کیا رشتہ ہے۔''

''آپ کی اس لاعلمی سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔'' میں نے عام سے لہجے میں کہا پھر جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے سوال کیا۔ ''آپ نے آلۂ قتل وغیرہ کا لیبارٹری ٹیسٹ تو کرایا ہوگا؟''

''جی بالکل یہ ٹیسٹ ہوا تھا۔'' اس نے سر کو اثباتی جنبش دی اور بتانے لگا۔ ''اس آہنی سلاخ کے ایک سرے پر جو خون اور اس خون کے ساتھ چپکے ہوئے جو بال ملے تھے، ان سے یہ ثابت ہوا کہ اسی سلاخ کی مدد سے ایک خطرناک ضرب لگا کر مقتول کریم بخش کو موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔''

''یہ تو آلۂ قتل کی تصدیق ہوئی نا۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''آپ سلاخ کے دوسرے سرے کے بارے میں بھی تو کچھ بتائیں نا......!''

''دوسرا سرا...... آپ کہنا کیا چاہ رہے ہیں؟''

''ویری سمپل۔'' میں نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔ ''سلاخ کا وہ سرا جو قاتل کے ہاتھ میں تھا جب اس آہنی سلاخ کی مدد سے مقتول کریم بخش کے سر کو نشانہ بنایا گیا......''

''ظاہر ہے، جب آہنی راڈ کے ایک سرے سے مقتول کے سر پر زوردار ضرب لگائی گئی تو اس راڈ کا دوسرا سرا قاتل کے ہاتھ کی گرفت ہی میں ہوگا نا......'' وہ الجھن آمیز

جھنجلاہٹ کے ساتھ بولا۔

"جی بالکل!" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "کیا آپ نے اس دوسرے سرے پر سے قاتل کی انگلیوں کے نشانات اٹھائے تھے اور...... کیا آپ نے ان نشانات کا ملزم کے فنگر پرنٹس سے موازنہ کیا تھا؟"

"جی...... یہ نکتہ میرے ذہن میں تھا۔" وہ پُراعتماد لہجے میں بولا۔ "لیکن آلۂ قتل کے دوسرے سرے پر کسی بھی شخص کے فنگر پرنٹس نہیں پائے گئے تھے لہٰذا ملزم کے فنگر پرنٹس سے اس کے موازنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا......" لحاتی توقف کرکے اس نے ایک گہری سانس لی پھر ان الفاظ میں اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

"لگتا ہے، قاتل نے مقتول کو موت کے گھاٹ اتارتے وقت اپنے ہاتھوں پر دستانے پہن رکھے تھے۔"

"کون قاتل......؟" میں نے تیز لہجے میں استفسار کیا۔

"م...... میرا اشارہ ملزم کامران کی طرف ہے۔" وہ جلدی سے سنبھلتے ہوئے بولا۔

"مجھے آئی او صاحب سے اور کچھ نہیں پوچھنا جناب عالی!" میں نے جج کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

اس کے بعد ماسکنگ ٹیپ بنانے والی مشین کے آپریٹر خالق کو گواہی کے لیے پیش کیا گیا۔ خالق نے سچ بولنے کا حلف اٹھانے کے بعد اپنا بیان ریکارڈ کرادیا پھر چند لمحات کے لیے وکیل استغاثہ اس سے مختلف سوالات پوچھتا رہا جن کا لب لباب یہ تھا کہ وقوعہ کے روز ان کے سیٹھ کریم بخش نے کامران کو اپنے کمرے میں بلایا اور خوب ڈانٹ ڈپٹ کی جس کے نتیجے میں کامران نے کریم بخش کو قتل کردیا۔ وغیرہ ہا......!

اپنی باری پر میں گواہوں والے کٹہرے کے قریب چلا گیا اور استغاثہ کے گواہ خالق کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اپنی جرح کا آغاز کیا۔

"خالق صاحب! آپ کو "سگما ٹریڈرز" میں کام کرتے ہوئے کتنا عرصہ ہوا ہے؟"

"آٹھ سال سے زیادہ ہوگئے ہیں۔" اس نے جواب دیا۔

"یعنی آپ ملزم کامران سے بھی زیادہ پرانے ملازم ہیں؟"

"جی بالکل۔" اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔

"اس کا مطلب ہے، آپ ملزم کو اچھی طرح جانتے ہیں۔" میں نے سوالات کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ "ملزم کی روز بروز ہونے والی ترقی اور مقتول کا اس پر اندھا اعتماد آپ سے چھپا نہیں ہوگا؟"

"جی، میں ان سارے معاملات سے اچھی طرح واقف ہوں۔" اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ "لیکن اس بات کا مجھے سخت افسوس ہے کہ آخر کار ملزم نے سیٹھ جی کو دھوکا دیا۔"

"سخت اور نرم افسوس کی طرف ہم بعد میں آئیں گے۔" میں نے سرسری انداز میں کہا پھر پوچھا۔ "کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ روزانہ ملزم سے آپ کا کتنی بار سامنا ہوجاتا تھا؟"

"کئی بار......" اس نے جواب دیا۔ "میں ٹھیک طرح سے تو نہیں بتا سکتا لیکن آٹھ دس مرتبہ تو سامنا ہو ہی جاتا تھا۔"

"کیا وقوعہ کے روز بھی آپ کا آٹھ دس مرتبہ ملزم سے سامنا ہوا تھا؟"

"جی یقیناً۔" وہ بڑے وثوق سے بولا۔ "کم ازکم پانچ مرتبہ تو ہوا ہی ہوگا۔"

"پانچ مرتبہ بھی چلے گا۔" میں نے اس انداز میں کہا جیسے اس بات کی کوئی اہمیت نہ ہو پھر پوچھا۔ "وقوعہ کے روز جتنی دفعہ بھی آپ کا ملزم سے سامنا ہوا کیا آپ نے اس کے ہاتھوں پر دستانے دیکھے؟"

"نہیں تو۔" وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "وقوعہ کے روز کیا، میں نے تو کبھی بھی ملزم کو دستانے پہنے نہیں دیکھا۔"

"دی پوائنٹ از ٹو بی نوٹڈ یور آنر۔" میں نے جج کی طرف دیکھتے ہوئے معنی خیز لہجے میں کہا پھر دوبارہ استغاثہ کے گواہ کی طرف متوجہ ہوگیا۔

"خالق صاحب! تھوڑی دیر پہلے آپ نے وکیل استغاثہ کے سوال کے جواب میں بتایا تھا کہ وقوعہ کے روز مقتول کریم بخش نے ملزم کو اپنے کمرے میں بلا کر خوب اچھی طرح ڈانٹا تھا۔ معزز عدالت یہ جاننا چاہتی ہے کہ مقتول کے کمرے کے اندر ہونے والی ڈانٹ ڈپٹ کا آپ کو کیسے پتا چلا؟"

"جناب! بات دراصل یہ ہے کہ میں سیٹھ صاحب کے کمرے کے پاس سے گزرا تو کمرے کے اندر سے مجھے سیٹھ صاحب کی غصیلی آواز سنائی دی۔ وہ کامران کو بری طرح ڈانٹ رہے تھے اور بار بار پانچ لاکھ روپے کے غبن کا ذکر کررہے تھے اور...... جواب میں کامران، سیٹھ صاحب سے گڑگڑا کر معافی مانگ رہا تھا اور غبن کا اقرار کرتے ہوئے کہہ رہا تھا کہ اس سے غلطی ہوگئی۔ وہ لالچ میں آگیا تھا۔

سیٹھ جی نے کامران کو دھمکی بھی دی تھی کہ وہ ابھی پولیس کو بلا کر اسے گرفتار کرا دیں گے۔

"گڈ...... ویری گڈ......" میں نے سراہنے والے انداز میں کہا۔ "آپ تو اس خونی ڈرامے کے کلائمیکس سین کے بھی گواہ ہیں۔ اب جلدی سے یہ بھی بتا دیں کہ اس کے بعد کیا ہوا تھا؟"

"مجھے کچھ پتا نہیں جناب۔" وہ اضطراری لہجے میں بولا۔ "میں تو گھبرا کر اپنی مشین کی طرف چلا گیا تھا۔"

"اور پھر اگلے ہی لمحے لائٹ چلی گئی تھی؟" میں نے سرسراتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"جی جی...... بالکل۔" اس نے جلدی سے اثبات میں گردن ہلائی۔

"لائٹ جانے کے بعد کیا ہوا تھا؟"

"میں مشین کو چھوڑ کر باہر نکل آیا تھا کیونکہ لائٹ جانے کے بعد مشین خود بخود رک گئی تھی۔"

"باہر نکل آیا تھا...... سے تمہاری کیا مراد ہے؟" میں نے اسے آڑے ہاتھوں لیا۔

"یعنی فیکٹری کے مشین والے کمرے سے نکل کر اس حصے میں آ گیا تھا جہاں سامنے ہی سیٹھ صاحب کا کمرا ہے۔" اس نے بتایا۔

"وہاں پہنچ کر تم نے کیا دیکھا؟" میں نے پوچھا۔

"میں نے کامران کو گھبرائے ہوئے انداز میں سیٹھ صاحب کے کمرے سے نکلتے دیکھا۔" اس نے جواب دیا۔ "اس نے مجھ سے پوچھا...... خالق! یہ اندھیرا کیسے ہو گیا؟" میں نے کہا۔ "لگتا ہے ہماری لائٹ چلی گئی ہے......"

"لیکن آس پاس کی فیکٹریوں اور عمارتوں کی بتیاں تو سب آن تھیں۔" میں نے اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی کہہ دیا۔ "جس پر ملزم نے تم سے کہا تھا، آؤ ذرا سوئچ بورڈ کو دیکھتے ہیں!"

"جی بالکل۔" وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "کامران کا خیال تھا کہ شاید ہمارا فیوز اڑ گیا ہوگا لیکن جب ہم نے سوئچ بورڈ کا جائزہ لیا تو پتا چلا کہ کسی نے فیکٹری کا مین سوئچ آف کر دیا تھا۔ میں نے مین سوئچ آن کیا تو فیکٹری کے اندر بجلی کی روانی بحال ہو گئی۔"

"ذرا سوچ کر...... بہت دھیان سے سوچ کر بتاؤ کہ جس وقت فیکٹری کی لائٹ گئی، اس وقت فیکٹری میں کتنے افراد موجود تھے؟" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے نہایت ہی اہم سوال کیا۔

"صرف تین۔" اس نے بڑے اعتماد سے جواب دیا۔ "میں، کامران اور سیٹھ صاحب۔"

"تم اپنی مشین پر ٹیپ بنانے میں مصروف تھے اور لائٹ چلی گئی۔" میں نے اپنے لہجے میں تیزی بھرتے ہوئے کہا۔ "لہٰذا یہ بات تو طے ہے کہ تم نے مین سوئچ آف نہیں کیا تھا؟"

"جی...... آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔"

"مقتول سیٹھ کریم بخش اپنے کمرے میں بیٹھا کامران کو ڈانٹ ڈپٹ کر رہا تھا۔" میں نے استغاثہ کے گواہ کی آنکھوں میں بہت دور تک جھانکتے ہوئے کہا۔ "لائٹ کی بحالی کے بعد سیٹھ کریم بخش کی لاش اس کے کمرے کے فرش پر پائی گئی تھی چنانچہ اس بات کا بھی کوئی امکان نہیں کہ مین سوئچ مقتول نے آف کیا ہوگا...... میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟"

"جی بالکل...... سیٹھ صاحب کو ایسی حرکت کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔"

"اور لائٹ جاتے ہی جب تم مشین چھوڑ کر سامنے والے حصے میں آئے تو تم نے ملزم کو گھبرائے ہوئے انداز میں مقتول کے کمرے سے باہر نکلتے دیکھا تھا۔" میں نے سنسناتے ہوئے لہجے میں کہا۔ "تھوڑی دیر پہلے تم نے مجھے یہی بتایا ہے نا؟"

"جی وکیل صاحب! میں نے جو دیکھا وہی بتایا ہے۔"

"تمہارے اس چشم دید واقعے سے تو یہی ثابت ہوتا ہے کہ مین سوئچ کو ملزم نے بھی آف نہیں کیا ہوگا۔" میں نے اپنی جرح کو سمیٹتے ہوئے کہا۔ "میں غلط تو نہیں کہہ رہا؟"

"جی نہیں...... آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔" وہ تائیدی انداز میں بولا۔ "سیٹھ صاحب کے کمرے میں بیٹھ کر ملزم فیکٹری کے داخلی گیٹ کے قریب لگے ہوئے مین سوئچ کو آف نہیں کر سکتا۔"

"پھر مین سوئچ کس نے آف کیا؟" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا پھر روئے سخن جج کی جانب موڑتے ہوئے ان الفاظ میں اضافہ کیا۔

"جناب عالی! اس کیس کی ایک ایک کڑی بتاتی ہے کہ میرا موکل بے گناہ ہے۔ اس نے سیٹھ کریم بخش کو قتل نہیں کیا۔ یہ ٹھیک ہے کہ ملزم نے کمپنی کے حسابات میں سے پانچ لاکھ روپے کا غبن کیا تھا اور اس غبن کا ایک پس منظر ہے جو ثمرین اور فرید خان کی ملی بھگت کا نتیجہ ہے اور...... میں آئندہ پیشی پر اپنے اس دعوے کو سچا بھی کر کے دکھا دوں گا لیکن فی الحال......" لمحاتی توقف کر کے میں نے ایک گہری

سانس لی پھر بڑے ڈرامائی انداز میں کہا۔

''فی الحال...... سب سے اہم سوال یہ ہے کہ وقوعہ کے روز ''سنگھا ٹریڈرز'' کا مین سوئچ کس نے آف کیا تھا؟ مجھے یقین ہے کہ جس شخص نے مین سوئچ آف کیا، وہ اصلی قاتل کا آلۂ کار ہے۔ اگر اس کیس کے تفتیشی افسر دوڑ دھوپ کے لیے اپنی آمادگی ظاہر کردیں اور پولیس اس شخص تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہوجائے تو پھر قاتل کی گردن کو ناپنا بہت آسان ہوجائے گا......''

اس کے ساتھ ہی عدالت کا مقررہ وقت ختم ہوگیا۔ جج نے دس روز بعد کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کرنے کا اعلان کردیا۔

''دی کورٹ از ایڈ جارنڈ......!''

آئندہ پیشی سے ایک روز پہلے میں نے وہاب عثمانی کو فون کر کے یاد دہانی کرادی کہ کل کا دن اہم ہے۔ مجھے استغاثہ کے گواہ فرید خان پر کڑی جرح کرنا ہے لہٰذا وہ اپنے فرض کے حوالے سے مستعد رہیں، انہوں نے مجھے اپنے تعاون کا مکمل یقین دلا دیا۔

☆☆☆

منظر اسی عدالت کا تھا اور گواہوں والے کٹہرے میں فرید خان کھڑا تھا۔ وکیل استغاثہ نے اس سے خاصی لمبی چوڑی جرح کی جس سے یہ ثابت کرنا مقصود تھا کہ استغاثہ کا یہ گواہ بے قصور اور بے گناہ ہے۔ میں بڑے تحمل سے یہ سب دیکھتا اور سنتا رہا کیونکہ میں نے جس انداز میں فرید خان کو رگیدنے کا فیصلہ کر رکھا تھا، اس کے بارے میں استغاثہ اور فرید خان کچھ نہیں جانتے تھے۔

وکیل استغاثہ نے اپنے گواہ کو فارغ کیا تو جج کی اجازت حاصل کرنے کے بعد میں فرید خان والے کٹہرے کے قریب چلا گیا۔ وہ بڑے طنزیہ انداز میں مجھے دیکھ رہا تھا۔ میں نے اپنی جرح کا آغاز کرتے ہوئے بے تلے انداز میں کہا۔

''فرید صاحب! کیا یہ درست ہے کہ اس واقعے سے پہلے آپ کی ملزم سے اچھی خاصی دوستی تھی؟''

''آپ اسے دوستی کا نام نہیں دے سکتے۔'' وہ بڑی رعونت سے بولا۔ ''مالک اور ملازم کے بیچ دوستی کی کوئی تک نہیں بنتی۔ ہاں، البتہ میں اس کی محنت، ایمان داری اور خدمت کی وجہ سے اس کو احترام کی نگاہ سے دیکھتا تھا لیکن اسے عزت راس نہیں آئی اور لاکھوں کا غبن کر کے اس نے اپنی اوقات دکھا دی......'' بات ختم کر کے اس نے نفرت آمیز نظر سے اکیوزڈ باکس میں کھڑے میرے مؤکل کی طرف دیکھا۔

''کیا یہ سچ ہے کہ مقتول کریم بخش آپ پر بہت اعتماد کرتے تھے۔'' میں نے اس کے اردگرد ایک نادیدہ جال پھیلاتے ہوئے کہا۔ ''اور آپ ہی نے مقتول کو رپورٹ دی تھی کہ ملزم کمپنی کے اکاؤنٹس میں سے رقم نکال کر ثمرین نامی کسی عورت پر لٹا رہا ہے؟''

''آپ کی آدھی بات درست ہے وکیل صاحب!'' وہ بڑی چالاکی سے بولا۔ ''یعنی یہ کہ انکل مجھ پر اندھا اعتماد کرتے تھے لیکن میں نے انہیں ایسی کوئی رپورٹ نہیں دی کہ ملزم کسی ثمرین نامی عورت پر دولت لٹا رہا ہے۔''

''پھر آپ نے اپنے انکل کو کیا رپورٹ دی تھی؟'' میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔

''وہ بات دراصل یہ ہے جناب کہ......'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''انکل کو شک ہوگیا تھا کہ ملزم کمپنی کے اکاؤنٹس کے ساتھ کوئی گڑبڑ کر رہا ہے۔ انہوں نے میرے ذمے یہ ڈیوٹی لگائی کہ میں پچھلے تین ماہ کے حسابات اور بینک کے معاملات کو چیک کروں۔ ملزم جب چھٹی کر کے گھر چلا جاتا تو میں تمام رجسٹرز اور چیک بکس لے کر بیٹھ جاتا۔ جلد ہی مجھے پتا چل گیا کہ ملزم نے کہاں کہاں گڑبڑ کر رکھی تھی۔ چھوٹی موٹی رقمیں نکالنے اور واپس ڈالنے کے بعد سب سے آخر میں اس نے پانچ لاکھ اڑا لیے تھے۔ میں نے یہ رپورٹ انکل کو پیش کردی۔''

''کیا ملزم گھر جاتے وقت تمام رجسٹرز اور چیک بکس یونہی اپنی میز پر ہی چھوڑ جاتا تھا کہ آپ اس کے جانے کے بعد یہ چیزیں لے کر بیٹھ جاتے تھے؟''

''ایسی کوئی بات نہیں۔'' وہ تمسخرانہ انداز میں میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''ملزم کی تمام درازوں کی ڈپلی کیٹ چابیاں انکل کے پاس تھیں جو اس مشن کو پورا کرنے کے لیے انہوں نے مجھے مہیا کردی تھیں۔''

''لیکن ملزم کا بیان تو یہ ہے کہ مقتول نے خود اسے بتایا تھا کہ آپ نے ملزم اور ثمرین کی ملاقاتوں والی کہانی مقتول تک پہنچائی تھی؟''

''آپ کا مؤکل غلط بیانی سے کام لے رہا ہے۔'' وہ روکھے لہجے میں بولا۔ ''سچ وہی ہے جو میں نے آپ کو بتایا ہے۔''

''یعنی آپ نے مقتول کو یہ رپورٹ نہیں دی تھی کہ ملزم کسی ثمرین نامی عورت پر کمپنی کی دولت لٹا رہا ہے؟'' میں نے تصدیق طلب انداز میں پوچھا۔

''قطعاً نہیں۔'' وہ اٹل لہجے میں بولا۔''میں ثمرین نامی کسی عورت کو نہیں جانتا۔''

اس کی ڈھٹائی اوج کمال پر تھی۔ میں نے غیر محسوس انداز میں اپنے جال کو سمیٹتے ہوئے کہا۔''اس کا تو مطلب یہ ہوا کہ آپ کی نظر میں ملزم نے ثمرین اور آپ کے حوالے سے اسٹاک ایکسچینج ..... اور حیرت انگیز پرافٹ والی جو کہانی سنائی ہے وہ بھی دروغ گوئی سے زیادہ اہمیت کی حامل نہیں۔ کیونکہ جب آپ کسی ثمرین کو جانتے ہی نہیں تو ثمرین کو اپنی ایک دوست کی حیثیت سے ملزم سے ملوانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا......''

''جی یہی حقیقت ہے۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔''آپ کا مؤکل جھوٹ پر جھوٹ بول کر آپ کو گمراہ کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔''

''کیا آپ اس بات سے بھی انکاری ہیں کہ جس وقت ایک بند کمرے میں، مقتول اور ملزم کے بیچ گرما گرمی ہو رہی تھی اس وقت آپ فیکٹری میں موجود تھے؟'' میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے سوال کیا۔''اور جب ملزم نے مقتول کو بتایا کہ وہ آپ کی باتوں میں آکر کمپنی سے فراڈ کرنے پر مجبور ہوا تھا تو مقتول نے طیش کے عالم میں ملزم سے کہا تھا...... بکواس نہیں کرو۔ فرید اس وقت فیکٹری میں موجود ہے۔ میں ابھی اسے یہاں بلا کر دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ کردوں گا......''

''لگتا ہے، آپ کے مؤکل نے غلط بیانی میں پی ایچ ڈی کر رکھا ہے۔'' وہ مذاق اڑانے والے انداز میں بولا۔''اس روز جب میں فیکٹری پہنچا تو انکل کی موت واقع ہو چکی تھی۔ میں نے ہی فون کر کے پولیس کو اس اندوہناک واقعے کی اطلاع دی تھی۔ مشین آپریٹر اس بات کی گواہی دے سکتا ہے۔''

''اوکے...... ایک لمحے کے لیے فرض کر لیتے ہیں کہ میرا مؤکل صد فیصد جھوٹا اور آپ صد فیصد سچے ہیں۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔''اب ذرا آپ میرے ایک سیدھے سادے سوال کا سیدھا سادہ جواب دے دیں۔''

وہ الجھن زدہ سوالیہ نظر سے مجھے تکنے لگا۔

''فرید صاحب! آپ نے میرے آفس میں بیٹھ کر مجھے کتنے اماؤنٹ کی آفر کی تھی؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔

''میں نے آپ کو آفر کی تھی......'' وہ بگڑے ہوئے لہجے میں بولا۔''آپ کا دماغ تو ٹھیک ہے...... میں بھلا آپ کو کیوں آفر کرنے لگا...... کس سلسلے میں آفر کرنے لگا......؟''

''آپ کی آفر کا اماؤنٹ تیس ہزار روپے سکہ رائج الوقت تھا اور آپ نے فرمایا تھا کہ میں اپنی ڈیمانڈ بتاؤں۔'' میں نے بدستور اس کی آنکھوں میں ڈوبتے ہوئے کہا۔''اور اس آفر کا سلسلہ یہ تھا کہ میں اس کیس سے الگ ہو جاؤں تا کہ ملزم بڑی آسانی سے پھانسی لگ جائے اور آپ کی گردن محفوظ رہے۔ آپ نے یہ الفاظ استعمال کیے تھے...... بیگ صاحب! لوگ تو آئے دن پھانسی چڑھتے ہی رہتے ہیں۔ آپ کامران کی فکر چھوڑ دیں۔ اپنی ڈیمانڈ بتائیں......''

''آپ بکواس کر رہے ہیں...... جھوٹ بول رہے ہیں۔'' وہ ایک دم آپے سے باہر ہو گیا۔''میں زندگی میں بھی آپ کے آفس نہیں گیا۔ اب تو مجھے یقین ہو گیا کہ آپ کا دماغ خراب ہو چکا ہے۔''

اس کی اس بکواس اور برہمی کے جواب میں اصولاً تو مجھے بھی چراغ پا ہو جانا چاہیے تھا لیکن میں نے نہایت ہی تحمل لہجے میں کہا۔

''میرے فاضل دوست کے معزز گواہ! نہ تو میرا دماغ خراب ہوا ہے اور نہ ہی میرا ٹیپ ریکارڈر......!''

''ٹیپ ریکارڈر۔'' اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔''کیا مطلب ہے آپ کا؟''

''ٹیپ ریکارڈر کا مطلب، ایک ایسی ریکارڈنگ مشین ہوتا ہے جس کی مدد سے کیسٹ کے ٹیپ پر آواز ریکارڈ کی جاتی ہے۔'' میں نے سنسناتے ہوئے لہجے میں کہا پھر اپنے کوٹ کی سائڈ پاکٹ میں سے ایک کیسٹ نکال کر اس کی آنکھوں کے سامنے لہراتے ہوئے ان الفاظ میں اضافہ کیا۔''اس کیسٹ کے اندر آپ کی اس دن کی تمام گفتگو ریکارڈ ہے جب آپ نے مجھے تیس ہزار کی آفر کی تھی......''

''یہ تو دھوکا ہے!'' وہ پاؤں پٹختے ہوئے غصیلے لہجے میں بولا۔''میں نے آپ پر اعتماد کر کے وہ باتیں کیں اور آپ نے اتنی گری ہوئی حرکت کی ہے......''

بات کے اختتام پر وہ پریشان نظر سے مجھے تکنے لگا۔ چہرے کے تاثرات بتاتے تھے کہ اسے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا ہے۔ غصے کی کیفیت میں وہ اس حقیقت کا اعتراف کر بیٹھا تھا کہ اس روز اس نے مجھے ایک بھاری رقم کی پیشکش کر کے اس کیس سے الگ ہو جانے کی بات کی تھی۔

''میری حرکت گری ہوئی ہے یا اچھی ہوئی، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔''اہم

بات یہ ہے کہ معزز عدالت نے آپ کی زبان سے سچ سن لیا ہے۔ اس سچ کو اگلوانے کے لیے مجھے یہ ڈراما رچانا پڑا۔''

''ڈراما......'' اس کی الجھن بے چارگی میں بدل گئی۔ ''آپ کہنا کیا چاہ رہے ہیں؟''

''یہ کیسٹ بلینک ہے یعنی اس میں کسی قسم کی ریکارڈنگ موجود نہیں۔'' میں نے زیرلب مسکراتے ہوئے کہا۔ ''نہ آپ کی گفتگو اور نہ ہی کسی اور کی۔ میں عموماً اس نوعیت کی غیر اخلاقی حرکتوں سے اجتناب برتتا ہوں لیکن جب آپ جیسے کسی ڈھیٹ اور اڑیل ٹٹو سے واسطہ پڑ جائے تو پھر اس قسم کے چھوٹے موٹے ڈرامے کرنا ہی پڑتے ہیں۔ وہ کیا کہتے ہیں کہ جب سیدھی انگلی سے گھی نہ نکل رہا ہو تو مجبوراً انگلی کو ٹیڑھا......''

''بیگ کے بچے...... میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔'' میری بات ختم ہوتے ہی وہ غصے سے لال پیلا ہوتے ہوئے بولا پھر وٹنس باکس میں سے باہر نکل کر میری جانب بڑھنے کی کوشش کی۔

مگر اس کی یہ کوشش کامیاب نہ ہو سکی کیونکہ جج کے اشارے پر متعلقہ عدالتی عملے نے اسے قابو کر لیا۔ میں نے جج کی جانب دیکھتے ہوئے واشگاف الفاظ میں کہا۔

''یور آنر! استغاثہ کے گواہ فرید خان نے معزز عدالت کے روبرو مجھے قتل کرنے کا ارادہ ظاہر کیا ہے۔ اگر کل کلاں مجھے کچھ ہو جاتا ہے تو اس کا ذمے دار یہی شخص ہوگا۔''

جج نے اپنے سامنے میز پر پھیلے ہوئے کاغذات پر کچھ نوٹ کیا پھر نگاہ اٹھا کر میری جانب دیکھا۔ میں نے کھنکھار کر گلا صاف کرتے ہوئے کہا۔

''جناب عالی! استغاثہ کے گواہ فرید خان نے میرے کئی سوالات کے جواب میں ثمرین کے حوالے سے اپنی لاعلمی کا اظہار کیا ہے بلکہ اسے ایک افسانوی کردار سے تعبیر کیا ہے لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ثمرین ایک حقیقی کردار ہے جس کا اصلی نام جویریہ ہے اور...... جو اس وقت ناظم آباد کے علاقے میں، ایک فلیٹ میں ثمینہ کے نام سے رہائش پذیر ہے اور...... فرید خان کا اس عورت سے گہرا میل ملاپ ہے۔''

جج کی دلچسپی ساتویں آسمان سے باتیں کرنے لگی۔ اس نے سرسراتی ہوئی آواز میں مجھ سے سوال کیا۔ ''آپ یہ باتیں اتنے وثوق کے ساتھ کس طرح کر رہے ہیں۔ اپنے دعوے کا کوئی ثبوت ہے آپ کے پاس؟''

''بہت ٹھوس ثبوت ہے جناب عالی!'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''میں ثمرین نامی اس عورت کا مکمل پتا اور فون نمبر معزز عدالت کو مہیا کر رہا ہوں۔ عدالت متعلقہ عدالتی عملے سے میرے دعوے کی تصدیق کرا سکتی ہے۔''

جج نے اثبات میں گردن ہلائی۔ میں نے ایک کاغذ جج کی خدمت میں پیش کرتے ہوئے کہا۔ ''جناب عالی! اس کاغذ پر وہ تمام اہم معلومات درج ہیں جن کا ثمرین کے حوالے سے ابھی میں نے ذکر کیا ہے۔ معزز عدالت سے میری استدعا ہے کہ ثمرین تک رسائی حاصل کرنے تک فرید خان کو زیر حراست رکھا جائے ورنہ یہ فتنہ پرور شخص سارا کھیل بگاڑ دے گا۔ مجھے یقین ہے کہ اگر ثمرین اور فرید خان کو شاملِ تفتیش کیا جائے تو پولیس ایک ہی رات میں اصل قاتل تک پہنچ جائے گی۔ دیٹس آل یور آنر......''

ادھر میری بات ختم ہوئی، ادھر فرید خان نے عدالت کے کمرے کے دروازے کی طرف دوڑ لگانے کی کوشش کی تاہم متعلقہ عدالتی عملے نے چوکسی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس کی کوشش کو ناکام بنا دیا۔ اگلے ہی لمحے وہ باقاعدہ گرفتار کیا جا چکا تھا۔

☆☆☆

صورت حال روزِ روشن کے مانند عیاں ہو چکی تھی۔ وہاب عثمانی کی مجھے فراہم کردہ اور بعدازاں میری عدالت کو مہیا کردہ معلومات کی روشنی میں اسی روز شام سے پہلے ثمرین کو ناظم آباد کے علاقے سے گرفتار کر لیا گیا۔ فرید خان پہلے ہی پولیس کی کسٹڈی میں تھا۔ آئندہ پیشی پر عدالت نے میرے مؤکل کامران کو باعزت بری کر دیا کیونکہ فرید خان نے کریم بخش کے قتل کا اقرار کر لیا تھا۔

اس خطرناک منصوبے میں مشین آپریٹر خالق نے اس کا ساتھ دیا تھا۔ خالق نے ہی مین سوئچ آف کر کے فرید خان کی راہ ہموار کی تھی جو پہلے ہی کریم بخش کے کمرے میں، ایک خفیہ گوشے میں چھپا ہوا تھا۔ فرید خان نے بعدازاں اپنے اقبالی بیان میں بتایا کہ اس نے کریم بخش کو ٹھکانے لگانے میں اس لیے جلدی کر دی کہ اگر وقوعہ کے روز وہ اس کی جان نہ لیتا تو اگلے دن اس کا لاکھوں کا ہیر پھیر مقتول کے علم میں آنے والا تھا......!

مجرم چاہے کتنا بھی ذہین اور چالباز کیوں نہ ہو، وہ کوئی نہ کوئی ایسی غلطی ضرور کرتا ہے کہ پلک جھپکتے میں وہ قانون کی آہنی گرفت میں آ جاتا ہے۔

(تحریر: حسام بٹ)

چراغ

منظر امام

کبھی کبھی امید کی دم توڑتی آخری لَو میں بھی یوں جان آجاتی ہے کہ نہ صرف اردگرد کا سارا ماحول روشن ہو جاتا ہے بلکہ چراغ بجھنے کا خوف بھی زائل ہو جاتا ہے... وہ بھی جو نئی نسل کی بے رخی سے افسردہ تھا مگر ایک لمحے کے خوب صورت منظر میں پھر سے جی اٹھا... کیونکہ کونپل کے پھوٹنے سے موسم کے پلٹنے کی نوید ملتی ہے۔

باپ کی شفقتوں اور جگر گوشوں کی مصروفیتوں کا ماجرا

یہ ایک ایسا واقعہ ہے جس نے مجھے بہت متاثر کیا تھا اور میں آج تک اس واقعے کو بھلا نہیں سکا ہوں۔ حالانکہ اس واقعے سے میرا براہِ راست کوئی تعلق نہیں تھا لیکن تعلق اس طرح بن گیا کہ دوسروں کی طرح میں بھی اس واقعے کا عینی شاہد ہوں، یہ سب کچھ میرے سامنے ہوا تھا۔

ایسا نہیں کہ مجھے اچھے ہوٹلوں میں جانے کا شوق نہیں رہا ہو یا میں نے اپنے آپ کو بالکل مار لیا ہو۔ ایسا کبھی نہیں ہوا۔ اپنی جوانی سے مجھے چائنیز کا شوق رہا ہے۔

اس زمانے میں بہت کم چائنیز ریستوران ہوا کرتے تھے اور وہ بھی پوش علاقوں میں۔ آج کل تو جگہ جگہ ایسے ریستوران مل جاتے ہیں جہاں چائنیز کھانے ملتے ہیں۔

تو میں اپنی جوانی میں بھی کبھی کبھی چلا جایا کرتا تھا، کیونکہ اس دور کے لحاظ سے بھی وہ خاصے مہنگے ہوتے تھے اور آج بھی مہنگے ہی ہوتے ہیں۔

میرا گھرانا بہت مختصر سا ہے۔ دو بیٹے اور ایک بیٹی۔ بیوی کا انتقال ہو چکا ہے۔ مجھے یاد ہے شادی کے بعد ہم اکثر چائنیز چلے جایا کرتے تھے۔ راشدہ کو تو اتنا شوق نہیں تھا لیکن میری وجہ سے وہ بھی چلی جاتی تھی۔ پھر آہستہ آہستہ اس کو بھی چائنیز کھانے پسند آنے لگے۔

وقت کتنی جلدی گزر جاتا ہے۔ اس کا اندازہ اس کے گزر جانے کے بعد ہی ہوتا ہے۔ اتنے برس ہو گئے کچھ پتا ہی نہیں چلا۔ اب تو اس کے انتقال کو بھی سات برس ہو چکے ہیں اور کچھ پتا نہیں چلا کہ اتنے دن میں نے اس کے بغیر کیسے گزار لیے۔

ویسے ایک بات تو ہے کہ اس کے بعد میں نڈھال ہوتا چلا گیا۔ کوئی تحریک نہیں رہی۔ بس ایک بے مقصد سی زندگی رہی۔ جسمانی کمزوریوں نے بھی گھیر لیا اور سب سے بڑی بات کہ زندگی گزارنے کا کوئی خاص مقصد نہیں رہا۔ پھر بچوں کی بے توجہی۔

تینوں بڑے ہو گئے تھے، ان کی اپنی زندگی تھی۔ شور مچاتی ہوئی ہنگامہ خیز۔ ایسے میں کسے یاد رہتا ہے کہ گھر کے ایک کونے میں ایک بوڑھا بھی پڑا ہوا ہے۔ جس کو بھی توجہ کی ضرورت ہے۔ ہمدردی کی ضرورت ہے جو اب چلنے پھرنے میں بھی دشواری محسوس کرتا ہے۔

بہرحال یہ باتیں کیا دہرائی جائیں۔ اس قسم کے نہ جانے کتنے گھرانے اس ملک میں ہوں گے۔ اس معاشرے میں ہوں گے جہاں اس قسم کی کہانیاں ہوتی ہیں۔

میری تو خدا سے ہمیشہ ایک ہی دعا رہی ہے کہ اے خدا مجھے صحت مند رکھ۔ کسی کا محتاج نہ بنا۔ میں بستر پر لیٹ کر اپنی موت کا انتظار نہیں کر سکوں گا کیونکہ میری دیکھ بھال کرنے والا کوئی نہیں ہوگا۔ مجھے چلتا پھرتا اٹھا لینا۔

اس قسم کی دعائیں مانگ کر ہمیشہ ایک سکون سا ہو جاتا ہے، احساس ہونے لگتا ہے کہ شاید خدا نے میری سن لی ہے۔ بہرحال تو میں چائنیز کھانوں کے حوالے سے بات کر رہا تھا۔

میں نے پچھلے دنوں اپنے بڑے بیٹے امجد سے کہا۔ ”بیٹا! میرا دل آج کل چائنیز کھانے کو چاہ رہا ہے۔ تم کسی دن مجھے لے کر چلو۔“

”ارے ابا، رہنے دیں۔ آپ کہاں ان چکروں میں پڑیں گے۔ گھر میں جو پکا ہوتا ہے، وہ کھا لیا کریں۔“ اس نے بڑی رکھائی سے کہا۔

بہت افسوس ہوا تھا۔ ایک معمولی سی فرمائش بھی اولاد پوری نہیں کر سکتی۔ ایسی بات نہیں تھی کہ ان کے پاس پیسے نہ ہوں۔ ماشاء اللہ امجد کی تنخواہ اچھی خاصی تھی۔ صرف یہ تھا کہ ان کے پاس باپ کے لیے وقت نہیں تھا۔ امجد کے بعد ارشد تھا۔ دو تین دنوں کے بعد جب میں نے اس سے کہا تو اس کا رویہ اور بھی خشک تھا۔ ”خدا کے لیے ابا۔ اب یہ سب شوق چھوڑیے۔ آپ کو یاد ہے کہ آپ کی وجہ سے ایک دن ہماری کتنی توہین ہوئی تھی۔“

”کیا توہین ہوگئی تھی بیٹا؟“

”آپ جو اس دن برتھ ڈے پارٹی میں ہمارے ساتھ ہوٹل گئے تھے تو آدھا کھانا آپ نے اپنے کپڑوں پر گرا لیا تھا۔“

”بیٹا! اس میں توہین کی کیا بات ہے۔ تم کو تو معلوم ہے کہ میرے ہاتھ میں رعشہ آگیا ہے۔ کوئی چیز ٹھیک سے پکڑ نہیں سکتا۔“

”اس لیے تو کہہ رہا ہوں کہ اب ادھر اُدھر جانے سے پرہیز کریں۔ خوامخواہ ہمیں شرمندگی ہونے لگتی ہے۔“

ظاہر ہے اب اس کے بعد میں کیا کہہ سکتا تھا۔ لیکن میں نے یہ سوچ لیا تھا کہ میں ضرور جاؤں گا۔ جس دن مجھے پنشن کے پیسے ملیں گے، اس دن جاؤں گا۔ مہینے میں ایک دن ایسا ضرور آتا جب میری جیب میں میرے اپنے پیسے ہوا کرتے تھے۔ وہ دن میری پنشن ملنے کا دن ہوتا تھا۔

بینک چونکہ قریب ہی تھا اس لیے میں اکیلا چلا جایا کرتا۔ بے چارہ بینک منیجر ایک مہربان آدمی تھا۔ اس لیے مجھے قطار میں لگنے کی ضرورت نہیں ہوتی تھی۔

مجھے دیکھتے ہی وہ اپنے چیمبر میں بلا لیتا اور پنشن کی رقم میرے حوالے کر دیتا۔ تو اس دن میں پنشن کی رقم لے کر ایک رکشا پکڑ کر چائنیز ریسٹوران کی طرف آگیا اور یہیں وہ واقعہ پیش آیا میں جس کے بارے میں بتا چکا ہوں۔

وہ ایک ایسا ہوٹل تھا جس میں دوپہر اور رات دونوں وقت لوگ بھرے رہتے تھے۔ ایسے ہوٹلوں کا ماحول ویسے بھی بڑا خوبصورت ہوتا ہے۔

اس دن بھی ہوٹل بھرا ہوا تھا۔ ہلکی ہلکی روشنی میں اس کا ماحول بہت خوابناک سا دکھائی دے رہا تھا۔ دل کو کئی کہانیاں یاد سی آکر رہ گئیں۔

میں نے دیکھا کہ اس دن نوجوانوں کی تعداد اور زیادہ تھی۔ نوجوان لڑکے اور لڑکیاں۔ شاید کسی یونیورسٹی یا کالج کا گروپ آیا ہوا تھا۔ کچھ مجھ جیسے بوڑھے بھی تھے جو اپنے اپنے گھر والوں کے ساتھ آئے ہوئے تھے۔

اس نوجوان نے اس بوڑھے کو ایک کرسی پر سہارا دے کر بٹھا دیا پھر ویٹر کو کھانے کا آرڈر دینے لگا۔ اس دوران وہ بوڑھا عجیب طرح کی شکلیں بنا تا رہا تھا۔

میرا خیال تھا کہ وہ ذہنی طور پر صحت مند نہیں ہے، بہرحال کھانا آ گیا۔ اصل تماشا اب یہاں سے شروع ہوا تھا۔

وہ بوڑھا کھاتے ہوئے کھانا اِدھر اُدھر ڈالتا رہا۔ کبھی لباس پر، کبھی میز پر۔ آس پاس بیٹھے ہوئے لوگ اشاروں کنایوں سے ان دونوں کو دیکھ رہے تھے لیکن اس نوجوان کو کسی کی پروا نہیں تھی۔ وہ بار بار نیپکن سے اس بوڑھے کا منہ صاف کرتا اور دوبارہ اس کی پلیٹ میں کچھ ڈال دیتا۔

اس بوڑھے کے ہاتھ میں اتنا رعشہ تھا کہ وہ ٹھیک سے کھا بھی نہیں پا رہا تھا۔ نوجوان نے اِدھر اُدھر دیکھا پھر اپنے ہاتھ سے اس بوڑھے کو کھلانے لگا۔

اس کا انداز اس وقت ایسا تھا جیسے وہ کسی بچے کو کھلا رہا ہو۔ پوری توجہ سے، پوری محبت سے، خود میں بھی اس کو دیکھ دیکھ کر حیران ہو رہا تھا۔

یہ سلسلہ بہت دیر تک چلتا رہا۔ بالآخر کھانا ختم ہوا۔ نوجوان نے اس بوڑھے کو سہارا دے کر اٹھایا اور اسے واش روم کی طرف لے گیا۔ کچھ دیر بعد وہ اس بوڑھے کا منہ ہاتھ دھلا کر اسے واپس لے آیا تھا۔ کرسی پر بیٹھ کر اس نے ویٹر سے بل طلب کیا، بل کے پیسے ادا کیے اور جب وہ بوڑھے کو سہارا دے کر جانے لگا تو ایک آدمی اٹھا۔ ”بیٹے! ذرا ایک منٹ رکو۔“

ہم سب آواز دینے والے کی طرف دیکھنے لگے۔ وہ بھی ایک بوڑھا آدمی تھا لیکن صحت مند۔ اس نے بہت اچھا سوٹ پہن رکھا تھا جس سے یہ اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ صاحب حیثیت انسان ہے۔

”جی فرمائیں؟“ نوجوان نے رک کر پوچھا۔

”یہ تمہارے کون ہیں؟“ بوڑھے نے پوچھا۔

”یہ میرے والد صاحب ہیں۔“ نوجوان نے جواب دیا۔

”بیٹے! تم یہاں کچھ چھوڑ کر تو نہیں جا رہے؟“ اس نے پوچھا۔

”چھوڑ کر!“ نوجوان جلدی جلدی اپنی جیبیں ٹٹولنے لگا۔ پھر اس نے میز کی طرف دیکھا۔ ”نہیں جناب...! میں کچھ بھی چھوڑ کر نہیں جا رہا۔“

”نہیں بیٹے! تم یہاں بہت سے اپنی عمر کے نوجوانوں کے لیے ایک سبق چھوڑ کر جا رہے ہو کہ اولاد ہو تو تم جیسی ہو۔ خوش رہو۔“

اس وقت ہوٹل میں موجود وہ لوگ جو کچھ دیر پہلے ان دونوں کی طرف طنزیہ نگاہوں سے دیکھ رہے تھے، انہوں نے اپنی گردنیں جھکالی تھیں اور میری آنکھوں میں آنسو تھے۔ میں رو رہا تھا۔

ہوٹل میں ایک گہرا سناٹا تھا۔

اس نوجوان کے ہونٹوں پر ایک دھیمی سی مسکراہٹ تھی، اس نے بوڑھے کا شکریہ ادا کیا اور اس بوڑھے کا بازو تھام لیا۔ ”چلیں بابا۔“

دونوں چلے گئے۔ دونوں باہر چلے گئے۔

کچھ دیر بعد جب یہ طلسم ٹوٹا تو پھر ہر شخص کھانے کی طرف متوجہ ہو گیا۔ میں نے بھی اپنے آنسو پونچھے اور بل ادا کر کے ہوٹل سے باہر آ گیا۔

اب میں نوجوان نسل سے مایوس نہیں تھا۔ چراغ ایک ہی جل جائے تو بھی اس کی روشنی بہت سوں کو راستہ دکھا دیتی ہے۔

ﮦﮦﮦ

اختصار

ایک جج صاحب الفاظ کے استعمال میں کنجوسی کی حد تک اختصار سے کام لیتے تھے۔ ایک دفعہ ایک چور ان کی عدالت میں پیش کیا گیا۔

انہوں نے چور سے پوچھا۔ ”کیا چاہتے ہو...... پانچ ہزار یا تین ماہ؟“

چور نے عاجزی سے کہا۔ ”حضور! پانچ ہزار دے دیں۔ مہینے لے کر کیا کروں گا؟“

میں پہچانتا ہوں

ایک معزز شخص سے اس کے غریب دوست نے جو برسوں بعد اسے ملا تھا، پوچھا۔

”کیا تم نے مجھے نہیں پہچانا؟“

معزز شخص نے جواب دیا۔ ”گدھوں کو میں نہیں پہچانتا۔“ اس پر غریب دوست نے برجستہ جواب دیا۔

”لیکن میں پہچانتا ہوں۔“

مرسلہ۔ ریاض بٹ، حسن ابدال

محفلِ شعر و سخن

❁ بینش صدیقی......حیدرآباد
یہ نہیں کہ تیرے فراق میں، میں اجڑ گیا یا بکھر گیا!
ہاں محبتوں پر جو مان تھا، وہ نہیں رہا میرے گمشدہ

❁ وردا، محمد آریز ملک......کراچی
ٹوٹ جاتے ہیں بکھر جاتے ہیں
کانچ کے گھر ہیں مقدر اپنے
اجنبی پیار سے ملتے ہیں سدا
بھول جاتے ہیں تو اکثر اپنے

❁ محمد شہباز اکرم نوئی......ڈھپئی، پاکپتن شریف
دعائے بد نہیں دیتا فقط اتنا کہتا ہوں دلنشیں
کہ جس پہ تیرا دل آئے وہ تجھ سا بے وفا نکلے......

❁ بادیہ ایمان، ماہا ایمان......ڈاہرانوالہ
ہم فقیروں کی صورتوں پہ نہ جا
ہم کئی روپ دھار لیتے ہیں
زندگی کے اداس لمحوں کو
مسکرا کر گزار لیتے ہیں

❁ زرین آفریدی......حیدرآباد
کبھی یاد آئے تو پوچھنا اپنی خلوتِ شام سے
کے عشق تھا تیری ذات سے کسے پیار تھا تیرے نام سے

❁ محمد شہباز ناز......گجر کالونی، شاہ پور، سرگودھا
زخمی ہوئے ہونٹ تو محسوس یہ ہوا
چوما تھا میں نے پھول کو دیوانگی کے ساتھ

❁ محمد کمال انور......اورنگی ٹاؤن، کراچی
ترس جاؤ گے ہمارے لبوں سے سننے کو اک اک لفظ
پیار کی بات تو کیا ہم شکایت بھی نہیں کریں گے

❁ محمد خواجہ......کورنگی، کراچی
رقص کرنے کا ملا حکم جو دریاؤں میں
ہم نے خوش ہو کے بھنور باندھ لیے پاؤں میں
وہ خدا ہے کسی ٹوٹے ہوئے دل میں ہو گا
مسجدوں میں اسے ڈھونڈ نہ کلیساؤں میں

❁ رمضان پاشا......گلشن اقبال، کراچی
اس دنیا میں کون ہمارے آنسو پونچھے گا
جس کو دیکھو اس کا دامن بھیگا بھیگا لگتا ہے

❁ ریاض بٹ......حسن ابدال
شفق لہو میں نہائی سحر اداس ہوئی
کلی نے جان گنوا دی شگفتگی کے لیے

❁ ثنا صادق......اسلام آباد
جنہیں عزیز انا تھی وہ شہر چھوڑ گئے
وہ لوٹ آئیں مگر کس طرح کوئی صورت
چھپائے پھرتے ہیں کتنی کہانیاں ہم بھی
تجھے سنائیں مگر کس طرح کوئی صورت

❁ زوہیب احمد ملک......گلستانِ جوہر، کراچی
دیوانگی ہے یا کوئی معراجِ عشق ہے
ہر شخص تیرے شہر کا تجھ سا لگا مجھے

❁ مدحت...... کراچی

آتا ہے تحریر میں جب لفظِ جدائی
محسوس یہ ہوتا ہے کہ قلم ٹوٹ رہا ہے

❁ اظہر حسین بچار...... ہزاری، جتوئی

اس دیس میں لگتا ہے عدالت نہیں ہوتی
جس دیس میں انسان کی حفاظت نہیں ہوتی
مخلوقِ خدا جب کسی مشکل میں پھنسی ہو
سجدے میں پڑے رہنا عبادت نہیں ہوتی

❁ ایم ایم نسیم...... ایبٹ آباد

کوئی ہاتھ بھی نہ ملائے گا جو گلے ملو گے تپاک سے
یہ نئے مزاج کا شہر ہے ذرا فاصلے سے ملا کرو
کبھی حسن پردہ نشین بھی ہو ذرا عاشقانہ لباس میں
جو میں بن سنور کے کہیں چلوں مرے ساتھ تم بھی چلا کرو

❁ عبدالجبار رومی انصاری...... لاہور

شہر کا شہر چلا آتا ہے پتھر لے کر
اس کی چاہت نے دیوانہ بنا رکھا ہے

❁ جنید احمد ملک...... گلستان جوہر، کراچی

کچھ انوکھے تجھے اندازِ ستم آتے ہیں
ہم تیری بزم سے بادیدہ نم آتے ہیں
سچ تو ہے کہ مہکتی ہے وہ پھولوں کی طرح
جس جگہ آپ کے گل رنگ قدم آتے ہیں

❁ محمد اقبال...... اسلام آباد

دن کا کام تو چل جاتا ہے بوجھل یادوں میں
لیکن رات کٹے گی کیسے آنکھوں آنکھوں میں
اب کے موسم بدلے گا تو لے کر آؤں گا
اس کے بدن کی ساری خوشبو اپنے ہاتھوں میں

❁ احمد حسن عرضی خان...... قبولہ شریف، بائی پاس

اس مقام پہ کل مجھ کو دیکھ کر تنہا
بہت اداس ہوئے پھول بیچنے والے

❁ خواجہ نعیم جاوید...... بھلوال

وہ زمانہ نہیں رہا جاناں
جب بچھڑ کر ملال ہوتا تھا

❁ وزیر محمد خان...... بٹل ہزارہ

خوشیوں کی آرزو میں مقدر بھی سو گئے
ایسی چلی ہوا کہ اپنے بھی کھو گئے

❁ فرقان احمد...... ملتان

قدموں تلے جو ریت بچھی تھی وہ چل پڑی
اس نے چھڑایا ہاتھ تو صحرا بدل گیا
کوئی بھی چیز اپنی جگہ پر نہیں رہی
جاتے ہی ایک شخص کے کیا کیا بدل گیا

❁ دانش عمیر...... کراچی

ہر دم دنیا کے ہنگامے گھیرے رکھتے تھے
جب سے تیرے دھیان لگے ہیں فرصت رہتی ہے
کرنی ہے تو کھل کے کرو، انکارِ وفا کی بات
بات ادھوری رہ جائے تو حسرت رہتی ہے

❁ ریحانہ افتخار...... میرپور خاص

دنیا کے غم ہی اپنے لیے کم نہ تھے کہ اور
دل نے لگا لیا ہے یہ تازہ وبال بھی!
اک سرسری نگاہ تھی، اک بے نیاز چپ
میں بھی تھا اس کے سامنے، میرا سوال بھی!

❁ رضیہ عمیر...... کراچی

جیو تو ایسے جیو زندگی کو رشک آئے
مرو تو موت کہے کون مر گیا یارو

❁ وسیم اکرم...... مہر شاہ، خانیوال

منسوب اس کے قصے اوروں سے بھی تھے لیکن
وہ بات بہت پھیلی، جو بات چلی ہم سے

❁ ڈبلیو ایس...... صادق آباد

اتنے سلیقے سے یاد آتے ہو تم
جیسے بارش ہو وقفے وقفے سے

❁ فرحان شیخ...... پاک کالونی، کراچی

جاتی ہے کسی جھیل کی گہرائی کہاں تک
آنکھوں میں تیری ڈوب کے دیکھیں گے کسی دن
خوشبو سے بھری شام میں جگنو کے قلم سے
اک نظم ترے واسطے لکھیں گے کسی دن

❁ ظفر اقبال ظفر...... کامرہ، شرقی

بقا کی فکر کرو خود ہی زندگی کے لیے
زمانہ کچھ نہیں کرتا کبھی کسی کے لیے

❁ ماہین فاطمہ...... اوکاڑہ

دل میں جب جگہ نہیں بچتی
درد آنکھوں میں پھیل جاتے ہیں

❁ اشفاق شاہین...... لاہور

اس کو کھونے کا بہت دکھ ہے مگر
ہم اس کو پانے کے اسباب کہاں سے لاتے

❁ ملائکہ حریم...... اوکاڑہ

اِک بار پھر میری عیادت کو آ
میں ابھی اچھی طرح سے اچھا نہیں ہوا

❁ داؤد اشفاق...... اوکاڑہ

غمِ یار کے زخموں کو نہ چھیڑ
زباں کھلے گی تو لفظوں سے لہو ٹپکے گا

❁ محمد جاوید بے وفا...... تحصیل علی پور

سینے میں رہ کر کسی اور کے لیے دھڑکتا ہے
دل سے بڑھ کر بے وفا کوئی نہیں ہوتا

❁ مرحا گل، رمنا گل...... درابن کلاں

اِک نگاہ برفیلی سی اِک بول پتھر سا
آدمی مرتا نہیں صرف خون بہہ جانے سے!

❁ مدثر علی...... اوکاڑہ

ہجر کی رات ڈھل گئی محسن
اب تو دل سے کہو سنبھل جائے

❁ بلقیس ریاض...... سیالکوٹ

کتنے مجبور ہیں ہم اپنی انا کے ہاتھوں
ریزہ ریزہ ہوئے اور بکھرتے بھی نہیں

❁ ایم کامران خالد...... اٹک

میں اسے شہرت کہوں یا کہ رسوائی کہوں!
مجھ سے پہلے اس گلی میں میرے فسانے گئے

❁ صادق معاویہ سعیدی...... خان پور، رحیم یار خان

ساری زندگی رکھا ہے بھرم بے فیض رشتوں کا
سچ پوچھو تو اپنے سوا کوئی اپنا نہیں ہوتا

❁ محمد رشید سیال...... روہڑی، ضلع سکھر

ان بارشوں سے دوستی اچھی نہیں فراز
کچا ترا مکان ہے کچھ تو خیال کر

❁ احمد جہانزیب...... ایبٹ آباد

کچھ اپنا ہوش تھا نہ تمہارا خیال تھا
یوں بھی گزر گئی شبِ الفت کبھی کبھی

❁ محمد قمر الزماں صائم...... خوشاب

بربادیوں کا جائزہ لینے کے واسطے
وہ پوچھتے ہیں حال، ہمارا کبھی کبھی

❁ ادریس احمد خان...... ناظم آباد، کراچی

پھر بھی میں خوش ہوں کہ مجھ پر کوئی الزام تو ہے
لب پر تیرے کسی صورت سے ہرا نام تو ہے

❁ جبران احمد ملک...... گلشن اقبال، کراچی

اب وہ منظر نہ وہ چہرے ہی نظر آتے ہیں
مجھ کو معلوم نہ تھا خواب بھی مر جاتے ہیں

❁ محمد عارف...... خانیوال

اک بڑی جنگ کی اس عہد میں تیاری ہے
نہ اٹھے ہم تو یہ تاریخ سے غداری ہے

❁ نعمان راحیل...... لاہور

پاؤں تھک جائیں تو گھر جانے کو جی چاہتا ہے
اور پھر جاں سے گزر جانے کو جی چاہتا ہے

❁ خان افضل...... میانوالی

دن بھر کے بعد کس طرح چہرے ہوئے گلاب
میری طرح تو دھوپ میں کوئی جلا نہ تھا

❁ فیصل علی...... پشاور

کرو نہ غم کہ ضرورت پڑی تو ہم دیں گے
لہو کا تیل چراغوں میں ڈالنے کے لیے

❁ میمونہ رفیق...... سرگودھا

گھر پہ وہ آسیب تھا چہرے سمٹ کر رہ گئے
دور تک بستی میں اپنا کوئی ہمسایہ نہ تھا

❁ شازیہ...... کراچی

الٹ دے بڑھ کے بساطِ نظامِ کارِ جہاں
تو انقلابِ زمانہ کا انتظار نہ کر

چکما

ثمر عباس

خود پر گھمنڈ کرنے اور اونچی اڑان بھرنے والے پنچھی خواہ کتنی ہی بلندی پر چلے جائیں بالآخر لوٹ کر تو پستی کی طرف ہی آنا ہوتا ہے... یہ اور بات کہ بلندی کی دلکشی میں وہ واپسی کا راستہ ہی بھول جائیں مگر ایک ٹھوکر اس بھول کی سزا ضرور دیتی ہے اور ایک دن اس چکما باز کا سارا کروفر بھی دھرا رہ گیا۔

آستین کے سانپ سے دوستوں کی یاری اور ہوشیاری کا دلچسپ ماجرا

"کیا یہ دانش مندی تھی، میرینا؟" اس کے برابر میں بیٹھی ہوئی خاکستری بالوں والی باوقار عورت نے پوچھا۔

میرینا کی نیلی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ "کس دانش مندی کی بات کررہی ہو؟"

"اس کیش بکس کو یہاں باہر لے کر آنا اور اسے یوں بے دھڑک اس گروسری ڈیلیوری مین کے روبرو پورا کھول دینا۔" ہیزل نے اپنے سوال کو واضح کرتے ہوئے کہا۔

"اوہ! میں ایک ایمان دار چہرے کو دیکھتے ہی پہچان

لیتی ہوں اور اس ڈیلیوری مین کے چہرے کو دیکھتے ہی میں نے پہچان لیا تھا کہ وہ ایک ایمان دار شخص کا چہرہ ہے۔"

"ویل، بہر حال......" ہیزل یہ کہتے ہوئے کمرے میں موجود تیسری عورت کی جانب گھوم گئی۔ "جینیفر! کیا تم نے میرینا کو علاقے میں ہونے والی حالیہ وارداتوں کے بارے میں کچھ نہیں بتایا؟"

جینیفر نے اپنے گھنگھرالے بالوں کو سرخ ڈائی کیا ہوا تھا۔ وہ اثبات میں سرہلاتے ہوئے بولی۔ "بے شک، بتا دیا تھا۔ میں سمجھتی ہوں کہ قدرتی طور پر وہ اس چھوٹی سی کیوٹ جگہ کو کرائے پر لینا چاہتی تھی لیکن میرے خیال میں ایک اپارٹمنٹ کمپلیکس زیادہ محفوظ جگہ تھی۔ بالکل ایسی جگہ جیسی کہ تمہاری رہائش گاہ ہے۔ کم از کم وہاں پر تمہاری اور تمہارے پڑوسیوں کی دیواریں مشترکہ تو ہیں۔"

"اور مجھے وہاں ان پڑوسیوں کا شور و غل بھی برداشت کرنا پڑتا ہے۔" میرینا نے کہا۔ "میں ایک ساٹھ سال سے اوپر کی بیوہ ضرور ہوں لیکن میں اپنا خیال خود رکھ سکتی ہوں۔"

"ہم سب ساٹھ سال سے اوپر کی بیوائیں ہیں۔" جینیفر نے کہا۔ "اسی لیے تو یہ بات مجھے اور ہیزل کو پریشان کر رہی ہے۔ برنیٹ ووڈ برگلر کی شکار ہونے والی تمام عورتیں ہماری ہی عمروں کی تھیں!"

"برنیٹ ووڈ برگلر؟" میرینا مسکراتے ہوئے بولی۔ "کیسا احمقانہ نام ہے۔"

اس بات پر ہیزل کی تیوریوں پر بل پڑ گئے۔ "یہ نام مضحکہ خیز ضرور لگتا ہے لیکن حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔ وہ نقدی، جیولری اور دیگر بہ آسانی لے جانے والی قیمتی اشیا لے جاتا ہے اور اسے آج تک کسی نے نہیں دیکھا۔"

"ویل، کم از کم وہ ایک امن پسند اور محتاط چور ہے اور مجھے حقیقت میں بالکل بھی شبہ نہیں کہ وہ ڈیلیوری مین وہی چور ہو سکتا ہے!"

☆☆☆

اپنے اپارٹمنٹ واپس پہنچ کر ہیزل نے اپنے دروازے کا ڈیڈ بولٹ لاک کر دیا۔ احتیاط بے حد ضروری تھی۔ کیا پتا کون کس وقت خلافِ توقع اندر گھس آئے؟

وہ تیز تیز قدموں سے اپنے بیڈروم میں پہنچی، تمام پردے گرا دیے اور ڈریسنگ ٹیبل کی سب سے نچلی دراز نکال دی۔ پھر اس نے خلا میں ہاتھ ڈال کر خفیہ خانہ تلاش کیا اور اس میں چھپا ہوا بھاری بیگ باہر نکال لیا جس میں وہ تمام جیولری موجود تھی جو اس نے گزشتہ پانچ وارداتوں میں چرائی تھی۔

"کاش میں ان میں سے چند قیمتی اشیا فروخت کر سکتی۔" وہ خود سے بڑبڑائی۔ "لیکن میں یہ جرأت نہیں کر سکتی...... کم از کم مقامی طور پر تو ہرگز نہیں۔ مجھے ان سب کو اس ریاست سے باہر لے جانا ہوگا۔ اسی لیے مجھے میرینا کے کیش بکس کی ضرورت ہے۔ بطور ویٹرس اپنی حقیری سی آمدنی سے میں ان عمدہ ملبوسات اور لذیذ کھانوں پر جو مجھے پسند ہیں، کچھ بھی خرچ نہیں کر سکتی۔ چہ جائے کہ سیر و تفریح کے اخراجات!"

ہیزل کی انگلیاں چمکتے دمکتے زیورات کو ٹٹولنے لگیں پھر اس نے ایک سرد آہ بھری۔

یہ برا ہوا کہ میرینا، جینیفر کی دوست تھی لیکن اس بارے میں کچھ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اسے اس طرح اپنی نقدی کی نمائش نہیں کرنی چاہیے تھی۔ اتنی خود اعتمادی اور اتنا اطمینان اچھی بات نہیں تھی اور میرینا کو اس کی عرفیت کا اس طرح مذاق بھی نہیں اڑانا چاہیے تھا، ہیزل نے دل ہی دل میں کہا۔

اسے "دی برنیٹ ووڈ برگلر" کا دیا ہوا نام اب اچھا لگنے لگا تھا۔ اسے یقین تھا کہ اس کا پیارا آنجہانی شوہر اگر زندہ ہوتا تو اسے بھی یہ نام پسند آتا۔

بلاشبہ بطور بانٹ ہینڈ ہیزل اور ایڈی ان دونوں کو اپنے فن میں امتیاز حاصل تھا۔ پھر ایڈورڈ مر گیا اور اسے تن تنہا اس فن کی ادائی پر مجبور ہونا پڑ گیا۔ ایک ماہ کے اندر وہ چوری کرتے ہوئے پکڑی گئی اور اسے جیل ہو گئی۔

جیل سے رہا ہوئے اسے زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ پرانے دنوں کی یادیں اسے ستانے لگیں۔ اسے اپنی زندگی میں روپے پیسوں اور ولولہ انگیزی کی کمی شدت سے محسوس ہونے لگی۔

"ایک اور واردات۔" ہیزل بڑبڑائی۔ "پھر تعطیلات منانے چلی جاؤں گی اور ان خوب صورت جواہرات کے عوض ڈھیروں ڈالرز حاصل کر لوں گی۔"

ہیزل نے دھیرے دھیرے ان جواہرات کو باری باری بیگ میں واپس ڈالنا شروع کر دیا۔ اس کی انگلیوں کو ان جواہرات کا لمس بہت اچھا لگ رہا تھا پھر اس نے وہ بیگ اس کی خفیہ جگہ پر واپس رکھ دیا اور دراز اس کی جگہ پر کھسکا دی۔

آنے والے دن کی شب ریسٹورنٹ میں اس کی چھٹی تھی اور میرینا اور جینیفر نے بھی اس رات ایک میوزیکل شو میں جانا تھا۔ ہاں، بس اسی شب دی برنیٹ ووڈ برگلر اپنا ایک اور وار کرے گا!

☆☆☆

اگلا دن روشن اور خوشگوار تھا۔

ہیزل نے ہلکا پھلکا ناشتا کیا اور صبح کی چہل قدمی کے لیے نکل کھڑی ہوئی۔ پارک میں اس کی مڈبھیڑ جنیفر اور میرینا سے ہوگئی۔

"ہیزل! ہم تم ہی سے ملنے کے متمنی تھے۔" جنیفر تیزی سے اس کے نزدیک آتے ہوئے بولی۔ میرینا اس کے پیچھے پیچھے تھی۔

"ہاں۔" میرینا نے کہا۔ "میں نے آج دوپہر جنیفر کو لنچ پر اپنے گھر مدعو کیا ہے اور ہم چاہتے ہیں کہ تم بھی ہمارے ساتھ شریک ہو۔"

"اوہ!" ہیزل سوچ میں پڑ گئی۔ کیا وہ شرکت سے معذرت کرلے یا...... نہیں، یقیناً نہیں۔ اسے انکار نہیں کرنا چاہیے۔ میرینا کے گھر پر لنچ کرنا اسے اپنے ٹارگٹ کو جانچنے کا ایک اور موقع مہیا کرے گا۔

"کیوں نہیں، شکریہ میرینا!" ہیزل نے ہامی بھرتے ہوئے کہا۔ "میں خوشی خوشی آؤں گی!"

☆☆☆

یہ گیٹ ٹو گیدر بہت شاندار رہی۔ وہ تینوں خوب گپیں لڑاتی رہیں۔ ہیزل اس دوران داخلی دروازے پر لگے ہوئے سستے سے تالے کو پہلے ہی نوٹ کرچکی تھی۔ 'میرینا! تمہیں اس دروازے میں ایک چٹخنی بھی لگانی چاہیے تھی......' ہیزل نے سوچا۔ پھر دل ہی دل میں مسکرانے لگی۔

پھر جب اسے باتھ روم میں جانے کی ضرورت محسوس ہوئی تو اسے گھر میں داخل ہونے کا ایک اور بہتر راستہ دکھائی دیا۔ اسپیئر بیڈروم کی کھڑکی فرش سے صرف دو فٹ اونچی تھی اور باہر کی سمت ایک خالی مکان کی جانب کھلتی تھی۔

پرفیکٹ!

ہیزل چپکے سے اس بیڈروم میں داخل ہوئی، کھڑکی کی چٹخنی کھول دی اور تیزی سے باہر نکل آئی۔ اس نے یہ کام کرنے میں صرف چند سیکنڈ لگائے تھے۔

ایک گھنٹے بعد جب وہ میرینا کے گھر سے روانہ ہوئی تو بے انتہا مطمئن تھی۔ اسے رات کی آمد کا شدت سے انتظار تھا۔

☆☆☆

رات ٹھیک پونے آٹھ بجے ہیزل نے میرینا کی لینڈ لائن کا نمبر ڈائل کیا۔ اسے معلوم تھا کہ اس وقت گھر میں کوئی موجود نہیں ہوگا لیکن پھر بھی یقین کرلینا چاہتی تھی۔

دوسری جانب سے جواب دینے والی مشین آن ہونے پر ہیزل نے فون بند کردیا۔ میوزیکل شو شروع ہونے میں پندرہ منٹ باقی تھے۔ اس وقت تک اندھیرا بھی پھیل جائے گا۔ ہیزل نے سوچا۔

ٹھیک آٹھ بجے ہیزل نکل کھڑی ہوئی۔ اسے میرینا کے چھوٹے سے گھر تک پہنچنے میں چند منٹ لگے۔ وہ گھوم کر میرینا کے گھر کے پہلو میں جا پہنچی۔ میرینا کے اسپیئر بیڈروم کی کھڑکی آسانی سے کھسک گئی اور ہیزل اس کھڑکی کے راستے اندر کود گئی۔

اب کیش بکس کو تلاش کرنا تھا۔

ہیزل نے اپنی فلیش لائٹ آن کی اور ہال سے گزر کر ماسٹر بیڈروم میں جا پہنچی۔ اس روز میرینا ڈیلیوری مین کو رقم دینے کے لیے اسی کمرے میں آئی تھی۔ لہٰذا کیش بکس یقینی طور پر اسی کمرے میں ہونا چاہیے تھا۔

اس دوران اس کی نگاہ میرینا کے جیولری بکس پر پڑ گئی۔ اس نے اس جیولری بکس کی تمام اشیا تکیے کے ایک غلاف میں الٹ دیں اور پھر ڈریسر کی درازیں کھولنا شروع کردیں۔

کیش بکس دوسری دراز میں چند زنانہ نیم جاموں کے نیچے رکھا ہوا تھا۔ "احمق میرینا! اس نے کیش بکس صحیح طور پر چھپا کر بھی نہیں رکھا تھا۔" ہیزل نے دل ہی دل میں کہا۔

ہیزل نے ایک جھٹکے سے کیش بکس کا ڈھکن اٹھادیا اور اس پر سکتے کی سی کیفیت طاری ہوگئی۔

کیش بکس خالی تھا!

عین اسی لمحے کمرا روشنی میں نہا گیا۔ ہیزل تیزی سے گھوم گئی۔ دروازے پر میرینا اور جنیفر کھڑی ہوئی تھیں۔ جنیفر قدرے اداس دکھائی دے رہی تھی جبکہ میرینا کی آنکھوں میں فاتحانہ چمک تھی اور میرینا کے ہاتھ میں ایک ریوالور بھی نظر آرہا تھا۔

"جب میں نے بیڈروم کی کھڑکی کی چٹخنی گری ہوئی پائی تو میں سمجھ گئی کہ تم آج رات ضرور کوشش کروگی، ہیزل!" میرینا نے کہا۔ "یا تم اب بھی ہاٹ ہینڈڈ ہیزل کہلائے جانے کو ترجیح دوگی؟"

"یہ سب کیونکر ہوا؟" ہیزل نے جاننا چاہا۔

"تمہیں شاید علم نہیں کہ جنیفر اور میں کبھی پارٹنر ہوا کرتے تھے۔" میرینا نے کہا۔ "جنیفر چونکہ ریٹائر ہوچکی ہے اور اس سال کے آخر تک میری باری بھی آجائے گی اس لیے میں فی الحال حاضر سروس ہوں اور سب مجھے سراغ رساں سارجنٹ میرینا کولسن کے نام سے جانتے ہیں۔"

ماروی

محی الدین نواب

چھتیسویں قسط

اگر کوئی کائنات کے رمز کو سمجھنے کی سعی کرے تو سب سے پہلے اسے انسان کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ خاموش صحرا کی ویرانی ہو یا پُرجوش لہروں کی روانی... سمندر کی گہرائی ہو یا آسمان کی بلندی... چاند ستاروں کا حسن ہو یا قوسِ قزح کے رنگ... تہ در تہ زمین کی پرتیں ہوں یا بلند آسمان کے سات پردے... ٹھنڈی ہواؤں کے جھونکے ہوں یا بادو باراں کی طوفانی گرج۔ کبھی ہلکی ہلکی بوندوں کی پھوار کا ترنم اور کبھی بجلی کی چمک، کہیں پھولوں کی مہک، کہیں کانٹوں کی کسک... اللہ تعالیٰ نے یہ سب چیزیں اس کائنات میں جگہ جگہ بکھیر دیں اور... ہر شے کو ایک مقام بھی عطا کیا، مگر... جب انسان کو بنایا تو اس پوری کائنات کو جیسے اس کے اندر کہیں چپکے سے بسا دیا اور یہ بھی عجب کھیل ہے کہیں نام یکساں ہیں مگر تقدیریں الگ اور کہیں چہرے حیران کن حد تک ایک جیسے ہیں مگر ان کی تقدیر کا لکھا کہیں ایک دوسرے سے میل نہیں کھاتا۔ اس داستان کی ماروی وہ نہیں جو سندھ کی دھرتی پر عزت و احترام کی ایک علامت کے طور پر جانی جاتی ہے، اسے یہ بھی پتا نہیں کہ اس کا نام ماروی کس نے اور کیوں رکھا... شاید اس کے بڑوں نے سوچا ہو کہ نام کی یکسانیت سے مقدر کی دیوی اس پر بھی مہربان ہو جائے... جدید ماروی بہت عقیدت کے ساتھ اپنی ہم نام پر رشک کرتی ہے... یہ جانتے ہوئے کہ وہ کبھی اس مقام کے قریب بھی نہیں پھٹک سکے گی... ورق ورق، سطر سطر دلچسپی، تحیّر اور لطیف جذبوں میں سموئی ہوئی ایک کہانی جس کے ہر موڑ پر کہیں حسن و عشق کا ملن ہے تو کہیں رقابت کی جلن... آج کے زمانے کے اسی چلن میں رنگین و سنگین لمحات کی لمحہ لمحہ روداد کو سمیٹتے، نئے رنگ و آہنگ کا تحیّر خیز سنگم۔

ایک چہرہ کئی روپ، کبھی چھاؤں کبھی دھوپ، محبت کی عنایتوں، رفاقتوں اور رقابتوں کا ایک دل ربا سلسلہ

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

یہ داستان ہے دورِ جدید کی ماروی اور اس کے عاشق مراد علی منگی کی۔ مراد ایک گدھا گاڑی والا ہے جو اپنے والد اور ماروی، چاچا جمرو اور چاچی فتی کے ساتھ اندرونِ سندھ کے ایک گاؤں میں رہتے تھے، گاؤں کا وڈیرا حشمت جلالی ایک بدنیت انسان تھا جس نے ماروی کا رشتہ دس ہزار نقد کے عوض مانگا تھا، چونکہ ماروی مراد کی منگ تھی اور دونوں بچپن ہی سے ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے لہٰذا وہ اس پر راضی نہیں تھی نتیجتاً انہیں گوٹھ چھوڑنا پڑا۔ مراد جو کہ ثانوی تعلیم یافتہ تھا، وڈیرا حشمت کی منشی گیری کرتا تھا۔ وڈیرا حشمت جلالی اور اس کے بیٹے روایتی ذہنیت کے مالک تھے اور انہوں نے جائیداد بچانے کی خاطر اپنی بیٹی زلیخا کی شادی قرآن سے کردی۔ ماں نے مخالفت کی مگر اس کی ایک نہ چلی۔ زلیخا نے بغاوت کا راستہ اپنایا اور مراد کو مجبور کیا کہ وہ اس کی تنہائیوں کا ساتھی بن جائے۔ مراد تیار نہ ہوا اور ایک رات گزارنے کے بعد اپنے باپ کے ساتھ گاؤں سے غائب ہوگیا۔ گاؤں سے فرار ہوکر یہ دونوں کراچی کے ایک مضافاتی علاقے میمن گوٹھ آگئے جہاں ماروی اپنے چاچا، چاچی کے ساتھ پہلے ہی آچکی تھی۔ یہیں مراد کی ملاقات اتفاقاً محبوب علی چانڈیو سے ہوگئی جو کہ ممبر اسمبلی اور بزنس ٹائیکون، لیکن ہو بہو مراد کا ہم شکل تھا۔ محبوب چانڈیو اپنے ہم شکل کو دیکھ کر حیران ہوا پھر اسے یاد آیا کہ حشمت جلالی جو کہ خود بھی ممبر اسمبلی تھا اس کا ذکر اپنی بیٹی کے قاتل کی حیثیت سے کرچکا تھا۔ اس کے استفسار پر مراد نے اپنی بے گناہی کا اعلان کیا۔ ہوا کچھ یوں تھا کہ مراد کے فرار کے بعد زلیخا نے اپنی ماں کے تعاون سے گاؤں کے ایک اور نوجوان جمال سے شادی کرلی اور خاموشی سے فرار ہوگئی۔ وڈیرے اور اس کے بیٹوں کو پتا چلا تو انہوں نے تلاش شروع کرائی۔ ناکامی پر انہوں نے بے عزتی سے بچنے کے لیے ایک نوکرانی جو کہ زلیخا کے ہی قد کاٹھ کی تھی، بربادکر کے قتل کردیا اور اس کا چہرہ تیزاب سے مسخ کرکے اسے اپنی بیٹی ظاہر کرکے الزام مراد پر لگادیا۔ یہاں شہر میں محبوب جب مراد سے ملا تو اس نے مراد کو اپنے پاس رکھ کر بہترین تربیت دینے کا فیصلہ کیا، ارادہ اسے اپنی جگہ رکھ کر خود گوشہ نشین ہونا تھا۔ محبوب کے سرپرست اس کے والد کے زمانے کے معروف منشی تھے جو اس کے کاروباری معاملات کی دیکھ بھال کرتے تھے۔ انہی کے مشورے پر ایک ماڈل سیمرا کو سیکریٹری کے طور پر رکھا گیا۔ مراد سے ملاقات کے دوران ماروی کی جھلک دیکھ کر محبوب اس پر دل وجان سے مرمٹا لیکن یہ ایک پاکیزہ جذبہ تھا۔ اس نے اپنی مصنوعات کے لیے بطور ماڈل ماروی کو چنا اور مراد کے ذریعے اسے راضی کیا۔ مراد بھی زلیخا کے قاتل کی حیثیت سے گرفتار ہوگیا۔ زلیخا مراد کے بچے کو جنم دے کر دوسرے بچے کی پیدائش کے دوران چل بسی۔ مراد قتل کے مقدمے میں ملوث تھا اور محبوب چانڈیو ماروی کی خاطر اس کے مقدمے کی پیروی کررہا تھا۔ اسی باعث اس کی وڈیرا حشمت سے دشمنی ہوگئی۔ یوں ماروی کے دشمنوں میں اضافہ ہوگیا۔ اسے اغوا کرنے کی کوشش کی گئی جب وہ اپنی سہیلی کی شادی میں شرکت کے لیے گوٹھ گئی، تاہم محبوب چانڈیو اسے بچالایا۔ دوسری جانب جاسوس سیکرٹ ایجنٹ برنارڈ کو رہا کرانے کے لیے اسکاٹ لینڈ سے تین ایجنٹ مرینہ، بہرام اور دارا اکبر آئے۔ مرینہ مراد کو ایک نظر دیکھ کر دل ہار گئی۔ مراد کو مرینہ جیلر باپ کی مدد سے جیل سے باہر نکال لائی اور محبوب اس کی جگہ بند ہوگیا۔ باہر نکل کر مراد مرینہ کی نیت بھانپ کر اسے جھانسا دیتے ہوئے اس کے شکنجے سے فرار ہوگیا۔ ماروی چاچی اور چاچا مرینہ کے ہاتھ لگ گئے۔ مراد نے ماروی کو اس کے چنگل سے آزاد کرالیا۔ لیکن بدقسمتی سے ماروی کے سر میں چوٹ لگی جس کے باعث اس کی یادداشت چلی گئی۔ مراد شہر پہنچ کر جیل میں محبوب سے ملاقات کرکے اسے رازداری کے ساتھ جیل سے واپس جانے پر آمادہ کرکے خود سلاخوں کے پیچھے بند ہوگیا۔ مرینہ اور مراد میں فساد بڑھتا جارہا تھا۔ خطرناک مجرم برنارڈ مراد کے ہاتھوں مارا گیا۔ مرینہ مراد کو ہندوستان لے آئی تھی۔ مراد مرینہ کی قید سے نکل گیا اور ماسٹر کو بھی بو کے ساتھ مل گیا۔ ادھر ماروی کے دوبارہ سر میں چوٹ لگنے سے اس کی یادداشت واپس آگئی۔ مرینہ دوبارہ TMET فیسر بن گئی تھی۔ مراد نے سرجری کے ماہر ڈاکٹر یکی کن سے اپنے چہرے کی پلاسٹک سرجری کروالی۔ ڈاکٹر نے اسے اپنے بچھڑے ہوئے بیٹے ایمان علی کی شکل دے دی۔ ادھر مرینہ انڈیا پہنچ گئی تھی۔ مراد نے اسے قابو کرکے اس کی سرجری کروادی اور ایک انجکشن لگوادیا جس سے اس پر پاگل پن کے دورے پڑنے لگے۔ تاہم اس نے ڈائریکٹر جنرل کو اپنے مرینہ ہونے کا ثبوت دے دیا تھا۔ مراد پاکستان گیا اور ماروی کو لے کر لندن آگیا مگر مرینہ سے مراد کے تعلقات کے بارے میں جان کر ماروی اس سے دور ہوگئی اور پاکستان آگئی۔

ادھر مراد دوبارہ اپنا چہرہ تبدیل کرکے انڈیا پہنچ گیا۔ مرینہ اور مراد میں پھر ان بن ہوگئی۔ ان دونوں میں مقابلہ ہوا۔ مراد اور مرینہ شدید زخمی ہوئے تاہم مرینہ اور مراد میں پھر صلح ہوگئی۔ مراد مرینہ سے نکاح پڑھانا چاہتا تھا مگر کوئی نہ کوئی رکاوٹ آرہی تھی۔ ادھر ماروی سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر لندن پہنچ گئی اور محبوب اور ماروی نے اپنے چہرے سرجری کے ذریعے تبدیل کرالیے۔ مراد نے ماروی کو طلاق نامہ بھجوادیا۔ ادھر ماسٹر مراد کو ڈھونڈنے انڈیا پہنچ گیا۔ تمام تنظیموں کے سربراہ ماسٹر کی موجودگی پر الرٹ ہوگئے اور وہاں خون کی ہولی کھیلی جانے لگی۔ درگا نے مراد کو وہاں سے بحفاظت نکال لیا تاہم بشریٰ اور مرینہ کی لڑائی میں مرینہ سخت گھائل ہوگئی اور اس کی کمر کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ مراد لندن جانے کے لیے جس جہاز میں سوار ہوا اسے ہائی جیک کرلیا گیا۔ وہ طیارہ ریاست باب النساء میں اترتا تاہم مراد نے جان پر کھیل کے ہائی جیکرز کو زیر کرلیا۔

مراد ملکہ نگارا کا مہمان بن گیا۔ ملکہ نے مراد کی باتوں سے اندازہ لگالیا کہ وہ مراد ہی ہے۔ مراد نے بھی قبول کرلیا۔ ادھر مرینہ مراد کے غم میں چل بسی۔ مراد نے ملکہ نگارا سے نکاح پڑھوالیا اور بشریٰ اور بلے کو اپنی سیکرٹ فورس میں شامل کرلیا۔ ماروی کا بھی محبوب سے نکاح ہوگیا۔

مراد اور نگارا میں اختلاف ہوگیا اور یہ اختلاف طلاق پر منتج ہوا۔ مراد برسرِ اقتدار آگیا۔ بابا اجمیری کی دعاؤں سے مراد کو روحانی طاقت حاصل ہوئی اور وہ ایک سے دو ہوگئے یعنی ایک مراد اور دوسرا اس کا ہم زاد۔ دونوں جب چاہتے نادیدہ ہوجاتے۔ مراد نے نادیدہ رہ کر دشمنوں کو

نا کوں چنے چبوائے۔ مراد کو ایک لڑکی ماہ نور بھی پسند آگئی۔ مراد نے اسے اپنی شریکِ حیات بنالیا۔ مراد اور ہم زاد کی نادیدہ صلاحیت ختم ہوگئی اب وہ دونوں اس صورتِ حال پر پریشان تھے۔ ادھر ہم زاد کو اس سے زیادہ اپنی محبوبہ جینی کے پاس نہ جانے کی پریشانی تھی، وہ اس کے بچے کی ماں بننے والی تھی۔ جینی کو ریاست ارضِ اسلام پہنچانے کے لیے جہاز میں سوار کیا گیا مگر حادثاتی طور پر جینی نے بچے کو جنم دیا اور خود جان کی بازی ہار گئی۔ وہ بچہ عجوبہ تھا۔ جینی کی لاش کو جہاز کے ذریعے واپس یہودیوں کے پاس بھیج دیا گیا تھا۔ یہودی اس عجوبہ بچے (عابد علی عرف عابی) کو حاصل کرنا چاہتے تھے اور چاہتے تھے کہ وہ ان کے مذہب پر چلے۔ وقت گزرتا گیا اور عابی دس برس کا ہوگیا۔ دس برس کا ہونے کے باوجود وہ نوجوان لگ رہا تھا۔ غیر معمولی طاقت کا حامل عابی کئی زبانوں پر عبور رکھتا تھا۔ اس کا حافظہ بہت تیز تھا۔ عابی کو یہودیوں نے اغوا کرانے کے لیے اپنے آدمی بھیجے مگر عابی نے ان کو ٹھکانے لگا دیا۔ عابی دو اغوا کاروں کے ساتھ دنیا دیکھنے خود چلا گیا۔ وہ رومانیہ آگیا۔ رومانیہ میں اسے پتا چلا کہ یہودی انسانی اعضا کی خرید و فروخت میں ملوث ہیں۔ مراد نے وہاں موجود اس عمارت کو نیست و نابود کر ڈالا۔ ادھر ہم زاد کے ہاں ایک اور بچے کی ولادت متوقع تھی جو عابی کی طرح عجوبہ تھا۔ دراصل وہ بچہ نہیں بچی تھی۔ مراد نے مشورہ دیا کہ بچی کا نام ماروی رکھا جائے تو زیب النساء محفوظ رہے گی۔ یہ ان کے دل کی بات تھی۔ ادھر اچانک خبر ملی کہ ماروی انتقال کر گئی ہے۔ اچانک زیب النساء کی کوکھ میں تین ماہ کی بچی متحرک ہوگئی تھی۔ مراد نے ماسٹر کو بو بو کی مدد سے اپنا چہرہ تبدیل کرلیا اور حماد کے نام سے اپنے کاغذات تیار کرالیے۔ حماد کے پیچھے شائلہ شانی کی بیٹی تھی تاہم مراد نے اسے باور کرادیا کہ وہ حماد کا ہم شکل ہے۔ ادھر ائرپورٹ پر شائلہ پر حملہ ہوا عابی نے اسے زخمی حالت میں اسپتال پہنچایا۔ عابی کو ایک پولیس افسر اپنے ساتھ لے گیا۔ تاہم پولیس افسر کو عابی سمیت اغوا کیا گیا۔ پولیس افسر مارا گیا۔ مرتے وقت اس نے اپنی بیٹی کی ذمے داری عابی کے سپرد کردی۔ عابی نے ماریہ سے نکاح پڑھالیا۔ عابی کا ایک اور دشمن میدان میں اتر چکا تھا جو لوگوں کے دماغ میں گھس کر ان کے خیالات پڑھ لیتا تھا اور انہیں قابو میں کر کے کچھ بھی کروا سکتا تھا۔ مگر وہ انجان دشمن عابی کے دماغ پر تسلط قائم نہیں کر پا رہا تھا۔ ادھر شادی کی پہلی رات ماریہ چل بسی۔ سب سمجھنے لگے کہ اسے ان تون نے ہلاک کیا ہے۔ ماریہ عابی کی غیر معمولی طاقت کے زیرِ اثر اپنی جان سے گئی تھی۔ ان تون نے یہ جھوٹا بیان دیا کہ ماریہ کو اس نے ہلاک کیا ہے۔ زیب النساء کے ہاں بچی کی ولادت ہوئی جو حیرت انگیز صلاحیتوں کی حامل تھی۔ تاریک دنیا کی ایک لڑکی نیلماں دینِ اسلام کی طرف مائل ہو کر عابی کی مددگار بن گئی۔ وہ جب چاہتی تھی ٹرانسپیرنٹ ہو کے غائب ہو جاتی تھی۔ نیلماں نے عابی کی مدد کر کے ان تون کو پکڑوا دیا تاہم نیلماں کا باپ باروداسے عابی کے شکنجے سے نکال کرلے گیا۔ شیطان کو ماننے والی اور اس کی پرستش کرنے والی لارا نامی عورت نے پھانس کر مراد سے نکاح کرلیا تاہم نیلماں کی بدولت مراد پر اس کی اصلیت کھل گئی۔ ادھر دشمن مراد کے بیٹے شہزاد کو ٹریپ کرنے کی کوشش کر رہے تھے اس مقصد کے لیے انہوں نے شہزاد پر لندن میں حملہ کرایا مگر ناکام رہے۔ لیکن انہی کی ایک آلۂ کار ایی مالا نے شہزاد کو اپنا اسیر بنالیا۔ لارا مراد کے بچے کی ماں بننے والی تھی۔ مراد اپنے ہونے والے بچے کو شیطان کے سائے میں نہیں رکھنا چاہتا تھا۔ نیلماں کو لارا کے متعلق آگہی ملی۔ اس نے مراد کو لارا کے پاس پہنچا دیا۔ لارا نے اپنے بچاؤ کے لیے مراد پر گولی چلائی مگر نیلماں سامنے آگئی۔ ایسے وقت وہ ٹرانسپیرنٹ ہونا بھول گئی تھی۔ لارا غائب ہوگئی اور نیلماں نے دم توڑ دیا۔ زندگی میں پہلی بار مراد ہار گیا تھا۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

مراد زندگی میں بہت کم اس طرح کی بے بسی کا شکار ہوا تھا۔ ایسی شکست ایسی ناکامی برداشت نہیں ہو رہی تھی۔ وہ فرش پر گھونسے مارتے ہوئے چاروں ہاتھ پاؤں سے رینگتے ہوئے بہو کی لاش کے پاس آکر گر پڑا۔

بیٹی جیسی بہو کی موت نے اسے توڑ کے رکھ دیا تھا۔ وہ آنسو بہانا نہیں جانتا تھا مگر اب جی میں آرہا تھا کہ ان لمحات میں کمزور ہوجائے اور دھاڑیں مار مار کر رونے لگے۔ نیلماں کی ہلاکت نے اسے ہلا کر رکھ دیا تھا۔

اس نے فون کے ذریعے عابی کو مخاطب کیا۔ ''بیٹے! بہت المناک خبر سنا رہا ہوں۔ ہماری نیلماں اللہ کو پیاری ہوگئی ہے۔''

عابی کے دل میں ایک گھونسا لگا۔ وہ تڑپ کر بولا۔ ''میں کسی بھی پہلی فلائٹ سے آرہا ہوں۔''

''پہلے اپنے بابا (ہم زاد) کو اطلاع دو۔ ہماری ریاست کا طیارہ اور آدمی یہاں آکر شاہی دستور کے مطابق میری بہو کو لے جائے گی۔ میں اپنی سلامتی کی فکر میں ہوں۔ وہ چڑیل کسی وقت بھی اچانک یہاں آکر مجھ پر گولیاں چلاسکتی ہے۔ میں پھر کسی وقت رابطہ کروں گا۔''

وہ بہت محتاط تھا۔ ایک دیوار سے لگ گیا تھا۔ اچانک ہونے والی فائرنگ سے بچنے کے لیے پوری طرح مستعد تھا۔ ہاتھ میں گن تھی۔ وہ نظر آتے ہی اس کے نشانے پر آسکتی تھی۔

اس نے ماسٹر کو بو بو کو موجودہ حالات بتائے۔ اس نے کہا۔ ''تم وہیں رہو۔ میرے شوٹرز وہاں پہنچ رہے ہیں۔''

وہ بولا۔ ''لارا نے میری موجودہ صورت دیکھی ہے۔ مجھے بھیس بدلنا ہوگا۔ اس کے بعد وہ مجھے ڈھونڈ نہیں سکے گی۔ آپ کسی سرجری کے ماہر سے بات کریں اور کسی دوسرے ملک میں میری رہائش کے انتظامات کریں۔''

ادھر لارا تاریک دنیا میں پہنچ کر قہقہے لگا رہی تھی۔ بے شک وہ قہقہے لگانے اور جشن منانے کی مستحق تھی۔ اس نے ایک بہت بڑے پہاڑ کو گرایا تھا۔ وہ جسے کوئی مات نہیں دے سکتا تھا، اسے مات دے کر اس کے شکنجے سے نکل کر اپنے بچے کے ساتھ صحیح سلامت واپس آگئی تھی۔

اس کے قہقہے رک گئے۔ وہ سوچنے لگی۔ 'میں نے ان کے بہت اہم مہرے کو موت کے گھاٹ اتارا ہے۔ وہ کمینی اچانک آجاتی تھی۔ ٹرانسپیرنٹ ہوجاتی تھی۔ مجھے چھپ کر رہنے پر مجبور کرتی تھی۔ یہ کانٹا ہمیشہ کے لیے نکل گیا ہے۔ میں نے مراد کو بھی گولی ماری تھی لیکن اس نے پلٹ کر حملہ کیا تھا۔ اس کا مطلب ہے، وہ بچ گیا ہے۔ مجھے بچے کے ساتھ رہائی حاصل کرکے اس پر سبقت لے جانے کی خوشی میں وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے۔ یہ سنہری موقع ہے۔ وہ میری نظروں میں آگیا ہے۔ اس پر پھر گولی چلانا چاہیے۔ وہ ابھی اسی بنگلے میں اپنی بہو کا ماتم کررہا ہوگا۔ میں اچانک جاکر تڑاتڑ گولیاں چلاکر واپس آجاؤں گی۔ اسے سنبھلنے اور بچ نکلنے کا موقع نہیں دوں گی۔'

وہ اپنے طور پر درست سوچ رہی تھی۔ مراد جلد ہی بھیس بدلنے والا تھا پھر وہ اسے پہچان نہ پاتی۔ ابھی وہ لکی تھی۔ تقدیر ساتھ دے رہی تھی۔ اس نے پھولے ہوئے پیٹ پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ''میرے بچے! آج کا دن تیرے باپ کے لیے منحوس ہے۔ چل اس کے تابوت پر آخری کیل ٹھونک دیں۔''

اس نے پستول کو دونوں ہاتھوں میں مضبوطی سے پکڑ لیا پھر پلکوں کو جھپکاتے ہی اس بیڈروم میں پہنچ گئی۔ وہاں نیلماں کی لاش پڑی ہوئی تھی۔ وہ نظر نہیں آیا۔ ابھی ہوگا' یقیناً اس بنگلے کے کسی دوسرے کمرے میں ہوگا۔

طاغوتی صلاحیتیں رکھنے والے صرف پلک جھپکنے کے مختصر سے لمحے میں غائب ہوکر کسی دوسری جگہ پہنچ جاتے تھے۔ اس کے بعد غائب نہیں رہ سکتے تھے۔ انہیں چھپنے کے لیے کہیں جانے کے لیے پھر پلکوں کو جھپکنا پڑتا تھا۔

وہ پریشان ہوگئی کہ مراد کی نظروں میں نہ آجائے۔ اس نے پھر پلکیں جھپکائیں پھر غائب ہوکر دوسرے کمرے میں پہنچی اور ایسے پہنچی کہ اچانک ہی سامنا ہوگیا۔ اس کی دہشت ایسی طاری تھی کہ وہ چند ساعتوں کے لیے بوکھلا گئی۔

گن فائٹنگ میں جو پہلے ٹریگر دبا دے، وہی بازی مار کر مردِ میدان کہلاتا ہے۔ وہ مراد سے زیادہ پھرتیلی نہیں ہوسکتی تھی۔ اس نے ایک پاؤں پر گولی ماری۔ وہ چیخ مار کر اچھل کر گرتے گرتے پلکیں جھپکا کر غائب ہوئی اور دوسرے ہی لمحے میں مہاکالی کے مندر کے فرش پر گر پڑی۔

مراد ایک مانا ہوا خطرناک شوٹر تھا۔ اندھیرے میں آواز کی سمت صحیح نشانہ لیتا تھا۔ وہ چاہتا تو لارا وہاں سے زندہ نہ آتی۔ اس نے اپنے بچے کی خاطر اس کے پاؤں میں گولی ماری تھی۔ خیال تھا کہ وہ گولی لگنے کے باعث غائب نہیں ہوسکے گی لیکن ہوگئی تھی۔ اس نے پریشان ہوکر کہا۔ ''لعنت ہے، پھر ہاتھ سے نکل گئی۔ قسمت اس کا ساتھ دے رہی ہے۔''

گولی اس کے ٹخنے کی ہڈی کو توڑ کر گزر گئی تھی۔ گرودیو رگوناتھ کالیا فوراً ڈاکٹر کو بلاکر اس کی مرہم پٹی کرا رہا تھا۔ ڈاکٹر نے کہا۔ ''ہڈی جوڑنے کے لیے کسی بڑے اسپتال میں لے جانا ہوگا۔ یہ ایک آدھ مہینے تک چلنے پھرنے کے قابل نہیں رہے گی۔ یہ حاملہ ہے۔ بڑے مسائل پیدا ہوں گے۔''

وہ مراد کو گالیاں دے رہی تھی۔ خود کو بھی کوس رہی تھی کہ وہ دوسری بار کیوں اس کے سامنے گئی تھی۔ پتا نہیں کتنے عرصے تک اپاہج لنگڑی بن کر رہے گی۔

اس نے خیال خوانی کے ذریعے کاہن کو اپنے موجودہ حالات بتائے اور یہ خوش خبری سنائی کہ اس نے مخبری کرنے والی نیلماں کو مار ڈالا ہے۔

کاہن نے خوش ہوکر کہا۔ ''ایک مسلمان کی گود میں جانے والی نے شیطانِ معظم پر تھوکنے کی بات کی تھی۔ تم نے اسے سزائے موت دے کر دل خوش کردیا ہے۔ دیوتا اہرمن تم سے خوش ہے۔ وہ تمہیں مراد جیسے قوی اور خطرناک دشمن پر حاوی کررہا ہے۔''

کاہن نے یہ خوش خبری آبنوس اور باروا کو سنائی۔ بیٹی کی ہلاکت سے باپ کو صدمہ پہنچا۔ وہ سر جھکا کر آہیں بھرتے ہوئے اسے یاد کرنے لگا۔

آبنوس نے اسپیشل چینل کے ذریعے ساری دنیا کو یہ خبر سنائی کہ پرنس عالی کی دوسری شریکِ حیات بھی چل بسی ہے۔ یہ بڑے فخر سے کہا کہ اس کی ہلاکت کا سہرا لارا کے سر ہے۔ اس نے بڑی دلیری سے مراد جیسے پہاڑ سے مقابلہ کیا ہے۔ اسے زخمی کرکے اس کے چنگل سے نکل آئی ہے۔

یہ سب ہی کو حیران اور متجسس کرنے والی خبر تھی کہ مراد جیسا ناقابلِ شکست فائٹر ایک عورت سے شکست کھا رہا ہے۔ اب سے پہلے بھی وہ لارا کو اپنی گرفت میں نہیں رکھ سکا تھا۔ دوسری بار وہ اپنی بہو کو لارا کے انتقام سے نہ بچا سکا۔

کئی چینلز کے ذریعے نیلماں کی میت کو شاہی دستور

کے مطابق ریاستِ ارضِ اسلام میں لے جاتے ہوئے دکھایا جارہا تھا۔ پرنس عابی اسکرین پر صدمے سے مغموم نظر آرہا تھا۔ اس نے اور مراد نے موجودہ حالات پر نہ کوئی تبصرہ کیا تھا، نہ کوئی بیان دے رہے تھے۔

لوگ تبصرے کررہے تھے کہ ان کی خاموشی شکست خوردگی کے باعث ہے۔ مراد کی فیملی میں پہلی بار ایک ایسی ہستی کی تدفین ہورہی تھی جسے ایک دشمن عورت نے ہلاک کیا تھا۔ شاید اسی لیے باپ بیٹے کے سر جھکے ہوئے تھے۔

یہ بھی کہا جارہا تھا کہ ان کے سر نہ تو شکست خوردگی کے باعث اور نہ ہی شرمندگی کے باعث جھکے ہیں۔ نیلماں ایک بہت ہی پیاری ہردل عزیز ہستی تھی۔ وہ سب اس کی ابدی جدائی کے صدمے سے خاموش تھے۔

یہودیوں کی تو جیسے عید ہوگئی تھی۔ موت کی طرح دھماکے کرنے والوں کو، جو اس پر چھا جانے والوں کو تنہا لارا نے مات دی تھی۔ وہ سب اپنا نام ظاہر کیے بغیر چینل کے ذریعے لارا کو خراجِ تحسین پیش کررہے تھے اور آئندہ اس سے تعاون کرنے کے لیے اسے بڑی سے بڑی آفر دے رہے تھے۔

وہ چینل کے ذریعے کہہ رہے تھے۔ ''لارا! ہم تمہارے دوست اور مددگار ہیں۔ مراد اور عابی جیسے انتہاپسند مسلمانوں کو کچلنے کے لیے ہم دامے، درمے اور سخنے تمہارے ساتھ ہیں۔ پلیز لارا...... ہم سے خیال خوانی کے ذریعے رابطہ کرو۔ ہم یہ یقین دلائیں گے کہ ان باپ بیٹے کے خلاف ہم تمہیں کس قدر وسیع ذرائع اور لامحدود اختیارات کی ملکہ بنادیں گے۔ ہم سے رابطہ کرو اور یقین کرو، تم دنیا کے جس ملک جس علاقے میں جاؤ گی، وہاں تمہاری مطلوبہ رقم، مطلوبہ ہتھیار، خطرناک فائٹرز اور شوٹرز تمہاری خدمت کے لیے حاضر ہوجائیں گے۔''

مراد اور عابی کی حمایت میں کہا جارہا تھا۔ ''یہ کون لوگ ہیں، جو مراد کی فیملی کے خلاف لارا کو شیطانی آفر دے رہے ہیں؟

''یہ سب جانتے ہیں کہ وہ تینوں ٹیلی پیتھی جاننے والے شیطان کے پجاری ہیں۔ کیا وہ بڑی آفر دینے والے شیطانیت کو پھیلانا اور ہمارے مذہب، اخلاق اور تہذیب کو مٹا دینا چاہتے ہیں؟ یہ سمجھ میں آتا ہے کہ بے انتہا دولت دینے والے، اسلحہ سپلائی کرنے والے بہت ہی وسیع ذرائع اور اختیارات کے مالک ہیں اور بہت ہی منظم ہیں اور جب وہ منظم ہیں، طاقتور ہیں تو پھر چھپتے کیوں ہیں؟ وہ آئیں اور ڈنکے کی چوٹ پر لارا کی پشت پناہی کریں۔ ہم دین دھرم والوں کے درمیان آستین کا سانپ بن کر نہ رہیں۔''

ایسی تیکھی اور سخت باتوں کے جوابات نہیں مل رہے تھے۔ کریگ ہوسٹن اور اس کی ٹیم نے خاموشی اختیار کرلی تھی۔ کسی بھی بات کا جواب دینا ضروری نہیں سمجھ رہے تھے۔

لارا نے فتح اور کامیابی حاصل تو کی تھی لیکن مراد نے اسے اپاہج بنا کر اس کے دن رات کا سکون غارت کردیا تھا۔ یہ اندیشہ مسلط رہتا تھا کہ وہ روحانی قوتوں کے ذریعے اس کا سراغ لگا سکتا ہے۔ پہلے کی طرح پھر اچانک اس کی گردن دبوچنے آسکتا ہے۔

وہ فی الحال گرودیو رگھوناتھ کالیا کو بڑی رقوم ادا کررہی تھی اور مہاکالی کے مندر میں محفوظ تھی۔ بچے کی پیدائش سے پہلے اس مندر سے نکل کر کسی اور محفوظ پناہ گاہ میں کسی خوف اور اندیشے کے بغیر رہنا چاہتی تھی۔

وہ اس شخص کے دماغ میں پہنچ گئی جو چینل کے ذریعے بڑی بڑی آفر دے رہا تھا۔ اس نے پوچھا۔ ''کون ہو تم؟ کیوں اتنے وسیع پیمانے پر میرے کام آنا چاہتے ہو؟''

وہ بولا۔ ''میں تمہیں خوش آمدید کہتا ہوں۔ تم بتائے بغیر ہی میرے خیالات خاموشی سے پڑھ کر میری پوری ہسٹری اور ہمارے نیک ارادوں کو معلوم کرلوگی۔ میں تمہیں دعوت دیتا ہوں۔ میرے اندر رہ کر مجھے پڑھو، مجھے سمجھو جب اطمینان ہوجائے تو پھر پورے اعتماد سے بات آگے بڑھے گی۔''

وہ پڑھنے لگی۔ اس شخص کا نام بن زیان تھا۔ وہ ایک یہودی تنظیم دی ڈینجرز پلیئرز کا سربراہ تھا۔ اس تنظیم ٹی ڈی پی کے تمام افراد شطرنج کے کھلاڑی تھے۔ انتہائی پیچیدہ مسائل کو بڑی ذہانت سے حل کرتے تھے وہ کسی بھی دشمن کے سامنے جا کر نہ اس سے تو، تو میں، میں کرتے تھے، نہ اس کے خلاف گن اٹھاتے تھے۔ انتہائی خطرناک شطرنجی چالیں چلتے ہوئے اسے خاک میں ملا دیتے تھے۔

کریگ ہوسٹن اور اس کی ٹیم کے تمام یہودی بن زیان کے دینی بھائی تھے۔ بن زیان صرف لارا سے دوستی کرکے اس کے کام آنا چاہتا تھا اور اس کی ٹیلی پیتھی سے فائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔ پرنس عابی یہودیوں کا قیمتی وقت اور کروڑوں ڈالرز ضائع کرانے کے بعد انہیں ٹھینگا دکھا رہا تھا۔ بن زیان اسے کچلنے کے لیے میدان میں آیا تھا اور لارا کی ٹیلی پیتھی کو اپنا موثر ہتھیار بنانا چاہتا تھا۔

وہ اس کے تمام خیالات پڑھنے کے بعد بولی۔ ''تم

یوگا کے ماہر ہو۔ اپنی سانسیں روک کر مجھے اپنے اندر آنے
سے روک سکتے ہو لیکن تم نے بڑی فراخ دلی سے اپنے تمام
اچھے برے، صحیح وغلط خیالات کو پڑھنے دیا ہے۔ مجھ سے کچھ
نہیں چھپایا ہے۔ تم سچے اور قابلِ اعتماد ہو۔''

''شکریہ...... تو پھر تم مجھ پر اعتماد کر رہی ہو؟''

''ہاں۔ تم نے صاف اور سچی بات کی ہے کہ میرے کام
آؤ گے تو میری ٹیلی پیتھی سے خود بھی فائدہ اٹھاؤ گے۔ اس طرح
لین دین کی بات نہ چھپائی جائے تو اعتماد قائم رہتا ہے۔''

وہ بولا۔ ''پھر یہ کہ میں تم سے ٹیلی پیتھی کے سلسلے میں
تعاون چاہوں گا اور تمہارے ہتھیار کو پرنس عابی کے خلاف
استعمال کروں گا تو اس میں تمہارا بھی فائدہ ہے۔ میں عابی کا سر
کچلنا چاہتا ہوں۔ تم اس کے باپ کو نابود کر دینا چاہتی ہو۔''

''بے شک ہمارے مقاصد اور مفادات مشترکہ
ہیں۔ اب یہ بتاؤ کہ فی الحال میرے لیے کیا کر سکتے ہو؟''

''وہ کر سکتا ہوں، جو کوئی اور نہیں کر سکتا۔ اپنے
مسائل بتاؤ؟''

''پہلا اہم مسئلہ ہے مراد سے چھپ کر رہنا۔ میں
مطمئن تھی۔ پچھلے چھ ماہ سے چھپ کر رہنے میں کامیاب
ہو رہی تھی لیکن وہ اچانک ہی میرے سر پر آپہنچا تھا۔ میں
نے مخبری کرنے والی نیلماں کو مٹی میں ملا دیا ہے۔ پھر بھی
اندیشہ ہے کہ وہ اچانک کبھی موت کی طرح آدھمکے گا۔''

''ہم تمہیں ایک چھوٹے سے جزیرے میں رکھیں
گے۔ اس کے چاروں طرف سمندر میں دن رات مسلح آرمی
ڈیوٹی پر رہے گی۔ مراد آبدوز کشتی کے ذریعے بھی اس
جزیرے کے ساحل تک نہیں پہنچ سکے گا۔ انڈر واٹر
الیکٹرونک سیکیورٹی سسٹم کے ذریعے سمندر کی تہ سے آنے
والوں کو دیکھ لیا جاتا ہے۔''

''اوہ گاڈ! ایسے زبردست انتظامات ہوں گے تو اس
کا باپ بھی مجھے آ کر چھو نہیں سکے گا۔ دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ اس
مردود نے مجھ پر گولی چلائی تھی۔ میرے ایک ٹخنے کی ہڈی
ٹوٹ گئی ہے۔ اس پر پلاسٹر چڑھایا گیا ہے لیکن ڈاکٹر، علاج
اور طبی سہولتیں ایسی نہیں ہیں جیسی میں چاہتی ہوں۔ یہاں
رہوں گی تو مہینوں چلنے پھرنے کے قابل نہیں ہو سکوں
گی۔ میرے لیے کیا کر سکتے ہو؟''

''یہ کوئی پرابلم نہیں ہے۔ یہاں دو چار ماہر تجربہ کار
ڈاکٹر تمہیں دن رات اٹینڈ کرتے رہیں گے۔ زچگی کے
مرحلے سے گزرنے تک تمہارے تمام مسائل حل کرتے
رہیں گے۔ تم اندازہ کر سکتی ہو کہ تمہارے ساتھ کیسا وی آئی
پی ٹریٹمنٹ ہوتا رہے گا۔''

''بے شک مجھے اندازہ ہے اور یقین ہے کہ اس دشمن
سے محفوظ رہ کر اپنے بچے کو جنم دے سکوں گی۔ وہ پیدائش
کے بعد بھی دشمن باپ کی پہنچ سے دور رہے گا۔ بولو کہ یہ
انتظامات کب تک ہو رہے ہیں؟ میں جلد سے جلد اس
جزیرے میں پناہ لینا چاہوں گی۔''

''اس جزیرے کا نام ٹروسیا ہے۔ وہاں کا سرکاری
پیلس وی آئی پی مہمانوں کے لیے خالی رکھا جاتا ہے۔ آج
سے ٹروسیا آئی لینڈ میں کوئی اعلیٰ عہدیدار اور اعلیٰ حاکم بھی
نہیں جائے گا۔ وہ صرف تمہارے لیے ریزرو رہے گا۔ تم
اپنی غیر معمولی صلاحیت کے باعث پلک جھپکتے ہی اس آئی
لینڈ میں پہنچ جاؤ گی۔ ہمیں دو گھنٹے کا وقت دو۔ وہاں کچھ
ضروری اضافی انتظامات کرتے ہی تمہیں کال کروں گا اور
وہاں تمہارے استقبال کے لیے موجود رہوں گا۔''

لارا نے کہا۔ ''پھر تو ہماری ڈیلنگ راز میں نہیں رہے
گی۔ دنیا جانتی ہے کہ آئی لینڈ ٹروسیا یہودیوں کی جاگیر ہے۔
مراد اور عابی پر تمہاری دشمنی کھل جائے گی۔''

''ہاں۔ ہم چاہتے تھے کہ انہیں معلوم نہ ہو لیکن
مجبوری ہے۔ تم اسی جزیرے میں محفوظ رہ سکو گی۔ تمہاری
سلامتی کی خاطر بھید کھلے گا تو وہ باپ بیٹے ہمارے پیچھے
پڑ جائیں گے۔''

''میں تمہاری دوستی اور اس احسان کو کبھی نہیں بھولوں
گی کہ میری سلامتی کی خاطر ان خطرناک لوگوں سے کھلی دشمنی
مول لو گے۔ فکر نہ کرو، تمہیں ایک ٹیلی پیتھی جاننے والی نہیں،
پانچ ٹیلی پیتھی جاننے والے ملیں گے۔''

اس نے حیرانی سے پوچھا۔ ''پانچ......؟''

''ہاں۔ تم لوگ ہم تین ٹیلی پیتھی جاننے والوں سے
واقف ہو۔ ہمارے اور دو (امی مالا اور طاغوتا) خیال خوانی
کرنے والے ہیں۔ تم ان کے مقابلے میں کبھی کمزور نہیں
پڑو گے۔''

وہ خوش ہو کر بولا۔ ''تھینکس گاڈ! پھر تو ہم ان کی
ریاست میں گھس کر ان کا جینا حرام کر دیں گے۔''

''او نو۔ ان کی ریاست میں کبھی نہ جانا۔ میں اور
آبنوس دو بار حرام موت مرنے سے بچ گئے۔ وہاں ان کی
روحانی قوتیں جکڑ لیتی ہیں۔ ہم ٹیلی پیتھی جاننے والے بھی
ادھر کا رخ نہیں کریں گے۔''

''کوئی بات نہیں۔ اس ننھی سی ریاست میں جانا
ضروری نہیں ہے۔ ہم بھی نہیں جائیں گے۔ وہ باپ بیٹے تم

سے نمٹنے کے لیے خود ہی وہاں سے نکل آئیں گے۔ وہ پتا نہیں کتنے عرصے تک تمہیں تلاش کرتے رہیں گے۔ جب بھید کھلے گا کہ تم آئی لینڈ ٹروسیا میں ہو، تب وہ ہم یہودیوں سے دشمنی کریں گے۔ ہماری پوری کوشش ہوگی کہ انہیں تمہاری خفیہ پناہ گاہ کا علم بھی نہ ہو۔"

فی الحال لارا کی قسمت اس پر مہربان تھی۔ اسے بہت ہی مضبوط پناہ گاہ مل گئی تھی۔ آثار کہہ رہے تھے کہ مراد اس کی پرچھائیں تک بھی پہنچ نہیں پائے گا۔

☆☆☆

مراد اور عابی کی طرف سے گہری خاموشی تھی۔ ریاست کے ٹی وی چینل سے خبریں موصول ہوتی تھیں۔ اتنا معلوم ہوا تھا کہ وہاں تین دنوں تک سوگ منایا جائے گا۔ وہ دونوں اپنے محل میں خاموش تھے۔ کوئی بیان نہیں دے رہے تھے۔ نہ ہی لارا کو کسی طرح کا چیلنج کر رہے تھے۔

جو لوگ ان کی طرف سے انتقامی کارروائی کی توقع کر رہے تھے، انہیں مایوسی ہو رہی تھی۔ دشمن کہہ رہے تھے کہ ایک عورت نے ان سمندروں کو جھاگ کی طرح بٹھا دیا ہے۔ آئندہ وہ شرم سے سر اٹھا نہیں سکیں گے۔ دوست کہہ رہے تھے طوفان سے پہلے سمندر خاموش اور پُرسکون رہتا ہے۔ لہٰذا باپ بیٹے کی خاموشی کسی بہت بڑے طوفان کا پیش خیمہ ہے۔ اچانک کوئی بہت بڑا دھماکا ہونے والا ہے۔

ایسا کچھ نہیں ہو رہا تھا۔ وہ باپ بیٹے تین دنوں کے بعد اسپیشل چینل کی اسکرین پر نظر آئے۔ عابی نے ناظرین کو مخاطب کرتے ہوئے سلام کیا پھر کہا۔ "ہم سب کو اللہ تعالیٰ کی رضا پر راضی رہنا پڑتا ہے۔ اگر ہم غلط نہیں ہیں تو اللہ کی طرف سے جو صدمات مل رہے ہیں وہ ہمارے لیے سزا نہیں ہوگی۔ آزمائش ہوگی۔ یہ ہمارے صبر و تحمل کی آزمائش ہے کہ ہم اپنے رب کے انصاف پر کس حد تک ایمان اور اعتماد رکھتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ میری شریک حیات کو ہلاک کرنے والی جہاں بھی ہے، سکون سے نہیں ہے۔ اس کے دن کا چین اور راتوں کی نیندیں اڑ چکی ہیں۔ ہم تین دنوں کے بعد ریاست سے باہر آگئے ہیں۔ وہ بھاگتی اور چھپتی پھر رہی ہوگی اور بھول گئی ہوگی کہ دنیا میں ایسی کوئی جگہ نہیں ہے، جہاں موت نہ پہنچتی ہو۔ لوگو......! اس سے پوچھو، وہ کہاں چھپے گی؟ موت کو تو آنا ہی ہے۔ میں آرہا ہوں۔"

مراد نے اسکرین پر آکر کہا۔ "یہ ایمان اور شیطانیت کی جنگ ہے۔ وہ عورت میرے بچے کو شیطان بنانا چاہتی ہے۔ میں ایسا ہونے نہیں دوں گا۔ ہر حال میں، ہر قیمت پر اپنے بچے کی پرورش دین و ایمان کے مطابق کروں گا۔ فی الحال میری مجبوری یہ ہے کہ وہ چشم زدن میں بھیس بدل لیتی ہے۔ اس کا چہرہ اس کی شخصیت بدل جاتی ہے۔ کوئی اسے پہچان نہیں پاتا۔ فی الحال اس کی دو پہچان ہیں۔ ایک تو یہ کہ وہ سات ماہ کی حاملہ ہے۔ میں نے اس پر گولی چلائی تھی۔ اس کا ایک پاؤں زخمی ہے۔ وہ لنگڑا کر چلتی ہوگی۔ ابھی ان لمحات میں دنیا کی کروڑوں عورتیں حاملہ ہوں گی۔ ان میں سے کچھ عورتیں لنگڑی ہوں گی۔ اگر آپ حضرات اپنے ملک، اپنے شہر اور علاقے کی حاملہ عورتوں پر توجہ دیں گے تو شاید ان میں سے کسی کے اندر وہ چھپی ہوئی ملے گی۔"

تاریک دنیا کے شیطان پرست صرف دین اسلام کے لیے ہی نہیں، دوسرے تمام مذاہب کے لیے بھی چیلنج بن گئے تھے۔ دین دھرم کو ماننے والے ان دشمنوں کے خلاف تحریک چلانے لگے۔ انہوں نے طے کرلیا کہ ایسے دشمنوں کو اپنی دنیا میں رہنے نہیں دیں گے۔

دنیا کے ہر حصے میں ایسی تحریک چلانے والے لارا کو ڈھونڈنے لگے۔ کسی بھی لنگڑی حاملہ عورت کا سختی سے محاسبہ کرنے لگے۔ زمین کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک تمام مائیں بننے والی عورتیں متلاشی نظروں سے گزرنے لگیں۔ لنگڑی اور اپاہج عورتوں کا سختی سے محاسبہ کیا جانے لگا۔

مراد اور عابی نے رابطے کے لیے اپنے فون نمبر بھی دیے تھے تاکہ اچانک کہیں لارا نظر آجائے تو وہ فوراً براہِ راست اطلاع دے سکیں۔

بے شمار جوان عورتوں کو نیلماں کی ہلاکت سے دلچسپی تھی۔ کیونکہ اس کے بعد وہ عابی سے چانس لے سکتی تھیں۔ عابی کی بدقسمتی دو بیویوں کو کھا گئی تھی۔ ایسی المناک ہلاکتوں کے باوجود بے شمار حسینائیں اس کے لیے جنونی تھیں۔

وہ عابی کے پرسنل فون پر بولتی تھیں۔ نیلماں کی ہلاکت پر دلی رنج و غم کا اظہار کر کے اس کی خالی جگہ کو پُر کرنا چاہتی تھیں۔ جواب میں کہا جاتا تھا کہ آپ نیلماں کی نہیں لارا کی بات کریں۔ وہ نظروں میں آئے تو فوراً اطلاع دیں۔

خود غرض اور مطلب پرستوں کے لیے انعام کا لالچ رکھا گیا تھا۔ یہ اعلان کیا گیا تھا کہ جو بھی لارا کو ڈھونڈ نکالے گا، اسے منہ مانگا انعام دیا جائے گا۔ اگر وہ کوئی مجرم ہوگا اور اس نے ناقابلِ معافی جرم کیا ہوگا تو مراد اسے اپنی ریاست میں پناہ اور سلامتی دے گا۔

لارا کو ڈھونڈ نکالنے کی ہر ممکن کوشش کی جارہی تھی۔ حمل کا آٹھواں مہینا بھی گزر گیا۔ یہ حیران کرنے والی بات

تھی کہ کہیں سے اس کی ایک جھلک نہیں مل رہی تھی۔ باروداً آبنوس اور کاہن کا بیان تھا کہ وہ ان کے پاس بھی نہیں آتی ہے۔ ٹیلی پیتھی کے ذریعے بھی رابطہ نہیں رکھتی ہے۔ تاریک دنیا کے پیش امام نے بھی اسپیشل چینل کے ذریعے بیان دیا تھا کہ اس دنیا میں بھی مسلمانوں کو تشویش ہے۔ وہ نہیں چاہتے کہ ایک دین ایمان والے مراد کا بیٹا شیطانی ماحول میں پرورش پائے۔

اس کے دشمن زیادہ تھے۔ دوست تو یہودی ہی تھے۔ ان میں سے صرف ٹی ڈی پی کے سربراہ بن زیان اور اس کے ساتھی جانتے تھے کہ وہ آئی لینڈ ٹروسیا میں سلامتی سے ہے۔ چونکہ وہ فون پر یا چینل کے ذریعے بھی کسی سے نہیں بول رہی تھی اس لیے خیال کیا جارہا تھا کہ شاید مرچکی ہے۔ جو آنکھوں سے دکھائی نہ دے، کانوں سے سنائی نہ دے، جس کی طرف موت کی خاموشی رہے، اسے مردہ ہی سمجھا جاتا ہے۔

مراد کہہ رہا تھا۔ ”شیطان اور اس کی شیطانیت نہیں مرتی۔ لارا زندہ ہے۔ ابھی دنیا میں ایسے کئی ممنوعہ علاقے ہیں جہاں جانے اور تلاش کرنے کی اجازت نہیں دی جارہی ہے۔ میں وہاں تک پہنچ کر رہوں گا۔“

تمام ممالک کے فوجی اڈے اور سیکرٹ سروس کی عمارتیں ممنوعہ ہوتی ہیں۔ وہاں صرف متعلقہ افراد کو جانے کی اور رہنے کی اجازت دی جاتی ہے۔ مثلاً فورٹ ناکس امریکا کا ایک انتہائی پراسرار قلعہ ہے۔ جہاں ہزاروں ٹن کے سونے کا ذخیرہ ہے اور وہاں بے شمار تاریخی ڈاکیومنٹس ہیں۔ یہ بائیس ٹن کے بلاسٹ پروف دروازے کے پیچھے ہے۔ اسے کھولنے کے لیے دس سیکرٹ کوڈ ورڈز دس اعلیٰ عہدیدار جانتے ہیں اور ہر عہدیدار دوسرے عہدیدار کا کوڈ ورڈ نہیں جانتا۔

وہاں کے عہدیدار مراد سے کہہ رہے تھے۔ ”لارا نہ یہاں آئی ہے اور نہ ہم اسے آپ کے خلاف پناہ دیں گے۔“

مراد نے کہا۔ ”وہ آپ حضرات کی مرضی کے خلاف دماغوں پر قبضہ جما کر آپ کو تابعدار بنا کر رہے گی اور آپ بے بس اور مجبور رہیں گے۔“

آخر اسے اجازت دی گئی۔ اس کی طرف سے ماسٹر کوبوبو کے دو ایسے آدمی وہاں گئے جو یوگا کے ماہر تھے۔ لارا انہیں ٹریپ نہیں کرسکتی تھی۔ انہوں نے قلعے کے اندر اور باہر اچھی طرح تلاش کیا پھر ناکام ہو کر واپس آگئے۔

ایریا-51 نویدا میں امریکا کا ایک ٹاپ سیکرٹ ائربیس ہے جو اسی زمین پر ہے لیکن دکھائی نہیں دیتا۔ اس کا نقشہ کسی کاغذ اور کمپیوٹر پر نہیں ہے۔ اول تو کوئی غیر ضروری شخص وہاں تک پہنچ نہیں سکتا، اگر کوئی پہنچ جائے تو بھی واپس نہیں آسکتا۔

لارا ٹیلی پیتھی کا ہتھیار استعمال کر کے وہاں جا کر چھپ سکتی تھی لیکن وہ وہاں بھی نہیں تھی۔ اس دنیا میں چند ایسے مذہبی گروہ ہیں جن کے علاقوں میں دوسرے گروہ کے افراد کو رہنے کی اجازت نہیں دی جاتی۔ چند ایسے جزیرے ہیں، جہاں پراسرار سرگرمیاں جاری رہتی ہیں۔ مراد اور عابی نے وہاں پہنچ کر بھی اسے تلاش کیا اور قدرے مایوس ہوئے۔

اتنی بھاگ دوڑ کے بعد صرف ایک جزیرہ آئی لینڈ ٹروسیا رہ گیا تھا اور اس جزیرے کے مالکان مراد کو وہاں جانے کی اجازت نہیں دے رہے تھے۔ باتیں بنا کر ٹال رہے تھے۔ یوں اسے ٹالنے کے دوران یہ کوشش کررہے تھے کہ لارا کو چند دنوں کے لیے وہاں سے کسی دوسری جگہ منتقل کردیں۔

وہ بری طرح سہمی ہوئی تھی۔ یہ دیکھتی آرہی تھی کہ مراد اس دنیا کے چپے چپے سے اسے ڈھونڈتا ہوا اس جزیرے تک آگیا ہے۔ اب اس جزیرے کے باہر کوئی جگہ چھپنے کی نہیں رہ گئی ہے۔ وہ جہاں جائے گی، گرفت میں آجائے گی۔

اس نے کہا۔ ”میں یہاں سے نہیں جاؤں گی۔ اتنی بڑی دنیا میں یہ آخری زمین، آخری میدانِ جنگ ہے۔ یہیں مقابلہ کرتی ہوئی مرجاؤں گی یا اسے مار ڈالوں گی۔“

بن زیان نے مراد سے کہا۔ ”یور ہائی نس! آپ نے اسرائیل سے کبھی سیاسی وسفارتی تعلقات نہیں رکھے۔ مذہب کے حوالے سے ہمیں اپنا بدترین دشمن کہتے آرہے ہیں۔ لہٰذا ہماری کسی زمین پر آنے اور قدم رکھنے کی بات نہ کریں۔“

مراد نے کہا۔ ”میں صرف ایک بات جانتا ہوں۔ میری مطلوبہ مجرمہ کو اس جزیرے سے نکالو یا مجھے وہاں آنے دو۔ میں اسے ڈھونڈ نکالوں گا۔ تمہارا جھوٹ دنیا کے سامنے آجائے گا۔“

اس نے کہا۔ ”جھوٹ ہوگا تو سامنے آئے گا۔ لارا یہاں نہیں ہے۔ تمہیں جو کرنا ہے، کرلو۔“

مراد نے اقوام متحدہ میں اپیل کی کہ لارا میری بہو کی قاتل ہے اور ان ٹیلی پیتھی جاننے والوں میں سے ہے جو ہماری دنیا کے تمام مذاہب کو ختم کردینا چاہتے ہیں۔ اس مجرم عورت کو جزیرہ ٹروسیا سے گرفتار کر کے اسے میرے حوالے کیا جائے۔

اسرائیلی حکام سے کہا گیا کہ غیر جانبدار سراغ رسانوں کی ایک ٹیم کو جزیرے میں جانے کی اجازت دی جائے یا پھر تسلیم کیا جائے کہ لارا وہاں موجود ہے۔

تب بن زیان نے کہا۔ ''لارا یہاں موجود ہے اور بین الاقوامی قوانین کے مطابق ہم اسے سیاسی و اخلاقی پناہ دے رہے ہیں۔ کوئی ہمیں اس نیک کام سے روک نہیں سکے گا۔''

مذکورہ قوانین کے مطابق مراد سے کہا گیا۔ ''اسرائیلی حکام لارا کو سیاسی و اخلاقی پناہ دے سکتے ہیں۔ آپ وہاں جانے اور اسے نقصان پہنچانے کی ضد نہ کریں۔ اسرائیلی حکام سے دوستی اور سمجھوتا کریں تاکہ امن وامان قائم رہے۔''

مراد نے کہا۔ ''امن وامان تو گیا' تمہارے قوانین ایک مجرم عورت کو پناہ دے رہے ہیں۔ میرا قانون اسے سزائے موت دے گا۔ ہم دیکھیں گے کہ وہ کب تک جزیرے کے پنجرے میں رہے گی۔''

یہودیوں نے چھپ کر عداوت کو جاری رکھنا چاہا تھا لیکن ظاہر ہونا پڑا۔ بن زیان نے کہا۔ ''لارا......! ہم نے تمہاری خاطر ان خطرناک باپ بیٹے سے دشمنی مول لی ہے۔ اگر انہوں نے اچانک حملہ کیا تو کیا ہوگا؟ ڈاکٹر نے کہا ہے آج رات یا کل صبح تک تم ماں بن جاؤ گی۔ ابھی اتنے مسائل سے گزر رہی ہو کہ خیال خوانی کے قابل نہیں ہو۔ ہمیں معلوم ہونا چاہیے کہ وہ دونوں کہاں ہیں اور ہمارے خلاف کیا کر رہے ہیں؟''

لارا زچگی سے پہلے بڑی پیچیدہ بیماریوں سے گزر رہی تھی۔ خیال خوانی کے قابل نہیں رہی تھی۔ اس نے کہا۔ ''مجھے اپنے ٹیلی پیتھی جاننے والے ساتھیوں کو بلانا ہوگا۔ تم کریگ ہوسٹن سے بولو کہ وہ بارودا کو میرے پاس بھیج دے۔''

وہ کریگ ہوسٹن سے رابطہ کرنے لگا۔ لارا سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ زچگی کا وقت قریب آئے گا تو وہ بہت کمزور اور بالکل ہی ناکارہ ہو جائے گی۔ ایسی حالت ہوگئی تھی کہ اس کے تمام تابعدار بننے والے خیال خوانی کی گرفت سے نکل گئے تھے۔ اپنے رب کا شکر ادا کر رہے تھے اور اس پر لعنت بھیج رہے تھے۔

تھوڑی دیر بعد بارودا نے اس کے دماغ میں آکر کہا۔ ''ہائے لارا......! تم نے تو ہمیں بھلا ہی دیا تھا۔ ابھی میں چپ چاپ تمہارے خیالات پڑھ رہا تھا۔ تم اتنی کمزور ہوگئی ہو کہ میری سوچ کی لہروں کو بھی محسوس نہیں کر رہی ہو۔''

وہ تکلیف سے کراہتے ہوئے بولی۔ ''میں نے اب تک اسی لیے اپنے اندر نہیں بلایا تھا کہ تم لوگ صرف کام کی باتیں نہیں کرو گے۔ میرے چور خیالات میرے اندر کے راز بھی معلوم کرو گے۔ آہ......! میں کتنی مجبور ہوگئی ہوں۔ پتا نہیں زچگی کے کتنے دنوں یا کتنے ہفتوں کے بعد خیال خوانی کرنے کے لیے دماغی توانائی حاصل ہوگی۔''

بارودا نے کہا۔ ''ہم پر بھروسا کرو۔ ہم دوست ہیں تمہارے اندر کے راز معلوم کر کے کسی طرح کا نقصان نہیں پہنچائیں گے۔ تمہیں مراد کی پہنچ سے دور رکھنے میں ہمارا بھی فائدہ ہے۔ ہم سب شیطان کو خوش رکھیں گے تو وہ ہمیں دشمنوں پر حاوی کرتا رہے گا۔''

وہ مجبور تھی۔ اسے اپنے ٹیلی پیتھی جاننے والے ساتھیوں پر بھروسا کرنا ہی تھا۔ بارودا کے علاوہ آبنوس' امی مالا اور طاغوتا بھی اس کے دماغ میں آنے والے تھے۔ ہوسکتا تھا آ گئے ہوں۔ اس کے چور خیالات پڑھ لیے ہوں۔ وہ کسی کی سوچ کی لہروں کو محسوس نہیں کر سکتی تھی۔ بہت ہی بے بس اور لاچار ہوگئی تھی۔

بارودا نے کہا۔ ''تم اطمینان رکھو۔ میں اور آبنوس تمہارے دماغ میں نہیں آئیں گے۔ یہاں کچھ لوگوں کو آلۂ کار بنا کر ان کے اندر رہیں گے۔ ان کے ذریعے تم سے باتیں کرتے رہیں گے۔ جب مراد اور عابی جزیرے کی طرف آئیں گے یا دوسرے ذرائع سے خطرہ بنتے رہیں گے تو امی مالا اور طاغوتا کو بھی خیال خوانی کے لیے بلایا جائے گا۔''

''میں آج کل میں اپنے بچے کو جنم دینے والی ہوں۔ دل بہت گھبرا رہا ہے۔ وہ روحانی قوتوں کے ذریعے بھی بلائے ناگہانی کی طرح آ سکتے ہیں۔ ایسے وقت رگھوناتھ کالیا میرے لیے بہت ضروری ہے۔ وہ مجھے کالے جادو کے خطرناک مراحل سے گزارتا رہا تھا۔ نو کنواریوں کے لہو سے غسل کرانا چاہتا تھا۔ میں نے آٹھ کنواریوں کے لہو سے غسل کیا تھا۔ ایک رہ گئی تھی۔ کیا کروں مراد کے خوف سے یہاں آ کر چھپ گئی ہوں۔ میں اس کے کالے عمل سے بڑی توانائی محسوس کر رہی ہوں۔ یہاں اپنے بچے کے ساتھ محفوظ ہوں۔ شیطان نے اور ان کنواریوں کے لہو نے مجھے سلامتی کے لیے یہاں پہنچایا ہے۔ بارودا......! گرو دیو کے پاس جاؤ۔ انہیں میرے حالات بتاؤ۔ مجھے ان کی طرف سے بھی شکتی ملتی رہے گی۔''

بارودا نے فون کے ذریعے رگھوناتھ کالیا سے رابطہ کیا پھر کہا۔ ''میں تاریک دنیا کا باشندہ ہوں۔ لارا کا بزرگ ہوں۔ وہ زچگی کے آخری مراحل سے گزر رہی ہے۔ کمزوری کے باعث خیال خوانی کے ذریعے تم سے

بولنے کے قابل نہیں ہے۔ اگر تم اجازت دو گے تو میں تمہارے دماغ میں آکر اس کے موجودہ حالات بتاؤں گا۔ فون پر طویل گفتگو ممکن نہیں ہے۔"

اس نے کہا۔ "ٹی وی چینلز کے ذریعے مراد اور لارا کا چرچا ساری دنیا میں ہو رہا ہے۔ میں مانتا ہوں کہ وہ کمزوری کے باعث مجھ سے رابطہ نہیں کر رہی ہے۔ وہ مجھے بھلا نہیں سکتی۔ مجھے نظر انداز نہیں کر سکتی۔ اس لیے تمہیں میرے پاس بھیجا ہے۔ ٹھیک ہے، میرے اندر آ سکتے ہو۔"

وہ اس کے اندر آکر بولا۔ "وہ بہت سمجھی ہوئی ہے۔ مراد اسے ڈھونڈتا ہوا جزیرہ ٹروسیا تک پہنچنے والا ہے۔ وہ کمبخت دھن کا پکا ہے۔ ناممکن کو ممکن کر دکھاتا ہے۔ بن زیان جیسے یہودی شاطر اسے قانون کے ذریعے روکنے کی کوششیں کر رہے ہیں۔ ہم ٹیلی پیتھی کے ذریعے لارا کی نگرانی کر رہے ہیں۔ تم سے امید ہے کہ کالے جادو کی شکتی سے اس دشمن کو روک سکو گے۔"

"بے شک میں دو میں سے ایک کام ضرور کر سکوں گا۔ کالی ماتا کی شکتی سے مراد کو موت کے گھاٹ اتار دوں گا۔ اگر ناکامی ہوئی تو اسے بچے تک پہنچنے نہیں دوں گا۔"

بارودا نے کہا۔ "ہم تمام شیطان کے بندے چاہتے ہیں کہ بچہ مسلمان باپ کے سائے میں نہ رہے۔"

"نہیں رہے گا۔ وہ باپ اسے چھو بھی نہیں سکے گا۔ مجھے ایک خطرناک عمل کرنے کے لیے لارا کے قریب اس جزیرے میں رہنا ہوگا۔"

بارودا نے بن زیان سے پوچھا۔ "کیا بلیک میجک کے لیے رگھوناتھ کالیا کو جزیرے میں بلایا جا سکتا ہے؟"

وہ انکار میں سر ہلا کر بولا۔ "یہاں انٹرپول کے سراغ رسانوں کو اور اسرائیل کے معتبر اعلیٰ عہدیداروں کو بھی آنے کی اجازت نہیں دی جاتی۔ سوری، انڈیا کے اس جادوگر سے بولو، وہیں سے اپنے جادوئی کمالات دکھائے۔"

کالیا نے کہا۔ "میں دور رہ کر بھی جادوئی کمالات دکھا سکتا ہوں۔ یہ دعویٰ کرتا ہوں کہ مجھے لارا کے سر کے کچھ بال اور اس کے ناپاک لباس کا ایک ٹکڑا مجھے مل جائے تو میں اس مسلمان باپ کی پاکیزگی اور طہارت کو خاک میں ملا دوں گا۔ اپنے بچے کو حاصل کرنا تو دور کی بات ہے، وہ بھی اسے دیکھ بھی نہیں سکے گا۔"

وہ بڑی ہی غلیظ اور ناگوار چیزیں طلب کر رہا تھا۔ چونکہ ہر پہلو سے بچے کو اور لارا کو محفوظ رکھنا تھا۔ اس لیے اس کا مطالبہ پورا کیا گیا۔ انٹیلی جنس والوں کے ذریعے دوسرے ہی دن اس کی مطلوبہ چیزیں اسے مل گئیں۔

کالیا کو لارا کی ٹیلی پیتھی سے دلچسپی تھی۔ وہ اس کے ذریعے جادوگری کو دو آتشہ بنا سکتا تھا۔ پھر وہ سیاست دان اس لیے بن گیا تھا کہ کسی بھی ملک کا حاکم اعلیٰ بن کر مراد کی طرح عزت اور شہرت حاصل کرنا چاہتا تھا۔

لارا اور بچے کے معاملات میں اسے ایک اچھا موقع مل رہا تھا۔ وہ کالی شکتی سے بچے پر مسلط ہو کر اسے اپنی جادوئی گرفت میں رکھ کر مراد کو کمزور بنا کر اسے بلیک میل کر سکتا تھا۔ اس کی ریاست ارضِ اسلام کا ففٹی پرسنٹ پارٹنر بن سکتا تھا۔ اس کے خاندان کے اہم افراد کو آسانی سے ٹریپ کر سکتا تھا اور اس ریاست میں کالے جادو کے اثرات پھیلا سکتا تھا۔

وہ مراد کی پیدا ہونے والی بیٹی کو ٹریپ کرنے میں ناکام رہا تھا کیونکہ زیب النساء اس کے زیر اثر نہیں آئی تھی۔ اس بار لارا پوری طرح اس سے متاثر تھی اور اس کی شیطانی ہدایات پر عمل کر رہی تھی۔

وہ اس کی ٹیلی پیتھی کے ذریعے بڑی کامیابیاں حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اس کا بچہ جب تک جادوئی شکنجے میں رہتا، تب تک ماں اس کی سلامتی کے لیے گرو دیو کی فرماں بردار بن کر رہتی۔ اس کے مفادات کے لیے خیال خوانی کرتی رہتی۔ اس نے بہت دور تک سوچ رکھا تھا۔ ایک طرف لارا سے دوسری طرف مراد سے بلے کرنا چاہتا تھا۔

ویسے مراد ابھی جزیرے میں آ نہیں سکتا تھا۔ ایک تو چاروں طرف گہرا سمندر تھا۔ چھپ کر آنا ممکن نہیں تھا۔ پھر یہ کہ دن رات مسلح آرمی جدید الیکٹرونک حفاظتی انتظامات کے ساتھ تھی۔ وہ نہ جادو جانتا تھا، نہ وہاں پہنچ سکتا تھا۔

اسے صبر کرنا تھا اور دو طرح کی پلاننگ کرنی تھی۔ ایک تو یہ کہ کسی تدبیر سے جزیرے میں پہنچ جائے۔ دوسرا یہ کہ کسی بھی حکمتِ عملی سے لارا کو وہ جزیرہ چھوڑنے اور وہاں سے نکلنے پر مجبور کر دے۔

عابی ہمیشہ قرآن مجید کی روشنی میں آسمانی ہدایات کو سمجھتا تھا اور سمجھاتا تھا۔ اس نے کہا۔ "بابا جانی! ہم نہیں جانتے لیکن اللہ علیم و خبیر ہے۔ سب جانتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ آپ کے ہونے والے بیٹے کے ساتھ کیا ہونے والا ہے اور وہ چھپنے والی ماں اسے دینی ماحول سے چھین کر اسے چھپا کر رکھ پائے گی یا نہیں؟

"ہم اپنی سی کوششیں کر رہے ہیں۔ وہ اپنی سی کوششیں

کررہی ہے۔ کرنے والا تو اوپر ہے۔ ہم سب اس کے گھیرے میں ہیں۔ اگر وہ پاک پروردگار چاہے گا کہ وہ بچہ اپنی ماں کے طاغوتی ماحول میں پرورش پائے تو وہ پھر وہیں رہے گا۔ اس عالم الغیب کی حکمت عملی وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ سمجھ میں آتی ہے۔"

بیٹے کی باتوں نے باپ کے ذہن سے مایوسی کی دھند ہٹادی۔

وہ اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر عابی سے بولا۔ "بیٹے! تم پر اللہ کی رحمت ہو۔ بے شک ہمیں اپنی ذہانت، توانائی اور حوصلے کی حد تک کوششیں کرنا چاہئیں۔ باقی اللہ پر چھوڑ دینا چاہیے، وہی ایک معبود تاریکی سے روشنی کو خارج کرتا ہے۔

"میرا بیٹا بھی لارا کی گود میں پرورش پائے گا تو یہ میرے رب کی مرضی ہوگی۔ وہی بہتر جانتا ہے۔ وہی بہتری فرماتا ہے۔"

خیالات کچھ بدلنے لگے۔ موجودہ مرحلے میں یہودی اکابرین بھی عداوت کے باوجود ذہانت سے سوچنے لگے کہ مراد اور عابی سے دشمنی مہنگی پڑتی رہے گی۔ وہ لارا کو پناہ دیتے رہیں گے تو صرف ان کے ڈالرز خرچ نہیں ہوں گے ان کی اپنی جانیں بھی ضائع ہوں گی۔

مراد نے اپنے ایک بیان میں بن زیان سے کہا تھا۔ "مجھے میرا بچہ نہیں ملے گا تو تم لوگ بھی اپنے بچوں سے محروم ہوتے رہو گے۔"

یہ ہر ماں باپ کے لیے دل کو ہلا دینے والا چیلنج تھا۔ ماں باپ اپنی جان کو داؤ پر لگا دیتے ہیں۔ بچوں پر آنچ نہیں آنے دیتے۔ مراد کے بیان نے انہیں اندیشوں کی سولی پر چڑھا دیا تھا۔

بچے مسلمانوں کے ہوں یا یہودیوں کے، وہ معصوم ہوتے ہیں۔ اپنی حفاظت اور سلامتی کا تقاضا کرتے ہیں۔ مراد اور عابی سنگدل نہیں تھے۔ وہ بڑوں کا انتقام بچوں سے لینے والے ظالم اور کم ظرف نہیں تھے۔ مراد نے کہا تھا کہ وہ دشمن بھی اپنے بچوں سے محروم ہوسکتے ہیں۔ یہ نہیں کہا تھا کہ وہ ان کے بچوں کو چھین لے گا۔ بدقسمتی ان کے بچوں کو ان سے جدا کرسکتی ہے یا ان بچوں کو ناگہانی حادثات پیش آسکتے ہیں۔ وہ قدرتی آفات میں والدین سے جدا ہوسکتے ہیں۔

لیکن دشمن کے منہ سے نکلی ہوئی بات کو دشمنی سے ہی سمجھا جاتا ہے۔ بدقسمتی سے صیہونی تنظیم کے ایک اعلیٰ عہدیدار ڈی والٹر کے دو ماہ کے بچے کو کسی نے اغوا کرلیا پھر تو جیسے سب ہی کہنے لگے کہ مراد نے جو دھمکی دی تھی، اسی کے مطابق ایک یہودی بچے کو اس نے اغوا کیا ہے۔

ایسے وقت لارا زچگی کے مرحلے سے گزر رہی تھی۔ اس نے ایک بیٹے کو جنم دیا تھا۔ وہ بیمار اور نقاہت کے باعث نیم بے ہوشی کی حالت میں تھی۔ اس نے سنا تھا کہ صیہونی تنظیم کی ایک برانچ کے اعلیٰ عہدیدار ڈی والٹر کے بچے کو انتقاماً اغوا کیا گیا ہے اور یہ کوئی بچوں کا کھیل نہیں ہے۔ کہا جارہا تھا کہ مراد اس بچے کے عوض اپنے بچے کا مطالبہ کرے گا۔

مراد نے بیان دیا۔ "یہ احمقانہ الزام ہے۔ میں نے بچے کو اغوا نہیں کیا۔ یہ ضرور کہوں گا کہ ایک یہودی کو خدا کی طرف سے سزا مل رہی ہے۔ میں دعا کرتا ہوں کہ اس کا بچہ اسے اور میرا بچہ مجھے واپس مل جائے۔"

مراد کے اس بیان کو ذو معنی کہا جارہا تھا۔ یعنی یہ کہا جارہا تھا کہ وہ کھل کر اغوا کرنے کا الزام اپنے سر نہیں لے رہا ہے۔ خدا کے حوالے سے باتیں بنا رہا ہے کہ اس کا بچہ اسے ملے گا تو ڈی والٹر کا بچہ بھی اسے لوٹا دیا جائے گا۔

حقیقت یہ تھی کہ ڈی والٹر کے خاندان میں دشمنی کے باعث ایک عورت اس بچے کو لے گئی تھی۔ ان کے درمیان برسوں سے دشمنی چلی آرہی تھی۔ بظاہر مراد کو الزام دیا جارہا تھا، دوطرفہ شطرنجی چال کے مطابق لارا کو دہشت میں مبتلا رکھا جارہا تھا۔ اس سے کہا گیا تھا کہ وہ اپنے بچے کو مراد کے حوالے کرے گی، تب مراد اس بچے کو واپس کرے گا لیکن یہودی زبان کے پکے ہوتے ہیں۔ ڈی والٹر اپنے بچے کو قربان کردے گا مگر لارا کے بچے کو مراد کے حوالے نہیں کیا جائے گا۔

یہودی خوب الجھانے والی چالیں چلنا جانتے ہیں۔ حالات ایسے تھے کہ اکثریت مراد کو اغوا کا مجرم کہہ رہی تھی اور ایسے حالات میں لارا اپنے بچے کو کلیجے سے لگائے رکھنے کے لیے ان یہودیوں کے شکنجے میں آگئی تھی۔ اس کے ٹیلی پیتھی جاننے والے آبنوس اور بارود ابھی بچے کو طاغوت کے سائے میں رکھنے کے لیے اپنی خیال خوانی کے ذریعے بن زیان کے کام آرہے تھے۔

جن اسلامی ممالک میں یہودیوں کی تجارت کو روک دیا گیا تھا، ان کی بنائی ہوئی مصنوعات کو خریدا نہیں جاتا تھا، وہاں حکمرانوں کو اور بڑے تاجروں کو ٹیلی پیتھی کے ذریعے ٹریپ کیا جارہا تھا اور اپنی مہنگی مصنوعات کی مارکیٹ بنائی جارہی تھی۔

بہرحال مراد کے معاملے میں یہودیوں نے یہ طے

کرلیا تھا کہ ان باپ بیٹے سے دشمنی نہ کی جائے۔ دوست بن کر اپنا الو سیدھا کیا جائے۔ میٹھی چھری بن کر آسانی سے گلا کاٹا جاتا ہے۔

صورت حال یہ تھی کہ ڈی والٹر کے جس بچے کو ایک عورت لے گئی تھی، وہ بچہ دوسرے ہی دن مر گیا تھا۔ عورت کو گرفتار کرلیا گیا تھا لیکن ان باتوں کو نشر نہیں کیا گیا۔ اپنی حکمتِ عملی کے مطابق یہی شبہ ظاہر کیا گیا، لوگوں کو یہی تاثر دیا گیا کہ مراد نے انتقاماً بچے کو اغوا کیا ہے۔

پھر بن زیان نے مراد سے رابطہ کیا اور کہا۔ ''ہم دشمنی اور فساد نہیں چاہتے۔ ہمارے درمیان دوستی اور امن و امان رہنا چاہیے۔ آپ ڈی والٹر کے بچے کو واپس کریں۔ ہم آپ کا بیٹا آپ کے حوالے کردیں گے۔''

مراد نے کہا۔ ''میں اللہ تعالیٰ کو حاضر و ناظر جان کر کہتا ہوں میں نے کسی معصوم بچے کو اغوا نہیں کیا ہے۔ اگر تمہیں یقین ہے کہ میں نے ایسی واردات کی ہے تو ثابت کرو۔ میری سچائی کا ثبوت یہی ہے کہ بچہ میرے پاس ہوتا تو اپنے بیٹے کو حاصل کرنے کے لیے اسے تمہارے حوالے کردیتا۔''

بن زیان نے کہا۔ ''آپ درست کہتے ہیں۔ آپ ڈی والٹر کے بچے کو رکھ کر کیا کریں گے۔ اس کے عوض اپنے بیٹے کو ضرور حاصل کریں گے۔ ہمیں یقین کرنا ہوگا کہ آپ نے اسے اغوا نہیں کرایا ہے۔ ہم اصل مجرم کو تلاش کریں گے۔''

بن زیان اپنے رویے میں لچک پیدا کررہا تھا۔ اس نے خوب سوچی سمجھی پلاننگ کے مطابق کہا۔ ''اصل مجرم کو تلاش کرنے کے سلسلے میں آپ بھی ہماری مدد کریں۔ ہم لارا کو قائل کررہے ہیں کہ وہ کسی بھی شرط پر آپ سے سمجھوتا کرے اور بیٹے کو آپ کے حوالے کرے۔ ہم ایک عورت اور ایک بچے کی خاطر آپس کے امن و سکون کو برباد نہیں کریں گے۔''

مراد نے کہا۔ ''میرا بیٹا مجھے مل جائے گا تو یہ آپ حضرات کی ذہانت اور اعلیٰ ظرفی ہوگی۔ یہودیوں کی طرف سے دوستی کی ایک نئی مثال قائم ہوگی۔''

''ہم ایسا کریں گے۔ آپ سے گزارش ہے کہ اپنے بیٹے کی خاطر لارا سے سمجھوتا کریں۔ اپنے رویے میں لچک پیدا کریں تاکہ وہ اپنا بیٹا آپ کے حوالے کرنے پر راضی ہوجائے۔''

اس نے کہا۔ ''شیطان کی پرستش کرنے والی سے کوئی سمجھوتا نہیں ہوسکتا۔ چونکہ اپنے بیٹے کو دینی ماحول میں رکھنا ہے۔ اس لیے اس کے عوض لارا کو جان کی امان دوں گا۔ یہ ایک مسلمان کی زبان ہے۔ بیٹے کو حاصل کرنے کے بعد بھی اس سے کسی طرح کی عداوت میں پہل نہیں کروں گا۔ وہ درپردہ میرے بیٹے کو گمراہ کرنا چاہے گی، تب میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ ویسے میں جانتا ہوں۔ وہ چڑیل بھی اس بچے سے دست بردار ہونا' اسے میرے حوالے کرنا نہیں چاہے گی۔''

''وہ راضی ہوجائے گی۔ آپ نہیں جانتے۔ اسے بچے سے زیادہ اپنی سلامتی کی فکر ہے۔ وہ سہمی ہوئی رہتی ہے۔ یہ کہتی رہتی ہے کہ آپ بہت خطرناک ہیں۔ کسی دن اس جزیرے میں بھی پہنچ جائیں گے۔ آپ کو روحانی قوتیں حاصل ہوجاتی ہیں۔ اسے چاروں طرف پھیلا ہوا سمندر اور ہماری سیکیورٹی بھی نہیں بچا سکے گی۔''

''اگر وہ سہمی ہوئی ہے، راضی ہوسکتی ہے تو مجھ سے فوراً نیکی کرو۔ بچے کو آج ہی میرے حوالے کرو۔''

''میں ابھی لارا سے بات کرتا ہوں۔''

''اور ایک بات...... میں اپنے بیٹے کو لینے خود وہاں جاؤں گا۔ یہ دیکھوں گا کہ اس جزیرے میں اور کتنے نوزائدہ بچے ہیں۔ مائنڈ نہ کرنا۔ میں دھوکے سے بچنا چاہتا ہوں۔''

''بے شک۔ آپ اطمینان کے لیے اپنے لوگوں کے ساتھ یہاں آسکتے ہیں۔ یہاں سرکاری پیلس میں اور آرمی کے ایک آفس میں ملازمت کرنے والی صرف بیس عورتیں ہیں۔ کوئی بچے والی نہیں ہے۔ اس جزیرے میں صرف آپ ہی کا نوزائدہ بیٹا ہے۔''

ان کے درمیان معاملات طے ہوگئے۔ مراد پورے جزیرے کی تلاشی لینا چاہتا تھا۔ وہاں کوئی دوسرا نوزائدہ بچہ نکل آتا تو پھر شبہ ہوتا کہ دو میں سے کون اس کا اپنا بیٹا ہے۔

لارا کے لیے کوئی جائے پناہ نہیں رہی تھی۔ وہ آخری جزیرہ بھی مراد کی نظروں میں آگیا تھا۔ وہ اپنی سلامتی کی خاطر بچے کو مراد کے حوالے کرنے پر راضی ہوگئی تھی۔

مراد دوسرے دن تین ہیلی کاپٹرز کے ذریعے اپنے پچیس قابل اعتماد لوگوں کے ساتھ اس جزیرے میں پہنچا۔ وہ پچیس افراد ماسٹر کوبو کے معتمدِ خاص تھے۔ انہوں نے وہاں کئی گھنٹوں تک جزیرے کے ہر حصے میں جاکر دیکھا۔ وہاں مسلح فوجی خاصی تعداد میں تھے۔ عورتیں برائے نام تھیں۔ ایک بھی بچہ اور بوڑھا نہیں تھا۔

لارا اپنے بچے کے ساتھ پیلس میں تھی۔ وہ ایک وسیع و عریض ہال میں آرمی کے افسروں کے درمیان سر جھکائے

بیٹھی ہوئی تھی۔ بچہ اس کے سینے سے لگا ہوا تھا۔

مراد بن زیان کے ساتھ وہاں آکر لارا سے کچھ فاصلے پر کھڑا ہو گیا۔ آئی لینڈ آرمی کے کمانڈر نے کہا۔ ”اس وقت کئی ٹی وی چینلز کے ذریعے ساری دنیا یہودیوں کی نیک نیتی اور نیک اعمال کو دیکھ رہی ہے۔ ہم امن و امان قائم رکھنے کے لیے ریاست ارضِ اسلام کے فرماں روا عزت مآب جناب مراد علی منگی اور ان کی سابقہ شریکِ حیات لارا کے درمیان سمجھوتا کرا رہے ہیں۔

”اس سمجھوتے کے مطابق لارا نے ہز ہائی نس کے جس بچے کو جنم دیا ہے۔ اسے آج پوری دنیا کے سامنے اس کے باپ مراد علی منگی کے حوالے کر رہی ہے۔ میڈم لارا......! کیا تم اپنے بچے کو راضی خوشی ہز ہائی نس کے حوالے کر رہی ہو؟“

وہ روتے ہوئے بولی۔ ”کوئی ماں اپنے جگر کے ٹکڑے سے دست بردار نہیں ہوتی۔ مجھے حالات مجبور کر رہے ہیں۔ میں چاہتی ہوں۔ اس بچے کا باپ میرا جانی دشمن نہ رہے۔ میں اس کے خوف سے چھپ کر زندگی نہ گزاروں۔ آزادی سے کھلی فضاؤں میں سانسیں لیتی رہوں اور میرا بچہ بھی ایک ریاست کا شہزادہ بن کر عزت اور شہرت حاصل کرے۔ میں اپنی سلامتی کی خاطر یہ بچہ ابھی اس کے باپ کے حوالے کر رہی ہوں۔“

بن زیان نے آگے بڑھ کر بچے کو لارا کے ہاتھوں سے لیا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ ان لمحات میں یقیناً وہ منظر دیکھنے والی مائیں بھی رو رہی ہوں گی۔ بن زیان نے بچے کو لا کر مراد کی طرف بڑھایا۔ وہ بیٹے کو لے کر چوم کر بولا۔ ”دنیا جانتی ہے کہ تاریک دنیا کے ٹیلی پیتھی جاننے والے شیطان کی پرستش کرتے ہیں اور اس روئے زمین سے مذاہب کو مٹا دینا چاہتے ہیں۔ میں ان لمحات میں پوری دنیا کے سامنے بظاہر ایک ماں سے اس کے بچے کو لے رہا ہوں لیکن حقیقت یہ ہے کہ ایک معصوم ننھے سے وجود کو شیطان کے شکنجے سے نکال چکا ہوں۔ یہ ایمان کے ہاتھوں میں آیا ہے اور ہمیشہ ایمان والا رہے گا۔ میں اپنے بیٹے کے عوض اس کی شیطان صفت ماں کو سلامتی دے رہا ہوں۔ جب تک یہ میرے بیٹے سے دور رہے گی۔ آزادی سے زندہ سلامت رہے گی۔ اگر کبھی چوری سے، مکاری سے اسے حاصل کرنا چاہے گی تو اس کے لیے سزائے موت لازمی ہو جائے گی۔ اس عورت کے لیے اس سے زیادہ اور کچھ نہیں بولوں گا۔ مسٹر بن زیان ان معاملات میں قابلِ تعریف ہیں۔ ان کی نیک خواہشوں سے اور کوششوں سے میرا بیٹا مجھے مل رہا ہے

اور امن و امان بھی قائم ہے۔ تھینک یو مسٹر بن زیان!“

وہ اپنے بیٹے کو سینے سے لگائے پیلس سے باہر آکر ہیلی کاپٹر میں بیٹھ گیا۔ اس کے ساتھ آنے والے ماسٹر کوبو بو کے معتمدِ خاص بھی دوسرے ہیلی کاپٹروں میں وہاں سے روانہ ہو گئے۔

پیلس کے اندر سے مسلح آرمی باہر آگئی۔ وہاں صرف لارا آرمی کا کمانڈر اور بن زیان رہ گئے۔ انہوں نے بالکونی سے دیکھا مراد کا ہیلی کاپٹر پرواز کرتا ہوا دور جا رہا تھا۔ جب وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا تو لارا نے آگے بڑھ کر بن زیان کی گردن میں بانہیں ڈال دیں۔ اس کے ایک گال پر بوسہ لے کر کہا۔ ”میں تمہارا احسان کبھی نہیں بھولوں گی۔ ہمیشہ تمہارے کام آؤں گی۔ مجھے اجازت دو۔ اس کے دودھ کا وقت ہو گیا ہے۔“

یہ کہہ کر وہ پلک جھپکتے ہی غائب ہو گئی۔ دوسرے لمحے میں اپنے بیٹے کے پاس تاریک دنیا میں پہنچ گئی۔ اس نے بڑی ممتا سے چوم کر اسے سینے سے لگا لیا۔

☆☆☆

کیا کیا جائے؟ ہزار احتیاطی تدابیر کے باوجود دھوکا کھانا ہی پڑتا ہے۔ مکاری میں لپٹی ہوئی شرافت اور ذہانت ذہین افراد کو بھی الو بنا دیتی ہے۔ بن زیان نے ایسی چال چلی تھی کہ مراد برسوں تک دھوکا کھانے والا تھا۔

یہ بھید شاید کبھی کھلنے والا نہیں تھا کہ وہ ایک لاوارث بچے کو اپنا بیٹا سمجھ رہا ہے۔ نیلماں کی طرح کوئی مخبر نہیں تھا۔ کوئی یہ جان نہیں سکتا تھا کہ وہ بچہ تاریک دنیا میں شیطانیت کے سائے میں پرورش پانے گیا ہے۔

مگر ہاں...... ایک ماروی تھی جو پیدا ہوتے ہی تاریک دنیا میں پہنچ گئی تھی۔ اس کے بعد بھی وہ نیلماں کے ساتھ وہاں جاتی رہی تھی۔ اب وہ فرفر بولتی تھی۔ دینی تعلیم حاصل کر رہی تھی۔ اس عمر میں بچے بول نہیں پاتے۔ وہ قرآن مجید کا پہلا سیپارہ پڑھنے لگی تھی۔

زیب النساء اور ہم زاد اس کی روحانی صلاحیتوں کو کسی حد تک دیکھتے اور سمجھتے رہتے تھے لیکن جتنا وہ سمجھتے تھے، اس سے زیادہ وہ گہری اور ناقابلِ فہم تھی۔

وہ بہت کم بولتی تھی۔ اکثر مراقبے کی حالت میں رہتی تھی۔ ایک بار وہ ہم زاد کے ساتھ ایک ملک کے سفارت خانے میں گئی۔ اس ملک کا سفیر اسے دیکھتے ہی اس کے سامنے آتے ہی پریشان ہو گیا۔ وہ باپ کی انگلی پکڑے کھڑی ہوئی تھی۔ وہ سفیر کھڑا نہ رہ سکا۔ لڑکھڑا کر فرش پر

گرنے کے انداز میں بیٹھ گیا۔ اس کے ماتحتوں نے اسے سنبھال کر فرش سے اٹھا کر صوفے پر بٹھایا۔ ہم زاد نے پوچھا۔ ''مسٹر جوزف! کیا آپ بیمار ہیں؟ بہتر ہے آرام کریں پھر کسی دن ملاقات ہوگی۔''

وہ سہما ہوا سا مسلسل ماروی کو دیکھ رہا تھا۔ اس نے لرزتی ہوئی آواز اور لہجے میں کہا۔ ''میں جوزف نہیں ہوں۔ ہز ہائی نس! آپ کے احکامات کے مطابق کوئی یہودی اس ریاست میں نہیں آسکتا۔ میں یہودی ہوں۔ میرا نام انتھونی وکٹر ہے۔ یہاں ہمارے سفارت خانے میں مزید دو ملازم یہودی ہیں۔''

وہ بول رہا تھا اور راز کھل رہا تھا۔ وہ عیسائی بن کر وہاں آئے تھے۔ ظاہر ہے کسی نیک مقصد کے لیے نہیں آئے تھے۔ انہیں حراست میں لے کر ان کے خلاف کارروائی کی گئی۔ اس ملک سے سفارتی تعلقات ختم کردیے گئے۔

ایک ننھی سی بچی ملکی اور سیاسی سرگرمیوں اور سازشوں کو بھلا کیا جانے؟ یہ روحانی قوت تھی۔ ماروی کے سامنے آتے ہی وہ فراڈ سفیر خود ہی بول پڑا تھا۔ اس طرح یہ معلوم ہوا کہ ماروی جھوٹ بولنے اور فریب دینے والوں کو پہچان لیتی ہے لیکن بول نہیں پاتی۔ اس کے روبرو آنے والے خود ہی بول پڑتے ہیں۔ اس کے بعد بھی اسے کئی بار آزمایا گیا۔ ماروی کی یہ روحانی صلاحیت سمجھ میں آگئی کہ کوئی بہروپیا اس سے چھپ کر نہیں رہ سکے گا۔ جو غلط ہوتے ہیں انہیں وہ ننھی سی جان پہچان لیتی ہے پھر محل میں آنے والے ایک غلط بچے کو کیسے نہ پہچانتی؟

جب مراد اسے بازوؤں میں اٹھائے سینے سے لگائے محل میں آیا تو ہم زاد، زیب النساء، بشریٰ اور ہلے نے اس بچے کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ مراد کے بیٹے کو سب ہی پیار کرنے لگے۔ ماروی اپنے کمرے میں سو رہی تھی۔ اچانک ہی اس کی آنکھ کھل گئی۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

وہ ایک سمت ایسے دیکھ رہی تھی جیسے محل میں آنے والا وہ ننھا سا وجود نظر آرہا ہو۔ وہ پلک جھپکتے ہی اس کمرے میں پہنچ گئی جہاں وہ بچہ سب ہی کی محبتوں کا مرکز بنا ہوا تھا۔

اس وقت وہ ان کے درمیان آکر نادیدہ تھی۔ کسی کو نظر نہیں آرہی تھی۔ بچے کو پالنے پر لٹا دیا گیا تھا۔ ماروی اس کے قریب آکر اسے دیکھنے لگی۔ اسے وہ دکھائی دیتا تھا' جو دوسرے دیکھ نہیں پاتے تھے۔ اس ننھے کے دائیں طرف کے پھیپھڑے فعال نہیں تھے۔ دل بہت کمزور تھا۔ وہ سفید اجلے کفن میں دکھائی دے رہا تھا۔

وہ بے چارہ بدنصیب تھا۔ پیدا ہوتے ہی ماں نے اسے بن زیان اور لارا کے حوالے کردیا تھا۔ میڈیکل رپورٹ نے بتادیا ہوگا کہ وہ بہت کمزور ہے۔ زیادہ دنوں تک جی نہیں سکے گا۔

وہ جزیرے سے ریاست تک سفر کے دوران میں بیمار رہا تھا۔ ڈاکٹر اسے اٹینڈ کرتے رہے تھے۔ محل میں پہنچ کر وہ کچھ دیر آرام سے رہا تھا پھر کوتاہ دمی کا مسئلہ پیدا ہوگیا تھا۔ اسے آکسیجن دی جارہی تھی۔

ماروی پلک جھپکتے ہی تاریک دنیا میں پہنچ گئی۔ اپنے بھائی کے پاس، مراد کے بیٹے کے پاس آگئی۔ وہ لارا کی گود میں سو رہا تھا۔ کاہن اور باروا اس کے آس پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ باروا کہہ رہا تھا۔ ''بن زیان بہت ہی ذہین اور معاملہ فہم ہے۔ اس نے خوب سوچ سمجھ کر ایک بیمار بچے کو مراد کے حوالے کیا ہے۔''

لارا نے کہا۔ ''وہ کہہ رہا تھا کہ بچہ مراد کے پاس جاکر بیمار رہ کر مرے گا تو وہ اسے تقدیر کا لکھا سمجھ کر برداشت کرلے گا۔''

اس نے بچے کو چھوٹے سے بیڈ پر لٹا دیا۔ ماروی اس کے سرہانے بیٹھ کر اس کا سر سہلانے لگی۔

کاہن نے کہا۔ ''یہ اندیشہ رہے گا کہ تمہارا یہ بیٹا بھی اس کی نظروں میں آسکتا ہے۔''

وہ بولی۔ ''آنے دو۔ وہ اس بچے پر اپنے حقوق نہیں جتا سکے گا۔ میں دوسری شادی کا اعلان کرنے والی ہوں۔ شادی کے دو ماہ بعد اعلان کروں گی کہ ماں بننے والی ہوں۔ سات ماہ بعد معلوم ہوگا کہ میں نے پھر ایک بیٹے کو جنم دیا ہے۔ اسپیشل چینل کے ذریعے کسی نوزائیدہ بچے کو پیش کروں گی۔ جب دو چار برس کے بعد اپنے بیٹے کے ساتھ منظرِعام پر آؤں گی تو یہ مراد کا نہیں دوسرے شوہر کا بیٹا کہلائے گا۔''

کاہن نے کہا۔ ''تمہیں یہی کرنا چاہیے لیکن اسے شبہ ہوگا یا کسی ذریعے سے معلوم ہوجائے گا کہ یہ اس کا اپنا بیٹا ہے تو اسے حاصل کرنے کے لیے پھر تمہاری جان کا دشمن بن جائے گا۔''

''وہ کبھی ثابت نہیں کرسکے گا کہ یہ اس کا بیٹا ہے۔''

''تم بھول رہی ہو۔ ڈی این اے ٹیسٹ کے ذریعے ثابت کرے گا۔ اس نے خود کو اسی طرح پرنس عابی کا باپ ثابت کیا تھا۔''

وہ ذرا چپ رہی پھر پریشان ہو کر بولی۔ ''ہم محتاط رہیں گے۔ مراد کو اس بچے کی ہوا نہیں لگنے دیں گے۔ اسے

ایسی شیطانی تربیت دیں گے کہ یہ کچی عمر سے ہی اپنے باپ اور اس کے دین کے خلاف زہر اگلنے لگے گا۔ میرا پلڑا بھاری رہے گا۔ وہ خود باپ کے سائے میں جانے سے انکار کرتا رہے گا۔ باپ اور بیٹے کے درمیان ایمان اور شیطان کی جنگ جاری رہا کرے گی۔"

اس وقت بچہ آنکھیں کھولے ماروی کو دیکھ رہا تھا۔ وہ مسکرائی تو وہ بھی مسکرانے لگا۔ لارا نے تعجب سے کہا۔ "یہ مسکرا رہا ہے۔ پہلی بار اسے مسکراتے دیکھ رہی ہوں۔ ایسا لگتا ہے کسی نادیدہ پری کو دیکھ رہا ہے۔"

بارودانے پوچھا۔ "اس کا نام کیا رکھو گی؟"

"یہ اپنے باپ سے زیادہ دلیر اور دانشمند ہوگا۔ اس کا نام دلیر یا دانش رکھوں گی۔"

کاہن نے کہا۔ "دونوں ہی رکھو۔ دلیر دانش۔ کبھی دلیر کبھی دانش کہہ کر مخاطب کیا کرو۔ چلو پوجا کا وقت ہو رہا ہے۔ معبد میں چلیں۔"

لارا نے دانش کو بازوؤں میں اٹھا لیا۔ کاہن اور بارودا کے ساتھ عبادت گاہ کی طرف جانے لگی۔ ماروی ان کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ اس نے کئی بار سوچا کہ دانش کو بازوؤں میں لے کر وہاں سے محل میں آجائے۔ بابا جانی کو حقیقت بتائے اور اپنے بزرگوں کو دھوکا کھانے سے بچائے لیکن وہ سوچنے اور ارادہ کرنے کے باوجود ایسا نہ کر سکی۔

اب اس نے معبد میں آکر دیکھا۔ وہاں شیطان کا ایک قد آور مجسمہ تھا۔ انہوں نے دانش کو اس کے قدموں میں لٹا دیا تھا اور سر جھکا کر عبادت میں مصروف ہو گئے۔ کاہن بلند آواز سے جھوم جھوم کر شیطانی کلمات پڑھ رہا تھا۔

ماروی کو یہ دیکھ کر تکلیف ہو رہی تھی کہ اس کا بھائی شیطان کے قدموں میں پڑا ہوا ہے۔ اسے روحانی قوتیں حاصل تھیں۔ اس کے باوجود وہ بھائی کو وہاں سے اٹھا کر نہیں لے جا رہی تھی۔ ایک ہی بات سمجھ میں آرہی تھی کہ کاتب تقدیر نے جو لکھ دیا ہے وہی پیش آتا رہے گا۔ وہ اپنے بھائی کو اس شیطانی ماحول سے نکال کر نہیں لے جا سکے گی۔

لارا ایک گھنٹے بعد دانش کو لے کر اپنی رہائش گاہ میں آگئی اور اس کی ضروریات سے فارغ ہو کر سو گئی۔ تب ماروی نے دانش کو بازوؤں میں لے کر سینے سے لگایا۔ وہاں سے محل میں جانا چاہا لیکن نہ جا سکی۔ یہ سمجھ میں آگیا کہ شیطانی ماحول سے اور اس کی ماں سے اسے دور نہیں کر سکے گی۔

اس کے ذہن میں یہ بات آئی کہ وہ اگر شیطانی ماحول سے اور پوجا پاٹ سے اسے دور نہیں کر سکے گی تو کیا اپنے دین ایمان کے قریب بھی نہیں لا سکے گی؟ ضرور لا سکے گی۔ وہ اپنی سی کوششیں کرتی رہے گی۔

وہ بسم اللہ کہہ کر دانش کے ایک کان پر جھک گئی پھر کلمہ پڑھنے لگی۔

لارا گہری نیند میں تھی۔ ماروی کی مترنم آواز اس کے کانوں تک نہیں پہنچ رہی تھی۔ وہ ان لمحات میں روحانی اثرات کے نتیجے میں غفلت کی نیند سو رہی تھی۔

ماروی نے دانش کے دوسرے کان میں بھی کلمہ پڑھا پھر اسے بستر پر لٹا کر اطمینان کی لمبی سانس لی۔ دل سے جیسے بوجھ اتر گیا تھا۔ اسے شیطانیت کے مقابلے میں ایمان... پروری کا راستہ مل رہا تھا۔ وہ آئندہ بھی بھائی کے میلے وجود کو دھونے کی راہیں نکال سکتی تھی۔

وہ محل میں آکر سوچنے لگی کہ کیا کرے؟ بابا جانی کو فریب خوردگی سے بچانا تھا۔ وہ مراد کے کمرے تک گئی پھر دروازے پر رک گئی۔ اس کے قدم آگے نہیں بڑھے۔ اس نے دروازے پر دستک دینی چاہی تو ہاتھ نہیں اٹھے۔

وہ پیچھے ہٹ گئی۔ بند دروازہ کہہ رہا تھا۔ "واپس جاؤ۔ جو بے خبر ہے، اسے بے خبر رہنے دو۔ بے شمار بندے لاعلمی اور بے خبری کے مراحل سے گزرتے ہیں۔ بابا جانی کو اپنے موجودہ حالات سے گزرنے دو۔"

وہ وہاں سے پلٹ کر آہستہ آہستہ چلتی ہوئی شاہی محل کے منی اسپتال میں آئی۔ وہاں اس لاوارث بیمار بچے کو آکسیجن پر رکھا گیا تھا۔ دو ڈاکٹر اسے توجہ سے اٹینڈ کر رہے تھے۔ زیب النساء، مہ زاد اور مراد کی نیندیں اڑی ہوئی تھیں۔

ماروی کو درس حاصل ہو رہا تھا کہ ایک لاوارث بچے کو دل کی گہرائیوں سے توجہ اور محبت دی جائے۔ اسے بھی شہزاد اور عالی کی طرح شہزادے کے تمام حقوق دیے جائیں۔ اس یقین کے ساتھ کہ وہ کسی شک و شبہے کے بغیر مراد کا بیٹا ہے۔ اس خاندان کا چشم و چراغ ہے اور وہ دکھ بیماری میں پوری توجہ کا مستحق ہے۔

ماروی کو جیسے آگہی مل رہی تھی۔ "خدا نے اس بچے کو بابا جانی کی چھاؤں میں بھیجا ہے تو اس میں کوئی مصلحت ہوگی۔ جب تک خدا کو منظور نہ ہو جب تک بھید نہ کھلے، تب تک دانش کو لارا کے پاس اور اس لاوارث کو بابا جانی کے پاس رہنا چاہیے۔"

وہ تمام بزرگ سمجھ رہے تھے کہ ماروی اپنے کمرے میں سو رہی ہے۔ انہوں نے آہٹ سن کر دیکھا تو وہ دروازے پر کھڑی ہوئی تھی۔ مراد نے آگے بڑھ کر اسے

بازوؤں میں اٹھا کر کہا۔ "آؤ بیٹی! دیکھو یہ تمہارا بھائی ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا کرو۔ یہ دنیا میں آتے ہی بیماریوں اور تکلیفوں میں مبتلا ہو گیا ہے۔"

ایک ڈاکٹر بچے کا معائنہ کر رہا تھا۔ وہ پیچھے ہٹ کر مایوسی سے سر جھکا کر بولا۔ "اب تو صرف دعا ہی رہ گئی ہے۔ دوائیں کام نہیں آ رہی ہیں۔"

وہ مراد کی گود سے اتر کر بچے کے پاس آ گئی۔ اس نے چشم تصور سے اسے سفید اجلے کفن میں دیکھا تھا۔ اس وقت وہ بیڈ پر ساکت پڑا تھا۔ زندگی سے خالی دکھائی دے رہا تھا۔ ماروی نے اس کے قریب آ کر اس کے سر پر ہاتھ رکھا تو اس نے آنکھیں کھول دیں۔

سب نے ایک نئی امید سے اسے دیکھا۔ اس نے ماروی کو دیکھنے کے بعد پھر آنکھیں بند کر لیں۔ جیسے چند لمحوں کے لیے زندگی کی حرارت ملی تھی۔ ڈاکٹر نے اس کے چہرے سے آکسیجن ماسک کو ہٹا دیا۔ اب اسے سانسیں نہیں مل سکتی تھیں۔

ماروی زیر لب ایک آیت پڑھ رہی تھی۔

ماروی اس کے چہرے پر جھک گئی۔ اس کے ننھے سے منہ کو کھول کر اپنا منہ اس پر رکھ دیا پھر ذرا جھٹکے دے دے کر اپنی سانسوں کے جھٹکے چھوڑنے لگی۔

ایک بہن ایک لاوارث بھائی کو منہ لگا کر اپنا پیار دے رہی تھی۔ اپنی سانسوں میں اسے شریک کر رہی تھی۔ سانس کے پہلے ہی جھٹکے میں وہ ننھا سا وجود ہولے سے لرز گیا۔

وہاں جو بیٹھے تھے' وہ حیرت سے اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ جو کھڑے ہوئے تھے، وہ قریب آ گئے۔ بچے نے آنکھیں کھول دی تھیں۔ ایک ڈاکٹر اور ایک لیڈی ڈاکٹر جو اس کا علاج کر رہے تھے اور مایوس ہو گئے تھے، وہ ہاتھ بڑھا کر بچے کو چھو کر دیکھ رہے تھے۔ اس کے بدن میں زندگی کی حرارت تھی۔ ماروی نے اسے سینے سے لگا رکھا تھا اور ٹھہر ٹھہر کر اس کے وجود میں اپنی سانسیں پہنچا رہی تھی۔

لیڈی ڈاکٹر نے بچے کی پشت سے اسٹیتھو اسکوپ لگا کر معائنہ کیا پھر حیرانی سے بولی۔ "وہاٹ اے میراکل......؟ یہ تو معجزہ ہو گیا ہے۔ اس کی سانسیں نارمل ہیں۔"

ڈاکٹر نے بچے کی نبض تھام رکھی تھی۔ اس نے کہا۔ "نو نیڈ آف آکسیجن...... اسے بے بی (ماروی) کی سانسیں اور حرارت مل رہی ہیں۔"

مراد' زیب النساء اور ہم زاد کے چہرے مسرتوں سے کھل گئے۔ وہ بڑی محبت سے بڑی عقیدت سے ماروی کو دیکھ رہے تھے۔ زیب النساء اپنی بیٹی سے آ کر لگ گئی تھی۔ اسے بڑی عقیدت سے بڑے فخر سے چوم رہی تھی۔

آدمی جو سوچتا ہے، جو کرتا ہے، کبھی اس کے برعکس ہو جاتا ہے۔ اس بچے کے متعلق سوچا گیا تھا کہ وہ ماں کے پیٹ میں ہی بیمار ہے۔ پیدا ہوا تو میڈیکل رپورٹ نے کہا' وہ زیادہ دنوں تک نہیں جیے گا۔ ماں باپ نے شاید اس کی اچھی قیمت وصول کر کے اسے بن زیان کے حوالے کیا ہو گا یا ماں باپ نے سوچا ہو گا کہ دولت مند گھرانے میں مہنگا علاج ہو گا تو شاید اسے لمبی زندگی مل جائے گی۔

بن زیان اور لارا نے اس کی بیماریوں کو چھپایا۔ اسے بڑے ڈرامائی انداز میں مراد کے حوالے کر دیا۔ یہ پورا یقین تھا کہ وہ دینی ماحول میں جا کر دم توڑ دے گا۔

سوچا تھا کیا اور کیا ہو گیا۔ اس بیمار اور لاوارث کا روحانی علاج ہو گیا۔ ڈاکٹر نے کہا۔ "اسے نئی زندگی مل رہی ہے۔ دن رات ہماری نگہداشت میں رہے گا تو اسے صحت اور توانائی ملتی رہے گی۔"

آدھی رات گزر چکی تھی۔ ماروی نے کہا۔ "مجھے نیند آ رہی ہے۔ میں بھائی کو اپنے ساتھ سلاؤں گی۔"

ہم زاد نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "ہاں بیٹی! یہ تمہارے پاس رہے گا۔ جب ضروری ہو گا تو ڈاکٹر اسے اٹینڈ کریں گے۔"

اس نے کہا۔ "بابا! میں اس کا نام بولوں؟"

"ہاں۔ تم ہی اس کا نام رکھو۔"

ماروی نے اس ننھے لاوارث کو دیکھا پھر کہا۔ "وارث...... میں اسے وارث کہوں گی۔"

مراد نے مسکرا کر کہا۔ "وارث علی منگی اچھا نام ہے۔ میری بیٹی نے رکھا ہے۔ یہ نام مبارک رہے گا۔"

زیب النساء وارث کو گود میں لے کر ماروی کے ساتھ اس کے کمرے میں آئی پھر اس کے بیڈ پر لٹا کر کہا۔ "یہ میری بیٹی کے سینے سے لگ کر سانسیں لیتا رہے گا۔ میری جان! میں تم پر جتنا بھی فخر کروں کم ہے۔ اب سو جاؤ رات زیادہ ہو گئی ہے۔"

وہ بیٹی کو چوم کر وہاں سے چلی گئی۔ ماروی نے ریموٹ کنٹرولر سے لائٹس آف کیں پھر گہری تاریکی میں وارث کے پاس آ کر لیٹ گئی۔ اب وہ لاوارث نہیں رہا تھا۔ مراد علی منگی کے خاندان کا ایک شہزادہ بن چکا تھا۔

☆☆☆

شہزاد اور امی ملا کی پہلی ملاقات لندن کے

ائرپورٹ میں ہوئی تھی پھر وہ کچھ دنوں تک ایک دوسرے سے مل نہ سکے۔ لندن کی رہائش گاہ میں پہنچتے ہی شہزاد پر حملہ ہوا تھا۔ ٹیلی پیتھی جاننے والوں نے کرائے کے شوٹرز کے ذریعے مراد کے اس بیٹے کو اپنے شکنجے میں رکھنا چاہا تھا۔ عبداللہ کبڈی نے بڑی مہارت سے ان کی کوششوں پر پانی پھیر دیا تھا۔

امی سے فون کے ذریعے رابطہ رہا۔ شہزاد اس کی طرف مائل ہورہا تھا اور وہ اپنی پلاننگ کے مطابق خیال خوانی کے ذریعے اسے اپنی طرف جھکا رہی تھی لیکن اس نے ٹیلی پیتھی کے ہتھیار کو زیادہ استعمال نہیں کیا۔ شہزاد اس کی سوچ کی لہروں کو اپنے دماغ میں محسوس کرکے پریشان ہوجاتا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ دماغ میں ایک بوجھ اور بے چینی سی کیوں محسوس کرتا ہے؟ اور جب وہ اس کے دماغ سے نکلتی تو اسے آرام آجاتا تھا۔ بے چینی اور ناگواری ختم ہوجاتی تھی۔ وہ سمجھ نہیں پاتا تھا کہ پرائی سوچ کی لہریں اس کے اندر آتی جاتی رہتی ہیں۔

مراد نے اسے جرائم کی دنیا سے دور رکھا تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ دشمن کیسی کیسی چالبازیوں سے کسی کو اپنے شکنجے میں لیتے ہیں۔ امی نے سوچا۔ یہ نادان ہے۔ خیال خوانی کی لہروں کو سمجھ نہیں پارہا ہے۔ مجھے اس کے اندر بار بار جاکر نہ اسے پریشان کرنا چاہیے۔ نہ اپنے خلاف شبہے میں مبتلا کرنا چاہیے۔ ذرا ٹھہر ٹھہر کر سہولت سے رومانس کرنا چاہیے۔'

اس نے فون پر پوچھا۔ ''ہائے جانی! تمہاری کوئی گرل فرینڈ نہیں ہے؟''

اس نے کہا۔ ''اب تک نہیں تھی۔ اب شاید ہونے والی ہے۔''

''کون ہے وہ لکی گرل؟''

''یہی جو ابھی بول رہی ہے۔ کیا مجھے لکی بنارہی ہو؟''

وہ ہنسنے لگی۔ اس نے کہا۔ ''میں تم سے ملنا چاہتا ہوں لیکن یہاں آتے ہی ایک مصیبت آگئی تھی۔ پتا نہیں اچانک مجھ سے دشمنی کرنے والے کہاں سے ٹپک پڑے تھے؟''

اس نے بتایا کہ وہ دشمن بابا جانی کے ہیں۔ انہوں نے باپ کے لیے مسائل پیدا کرنے کی خاطر بیٹے پر حملہ کیا تھا۔ تب امی کو معلوم ہوا کہ وہ مراد علی منگی کا بیٹا ہے۔

شیطان کی عبادت گاہ میں بھی کاہن نے اسے شہزاد اور مراد کے متعلق بہت کچھ بتایا تھا۔ اس کے بعد یہ طے پایا کہ آئندہ شہزاد پر شوٹر کے ذریعے حملے نہیں کیے جائیں گے۔ امی اسے بڑے پیار سے اپنا اسیر بنائے گی۔

اسیر بنانے کا سیدھا راستہ تھا۔ وہ شہزاد پر تنویمی عمل کرکے اس کے اندر کی یوگا کی مہارت کو ختم کرسکتی تھی۔ وہ تابعدار بن جانے کے بعد سانس روکنے کی مہارت کو بھول جاتا۔ خیال خوانی کی لہریں اسے بے چین اور پریشان نہ کرتیں اور وہ امی کو پہچانے بغیر اسے اپنے اندر قبول کرتا رہتا۔

ایسے وقت مراد نے بھی کچھ ایسا ہی فیصلہ کیا۔ اس نے عبداللہ کبڈی سے کہا۔ ''شہزاد کو ٹیلی پیتھی جاننے والوں کی گرفت سے بچانے کے لیے یہ لازمی ہوگیا ہے۔ اس کے دماغ کو تنویمی عمل کے ذریعے لاکڈ کرانا ہوگا۔''

کبڈی نے کہا۔ ''ہاں یہی کرنا ہوگا۔ ورنہ دشمن بھی ایسی ہی کوئی چال چل جائیں گے پھر ہمیں معلوم نہیں ہوسکے گا کہ شہزاد ان کے شکنجے میں چلا گیا ہے۔''

دونوں ہی طرف سے شہزاد پر تنویمی عمل کی پلاننگ کی گئی۔ ماسٹر کوبوبو نے کبڈی سے کہا۔ ''کل ایک پناٹزم کا ماہر آئے گا۔ وہ شہزاد کے دماغ کو لاکڈ کردے گا۔''

ادھر امی نے فون پر شہزاد سے پوچھا۔ ''کیا ہم کبھی روبرو نہیں مل سکیں گے؟ کب تک چار دیواری میں قیدی بن کر رہوگے؟ کیا تعلیم جاری رکھنے کے لیے یونیورسٹی نہیں جاؤ گے؟''

اس نے کہا۔ ''صرف کل تک قیدی بن کر رہوں گا پھر آزادی سے یونیورسٹی جاؤں گا اور تم سے ملتا رہوں گا۔''

امی نے پوچھا۔ ''صرف کل تک کی قید کیوں ہے؟ کیا اس کے بعد خطرات ٹل جائیں گے؟''

''ہاں۔ بابا جانی میری حفاظت کے لیے ٹھوس انتظام کررہے ہیں۔ کل ایک پناٹائز کرنے والا آئے گا پھر میرے دماغ کو لاکڈ کردے گا۔ اس کے بعد کوئی ٹیلی پیتھی جاننے والا دشمن کبھی میرے اندر نہیں آسکے گا۔''

امی کے دماغ کو جھٹکا سا لگا۔ مراد بھی اسی پلاننگ پر عمل کرانے جارہا تھا' جس پر وہ عمل کرنے والی تھی۔ اس نے بظاہر خوش دلی سے کہا۔ ''یہ تو زبردست آئیڈیا ہے۔ تمہارے بابا جانی بہت ہی ذہین ہیں۔ دشمنوں کو کمزور بنانا اور مات دینا جانتے ہیں۔ یہ ہمارے لیے بہتر ہوگا۔ تم کل کے بعد مجھ سے کسی خوف اور اندیشے کے بغیر ملتے رہوگے۔''

انسان کی زندگی میں کل کبھی نہیں آتا۔ وہ آتے آتے آج ہوجاتا ہے۔ جو ہوتا ہے' وہ آج ہی ہوتا ہے۔ امی نے کل آنے نہیں دیا۔ اسی رات شہزاد کے دماغ میں پہنچ گئی۔ وہ گہری نیند میں تھا۔ پرائی سوچ کی لہروں کے باعث بے چینی محسوس کررہا تھا۔ اس کی نیند ٹوٹنے والی تھی۔ اس سے

پہلے ہی اس نے دماغ کی چار دیواری میں زلزلہ پیدا کیا۔ اپنی سوچ کی لہروں کے ذریعے ایک شدید ضرب لگائی۔ وہ تکلیف کی شدت سے چیخیں مارتے ہوئے اٹھ کر بیٹھ گیا۔

امبی نے اس کی چیخوں کو ابھرنے نہیں دیا۔ اس پر حملہ کرتے ہی اسے منہ کو سختی سے بند رکھنے پر مجبور کر دیا۔ وہ پہلے کبھی ایسی دماغی تکلیف سے نہیں گزرا تھا۔ اس دماغی جھٹکے نے اسے یکلخت کمزور کر دیا۔ وہ بیٹھنے کے بعد پھر تکیے پر گر پڑا۔ اس پر نیم بے ہوشی طاری ہو رہی تھی۔ وہ سوچنے کے قابل نہیں رہا تھا کہ اس کے ساتھ کیا ہو رہا ہے؟ اور کون ایسا کر رہا ہے؟

اب اس کے اندر امبی کی سوچ بول رہی تھی۔ ''ایزی مائی ڈیئر! ایزی۔ یہ تم پیار کے مرحلے سے گزر رہے ہو۔ ابھی آرام آجائے گا۔ میں تمہارے دماغ کو تھپک رہی ہوں۔ تم نہیں جانتے میں کون ہوں؟ اور جاننا بھی نہیں چاہیے۔ میں ایک پراسرار ملکہ ہوں، آج سے تم میرے غلام بن کر رہو گے۔''

وہ بول رہی تھی اور اس کے دماغ کو تھپک رہی تھی۔ جلد ہی دماغی تکلیف کم ہو گئی۔ اب وہ کمزوری کے باعث سانسیں روکنے کے قابل نہیں رہا تھا۔

وہ بول رہی تھی۔ ''تم اسی طرح آنکھیں بند کیے آرام سے لیٹے رہو گے۔ اپنے گھر کو اپنے ماحول کو نہیں دیکھو گے۔ صرف میری باتیں سنتے رہو گے۔ ان باتوں کو تسلیم کرتے رہو گے اور ان پر عمل کرتے رہو گے۔''

اس کی باتیں شہزاد کو متاثر کر رہی تھیں۔ اس پر مسلط ہو رہی تھیں۔ وہ بڑے اعتماد سے تنویمی عمل کر رہی تھی۔ ''ان لمحات میں تمہارے اندر کوئی سوچ نہیں ہے۔ صرف میری سوچ کی لہریں ہیں اور مکان اسی کا ہوتا ہے، جو اس کے اندر رہتا ہے۔ یہاں میری سوچ کا قبضہ ہے۔ اس لیے یہ دماغ میرا ہے۔

''تم اس دماغ کے تابع ہو۔ میری سوچ کی لہریں جو حکم دیا کریں گی تم اس پر تابعداری سے عمل کرتے رہو گے۔''

اس کا کمزور دماغ امبی کی گرفت میں آچکا تھا وہ اور کچھ سوچنے سمجھنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ اس نے حکم دیا۔ ''بولو میں تم پر حاوی ہو چکی ہوں؟''

وہ سحر زدہ ہو کر بولا۔ ''ہاں۔ مجھے تم ہی تم دکھائی دے رہی ہو لیکن تمہارا کوئی چہرہ نہیں ہے۔''

''میں خیال خوانی کی ملکہ ہوں۔ میری سوچ تمہیں سنائی دے گی۔ صورت بھی دکھائی نہیں دے گی۔ بولو کہ تم کبھی کسی سے میرا ذکر نہیں کرو گے۔''

اس نے تابعدار بن کر کہا۔ ''میں کبھی کسی سے تمہارا ذکر نہیں کروں گا۔''

''بولو کہ تم اپنے باپ مراد کو اور بھائی عابی کو اور دوسرے اہم رازداروں کو یہ شبہ نہیں ہونے دو گے کہ میرے زیر اثر رہا کرتے ہو۔ تم اپنی جان کی طرح مجھے اپنے اندر چھپا کر رکھو گے۔''

''میں تمہیں اپنی جان کی طرح اپنے اندر چھپا کر رکھوں گا۔ کسی کو شبہ نہیں ہونے دوں گا کہ تمہارے زیر اثر آگیا ہوں۔ اپنے باپ کو، بھائی کو اور کسی رازدار کو شبہ نہیں ہونے دوں گا۔''

''کیا تم فلرٹ ہو۔ لڑکیوں سے دوستی کرتے ہو؟''

اس نے جواب دیا۔ ''ہاں۔ دو لڑکیوں سے دوستی ہوئی تھی۔ میں دل سے دوستی چاہتا تھا۔ وہ جسمانی دوستی چاہتی تھیں اس لیے ان سے دور ہو گیا۔''

''کیا آئندہ کسی سے دوستی نہیں کرو گے؟''

''یہی سوچا تھا لیکن امبی مالا نامی لڑکی بہت اچھی لگ رہی ہے۔ آخری بار اس لڑکی سے دوستی کر کے دیکھوں گا اور چاہوں گا کہ وہ شادی سے پہلے صرف رومانس کرے۔''

''میں حکم دیتی ہوں تم امبی مالا سے ملتے رہو گے اور جلد از جلد اس سے شادی کرو گے۔''

اس نے کہا۔ ''میں امبی مالا سے جلد از جلد شادی کروں گا۔''

''اگر مراد اور عابی اعتراض کریں گے، تمہیں امبی مالا سے دور کرنا چاہیں گے تو تم امبی کی طلب سے باز نہیں آؤ گے۔ اس سے چور رشتہ قائم رکھو گے۔ اس سے اپنی اولاد پیدا کراؤ گے۔''

''میں امبی مالا کی طلب سے باز نہیں آؤں گا۔ اگر اس سے رشتہ نہ کرنے دیا گیا تو چور رشتہ قائم کروں گا۔ امبی کو اپنے بچوں کی ماں بناؤں گا۔''

''میں حکم دیتی ہوں۔ ابھی سکون سے سو جاؤ۔ بیدار ہونے کے بعد بھول جاؤ کہ تمہارے دماغ میں زلزلہ پیدا ہوا تھا اور کسی نے تم پر تنویمی عمل کیا ہے۔''

''میں زلزلے کی تکلیف کو اور تنویمی عمل کو بھول جاؤں گا۔''

''اپنی ملکہ کو یاد رکھو گے اور اس کے تمام احکامات کی تعمیل کرتے رہو گے۔''

''میں اپنی ملکہ کو یاد رکھوں گا اور اس کے تمام

احکامات کی تعمیل کرتا رہوں گا۔"

"اب تم سو رہے ہو۔ گہری نیند میں ڈوبتے جا رہے ہو۔"

وہ مکمل تابعدار بن چکا تھا۔ امی مالا جو کہتی' وہی کرنے والا تھا۔ وہ چند لمحوں میں گہری نیند سو گیا۔

جو مراد کرنے والا تھا' وہ امی مالا کر گزری۔ پہلے آؤ پہلے پاؤ والی بات ہوگئی۔ وہ ٹیلی پیتھی اور ہپناٹزم کے ذریعے شہزاد کی جڑوں میں جا کر بیٹھ گئی تھی۔

وہ دوسری صبح نیند سے بیدار ہوا تو امی یاد آئی۔ وہ تنویمی عمل کے بعد اس کے حواس پر اور زیادہ چھا گئی تھی۔ اگرچہ یہ نہیں جانتا تھا کہ اس نے کوئی عمل کیا ہے۔ وہ لاعلمی کے باوجود اسے یاد کر رہا تھا اور یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ ان لمحات میں وہ موجود تھی۔ اپنے عمل کا ردعمل دیکھنے آئی تھی۔ بہت خوش تھی۔ اس نے ایک ناقابلِ شکست باپ کے بیٹے کو تسخیر کر لیا تھا۔

اسی شام تنویمی عمل کا ایک ماہر وہاں آیا۔ اس نے شہزاد پر عمل کرنا شروع کیا۔ ایسے وقت امی اس کے دماغ میں موجود تھی۔ چپ چاپ ہپناٹزم کا تماشا دیکھ رہی تھی۔ عمل کے اختتام پر عامل کو یقین ہوگیا کہ شہزاد کا دماغ لاکڈ ہو چکا ہے۔ وہ آئندہ پرائی سوچ کی لہروں کو محسوس کرتے ہی اپنے دماغ سے بھگا دیا کرے گا۔

اس نے حکم دیا۔ "اب تم گہری نیند سو جاؤ۔ بیدار ہونے کے بعد تمہارے دماغ کے دروازے فولادی ہوں گے۔ کوئی بھی خیال خوانی کرنے والا تمہارے اندر داخل نہیں ہو سکے گا۔"

ہپناٹزم کا عمل ختم ہو چکا تھا۔ عامل مطمئن ہو کر چلا گیا۔ امی اس کے اندر موجود رہی۔ اس نے کہا۔ "میں تمہاری ملکہ بول رہی ہوں۔ تمہیں حکم دے رہی ہوں، وہ عامل جو احکامات دے گیا ہے انہیں حرفِ غلط کی طرح بھول جاؤ۔ بولو کہ بھول رہے ہو۔"

اس نے کہا۔ "میں بھول رہا ہوں۔"

"بولو کہ صرف میں ہی تمہارے ذہن پر اور تمہاری تمام سوچ کی لہروں پر حاوی رہوں گی۔ وہ عمل کرنے والا تمہارے اندر سے فنا ہو چکا ہے۔"

اس نے کہا۔ "صرف تم میرے ذہن پر اور تمام سوچ کی لہروں پر حاوی رہو گی۔ دوسرا فنا ہو چکا ہے۔"

"میں حکم دیتی ہوں۔ گہری نیند سو جاؤ۔ دو گھنٹے کے بعد بیدار ہو کر امی مالا سے باتیں کرو۔"

وہ گہری نیند سو گیا۔ اب پورے دل و دماغ سے اس کا تابعدار بن چکا تھا۔ اس نے دو گھنٹے بعد نیند سے بیدار ہوتے ہی امی مالا کو فون پر پکارا۔ "ہائے امی! آج شام کو بے وقت سو گیا تھا۔ جاگتے ہی تمہیں یاد کر رہا ہوں۔"

"ابھی میں بھی تمہیں یاد کر رہی تھی۔ کیا تم پر تنویمی عمل ہو چکا ہے؟"

"ہاں۔ ایک عامل آیا تھا۔ اسی کے زیر اثر رہ کر ابھی سو گیا تھا۔ عامل نے یقین سے کہا ہے کہ کوئی ٹیلی پیتھی جاننے والا دشمن میرے اندر نہیں آسکے گا۔"

"یہ اچھا ہوا۔ اب تم آزادی سے یونیورسٹی آؤ گے۔ ہم کسی روک ٹوک کے بغیر ملتے رہیں گے۔ بڑا مزہ آئے گا۔"

"ہم ابھی بہت محتاط رہیں گے۔ میرے انکل (کبڈی) بہت چالاک ہیں۔ میرے چہرے کو پڑھ کر اندر کی باتیں معلوم کر لیتے ہیں۔ کوئی اچھا موقع دیکھ کر تمہیں ان سے ملاؤں گا۔ ویسے کل یونیورسٹی میں ہماری ملاقات ہوگی۔"

کبڈی اس کے پاس آرہا تھا۔ شہزاد پر تنویمی عمل کے اثرات دیکھنا چاہتا تھا۔ وہ کھڑکی کے پاس رک گیا تھا اور اس کی باتیں سن کر مسکرا رہا تھا۔ اس نے واپس اپنے کمرے میں آکر فون پر مراد سے کہا۔ "شہزاد پر تنویمی عمل ہو چکا ہے۔ وہ نیند سے اٹھ کر فریش ہے اور ہواؤں میں اڑ رہا ہے۔"

مراد نے پوچھا۔ "کن ہواؤں میں اڑ رہا ہے۔"

کبڈی نے کہا۔ "ہم دماغ میں آنے والے کسی بھی خیال خوانی کرنے والے سے اسے بچا سکتے ہیں۔ کسی دل میں آنے والی سے بچا نہیں سکیں گے۔ صاحبزادے کسی کے عشق میں مبتلا ہو گئے ہیں۔"

وہ ہنستے ہوئے بولا۔ "یہ عمر ہے بہکنے کی لیکن کبڈی کہیں وہ غلط سمت میں نہ بہک جائے۔ دشمن ہزار بھیس میں آتے ہیں اور شہزاد بالکل ہی اناڑی ہے۔"

"فکر نہ کرو۔ میں اس لڑکی کے متعلق معلومات حاصل کروں گا۔ تم کہہ رہے تھے کہ عابی یہاں آنے والا ہے۔"

"ہاں۔ یہاں سے روانہ ہو رہا ہے۔ یہ شہزاد کے قریب رہے گا تو دشمنوں پر دہشت طاری رہے گی۔ کوئی ٹیلی پیتھی جاننے والا میرے اس بیٹے کو تر نوالا نہیں سمجھے گا۔"

بہت عرصے بعد عابی میدانِ عمل میں آرہا تھا۔ وہ آبنوس سے مقابلے کے دوران روپوش ہو گیا تھا پھر نیلماں کی ہلاکت کے بعد صبر و تحمل سے محل میں وقت گزار رہا تھا۔ اس نے دشمنوں کو چیلنج نہیں کیا تھا۔ اب بھی کسی کو نہیں للکار رہا تھا۔ لندن جانے

کے لیے چپ چاپ ریاست سے نکل آیا تھا۔

کوئی اسے پرنس عابی کی حیثیت سے پہچان نہیں سکتا تھا۔ اس کا چہرہ تبدیل ہوگیا تھا۔ اس نے پہاڑ جیسے ڈیل ڈول کے باعث ایک پیشہ ور ریسلر (پہلوان) کی شناخت بنوائی تھی۔ ماسٹر کوبوبو نے اس کے نئے چہرے اور نئی پہلوانی شخصیت کے مطابق پاسپورٹ اور دیگر اہم کاغذات تیار کرائے تھے۔ وہ رازداری سے پہلے افریقا کے شہر نسٹی گیا تھا۔ ماسٹر کوبوبو کا وہ علاقہ مراد کی فیملی کے لیے بہترین اور محفوظ پناہ گاہ تھا۔ عابی وہاں رازداری سے تبدیل ہونے کے بعد لندن کی ایک رہائش گاہ میں پہنچ گیا تھا۔

☆☆☆

یہودی ٹیلی پیتھی جاننے والوں کا اعتماد حاصل کر کے ان کے مستحکم اتحادی بن چکے تھے۔ انہوں نے مراد کو دھوکا دے کر اس کے بیٹے کو لارا کی گود میں رہنے دیا تھا۔ یہ بن زیان اور یہودی اکابرین کا بہت بڑا کارنامہ تھا۔ ان کے اتحاد سے ہی ٹیلی پیتھی جاننے والوں نے پہلی بار مراد اور عابی کے خلاف بہت بڑی کامیابی حاصل کی تھی۔

سپر پاور اور دیگر بڑے ممالک بھی دیکھ رہے تھے کہ مراد اور عابی کچھ ٹھنڈے اور ڈھیلے پڑ گئے ہیں۔ شیطان کے پرستاروں اور یہودیوں کے اتحاد نے انہیں ریاست ارضِ اسلام تک محدود کردیا تھا۔ وہ وہاں سے باہر مخالفین سے انتقام لینے نہیں آرہے تھے۔ اسے باپ بیٹے کی شکست خوردگی سمجھا جارہا تھا۔ لہٰذا سیاسی اور عسکری قوتیں بھی ان باپ بیٹے کے خلاف پر تول رہی تھیں۔

سپر پاور اور دیگر بڑے ممالک کی سیاست پر یوں بھی یہودی چھائے ہوئے تھے۔ وہ ریاست ارضِ اسلام سے سفارتی تعلقات کو کمزور بنارہے تھے۔ لارا' آبنوس اور بارودا سے دوستی کو زیادہ سے زیادہ مستحکم کررہے تھے اور انہیں اپنی دنیا میں طرح طرح کی سہولتیں دینے کی آفر کرچکے تھے۔

ان حالات میں مراد نے سپر پاور کے اعلیٰ حکام سے کہا۔ ''آپ کے یہودی سیاستداں کریگ ہوسٹن کی پشت پناہی کررہے ہیں اور ہوسٹن نے ٹیلی پیتھی جاننے والوں کو میرے معصوم بیٹے شہزاد تک پہنچا دیا ہے۔ میرا بیٹا ایک سیدھا سادہ سا پُرامن شہری ہے۔ اس پر ایک ناکام قاتلانہ حملہ ہوچکا ہے۔ آئندہ بھی ہوسکتا ہے۔ آپ ان یہودیوں کو شرپسندی سے باز رکھیں۔''

سپر پاور کی طرف سے جواب ملا۔ ''یہودی نہ ہمارے زیرِ اثر ہیں، نہ وہ ہمارا کوئی مشورہ قبول کریں گے۔ آپ نے لارا سے اپنے بچے کو چھین کر دشمنوں کی تعداد میں اضافہ کرلیا ہے۔ آپ مائنڈ نہ کریں۔ سچ تو یہ ہے کہ آپ بہت ضدی' خودسر اور مغرور ہیں۔ ذرا اپنے حالات پر غور کریں۔ غرور آپ کا سر نیچا کررہا ہے۔ کبھی آپ نے اور آپ کے بیٹے عابی نے اپنی طاقت کا لوہا منوایا تھا۔ اب یہ کریگ ہوسٹن اور ٹیلی پیتھی جاننے والوں کا کمال ہے کہ آپ دونوں باپ بیٹے کے غبارے سے ہوا نکل گئی ہے۔ آپ سمٹ کر ریاست میں جا بیٹھے ہیں۔ بہتر ہے' وہیں بیٹھے رہیں۔ شہزاد کو بھی لندن سے بلالیں۔ بس وہ ریاست ہی آپ کے لیے ماں کی گود رہے گی۔ آپ اپنے پورے خاندان کے ساتھ وہیں محفوظ رہ سکیں گے۔''

سپر پاور اور اس کے اتحادی ممالک نے اپنی باتوں سے اپنے رویوں سے ظاہر کردیا کہ وہ یہودیوں اور شیطانی قوتوں کے ساتھ ہیں۔ موجودہ حالات میں تاریک اور روشن دنیا کی تمام قوتیں متحد ہوگئی تھیں۔ وہ باپ بیٹے تنہا رہ گئے تھے۔

ایمان کی بات یہ ہے کہ تنہا صرف اللہ رہتا ہے۔ وہ اپنے نیک بندوں کو تنہا اور بے یار و مددگار نہیں رہنے دیتا۔ اس معبود نے باپ بیٹے کو حکمتِ عملی سے کام لینے والی ذہانت دی تھی۔ وہ کچھ سوچ سمجھ کر ریاست میں تھے۔ اب عابی محل سے نکل کر میدان میں آگیا تھا۔ مراد بھی کسی دن گھر سے نکل کر دوست نما دشمنوں کی مزاج پرسی کرنے والا تھا۔

عابی لندن پہنچ کر شہزاد اور کیڈی سے دور رہا۔ وہ دور ہی سے اپنے بڑے بھائی شہزاد کی نگرانی کرنے والا تھا۔ وہ وہاں پہنچتے ہی انٹرنیشنل ریسلنگ چیمپئن شپ میں حصہ لے کر نامور اور درندہ صفت پہلوانوں کے مقابلے میں آگیا تھا۔

اس کی غیر معمولی خداداد جسمانی قوت کے آگے کوئی پہلوان کھڑا نہیں رہ سکتا تھا لیکن وہ مقابلے کے دوران میں روبوٹ والی قوت کا مظاہرہ نہیں کررہا تھا۔ اس نے دانستہ خود کو ذرا کمزور بنالیا تھا۔ کسی بھی پہلوان پر حملہ کرتے وقت ہاتھ ہلکا رکھتا تھا اور اپنے مقابل سے جان بوجھ کر مار بھی کھاتا تھا۔ اس طرح کوئی اس پر پرنس عابی ہونے کا شبہ نہیں کررہا تھا۔ وہ مقابل کو مارتے اور اس سے مار کھاتے کھاتے جیت جاتا تھا۔

اسے چند مقابلوں کے بعد ہی شہرت حاصل ہونے لگی۔ ریسلنگ کے شائقین پیش گوئی کرنے لگے کہ وہ اس مقابلے میں بیس پہلوانوں کو شکست دینے کے بعد چیمپئنز

ٹرافی ضرور حاصل کرے گا۔

ایسے وقت عابی نے شیخی بگھارنے کے انداز میں بیان دیا۔ ''یہاں مقابلے میں آنے والے پہلوان میری نظروں میں کچھ نہیں ہیں۔ میں اس دنیا کے سب سے زیادہ طاقتور کہلانے والے پرنس عابی کو چیلنج کرتا ہوں۔ وہ مجھ سے مقابلہ کرے۔ میں اس کی ہڈیاں پسلیاں توڑ کر رکھ دوں گا۔''

اس چیلنج نے سپر پاور کو اور یہودیوں کو اس کی طرف متوجہ کیا۔ انہیں پرنس عابی کے مقابلے میں ایک روبوٹ کی ضرورت تھی۔ انہوں نے بڑے یقین سے سوچا' اگر عابی اس پہلوان کے مقابلے میں آ کر ٹوٹ پھوٹ جائے گا تو مراد بالکل ہی صفر ہو کر رہ جائے گا۔

عابی موجودہ پہلوان کی حیثیت سے بگ ہنٹر کہلا رہا تھا۔ سپر پاور کے نمائندوں نے اس سے ملاقات کی۔ اس سے پوچھا۔ ''مسٹر بگ ہنٹر! کیا آپ کو معلوم ہے کہ پرنس عابی فولاد ہے۔ کہا جاتا ہے کہ مقابلہ کرنے والے، حملہ کرنے سے پہلے ہی اس سے ٹکرا کر زخمی ہو جاتے ہیں؟''

عابی نے کہا۔ ''ہاں، سنا ہے۔ میں اس سے کم نہیں ہوں۔ لوہے کی دیوار سے ٹکرا کر سلامت رہتا ہوں۔ زخمی نہیں ہوتا۔''

نمائندے نے کہا۔ ''تاریک دنیا میں بارودا نامی ایک شہ زور ہے۔ ہم چاہیں گے کہ پہلے اس سے مقابلہ کرو۔ اس سے جیت جاؤ گے تو ہمیں یقین ہو گا کہ پرنس عابی جیسے روبوٹ کو بھی شکست دے سکو گے۔''

عابی نے کہا۔ ''میں بارودا سے بھی مقابلہ کروں گا۔''

سپر پاور کے اعلیٰ حاکم نے بارودا سے پوچھا۔ ''کیا بگ ہنٹر سے مقابلہ کرو گے؟ اگر وہ تم سے جیت جائے گا تو ہمیں پرنس عابی کے مقابلے میں ایک روبوٹ مل جائے گا۔''

بارودا نے کہا۔ ''میں صرف تماشا دکھانے کے لیے اس سے مقابلہ نہیں کروں گا۔ جان لینے یا دینے والا مقابلہ ہو گا۔ بگ ہنٹر کو منظور ہے تو مقابلے پر آئے۔''

بارودا' عابی کی مرحومہ بیوی نیلماں کا باپ تھا۔ نیلماں وفات کے بعد بھی اس کے دل میں رہتی تھی۔ وہ سوچ میں پڑ گیا کہ اپنی محبوب شریک حیات کے باپ کو مقابلے میں کس دل سے ہلاک کرے گا۔ نیلماں کی روح کو تکلیف پہنچے گی۔

نمائندے نے اس سے پوچھا۔ ''کیا بارودا سے ڈر گئے؟''

اس نے کہا۔ ''نہیں۔ کسی کی جان لینا درندگی ہے۔ میں مقابلے پر آنے والوں کو بری طرح زخمی کر دیتا ہوں لیکن ان کی جان نہیں لیتا۔ بہتر ہے کہ بارودا کو سمجھاؤ' وہ جان لیوا کشتی لڑنے کی بات نہ کرے۔''

بارودا نے سنا تو ہنستے ہوئے کہا۔ ''وہ بگ ہنٹر بزدل ہے۔ ٹھیک ہے۔ میں اسے جان سے نہیں ماروں گا لیکن اس کی ہڈیاں توڑ ڈالوں گا۔''

عابی نے کہا۔ ''مجھے منظور ہے۔''

مقابلہ طے ہو گیا۔ دو روز بعد ہزاروں تماشائیوں کے درمیان سسر اور داماد لڑنے والے تھے۔ اس نے فون پر مراد سے کہا۔ ''بابا جانی! شیطان کا ایک پجاری مقابلے پر آ رہا ہے۔ شیطانیت پھیلانے والوں کو زندہ نہیں چھوڑنا چاہیے لیکن وہ میری نیلماں کا باپ ہے، کیا کروں؟''

مراد نے کہا۔ ''نیلماں ہمیشہ ہمارے دلوں میں رہے گی۔ اس کے شیطان باپ کو رشتے دار نہ کہو۔ دین و ایمان کا جو بھی دشمن ہے، اسے کچل دینا چاہیے۔ اس خبیث کو اگر معلوم ہو گا کہ تم عابی ہو تو وہ داماد کے رشتے کا لحاظ نہیں کرے گا۔ تمہیں مار ڈالنے کی کوشش کرے گا۔''

یہ عجیب اتفاق تھا کہ ٹیلی پیتھی جاننے والا صرف ایک بارودا ہی اس کے روبرو آنے والا نہیں تھا۔ امی مالا بھی اس کی نظروں میں تھی۔ وہ لندن میں شہزاد کی نگرانی کے لیے آیا تھا۔ اس نے یونیورسٹی کے قریب امی کو شہزاد کے ساتھ دیکھا تھا۔ ابھی وہ نہیں جانتا تھا کہ وہ بھی ٹیلی پیتھی جانتی ہے اور تاریک دنیا سے آئی ہے۔

عابی کی لندن میں آمد کو چھپایا گیا تھا۔ شہزاد کو بھی معلوم نہیں تھا کہ اس کا بھائی وہاں اس کی نگرانی اور حفاظت کے لیے پہنچا ہوا ہے۔ وہ بڑی آزادی سے امی کے ساتھ گھومتا پھرتا تھا۔ بہت خوش تھا۔ بے چارہ جسمانی طور پر اس کا محبوب تھا اور دماغی طور پر غلام بنا ہوا تھا۔

عابی نے دور سے امی کو دیکھا تھا۔ اسے ایک دولت مند باپ کی شریف زادی سمجھ رہا تھا۔ ارادہ تھا کہ بارودا سے مقابلہ کرنے کے بعد اسے قریب سے دیکھے گا اور اس کے بارے میں معلومات حاصل کرے گا۔

وہ ایک ریسلر کی حیثیت سے شہرت حاصل کر رہا تھا۔ امی نے اسے ایک چینل کی اسکرین پر دیکھا تھا۔ پہلے تو نظر انداز کیا پھر جب اعلان ہوا کہ وہ تاریک دنیا کے ایک شہ زور بارودا سے مقابلہ کرنے والا ہے تو وہ عابی میں دلچسپی لینے لگی۔ بارودا اس کا شیطانی بھائی تھا۔ وہ معلوم کرنا چاہتی تھی کہ عابی کس قدر شہ زور ہے؟ وہ بارودا سے مات کھائے گا یا نہیں؟

وہ عابی کو اسکرین پر دیکھتے دیکھتے اس کے دماغ میں

پہنچ گئی لیکن دوسرے ہی لمحے میں باہر آگئی۔ عابی نے سانس روک لی تھی۔ اس وقت وہ اسکرین پر ریسلنگ کے ادارے سے تعلق رکھنے والے عہدیداروں سے باتیں کررہا تھا۔

اس نے اپنے سر کو تھام کر کہا۔ ”یہ سب ہی جانتے ہیں کہ تاریک دنیا کے لوگ ٹیلی پیتھی جانتے ہیں۔ بارودا بھی جانتا ہے۔ ابھی میرے دماغ میں آکر معلوم کرنا چاہتا ہے کہ میں کتنے پانی میں ہوں۔ میں نے سانس روک کر اسے بھگا دیا ہے۔“

بارودا کہیں بیٹھا، وہ لائیو پروگرام دیکھ رہا تھا۔ وہ پلک جھپکتے ہی عابی اور متعلقہ عہدیداروں کے سامنے آکر بولا۔ ”بگ ہنٹر! تم جھوٹ بول رہے ہو۔ میں تمہارے دماغ میں نہیں آیا تھا۔“

عابی نے کہا۔ ”تم آئے تھے۔ چپ چاپ میرے خیالات پڑھ کر معلوم کرنا چاہتے تھے کہ مقابلے کے دوران میری کن ڈھکی چھپی کمزوریوں سے فائدہ اٹھا سکو گے۔“

وہ بولا۔ ”بکواس کر رہے ہو۔ چند مقابلے جیت کر خود کو ناقابلِ شکست سمجھ رہے ہو۔ کل ہمارا مقابلہ ہے۔ دنیا دیکھے گی کہ میں تمہاری گردن دبوچ لوں گا تو میرے شکنجے سے نکل نہیں سکو گے۔ میں تمہیں دونوں ہاتھوں سے اٹھا کر رنگ کے باہر پھینک دوں گا۔“

عابی اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ اس کے سامنے تن کر بولا۔ ”تو پھر آؤ۔ مجھے ابھی اٹھا کر پھینکو۔ میں بھی دیکھوں کہ کتنے شہ زور ہو۔“ وہ دونوں ..... مقابلے کے لیے تن گئے۔

اس ادارے کے تمام عہدیدار فوراً ہی دونوں کے درمیان آگئے۔ انہیں ایک دوسرے سے دور کرتے ہوئے سمجھانے لگے کہ وہ کل تک صبر کریں، ابھی اس طرح نہ الجھیں۔ عابی کو غصہ نہیں آتا تھا۔ وہ عام پہلوانوں کی طرح یونہی گرم مزاجی کا مظاہرہ کررہا تھا۔

بارودا وہاں سے اپنی موجودہ رہائش گاہ میں واپس آگیا۔ اسپی نے اس کے سامنے حاضر ہو کر کہا۔ ”سوری بارودا......! میں اس بگ ہنٹر کے دماغ میں جانا چاہتی تھی۔ معلوم کرنا چاہتی تھی کہ وہ تمہارے مقابلے میں کتنا شہ زور ہے؟ میں تمہارے لیے فکرمند ہوں۔ وہ اب تک دس پہلوانوں کو شکست دے چکا ہے۔“

”یہ تمہاری محبت ہے کہ میری فکر کررہی ہو۔ مطمئن ہوجاؤ۔ کل مقابلہ شروع ہوتے ہی اسے چند منٹوں میں ناک آؤٹ کردوں گا۔“

”بارودا......! بے شک تم حیرت انگیز جسمانی قوت رکھتے ہو لیکن بگ ہنٹر کے مقابلے میں بوڑھے ہو۔ میری ایک بات مانو، مقابلے کے دوران میں اسے زیادہ سے زیادہ زخمی کرو۔ وہ زخمی ہوگا تو پھر سانس روک کر مجھے بھگا نہیں سکے گا۔ میں اسے دماغی طور پر کمزور بناؤں گی تو وہ چاروں شانے چت ہوجائے گا۔“

اس نے کہا۔ ”لارا‘ آبنوس اور طاغوتا بھی یہی کہہ رہے ہیں کہ وہ زخمی ہوگا تو اس کے اندر جاکر اسے مجھ پر حاوی نہیں ہونے دیں گے۔ اگر وہ حاوی ہوجائے گا، مجھ سے جیت جائے گا تو سپر پاور مان لیں گے کہ وہ پرنس عابی کو بھی زیر کرسکے گا۔ دنیا کی تمام طاقتیں اور اتحادی تنظیمیں بگ ہنٹر کو سر آنکھوں پر بٹھائیں گی۔“

”تمہارا کیا خیال ہے؟ کیا اندازہ ہے یہ بگ ہنٹر عابی سے زیادہ طاقتور ہوگا؟“

وہ انکار میں سر ہلا کر بولا۔ ”وہ عجوبہ ہے۔ تنہا مسلح فوج کو شکست دیتا ہے۔ اس کے ساتھ روحانی قوتیں ہیں۔ کوئی اس سے زیادہ طاقتور نہیں ہوسکتا۔“

پھر وہ سوچ کر بولا۔ ”دنیا میں ہر شے کو زوال ہے۔ طاقت بھی رفتہ رفتہ ڈھل جاتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے، پرنس عابی پر زوال آیا ہے۔ رفتہ رفتہ ڈھل رہا ہے۔ اسی لیے ریاست میں چھپ کر رہتا ہے۔ لارا نے اس کی واقف نیلماں کو ہلاک کیا تھا۔ عابی کی کمزوری اس طرح ظاہر ہورہی ہے کہ اس نے لارا کو ابھی تک نقصان نہیں پہنچایا ہے۔ ایسے تو بزدل اور کمزور چھپ کر بیٹھ جاتے ہیں۔“

”اس کا باپ مراد بھی ریاست سے باہر نہیں آرہا ہے۔ میں اس کے بیٹے شہزاد کو بڑی آسانی سے ٹریپ کررہی ہوں۔ ان کی طرف سے کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔ وہ شہزاد پر ایک ناکام تنویمی عمل کرانے کے بعد مطمئن ہوگئے ہیں۔ مراد اور عابی اس کی سیکیورٹی کے لیے خود نہیں آرہے ہیں۔“

”ہاں۔ اس طرح ان کی کمزوریوں کا اندازہ ہورہا ہے۔ وہ اینٹ کا جواب پتھر سے دینے کے قابل نہیں رہے ہیں۔ اس لیے ریاست کے اندر بیٹھ کر اللہ اللہ کرتے رہیں گے۔“

اس بات پر دونوں ہنسنے لگے۔ وہاں سے دور بن زیان سپر پاور کے اعلیٰ حاکم سے باتیں کررہا تھا اور کہہ رہا تھا۔ ”اگرچہ وہ باپ بیٹے اپنی ریاست میں بزدلوں کی طرح خاموش بیٹھے ہیں، تاہم ہمیں دھوکا نہیں کھانا چاہیے۔ میں سمجھتا ہوں انہوں نے مصلحتاً خاموشی اختیار کی ہے۔“

اعلیٰ حاکم نے کہا۔ ”ہم ان کی خاموشی سے دھوکا نہیں کھائیں گے۔ مراد جب تک مرے گا نہیں، تب تک اس

سے پیچھا نہیں چھوٹے گا۔ ہاں اگر عابی جیسا پہاڑ ٹوٹ پھوٹ کر ہمارے سامنے گرے گا، تب یقین ہوگا کہ وہ باپ بیٹے کمزور ہو گئے ہیں اور ان سے پیچھا چھوٹ گیا ہے۔"

"دشمن میدان میں نہ آئے؛ روپوش رہے تو اس کی خاموشی اور گمشدگی خوف طاری کرتی ہے۔ انہیں ان کے بل سے باہر آنے پر مجبور کرنا ہوگا۔ امی بڑی کامیابی سے شہزاد کو اپنا تابعدار بنا چکی ہے۔ آئندہ اسی ایک بیٹے کو اپنا آلۂ کار بنا کر مراد اور عابی کو ریاست سے باہر آنے پر مجبور کیا جائے گا۔ فی الحال عابی سے کہا جائے گا کہ وہ بگ ہنٹر سے مقابلہ کرنے کے لیے یہاں آئے۔ یہ ثابت کرے کہ وہ کسی وجہ سے مجبور ہو کر ریاست میں چھپا ہوا نہیں ہے۔"

اعلیٰ حاکم نے کہا۔ "عابی کو ابھی مجبور کرنا چاہیے۔ دیر کیوں کی جا رہی ہے؟"

"امی بہت ہی عیاش اور ہوس پرست ہے۔ کہتی ہے، دو چار روز عیش کرے گی پھر شہزاد کو اس کے باپ اور بھائی کے خلاف استعمال کرے گی۔"

سپر پاور اور کوئی بھی دشمن یہ نہیں جانتا تھا کہ لارا اور بن زیان نے مراد سے اس کے بیٹے کو چھین لیا ہے اور مراد ایک لاوارث بچے کو اپنا سمجھ کر دھوکا کھا رہا ہے۔

دوسری کامیابی امی مالا نے حاصل کی تھی۔ اس نے مراد کے دوسرے بیٹے شہزاد کو اس سے چھین لیا تھا۔ باپ کو دوسرے بیٹے کی طرف سے بھی جلد ہی دماغی صدمہ پہنچنے والا تھا۔

مراد کی یہ شکست خوردگی محض اسی لیے تھی کہ وہ حقائق سے بے خبر تھا۔ وارث علی منگی کو گود لے کر فریب کھا رہا تھا اور یہ نہیں جانتا تھا کہ دوسرا بیٹا بھی ہاتھ سے نکل چکا ہے۔ آنے والا وقت ہی اسے جھنجوڑ سکتا تھا۔

☆☆☆

ریسلنگ کا وہ آڈیٹوریم ہزاروں تماشائیوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ کئی دنوں سے پبلسٹی کی جا رہی تھی کہ بگ ہنٹر تاریک دنیا کے ایک شیطان ریسلر بارودا سے مقابلہ کرنے والا ہے۔ یہ بہت ہی جوش و جنون پیدا کرنے والی پبلسٹی تھی۔ ایک شیطان کا اور ایمان والے کا مقابلہ انتہائی دلچسپ اور تجسس آمیز ہو سکتا تھا۔

انہیں پوری دنیا میں ٹی وی کے ذریعے دکھایا جا رہا تھا۔ مراد ٹی وی کے سامنے اپنے ریسلر بیٹے کو دیکھنے کے لیے بیٹھا ہوا تھا۔ لارا، امی، آبنوس اور طاغوتا خیال خوانی کے ذریعے بارودا کے دماغ میں موجود تھے۔ یعنی کشتی کے اکھاڑے میں عابی تنہا تھا اور بارودا چار ہارس پاور کے ساتھ ناقابلِ شکست بننے کے لیے آیا تھا۔

وہ دونوں رنگ (اکھاڑے) کے دو گوشوں میں ایک دوسرے سے دور کھڑے ہوئے تھے۔ عابی آگے بڑھا تو اس نے بھی آگے بڑھتے ہوئے کہا۔ "میں چاہتا تھا کہ یہ مقابلہ ہلاکت خیز ہو۔ یہاں سے تمہاری لاش چار کاندھوں پر جائے لیکن تم بزدل ہو۔ تم نے ایسے مقابلے سے انکار کر دیا۔ لعنت ہے تم پر۔"

عابی نے کہا۔ "میں بزدل نہیں ہوں۔ میں اپنی مقتول بیوی کو دل و جان سے چاہتا تھا۔ تم اس کے باپ سے بہت مشابہت رکھتے ہو۔ مجھے تمہاری بزرگی کا مان رکھنا چاہیے۔ اس لیے جان لیوا مقابلے سے انکار کر دیا۔ اب زیادہ نہ بولنا۔ مجھے غصہ آ گیا تو گردن توڑ کر رکھ دوں گا۔"

بارودا نے حملہ کیا۔ عابی نے ہاتھ پکڑ لیا۔ اس نے دوسرے ہاتھ سے ضرب لگانی چاہی۔ عابی نے اس ہاتھ کو بھی روک لیا۔ ان کے ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں پھنس گئیں۔ وہ پنجے لڑاتے ہوئے زور آزمانے لگے۔

عابی کی خداداد قوت کے آگے بارودا ایک کھلونا تھا۔ وہ ایک ہلکا سا جھٹکا دیتا تو اس کی تمام انگلیاں کچی لکڑی کی طرح ٹوٹ جاتیں لیکن وہ ایسی تکلیف سے پنجے لڑا رہا تھا جیسے بارودا اس پر حاوی ہو رہا ہو۔ اپنی قوت سے اسے زیر کر رہا ہو اور وہ بچاؤ کے لیے اس سے ہاتھ چھڑانا چاہتا ہو۔

لارا نے کہا۔ "واہ بارودا......! تو نے خوب پھنسایا ہے۔ توڑ دے اس کی انگلیاں......"

وہ سسر واقعی حیرت انگیز جسمانی قوت رکھتا تھا۔ کوئی اور ہوتا تو اس کی آہنی انگلیوں کی گرفت سے نکل نہ پاتا۔ عابی نے اس کے ایک پاؤں پر اپنا پاؤں مارا تو وہ تکلیف سے تلملا گیا۔ گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ عابی نے ایک ہلکا سا ہاتھ اس کے سینے پر مارا تو وہ دور تک لڑکھڑاتا ہوا گیا پھر رنگ کے رسے سے ٹکرا کر واپس آ کر اوندھے منہ گر پڑا۔

چاروں ٹیلی پیتھی جاننے والوں کے منہ سے ہائے نکلی۔ آبنوس نے کہا۔ "بارودا......! اسے فوراً زخمی کرو۔ ہم اس کے دماغ میں گھس جائیں گے۔ ابھی اسے جسمانی طور پر کمزور بنا دیں گے۔ فوراً اسے زخمی کرو۔"

وہ فوراً ہی اٹھ کر کھڑا ہو گیا پھر اس نے ایک لمحہ بھی ضائع کیے بغیر عابی کے سینے پر فلائنگ کک ماری۔ وہ جان بوجھ کر مار کھا گیا۔ پیچھے کی طرف جا کر رسے کو پکڑ کر جیسے گرنے سے پہلے سنبھل گیا۔ حالانکہ گرنے والا نہیں تھا۔

اسی نے کہا۔ ''لارا...... ! بگ ہنٹر کو چوٹ لگی ہے۔ اس کے اندر جانا چاہیے۔''

طاغوتا نے کہا۔ ''ابھی نہیں۔ اس پر فلائنگ کک کا خاص اثر نہیں ہوا ہے۔ ابھی بارودا سے اور مار کھانے دو۔''

وہ آگے کیسے مارتا؟ جس پاؤں سے عابی کو فلائنگ کک ماری تھی، اس پاؤں کی ہڈی دکھنے لگی تھی۔ عابی کوشش کررہا تھا کہ اپنے جسم کو، گوشت اور کھال کو فولاد نہ رہنے دے۔ ان میں نرمی اور لچک لے آئے تاکہ حملہ کرتے وقت بارودا کو چوٹ نہ لگے۔

لیکن کیا کیا جائے کہ نرمی اور لچک پیدا کرنے کے باوجود وہ روبوٹ ہی رہا۔ بارودا نے اس کے منہ پر ایک گھونسا مارا تو اس گھونسے کی انگلیاں تکلیف سے کھل گئیں۔ وہ دوسرے ہاتھ سے انہیں تھام کر عابی سے دور ہوگیا۔

وہ چاروں ٹیلی پیتھی جاننے والے اس کی تکلیف کو سمجھ رہے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ عابی جلد سے جلد زخمی ہوجائے۔ اس کے برعکس بارودا تکلیف میں مبتلا ہورہا تھا۔ رفتہ رفتہ زخمی ہورہا تھا۔

بارودا کو یاد آیا کہ اس نے ایک بار عابی پر جس ہاتھ سے حملہ کیا تھا، اس ہاتھ کی ہڈیاں تڑخ گئی تھیں۔ اس نے بگ ہنٹر کو سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ اس کا بدن بھی عابی کے جیسا فولادی تھا۔

اس کے اندر سوال پیدا ہوا' کیا یہ عابی ہے؟ یا عابی جیسا دوسرا شہ زور پیدا ہوگیا ہے؟

اس نے سوچا' اس پر حملہ نہیں کرنا چاہیے۔ مجھے تکلیف پہنچے گی۔ اب آخری داؤ لگاتا ہوں۔ اسے دونوں ہاتھوں سے اٹھا کر زمین پر دے ماروں گا۔'

وہ عابی کے قریب آیا پھر پینترا بدل کر اس کے پیچھے پہنچ گیا۔ اسے دونوں ہاتھوں سے جکڑ کر اپنے سر سے اوپر اٹھانے کی کوشش کرنے لگا۔ اپنی پوری قوت صرف کرنے لگا۔

وہ تو وزن میں پہاڑ جیسا تھا۔ اسے تو کوئی کرین ہی اٹھا سکتی تھی۔ اس نے بارودا کے لیے آسانی کی۔ اس کے اٹھانے سے خود ہی اٹھتا ہوا اس کے سر کے اوپر سے گزرتا ہوا، پیچھے جا کر فرش پر گر پڑا۔ ناظرین کو یوں دکھائی دیا جیسے بارودا نے اسے سر سے اٹھا کر زمین پر پٹخ دیا ہو۔

لارا نے کہا۔ ''واہ بارودا...... ! شاباش۔''

آبنوس نے کہا۔ ''وہ نیچے پڑا ہے۔ ایک لات مار، اس کی کمر کی ہڈی ٹوٹ جائے گی۔''

بارودا نے کامیابی کے جوش میں آکر ایک لات ماری تو اس کے جوتے کا منہ آگے سے کھل گیا۔ اس پیر کی ہڈی اور گوشت میں ایسا درد ابھرا کہ وہ تکلیف کی شدت سے دوسرے پاؤں پر اچھلنے لگا۔ دوسرا پاؤں زمین پر رکھنے کے قابل نہیں رہا۔ وہ ایک پاؤں سے اچھلتا ہوا رنگ کے گوشے میں جا کر ٹیک لگا کر زخمی پاؤں کو سہلانے لگا۔ عابی اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ اس سے دور دوسرے گوشے میں جا کر اسے ہمدردی سے دیکھنے لگا۔ اسے دیکھ کر نیلماں یاد آرہی تھی۔ اپنے باپ کے پاس جھلک رہی تھی۔

عابی کو اس کی سرگوشی سنائی دی۔ ''میرے باپ کو نہ مارو۔ یہ اپنے بڑھاپے کو نہ سمجھ کر طاقت کے غرور میں تم سے مقابلہ کررہا ہے۔ اسے جانے دو۔ تمہاری نیلماں اپنے باپ کے لیے سفارش کررہی ہے۔''

وہ اپنے سسر کو دیکھتے ہوئے بولا۔ ''اگر تو سمجھتا ہے کہ مقابلہ نہیں کرسکے گا تو اپنی شکست کا اعلان کر۔ یہ دانشمندی ہوگی۔ تو ٹوٹنے پھوٹنے سے بچ جائے گا۔''

وہ زخمی پاؤں کو زمین پر رکھ کر لنگڑاتے ہوئے دو قدم آگے بڑھ کر بولا۔ ''کون ہے تو؟ میں تجھے مارتا ہوں تو چوٹ مجھے لگتی ہے۔ ایسا تو ایک پرنس عابی ہے۔ سچ بول تو کون ہے؟''

وہ عابی کو گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''کیا میرا دشمن داماد ہے؟''

اس نے کہا۔ ''جب پرنس عابی میرا چیلنج قبول کرے گا پھر مجھ سے مقابلہ کرنے یہاں آئے گا تو اس وقت پہچان لینا۔ اس وقت جواب مل جائے گا کہ ہم دونوں میں سے کون تیرا داماد ہے۔ ابھی اپنی سلامتی کی فکر کر۔ اب میں حملہ کروں گا۔ بول گھر جائے گا یا یہیں مر جائے گا؟''

اگر وہ شیطان کا پجاری نہ ہوتا تو عابی اپنی نیلماں کا لحاظ کرکے اس کی بزرگی کا مان رکھ کر مقابلے سے باز آجاتا۔ وہ سسر بھی باز نہیں آرہا تھا۔ چاروں ٹیلی پیتھی جاننے والے پوری تیاری سے آئے تھے۔ انہوں نے رنگ (اکھاڑے) کے قریب چار افراد کو آلۂ کار بنائے رکھا تھا۔ انہیں وقت ضرورت استعمال کرنے والے تھے۔

ان چاروں نے بارودا کے دماغ میں رہ کر معلوم کرلیا تھا کہ وہ بگ ہنٹر سے مقابلہ کرنے کے قابل نہیں رہا ہے۔ ادھر عابی یہ کہہ کر آگے بڑھا کہ یہ اس کا آخری حملہ ہے۔ بارودا زمین پر گرنے کے بعد اٹھ نہیں سکے گا۔ ادھر آبنوس اور طاغوتا اپنے آلۂ کاروں کے دماغوں میں گھس کر انہیں دوڑاتے ہوئے رنگ کے اندر لے آئے۔ ان میں سے

ایک کے ہاتھ میں لوہے کا راڈ تھا۔ دوسرے کے ہاتھ میں ہتھوڑا تھا۔

ان دونوں نے عابی پر بیک وقت حملہ کیا۔ وہ ان کے درمیان سے اچھل کر فضا میں قلابازی کھا کر ایک کے پیچھے گیا پھر اسے دونوں ہاتھوں سے اٹھا کر ہتھوڑا بردار کے اوپر دے مارا۔ دونوں کے حلق سے چیخیں نکلیں۔ وہ زمیں بوس ہوگئے پھر انہیں وہاں سے اٹھنے کی مہلت نہیں ملی۔ ایک ایک ٹھوکر ایسی لگی کہ وہ اپنی ہڈیوں کا ماتم کرنے لگے۔ ان کے ہاتھوں سے ہتھیار چھوٹ گئے تھے۔

بارودا نے لوہے کے راڈ کی طرف چھلانگ لگائی۔ اسے اٹھا کر بڑی پھرتی سے عابی پر حملہ کیا۔ وہ عابی سے زیادہ پھرتیلا نہیں ہوسکتا تھا۔ اس نے راڈ کے دوسرے سرے کو پکڑ لیا۔ ایک ہلکا سا جھٹکا دے کر اس کے ہاتھ سے چھڑا لیا۔ وہ تڑپ کر فرش پر سے اٹھا تو ایک ہاتھ منہ پر پڑا۔ بس وہ آخری حملہ تھا۔ اس نے پہلے ہی کہہ دیا تھا۔ اس کے دانت ٹوٹ گئے تھے۔ چہرے کی جلد پھٹ گئی تھی۔ ٹوٹی ہوئی ناک سے دھاروں خون بہہ رہا تھا۔

وہ بیٹھا ہوا تھا۔ پیچھے کی طرف گر کر چاروں شانے چت ہوگیا۔ ہمیشہ کے لیے سانس لینا بھول گیا۔

وہ چاروں اس کے مردہ دماغ سے باہر آگئے۔ لارا اور آبنوس تاریک دنیا میں تھے۔ طاغوتا مصر میں اور رامبی مالا لندن میں تھی۔ ان سب کے دل دکھ رہے تھے۔ بارودا ایک سرپرست کی طرح ان سب کا بزرگ اور رہنما تھا۔

لارا نے خیال خوانی کے ذریعے بن زیان سے کہا۔ ”ہمیں صدمہ پہنچ رہا ہے۔ کیا تم ریسلنگ دیکھ رہے ہو؟“

”ہاں، میں بارودا کو دیکھنے کے لیے ٹی وی کے سامنے بیٹھا ہوا ہوں۔ یہ کیا ہوگیا لارا؟ ہمارا ایک ٹیلی پیتھی جاننے والا کم ہوگیا۔“

وہ بولی۔ ”زیان! میرے اندر خطرے کی گھنٹی بج رہی ہے۔ عابی ریاست سے باہر آگیا ہے۔“

”یہ کیا کہہ رہی ہو؟“

”وہ کوئی اور نہیں ہوسکتا۔ عابی کسی کو ایک ہاتھ مارتا ہے تو مار کھانے والا پھڑ پھڑا کر مر جاتا ہے۔“

”درست کہہ رہی ہو۔ بارودا جیسا شہ زور ایک ہاتھ کھاتے ہی مر گیا۔ تمہارے دو آلۂ کار جو اس کی مدد کرنے آئے تھے، وہ بگ ہنٹر کی ایک ایک ٹھوکر سے ناکارہ ہوگئے ہیں۔ ایک کی کمر کی ہڈی اور دوسرے کی پسلیاں ٹوٹ گئی ہیں۔ ہمیں یقین کرنا ہوگا کہ وہ بگ ہنٹر نہیں ہے۔ پرنس عابد علی منگی ہے۔“

بن زیان نے سپر پاور اور دیگر ممالک کے حکمرانوں سے رابطہ کیا۔ وہ سب ہی یقین کی حد تک شبہ کر رہے تھے کہ پرنس عابی بگ ہنٹر کے نام سے چہرہ بدل کر ریاست سے باہر آیا ہوا ہے۔

عابی نے کبھی کسی دشمن کو کسی ہتھیار سے ہلاک نہیں کیا تھا۔ خالی ہاتھوں سے انہیں جہنم میں پہنچاتا رہا تھا۔ جو دشمن اس کے ہاتھوں مارے گئے تھے، ان کی تصویریں ریکارڈ کے طور پر ان کے ممالک میں رکھی ہوئی تھیں۔ ان تصویروں کو اور مرڈر رپورٹس کو نکال کر دیکھا اور پڑھا جا رہا تھا۔

جس طرح بارودا کے چہرے کی جلد پھٹ گئی تھی، دانت ٹوٹ گئے، ناک اکھڑ گئی تھی، اسی طرح ماضی میں عابی کے ہاتھوں مرنے والوں کے ساتھ ہوا تھا۔ اب وہ تمام دشمن دیکھ رہے تھے کہ بگ ہنٹر نے بھی ٹھیک اسی طرح بارودا کو ایک ہی گھونسے میں ہلاک کیا تھا اور کسی ہتھیار کے بغیر باقی دو مددگاروں کی ہڈیاں پسلیاں توڑ دی تھیں۔

ان تمام ثبوتوں کے پیش نظر احکامات صادر کیے گئے کہ بگ ہنٹر کو حراست میں لے کر اس کا محاسبہ کیا جائے۔ اگر یہ ثابت ہو جائے کہ وہ واقعی جواد احمد عرف بگ ہنٹر ہے اور پرنس عابی اپنی ریاست میں موجود ہے تو سپر پاور اور یہودی تنظیمیں اسے عابی کے مقابلے میں اپنے سروں پر بٹھائیں گی۔

عابی کبھی یہ نہیں چاہتا تھا کہ ریسلنگ کے دوران میں کسی بھی پہلوان کے خلاف غیر معمولی جسمانی قوت کا مظاہرہ کرے۔ اور اس نے اب تک ایسا نہیں کیا تھا لیکن بارودا سے مقابلہ کرتے وقت اس کے ذہن میں یہ حقیقت چبھ رہی تھی کہ وہ سر دین اسلام کا دشمن ہے اور اس کی سزا صرف موت ہے۔

اس نے اس پہلو سے نہ ہی سوچا اور نہ ہی اس بات کو اہمیت دی کہ ہتھیار کے بغیر بارودا کو ہلاک کرے گا اور اس کے مددگاروں کو ناکارہ بنائے گا تو اس پر عابی ہونے کا شبہ کیا جائے گا۔ اس نے اس لیے بھی اہمیت نہیں دی کہ مراد پہلے ہی حفاظتی تدابیر پر عمل کر چکا تھا۔ عابد علی منگی کی ایک ڈمی تیار کرلی گئی تھی۔ وہاں ریاست کے محل میں عابی کا ایک ہم شکل موجود تھا۔

مراد اتنی تو عقل رکھتا تھا کہ ریاست کے باہر جا کر عابی سے جانے انجانے میں غلطی ہوسکتی ہے۔ وہ بے اختیار قدرتی جسمانی قوتوں کا مظاہرہ کرسکتا ہے۔ اگرچہ وہ بہت ہی ذہین اور حاضر دماغ تھا لیکن دین کے معاملات میں اس کے فیصلے

مل ہوتے تھے۔ وہ کسی اندیشے اور خطرے کو خاطر میں نہیں لاتا تھا۔

برطانیہ کے حکام نے اسے حراست میں لینے کا حکم صادر کیا تو ایک پولیس افسر سپاہیوں کے ساتھ اس کے دروازے پر پہنچ گیا۔ عابی نے دروازہ کھولنے سے انکار کرتے ہوئے کہا۔ ”ریسلنگ کا پیشہ ایسا ہے کہ مقابلے کے دوران میں کبھی کبھی کسی مقابل کی ہلاکت ہوجاتی ہے۔ فاتح پہلوان کو قانوناً قاتل نہیں کہا جاتا۔ پہلے میں اپنے وکیل کو کال کروں گا، اس سے مشورہ لوں گا پھر دروازہ کھولوں گا۔“

پولیس افسر نے کہا۔ ”ہم تمہیں قتل کے الزام میں گرفتار کرنے نہیں آئے ہیں۔ تم پر شبہ ہے کہ تم جواد احمد عرف بگ ہنٹر نہیں ہو۔ تم نے اپنی اصل شناخت کو چھپایا ہے۔ ہم سچ جاننے کے لیے آئے ہیں۔ ہمیں اندر آنے دو۔“

”ابھی میرا وکیل آئے گا تو دروازہ کھولوں گا۔ انتظار کریں۔“

وہ انتظار کرنے لگے۔ وکیل نے آکر کہا۔ ”آپ صرف شبہے کی بنا پر میرے موکل کو گرفتار نہیں کرسکتے۔ اگر یہ جواد احمد عرف بگ ہنٹر نہیں ہیں تو پھر بتائیں یہ کون ہیں؟ اور جو بھی ہیں پولیس کو مطلوب کیوں ہیں؟“

افسر نے کہا۔ ”بارودا سے ہونے والی کشتی کا انجام ثابت کررہا ہے کہ یہ بجوبہ ہیں۔ پرنس عابد علی منگی کی طرح عجیب وغریب جسمانی قوتوں کے حامل ہیں بلکہ یہی پرنس عابی ہیں۔“

عابی نے کہا۔ ”تعجب ہے۔ وہ پرنس اپنی ریاست میں آرام فرمارہا ہوگا اور تم اسے یہاں میرے وجود میں دیکھ رہے ہو۔ کیا تمہارے اوپر والوں نے یہ معلوم کیا ہے کہ پرنس اپنی ریاست میں نہیں ہے اور یہاں بھیس بدل کرآیا ہے؟“

افسر نے کہا۔ ”اعلیٰ سطح پر ریاست کے حکمران مراد علی منگی سے رابطہ کیا جارہا ہے۔ ضرور اس بات کی تصدیق ہوگی کہ پرنس وہاں نہیں ہے۔ یہاں ہے اور وہ تم ہو۔“

دوسری طرف سپر پاور کا ایک اعلیٰ حاکم مراد سے رابطہ کرنا چاہتا تھا۔ مراد مصروفیات کا بہانہ کرکے اسے چند گھنٹوں تک ٹالتا رہا۔ وہ ان کی بے تابیوں کو سمجھ رہا تھا۔ بگ ہنٹر اگر پرنس عابی ثابت نہ ہوتا تو وہ اسے عابی کے مقابلے میں بڑی سے بڑی قیمت پر حاصل کرلیتے۔ آئندہ اسے عابی کی سرکوبی کے لیے استعمال کرتے رہتے۔

آخر اس نے رابطہ کیا۔ اعلیٰ حاکم نے کہا۔ ”یور ہائی نس! ہم پرنس عابد علی منگی سے باتیں کرنا چاہتے ہیں۔“

”وہ سو رہا ہے۔ اگر اسے جگانا ضروری نہیں ہے تو وہ باتیں مجھ سے کریں۔“

”پرنس سے گفتگو ضروری ہے۔ پلیز آپ کوئی سوال نہ کریں۔ ہم انہیں اسکرین پر دیکھ کر باتیں کرنا چاہتے ہیں۔“

”اچھی بات ہے۔ انتظار کرو۔“

انہوں نے تھوڑی دیر بعد عابی کو اپنی ٹی وی اسکرین پر دیکھا۔ اس نے ناگواری سے پوچھا۔ ”کیا پرابلم ہے؟ آپ حضرات مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟“

”ہم شرمندہ ہیں۔ آپ کو نیند سے جگایا ہے۔ اگر آپ جاگ رہے ہوتے اور آپ نے بارودا سے بگ ہنٹر کا مقابلہ دیکھا ہوتا تو ہماری طرح حیران رہ جاتے۔“

عابی نے کہا۔ ”میں اس وقت جاگ رہا تھا۔ مقابلہ دیکھنے کے بعد سونے گیا تھا۔ بے شک یہ کس قدر حیرانی کی بات ہے۔ وہ میری طرح جسمانی قوت کا حامل ہے اور اس کے ایک ہی حملے سے مقابل ناکارہ ہوجاتا ہے۔“

اعلیٰ حاکم نے پوچھا۔ ”آپ کے دل میں تجسس ہوگا کہ وہ آپ کے مقابلے میں زیادہ قوی ہے یا کمزور ہے؟“

”میرے اللہ نے مجھے قوتیں دی ہیں۔ اللہ تعالیٰ قادر مطلق ہے۔ دوسروں کو بھی غیر معمولی قوتیں عطا کرتا ہے۔ اس کی شہ زوری اس کے ساتھ، میری شہ زوری میرے ساتھ۔ میں کسی طرح کے تجسس میں مبتلا نہیں ہوں۔“

”اگر وہ کبھی آپ کے مقابلے پر آئے گا تو نتیجہ کیا ہوگا؟“

”وہی ہوگا' جو منظورِ خدا ہوگا۔“

”ہم چاہتے ہیں اور اگر آپ مناسب سمجھیں تو اس سے ایک بار مقابلہ کریں۔“

”میں مناسب نہیں سمجھتا۔ وہ ایک پیشہ ور کشتی لڑنے والا ہے اور میں ایک ریاست کا شہزادہ ہوں۔ یہ مقابلہ میرے شایانِ شان نہیں ہوگا۔ میری اور اس کی سماجی حیثیت میں زمین آسمان کا فرق ہے۔“

”اگر وہ کبھی خود آپ سے مقابلہ کرنے آئے گا تو حالات کیا ہوں گے؟ کیا اس سے کترا جائیں گے؟“

”نہیں، اسے سمجھاؤں گا کہ ہمیں اپنی اپنی جسمانی قوتوں کو تماشا نہیں بنانا چاہیے۔ اللہ نے جو قوتیں اور صلاحیتیں دی ہیں' انہیں نیک مقاصد کے لیے استعمال کرنا چاہیے۔ میں آپ حضرات کے ذریعے اسے یہ آفر دیتا ہوں کہ وہ ہماری ریاست میں آئے اور ایک مسلمان بھائی کی طرح یہاں ہمارے ساتھ دین وایمان کے تقاضے پورے کرے۔“

اس کے جوابات نے سپر پاور کو مایوس کیا۔ انہوں نے رابطہ ختم کر دیا۔ یہ یقین ہو گیا کہ بگ ہنٹر بہرہ پیا نہیں ہے۔ دنیا میں ایک سے بڑھ کر ایک ہوتے ہیں۔ عابی کے مقابلے میں سوا سیر پیدا ہو گیا ہے۔

انہوں نے حکم صادر کیا کہ بگ ہنٹر کو ویری امپورٹنٹ پرسن کا درجہ دیا جائے۔ اسے اتنی اہمیت دی جائے کہ وہ دوست اور وفادار بن کر ان کے کام آئے۔ ان احکامات کے مطابق اس سے ملاقات کی گئی۔ اسے شاہی محل میں مدعو کیا گیا۔ وہاں بڑے ممالک کے چند حکمرانوں کے علاوہ صیہونی تنظیم کے اکابرین بن زیان اور کریگ ہوسٹن جیسے سیاسی بازی گر بھی تھے۔ لارا، امی مالا، طاغوتا اور آبنوس بھی خیال خوانی کے ذریعے آ گئے تھے۔

لارا نے ایک آلۂ کار کے ذریعے کہا۔ ''بگ ہنٹر! تم نے ہمارے ایک ٹیلی پیتھی جاننے والے کو مار ڈالا لیکن ہم شکایت نہیں کریں گے۔ ریسلنگ کے دوران پہلوان بھی ٹوٹ پھوٹ کر ناکارہ ہو جاتے ہیں۔ کبھی زندگی بھی ہار جاتے ہیں۔ ہم تمام ٹیلی پیتھی جاننے والے بارودا کا خون معاف کرتے ہیں اور تمہاری طرف دوستی کا ہاتھ بڑھاتے ہیں۔''

کریگ ہوسٹن نے کہا۔ ''مسٹر ہنٹر! یہاں اعلیٰ حکام ہیں اور معتزز اکابرین ہیں۔ ہم سب یقین دلاتے ہیں کہ تمام ٹیلی پیتھی جاننے والے تمہارے سچے دوست بن کر وقتِ ضرورت تمہارے کام آتے رہیں گے اور ہماری دوستی تمہاری توقع سے زیادہ تمہیں دولت مند بنا دے گی۔ تم جس ملک میں جاؤ گے، وہاں صرف ایک کریڈٹ کارڈ کے ذریعے تمہاری مہنگی سے مہنگی ضرورتیں پوری ہوتی رہیں گی۔ دنیا کا تمام حسن اور تمام عیش و آرام ایک چٹکی بجاتے ہی حاصل کر لیا کرو گے۔''

عابی نے کہا۔ ''میں حیران ہوں کہ صرف ایک بارودا کو ہلاک کرنے کے نتیجے میں ساری دنیا کا عیش و آرام اور سہولتیں مجھے دی جا رہی ہیں۔ یہ بارودا کون تھا؟ کیا میں نے آپ لوگوں کو ایک بہت بڑے عذاب سے نجات دلائی ہے؟''

''بارودا عذاب نہیں تھا۔ ہمارا ایک زبردست غیر معمولی طاقتور ساتھی تھا۔ وہ صرف پرنس عابی کے مقابلے میں ذرا کمزور پڑ گیا تھا۔ تم نے جس انداز میں بارودا کو ہلاک کیا ہے، وہ انداز، وہ طریقہ کار ہو بہو پرنس عابی کا ہے۔ وہ بھی ہتھیار کے بغیر مخالفین کی ہڈیاں توڑ دیتا ہے۔ اس کا جسم بھی فولاد کی طرح سخت ہے۔ اس پر حملہ کرنے والے خود ہی زخمی ہو جاتے ہیں۔ کیا تم پیدائشی ایسے شہ زور ہو؟''

''ہاں۔ میں پیدائشی ایسا ہی ہوں۔ تم لوگوں کو میری غیر معمولی جسمانی قوت سے دلچسپی کیوں ہے؟''

''ہمیں پرنس عابی کی جسمانی قوتیں طلسمی لگتی تھیں۔ ہم سمجھتے تھے، اسے کوئی مات نہیں دے سکے گا لیکن تم اسے صرف مات ہی نہیں دے سکو گے، اسے توڑ پھوڑ کر بھی رکھ دو گے۔''

''وہ ریاست کا شہزادہ ہے۔ اپنی سطح سے نیچے آ کر مجھ سے کشتی نہیں لڑے گا۔''

''ہم اپنی حکمتِ عملی سے اسے لڑنے پر مجبور کر دیں گے۔''

عابی نے کہا۔ ''مجھے کوئی چیلنج کرتا ہے، تب میں مقابلہ کرتا ہوں۔ آپ سمجھ سکتے ہیں' وہ شہزادہ مجھ جیسے پیشہ ور ریسلر کو بھی کوئی اہمیت نہیں دے گا۔''

''ہم ایسی چالیں چلیں گے کہ وہ مجبور ہو کر تم پر حملہ کرنے چلا آئے گا۔ اسے ریاست سے باہر نکالنے اور تم سے دشمنی کرنے پر مجبور کرنے میں کچھ وقت لگے گا۔ فی الحال ہم نے تمہاری خدمات حاصل کی ہیں۔ تم ہماری اتحادی فوج کے ایک اسپیشل افسر کے عہدے پر رہو گے۔ تمام بڑے ممالک کے آرمی افسران تمہیں سیلوٹ کریں گے اور تمہارے تمام احکامات کی تعمیل کیا کریں گے۔''

''آپ حضرات مجھ جیسے ریسلر کی اوقات سے بہت زیادہ عزت، عیش و عشرت اور دولت دے رہے ہیں۔ میں دل و جان سے آپ کا خدمت گزار بن کر رہوں گا۔''

بن زیان نے کہا۔ ''تمہیں سب سے پہلے مراد کے بیٹے شہزاد پر نظر رکھنی ہو گی۔ آئندہ ہماری پلاننگ کے مطابق اس کے لیے مشکلات پیدا کرو گے تو مراد اور عابی اس کی حفاظت کے لیے ضرور ریاست سے نکل کر یہاں آئیں گے۔''

امی مالا نے کہا۔ ''فی الحال اسے چھیڑا نہیں جائے گا۔ میں نے اسے تنویمی عمل کے ذریعے اپنا تابعدار عاشق بنا کر رکھا ہے۔ کچھ روز عیاشی کرنے کے بعد دل بھر جائے گا تو اسے تم لوگوں کے حوالے کر دوں گی۔''

عابی سر جھکا کر سن رہا تھا۔ یہ پہلی بار معلوم ہوا کہ ٹیلی پیتھی جاننے والی ایک عورت نے شہزاد کو اپنا معمول اور تابعدار بنا رکھا ہے۔ یہ معلومات بڑی تشویشناک تھیں۔ دشمن ان کی لاعلمی میں سرنگ بنا کر چھپے ہوئے تھے۔ کسی وقت بھی شہزاد کو بھاری نقصان پہنچا کر مراد کو اور عابی کو جھکنے پر مجبور کر سکتے تھے۔

اس کے اندر ہلچل سی ہو رہی تھی۔ وہ دشمنوں کے اس حملے سے بے خبر تھے۔ وہ باپ بیٹے اب تک نقصان اٹھا

رہے تھے اور سمجھ رہے تھے کہ سب خیریت ہے اور دشمن ٹھنڈے بیٹھے ہوئے ہیں۔ اب حقیقت معلوم ہوتے ہی عابی کا دماغ گرم ہو رہا تھا۔

وہ سپر پاور اور ان کے اتحادیوں اور یہودی اکابرین کے درمیان بیٹھا اپنی خدمات انہیں فروخت کر رہا تھا۔ ٹیلی پیتھی جاننے والے بھی خیال خوانی کے ذریعے موجود تھے۔ ان میں وہ امبی مالا بھی تھی جس نے اس کے بھائی کو اپنا غلام معشوق بنا رکھا تھا۔

'یہ امبی مالا کون ہے؟' وہ سوچنے لگا۔ 'اسے دیکھنا اور پکڑنا آسان ہوگا۔ جو لڑکی ان دنوں بھائی جان (شہزاد) سے فلرٹ کر رہی ہوگی اور جس کے بھائی جان دیوانے ہوں گے، وہی امبی مالا ہوگی۔ اسے تو آج ہی ایک چٹکی میں مسل کر پھینک دوں گا لیکن نہیں۔ آج ہی اس کی موت ہوگی تو انہیں مجھ پر شبہ ہوگا۔ امبی مالا پر پہلے کسی نے حملہ نہیں کیا تھا۔ بھائی جان کو ٹریپ کرنے کی بات میرے سامنے کہی گئی ہے۔ اس کے بعد ہی امبی کو ہلاک کیا گیا ہے۔ ویسے بھی یہ لوگ مجھے عابی سمجھتے رہے تھے۔ یہ خیال ان کے دماغ سے نکالا گیا ہے۔ اب پھر شبہ ہوسکتا ہے کہ میں ڈبل رول پلے کر رہا ہوں۔ اور یہ کہ میں درپردہ عابی ہوں اور میں نے امبی کو ہلاک کیا ہے۔ نہیں، اسے ہلاک کرنے کے سلسلے میں جلدی نہیں کرنی چاہیے۔ بہت سوچ سمجھ کر بھائی جان کو اس کے تنویمی عمل سے نجات دلانی ہوگی۔'

ابھی حالات یہ تھے کہ پرنس عابی تمام دشمنوں کے لیے ناقابلِ شکست اور خطرناک تھا اور وہی عابی یعنی بگ ہنٹر ان کے خطرناک دشمن کو کچلنے کا معاہدہ ان سے کر چکا تھا۔ انہیں پورا یقین تھا کہ بگ ہنٹر عابی کو موت کے گھاٹ اتارے گا۔ اگر ایسا نہ کر سکا، تب بھی مقابلہ برابر رہا کرے گا۔ دونوں کے درمیان جنگ جاری رہا کرے گی۔

اس نے دشمنوں کے اس اجلاس سے نکل کر اپنی رہائش گاہ کی طرف جاتے ہوئے مراد سے رابطہ کیا۔ ''بابا جانی! ہم دھوکا کھا رہے ہیں۔ بھائی جان دشمنوں کے چنگل میں ہیں اور ہم بے خبر ہیں۔''

اس نے بتایا کہ امبی مالا ایک عیاش ٹیلی پیتھی جاننے والی عورت ہے۔ وہ شہزاد کو اپنا غلام بنا کر اس کے ساتھ گناہ کا کھیل کھیل رہی ہے۔ یہ بہت بڑا المیہ تھا، انتہائی صدمہ پہنچانے والی بات تھی کہ پہلی بار مراد کا ایک بیٹا ایک گناہ گار کی زندگی گزار رہا تھا اور وہ اب تک بے خبر رہے تھے۔

ایمان کا' طہارت کا تقاضا تھا کہ شہزاد کو فوراً ہی گناہ کی دلدل سے نکالا جائے۔ مراد نے کہا۔ ''ابھی انتقامی کارروائی نہ کی جائے۔ امبی مالا کو ہلاک نہ کیا جائے۔ شہزاد کو چپ چاپ اس کے شکنجے سے نکالا جائے۔ اس سے نجات ملتے ہی وہ گناہ سے باز آجائے گا۔''

دوسرے عامل کے ذریعے امبی مالا کے تنویمی عمل کا توڑ کرایا جاسکتا تھا۔ مراد نے کہا۔ ''ہم نے شہزاد پر تنویمی عمل کرایا تھا۔ معلوم ہوتا ہے، امبی مالا نے چالاکی دکھائی تھی۔ ہمارے عامل کے عمل کا توڑ کر کے خود شہزاد پر حاوی ہوگئی تھی۔''

عابی نے کہا۔ ''اس بار بھی وہ ایسا کرسکتی ہے۔ ہمیں شہزاد پر عمل کرانے سے پہلے یہ یقین کرنا ہوگا کہ وہ مکار عورت ہمارے اقدامات سے بے خبر ہے۔''

''تمہیں یہ کوشش کرنی ہوگی کہ کسی طرح اس کی مصروفیات کا علم ہوتا رہے۔ ادھر تم اس پر نظر رکھو گے تو ہم ادھر شہزاد کا دماغ واش کرا دیں گے۔''

عابی نے اس معاملے کو کئی پہلوؤں سے دیکھا' سوچا پھر بن زیان سے کہا۔ ''مجھے ٹیلی پیتھی جاننے والوں سے دلچسپی ہے۔ میں ان سے باتیں کرنا چاہتا ہوں۔''

بن زیان نے لارا سے کہا۔ لارا نے طاغوتا کو بگ ہنٹر سے رابطہ کرنے کے لیے کہا۔ طاغوتا نے فون پر کہا۔ ''ہیلو مسٹر ہنٹر! تم سے باتیں کر کے خوشی ہوگی۔ کیا یہ بہتر نہیں ہوگا کہ میں تمہارے دماغ میں آ کر بولوں؟''

عابی نے کہا۔ ''سوری۔ میں کسی بھی خیال خوانی کرنے والے کو اپنے اندر آنے کی اجازت نہیں دوں گا۔''

''کوئی بات نہیں پھر بھی ہم دوست رہیں گے۔''

''میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ کبھی پرنس عابی سے میرا مقابلہ ہوگا تو ایسے وقت تم لوگ اس کے اندر جا کر اسے کمزور بنا سکو گے؟''

''ہاں ضرور۔ یہ ہم نے پہلے ہی سوچ رکھا ہے۔ جب تم اسے زخمی کرو گے اور اس کا دماغ کسی قدر کمزور ہوگا تو ہم آسانی سے اس پر حاوی ہو جائیں گے۔ اس کے بعد مقابلہ دھرا کا دھرا رہ جائے گا۔ ہم اس کے اندر ایسا زلزلہ پیدا کریں گے کہ وہ نیم مردہ ہو کر رہ جائے گا۔ اس کے بعد جو سلوک اس سے ہم کریں گے' اسے دنیا دیکھے گی۔''

''مسٹر طاغوتا! مجھے یقین نہیں ہے کہ ایک ریاست کا پرنس کبھی مجھ سے کشتی لڑنے آئے گا اور آئے گا تو کتنی مدت تک اس کا انتظار کرنا ہوگا۔ کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ امبی مالا نے جس طرح شہزاد کو پھانسا ہے، اسی طرح عابی کو بھی پھانس لے۔''

"وہ نگاہوں کے سامنے آئے گا تب ہی اسے ٹریپ کر سکے گی۔ وہ تو ریاست سے باہر ہی نہیں آ رہا ہے۔"

"وہ باہر نہیں آ رہا ہے لیکن سوچو ہم اس ریاست کے اندر جا سکتے ہیں۔"

عابی نے بن زیان سے کہا۔ "میرے ذہن میں ایک تدبیر ہے۔ اگر امی مالا بہت حسین ہے۔ اگر وہ شہزاد کی طرح عابی کو بھی پھانس سکتی ہے تو میں ریسلنگ کے تماشے کرنے امی کے ساتھ اس ریاست میں جاؤں گا۔ وہاں کھیل تماشوں کے لیے جانے کی اجازت مل ہی جاتی ہے۔"

"زبردست آئیڈیا ہے۔ امی اگر عابی کو پھانسنے میں ناکام رہے گی، تب بھی تم مختلف مقابلوں کے دوران میں پرنس عابی کو دوستانہ مقابلے کی دعوت دے سکو گے۔"

عابی نے کہا۔ "یہی کروں گا۔ وہ دوستانہ مقابلے کے لیے آئے گا تو اسے زخمی کر کے اپنے ٹیلی پیتھی جاننے والوں کو اس کے اندر پہنچا سکوں گا۔"

وہ اپنے طور پر امی کو شہزاد سے دور لے جانے اور اسے اپنی نظروں میں رکھنے کی پلاننگ پر عمل کرانا چاہتا تھا۔ دشمنوں کے لیے یہ منصوبہ قابلِ قبول تھا لیکن ٹیلی پیتھی جاننے والے شیطان کے پرستار ریاست کی زمین پر قدم رکھنے کے خیال سے ہی ڈر جاتے تھے۔

وہ ماضی میں کئی بار وہاں جا کر مرتے مرتے بچ کر آئے تھے۔ کان پکڑ چکے تھے کہ اس ریاست میں کبھی نہیں جائیں گے۔

کاہن نے کہا۔ "بگ ہنٹر کے ساتھ امی کا وہاں جانا ضروری نہیں ہے۔ ہنٹر ریسلنگ کے تماشے کرنے وہاں تنہا جا سکتا ہے۔ خیال خوانی کرنے والے اس کے آس پاس رہا کریں گے۔"

واقعی امی کا وہاں جانا ضروری نہیں تھا لیکن وہ ہوس پرست عورت ایک عرصے سے پرنس عابی کی دیوانی تھی۔ ہوس کبھی بجھتی نہیں ہے۔ ہمیشہ بھڑکتی رہتی ہے۔

اسے پہلی بار پرنس عابی کے قریب جانے کا موقع مل رہا تھا۔ اس نے کہا۔ "میں جاؤں گی۔ مجھے کوئی خطرہ پیش نہیں آئے گا۔ میں نادان نہیں ہوں۔ بہت محتاط رہوں گی۔ خطرے کی بو ملتے ہی چشم زدن میں غائب ہو جاؤں گی پھر یہ کہ سب سے پہلے نیلیاں کی مخبری کے باعث وہاں آبنوس اور لارا پر مصیبتیں آئی تھیں۔ اب کوئی مخبر نہیں ہے۔ کسی کو معلوم نہیں ہوگا کہ بگ ہنٹر کے ساتھ ریاست میں آنے والی ٹیلی پیتھی جانتی ہے اور شیطان کی پرستار ہے۔"

مجموعی طور پر یہ بات سامنے آ رہی تھی کہ بگ ہنٹر ریاست میں ہی جا کر عابی کو مقابلے کے لیے راضی کر سکے گا۔ ورنہ پرنس مدتوں محل چھوڑ کر کہیں نہیں جائے گا۔

سب ہی متفق ہو گئے۔ ورلڈ ریسلنگ کے ادارے نے مراد کے نام درخواست بھیجی کہ اسے ریاست میں کشتی اور پہلوانی کے دلچسپ مقابلے کرانے کی اجازت دی جائے۔

یہ تو بیٹے کی پلاننگ تھی۔ باپ کو اجازت دینی ہی تھی۔ لہٰذا ریاست میں آنے کی اجازت دے دی گئی۔ امی کو شہزاد سے دور کرنے کے سلسلے میں خاصا وقت گزرتا رہا۔ اس دوران کبڈی نے سخت رویہ اختیار کیا۔ وہ شہزاد کے بنگلے سے باہر جانے پر پابندیاں عائد کرتا رہا۔ اسے یہ بتایا کہ وہ اسے کسی لڑکی سے ملتے اور اس کے ساتھ بے تکلفی سے وقت گزارتے دیکھ چکا ہے۔

شہزاد کبھی پابندیوں پر سر جھکا لیتا تھا، کبھی جھنجلاتا تھا۔ امی اس کے اندر رہ کر اسے بغاوت پر اکساتی تھی۔ ایک رات شہزاد چھپ کر بنگلے سے باہر اس سے ملنے گیا لیکن جہاں پہنچا، وہاں امی سے پہلے کبڈی موجود تھا۔ اس نے کہا۔ "بیٹے! تم اس باپ کے بیٹے ہو جو چوری سے پہلے چور کو پکڑ لیا کرتا ہے۔ ہم نے یہ گر اسی استاد سے سیکھے ہیں۔"

بہرحال شہزاد کو گناہ سے بچانے کی کوششیں کی جاتی رہیں۔ آخر عابی، امی کو لے کر ریاست کی طرف چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی ہپناٹزم کے ماہر کو بلایا گیا پھر ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کیا گیا۔ شہزاد کے دماغ سے امی کے تنویمی عمل کو ختم کر دیا گیا۔

جب وہ تنویمی نیند پوری کر کے بیدار ہوا تو کبڈی اس کے پاس آ کر بیٹھ گیا پھر بولا۔ "ہاں تو برخوردار! وہ لڑکی کون ہے جس سے ملنے کے لیے چھپ کر جاتے ہو؟"

وہ سر جھکا کر سوچنے لگا۔ تنویمی عمل کے ذریعے امی کی چاہت اور طلب کو دماغ سے نکال دیا گیا تھا۔ اس نے اپنا سر سہلاتے ہوئے کہا۔ "ایک لڑکی مجھے لندن ائرپورٹ پر ملی تھی، تب سے پتا نہیں کیوں حواس پر چھا گئی تھی۔"

"بیٹے! اس لیے کہ وہ ٹیلی پیتھی جانتی تھی۔ اس نے تمہارے دماغ کو جکڑ رکھا تھا۔ ہم نے تنویمی عمل کے ذریعے تمہیں اس سے نجات دلائی ہے۔ یہ بات میں نے پہلے بھی سمجھائی تھی کہ وہ جادوگرنی ہے لیکن تم اس کے سحر میں تھے۔ میری بات ماننے والے نہیں تھے۔"

وہ کبڈی کا ہاتھ تھام کر بولا۔ "سوری انکل! میں نے انجانے میں آپ کی نافرمانی کی ہے۔ اب عقل آ رہی ہے کہ

بابا جانی کے دشمن ایسی چالیں بھی چلتے ہیں کہ بیٹا اپنے باپ کے دشمنوں سے محبت کرنے لگتا ہے۔ میں آئندہ بہت محتاط رہوں گا۔"

مراد اور عابی نے کسی طرح کی انتقامی کارروائی پر عمل کیے بغیر شہزاد کو امی سے نجات دلائی۔ اب وہ عابی کے ساتھ ریاست میں پہنچ کر پوری طرح شکنجے میں آگئی تھی۔ اس کی گردن دبوچ لی جاتی تو وہ پلکیں جھپک کر غائب نہیں ہوسکتی تھی۔

فی الحال اسے ڈھیل دی جارہی تھی۔ آگے چل کر حالات جو تقاضا کرتے اسی کے مطابق عمل کیا جاتا۔ ویسے وہ ریاست کی زمین پر قدم رکھتے ہی پانچوں حواس کے ساتھ محتاط ہوگئی تھی۔ یہ دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش کررہی تھی کہ کوئی اسے شک وشبے کی نظروں سے دیکھ رہا ہے یا نہیں؟

وہ کسی کے قریب نہیں جارہی تھی۔ کسی سے مصافحہ نہیں کررہی تھی کیونکہ مصافحہ کرنے کے بہانے کوئی اسے پکڑ سکتا تھا۔

وہاں اس کی پہلی اور آخری خواہش تھی کہ پرنس عابی سے ایک ملاقات ہوجائے۔ اس کے قریب چلی جائے اور کسی طرح اپنا جادو جگائے۔ ایک کے بعد دوسری ملاقات مقرر ہوگی تو اس پر مسلط ہونے کا موقع ملتا رہے گا اور اگر ایسا نہ ہوا تو پھر وہاں نہیں رہے گی۔ دوسرے ہی دن لندن واپس چلی جائے گی۔ وہاں اس کا دل بہلانے کے لیے شہزاد تھا۔

اس نے مسکرا کر تصور میں شہزاد کو دیکھا۔ وہ گھر کا مرغا دال برابر تھا۔ جب چاہے اسے حاصل کرسکتی تھی۔ اس نے یونہی ہائے ہیلو سننے کے لیے اسے مخاطب کرنا چاہا۔ خیال خوانی کی پرواز کرتی ہوئی اس کے دماغ میں پہنچی تو اس کے ذہن کو حیرانی کا ایک جھٹکا لگا۔ گھر کے مرغے نے اسے سانسیں روک کر بھگا دیا تھا۔

وہ تھوڑی دیر تک حیرانی سے خلا میں تکتی رہی، سوچتی رہی۔ 'مجھے حیران نہیں ہونا چاہیے۔ اب سے پہلے بھی شہزاد پر اس کے باپ نے تنویمی عمل کرانا چاہا تھا۔ میں نے اس عمل کو ناکام بنا دیا تھا۔ اس پر پھر کوشش کی ہے اور کامیاب ہوگیا ہے۔ کوئی بات نہیں۔ وہ میرا دیوانہ ہے۔ میں پھر اس کے اندر جاکر اس کے دماغ کو کمزور بنا کر پھر اسے زیر اثر لے آؤں گی۔'

اس نے فون کے ذریعے اسے مخاطب کیا۔ "ہیلو شہزاد! میں بول رہی ہوں۔"

اس نے پوچھا۔ "میں کون......؟"

"کیا ہوا ہے تمہیں؟ کیا اپنی امی کو نہیں پہچان رہے ہو؟"

اس نے پھر پوچھا۔ "کون امی......؟"

وہ ایک گہری سانس لے کر بولی۔ "اچھا تو تنویمی عمل نے مجھے پوری طرح نچوڑ کر تمہارے دماغ سے باہر پھینک دیا ہے۔"

وہ فون بند کرتے ہوئے بولی۔ "دیکھوں گی...... تجھے ہاتھ سے جانے نہیں دوں گی۔ تیرا باپ بہت چالاک بنتا ہے۔ یہیں ریاست میں ہے۔ وہ باپ بیٹے کشتی کا مقابلہ دیکھنے ضرور آئیں گے۔"

وہ سوچنے لگی۔ ’کیا کروں؟ کیوں نہ اس بار بیٹے کو چھوڑ دوں۔ باپ کو پکڑ لوں۔ بڈھے کو جوانی کا جھولا جھلاؤں گی۔ بس وہ میرے داؤ میں آجائے۔‘

کاہن نے اسے سمجھایا تھا کہ وہ ریاست میں ضرور جائے لیکن عابی اور مراد کے قریب نہ جائے۔ اب تک یہی دیکھنے میں آیا تھا کہ شیطان کی پرستش کرنے والے ان کے قریب جا نہیں پاتے ہیں۔ اگر وہ قریب جانے میں ناکام رہے گی تو انہیں یقین ہوجائے گا کہ وہ شیطان کی پرستار ہے۔

اور امبی مالا نے سوچا تھا کہ خطرہ مول لینا نہیں چاہیے۔ ان باپ بیٹے سے کہیں تنہائی میں ملے گی۔ پہلے پلک جھپکتے ہی غائب ہوکر معلوم کرے گی کہ وہ دونوں کہاں ہیں؟ ایسے وقت وہ بڈھے کو بعد میں جوان کو پہلے دیکھے گی، وہ جہاں تنہا ہوگا، وہاں پہنچ جائے گی۔ جب اس کے بالکل قریب نہیں پہنچ پائے گی تو پھر خطرہ یقینی ہوگا۔ وہ چشمِ زدن میں وہاں سے فرار ہوجائے گی۔

وہ مختلف پہلوؤں سے سوچتی رہتی تھی اور اپنے بچاؤ کے ہر پہلو کو اچھی طرح یاد رکھتی تھی۔ یوں دیکھا جائے تو وہ عابی کے قریب ہی تھی۔ امبی کے خواب و خیال میں بھی نہیں آسکتا تھا کہ وہ جسے ٹریپ کرنا چاہتی ہے، اسی کے ساتھ ہزاروں میل دور چلی آئی ہے۔

امبی نے آدھی رات کے بعد سوچا ’پرنس عابی گہری نیند میں ہوگا۔ مجھے ایسے ہی وقت جانا چاہیے۔ میں اسے نیند کی حالت میں دیکھوں گی۔ ذرا فاصلے سے سمجھوں گی پھر اسے اعصابی کمزوری کا انجکشن لگاؤں گی۔ وہ ساری شہ زوری بھول جائے گا۔ میں اس کے دماغ میں پہنچ کر اسے اپنا تابعدار بنالوں گی۔ اور اگر وہ میرے وہاں پہنچتے ہی ہوشیار ہوجائے گا تو اسے اپنے قریب آنے کا موقع ہی نہیں دوں گی۔ ایک ہی لمحے میں وہاں سے لندن پہنچ جاؤں گی۔ مجھے ابھی جانا چاہیے۔ نہیں جاؤں گی تو نیند نہیں آئے گی۔ صبح سے سوچ سوچ کر پاگل ہورہی ہوں۔‘

وہ عابی تک پہنچنے اور اسے ٹریپ کرنے کے سلسلے میں پوری پلاننگ کے ساتھ آئی تھی۔ اس نے ایک چھوٹی سی سرنج میں اعصابی کمزوری کی دوا بھری پھر پلک جھپکتے ہی اپنے کمرے سے غائب ہوگئی۔ دوسرے ہی لمحے میں ایک دوسرے کمرے میں پہنچ گئی جبکہ محل میں ایک ڈمی عابی کے پاس پہنچنا تھا۔

لیکن اس نے کسی ڈمی کے پاس پہنچنے کا نہیں، حقیقی کے پاس پہنچنے کا ارادہ کیا تھا۔ اس لیے بگ ہنٹر (عابی) کے کمرے میں پہنچ گئی تھی۔ وہ نظر نہیں آرہا تھا۔ امبی نے حیرانی سے کہا۔ ”ہنٹر! یہ تو تمہارا کمرا ہے۔ میں تو عابی کے پاس جانا چاہتی تھی تمہارے پاس کیسے......“

اس کی آواز حلق میں پھنس گئی۔ عابی نے پیچھے سے گردن دبوچ لی تھی۔ کہہ رہا تھا۔ ”تم صحیح جگہ پہنچی ہو۔ میں چاہتا تھا کہ ابھی بھید نہ کھلے لیکن تمہاری حرکتوں سے کھل رہا ہے۔ یہ سرنج کیسی ہے؟ مجھے مار ڈالنے یا کمزور بنادینے آئی ہو؟“

اس نے سرنج لے کر امبی کے بازو میں گھونپ دی۔ اس کے حلق سے ایک کراہ نکلی۔ شکنجے میں آئی ہوئی گردن بھی دکھ رہی تھی۔ کمزوری کے باعث خیال خوانی کرنے کے قابل نہیں رہی تھی۔ تاریک دنیا کے کسی ساتھی کو مدد کے لیے بلا نہیں سکتی تھی۔

وہ اس کی گردن کو ہلکا سا جھٹکا دے کر بولا۔ ”ذلیل عورت! میرے بھائی جان ہوس پرست اور عیاش نہیں تھے۔ تو نے انہیں گناہ گار بنادیا۔ تجھے تو تڑپا تڑپا کر مارنا چاہیے لیکن تجھے جہنم میں فوراً نہ پہنچایا تو تیرا کوئی بھی مددگار اچانک آسکتا ہے پھر اسے بھی معلوم ہوجائے گا کہ بگ ہنٹر ہی پرنس عابی ہے۔“

یہ کہتے ہی اس نے امبی کی گردن پر گرفت ذرا مضبوط کی تو اس کے دیدے پھیل گئے۔ وہ ایک کے بعد دوسری سانس نہ لے سکی۔ اسے آج نہیں تو کل عابی کے ہاتھوں ہی مرنا تھا۔ سو مرگئی۔

اس کی لاش کو فوراً ہی محل میں ڈمی عابی کے پاس پہنچایا گیا۔ ریاست کے ذاتی ٹی وی چینل اور اسپیشل چینل کے عملے کو بلایا گیا۔ کیمرے آن ہوگئے۔ امبی مالا کی ہلاکت کے سلسلے میں جو بیان دیا جانے لگا، اس کی آڈیو اور ویڈیو ریکارڈنگ ہونے لگی۔

مراد اور عابی نے ڈمی عابی کو جو سمجھایا، اسی کے مطابق وہ کیمرے کے سامنے بیان دینے لگا۔ کہنے لگا۔ ”ٹی وی کے تمام ناظرین میرے کمرے میں ایک عورت کی لاش دیکھ رہے ہیں۔ اس کا نام امبی مالا ہے۔ یہ تاریک دنیا سے آئی ہے اور یہ شیطان کی پوجا کرنے والوں میں سے ہے۔ قصہ یہ ہے کہ ہماری ریاست میں فن کشتی کا مظاہرہ کرنے جتنے پہلوان آئے ہیں، ان میں سے ایک پہلوان جواد احمد عرف بگ ہنٹر ہے۔ یہ عورت امبی مالا اس بگ ہنٹر کے ساتھ یہاں آئی تھی۔ ہم نے اسے بھی گرفتار کرلیا ہے۔“

کیمروں کے ذریعے عابی کو ایک جگہ دکھایا جارہا تھا۔

بھابھی

لڑکا راہ چلتے ہوئے ٹھوکر لگنے سے گدھے کے پاؤں میں جاگرا۔

پاس سے گزرتی ہوئی لڑکی بولی۔ ''بڑے بھائی کے پاؤں چھو رہے ہو۔''

لڑکا بولا۔ ''جی بھابھی۔''

مرسلہ۔ عبدالجبار رومی انصاری چوہنگ، لاہور

☆☆☆

شیطان کے معبد میں ماتمی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ لارا، آبنوس اور طاغوتا سر جھکائے کاہن کے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ بارودا کے بعد امی مالا کی موت ہوئی تھی۔ چند ہی دنوں میں دو ٹیلی پیتھی جاننے والے نابود ہوگئے تھے۔

وہ خیال خوانی کے ذریعے بن زیان سے رابطے میں تھے۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ''بہت بڑا نقصان ہوا ہے۔ دو ٹیلی پیتھی جاننے والے کم ہوگئے ہیں۔ یہ حیران اور پریشان کرنے والا سانحہ ہے۔ کسی دشمن سے مقابلہ نہیں ہوا اور ہمارے دو انمول ہتھیار ٹوٹ گئے۔ یہ ہماری آنکھوں کے سامنے کیسے ہوگیا؟ ہم سمجھ کیوں نہیں پائے کہ بہت بڑے نقصان کی طرف جارہے ہیں۔''

آبنوس نے کہا۔ ''تم تمام یہودی ہمارے مشیر ہو۔ ہمارے راہنما ہو۔ جو مشورے دیتے ہو ہم اس پر عمل کرتے ہیں۔''

بن زیان نے کہا۔ ''میں نے بارودا کو بگ ہنٹر سے مقابلہ کرنے کا مشورہ نہیں دیا تھا۔ سپر پاور اور اس کے اتحادی عابی کے مقابلے میں بگ ہنٹر کی جسمانی قوتوں کو تولنا چاہتے تھے۔ تم لوگوں نے ان کے مشورے پر وہ مقابلہ کرایا تھا۔''

طاغوتا نے کہا۔ ''بگ ہنٹر ہمارے بارودا کا قاتل ہے۔''

''ریسلنگ میں مرنے والے کو مقتول تو کہتے ہیں لیکن مارنے والے کو قاتل نہیں کہتے۔ اسے قانونی گرفت میں نہیں لایا جاتا۔''

اس معاملے میں بحث کی گنجائش نہیں تھی۔ وہ دشمنی کے نہیں، دوستی کے اکھاڑے میں مارا گیا تھا۔ وہ چند لمحوں تک چپ رہے پھر لارا نے پوچھا۔ ''اور امی مالا......؟''

آبنوس نے کہا۔ ''اسے تو ہوس پرستی اور جوانی کی مستی پرنس عابی کی طرف لے گئی تھی۔ اسے یہ گمان تھا کہ وہ اسے جھکڑی پہنادی گئی تھی۔ وہ سر جھکائے بیٹھا تھا۔ ڈمی عابی کہہ رہا تھا۔ ''ہمیں شبہ ہے کہ بگ ہنٹر نام کا مسلمان ہے اور در پردہ امی مالا کی طرح شیطان کی پوجا کرتا ہے۔''

عابی نے کہا۔ ''یہ مجھ پر الزام ہے۔ الحمدللہ میں مسلمان ہوں اور مسلمان ہی رہ کر اس دنیا سے جاؤں گا۔''

ڈمی نے پوچھا۔ ''مسلمان ہو تو شیطان کی بیٹی تمہارے ساتھ کیوں آئی تھی؟''

عابی نے کہا۔ ''ہماری دنیا میں انسانوں کے ساتھ شیطان بھی رہتے ہیں۔ وہ کس بھیس میں ہمارے ساتھ چلتے پھرتے ہیں پھر کب بچھڑ جاتے ہیں، یہ ہم نہیں جانتے۔ ہم انہیں اجنبی ہم سفر سمجھ کر بھول جاتے ہیں۔ میں جس فلائٹ میں یہاں آیا ہوں اسی فلائٹ میں امی مالا میری ہم سفر تھی۔ ہم لندن سے یہاں تک ساتھ رہے ہیں۔ ہمارے درمیان دوستی نہیں تھی، صرف آج ایک دن کی شناسائی تھی۔ آپ میرے متعلق انکوائری کریں گے تو میرا ایچ سامنے آجائے گا۔''

ڈمی نے کہا۔ ''ناظرین! ہمیں اس پہلوان بگ ہنٹر سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ اگر یہ شیطان کا پجاری نہیں ہوگا اور امی مالا سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہوگا تو ہم اسے کسی بھی فلائٹ کے ذریعے یہاں سے بھگادیں گے۔ ہمیں جس پر شبہ ہوجاتا ہے، ہم اسے اپنی ریاست میں رہنے نہیں دیتے۔''

پھر اس نے کہا۔ ''میں تاریک دنیا کے ان خبیث لوگوں سے مخاطب ہوں، جو شیطان کی پوجا کرتے ہیں۔ وہ اب سے پہلے دیکھ چکے تھے۔ ہماری ریاست میں جو بھی شیطان کا پرستار آتا ہے، اس پر موت دھاوا بولتی ہے۔ وہ چھپنے کے باوجود خود بخود ظاہر ہوجاتا ہے۔ آبنوس اور لارا بھی یہاں آکر مارے جانے والے تھے۔ اپنی قسمت سے بچ کر نکل گئے۔ یہ امی مالا نہ بچ سکی۔ اس کی لاش دو دنوں تک یہاں کے مردہ خانے میں پڑی رہے گی۔ کوئی بھی کسی بھی ملک سے آکر اسے لے جاسکتا ہے۔ یہ دو دنوں کے بعد بھی لاوارث رہے گی تو اسے دریا میں پھینک دیا جائے گا۔''

کسی بھی ملک سے یا تاریک دنیا سے کسی نے جواباً یہ نہیں کہا کہ وہاں آکر اس کی لاش لے جائیں گے اور کسی رشتے سے یا انسانی محبت کے ناتے اس کی آخری رسومات ادا کریں گے۔

وہ جب تک زندہ تھی، تب تک اس کی قدر و قیمت تھی۔ مرنے کے بعد غیر ضروری ہوگئی تھی۔ وہ دفن کردی جائے یا چتا میں جلادی جائے یا دریا میں بہادی جائے، کسی کے لیے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔

ماہنامہ داستانِ دل ساہیوال

ادب کی دنیا میں ایک نیا نام

نئے لکھنے والوں کے لئے ایک بہترین پلیٹ فارم

اگر آپ لکھاری ہیں اور تحریر کسی مستند ادارے میں بھیجنا چاہتے ہیں تو ابھی داستانِ دل کو بھیجیں۔ آپ کی تحریر قریب کے شمارے میں پبلش کی جائے گی۔ آپ اپنے افسانے، ناولٹ، ناولز، کہانیاں، جگ بیتیاں، آپ بیتیاں، غزلیں یا پھر نظمیں ہمیں ای میل کے ذریعے، ڈاک کے ذریعے یہاں تک کہ وٹس ایپ کے ذریعے بھی بھیج سکتے ہیں۔ بس آپ کی تحریر اردو میں لکھی ہونی چاہیئے۔ اگر آپ نئے لکھاری ہیں تو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، آپ اپنی تحریر ہمیں بھیجیں ہم اس کو صحیح کر کے اپنے شمارے کا حصہ بنائیں گے۔ اگر آپ لکھنا نہیں جانتے تب بھی آپ کو فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں آپ ہمیں کوئی بھی اچھی سی غزل یا اقوال زریں انتخاب کے لئے بھیج سکتے ہیں۔ وہ بھی داستانِ دل کا حصہ بنے گا۔ اس کے علاوہ آپ اپنی تحریر موبائل پر بھی میسج کر سکتے ہیں بس اردو میں تحریر ہو۔

ہمارے داستانِ دل کے سلسلے کچھ اس طرح سے ہیں

محبت نامے، ملک کی ممتاز شخصیات کا انٹرویو، افسانے ناولز، ناولٹ، غزلیں، نظمیں، حمد، نعت اور انتخاب

اس کے علاوہ آپ کی ہر تحریر کو ہمارے شمارے میں خاص جگہ دی جائے گی۔ آپ ہمارے سارے شمارے پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر پڑھ سکتے ہیں اور پڑھ کر اپنی رائے دے سکتے ہیں

ہمارا ایڈریس ہے۔

ندیم عباس ڈھکو چک نمبر 5-L/79 ڈاکخانہ 5.L/78 تحصیل وضلع ساہیوال

وٹس ایپ نمبر: 03225494228

ای میل ایڈریس ہے abbasnadeem283@gmail.com

ہماری طرح وہاں جا کر نہیں پہنچے گی۔ اس سے پہلے ہی فرار ہو جائے گی۔ دشمن اسے مارنے نہیں گئے تھے، وہ خود مرنے گئی تھی۔"

بن زیان نے کہا۔ "یہ کیسی عجیب سی بات ہے۔ وہ باپ بیٹے آرام سے ریاست کے محل میں ہیں۔ ہمیں چیلنج نہیں کر رہے ہیں پھر بھی ہم نقصان اٹھا رہے ہیں۔"

طاغوتا نے کہا۔ "مجھے تو یوں لگ رہا ہے۔ وہ ہمارے خلاف کسی طرح کا روحانی عمل کر رہے ہیں۔ وہ ہم تینوں سے بھی دشمنی کریں گے۔ ہمیں اپنی حفاظت کے لیے کچھ کرنا ہوگا۔"

کاہن نے کہا۔ "میں تم لوگوں کی سلامتی کے لیے عبادت کرتا رہتا ہوں۔ شیطان کا بول بالا رہے۔ تم لوگوں کو کچھ نہیں ہوگا۔"

بن زیان نے کہا۔ "انہوں نے بگ ہنٹر کو اپنی ریاست سے نکال دیا ہے۔ وہ لندن واپس آ گیا ہے۔ ہم چاہتے تھے کہ عابی اس سے مقابلہ کرے لیکن وہ دونوں بالکل قریب آ کر پھر دور ہو گئے ہیں۔ آئندہ ایسے آثار نظر نہیں آ رہے ہیں کہ دونوں کا کہیں ٹکراؤ بھی ہوگا۔"

لارا نے کہا۔ "ٹکراؤ ہونا چاہیے۔ ان باپ بیٹے کو کسی بھی طرح مٹی میں مل جانا چاہیے۔ وہ زندہ رہیں گے تو میں اپنے بیٹے کے لیے فکرمند رہوں گی۔ یہ دھڑکا لگا رہے گا کہ مراد کو ہمارے فراڈ کا علم ہونے والا ہے۔ وہ پھر عذابِ جان بننے والا ہے۔"

لارا اس عرصے میں یہ اعلان کر چکی تھی کہ اس نے دوسری شادی کی ہے پھر دو ماہ میں اعلان کیا تھا کہ دوسرے شوہر کے بچے کی ماں بننے والی ہے۔ دس ماہ بعد کی نوزائیدہ بچے کے ساتھ اسپیشل چینل کی اسکرین پر آنے والی تھی۔ اس کے اگلے ایک ڈیڑھ برس میں اپنے بیٹے دانش کو گود میں لے کر فخر سے کہنے والی تھی کہ مراد نے اس سے ایک بیٹے کو چھین لیا تھا۔ وہ دوسرے شوہر سے پھر ایک بیٹا لے آئی ہے۔

ایسی چالبازی اور ڈراما بازی کے بعد پھر اسے اندیشہ نہیں رہے گا کہ مراد بھی دانش پر اپنا بیٹا ہونے کا شبہ کرے گا۔ وہ اپنا کام پکا کر رہی تھی۔

کالیا نے بھی پکا کام کیا تھا۔ اس کے بیٹے دانش کا اور اس کا پتلا بنا کر ایک شوکیس میں انہیں بند کر دیا تھا۔ یعنی اپنے جادوئی حصار میں باندھ رکھا تھا۔ وقتِ ضرورت اس بچے کو اپنے مفادات کے لیے استعمال کرنے والا تھا۔

اس بچے کے متعلق وہ بھی یہی جانتا تھا کہ مراد سے لارا سے چھین کر لے گیا ہے۔ وہ بیٹا اب ماں کے پاس نہیں باپ کے پاس رہتا ہے۔ اب وہ اپنی جادوئی شکتی کو آزمانا چاہتا تھا۔ ہزاروں میل کی دوری سے اس بچے پر اثرانداز ہو کر مراد کا سکون برباد کرنا چاہتا تھا۔

تھوڑی دیر بعد دونوں کا رابطہ ہو گیا۔ مراد نے کہا۔ "ہیلو! تم وہی منسٹر ہو جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ خطرناک بلیک میجک جانتے ہو۔"

اس نے کہا۔ "بے شک میں وہی ہوں۔"

"ہم حضرت صلاح الدین اجمیری کے حجرے میں حاضری دینے گئے تھے۔ تم نے لہو کی بارش کر کے ملکۂ عالیہ زیب النساء کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی تھی۔"

"ہاں کی تھی لیکن انٹرپول والے بھی یہ ثابت نہ کر سکے کہ میں نے وہ واردات کی تھی۔"

"اب فون پر اپنا وہ جرم کیوں قبول کر رہے ہو؟"

"اس لیے کہ آئندہ تمہارا اپنا بیٹا میرے کالے جادو کے شکنجے میں رہا کرے گا۔"

مراد نے پریشان ہو کر پوچھا۔ "یہ کیا بکواس کر رہے ہو؟"

"یہ بکواس ابھی سچ ثابت ہوگی۔ تھوڑی دیر بعد وہ بچہ بخار میں مبتلا ہوگا اور دودھ پینے سے انکار کرے گا۔"

وہ غصے سے بولا۔ "یہ کیا بدمعاشی ہے؟ میرے بیٹے سے دشمنی کیوں کر رہے ہو؟"

"اپنے کچھ مقاصد حاصل کروں گا۔ پہلے دشمنی تو شروع کرنے دو۔ پہلے یہ یقین تو کر لو کہ میں ہزاروں میل دور رہ کر بھی تمہارے بیٹے کو اپنے شکنجے میں رکھا کروں گا۔"

اس نے رابطہ ختم کر دیا۔ مراد نے پریشان ہو کر... ہم زاد اور زیب النساء سے کہا کہ ابھی اس کے بیٹے وارث پر شیطانی مصیبت آنے والی ہے۔ وہ انڈیا کا ایک منسٹر جس نے دلی میں ہم سے دشمنی کی تھی، وہ پھر دشمنی کے لیے پر تول رہا ہے۔

وہ سب پریشان ہو کر انتظار کرنے لگے۔ وارث ایک آرام دہ پالنے میں پڑا ہوا تھا۔ وہ خاصا صحت مند تھا۔ ہاتھ پاؤں جھٹک کر کھیل رہا تھا اور منہ سے غوں غاں کی آوازیں نکال رہا تھا۔ کسی بیماری کا دور تک پتا نہیں تھا۔

لارا پریشان ہو گئی۔ اس نے دانش کو چھو کر دیکھا تو اس کا ننھا سا بدن بخار میں تپ رہا تھا۔ وہ رو رہا تھا۔ لارا نے اسے بہلانے کے لیے دودھ پلانا چاہا تو اس نے دودھ نہیں پیا جبکہ وہ بھوکا تھا اور وہ دودھ پینے کا وقت تھا۔

وہ تاریک دنیا میں تھی۔ بیٹے کو روشن دنیا میں نہیں

لے جاسکتی تھی۔ وہاں کا ہن شیطانی منتروں کے ذریعے اور وید دواؤں کے ذریعے علاج کرتا تھا۔ وہ دونوں علاج کرنے لگے لیکن ایک ذرا فاقہ نہ ہوا۔ بچے کا بخار تیز ہوتا جارہا تھا۔ وہ کئی گھنٹوں سے بھوکا رہنے کے باوجود دودھ نہیں پی رہا تھا۔

کاہن نے کہا۔ ''اس پر کالا جادو کیا گیا ہے۔ کسی جادوگر سے توڑ کرانا ہوگا۔''

ادھر کالیا نے پہلی بار دانش پر اپنی کالی شکتی آزمائی تھی۔ وہ مطمئن تھا کہ اس کا جادو بے اثر نہیں ہوگا۔ اثر دکھا رہا ہوگا۔ مراد اس کا علاج کرانے میں ناکام ہونے کے بعد اسے کال کرے گا۔ بچے کی صحت مندی کے لیے اس سے التجا کرے گا، ہاتھ جوڑ کر گڑگڑائے گا۔

لیکن خاصا وقت گزرنے کے بعد بھی مراد اسے گھاس نہیں ڈال رہا تھا۔ اس کے اندر بے چینی اور مایوسی پیدا ہوئی۔ ''کیا میرا جادو بے اثر ہورہا ہے؟ نہیں۔ ایسا نہیں ہوسکتا۔''

اس نے اپنے اطمینان کے لیے خود ہی اسے فون پر مخاطب کیا۔ ''ہیلو! کیا بہت زیادہ پریشان ہو؟ بیٹے کی بیماری ناقابلِ علاج ہوگئی ہے؟''

یہ کہہ کر وہ فاتحانہ انداز میں قہقہہ لگانے لگا۔ مراد نے کہا۔ ''آخ تھو......'' پھر فون بند کردیا۔

کالیا کا ہاتھ اپنے منہ پر یوں آیا جیسے تھوک آیا ہو۔ وہ اپنی توہین اور غصے کی شدت سے چیخ پڑا۔ اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ جادو بے اثر ہوگیا ہے۔ مراد نے اس پر تھوک کر اسے پہلے سے زیادہ اپنا دشمن بنالیا تھا۔

وہ تیزی سے چلتا ہوا شیشے کے شوکیس کے پاس آیا۔ وہاں دانش کا پتلا اپنی ماں لارا کے پتلے کے ساتھ لیٹا ہوا تھا۔ شیشے کے اندر کی سرخ روشنی کہہ رہی تھی کہ بچے کو آگ لگی ہوئی ہے۔ وہ تیز بخار میں مبتلا ہے۔ اس کا منہ ذرا سا کھلا ہوا تھا۔ وہ دودھ مانگ رہا تھا اور دودھ ملنے پر اسے منہ نہیں لگا رہا تھا۔ کالیا کی اجازت کے بغیر نہیں پی رہا تھا۔

وہ حیرانی سے سوچنے لگا۔ 'جادو تو زبردست اثر دکھا رہا ہے پھر مراد پریشان کیوں نہیں ہے؟ وہ اپنے بیٹے کے لیے رحم کی بھیک نہیں مانگ رہا ہے۔ اس نے حقارت سے کیوں تھوکا ہے؟ کیا اس کی آنکھوں کے سامنے اس کا بیٹا بیمار نہیں ہے؟'

ایسے ہی وقت لارا نے اسے فون پر مخاطب کیا۔ ''گرودیو! میں بہت پریشان ہوں۔ میرے بیٹے کا بخار نہیں اتر رہا ہے۔ یہ دودھ نہیں پی رہا ہے۔ اس پر کوئی دوا اثر نہیں کررہی ہے۔ کسی دشمن نے اس پر جادو کیا ہے۔ اسے بچالو۔ میں اس کی خاطر روشن دنیا میں آکر چھپی ہوئی ہوں۔''

کالیا کا منہ حیرت سے کھل گیا۔ اس نے پوچھا۔ ''وہ بیٹا تو مراد کے پاس تھا پھر تمہارے پاس کیسے آگیا؟''

''وہ شروع ہی سے میرے پاس تھا۔ ہم نے مراد کو ایک لاوارث بچہ دے کر اس کی تسلی کردی ہے۔ اس کے جس بیٹے کو میں نے جنم دیا ہے، وہ میرے پاس ہے۔ گرودیو! جلدی کریں۔ اس پر ہونے والے جادو کا توڑ کریں۔''

''تم نے اتنا بڑا فراڈ کیا۔ مجھ سے کیوں چھپایا؟''

''ہم تمام ٹیلی پیتھی جاننے والے بن زیان کی ہدایات پر عمل کرتے ہیں۔ اس نے کہا تھا کہ بچے کی تبدیلی کا فراڈ اپنے سائے کو بھی معلوم نہ ہو۔''

''اور بن زیان کے کہنے پر تم نے مجھے اہمیت نہیں دی۔ میں نے نو نو کنواریوں کے لہو سے تمہیں اشنان کرایا۔ ان کا لہو پلایا۔ ایسے لہو کو تمہارے بیٹے کی رگوں تک پہنچایا۔ پیدا ہونے سے پہلے ہی اس بچے سے طہارت اور پاکیزگی کو ختم کردیا۔ وہ بچہ ابھی مراد کے پاس ہوتا، تب بھی میں اسے وہاں شیطان کا پرستار بنائے رکھتا۔ میں نے بڑی دور تک منصوبے بنائے تھے لیکن تم نے میرے اعتماد کو دھوکا دیا ہے۔ بچے کو بدل کر ایک بہت بڑا فراڈ کرتے وقت مجھے نظر انداز کردیا ہے۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ بچہ تمہارے پاس ہے۔ میں نے مراد سے ایک گیم کھیلنے کے لیے اس پر بیماری مسلط کردی ہے۔ ابھی میں نے ہی اسے بیمار بنا رکھا ہے۔ میں ہی بیماری دور کرسکتا ہوں لیکن کیوں کروں؟ جاؤ بن زیان سے بولو۔ دنیا کے بڑے سے بڑے ڈاکٹروں سے علاج کرائے۔ خطرناک بلیک میجک کرنے والے بھی میرے جادو کا توڑ نہیں کرسکیں گے۔''

''مجھ سے بڑی بھول ہوئی۔ آئندہ تمہیں سب سے زیادہ اہمیت دوں گی۔ تم مہا شکتی مان ہو۔ میرے بچے کے لیے اہم ہو۔ تم چاہو گے تو میرا بیٹا سلامت رہا کرے گا۔ میں تمہارے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں۔ سر جھکاتی ہوں۔ اسے جادو سے نجات دو۔''

وہ دانش کے پتلے کے سامنے منتر پڑھنے لگا۔ چند لمحوں کے بعد ہی شوکیس کے اندر جو آگ کی طرح دہکتی ہوئی سرخی تھی، وہ ختم ہوگئی۔ لارا نے فون پر خوشی سے چیخ کر کہا۔ ''دھنیواد گرودیو! بخار اچانک ہی ختم ہوگیا ہے۔ یہ دودھ پی رہا ہے۔''

"میرا خیال ہے، آج کے بعد میری اہمیت کو کبھی نہیں بھولو گی۔ تمہارا بیٹا میری مرضی سے سانسیں لیتا رہے گا۔ میں جب چاہوں گا، اس کی سانسیں رک جائیں گی۔"

"میں مانتی ہوں۔ وعدہ کرتی ہوں آئندہ اپنا کوئی بھید تم سے نہیں چھپاؤں گی۔"

"یہ سوچو کہ میں ابھی مراد کو بتا سکتا ہوں کہ بچہ تبدیل ہو چکا ہے۔ وہ ایک لاوارث بچے کو گود لے کر دھوکا کھا رہا ہے پھر کیا ہوگا؟"

وہ جلدی سے بولی۔ "نہیں، تم ایسا نہیں کرو گے۔ میں تمہاری وفادار بن کر رہوں گی۔"

"وہ تو رہو گی۔ تمہارے سر کے بال اور ناپاک کپڑے نے تمہیں میرے طلسمی شکنجے میں جکڑ لیا ہے۔ تم کبھی اس شکنجے سے نہیں نکل سکو گی۔"

وہ بے بسی سے بولی۔ "مجھ سے کیوں ایسی دشمنی کر رہے ہو؟"

"دوست بن کر رہو گی تو دشمنی کبھی نہیں ہوگی۔ تم ٹیلی پیتھی کے ذریعے دن رات میرے کام آتی رہو گی۔ میں نے انڈیا کے ایک علاقے میں اپنی ایک آزاد خود مختار ریاست بنانے اور وہاں کا حکمران بن کر رہنے کا منصوبہ بنایا ہے۔ فون بند کرو۔ میرے دماغ میں آؤ۔ میں تمہیں وہ علاقہ دکھا رہا ہوں۔"

وہ اس کے دماغ میں آ گئی۔ وہ انڈیا کے کسی علاقے میں تھا۔ وہاں ترقیاتی منصوبے کے مطابق بڑی سرگرمیوں سے کام جاری تھا۔ اس نے کہا۔ "یہاں کے حکمران اور تمام سیاستدان میرے مخالف ہیں۔ کہہ رہے ہیں، انڈیا میں کسی آزاد اور خود مختار ریاست کا وجود نہیں ہے اور نہ ہی ہونے دیا جائے گا۔ میری ریاست کے قیام میں رکاوٹیں پیدا کی جا رہی ہیں۔ میں کالے جادو کی شکتی سے بڑی حد تک رکاوٹیں دور کر رہا ہوں۔ اب تم ٹیلی پیتھی کے ذریعے میرے مخالفین کو نگنی کا ناچ نچاؤ گی تو تمام مشکلیں آسان ہوتی جائیں گی۔"

وہ چپ چاپ سن رہی تھی۔ مجبوراً دلچسپی لے رہی تھی۔ وہ دن رات اسے اپنی خدمات کے لیے طلب کرنے والا تھا۔ وہ بڑی دیر تک اس کے ساتھ رہی پھر اس کے دماغ سے نکل کر اپنی رہائش گاہ میں آ گئی۔ دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر ہائے ہائے کرنے لگی۔ وہ اب تک مطمئن تھی کہ خود کو اور اپنے بچے کو مراد سے نجات دلا چکی ہے۔ اب پتا چل رہا تھا کہ آسمان سے گر کر کھجور میں اٹک گئی ہے اور وہیں بچے کے ساتھ شکتی رہے گی۔ اس کے جادوئی شکنجے سے نکلنا ممکن نہیں ہوگا۔

وہ پلک جھپک کر بن زیان کے پاس آ گئی۔ وہ اچانک اسے دیکھ کر بولا۔ "تم اطلاع دیے بغیر اچانک آئی ہو۔ خیریت تو ہے؟"

وہ رونے کے انداز میں بولی۔ "خیریت نہیں ہے۔ میں اپنے سر کے بال اور ناپاک کپڑا دے کر بری طرح پھنس گئی ہوں۔ کالیا نے طلسمی شکنجے میں جکڑ لیا ہے۔ میری اور دانش کی زندگی اس کی مٹھی میں ہے۔ وہ جب چاہے، ہمیں ہلاک کر سکتا ہے۔ اب میں آخری سانسوں تک اس کے رحم و کرم پر رہوں گی۔"

وہ اسے بتانے لگی کہ کالیا نے کس طرح اسے گرفت میں لیا ہے۔ اسے معلوم ہو گیا ہے کہ ہم مراد کو بچے کے سلسلے میں دھوکا دے رہے ہیں۔ وہ جب چاہے گا، مراد کو حقیقت بتا کر اس کا قابلِ اعتماد دوست بن جائے گا۔ لارا کو اور یہودیوں کو ناقابلِ برداشت نقصان پہنچائے گا۔ اس سے ایک لمحے کے لیے بھی دشمنی کی جائے گی تو وہ دوسرے ہی لمحے میں ماں بیٹے کو ہلاک کر دے گا۔

بن زیان نے پریشان ہو کر کہا۔ "تمہارے بعد ہم یہودیوں کو بھی زندہ نہیں چھوڑے گا۔ وہ تمہارے بیٹے کو ہلاک نہیں کرے گا۔ اسے مراد کے حوالے کر کے ہمارے خلاف بہت بڑی طاقت بن جائے گا۔"

لارا نے کہا۔ "ایک طرف مراد کی روحانی قوتیں ہوں گی، دوسری طرف کالیا کی کالی شکتی ہوگی۔ ہم ان کے درمیان دم نہیں مار سکیں گے۔ بن زیان کچھ سوچو۔ مجھ کو اور میرے بیٹے کو کسی طرح اس کتے سے نجات دلا سکو گے؟"

"سوچنا سمجھنا ہوگا۔ ناممکن کچھ نہیں ہوتا۔ کسی بہت بڑے جادوگر سے توڑ کرانا ہوگا۔"

"اس کے خلاف جادو ہوگا تو وہ ایک لمحہ بھی ضائع کیے بغیر مجھے ہلاک کر کے دانش کو مراد کے پاس پہنچا دے گا۔"

"ہاں اسے معلوم نہیں ہونا چاہیے کہ اس کے خلاف کارروائی ہو رہی ہے۔ جو کرنا ہے، اس کی لاعلمی میں کرنا ہوگا۔"

وہ اٹھ کر ٹہلنے لگا، سوچنے لگا پھر اس نے کہا۔ "آج سے ہمارے جاسوس مختلف بھیس میں اس کے آس پاس رہیں گے۔ جب انہیں یقین ہو جائے گا کہ وہ پوری طرح نشانے پر ہے اور اپنی جان نہیں بچا سکے گا تو اسے گولی مار دی جائے گی۔ یہ ہم نے سنا ہے کہ جادوگر کی موت کے بعد اس کا

تمام جادو بے اثر ہوجاتا ہے۔ اس نے تم پر اور دانش پر جو عمل کیا ہے وہ اس کے مرتے ہی ختم ہوجائے گا۔"

وہ بیٹے کو سینے سے لگا کر بولی۔ "صرف تم پر ہی اعتماد ہے کہ ہم ماں بیٹے کو اس سے نجات دلا سکو گے۔ اس بات کا خاص خیال رکھنا کہ اسے موت سے پہلے اپنے ہلاک ہونے کا شبہ نہ ہو۔"

"نہیں ہوگا۔ کوشش کروں گا کہ میری موجودگی میں اسے گولی ماری جائے۔ میں کسی آلۂ کار سے کوئی غلطی نہیں ہونے دوں گا۔" وہ کسی قدر مطمئن ہوکر تاریک دنیا میں آگئی۔ روشن دنیا میں اس بچے کے ساتھ کہیں نظر نہیں آنا چاہتی تھی۔ اسے برس ڈیڑھ برس تک چھپائے رکھنا تھا۔ ویسے تاریک دنیا میں بھی ایک ہستی ایسی تھی، جس سے وہ چھپا نہیں سکتی تھی اور وہ تھی ماروی۔

ماروی پہلے ہی دن سے جانتی تھی کہ اس کا اپنا بھائی لارا کے پاس ہے۔ اس کے بابا جانی کو دھوکا دیا جارہا ہے۔ وہ چاہتی تھی کہ بچے کو وہاں سے اٹھا کر لے جائے لیکن اسے لے جانے کی غرض سے اٹھا نہ سکی۔ اس کے ننھے سے ذہن نے سمجھ لیا کہ اللہ کو منظور نہیں ہے۔ وہ اسے چھو سکے گی، پیار کرسکے گی لیکن بابا جانی کے پاس نہیں لے جاسکے گی۔

وہ اپنے بھائی کو پاکیزہ ماحول نہیں دے سکتی تھی پھر بھی اس نے کلمے کی پاکیزگی اس کے کانوں تک پہنچائی تھی۔ اس روز یہ طے کیا تھا کہ بھائی کے پاس آتی رہے گی اور اس کے کانوں میں اللہ کا کلام سناتی رہے گی۔

وہ اس روز بھی آئی، جب کالیا نے پہلی بار دانش پر ظلم کیا۔ اس کے ننھے سے بدن میں بخار کی آگ لگادی۔ ماروی نے آکر دیکھا تھا۔ کاہن اور وید پریشان تھے۔ اس کا علاج کرنے میں ناکام ہورہے تھے۔

اس نے بھائی کے قریب آکر اس پر ہاتھ رکھا تو بخار کی تپش ذرا کم ہوئی لیکن وہ تکلیف سے اور بھوک سے تڑپتا رہا۔ وہ پریشان ہورہی تھی۔ اللہ تعالیٰ سے دعائیں مانگ رہی تھی۔

پھر لارا اسے روشن دنیا میں لے گئی اور کالیا کے آگے سر جھکایا تو دانش کا بخار یکلخت کم ہوگیا۔ وہ دودھ پینے لگا۔ ماروی کو پہلی بار معلوم ہوا کہ رگھوناتھ کالیا نے اس کے بھائی کو موت کے شکنجے میں جکڑ کر ایک شوکیس میں بند کر رکھا ہے۔

وہ اس تہ خانے میں پہنچ گئی جہاں وہ شیشے کا شوکیس رکھا ہوا تھا۔ اس شیشے کے شوکیس کے اندر ایک عورت کا پتلا اور ایک بچے کا پتلا تھا۔ اسے بڑے جتن سے ایک اونچے اسٹینڈ پر رکھا گیا تھا۔ وہ زیر لب ایک آیت پڑھ کر بچے کو توجہ سے دیکھنے لگی تو اسے اپنا بھائی دانش دکھائی دیا۔

اس نے تڑپ کر اس شوکیس کو بلندی سے گرا کر توڑنا چاہا۔ آگے بڑھ کر اس پر ہاتھ مارنا چاہا تو ہاتھ رک گئے۔ اس کے اور شوکیس کے درمیان کوئی رکاوٹ تھی۔ نظر نہیں آرہی تھی۔ کالیا نے کالی شکتی سے حصار باندھا تھا۔ کوئی اس شوکیس تک پہنچ نہیں سکتا تھا۔ اسے چھو بھی نہیں سکتا تھا۔

ماروی نے دوسری بار پھر تیسری بار اس پر ہاتھ مارنے کی کوشش کی۔ ہر بار ناکام رہی۔ قدرتی ذہانت نے سمجھایا۔ "کاتب تقدیر نے جو لکھا ہے وہی ہوگا۔ واپس جاؤ۔"

وہ سر جھکا کر دانش کے پاس آئی۔ لارا اسے تاریک دنیا میں لے آئی تھی۔ اسے بیماری سے نجات مل گئی تھی۔ وہ دودھ پینے کے بعد گہری نیند سو رہا تھا۔ ماروی اس کے پاس بیٹھ گئی۔ اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر ایک آیت پڑھنے لگی۔ یہ اس کا معمول تھا۔ دن میں ایک بار ضرور آتی تھی۔ اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر اللہ کا کلام ضرور پڑھتی تھی۔ اس شیطانی ماحول میں کانوں کے ذریعے دل اور دماغ میں کلام کی پاکیزگی ضرور پہنچاتی تھی۔

پھر وہ محل میں آگئی۔ وہاں دوسرا بھائی وارث تھا۔ یہ صرف وہی جانتی تھی کہ وہ ایک لاوارث بچہ ہے۔ اس نے یہ حقیقت اپنے بزرگوں سے چھپائی تھی۔ قدرتی حالات اسے جس سمت لے جارہے تھے، وہ جارہی تھی۔ وہ اللہ کی مرضی سے وارث کو سگی بہن کا پیار دے رہی تھی اور اسے مراد کا وارث بنا رہی تھی۔

وہ اس کے پاس آکر لیٹ گئی۔ اسے پیار کرکے اس ننھے کے سر سے سر ملا لیا۔ دھیمی سرگوشی کے انداز میں کہنے لگی۔ "میرے اللہ! میرے وارث کی عزت رہے۔ یہ کبھی لاوارث نہ کہلائے۔ اسے ذہانت اور علم و ہنر سے مالا مال فرما۔ میرے اللہ! جو علوم اور غیر معمولی صلاحیتیں مجھے عطا کررہا ہے، وہی اسے بھی عطا فرما۔ یہ دنیا میں بہت نام کمائے۔ اگر کبھی بھید کھلے تو میرے بابا جانی کا نام ہو کہ انہوں نے ایک لاوارث بچے کو عزت، شہرت اور نیک نامی کی بلندیوں پر پہنچایا ہے۔"

وہ وارث سے لگی ہوئی دھیرے دھیرے بولتی ہوئی چپ ہوگئی۔ آنکھ لگ گئی۔ دونوں کے سر ایک دوسرے سے یوں لگے ہوئے تھے جیسے ایک سر سے دوسرے سر میں ایک جھولی سے دوسری جھولی میں غیر معمولی صلاحیتوں کے خزانے منتقل ہورہے ہوں۔ ہماری دنیا میں بہت کچھ ہوتا

ہے لیکن سب کچھ دکھائی نہیں دیتا۔

☆☆☆

یہودیوں نے عابد علی منگی پر لاکھوں ڈالرز خرچ کیے تھے۔ اس یہودی ماں کے بیٹے کو یہودی بنانے کے لیے مالدوا سے پیرس تک کئی ماہ ضائع کر چکے تھے۔ ایسا خسارہ اٹھانے کے بعد جھنجلا رہے تھے۔ مزید ناکامی یہ تھی کہ اس کے خلاف انتقامی کارروائی کرنے میں بھی ناکام ہو رہے تھے۔

انہوں نے عابی جیسے پہاڑ سے ٹکرانے کے لیے ٹیلی پیتھی جاننے والوں سے رابطہ کیا تھا۔ انہیں اپنے اعتماد میں لے کر دوستی کی پھر ان کے ذریعے پہلی بار شہزاد پر حملہ کرایا تھا۔ وہ شہزاد کو نقصان پہنچا کر مراد اور عابی کو ریاست سے باہر آنے پر مجبور کرنا چاہتے تھے۔ اس مرحلے پر بھی ناکامی ہوئی تھی۔

وہ باپ بیٹے کچھ عرصے تک امن و امان سے رہنے کے لیے ریاست کے معاملات میں دلچسپی لے رہے تھے۔ محل میں آرام سے رہ کر دور ہی سے دشمنوں کی چھیڑ خانی اور ناکامیاں دیکھ رہے تھے۔

پھر عابی ایک ریسلر بگ ہنٹر بن کر لندن آ گیا تھا۔ دشمنوں نے اسے بھی اپنے مقاصد کے لیے استعمال کیا تھا۔ نتیجے میں اپنے دو ٹیلی پیتھی جاننے والے بارودا اور امیی مالا کی زندگیاں ہار گئے تھے۔

ان دنوں سپر پاور اور اس کے اتحادی ممالک بھی کھل کر مراد کے خلاف یہودیوں اور ٹیلی پیتھی جاننے والوں کے ساتھ ہو گئے تھے۔ موجودہ حالات میں صرف ماسٹر کوبوبو اور ریڈ الرٹ کی براؤن فیملی ان باپ بیٹے کی حامی اور مددگار تھیں۔

اس زمین کی تمام مغرور اور بے لگام قوتوں نے باپ بیٹے کو تنہا کر دیا تھا۔ ان متحدہ قوتوں کو یقین تھا کہ وہ دونوں جب بھی ریاست سے باہر آئیں گے تو کہیں بھی گھیرے جائیں گے اور کمزور سے مقابلے کے بعد مارے جائیں گے۔

لیکن مارے تب جاتے' جب کہیں نظر آتے۔ اگرچہ عابی نظروں کے سامنے تھا لیکن ان نظروں سے شناسائی چھین لی گئی تھی۔ وہ اسے پہچان نہیں پا رہے تھے۔

سپر پاور اور اس کے اتحادیوں نے بگ ہنٹر کو طلب کیا اور کہا۔ ”تم ان کی ریاست میں گئے تھے۔ تم نے انہیں کوئی نقصان نہیں پہنچایا تھا۔ وہاں ریاست کے قانون کے خلاف کوئی غلطی نہیں کی تھی پھر بھی انہوں نے تم پر امیی مالا کا ساتھی ہونے کا الزام لگایا اور تمہیں اس ریاست سے نکل جانے کا حکم دے دیا؟“

عابی نے کہا۔ ”جی ہاں۔ انہوں نے میرے ساتھ زیادتی کی ہے۔ مجھے اس شیطان عورت کا عاشق سمجھ کر وہاں سے نکال دیا۔ ہم کیا کر سکتے ہیں۔ ان کی ریاست ہے۔ ان کی حکمرانی ہے۔ جو چاہتے ہیں وہ کرتے ہیں۔“

”انہیں نقصان پہنچاؤ گے تو تمہاری اہمیت کا اندازہ انہیں ہوگا۔ وہ تمہارے سامنے جھکیں گے۔“

”میں انہیں کس طرح نقصان پہنچا سکوں گا؟“

”مراد کا بیٹا شہزاد اسی شہر میں رہتا ہے۔ اسے اغوا کر کے ایک خفیہ پناہ گاہ میں پہنچا دو۔ وہ بیٹے کی واپسی کے لیے یا تو تمہارے سامنے جھک جائے گا یا وہ باپ بیٹے تمہارے مقابلے پر آ جائیں گے۔ ہم یہی چاہتے ہیں کہ عابی تمہارے مقابلے پر آ جائے۔“

”لیکن یہ تو دشمنی والا مقابلہ ہوگا جبکہ میں پیشہ ور پہلوان ہوں۔ میں نے کبھی کسی کو دشمن سمجھ کر زور آزمائی نہیں کی ہے پھر یہ کہ کسی کو اغوا کرنا سراسر جرم ہے۔ پلیز آپ مجھے جرم کے راستے پر چلنے کو نہ کہیں۔ کوئی سیدھا سا شریفانہ راستہ دکھائیں۔“

”مسٹر ہنٹر! جسے تم جرم سمجھتے ہو' وہ سیاست ہے۔ ہم ایسی ہی حکمت عملی کے نتیجے میں طاقتور حکمران بن کر شان و شوکت سے جی رہے ہیں۔ ہمارے ساتھ رہو اور ہم سے جینا سیکھو۔“

”سوری۔ میں اپنے نظریات اپنے ایمان کے مطابق زندگی گزار رہا ہوں۔ میرے دین نے جسے گناہ کہا ہے' وہ گناہ ہے۔ جسے ثواب کہا ہے' وہ ثواب ہے۔ میں کسی کے بیٹے کو اغوا کرنے کا جرم نہیں کروں گا۔“

ایک اعلیٰ عہدیدار نے بڑے رعب سے حاکمانہ انداز میں کہا۔ ”کیسے نہیں کرو گے؟ ہم نے لاکھوں ڈالرز کے عوض تمہاری خدمات حاصل کی ہیں۔ تمہیں ہمارے تمام احکامات کی تعمیل کرنا چاہیے۔“

عابی نے تن کر کہا۔ ”نہیں کروں گا۔ تم لوگوں کا زر خرید غلام نہیں ہوں۔ ابھی اسی لمحے میں اپنی خدمات سے پھر رہا ہوں۔“

”ہماری خدمت کے لیے جو معاہدہ کر چکے ہو' اس سے پھر نہیں سکو گے۔“

دوسرے عہدیدار نے کہا۔ ”مسٹر ہنٹر! تمہارے ساتھ ہونے والے معاہدے پر صرف ایک سپر پاور نے ہی نہیں' چھ اتحادی ممالک نے بھی دستخط کیے ہیں۔ اب اس

معاہدے کی خلاف ورزی جرم ہوگی۔ تم اجازت کے بغیر ہمارے عسکری ادارے سے باہر نہیں جاسکو گے۔"

عابی نے حیرانی سے پوچھا۔ "کیا میں معاہدے کو توڑنے کا حق نہیں رکھتا ہوں؟"

"نہیں۔ ہم توڑ سکتے ہیں۔ تمہیں چھوڑ سکتے ہیں۔ تم نہیں چھوڑ سکتے۔ خوامخواہ بات نہ بڑھاؤ۔ ہم نے پہلی بار ایک حکم دیا ہے۔ اس کی تعمیل کرو۔ شہزاد کو اغوا کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئے گی۔ ہمارے دو چار ماہر تمہارے ساتھ رہیں گے۔"

"تو پھر ان ماہرین سے یہ کام کرالیں۔"

"نہیں۔ شہزاد کو معلوم ہونا چاہیے کہ بگ ہنٹر اس سے دشمنی کررہا ہے۔ ہماری پلاننگ کو سمجھو۔ وہ اپنے باپ اور بھائی کے سامنے تمہیں دشمن کہے گا، تب ہی عابی تلملا کر تمہاری سرکوبی کے لیے ریاست سے باہر آئے گا۔"

"میں تم لوگوں کے لیے بڑی سے بڑی جنگ لڑنے کو تیار رہوں گا لیکن پھر ایک بار سوری۔ کوئی مجرمانہ قدم نہیں اٹھاؤں گا۔"

"تو پھر سن لو۔ جب تک حکم کی تعمیل نہیں کروگے، اس آرمی ہیڈ کوارٹر سے باہر نہیں جاسکو گے۔"

وہ اپنا فون نکال کر بولا۔ "میں اپنے وکیل کو کال کرتا ہوں، مجھے اپنی آزادی کے لیے قانونی جنگ لڑنی ہوگی۔"

ایک آرمی افسر نے اسے گن کے نشانے پر رکھتے ہوئے کہا۔ "تم کسی کو فون نہیں کروگے۔ آرڈر از آرڈر...... پہلے حکم کی تعمیل کروگے تو تمہیں فون کال کی سہولتیں دی جائیں گی۔"

دوسری آرمی افسر نے اس سے فون لے لیا۔ وہ بولا۔

"آپ بات بڑھا رہے ہیں۔ مجھ سے عداوت کررہے ہیں۔ میں عابی سے کم نہیں ہوں۔ تنہا درجنوں سپاہیوں کو مات دے سکتا ہوں۔ یہاں سے جنگ لڑتا ہوا جاسکتا ہوں۔"

افسر نے گن کے ٹریگر پر انگلی رکھتے ہوئے کہا۔ "پرنس عابی کو گولیاں نہیں لگتیں۔ وہ فائرنگ اور بم دھماکوں کے درمیان سے گزر جاتا ہے۔ کیا میں گولی چلاؤں؟ تم زندہ رہ سکو گے؟ کیا عابی کی طرح عجوبہ ہو......؟"

اس نے سر کو جھکا لیا۔ خاموش رہ کر اپنی بے بسی ظاہر کرنے لگا۔ ایک اعلیٰ عہدیدار نے کہا۔ "ہم نے موت کے سامنے صرف اس عجوبہ کو مجبور ہوتے نہیں دیکھا۔ تم اپنی مجبوری کو سمجھو۔ بے شک عابی کی طرح جسمانی طور پر طاقتور ہوسکتے ہو لیکن اس کی طرح روحانی صلاحیتوں کے حامل نہیں ہو۔"

دوسرے عہدیدار نے کہا۔ "ہم بھی دیکھنے کے لیے بے چین ہیں کہ اس کی روحانی صلاحیتوں کے مقابلے میں تم کس طرح پیشہ ورانہ مہارت سے اسے مات دے سکو گے؟"

"میں اتنا جانتا ہوں کہ میں نے کبھی شکست کا منہ نہیں دیکھا ہے۔ پرنس عابی کا بھی یہی دعویٰ ہوگا۔ یہ تو آنے والا وقت ہی بتائے گا کہ کون کسے زیر کرے گا؟ میں اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے اپنی جیت کو یقینی بنانے کے لیے مجرمانہ طریقے سے عابی کو مقابلے کے لیے مجبور نہیں کروں گا۔"

"اور ہم مدتوں عابی کا انتظار نہیں کریں گے۔ وہ اپنے بھائی شہزاد کی سلامتی کے لیے ادھر آنے پر مجبور ہوجائے گا۔ ہم سے بحث نہ کرو۔ شہزاد کو اغوا کرنے کی تدبیر کرو۔"

ان کے درمیان بحث ناکام ہوچکی تھی۔ عابی نے کہہ دیا۔ "آخری بار کہہ چکا ہوں، مجھ سے فی الوقت جو چاہتے ہو وہ جرم کبھی نہیں کروں گا۔"

اسے حراست میں لے لیا گیا۔ آرمی ہیڈ کوارٹر کی ایک چھ منزلہ عمارت کے ٹاپ فلور میں اسے نظر بند رکھا گیا۔ وہ اس فلور میں آزادی سے گھوم پھر سکتا تھا۔ وہاں سے نیچے زمین پر نہیں آسکتا تھا۔ نیچے آنے والے تمام دروازوں کو لفٹ اور سیڑھیوں کو بند کردیا گیا پھر یہ دعویٰ کیا گیا کہ اسے قیدی بنا کر جلد ہی احکامات کی تعمیل کرنے پر مجبور کردیا جائے گا۔

وہ چپ چاپ قیدی بن گیا۔ ٹاپ فلور کی کھڑکیوں سے دور تک آرمی ہیڈ کوارٹر کو دیکھنے لگا۔ وہ چھلانگ لگا کر کئی منزلہ عمارتوں کی چھتوں پر پہنچ جاتا تھا۔ ان چھتوں کی بلندیوں سے زمین پر پہنچ جاتا تھا۔ وہ چھ منزلہ عمارت اس کے سامنے کچھ نہیں تھی۔ وہ جب چاہتا، وہاں سے نکل جاتا لیکن اس طرح ثابت ہوجاتا کہ وہی پرنس عابی ہے۔ ابھی خود کو چھپائے رکھنا ضروری تھا۔ دشمن اس کے نظر نہ آنے سے اندر ہی اندر دہشت زدہ تھے۔ ان کے خیال کے مطابق عابی کو ریاست میں ہی ہونا چاہیے تھا۔

ابھی وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ قیدی بنانے کے بعد اس سے کیسا سلوک کیا جائے گا؟ کس طرح جبراً اپنے احکامات کی تعمیل کرائی جائے گی؟

انہوں نے پلاننگ کرلی۔ بن زیان نے کہا۔ "یہ سیدھی طرح قابو میں نہیں آئے گا۔ اس پر تنویمی عمل کرکے اسے اپنا معمول اور تابعدار بنا کر رکھا جائے پھر تو یہ زرخرید غلام کی

طرح تمام جائز اور ناجائز احکامات پر عمل کرتا رہے گا۔''

ایسے ہی ٹھوس اور پائیدار طریقے سے اسے ان دیکھی زنجیروں سے باندھ کر رکھا جاسکتا تھا۔ کریگ ہوسٹن نے کہا۔ ''اس سلسلے میں احتیاط لازمی ہے۔ کسی ٹیلی پیتھی جاننے والے کو معلوم نہ ہو کہ اس پر تنویمی عمل کرایا جارہا ہے۔ انہیں معلوم ہوگا تو وہ ایسے وقت اس کے دماغ میں پہنچ جائیں گے اور اسے اپنا تابعدار بنالیں گے۔ انہیں ایسا دماغی کھیل کھیلنے کا موقع نہیں دینا چاہیے۔''

لارا' آبنوس اور طاغوتا تین ٹیلی پیتھی جاننے والے رہ گئے تھے۔ ان سے یہ بات چھپی نہیں رہ سکتی تھی۔ انہوں نے پوچھا۔ ''بگ ہنٹر کو حراست میں کیوں رکھا گیا ہے؟''

جواب ملا کہ وہ ناجائز احکامات کی تعمیل کرنے سے انکار کررہا تھا۔ لارا نے کہا۔ ''اعصابی کمزوری کی دوا کھلاکر اس کے دماغ کو کمزور بنایا جائے پھر میں اس کے اندر جاکر اسے تنویمی عمل کے ذریعے آپ کا تابعدار بنادوں گی۔''

لارا وہی کہہ رہی تھی، جس کی وہ پلاننگ کرچکے تھے۔ انہوں نے کہا۔ ''سوری لارا......! بگ ہنٹر ہمارے لیے بہت اہم ہے۔ ہم کسی بھی ٹیلی پیتھی جاننے والے کو اس کے دماغ میں جانے اور کسی طرح کا عمل کرنے کی اجازت نہیں دیں گے۔ ہمیں ایک دوسرے کا اعتماد قائم رکھنا چاہیے۔ تب ہی ہمارا مستحکم اتحاد قائم رہے گا۔''

ان تینوں خیال خوانی کرنے والوں نے وعدہ کیا کہ وہ کبھی کسی مقصد کے لیے بھی بگ ہنٹر کے دماغ میں نہیں جائیں گے۔ تب انہوں نے عابی کے کھانے پینے کی چیزوں میں اعصابی کمزوری کی دوا ملا کردی۔ وہ بہت حساس تھا۔ کھانے کے ذائقے سے سمجھ گیا کہ کوئی مضر رساں دوا کھلائی جارہی ہے۔

اس نے ایک بار دوپہر کے کھانے میں دوسری بار رات کے کھانے میں وہ دوا حلق سے اتار لی۔ اس عجوبہ کے جسم میں کوئی ہتھیار پیوست نہیں ہوتا تھا۔ شافی اور مضر رساں دوائیں بھی اثر نہیں کرتی تھیں لیکن اس نے ظاہر کیا کہ وہ بہت زیادہ کمزوری محسوس کررہا ہے۔

وہ اپنے منصوبے کے مطابق اس کے علاج کے لیے ایک ڈاکٹر کو ٹاپ فلور پر لائے۔ وہ ڈاکٹر نہیں تھا۔ ہپناٹائز کرنے کا ماہر تھا۔ عابی کے بظاہر کمزور دماغ نے اس کے عمل کو قبول کرلیا۔ وہ اس کی باتوں سے متاثر ہوتا گیا۔ اس کے احکامات کو تسلیم کرتا گیا۔ عمل کے اختتام پر وہ پوری طرح سپر پاور کا مطیع اور فرماں بردار بن گیا۔ وہ خوش ہوگئے۔ انہیں ایک اہم مقصد میں کامیابی ہوگئی تھی۔

جب وہ اسے تنویمی نیند سونے کے لیے چھوڑ کر گئے تو لارا اس کے دماغ میں آگئی۔ عابی نے اپنے اندر اس کی باتیں سنیں۔ وہ آبنوس اور طاغوتا سے کہہ رہی تھی۔ ''وقت کم ہے۔ اسے دو گھنٹے کی نیند سونا ہے۔ ہم میں سے کوئی ایک ہی اسے اپنا تابعدار بناسکے گا۔''

طاغوتا نے کہا۔ ''تم عمل کرو۔ ہم تینوں کی سوچ کی لہروں کو اس کے دماغ میں نقش کرو اور اسے حکم دو کہ یہ ہم تینوں کی سوچ کی لہروں کو کبھی اپنے اندر آنے سے نہیں روکے گا۔''

انہوں نے ایک دوسرے سے متفق ہوکر اس پر مختصر سا تنویمی عمل کیا۔ پہلے عمل کو قائم رکھتے ہوئے اپنے عمل کو مستحکم کیا پھر مطمئن ہوکر اسے تنویمی نیند سونے کا حکم دے کر چلے گئے۔

جو قوت اور اقتدار کے بھوکے ہوتے ہیں' وہ متحد ہوکر بھی ایک دوسرے کے اعتماد کو دھوکا دیتے رہتے ہیں۔ عابی ان کے جانے کے بعد مسکرا رہا تھا۔ اس نے قید سے رہائی پانے کے لیے دشمنوں سے لڑائی نہیں کی تھی وہ خود ہی اسے رہا کرنے والے تھے۔ اس یقین کے ساتھ کہ بگ ہنٹر ان کا مطیع و فرماں بردار بن چکا ہے۔ انہوں نے دوسرے دن عابی کو دیکھا۔ اس کا من مزاج بدل گیا تھا۔ اس نے سپر پاور کے اعلیٰ حاکم سے کہا۔ ''میں خوامخواہ بحث کررہا تھا۔ مجھے جائز اور ناجائز کے جھگڑے میں نہیں پڑنا چاہیے۔ میں آپ کے حکم کی تعمیل کروں گا۔''

وہ خوش ہوگئے، اس کا فون اسے واپس کردیا پھر شہزاد کو اغوا کرنے کی پلاننگ بتائی۔ بن زیان کی تنظیم ٹی ڈی پی کے چار ایسے خطرناک کھلاڑی تھے جنہیں اغوا اور قتل کی واردات کرنے میں مہارت حاصل تھی۔ انہوں نے عابی سے کہا۔ ''مسٹر ہنٹر! ہم کل صبح شہزاد کو یونیورسٹی روڈ سے اٹھائیں گے پھر آپ کو اس کے ساتھ کنگسٹن اسٹریٹ کی ایک خفیہ پناہ گاہ میں پہنچادیں گے۔ وہاں مراد کے بیٹے کو دواؤں کے ذریعے بیمار بناکر رکھیں گے۔''

عابی نے کہا۔ ''میں کنگسٹن اسٹریٹ کا وہ مکان دیکھوں گا جہاں مجھے شہزاد کو اپنی نگرانی میں رکھنا ہوگا اور فون کے ذریعے اس کے باپ اور بھائی کو چیلنج کرنا ہوگا۔''

واردات کرنے والے نے کہا۔ ''ہم ایک گھنٹے بعد آپ کو وہاں لے جائیں گے۔ اس مکان کے اطراف جو لوگ آباد ہیں، وہ سب ہمارے وفادار کارندے ہیں۔ یہ

واردات قانون کے محافظوں کی نگرانی میں ہوگی۔ وہاں کوئی آپ کو پریشان کرنے نہیں آئے گا۔ صرف وہ باپ بیٹے تمہیں ڈھونڈتے پھریں گے۔"

بن زیان نے کہا۔"وہ شہزاد کی سلامتی کے لیے تڑپ جائیں گے۔ ہڑبڑا کر ریاست سے باہر آئیں گے۔"

عابی نے کہا۔"یہ پلاننگ زبردست ہے۔ کل تک عابی میرے مقابلے پر ضرور آئے گا۔"

"ہمیں ان ہی فیصلہ کن لمحات کا انتظار ہے۔ تمہیں ثابت کرنا ہوگا کہ اس کے مقابلے میں سوا سیر ہو۔"

"میں دعویٰ نہیں کروں گا۔ جو کرنا ہے' کر دکھاؤں گا۔"

عابی نے ان سے باتیں کرنے کے بعد مراد کو بتایا کہ اس کے ساتھ اب تک کیا ہوتا رہا ہے۔ آئندہ وہ کیا کرنے والا ہے۔ مراد نے کہا۔"ہماری توقع کے خلاف ایسے حالات پیدا ہوئے ہیں۔ آئندہ تم ناجائز احکامات کی تعمیل کے لیے ان کے ساتھ نہیں رہ سکو گے۔"

"مجھے آج ہی چہرہ اور شناخت بدل کر یہاں رہنا ہوگا۔ وہ میرے لیے مسئلہ بن رہے ہیں۔ میں ان کے لیے مسائل کا انبار بن جاؤں گا۔ آپ لوگ کیا چاہتے ہیں؟"

"وہ کھلی دشمنی کی دعوت دے رہے ہیں۔ ہم دعوت قبول کریں گے۔ ان کی حسرتیں پوری کریں گے۔"

دونوں باپ بیٹے نے فون پر مختصر سالائن آف ایکشن تیار کیا پھر رابطہ ختم کر دیا۔ ایسے وقت لارا بڑے یقین سے عابی کے دماغ میں آئی۔ بڑی خوش تھی کہ اسے رازداری سے تابعدار بنا کر اپنے احکامات کی تعمیل کراتی رہے گی لیکن اچانک ہی اس کی سوچ کی لہریں باہر نکل آئیں۔ عابی نے سانس روک کر اسے بھگا دیا تھا۔ اس نے آبنوس اور طاغوتا سے کہا۔"ہم اپنے مقصد میں ناکام رہے ہیں۔ ہمارا تنویمی عمل بگ ہنٹر پر ناکام رہا ہے۔ ابھی اس نے میری سوچ کی لہروں کو بھگا دیا ہے۔"

آبنوس نے کہا۔"اس کا مطلب یہ ہے کہ سپر پاور اور بن زیان کی طرف سے جو تنویمی عمل اس پر کیا گیا ہے، وہ بھی ناکام رہا ہوگا۔"

طاغوتا نے کہا۔"ہمیں معلوم کرنا چاہیے کہ وہ عمل بھی ناکام رہا ہے یا وہ ان کا تابعدار بن چکا ہے۔"

لارا نے بن زیان سے پوچھا۔"کیا بگ ہنٹر قابو میں آچکا ہے؟ تابعدار بن گیا ہے؟"

وہ بولا۔"تھینکس گاڈ! وہ اپنا دین و ایمان بھول گیا ہے۔ ہمارے احکامات کی تعمیل کر رہا ہے۔"

"کیا تمہیں پورا یقین ہے کہ اس پر تنویمی عمل کامیاب رہا ہے؟"

"ہاں۔ یقین کیوں نہیں ہوگا۔ ابھی وہ ہمارے احکامات کی تعمیل میں پوری طرح مصروف ہے۔ تمہیں شبہ کیوں ہو رہا ہے؟"

"بس یونہی۔ ہمیں اس پہلو سے بھی سوچنا چاہیے کہ عامل حضرات بعض اوقات غلطیاں کر بیٹھتے ہیں۔ ناکام ہو جاتے ہیں۔ بعد میں وہ ناکامی نقصان پہنچاتی ہے۔"

وہ کھل کر کہہ نہیں سکتی تھی کہ اس نے رازداری سے ان سب کو دھوکا دے کر بگ ہنٹر پر عمل کیا تھا اور ناکام رہی تھی۔ لہٰذا وہ ہپناٹزم کا ماہر بھی ناکام رہا ہوگا لیکن وہ لوگ مطمئن تھے۔ بگ ہنٹر شہزاد کو اغوا کرنے کے سلسلے میں بڑی سرگرمی سے مصروف ہو گیا تھا۔

لارا اس معاملے میں زیادہ کھوج نہ لگا سکی۔ رگھوناتھ کالیا وقتاً فوقتاً اسے اپنے معاملات میں مصروف رہنے پر مجبور کر دیتا تھا۔ وہ مجبور ہو جاتی تھی۔ اس کی اور بچے کی جان شیشے کے شوکیس میں تھی۔ کالیا کسی بھی وقت اسے ایک چھناکے سے توڑ سکتا تھا۔

آبنوس اور طاغوتا اس کی بے بسی اور مجبوریوں کو سمجھتے تھے۔ اس کی خاطر وہ بھی ٹیلی پیتھی کے ذریعے کالیا کے کام آرہے تھے۔ وہ اپنی ایک آزاد ریاست بنانے کے سلسلے میں بھارتی سیاستدانوں اور حکمرانوں کے دماغوں سے کھیل رہا تھا اور ٹیلی پیتھی کے ہتھیاروں سے کامیابیاں حاصل کرتا جا رہا تھا۔

لارا نے کہا۔"بن زیان......! یہ مجھے دن رات اپنی خدمت میں لگائے رکھتا ہے۔ میں اپنے بچے کو معبد میں چھوڑ کر اس کے کام سے لگی رہتی ہوں۔ وہ راتوں کو پوری نیند سونے نہیں دیتا۔ دن کے وقت بھی آرام حرام کر دیتا ہے۔ مجھے اس ظالم سے کسی طرح نجات دلاؤ۔"

اس نے کہا۔"صبر کرو۔ ذرا حوصلہ کرو۔ میرے جاسوس اس کے آس پاس رہتے ہیں۔ اسے کسی وقت بھی گولی سے اڑا دیں گے۔ کل تک یہاں بگ ہنٹر کے ساتھ مصروف رہوں گا۔ شہزاد کو اغوا کرانے کے بعد کالیا کے پیچھے پڑ جاؤں گا۔ جلد ہی اس کا کام بھی تمام کرنا ہوگا۔"

اس وقت بن زیان اپنی رہائش گاہ میں تھا۔ اس نے لارا سے رابطہ ختم کر دیا۔ اپنے ان چار ماتحتوں کے پاس فون کے ذریعے پہنچ گیا جو بگ ہنٹر کے ساتھ کنگسٹن اسٹریٹ کے مکان میں گئے تھے۔ اس نے بگ ہنٹر سے پوچھا۔"کیا وہ

مکان دیکھ رہے ہو؟ ہم تو مطمئن تھا۔ وہاں شہزاد تک اس کے باپ اور بھائی نہیں پہنچ سکیں گے۔"

عابی نے کہا۔ "میں مطمئن نہیں ہوں۔ مجھے یوں لگ رہا ہے کہ عابی میرے ساتھ یہاں پہنچ گیا ہے۔"

وہ ناگواری سے بولا۔ "یہ کیا کہہ رہے ہو؟"

"سچ کہتا ہوں۔ ابھی میرے سر پر بوجھ ہے۔ ایسا لگ رہا ہے جیسے مجھ پر کوئی سوار ہو گیا ہے۔ مجھے نظر نہیں آرہا ہے۔"

"اوہ گاڈ! یہ کیا ہو رہا ہے؟"

بن زیان کا خیال دو اطراف میں گیا۔ کیا ان مسلمانوں کی طرف سے روحانی عمل کیا جا رہا ہے؟ کیا انہیں معلوم ہو گیا ہے کہ شہزاد کو اغوا کیا جائے گا؟ پھر اس نے دوسری طرف کا لیا کے متعلق سوچا۔ کیا وہ مراد کے بیٹے دانش کو جکڑنے کے بعد شہزاد کو بھی شکنجے میں لینا چاہتا ہے؟ کیا اس مقصد کے لیے آسیب بن کر بگ ہنٹر پر سوار ہو گیا ہے؟

اس نے اپنے چاروں ماتحتوں سے کہا۔ "بگ ہنٹر کو دیکھو! اسے کیا ہو رہا ہے؟ اسے سنبھالو۔ مجھے فوراً بتاؤ کیا ہمارے کسی ربی کو عامل کامل کو بلانا ہوگا؟"

وہ چاروں ماتحت اس کے قریب آئے۔ ایک نے اس پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔ "تم کیسا محسوس کر رہے ہو؟"

عابی نے اچانک گرجتے ہوئے دونوں ہاتھ فضا میں لہرائے، وہ ہاتھ دائیں بائیں کھڑے ہوئے ماتحتوں کو لگے تو وہ الٹ کر فرش پر گرے اور ایک ذرا تڑپ کر ہمیشہ کے لیے ٹھنڈے پڑ گئے۔

فون کا وائڈ اسپیکر آن تھا۔ ایک ماتحت چیخ کر کہہ رہا تھا۔ "سر! بگ ہنٹر نے ہمارے دو ساتھیوں کو مار ڈالا ہے۔"

عابی نے پھر گرج کر کہا۔ "میں نے نہیں مارا ہے۔ کوئی میرے اندر بول رہا ہے کہ مجھ پر تنویمی عمل کیا گیا تھا۔ میرے دماغ کو الٹ دیا گیا ہے۔ بولو کیا سچ ہے؟"

وہ ان دونوں کو پکڑنے کے لیے آگے بڑھا۔ وہ دور بھاگتے ہوئے چیخ رہے تھے۔ "سر! یہ ہمیں بھی مار ڈالے گا۔ دروازہ بند ہے۔ یہ ہمیں کھول کر جانے نہیں دے گا۔"

دوسرے نے عابی سے کہا۔ "اے بھائی! تجھے کیا ہو گیا ہے۔ ہم دشمن نہیں ہیں۔ دوست ہیں۔ بھائی ہیں۔ کسی نے تمہارا دماغ نہیں الٹایا ہے۔"

عابی اچھل کر اس کے پاس پہنچ گیا۔ اسے دونوں ہاتھوں سے اٹھا کر سر سے بلند کرتے ہوئے بولا۔ "وہ آسیب میرے اندر بول رہا ہے۔ میں یہاں رہوں گا تو بے ایمان بن جاؤں گا۔"

دوسرا ماتحت چیخ کر کہہ رہا تھا۔ "سر! وہ ٹونی کو اٹھا کر سر سے اوپر لے آیا ہے۔ اسے پٹخنے والا ہے۔"

بن زیان ادھر سے چیخ رہا تھا۔ "ہنٹر......! رک جاؤ۔ میری ایک بات سنو۔ میں ابھی آرہا ہوں۔ میں تمہارے آسیب......"

اس کی بات ادھوری رہ گئی۔ عابی نے اس ماتحت کو دوسرے ماتحت پر دے مارا تھا۔ ایک تو وہیں پھڑ پھڑا کر مر گیا۔ دوسرا زخمی ہو کر تڑپنے لگا۔ اس نے ایک پاؤں اس کے سینے پر رکھا تو باہر کی سانسیں باہر ہی رہ گئیں۔ ایک طرف رکھا ہوا فون بن زیان کی آواز میں چیخ رہا تھا۔ اس کی صدائیں دیواروں سے ٹکرا رہی تھیں۔ وہ کمرا وہ مکان عابی کے وجود سے خالی ہو چکا تھا۔

اس مکان کے اطراف ٹی ڈی پی کے یہودی کارندے رہتے تھے۔ بن زیان نے فون پر حکم دیا۔ "فوراً اس مکان میں جاؤ۔ بگ ہنٹر کو گن پوائنٹ پر رکھو۔ اگر وہ قابو میں نہ آئے تو گولی مار کر زخمی کرو۔ اسے گرفتار کر کے لے آؤ۔"

تھوڑی دیر بعد اطلاع ملی کہ اس مکان میں بگ ہنٹر نہیں ہے۔ اپنے ہی ساتھیوں کی لاشیں پڑی ہیں۔ بن زیان، یہودی اکابرین، سپر پاور اور ان کے اتحادی سب ہی کو چپ لگ گئی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ بگ ہنٹریوں اچانک رسیاں توڑ کر چلا جائے گا۔

لارا نے کہا۔ "میں پہلے ہی بن زیان سے شبہ ظاہر کر چکی تھی۔ وہ تنویمی عمل کے زیر اثر نہیں آیا تھا۔ اس نے تابعدار بننے کا ناٹک کیا تھا۔ یہ پلان کر چکا تھا کہ اسے کس طرح قید سے رہائی حاصل کرنا ہے۔"

بن زیان نے کہا۔ "اب بات سمجھ میں آرہی ہے۔ وہ عابی کی طرح پوری آرمی سے جنگ لڑتا ہوا فرار نہیں ہو سکتا تھا۔ آرمی ہیڈ کوارٹر میں مجبور ہو گیا تھا۔ اس نے ہمارے ہی کرائے گئے تنویمی عمل سے فائدہ اٹھایا ہے۔ اس نے ناکام عمل سے فائدہ حاصل کیا ہے۔ جھوٹ بول کر خود کو تابعدار بنا کر ہماری آرمی سے لڑے بغیر فرار ہو گیا ہے۔"

ایک اعلیٰ حاکم نے کہا۔ "وہ ہم سے بدظن ہو کر باغی ہو کر گیا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ مراد کی جھولی میں چلا جائے۔"

دوسرے حاکم نے کہا۔ "اگر پرنس عابی اس کی خدمات حاصل کرے گا تو وہ جسمانی قوت میں ڈبل پاور ہو جائے گا۔ ادھر طاقت کا توازن بڑھ جائے گا۔ ہم مقابلتاً ہلکے پڑ رہے ہیں۔"

بن زیان نے کہا۔ ”وہ ابھی اسی شہر میں ہوگا۔ اسے تلاش کیا جا رہا ہے۔ ہم بھی نہیں چاہیں گے کہ وہ مراد کی جھولی میں جائے۔ شہر سے باہر جانے کے تمام راستے بند کر دیے گئے ہیں۔ یہ حکم دیا گیا ہے کہ وہ نظر آجائے اور گرفتاری پیش نہ کرے تو اسے گولی ماردی جائے۔ وہ کمبخت مسلمان ہے۔ مسلمانوں کی طرف ہی جائے گا اور ہم اسے جانے نہیں دیں گے۔“

اسی وقت اعلیٰ حاکم کے پی اے نے انٹرکام پر کہا۔ ”سر! بگ ہنٹر کی کال ہے۔“

اعلیٰ حاکم نے فوراً ہی فون کے وائڈ اسپیکر کا بٹن دبا کر ریسیور کو اٹھایا پھر کہا۔ ”یو بگ ہنٹر! کیوں ہم سے بدظن ہوگئے ہو؟ عقل کے ناخن لو۔ واپس آجاؤ۔ ہم تمہیں سر آنکھوں پر بٹھائیں گے۔ دوستوں کو دشمن نہ بناؤ۔“

”دشمن تو تم نے بنالیا ہے اور میری عداوت بہت مہنگی پڑنے والی ہے۔ میں وعدہ کرتا ہوں، اسی شہر میں رہوں گا اور تم لوگوں کا جینا حرام کرتا رہوں گا۔ یوں چیلنج کرنے کے بعد تنہا نہیں رہوں گا۔ مراد علی منگی سے پناہ کی درخواست کروں گا۔ یہاں ان کے بیٹے شہزاد کا محافظ بن کر رہوں گا تو وہ خوشی سے میری خدمات حاصل کریں گے۔ تم لوگوں کو اندازہ ہوجانا چاہیے کہ میں کس طرح ایک مضبوط پناہ گاہ میں پہنچنے والا ہوں۔“

اس نے رابطہ ختم کردیا۔ ایک فون کال کے ذریعے جتادیا کہ آئندہ تنہا اور بے یارومددگار نہیں رہے گا۔

☆☆☆

رگھوناتھ کالیا اپنی ریاست کالیا نگر کو قانونی حیثیت دینے کے سلسلے میں معروف تھا جبکہ انڈین لاء کے مطابق بھارت کی زمین پر کوئی آزاد ریاست قائم نہیں ہوسکتی تھی۔

اس نے دعویٰ کیا تھا کہ قانون بدل دے گا۔ ریاست کالیا نگر کا آزاد حکمران بن کر رہے گا۔ جس کے ہاتھ میں لاٹھی اس کے ہاتھ میں بھینس۔ جس کے ہاتھ میں طاقت ہوتی ہے وہی اقتدار حاصل کرتا ہے۔ اس کے پاس دولت تھی۔ اسے تانترک مہاراج کی حیثیت سے ماننے والے ہزاروں لوگ تھے۔ الیکشن میں کامیابی کے لیے مضبوط ووٹ بینک تھا۔ درپردہ جادوئی شکتی تھی اور اب تین ٹیلی پیتھی جاننے والوں کے ذریعے وہ عدالت میں بیٹھنے والے ججوں کو اور قانون کی بالادستی قائم رکھنے والوں کو اپنے زیر اثر لا رہا تھا۔

لارا، آبنوس اور طاغوتا اس کے احکامات کے مطابق کسی بھی متعلقہ جج کے اور قانون کے محافظوں کے اندر جاکر انہیں دماغی کمزوریوں میں مبتلا کردیتے تھے۔ ان کی بیویوں اور بچوں کو چھوٹے بڑے حادثات سے دوچار کرتے تھے۔ ان سب کو بری طرح دہشت زدہ کردیا تھا۔ ان میں دماغی اور جسمانی طور پر کمزور ہوتے رہنے کا حوصلہ نہیں رہا تھا۔ انہوں نے گھٹنے ٹیک دیے تھے۔ اس کے حق میں عدالتی فیصلہ لکھنے والے تھے۔

بن زیان کے کئی جاسوس کالیا نگر میں پہنچے ہوئے تھے۔ لارا کو اس سے نجات دلانے کا ایک ہی راستہ تھا کہ اسے گولی ماردی جائے۔ کوئی اس کے جادو کا توڑ نہیں کرسکتا تھا۔ نہ اس کی سیاسی اور سماجی حیثیت کو نقصان پہنچا سکتا تھا۔ اسے آسانی سے گولی بھی نہیں ماری جاسکتی تھی۔ وہ بلٹ پروف گاڑی میں مضبوط سیکیورٹی کے ساتھ باہر آتا تھا۔

وہ تینوں ٹیلی پیتھی جاننے والے اس کے دماغ میں آکر اس سے باتیں کرتے تھے لیکن اس کے فولادی دماغ کو کمزور نہیں بناسکتے تھے۔ اس نے لارا سے کہا تھا۔ ”میرے اندر زلزلہ پیدا کردو۔ میں شکایت نہیں کروں گا۔“

لارا نے اس کے اندر خیال خوانی کے کئی شدید جھٹکے دیے۔ وہ مسکراتا رہا۔ اسے یقین دلادیا کہ وہ ٹیلی پیتھی جیسے خطرناک ہتھیار سے بھی اسے زیر نہیں کرسکے گی۔

شیطان ازل سے اسی لیے زندہ ہے کہ اسے کوئی مار نہیں سکتا۔ بن زیان نے کہا۔ ”کیسے نہیں مرے گا؟ میں اس سے بڑا شیطان ہوں اور شیطان ہی شیطان کو مارسکتا ہے۔“

اس نے ایک رات کالیا کے بنگلے میں آگ لگوادی۔ ایسے وقت سیکیورٹی کمزور ہوگئی۔ تمام مسلح گارڈز آگ بجھانے کی کوشش میں تتر بتر ہوگئے۔ کالیا بھاگتا ہوا بنگلے کے باہر لان میں آیا تو اچانک ہی چاروں طرف سے فائرنگ ہوئی۔

بن زیان کے چار شوٹرز نے اسے گھیر لیا تھا۔ اس پر گولیاں برسا کر وہاں سے بھاگ جانا چاہتے تھے لیکن شدید حیرانی سے اپنے ہتھیاروں کو دیکھنے لگے۔ ان سے گولیاں نکلی تھیں لیکن کالیا کے قریب پہنچ کر نادیدہ رکاوٹوں سے ٹکرا کر زمین پر گر پڑی تھیں۔ یہ کوئی نہیں جانتا تھا۔ اس وقت معلوم ہو رہا تھا کہ وہ تانترک مہاراج دن رات طلسمی حصار میں رہتا ہے۔

ننھی ماروی شیشے کے شوکیس کے پاس گئی تھی۔ اسے چھو بھی نہ سکی تھی۔ کالیا نے اس کے بھائی کے پتلے کو بھی جادوئی بندش میں رکھا ہوا تھا۔ وہ محتاط رہنے کا عادی تھا۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

اسی لیے اسے گولیوں کی بوچھاڑ میں موت نہیں زندگی مل رہی تھی۔

وہ شوٹرز ناکام ہوتے ہی وہاں سے بھاگنے لگے۔ کالیا نے اپنی گن نکال کر گولیاں چلائیں تو دو زخمی ہو کر گرے۔ دو بھاگنے لگے۔ سیکیورٹی گارڈز نے آ کر انہیں پکڑ لیا۔ کالیا نے ان کی پٹائی کرتے ہوئے پوچھا۔ "کون ہو؟ کس کے حکم سے قتل کرنے آئے ہو۔ فوراً بولو۔"

بن زیان کے شوٹرز بڑے سخت جان تھے۔ جان ہار جاتے تھے، زبان نہیں ہارتے تھے۔ کبھی اپنا بھید نہیں کھولتے تھے۔ وہ سیکیورٹی گارڈز کی گرفت سے نکلنے کے لیے فائٹ کرنے لگے۔ وہ اچھے فائٹر بھی تھے۔ ایک نے ان کی گرفت سے نکلتے ہی خود کو گولی مار لی۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ فرار نہیں ہو سکے گا۔

دو زخمیوں میں سے ایک مر گیا۔ بنگلے میں لگی ہوئی آگ بجھی نہیں تھی۔ بجھانے کی کوششیں کی جا رہی تھیں۔ دوسرا زخمی اچانک ہی دوڑتا ہوا بنگلے کے اندر آگ میں چھلانگ مار کر نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ وہ ثابت کر رہے تھے کہ جان پر کھیلنا جانتے ہیں۔ یہ بھی نہیں بتائیں گے کہ کس کے حکم سے موت کا کھیل کھیلنے آئے تھے۔

وہ ایک ہی بچ گیا تھا۔ اسے ٹارچر سیل میں لایا گیا۔ مرنا آسان ہے لیکن اذیتیں برداشت کرتے ہوئے جینا مشکل ہو جاتا ہے۔ اس پر غیر انسانی مظالم ڈھانے کی انتہا ہونے لگی۔ وہ چیخ رہا تھا۔ موت کی بھیک مانگ رہا تھا لیکن یہ نہیں بتا رہا تھا کہ کس کے حکم سے موت بن کر آیا تھا۔

لارا اور بن زیان کو معلوم ہو گیا تھا کہ وہاں بھید کھل گیا ہے۔ وہ اس شوٹر کے دماغ میں پہنچ گئی۔ اس کی حالت دیکھی نہیں جا رہی تھی۔ وہ مردے سے بھی بدتر ہو گیا تھا۔

وہ بولی۔ "شاباش ہے تم پر۔ تم نے جاں نثاری کی انتہا کر دی ہے لیکن افسوس! میں تمہاری سانسیں چھین کر ہی تمہیں آرام پہنچا سکتی ہوں اور کوئی راستہ نہیں ہے۔"

وہ بڑی نقاہت سے بولا۔ "لارا......! تمہارا احسان ہو گا۔ مجھے فوراً مار ڈالو۔"

لارا نے اس کے کمزور دماغ پر قبضہ جما لیا۔ اسے سانس لینے سے روک دیا۔ وہ اپنے اختیار میں نہیں رہا تھا۔ اس نے تڑپ کر سانس لینے کی کوشش کی۔ اس قدر کمزور ہو گیا تھا کہ دوسری بار کوشش نہ کر سکا۔ یکلخت بے دم ہو گیا۔ اس کے دیدے پھیل کر ہمیشہ کے لیے ساکت ہو گئے۔ آخر اسے رہائی مل گئی۔

کالیا ٹارچر سیل کے باہر بیٹھا تھا۔ اسے انتظار تھا کہ وہ قیدی اس کے دشمنوں کے نام اگل دے گا۔ ایسے وقت اس کے جلاد کارندے نے باہر آ کر کہا۔ "وہ مر گیا ہے۔"

وہ غصے سے پاؤں پٹخ کر کھڑا ہو گیا۔ "کیا اس نے کسی کا نام نہیں بتایا؟ ابھی تو اس میں بہت جان تھی۔"

کارندے نے کہا۔ "گرودیو! وہ مرتے وقت تھوڑا بڑبڑایا تھا۔"

اس نے جلدی سے پوچھا۔ "کیا بول رہا تھا؟"

"وہ بول رہا تھا 'لارا تمہارا احسان ہو گا۔ مجھے مار ڈالو۔'"

"نہیں......" وہ غصے کی شدت سے چیخ پڑا۔ "کتے کی بچی! آستین کی ناگن! تو نے میری موت کے ہرکارے بھیجے تھے۔ تو مرے گی۔ حرام موت مرے گی۔"

اس نے فون پر اس کے نمبر پنچ کیے۔ وہ اس وقت تاریک دنیا میں تھی۔ وہاں فون کے ذریعے رابطہ نہیں ہوتا تھا۔ وہ غصے سے تلملا رہا تھا۔ اسے گالیاں دینے کے لیے تڑپ رہا تھا۔

وہ تہ خانے میں شوکیس کے پاس آ گیا۔ وہاں ماں اور بیٹے کے پتلے لیٹے ہوئے تھے۔ وہ بڑے کرودھ میں پراسرار منتر پڑھنے لگا پھر اس نے شوکیس کے ایک پٹ کو کھول کر اس میں ہاتھ ڈالا۔ پتلے کے سرہانے رکھی ہوئی ایک سوئی اٹھائی پھر اس پر تھوک کر پتلے کے بدن کے ایک حصے میں اسے پیوست کر دیا۔

اسی لمحے میں لارا کے حلق سے ایک دلخراش چیخ نکلی۔ وہ زمین پر گر کر تڑپنے لگی۔ کاہن اور دونوں ٹیلی پیتھی جاننے والے ساتھی دوڑتے ہوئے آئے۔ وہ تڑپ رہی تھی۔ چیخ رہی تھی۔ "وہ مجھے مار ڈالے گا۔ مجھے بچاؤ۔ اس کے پاس جاؤ۔ اس سے رحم کی بھیک مانگو۔ میرے بدن میں آگ لگی ہوئی ہے۔ ایسی جلن ہے کہ برداشت نہیں ہو رہی ہے۔ میں مر جاؤں گی۔"

آبنوس اور طاغوتا فوراً ہی کالیا کے دماغ میں آ کر بولے۔ "گرودیو! آپ یہ ظلم کیوں کر رہے ہیں؟ لارا آپ کی وفادار داسی ہے۔ آپ اسے کیوں مار ڈالنا چاہتے ہیں؟"

وہ اسے خوب گالیاں دیتے ہوئے بولا۔ "اس نے مجھے مار ڈالنے کے لیے اپنے کتوں کو یہاں بھیجا تھا۔ ان سب نے مجھ پر گولیاں چلائی تھیں۔ وہ کتیا کیا جانے کہ موت بھی مجھے نہیں مارتی ہے۔"

"گرودیو! وہ آپ کی جانی دشمن نہیں بن سکتی۔ اس کی

جان آپ کی مٹھی میں رہتی ہے۔ آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ آپ اس سے بات کریں۔ وہ تڑپ رہی ہے۔ اس کی سزا ختم کریں۔ وہ مرجائے گی۔"

کالیا نے پتلے کے بدن سے سوئی نکال لی۔ اسی لمحے میں لارا نے سکون کی سانس لی۔ آگ بجھ گئی تھی۔ ٹھنڈک محسوس ہورہی تھی۔ طاغوتا نے کہا۔ "کالیا کے پاس جاؤ۔ اسے یقین دلاؤ کہ وہ قاتل تمہارے آدمی نہیں تھے۔"

اس نے فوراً ہی کالیا کے دماغ میں آکر کہا۔ "میں ہاتھ جوڑ کر شیطان کی قسم کھا کر کہتی ہوں۔ میں نے کسی قاتل کو تمہاری جان لینے کے لیے نہیں بھیجا تھا۔"

وہ گالیاں دیتے ہوئے بولا۔ "تو پکی حرام زادی ہے۔ یہ سمجھ رہی ہے کہ جھوٹ بول کر جان بچالے گی اور مجھے معلوم نہیں ہوگا کہ تو چھپ کر اس قیدی کے دماغ میں آئی تھی۔"

"کیا تمہاری جادوئی شکتی کہہ رہی ہے کہ میں دشمنی کررہی ہوں......؟"

"تو مجھ سے سوال نہ کر۔ میرے سوال کا جواب دے۔ کیا مرنے والے قیدی کے آخری الفاظ یہ ہیں...... لارا تمہارا احسان ہوگا۔ مجھے فوراً مار ڈالو۔"

وہ انکار نہ کرسکی۔ ڈھیٹ بن کر انکار کرتی تو وہ پھر اس کے بدن میں آگ لگا دیتا۔ وہ رونے لگی۔ دونوں ہاتھ جوڑ کر گڑگڑانے لگی۔ زندگی کی بھیک مانگنے لگی۔

وہ بولا۔ "میں نے کرودھ میں آکر سوچا تھا۔ ابھی تجھے جان سے مار ڈالوں گا لیکن مرجائے گی تو تجھے ہمیشہ کے لیے آرام آجائے گا۔ نہیں۔ میں تجھے زندہ رکھوں گا لیکن تجھے بیمار بنائے رکھوں گا۔ بچے کو تجھ سے چھین لوں گا۔"

وہ اچانک ہی قہقہے لگانے لگا۔ "ہاہاہا...... ایک زبردست آئیڈیا دماغ میں آیا ہے۔ مجھے اپنی ریاست کا حکمران بن کر رہنے کے لیے مراد علی منگی سے بھی دوستی رکھنی چاہیے۔ میں اس کے اصل بچے کی ہسٹری اسے بتاؤں گا۔ اس بچے کی نشاندہی کروں گا، دانش کو اس کے پاس پہنچاؤں گا تو وہ میری قدر کرے گا۔ ہمارے درمیان دوستی اور سفارتی تعلقات قائم ہوجائیں گے۔ ہاہاہا......"

وہ قہقہے لگا رہا تھا۔ وہ گڑگڑا رہی تھی۔ مراد کو بچے کے بارے میں فراڈ کا علم ہوتا تو وہ لارا اور بن زیان کا جینا حرام کردیتا۔ کالیا کالے جادو کے ذریعے یوں بھی آدھی جان نکالتا رہتا تھا۔ آئندہ عداوت میں مراد جیسے غضب ناک دشمن کا اضافہ ہوجاتا۔

آبنوس اور طاغوتا بھی اس کی خوشامدیں کرنے لگے کہ وہ بچے کے معاملے میں لارا سے دشمنی نہ کرے۔ بن زیان کو معلوم ہوا تو وہ گھبرا گیا۔ بچے کا بھید کھلنے کے بعد مراد اسے زندہ نہیں چھوڑنے والا تھا۔ اس نے فون کے ذریعے کالیا سے کہا۔ "گرودیو! ہم سب پر رحم کرو۔ مراد جیسے دشمن کو دوست نہ بناؤ۔ ہم سے ایک غلطی ہوگئی ہے۔ ایک بار ہمیں معاف کردو۔ آئندہ ہم ایسی غلطی کی جرأت نہیں کرسکیں گے۔"

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ فون بند کردیا۔ اسے مراد سے دوستی کرکے ریاستی معاملات میں دور تک فائدے نظر آرہے تھے۔ وہ تھوڑی دیر تک سوچتا رہا پھر اس نے فون اٹھا کر اس کے نمبر پنچ کیے۔ ننھی سی اسکرین پر نمبر دکھائی دے رہے تھے۔ معلوم ہوا کہ ایک غلط نمبر پنچ ہوگیا ہے۔

اس نے درست کیا تو اسی لمحے میں دوسرا نمبر صفر ہوگیا۔ اس نے حیرانی سے اسکرین کو دیکھا۔ ایسا کبھی نہیں ہوتا مگر ہو رہا تھا۔ وہ فون صحیح نمبر کے ساتھ اسے مراد تک نہیں پہنچا رہا تھا۔ اس نے پھر ایک بار نمبر پنچ کیے تو وہ تمام نمبر صفر ہوگئے۔ اسکرین پر صرف صفر ہی صفر دکھائی دے رہے تھے۔

وہ تمام صفر لوح مقدر پر لکھے تھے کہ اصل بیٹا دانش صفر رہے گا۔ کوئی اس کی حقیقت نہ بیان کرسکے گا، نہ جان سکے گا۔ پہلی بار ننھی باروی کو حقیقت معلوم ہوئی تھی تو اس نے مراد کو بتانا چاہا تھا لیکن کچھ بول نہیں پائی تھی۔ وہ تاحال خاموش تھی۔ اس نے رضائے الٰہی کے مطابق لاوارث بچے کو بابا جانی کا وارث بنا دیا تھا۔

کالیا حیرانی سے دیدے پھاڑے صفر کی بھرمار دیکھ رہا تھا۔ کالے جادو سے بھرپور زندگی میں اس نے عجیب و غریب تماشے کیے تھے۔ ایسا تماشا اس کے ساتھ پہلی بار ہو رہا تھا۔

اس نے پرسنل سیکریٹری سے کہا۔ "ریاست ارض اسلام کے حکمران مراد علی منگی سے بات کراؤ۔"

وہ حکم دے کر انتظار کرنے لگا۔ سیکریٹری رابطہ نہیں کرا رہا تھا۔ بڑی دیر بعد اس نے انٹرکام پر کہا۔ "سر! میں وقفے وقفے سے کوشش کرتا رہا ہوں۔ کبھی سگنل نہیں ملتے ہیں کبھی نیٹ ورک میں خرابی پیدا ہوجاتی ہے۔"

اس نے کہا۔ "کوشش جاری رکھو۔ جیسے ہی رابطہ ہو بات کراؤ۔"

وہ سوچنے لگا۔ مراد اگرچہ بڑا دین دار بنتا ہے۔ کالا جادو جاننے والوں سے اور شیطان کے پرستاروں سے بات

کرنا بھی گوارا نہیں کرتا لیکن مجھ سے کرے گا۔ میں اسے ایک بہت بڑے فریب سے آگاہ کروں گا۔ اس کے اصل بیٹے کو اس کی گود میں پہنچاؤں گا۔ وہ تو میرے گھٹنے پکڑ کر احسان مانے گا۔"

اسی وقت سیکریٹری نے انٹر کام سے کہا۔ "سر! رابطہ ہوگیا ہے۔ ہز ہائی نس بات نہیں کرنا چاہتے تھے پھر انہوں نے رابطہ کرنے کو کہا ہے۔"

کالیا نے کہا۔ "وہ بہت مغرور ہے۔ بہت اکڑتا ہے۔ بیٹے کی حقیقت معلوم ہوگی تو......"

بات ادھوری رہ گئی۔ رابطہ ہوگیا۔ کالیا نے بڑی سنجیدگی سے انٹر کام کو دیکھا۔ دل میں کہا۔ "تمہارا تو باپ بھی بات کرنے والا تھا۔ کیسے بات نہ کرتے۔"

اس نے بڑے اعتماد سے انٹر کام کے ایک بٹن کو دبایا۔ دوسری طرف سے مراد کی آواز سنائی دی۔ "آ...... آ...... آخ تھو......" پھر فون بند ہوگیا۔

یہ کیا ہوگیا؟ یہ تو ایسا دھماکا ہوا کہ کالیا کے وجود کی دیواریں لرز گئیں۔ ایسی توہین کوئی برداشت کر ہی نہیں سکتا تھا۔ وہ پھٹ پڑا تھا۔ حلق پھاڑ کر چیخ رہا تھا۔ انتہائی غلیظ گالیاں دے رہا تھا۔ دیوار پر لاتیں اور گھونسے مار رہا تھا۔ یوں کسی حد تک بہل رہا تھا کہ مراد کی پٹائی کر رہا ہے۔

توہین کا بدلہ لینے کے لیے بھی ایک فوری انتقامی کارروائی تھی۔ جنون کی حالت میں اسی طرح تسلی ہوسکتی تھی۔ وہ ایسے پراسرار منتر اور جادوئی ہتھکنڈے جانتا تھا کہ ہزاروں میل تک دشمنوں کو عذاب میں مبتلا کرسکتا تھا۔ جیسے اس نے پتلے کو ایک سوئی چبھو کر لارا کو عذاب میں مبتلا رکھا تھا۔

اب سے پہلے بھی مراد نے اس پر تھوکا تھا اور اس نے جنون میں مبتلا ہو کر کالی شکتی کے کئی حملے کیے تھے اور ناکام رہا تھا۔ اگر لارا کی طرح مراد کا بھی کوئی ناپاک کپڑا مل جاتا یا وہ صوم وصلوٰۃ کا پابند نہ رہتا اور ناپاک رہا کرتا تو اس پر کالے ہتھکنڈے ضرور کامیاب ہوتے۔

وہ اپنے آپ سے لڑتے لڑتے تھک کر بیٹھ گیا۔ بھوکے درندے کی طرح ہانپنے لگا۔ قسمیں کھانے لگا کہ اسے زندہ نہیں چھوڑے گا۔ وہ اپنے مزاج کے خلاف خود پر جبر کرنے اور صبر کرنے لگا۔ خود کو سمجھانے لگا۔ "میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ صرف اپنی کالی شکتی سے اسے زیر نہیں کرسکوں گا۔ اس کمینی ٹیلی پیتھی جاننے والی کو زندہ رکھنا ہوگا۔ اس کی ٹیلی پیتھی سے اور بن زیان کی سیاسی شطرنجی چالوں سے اسے کچلنا ہوگا۔"

اس نے لارا سے کہا کہ دماغ میں آئے پھر فون پر بن زیان سے کہا۔ "تم دونوں میری باتیں سن رہے ہو؟ میں نے سوچا ہے کہ تمہاری پہلی غلطی معاف کردوں گا۔"

وہ دونوں خوش ہوگئے۔ بن زیان نے کہا۔ "تم بہت اونچے انسان ہو۔ ہم نے تم پر قاتلانہ حملے کرائے۔ ہم شرمندہ ہیں۔ تم ہماری اتنی بڑی غلطی کو معاف کررہے ہو۔"

کالیا نے کہا۔ "وہ مسلمان بھی تمہارا دوست نہ بن سکا۔ میرا بھی نہیں بنے گا اور نہ میں بناؤں گا۔ میں اسے مار ڈالنا چاہتا ہوں۔ بولو کہ اسے کس طرح موت کے گھاٹ اتارا جاسکتا ہے؟"

بن زیان نے کہا۔ "ہم تو اس کی تاک میں رہتے ہیں۔ جس دن نشانے پر آئے گا، ہم اسے ایک کے بعد دوسری سانس نہیں لینے دیں گے۔"

"وہ خود نشانے پر نہیں آئے گا۔ اسے آنے پر مجبور کرنا ہوگا۔ میں تم دونوں کی غلطیاں اسی لیے معاف کررہا ہوں۔ تم اپنی اپنی صلاحیتوں سے اسے ریاست سے باہر منظر عام پر آنے پر مجبور کردو۔ وہ آئے گا تو ہم کالے جادو کی شکتی سے ٹیلی پیتھی کی قوت سے اور تمہاری سیاسی شطرنجی چالوں سے بچ کر جانے نہیں دیں گے۔"

"درست کہتے ہو۔ ہمارے پاس کالے جادو، ٹیلی پیتھی کی اور مکارانہ چالیں چلنے کی صلاحیتیں ہیں۔ وہ ریاست سے باہر آئے گا تو ہمارے ہاتھوں سے ضرور مارا جائے گا۔ ہم آج ہی سے بلکہ ابھی سے اسے مقابلے پر آنے کے لیے مجبور کردیں گے۔"

فی الحال ان کے سامنے ایک شہزادی تھا جس پر حملے کرکے اور جسے اغوا کرکے مراد اور عابی کو لندن آنے پر مجبور کرسکتے تھے اور وہ دوبار اس پر حملے کرچکے تھے۔ سب سے بڑا حملہ امی مالا نے کیا تھا۔ بڑی رازداری سے شہزاد کو تابعدار بنائے رکھا تھا لیکن مقدر کی بات ہے۔ اس قدر کامیاب ہونے کے باوجود وہ حرام موت ماری گئی تھی اور وہ باپ بیٹے ان کی حسرتیں پوری کرنے کے لیے باہر کسی ملک میں نہیں آرہے تھے۔

جبکہ عابی آچکا تھا۔ لندن میں موجود تھا۔ مراد بھی کسی دن آجاتا تو وہ لوگ اسی طرح آنکھوں والے اندھے بن کر رہتے۔

مراد کیوں طویل عرصے سے ریاست میں تھا؟ اس کی مصروفیات کیا ہیں؟ یہ رفتہ رفتہ معلوم ہونے لگا۔ ریاست

کے شمال میں ایک گھنا جنگل پچاس میل کے رقبے تک پھیلا ہوا تھا۔ وہاں میلوں دور تک ایک وسیع و عریض اسلامی درس گاہ تعمیر کی جارہی تھی۔ رواں سائنس اور ٹیکنالوجی کے مطابق جدید مشینیں اور آلات پہنچائے جارہے تھے۔ دنیا جہان کے اسلامی اسکالرز اور علمائے دین کی خدمات حاصل کی جارہی تھیں۔

اور یوں دشمنانِ اسلام کے آگے خطرے کی گھنٹی بجنے لگی تھی۔ یہ تاریخی حقیقت ہے کہ جب بھی دین اسلام کی تعلیم و تبلیغ کے لیے اس کی اشاعت اور پھیلاؤ کے لیے جدوجہد کی جاتی ہے تو بڑے ہی منظم طریقوں سے رکاوٹوں کا سلسلہ شروع ہوجاتا ہے۔

درحقیقت جہاں سیکیورٹی کمزور ہوتی ہے۔ جہاں مسلمان منافق ہوکر تخریب کاروں کو کھلا راستہ دیتے ہیں۔ وہاں دہشت گردوں کو کامیابیاں حاصل ہوتی رہتی ہیں۔

مراد نے بھی پابندی عائد کی تھی۔ یہ اعلان کیا تھا۔ ''اس درس گاہ کا نام درس گاہ نورانی ہے۔ انشاء اللہ یہ ادارہ پوری دنیا میں اسلام کا نور پھیلائے گا۔ یہ جب تک زیر تعمیر رہے گا' تب تک کسی غیر مسلم کو یہاں قدم رکھنے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔''

جو بات چھپائی جائے' وہ پراسرار بن جاتی ہے۔ درس گاہ نورانی کو چھپایا جارہا تھا۔ اسے دور سے دیکھا جاسکتا تھا نہ سمجھا جاسکتا تھا کہ وہاں کیا ہورہا ہے؟ دشمنوں کو خبریں ملتی رہتی تھیں۔ وہ آپس میں بولتے رہتے تھے۔ انہیں تقریباً تیس میل کے رقبہ تک اٹھائی جانے والی احاطے کی دیواروں سے معلوم ہورہا تھا کہ اسلام کا ایک مضبوط قلعہ تعمیر کیا جارہا ہے۔

انتہائی سخت سیکیورٹی کے باعث مخالفین اور جاسوس احاطے کی دیواروں کے قریب بھی نہیں جاسکتے تھے۔ انہیں خفیہ کیمروں کے ذریعے دیکھ لیا جاتا تھا۔ اس کے باوجود کیمرے کسی بہروپیے کو نہیں پکڑ سکتے تھے۔ کچھ غیر مسلم' مسلمان بن کر آسکتے تھے اور کچھ مسلمان منافق بھی تھے۔ وہ مخالفین کے زرخرید بن کر جاسوسی کرتے تو کبھی گرفت میں نہ آتے۔

درس گاہ نورانی کے معاملات میں مخالفین حیران تھے۔ اس کے احاطے میں قدم رکھنے والے بہروپیے آپ ہی آپ بے نقاب ہوجاتے تھے اور وہ اس طرح کہ ماروی جس کے قریب سے گزرتی تھی' وہ یکلخت سحرزدہ ہوجاتا تھا۔ بے اختیار بولنے لگتا تھا کہ وہ کون ہے اور اس کی اصلیت کیا ہے اور وہاں کن مقاصد کے لیے آیا ہے۔ اس کے ساتھ قدرتی کرشمہ سازی تھی۔ اس کا وجود جیسے آئینہ تھا۔ بھیس بدلنے والے اس آئینے میں اپنا اصلی چہرہ خود دیکھتے تھے اور اپنی زبان سے اپنی حقیقت بیان کرنے لگتے تھے۔

ابتدا میں کئی دشمن بھیس بدل کر درس گاہ نورانی کے خفیہ معاملات کو دیکھنے اور سمجھنے آئے پھر سمجھنے سے پہلے ہی بے نقاب ہوگئے۔ یہ اعتراف کرنے لگے کہ اس ادارے ''نورانی'' کو روحانی سیکیورٹی حاصل ہے۔ وہاں دولت' طاقت' اسلحہ اور مکاریاں کام نہیں آئیں گی۔

فی الحال کالیا' لارا اور بن زیان بھی درس گاہ نورانی کے خلاف کچھ کرنہیں سکتے تھے۔ مراد کو ریاست سے باہر آنے پر مجبور کرنا بہت ضروری ہوگیا تھا۔ وہ نظروں میں رہتا تو اس سے نمٹتے رہنے کے ہتھکنڈے آزمائے جاتے رہتے۔

وقت گزرتا جارہا تھا۔ درس گاہ نورانی تعمیر کے آخری مراحل میں تھی۔ تعلیم و تربیت بہت پہلے ہی سے جاری تھی۔ ہزاروں کی تعداد میں مسلمان لڑکے اور لڑکیاں داخل ہوچکے تھے۔ دنیا جہاں کے علوم کے اساتذہ بھی وہاں رہائش پذیر تھے۔ علم ریاضی' تجارت' طب' سائنس اور جدید ٹیکنالوجی کے الگ الگ شعبے قائم تھے۔ طلبا و طالبات کے لیے انتہائی مہنگی مشینیں اور جدید آلات فراہم کیے گئے تھے۔ یوگا' ہپناٹزم' ٹیلی پیتھی' جوڈو کراٹے اور سراغ رسانی کی سپاہیانہ تربیتیں دی جارہی تھیں۔ اسے صحیح معنوں میں دین اسلام کا فولادی قلعہ بنایا جارہا تھا۔

ان حالات میں مراد وہاں سے نکل ہی نہیں سکتا تھا۔ وہ درس گاہ نورانی کے باہر کی دنیا کو فی الحال بھول چکا تھا۔ مخالفین نے اسے مشتعل کرنے کے لیے پھر شہزاد پر حملے کیے تھے۔ کئی ماہ کے وقفوں سے کیے جانے والے حملے جس طرح ناکام ہوئے اور جس طرح حملہ کرنے والے مارے گئے، اس سے یہ اندازہ ہوتا رہا کہ عابی لندن میں ہے اور ایسے وقت عابی یہ ظاہر کرتا رہا کہ وہ بگ ہنٹر ہے۔ مراد اور پرنس عابی کا وفادار بن چکا ہے۔

لیکن وہ زیادہ عرصے تک بگ ہنٹر بن کر نہ رہ سکا۔ ایک بار دشمنوں نے اسے چاروں طرف سے گھیر لیا تھا۔ فرار ہونے کے لیے لازمی ہوگیا تھا کہ وہ بلند و بالا عمارتوں پر سے چھلانگیں لگا کر راستہ بنائے۔ ایسے وقت اس پر حملہ کرنے اور اسے گھیرنے والے دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے۔

بن زیان' یہودی اکابرین' سپر پاور اور ٹیلی پیتھی جاننے والے سب ہی فون کے ذریعے اور خیال خوانی کے

ذریعے بولنے لگے۔ ''جس ناگ کو ہم سمجھ رہے تھے کہ پٹارے میں ہے وہ ہمارے ہی درمیان پھنکارتا پھر رہا تھا۔ آج بھید کھل گیا ہے۔ وہ بگ ہنٹر نہیں ہے۔ پرنس عابد علی منگی ہے۔''

لیکن وہ اعتراف نہیں کررہا تھا۔ بگ ہنٹر کی حیثیت سے بھی گم ہوگیا تھا۔ ان کے جواب میں کوئی بیان نہیں دے رہا تھا۔ اپنی خاموشی اور گمشدگی سے خود کو پرنس عابی ثابت کرچکا تھا۔ اس کی خاموشی بھی ایک چیلنج تھی کہ میں عابی ہوں۔ نہ ہنٹر ہوں۔ میرا کوئی وجود نہیں ہے۔ ہے تو مجھے ڈھونڈلو۔

تمام مخالفین نے لندن شہر کو جیسے مقفل کردیا۔ یہی موقع تھا، اسے کسی بھی بھیس میں شہر سے باہر جانے نہ دیا جاتا۔ اس کے قد اور جسامت سے مناسبت رکھنے والے لاکھوں افراد تھے۔ وہ مصیبت میں مبتلا ہوگئے تھے۔ پولیس اور سراغ رساں انہیں شاہراہوں میں، گلی کوچوں، محلوں اور مکانوں میں دیکھتے ہی روکتے تھے۔ ان کی صحیح شناخت سے مطمئن ہوئے بغیر ان کا پیچھا نہیں چھوڑتے تھے۔

عابی کے چہرے کی پلاسٹک سرجری ایسی مہارت سے کرائی گئی تھی اور لندن کے ایک شہری کی حیثیت سے اس کے آئی ڈی کارڈ، پاسپورٹ اور دیگر اہم کاغذات ایسے ٹھوس تھے کہ سراغ رساں دوبارہ اس کا محاسبہ کرکے مطمئن ہوکر چلے گئے تھے۔

اسے تلاش کرنے والے حیران تھے کہ وہ کہاں گم ہوگیا ہے؟ کیا آنکھوں میں دھول جھونک کر لندن سے باہر جاچکا ہے؟ کیا روحانی قوت نے اسے چھپا رکھا ہے؟

ایسے وقت شہزادہ لندن چھوڑ کر اپنی ریاست میں چلا گیا۔ اسے قانونی طور پر جانے سے روکا نہیں جاسکتا تھا اور نہ ہی جاتے وقت جانی نقصان پہنچایا جاسکتا تھا۔ مراد نے سختی سے چیلنج کیا تھا۔ ''میرے ایک بیٹے کو ہلکی سی بھی خراش آئے گی تو درجنوں حکمران مارے جائیں گے۔'' اسے بین الاقوامی پولیس کی نگرانی میں وہاں سے روانہ کیا گیا تھا۔ عابی نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ بغل میں چھری بن کر نظر نہ آنے والا آسیب بن کر رہے گا۔ وہ سب ہی الجھے ہوئے تھے۔ سمجھ نہیں پارہے تھے کہ وہ موجود ہے یا اپنے بھائی کے پیچھے رازداری سے چلا گیا ہے؟ وہ چاہتے تھے کہ باپ بیٹے ریاست سے باہر آئیں۔ اب بیٹا باہر آکر تاریکی میں چلنے والی بندوق بن گیا تھا۔

ان حالات میں وقت گزرتا جارہا تھا۔ لارا نے اپنی پلاننگ کے متعلق پہلے اعلان کیا تھا کہ اس نے دوسری شادی کی ہے پھر دو ماہ بعد یہ بیان دیا تھا کہ دوسرے شوہر سے ایک بچے کو جنم دینے والی ہے۔ وہ اپنے منصوبے کے مطابق دس ماہ بعد نوزائدہ بچے کو اسپیشل چینل کی اسکرین پر لائی تھی پھر ڈیڑھ برس کے بعد اپنے بیٹے دانش کے ساتھ اسکرین پر آکر یہ ثابت کیا تھا کہ وہ دوسرے شوہر سے ہونے والا بیٹا ہے۔

اب تو کالیا بھی دشمنی سے کبھی نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ مراد کا بیٹا نہیں ہے۔ وہ لارا کو فراڈ نہیں کہہ سکتا تھا اور یہ کوئی ضروری بھی نہیں سمجھتا تھا۔ اس ماں اور بیٹے کی جان کو شوکیس میں بند رکھ کر مطمئن تھا۔

کالیا' مراد کے لہو کا پیاسا تھا۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ مراد درس گاہ نورانی کے دینی معاملات میں مصروف رہنے لگا ہے۔ اسے وہاں سے کسی دوسرے ملک میں آنے کے لیے مجبور نہیں کیا جاسکے گا۔

اس نے بن زیان سے کہا۔ ''باپ نہ سہی بیٹا سہی۔ یہ ہم سب اچھی طرح جانتے ہیں کہ وہ لندن میں کہیں ہے۔ بہت انتظار ہوچکا۔ اسے سانپ کے بل سے نکالو۔''

بن زیان نے کہا۔ ''ابھی ہم اپنی دولت سے، ہتھیاروں سے، جسمانی طاقت اور وسیع ذرائع سے اسے پکڑ نہیں سکیں گے۔ اسے مکارانہ ذہانت سے زیر کرنا ہوگا اور میں پلان کرچکا ہوں۔ میں عابی کی ایک بہت بڑی کمزوری سے کھیلوں گا۔ میرا کھیل اب شروع ہونے والا ہے۔''

جینیفر عرف جینی اس بیٹے کو جنم دینے کے لیے جن ناقابل برداشت اذیتوں سے گزرتی رہی تھی اور جس طرح ٹوٹ پھوٹ کر اسے دنیا میں لائی تھی، ان اذیتوں کو اور ماں کی ممتا بھری قربانی کو وہ بھولتا نہیں تھا۔

یہ دشمن جانتے تھے کہ وہ ماں کو دل کی اور روح کی گہرائیوں سے چاہتا ہے۔ یہ مراد نے اور سب نے دیکھا تھا کہ وہ ہر نماز کے بعد اپنی ماں کی مغفرت کے لیے دعائیں ضرور مانگتا ہے۔ اس کے بیڈروم میں سامنے کی دیوار پر ماں کی ایک بڑی سی مسکراتی ہوئی تصویر رہتی تھی۔ صبح آنکھ کھلتے ہی ماں کو دیکھتا تھا۔ جب حالات سے مجبور ہوکر جگہ بدلتا تھا تو تصویر کو ایک لاکٹ میں رکھتا تھا۔ وہ ماں ہمہ وقت اس کے سینے پر دھڑکنوں سے لگی رہتی تھی۔

بن زیان نے دیوانہ وار چاہنے والے بیٹے کے جذبات سے کھیلنے کے لیے ایک فرضی پرنس عابد علی منگی پیدا کیا۔ اس فرضی عابی نے اسپیشل چینل کے ذریعے کہا۔ ''میں

پرنس عابد علی منگی ولد مراد علی منگی ایک طویل عرصے تک خاموش رہنے کے بعد بول رہا ہوں۔ مجھے افسوس ہے کہ میرا اصلی چہرہ نظر نہیں آئے گا۔ میں نے دشمنوں سے چھپنے کے لیے ابھی ماسک پہنا ہوا ہے۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں، شیطان کے ایک ٹیلی پیتھی جاننے والے چیلے آبنوس نے مجھ سے دشمنی کی ابتدا کی تھی۔ تب سے ہم مختلف چینلز کے ذریعے آپ حضرات کے سامنے آتے رہے ہیں۔ وہ ٹیلی پیتھی جاننے والا میرے مقابلے میں ناکام ہو کر جھنجلا گیا تھا۔ مجھے مجبور اور بے بس کرنے کے لیے اس نے اعلان کیا تھا کہ میں جس ملک میں جس علاقے میں رہوں گا، وہ وہاں لوگوں کو فائرنگ سے اور بم دھماکوں سے مار ڈالے گا۔ میں نے بے گناہ لوگوں کی جان بچانے کے لیے روپوشی اختیار کی ہے۔ اگرچہ میری زندگی محدود ہو گئی ہے۔ میں نقصان اٹھا رہا ہوں۔ تاہم یہ اطمینان ہے کہ میری وجہ سے بے گناہ لوگ مارے نہیں جا رہے ہیں۔ میری ہسٹری سب ہی جانتے ہیں۔ مجھے ایک عظیم ماں نے اپنی جان پر کھیل کر پیدا کیا تھا۔ اس ماں کی بے لوث ممتا اور بے غرض محبتوں کا قرض مجھ پر ہے۔ میں اپنی ماما کے لیے بہت کچھ کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے سوچا ہے کہ اس دنیا کی جو بھی عورت میری ماما کی ہم شکل ہوگی یا اس سے بہت زیادہ مشابہت رکھتی ہوگی، اسے ایک لاکھ ڈالر دوں گا۔ اس کی بڑی سے بڑی مصیبتیں دور کروں گا۔ اس کے مسائل حل کروں گا تو میری ماما کی روح کو سکون پہنچتا رہے گا اور میں روپوش رہ کر بہت اچھا وقت گزارتا رہوں گا۔''

مراد اور عابی اس جعلی عابد علی منگی کو اسکرین پر دیکھ رہے تھے۔ بڑی سنجیدگی سے سوچ رہے تھے اور سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے کہ دشمن یہ کیسی چال چل رہے ہیں؟ ایک جعلی عابی کو پیش کر کے کیا حاصل کرنا چاہتے ہیں؟

مراد نے اسپیشل چینل سے رابطہ کیا پھر کہا۔ ''میں مراد علی منگی بول رہا ہوں۔ تمام ناظرین سے عرض کر رہا ہوں کہ یہ ابھی آپ سے بولنے والا میرا بیٹا عابد علی منگی نہیں ہے۔ میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ یہ کون ہے اور کیوں پرنس عابی بن کر آپ حضرات کو دھوکا دے رہا ہے؟''

فرضی عابی نے کہا۔ ''مجھے فریبی کہنے والے، یہ بتاؤ کہ تم کون ہو؟ میں اپنے بابا جانی مراد علی منگی کو ان کے لب و لہجے سے پہچان لیتا ہوں۔ تمہارا لب و لہجہ بناوٹی ہے۔ تم میرے بابا جانی نہیں ہو۔ کیا وہی ٹیلی پیتھی جاننے والے دشمن ہو؟''

''اسپیشل چینل والے گواہی دیں گے کہ میں مراد علی منگی ہوں اور ابھی اپنی ریاست ارضِ اسلام سے بول رہا ہوں۔''

وہ بولا۔ ''میں غلط نہیں کہہ رہا ہوں۔ آبنوس اور اس کے ٹیلی پیتھی جاننے والے ساتھیوں نے اسپیشل چینل کے پورے عملے کے دماغوں پر قبضہ جما لیا ہے۔ ایک فرضی مراد علی منگی کو میرے خلاف بولنے کے لیے یہاں لے آئے ہیں۔ میں پرنس عابی ہوں۔ ناظرین مجھے دل و جان سے چاہتے ہیں۔ آپ ذرا اس پہلو پر غور کریں کہ میں یہاں اپنی ماما سے والہانہ محبت کا اظہار کر رہا ہوں۔ کسی کو نقصان نہیں پہنچا رہا ہوں۔ آپ اس چینل کی اسکرین پر دیکھیں گے، میں ہر اس عورت کو آپ کے سامنے ایک لاکھ ڈالر پیش کروں گا جو میری ماما کی ہم شکل ہوگی۔ اگر لاکھوں عورتیں ہم شکل ہوں گی تو لاکھوں کو ایک ایک لاکھ ڈالر ادا کروں گا۔ صرف اس لیے ادا کروں گا کہ ان عورتوں میں اپنی ماما کو دیکھتا رہوں گا۔ آپ یہ بھی دیکھیں گے کہ میں ان کے مسائل حل کروں گا اور ایسا وہی کرتا ہے جو اپنی ماں کا سچا محبت کرنے والا بیٹا ہوتا ہے۔ آپ سے گزارش ہے کہ ٹیلی پیتھی جاننے والے دشمنوں کو میرے خلاف بولنے دیں اور اس چینل کے ذریعے ایک بیٹے کی محبت اپنی ماما سے دیکھتے رہیں۔ میں اپنی ماما کی تمام ہم شکل عورتوں سے گزارش کرتا ہوں کہ ابھی جو فون نمبر بتائے جا رہے ہیں۔ ان کے ذریعے میرے سیکریٹری سے رابطہ کریں۔ اپنی پوسٹ کارڈ سائز کی تصویریں ارسال کریں۔ مجھ سے ذاتی طور پر ملاقات کرنے کی خواہش نہ کریں۔ میری مجبوریوں کو سمجھیں۔ ہزاروں لاکھوں خواتین سے ملاقات کرنا میرے لیے ممکن نہیں ہوگا۔ مگر ہاں، میں وقت اور حالات کے مطابق جب دیکھوں گا کہ دشمنوں کی طرف سے میری جان کو خطرہ نہیں ہے تو میں اپنی ماما کی ہم شکل خواتین سے ضرور ملوں گا۔ ان کے چہرے قریب سے دیکھوں گا۔ گویا اپنی ماما کو دیکھتا رہوں گا۔''

اس کی باتیں عورتوں کو اور خصوصاً ماؤں کے جذبات کو چھو رہی تھیں۔ مرد حضرات بھی قائل ہو کر کہہ رہے تھے کہ وہ لاکھوں کروڑوں ڈالرز خرچ کرنے والا پاگل نہیں ہے۔ واقعی پرنس عابی ہے۔ آئندہ دیکھیں گے کہ کیا ہونے والا ہے؟

حیرت انگیز واقعات، سحر انگیز لمحات اور سنسنی خیز گردشِ ایام کی دلچسپ داستان کا مزید احوال اگلے ماہ ملاحظہ فرمائیں

فائیو اسٹار ہوٹل کا ایئر کنڈیشنڈ ہزارانی ہال...... دیس دیس سے آئی عورتوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا اور آٹے میں نمک برابر کچھ بڑی عمر کے مرد بھی اگلی نشستوں پر بیٹھے نیند کا ادھار اتارنے میں لگے ہوئے تھے۔ آج کے اجلاس میں جو عنوان رکھا گیا تھا وہ تھا...... "مردوں کے درمیان سانس لیتی عورتوں کی مشکلات، محرومیاں اور ان کا حل......!"

اسٹیج پر چلی سے آئی بیز ارنگ...... پیرو سے پہنچنے والی مگدا پورٹل...... بالٹی مور کی ایڈرین رچ...... مصر سے نوال السعدی اور ان کے ساتھ آسٹریلیا سے آج کے اجلاس کی صدر ڈورتھی پورٹر بیٹھی تھیں۔ ان کے نزدیک ہی آج کے پروگرام کی اسٹیج سیکریٹری مسند نشین تھی۔

وہ بڑے دلنشین انداز میں آج کے موضوع کے بارے میں بات چیت اور مقالے پڑھنے کے لیے آئی مندوبین کو بلا رہی تھی۔ آج کے اس آخری اجلاس میں آنے والی مندوبین تو

گندے خمیر اور مردہ ضمیر انسانوں کا دہرا معیار

کسی بھی انسان کے خواہ کتنے ہی چہرے ہوں مگر اصل چہرہ تو ایک ہی ہوتا ہے یعنی اس کا ضمیر۔ ۔ ۔ بہ ظاہر خوشبو میں بسنے والے اندر سے تعفن زدہ لوگ معاشرے اور ماحول کو اس قدر حبس زدہ کردیتے ہیں کہ باضمیر لوگوں کے لیے سانس لینا بھی دوبھر ہوجاتا ہے اور اس پر طُرّہ یہ کہ الزام دوسروں پر دھر کر خود رنگ رلیوں میں مصروف ہوجاتے ہیں۔

کومل

علی اختر

کم تھیں کیونکہ آج تین دن کی کانفرنس کا آخری دن قراردادوں اور ڈیمانڈ کا دن تھا۔

''آج وقت کے اس جنگل میں ہر طرف مرد شیر اور بھیاڑ بے عورتوں کو خوف زدہ اور ان کا استعمال کر رہے ہیں اور عورتیں حیران و پریشان ہرنیوں کی طرح اپنا آپ بچاتی پھر رہی ہیں۔ انہیں سانس لینے اور اپنا آپ بچانے کے لیے کہیں کوئی جگہ، کوئی آسرا نہیں مل رہا۔ سرکاری دفتروں میں اچھی نوکریاں اور دلفریب عہدوں کو اپنی جھولی میں ڈالے مردوں کو اپنے دفتر میں کوئی لڑکی نظر آجائے تو حرص اور ہوس کے متوالے اسے اپنے... پُرفریب جال میں ہر وقت پھانسنے کی کوششوں میں مصروف رہتے ہیں۔ یہ ہمارے ملک کی سب سے بڑی بدنصیبی ہے کہ یہاں عورت کو حیلے بہانے ہراساں کیا جاتا ہے...... لیکن ایسا صرف یہیں نہیں ہوتا...... ہر جگہ یہی بدنصیبی اور محرومیاں عورت کا مقدر بنادی جاتی ہیں اور یہی آج کا موضوع ہے جس پر آج ہمارے مندوبین اور نمائندے بات کریں گے۔ اس پر جب پیرو سے آئی ہماری مہمان مگدا پورٹل اپنے خیالات کا اظہار کر چکیں گی تو چائے کا وقفہ ہو جائے گا۔ لیجیے سامعین! اب آپ کے سامنے آتی ہیں، پیرو سے آئی ہماری مہمان مگدا پورٹل......''

مگدا پورٹل نے بڑے خوب صورت انداز میں اپنا مقالہ سامعین کے سامنے پیش کیا تو ایک بار پھر وہ ڈائس پر آئی اور کہنے لگی۔

''آج کے اس پروگرام میں...... آخری مہمان کو آپ نے سنا۔ چائے کے وقفے کے بعد آپ کی میزبان ازیتہ قیصر کی جگہ دوسری میزبان اس پروگرام کو آگے چلائیں گی اور آج کی صدارتی نشست پر براجمان آسٹریلیا سے آئیں ڈورتھی پورٹر وقفے کے بعد اپنا مکالمہ آپ کے ساتھ شیئر کریں گی۔ بعد میں وقفہ سوالات ہوگا۔ جس میں سامعین سوالات کریں گے اور مسندِ صدارت پر جلوہ افروز ہونے والی ڈورتھی پورٹر ان کے جوابات دیں گی۔ اس کے بعد ہم سب کی طرف سے اربابِ اقتدار و اختیار سے ہمارے مطالبات ہوں گے۔ قراردادیں ہوں گی...... تو آیئے سامعین کرام...... چائے آپ کا انتظار کر رہی ہے۔'' یہ کہہ کر ازیتہ قیصر اسٹیج سے نیچے اتر گئی۔

ازیتہ قیصر میزبان کی حیثیت سے اس پروگرام کی کرتا دھرتا تھی۔ اسی لیے اس کا مقام دوسری خواتین سے بلند سمجھا جا رہا تھا۔ وہ چالیس اور پینتالیس برس کی ایسی عورت تھی جو متوسط گھرانے یا غریب ماحول میں پلی بڑھی ہوتی تو اب تک قبر میں جانے والی ہوتی یا پھر کسی ٹوٹی ہوئی چارپائی پر پڑی بیماریوں سے لڑ رہی ہوتی۔

لیکن یہاں اس نے اپنے آپ کو بڑا سنبھال کے رکھا ہوا تھا۔ اسی لیے وہ اپنی عمر سے دس بارہ سال کم ہی دکھائی دے رہی تھی۔ کھاتے پیتے گھرانے کی فرد...... اور اوپر سے خاوند بھی کسی اعلیٰ سرکاری عہدے پر فائز ہو...... چاہے وہ اسے چھوڑ ہی چکا ہو پھر بھی فکر اور فاقہ اس کی عمر کو زنگار بن کر کھانے سے ڈرنے لگتا ہے۔

چائے پیتے ہوئے اسے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں ایک انجانی سی چمک عود آئی اور دل کی یہی کشش اسے اس کے نزدیک لے گئی۔ وہ اس کی سوچوں سے کہیں زیادہ خوب صورت اور کومل سی لڑکی تھی۔ اس کی جوانی چڑھتی دھوپ کی طرح منہ زور اور نکھری نکھری تھی...... جس کی حدت اسے دور سے ہی محسوس ہونے لگی تھی۔ اس نے اس کے نزدیک جا کر ہیلو کہا۔

وہ اس آواز پر یکدم گھومی...... اس کے سینے پر شناختی کارڈ لگا ہوا تھا جس پر اس کا اپنا نام اور اس کے ملک کا نام...... جس کی وہ نمائندگی کر رہی تھی، واضح لکھا ہوا تھا۔

واشمبوسکا...... پولینڈ سے......!

اپنا نام اس کی زبانی سن کر وہ دھیرے سے مسکرائی اور پیار بھری نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

ازیتہ قیصر...... آپ کی میزبان۔'' اس نے گرمجوشی کے ساتھ ہاتھ ملایا۔

''میں تین چار دنوں سے نہ صرف آپ کو دیکھ رہی ہوں بلکہ برداشت بھی کر رہی ہوں۔'' وہ ایک بار پھر مسکرائی۔

''اوہ...... آئی سی!'' ازیتہ نے ہنس کر بات بڑھائی۔

''آپ نے اپنی فگر بڑی سنبھال کے رکھی ہوئی ہے۔''

''میں اپنے ملک کی جمناسٹک ٹیم کو لیڈ کرتی ہوں۔'' واشمبوسکا نے جواب دیا۔

''یہاں کس کمرے میں ہیں؟'' ازیتہ نے چائے سپ کرتے ہوئے پوچھا۔

''کمرا نمبر 32......'' اس نے بتایا۔

''تمہارے ساتھ وہاں اور کون ہے؟'' ازیتہ نے ایک بار پھر پوچھا۔

''مراکش سے آئی مرندا ایکٹ ملک میری روم میٹ ہے۔'' واشمبوسکا بولی۔

''اوہ...... پھر تو وقت ہی نہیں ملے گا۔'' ازیتہ نے ہنس کر لالچی نگاہوں کے ساتھ اس کے جسمانی خدوخال دیکھتے ہوئے کہا۔

''نہیں، ایسی بھی کوئی بات نہیں...... ویسے کہیں......'' اس نے بات ادھوری چھوڑ کر اس کی طرف دیکھا۔

اس کی ادھوری بات کو ازیتہ نے جلدی سنبھال لیا۔
"خوب صورت جسم، بھوری آنکھیں اور جوانی کے سارے رنگوں سے سجا ہوا حسن...... اپنا آپ نہ دکھایئے تو اس کا ہونا اور نہ ہونا ایک برابر ہوتا ہے...... کس قدر بدنصیبی ہوگی میری...... اگر میں اس کی چمک بھی نہ دیکھ سکوں۔" ازیتہ نے نپے تلے انداز میں کہا۔
"اوہ تو آپ بھی ہومو (Homo) ہیں۔ ہم جنس ساتھی......!"
"آپ کی پہچان بھی آپ کی طرح خوب صورت ہے۔" ازیتہ نے ہنس کر کہا۔
"میں نے آپ کی آنکھوں میں تیرتی پیاس دیکھ لی تھی...... میں بھی آپ کی طرح پیاسی ہوں۔" واشمبوسکا نے ایک بار پھر گرمجوشی سے اس کے ہاتھ کو دبایا۔ اسے لگا جیسے اس کے جسم کی ساری حرارت اس کے جسم میں اتر آئی ہو...... اس نے اپنے جذبوں کی ساری حدت اپنے لفظوں میں سمو کر کہا۔
"پانی سے بھری بوتل فریزر میں رکھی رہے تو وہ جم جاتی ہے۔ بالکل ایسے ہی ہماری خواہشیں جسم کے برف خانے میں رکھے رکھے برف ہوجاتی ہیں۔ پروگرام تو ہمارے بغیر بھی چلتا رہے گا...... آپ اپنے مقالے سے فارغ ہوچکی ہیں اور میں بھی پروگرام دوسرے ہاتھ میں دے آئی ہوں پھر وقت کیوں گنوائیں۔" ازیتہ نے دلیل دی۔
"چلیں ہم کمرے میں چلتے ہیں۔" واشمبوسکا نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے مشورہ دیا۔
پھر وہ دونوں ایک دوسرے کے ہاتھوں میں انگلیاں پھنسا کر چلتی ہوئی اس کے کمرے میں آگئیں۔ پروگرام کب ختم ہوا انہیں کچھ علم نہیں مگر جب ان کے کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی تو انہیں لگا جیسے وہ بڑی گہری نیند سے بیدار ہوئی ہوں...... یا بہت دور سے بھاگتی ہوئی آرہی ہوں اور یکلخت اپنی بے ترتیب سانسیں لیے ہڑبڑا اٹھی ہوں...... ازیتہ دروازہ کھول کر باہر چلی گئی۔
آج کا آخری پروگرام بھی بڑے خوب صورت طریقے سے ختم ہوگیا تھا اور اس کانفرنس کی کامیابی کا سارا کریڈٹ ازیتہ کو دیا جارہا تھا۔ دوسرے ملکوں کے مندوبین اپنے اپنے ملکوں کو واپس جارہے تھے۔ پتا نہیں رات کا کون سا پہر تھا جب وہ اپنے حصے کا کام ختم کرکے گھر پہنچی تو اپنے بیڈ پر گرتے ہی اسے اپنا قطعاً ہوش نہ رہا تھا۔
اگلے دن اسے موبائل کی رنگ ٹون نے اٹھایا تو وہ ہڑبڑا کر اٹھی۔ دن پوری طرح اپنی آنکھیں کھول چکا تھا۔ ہوسکتا تھا کہ وہ اپنے بیڈ پر لیٹی ویسے ہی کروٹیں بدلتی رہتی اگر اس کے گھر میں جھگڑنے کی آوازیں نہ آتیں۔
آج پھر وہ سروش کے ساتھ جھگڑ رہی تھی...... روز روز کے ایسے جھگڑوں نے اس کی طبیعت کو مضمحل کرڈالا تھا۔ تب سروش کی آواز جیسے دور ہونے لگی تھی۔ اس نے کسلمندی سے اٹھ کر کھڑکی سے باہر دیکھا۔ کسی نے بڑی تیزی سے گیراج سے گاڑی نکالی اور باہر نکال کرلے گیا۔
یہ اس کی بہو شائلہ تھی...... جسے وہ سارے پیار سے شملی کہتے تھے۔ وہ جلدی سے باہر نکلی...... سروش پریشان کھڑا تھا۔
"آج پھر سروش...... یہ کتیا تمہارے ساتھ کیوں جھگڑ رہی تھی۔" اس نے اپنے بیٹے سے پوچھا۔
"مما! یہ ایک دن کی بات ہو تو......" سروش نے اکتائے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔
"تم یوں کیوں نہیں کرتے، اس کتیا کی ناک، بال کاٹ دو یا پھر اس کے چہرے پر تیزاب پھینک دو۔ میں سنبھال لوں گی۔ اسے اپنے حسن کا بڑا مان ہے نا......" اس نے غصے سے اپنے بیٹے کو مشورہ دیا۔
"مما! اسے اپنے باپ کی دولت کا بڑا غرور ہے۔"
"پھر بھی اسے احساس ہونا چاہیے کہ تمہارا اس سے کیا رشتہ ہے۔" اس نے غصے میں کہا۔
ابھی پتا نہیں وہ کتنی دیر اور اپنا غصہ نکالتی رہتی اگر وہ آکر اس کے قریب نہ کھڑی ہوجاتی۔ وہ بیس اکیس سال کی خوب صورت نقوش کی حامل لڑکی تھی جس کے چہرے پر غلافی آنکھوں میں موجود حیرانی نے اسے اور بھی حسین بنا ڈالا تھا مگر لگتا تھا جیسے وہ ایک لمبے سفر سے پلٹی ہو۔ غور سے دیکھنے پر احساس ہوتا تھا کہ وہ اپنی عمر سے کہیں بڑی لگ رہی ہے۔
انہیں اس طرح پریشان دیکھ کر وہ بولی۔
"کیا ہوا میڈم......؟"
"کچھ نہیں جاناں...... تم کمرے میں پہنچو، میں آتی ہوں......"
جاناں کچھ نہ سمجھتی ہوئی کمرے میں آگئی۔ کچھ ہی دیر بعد وہ بھی وہاں آپہنچی۔
"اتنی بڑی کانفرنس کو سنبھالنا آپ کی ہمت اور حوصلہ تھا میڈم...... ہم جیسے لوگ تو پہلے سیشن میں ہی حوصلہ چھوڑ جاتے۔" جاناں نے بات بڑھائی۔
"یہ تو پھر ہے......" ازیتہ نے ہنس کر جواب دیا۔
"لیکن میڈم...... ان تین چار دنوں میں اپنی بھوک نے تو کڑاکے نکال دیے ہیں۔ چھوٹی کے اسکول کی فیس، امی کی

دوائی......" جاناں کی بات ابھی پوری نہ ہو پائی تھی کہ ازیتہ بول اٹھی۔

"یہ مرد ہوتے ہی ظالم ہیں۔ تم دیکھو گی ہماری اس کانفرنس کی دھوم پوری دنیا میں مچ جائے گی۔ مل کے رہ جائیں گے سب......اور تو اور...... روس سے آئی لویکا احماتو وا نے اگلی کانفرنس اپنے ملک میں کرانے کا عندیہ بھی دیا ہے بلکہ اس نے تو مجھے وہاں بلانے کی ہامی بھی بھر لی ہے۔ پیشگی دعوت دے ڈالی۔"

ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے جاناں کی باتوں سے ازیتہ کا من نہیں بھرا تھا، وہ اپنی اور بھی تعریفیں سننا چاہتی تھی۔

"واقعی میڈم! جو کارنامہ آپ انجام دے رہی ہیں وہ دنیا کی عورتوں پر سب سے بڑا احسان ہوگا۔ ان مردوں نے تو ساری دنیا میں اندھیر مچا رکھا ہے۔ ظلم، منافقت کی کوئی تو حد ہو......" جاناں نے ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا۔ اس میں وہ ازیتہ کی پھر بھی تعریف کر گئی تھی۔

"تو اور کیا......" ازیتہ نے جواب دیا۔ "پچھلے روز قیصر کا فون آیا تھا...... کہہ رہا تھا۔ جب میں نے تمہیں چھوڑ دیا ہے۔ طلاق دے دی ہے تو تمہیں اپنے نام کے ساتھ میرا نام لگانے کا کوئی حق نہیں رہا۔ اس لیے تم میرا نام اپنے نام سے لگانا چھوڑ دو...... نہیں تو میں تمہیں کورٹ کچہری لے جاؤں گا۔"

میں نے غصے سے جواب دیا۔ "میری بلا سے کہیں بھی جاؤ۔"

"پھر تو وہ خاموش ہو گیا ہوگا۔" جاناں نے ہنس کر پوچھا۔

"تو اور کیا...... پتا نہیں کیا سمجھتا ہے اپنے آپ کو...... اب میری حیثیت اس سے کہیں زیادہ ہے۔ میں اسے کیا جانتی نہیں ہوں......" ازیتہ نے بتایا۔

"میڈم...... اب آپ سارے کاموں سے فارغ ہو چکی ہیں۔ مجھے آج کل رقم کی بہت ضرورت ہے، یا تو اپنی طرف سے ادھار دے دیں یا پھر......" جاناں نے دوبارہ بات شروع کی۔

"جاناں...... میں نے پہلے بھی تمہیں بتایا تھا۔ سوہنیے...... اپنی فگر کی طرف دھیان دو...... مگر تم نے میری کبھی نہ مانی۔ اب تم خود ہی بتاؤ...... اس طرح تھل تھل کرتا ہوا جسم کسے پسند ہے...... پیسے خرچنے والے اپنی ڈیمانڈ بھی بڑھاتے جا رہے ہیں۔ لوگ سمجھدار ہو چکے ہیں۔ تم بیٹھو...... میں کچھ کرتی ہوں تمہارا......" یہ کہہ کر ازیتہ کمرے سے نکل گئی۔

اس کے باہر جاتے ہی سروش اندر آ گیا۔ "مام کدھر گئیں......؟" اس نے اندر آتے ہی پوچھا۔

"کبھی ہماری طرف بھی دھیان دے دیا کرو۔" جاناں نے بڑی پیار بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"میں نے مام کا پوچھا ہے۔" اس نے سنی اَن سنی کرتے ہوئے کہا۔

"ہمارے قریب پیار سے بیٹھو...... تو بتا بھی دیں گے۔" جاناں نے دلفریب نظروں سے دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

سروش جانے لگا تو وہ اٹھ کر اس کے سامنے آ گئی۔

وہ اپنا آپ بچا کے باہر نکل گیا تو ازیتہ دوسرے دروازے سے کمرے میں موبائل پر کسی سے باتیں کرتے ہوئے داخل ہوئی۔

"جی...... جی...... شکریہ ملک جی...... بس وہاں مصروفیت ہی اس قدر تھی۔ ذرا بھی فرصت نہ تھی۔ ایمان سے...... موبائل بند تو نہیں تھا...... بس ویسے ہی...... اور پھر آپ جیسے لوگوں کو بھلایا جا سکتا ہے۔ یقین کریں، آج ہی فارغ ہوئی ہوں۔ ٹھیک ہے ملک جی...... آپ کا کہا پہلے بھی میں نے ٹالا ہے۔ ہیرا اگر پسند نہ آئے، یہ تو کوئی بات نہ ہوئی......" جاناں کی آنکھوں میں اس کی باتیں سن کر عجیب سی چمک آ گئی تھی...... امید اور آس بھری روشنی اس کے جسم کو آنے والے خوب صورت رنگوں میں رنگ گئی۔

"ٹھیک ہے...... ٹھیک ہے ملک جی...... سب کچھ آپ کی پسند کے مطابق ہوگا۔ کہہ تو رہی ہوں، پہنچ جائے گی...... وقت پر ہی پہنچ گی۔" موبائل بند کر کے اس نے جاناں کی طرف دیکھا۔

"کون تھا میڈم......؟" جاناں نے پوچھا۔

"وہی...... اپنا ملک...... تمہارے پاس منال کا فون نمبر ہے؟" ازیتہ نے پوچھا۔

"لیکن میڈم...... میں بھی تو ہوں......" اس نے اپنا آپ اسے یاد دلایا۔

"ہاں...... ہاں جاناں! دیکھنا...... لوگ یہ سمجھتے ہیں جیسے ازیتہ بازار میں سبزیاں لے کر بیٹھی ہے۔ جس کی سنو...... اس کی ایک ہی مانگ ہے۔ لگتا ہے جیسے سارے ایک ہی بات کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔ میں اپنی سمجھا سمجھا کے تھک گئی ہوں کہ جو مزہ تجربہ زدگان میں ہے، وہ اسکی میں کہاں...... اب اس ملک حرامزادے کو دیکھو...... جس وقت سے رابطہ ہوا ہے، اس کی بس ایک ہی مانگ ہے...... لڑکی ذرا کومل ہونی چاہیے......!"

امیر خسرو

ضیاء تسنیم بلگرامی

کچھ خوبیاں اللہ تعالیٰ انسان کو پیدائشی طور پر ودیعت کرتا ہے اور کچھ انسانوں کے حصے میں ایسے اعلیٰ مرتبت مقام آتے ہیں جن کے بارے میں انسان سوچ بھی نہیں سکتا... خسرو کا تعلق بھی انہی لوگوں میں ہوتا ہے جن کے قدم اٹھانے سے پہلے ہی رستے منتظر ہوتے ہیں۔ آپ بیک وقت کئی خوبیوں کے حامل تھے۔

لافانی شاعری کے خالق امیر خسرو کی زندگی کا قصہ

ان دنوں چنگیز خاں کا سیلاب بلاخیز ملکوں اور قوموں کو خس و خاشاک کی طرح بہائے لیے جا رہا تھا۔ منگول افواج کوہستان الطائی اور تھیان شان کو روندتی ہوئی ماوراء النہر میں داخل ہو گئیں۔ آبادیاں ویرانوں میں بدل گئیں اور شہر کھنڈرات بن گئے۔ بقیۃ السیف نے راہِ فرار اختیار کی، جس کا جدھر منہ اٹھا، چل دیا۔ ماوراء النہر کے ایک ترک خاندان نے ہندوستان کا رخ کیا۔ اس ترک خاندان کا جدِ اعلیٰ لاچین نامی ترک تھا۔ یہ خاندان ماوراء النہر کے شہر کش میں آباد تھا۔ یہ لوگ کش سے بلخ اور

پھر ہندوستان میں داخل ہوگئے۔ ہندوستان کے صوبہ یوپی کے ایٹہ نامی ضلع کے قصبے مومن پورہ میں ان لوگوں نے قیام کیا۔ پہلے یہ قصبہ ضلع بدایوں میں شامل تھا، جب یہ مومن پورہ سے پٹیالی بنا تو جغرافیائی تقسیم اور ردوبدل میں اس کو ضلع ایٹہ میں شامل کردیا گیا۔

یہ خاندان جو پٹیالی میں آباد ہوا تھا، قبیلہ ہزارہ لاچین کے ایک امیر سیف الدین محمود کی سرپرستی میں ہندوستان آیا تھا۔ ان دنوں برصغیر پر سلطان شمس الدین التمش کی حکومت تھی۔ سلطان نے اس آوارہ گرد امیر کو اپنی فوج میں شامل کرلیا۔ امیر کے ساتھ دوسرے ترکوں نے بھی سلطان کی فوج میں شمولیت اختیار کرلی۔ بعد میں سلطان، امیر سیف الدین سے اتنا خوش ہوا کہ پٹیالی میں جاگیر عطا کردی۔

سلطانی ملازمت کے دوران امیر سیف الدین کے تعلقات جن لوگوں سے استوار ہوئے ان میں عماد الملک کا نام سرفہرست ہے۔ عماد الملک ایک متمول ہندو خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ انہوں نے اپنا آبائی مذہب چھوڑ دیا اور مسلمان ہوگئے۔ غیاث الدین بلبن نے انہیں اپنا وزیر بنالیا تھا اور سلطان التمش کے زمانے میں یہ ایک ممتاز عہدے پر فائز تھے۔ عماد الملک نے امیر سیف الدین میں جو کچھ دیکھا تھا، وہ کسی اور میں نہیں نظر آتا تھا۔ انہوں نے اس نوجوان کو دیکھا، پرکھا اور پسند کرلیا اور خاموشی سے اپنی بیٹی کا نکاح امیر سیف الدین سے کردیا۔

شادی کے بعد امیر سیف الدین کے گھر میں یکے بعد دیگرے تین بیٹے پیدا ہوئے۔ پہلے کا نام عزالدین علی شاہ، منجھلے کا نام ابوالحسن اور چھوٹے کا نام حسام الدین تخلیق رکھا گیا۔ بڑے اور چھوٹے بیٹے مستقبل میں بہادر سپاہی ثابت ہوئے لیکن منجھلا بیٹا ابوالحسن دونوں سے مختلف نکلا۔

ابوالحسن کا سن پیدائش 651 ہجری (1252ء) ہے۔ اس بچے کی پیدائش پر جانے کیا بات تھی کہ امیر سیف الدین کو بہت زیادہ خوشی ہوئی۔ انہوں نے بچے کو ایک خرقے میں لپیٹ کر باہر کا رخ کیا۔ بیوی نے ان کا راستہ روکا، پوچھا۔ ”آپ میرے بچے کو کہاں لیے جارہے ہیں؟“

امیر سیف الدین نے جواب دیا۔ ”پٹیالی کے مجذوب کے پاس۔“

بیوی نے پوچھا۔ ”کیوں؟ یہ مجذوب کیا کریں گے میرے بچے کا؟“

امیر نے جواب دیا۔ ”نیک بخت! تو بات سمجھنے کی کوشش کیا کر۔ میں نے اس بچے کی پیشانی میں معلوم نہیں کیا دیکھا ہے کہ اب میں اس کی تصدیق ان مجذوب سے کرانے کے لیے جارہا ہوں۔“

بیوی پر کمزوری نے غلبہ پایا اور وہ خاموش ہوکر پڑرہیں۔

امیر سیف الدین بچے کو خرقے میں چھپا کر مجذوب کے پاس لے گئے۔ مجذوب نے انہیں دور سے دیکھتے ہی نعرہ لگایا۔ ”ابوالحسن! زندہ باد۔ یہ تو خاقانی سے بھی دو قدم آگے چلے گا۔“

امیر سیف الدین نے اپنا بچہ مجذوب کی گود میں ڈال دیا اور فرمایا۔ ”حضرت! اس کے حق میں دعا فرمائیں۔ میں اسی لیے اس نالائق کو لے کر حاضر ہوا ہوں۔“

مجذوب نے ایک بار پھر اپنی پہلی بات دہرائی۔ ”میں نے ایک بار کہہ جو دیا کہ یہ تو خاقانی سے بھی دو قدم آگے رہے گا۔ اب اس کے بعد بھی اگر تو کچھ جاننا چاہتا ہے تو اس کا میرے پاس کوئی جواب نہیں۔“

باپ کو پھر بھی قرار نہ آیا۔ خوشامدانہ انداز میں کہا۔ ”غیب کا علم صرف خدا کو ہے، پھر بھی میں یہ چاہتا ہوں کہ آپ اس کے حق میں دعائے خیر فرمادیں۔“

مجذوب نے دونوں ہاتھ دعائیہ انداز میں اٹھائے اور کہا۔ ”یا اللہ العالمین! اس کا نام قیامت تک زندہ رکھ (آمین)۔“

یہ سیدھی سادی دعا امیر کی سمجھ میں نہیں آئی مگر اس کے بعد امیر وہاں نہیں ٹھہرے اور مجذوب سے اجازت لے کر اپنے گھر چلے گئے۔

ان کے گھر میں داخل ہوتے ہی بیوی نے طنزاً پوچھا۔ ”کیا ہوا؟ کچھ اپنے بچے کے مستقبل کا پتا چلا یا نہیں؟“

امیر نے جواب دیا۔ ”پتا چلا کیوں نہیں، مجذوب نے کہا ہے یہ بچہ تو خاقانی سے بھی دو قدم آگے چلے گا۔“

بیوی کو اس خبر سے خوشی نہیں ہوئی، نہایت افسردگی سے کہا۔ ”تو اس کا یہ مطلب ہوا کہ میرا بچہ مستقبل میں شاعری کرے گا۔“ پھر سرد آہ بھر کر کہا۔ ”گویا ابوالحسن سپاہی نہیں بنے گا۔“

امیر نے تسلی دی۔ ''خاتون! اگر میرا بیٹا مستقبل کا بہت بڑا شاعر ہے تو ہمیں اس خبر سے خوش ہونا چاہیے کیونکہ خاقانی سے بڑا شاعر زندۂ جاوید ہو جائے گا اور یہ بات کسی بھی خاندان کی برتری اور افتخار کا باعث بن سکتی ہے۔''

بیوی نے سرد مہری سے جواب دیا۔ ''لیکن میں تو صرف ایک بات جانتی ہوں جو پورا پورا سپاہی نکلا، وہ مستقبل میں کبھی بھی پریشان نہیں ہوگا۔ سپاہی اپنا گھر خوب بنالیتا ہے، مگر شاعر! یہ شاعر......''

وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی اور امیر نے بچے کو ماں کی گود میں ڈال کر باہر کا رخ کیا۔ یہ بات امیر کے دل و دماغ پر بھی اثر کر گئی تھی کہ ان کا بیٹا خاقانی سے بھی دو قدم آگے چلے گا۔

ایسا لگتا ہے کہ ابوالحسن کی تعلیم و تربیت پر کوئی خاص توجہ نہیں دی گئی۔ امیر سیف الدین خواجہ نظام الدین اولیا کے مریدوں میں داخل تھے۔ انہیں جب بھی موقع ملتا خواجہ نظام الدین اولیا کی خدمت میں ضرور جاتے۔

جب امیر کا بڑا بیٹا عزالدین شاہ سیانا ہو گیا تو امیر سیف الدین نے اس سے کہا۔ ''بیٹے! جیسا کہ تُو جانتا ہے میں حضرت خواجہ نظام الدین اولیا کا مرید ہوں۔ اب تو بھی بڑا ہو چلا ہے اس لیے میری خواہش ہے کہ میں تجھے بھی اپنے پیر و مرشد کی خدمت میں لے جاؤں اور تیرا ہاتھ ان کے ہاتھ میں دے دوں۔''

بڑے بیٹے نے سعادت مندی سے سر جھکا دیا، کہا۔ ''باوا جان! جیسی آپ کی مرضی۔ میں کیا کہہ سکتا ہوں، جب فرمائیں آپ کے ساتھ جانے کو تیار ہوں۔''

باپ نے کہا۔ ''جب تب کیا ہوتی ہے بیٹے۔ میں تو تجھ کو اسی وقت لے جانا چاہتا ہوں۔''

بیٹے نے جواب دیا۔ ''میں حاضر ہوں، بسم اللہ۔''

باپ نے بیٹے کو خوب نہلایا دھلایا۔ صاف ستھرے کپڑے پہنائے اور خواجہ نظام الدین اولیا کی خدمت میں لے چلے۔ ان کی یہ ساری تیاریاں منجھلا بیٹا ابوالحسن بھی دیکھ رہا تھا۔ ان دونوں کو تیار ہوتے دیکھ کر اس نے پوچھا۔ ''باوا جان! کہاں؟''

امیر نے جواب دیا۔ ''وہاں، جہاں دو سال بعد تو بھی جائے گا۔ میں تجھے بھی ایک نہ ایک دن ان کی بارگاہ میں لے جاؤں گا۔''

ابوالحسن نے پوچھا۔ ''مگر ابھی کیوں نہیں باوا جان؟''

باپ نے نہایت غور سے ابوالحسن کی طرف دیکھا، جواب دیا۔ ''ابھی اس لیے نہیں کہ وہ باتیں ابھی تیری سمجھ میں نہیں آئیں گی۔''

ابوالحسن نے اصرار کیا۔ ''باوا جان! میں بھی آپ دونوں کے ساتھ چلوں گا۔''

باپ نے اپنے بڑے بیٹے کی طرف دیکھا، پوچھا۔ ''بیٹے عزالدین! تو کیا کہتا ہے؟''

عزالدین نے جواب دیا۔ ''میں کیا کہوں گا باوا جان۔ میرا خیال ہے ابھی اس کا اس دربار میں لے جانا بے کار رہے گا۔ ابھی یہ بہت کمسن ہے۔''

ابوالحسن نے رونا شروع کر دیا۔ ''باوا جان! میں وہاں ضرور جاؤں گا۔ آپ مجھے اپنے ساتھ لے چلیے۔''

جب دونوں بالکل بے بس ہو گئے تو آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے کو دیکھ کر یہ فیصلہ کر لیا کہ ابوالحسن کو ضرور لے جایا جائے گا۔ آخر باپ نے اپنا فیصلہ بہ آوازِ بلند سنا دیا۔ ''اگر تجھ کو اسی وقت ہمارے ساتھ چلنا ہے تو فوراً تیار ہو جا۔ ہمارے پاس وقت نہیں ہے۔''

ابوالحسن کو ان کی ماں نے آناً فاناً تیار کر دیا اور پھر یہ تینوں حضرت خواجہ نظام الدین اولیا کی بارگاہ میں روانہ ہو گئے۔

راستے میں ایک جگہ باپ نے ابوالحسن کو بتایا۔ ''بیٹے ابوالحسن! ہم دونوں مشہورِ زمانہ بزرگ حضرت نظام الدین اولیا کی خانقاہ میں چل رہے ہیں۔ میں ان کے دستِ حق پرست پر پہلے ہی بیعت ہو چکا ہوں اور اب میں عزالدین کو بھی ان کے پاس اسی غرض سے لیے جا رہا ہوں کہ اس کو بھی بیعت کرا دیا جائے۔''

ابوالحسن نے نہایت معصومیت سے پوچھا۔ ''لیکن مجھ کو بیعت نہیں کرائیے گا؟''

باپ نے جواب دیا۔ ''تجھ کو بھی بیعت کراؤں گا مگر ابھی نہیں۔ دو تین سال بعد۔ ابھی تُو سات سال کا ہے، بس دس تک پہنچتے پہنچتے تجھے بھی بیعت کرا دوں گا۔''

ابوالحسن نے برا سا منہ بنایا۔ ''اور باوا جان! یہ نظام الدین اولیا آخر ہیں کیا چیز؟ انہی کے ہاتھ پر بیعت کرنا کیا معنی؟''

باپ نے جواب دیا۔ ''بیٹے ابوالحسن! ابھی تو ان باتوں کو نہیں سمجھ سکے گا، ابھی تیری عمر ہی کیا ہے؟''

یہ تینوں حضرات جب خواجہ نظام الدین اولیا کی خانقاہ کے قریب پہنچے تو ننھے ابوالحسن نے اپنے دل میں ایک فیصلہ کرلیا تھا۔ خانقاہ کے در پر رک کر امیر سیف الدین نے اپنے دونوں بیٹوں کی طرف دیکھ کر فرمایا۔ ''بچو! ذرا مؤدب ہوجاؤ، یہ دربار بادشاہ کے دربار سے زیادہ عظیم ہے۔''

عزالدین تو خاموش رہے مگر ابوالحسن نے جواب دیا۔ ''باوا جان! مجھ کو تو اندر جانا ہی نہیں جس کو اندر جانا ہو وہ مؤدب ہو جائے۔ میں اندر نہیں جاؤں گا۔''

باپ کو بیٹے کی اس بات سے دکھ پہنچا، پوچھا۔ ''اندر نہ جانے کا سبب؟''

ابوالحسن نے جواب دیا۔ ''میں ان کا مرید نہیں ہونا چاہتا کیونکہ جب تک یہ بزرگ میری سمجھ میں نہ آجائیں، میں ان کا مرید نہیں ہوسکتا۔''

باپ نے ناخوشگوار لہجے میں کہا۔ ''ابوالحسن! بس حدِ ادب، خاموش ہوجاؤ۔ پیرومرشد کی شان میں ایسی بدگمانی درست نہیں۔ وہ روشن ضمیر ہیں، انہیں تیرے عقائد اور خیالات کی بابت سب کچھ معلوم ہوجائے گا۔''

ابوالحسن نے عرض کیا۔ ''آپ اندر تشریف لے جائیں اگر آپ کے پیرومرشد روشن ضمیر ہیں تو انہیں میری بابت سب کچھ خود ہی معلوم ہوجائے گا۔ میں باہر ہی رکا رہوں گا۔''

عزالدین اور امیر سیف الدین ابوالحسن کو باہر ہی چھوڑ کر اندر چلے گئے۔

ابوالحسن کی ابھی عمر ہی کیا تھی، سات سال لیکن شاعری کا مذاق پیدائشی تھا۔ وہ سوچنے لگے کہ اگر خواجہ نظام الدین کامل ہیں تو انہیں میری بابت سب کچھ خود بخود معلوم ہوجانا چاہیے۔ وہ چند مصرعے موزوں کرنے لگے۔ آخر ذرا سی دیر میں دو شعر موزوں کر ڈالے۔ سوچا، ان چار مصرعوں میں میری خواہش موجود ہے۔ اگر خواجہ نظام الدین روشن ضمیر ہیں تو میرے ان چاروں مصرعوں کا جواب چار مصرعوں میں دے کر مجھے لاجواب کردیں گے ورنہ میں ان سے دور ہی رہوں گا۔

ابوالحسن کے چار مصرعے تھے۔

تو آں شاہے کہ بر ایوانِ قصرت — کبوتر گر نشیند باز گردد

غریبے مستمندے بر در آمد — بیاید اندروں یا باز گردد

(تو ایسا بادشاہ ہے کہ اگر تیرے محل کے کنگورے پر کبوتر آن بیٹھے تو تیری برکت سے وہ کبوتر باز بن جائے۔ پس ایک غریب حاجت مند تیرے دروازے پر آیا ہے۔ وہ اندر آجائے یا واپس چلا جائے)

ابوالحسن نے یہ مصرعے موزوں کیے اور جواب کے انتظار میں بیٹھ رہے۔

کچھ دیر بعد دروازہ کھلا اور اندر سے ایک شخص نمودار ہوا، پوچھا۔ ''یہاں کوئی ترک زادہ موجود ہے؟''

ابوالحسن نے جواب دیا۔ ''میں موجود ہوں، ارشاد؟''

اس شخص نے جواب دیا۔ ''میں خواجہ نظام الدین کا ادنیٰ خادم ہوں۔ انہوں نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں بہ آوازِ بلند تمہیں دو شعر سنادوں اور واپس چلا جاؤں۔''

ابوالحسن نے کہا۔ ''ارشاد، سنائیے۔''

خواجہ نظام الدین کے خادم نے دو شعر سنائے۔

بیاید اندروں مردِ حقیقت — کہ باما یک نفس ہم راز گردد

اگر ابلہ بود آں مردِ ناداں — ازاں راہے کہ آمد باز گردد

(حقیقت کا مردِ میدان اندر چلا آئے تاکہ ہمارے ساتھ کچھ دیر ہمراز بن جائے اور اگر وہ آنے والا ناسمجھ اور نادان ہے تو جس راستے سے یہاں آیا ہے، اسی راستے سے واپس چلا جائے)

ابوالحسن نے یہ دونوں شعر سنے تو ان کی حالت غیر ہوگئی۔ دیوانوں کی طرح اٹھے اور خادم کے ساتھ اندر چلے گئے۔

وہاں خواجہ نظام الدین کے روبرو امیر سیف الدین، بھائی عزالدین اور حضرت خواجہ کے ایک مریدِ خاص سید محمد کرمانی بیٹھے ہوئے تھے۔ ابوالحسن نے خواجہ نظام پر نظر ڈالی تو ان کی رہی سہی حالت بھی غیر ہوگئی۔ خواجہ نظام الدین انہیں مسکرا کر

دیکھ رہے تھے۔ ابوالحسن دوڑ کر ان کے قدموں میں گر گئے۔
خواجہ نظام الدین نے فرمایا۔ ''بیا بیا دے مرد حقیقت این جا بیا و یک نفس با ما ہمراز یشو دآ جا آ جا۔
(''اے مرد حقیقت آ اور ایک دم کے لیے ہمارا ہمراز بن جا۔'')
ابوالحسن نے رقت زدہ آواز میں درخواست کی۔ ''حضرت! مجھے بیعت فرما لیجیے۔ میں آپ کی غلامی کا حلقہ اپنی گردن میں ڈالنا چاہتا ہوں۔''
آپ نے ابوالحسن کو بیعت فرما لیا۔

☆☆☆

اس واقعے کو پورا ایک سال بھی نہیں گزرا تھا کہ امیر سیف الدین کا انتقال ہو گیا۔ ابوالحسن پیدائشی شاعر تھے، انہوں نے خسرو تخلص اختیار کیا اور اپنے باپ کا ایک مرثیہ لکھا جس کا ایک شعر ہے۔

سیف از سرم گزشت و دلِ من دو نیم شد
دریایِ من رواں شد و درِ یتیم ماند

باپ کی وفات کے بعد خسرو اپنے نانا عماد الملک کی سرپرستی میں چلے گئے۔ عماد الملک امرائے سلطنت میں سے تھے اس لیے ان کی مجلسوں میں شاعروں، عالموں اور دانشوروں کا اجتماع ہوا کرتا تھا۔ خسرو ان کی باتیں غور سے سنتے اور دماغ میں بٹھا لیتے۔ یوں بھی وہ تلمیذ الرحمٰن (خدا کے شاگرد) تھے۔ اسی زمانے میں انہوں نے کئی زبانیں سیکھیں۔ عربی پر خاصا عبور حاصل کیا اور مولانا قاضی اسد الدین سے فنِ خطاطی سیکھا۔ استاد اپنے زمانے کے بے نظیر خطاط تھے اور ان کی خواہش تھی کہ اس میں خسرو بھی یگانہ روزگار بن جائیں مگر خسرو کو خطاطی سے زیادہ شاعری سے شغف تھا۔ اس لیے استاد ان سے ہمیشہ نالاں رہے۔

کوتوال کے نائب خواجہ اصیل، خسرو کے استاد مولانا قاضی اسد الدین کو اکثر خطوط لکھوانے کے لیے بلایا کرتے تھے۔ ایک دن جو بلایا تو ان کے ساتھ خسرو بھی چلے گئے۔ اس وقت خواجہ اصیل کے پاس ایک نامی گرامی امیر خواجہ عز الدین بھی بیٹھے تھے۔ بات شعر و شاعری کی چل نکلی تو قاضی اسد الدین نے خواجہ عز الدین سے کہا۔ ''حضرت! میرا یہ شاگرد بھی کچھ موں غاں کر لیتا ہے۔ پتا نہیں کہ موزوں بھی کہتا ہے یا نہیں۔ آپ بھی اس کا کلام سن کر رائے دیجیے کہ یہ اپنا وقت ضائع کر رہا ہے یا ترقی کر رہا ہے۔''

خواجہ عز الدین کے ہاتھ میں اشعار کی بیاض تھی۔ اسے خسرو کی طرف بڑھا دیا اور کہا۔ ''صاحبزادے! ذرا سنانا تو، ابھی پتا چل جاتا ہے کیونکہ صحیح شعر پڑھنا بھی موزونِ طبع کی ایک علامت ہے۔''

خسرو نے بیاض میں سے ایک شعر چن لیا اور اسے نہایت پرسوز آواز میں سنایا۔ خواجہ عز الدین، خواجہ اصیل اور قاضی اسد الدین کی حالت غیر ہو گئی، آنکھیں بھیگ گئیں اور چہرہ رنج و غم کی تصویر بن گیا۔

قاضی اسد الدین نے کہا۔ ''آپ اس کا امتحان بھی لے لیجیے کہ یہ خود کیسی شاعری کرتا ہے۔''
خواجہ عز الدین نے پوچھا۔ ''کیوں صاحبزادے! کیا تم شعر گوئی کا امتحان دینے کو تیار ہو؟''
خسرو نے جواب دیا۔ ''ہاں، میں اس کے لیے بھی تیار ہوں۔''
خواجہ عز الدین نے کہا۔ ''میں تمہیں چار لفظ دیتا ہوں، انہیں اپنے شعر میں استعمال کرو۔''
خسرو نے عرض کیا۔ ''ارشاد۔''
خواجہ عز الدین نے کہا۔ ''مو، بیضہ، تیر اور خربوزہ۔''
خسرو نے برجستہ شعر کہا۔

ہر موئی کہ در دو زلفِ آں صنم است — صد بیضۂ عنبریں بر آں موی صنم است
چوں تیر مداں راست دلش راز یرا کہ — چوں خربزہ دندانش میانِ شکم است

خواجہ عز الدین نے حیرت سے پوچھا۔ ''میاں صاحبزادے! تمہارا نام کیا ہے؟''
انہوں نے جواب دیا۔ ''خسرو۔''
پوچھا۔ ''کس کے بیٹے ہو؟''

خسرو نے باپ کی جگہ قبیلے کا نام لیا۔ "لاچین کا۔"

خواجہ عزالدین نے ازراہِ مذاق کہا۔ "تو گویا لاچین (یعنی چین نہیں ہے)۔ کچھ توقف سے کہا۔ "ترک خطا است"۔ (ان کو ترک کہنا خطا ہے)

خسرو نے اس لفظ کو پلٹ دیا۔ "بے خطا ترک است"۔ (قطعاً وہ ترک ہے)

خواجہ عزالدین نے کہا۔ "خسرو! تمہارا تعلق دربارِ سلطانی سے قائم ہو چکا ہے اس لیے تم خسرو، ترک کر کے سلطانی تخلص اختیار کرو۔"

خسرو نے خواجہ کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔

ابھی خسرو بیس سال کے بھی نہ ہوئے تھے کہ نانا عماد الملک کا بھی انتقال ہو گیا۔ اب خسرو کی زندگی میں ابتلا و افتاد کا دور آ گیا۔ ان کی پریشانیوں میں اضافہ ہو گیا۔ ابھی تک وہ فکرِ معاش سے لاتعلق تھے مگر اب انہیں یہ فکر بھی کرنا پڑی۔ یہ غیاث الدین بلبن کا زمانہ تھا۔

خسرو نے شہزادوں کی شان میں قصیدے لکھے اور بلبن کے بھتیجے کشلو خان جو ملک چھجو کے نام سے مشہور تھا، نے انہیں اپنے پاس رکھ لیا۔ کشلو خان اپنی علم پروری اور داد و دہش میں بڑی شہرت رکھتا تھا۔ خسرو دو سال تک بڑے سکون سے رہے۔ اس دوران بلبن کے بیٹے بغرا خان نے کشلو خان کے ہاں خسرو سے ملاقات کی اور ان کے اشعار سن کر انہیں داد و تحسین کے ساتھ نقرئی سکوں سے بھی نواز دیا۔ ملک چھجو (کشلو خان) کو یہ بات ناگوار گزری اور انہیں اپنے پاس سے الگ کر دیا۔ کشلو خان نے انہیں ستانا شروع کر دیا۔ جب خسرو کو یہ یقین ہو گیا کہ وہ کشلو خان سے نقصان اٹھا جائیں گے تو انہوں نے سامانہ کا رخ کیا۔ سامانہ میں بغرا خان کی حکومت تھی۔ اس نے خسرو کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔

اس دوران بنگال میں بغاوت ہو گئی اور بلبن کو بغرا خان کے ساتھ بنگال جانا پڑ گیا۔ خسرو نے بھی اس سفر میں ان کا ساتھ دیا اور بنگال چلے گئے۔ بادشاہ نے بغاوت کچل دی اور بغرا خان کو وہاں کا حاکم بنا دیا۔ بغرا خان نے خسرو کو بھی روکنا چاہا مگر یہ نہیں رکے، سلطان کے ساتھ دہلی واپس چلے گئے۔

دہلی میں جشنِ فتح منایا گیا تو اس میں شرکت کے لیے سلطان کا پسندیدہ اور محبوب ترین بیٹا سلطان محمد بھی ملتان سے باپ کے پاس پہنچا۔ خسرو کا یہ حال تھا کہ دن بھر کے سلطانی کاموں سے فراغت پانے کے بعد خواجہ نظام الدین کی صحبت میں چلے جاتے۔ یہ اپنے حالات سے مطمئن نہیں تھے کیونکہ ان کا مربی بنگال میں رہ گیا تھا۔ خواجہ نظام الدین نے انہیں یہ کہہ کر مطمئن کر دیا۔ "خدا تجھ کو بغرا خان سے بڑا مربی عطا کرے گا۔"

دہلی میں ان کی ملاقات اچانک شہزادہ سلطان محمد سے ہو گئی۔ شہزادے کو خسرو پسند آ گئے اور اس نے انہیں ملازم رکھ لیا۔

ایک دن یہ بازار سے گزر رہے تھے کہ انہوں نے ایک نوجوان حسین ترین نانبائی کو روٹیاں بیچتے دیکھا۔ خسرو پر اس نوجوان نانبائی نے گہرا اثر ڈالا۔ یہ اس طرف کھنچے چلے گئے۔ کچھ دیر کھڑے نانبائی کو دیکھتے رہے۔

نوجوان نانبائی نے پوچھا۔ "کھڑے صورت کیا دیکھتے ہو؟"

خسرو نے پوچھا۔ "تم روٹیاں کس حساب سے بیچتے ہو؟"

نوجوان نانبائی نے جواب دیا۔ "حساب پوچھتے ہو تو بتاتا ہوں۔ میں ایک پلڑے میں روٹی رکھ کر دوسرے پلڑے میں خریدار سے سونا رکھواتا ہوں۔ پھر جب سونے کا پلڑا جھک جاتا ہے تو روٹی خریدار کے حوالے کر دیتا ہوں۔"

خسرو نے پوچھا۔ "لیکن اگر خریدار مفلس ہو تو؟"

نانبائی نے جواب دیا۔ "تب میں سونے کے بجائے نیاز قبول کر لیتا ہوں۔"

خسرو لاجواب ہو گئے۔ کچھ دیر ساکت و صامت کھڑے رہے۔ اس کے بعد اپنے پیر و مرشد خواجہ نظام کے پاس چلے گئے۔

خواجہ نظام نے ان کا ابتر حال جو دیکھا تو پوچھا۔ "کیا بات ہے خسرو؟ تم اداس کیوں ہو؟"

خسرو نے عرض کیا۔ "کیا بیان کروں پیر و مرشد جو واقعہ ہے اس کو بیان کرتے ہوئے شرم محسوس ہوتی ہے۔"

پیر و مرشد نے اصرار کیا۔ "شرماؤ نہیں، بات بتاؤ کیا ہے؟"

خسرو نے سارا واقعہ بیان کر دیا۔ آخر میں بولے۔ "پیر و مرشد! اس نوجوان میں کوئی ایسی قدرِ مشترک ضرور ہے جس نے مجھے بے قابو کر دیا ہے۔ میں خود کو اس کی طرف کھنچا محسوس کر رہا ہوں۔"

خواجہ نظام الدین نے مسکرا کر فرمایا۔ ”بے شک تم دونوں میں قدرِ مشترک موجود ہے اور یہ نانبائی بچہ تجھ سے کیونکر بھاگ سکتا ہے، میں اس کو یہیں بلوائے دیتا ہوں۔“

ابھی بات پوری بھی نہ ہوئی تھی کہ اسی وقت نانبائی خواجہ کے دربار میں پہنچ گیا۔

وہاں خسرو بھی موجود تھے۔ خواجہ نظام الدین نے نانبائی کو اپنے پاس بلا کر پوچھا۔ ”نوجوان! ہوش و حواس مٹا کر بے نیازی اور بے پروائی اختیار کرنا کہاں کی شرافت ہے؟“

نوجوان نانبائی نے آپ کو بہت غور سے دیکھا۔ ”حضرت! یہ آپ کیا فرما رہے ہیں؟ میں نے تو کسی کو بھی نہیں ستایا۔“

خواجہ نے خسرو کی طرف دیکھ کر دریافت فرمایا۔ ”اس نوجوان کو جانتے ہو؟“

نانبائی نے خسرو کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ ”جی ہاں جانتا ہوں۔ ان سے آج ہی ملاقات ہوئی تھی دکان پر۔ کچھ مکالموں کا تبادلہ بھی ہوا تھا۔“

خواجہ نے پوچھا۔ ”تم دونوں میں قدرِ مشترک کیا ہے؟ کچھ بتا سکتے ہو؟“

نانبائی نے جواب دیا۔ ”جناب! کیا بات ہے؟ ہم دونوں میں قدرِ مشترک کیا ہے؟ غالباً شاعری، وہ وجدان جو ہم دونوں کو عطا ہوا ہے، وہ شعری مذاق جو ہمیں فطرت کی طرف سے ودیعت ہوا ہے، وہ گداز دل جو سینوں میں دھڑک رہے ہیں اور وہ شے لطیف جو ہم دونوں میں موجود ہے۔“

خسرو رونے لگے، نانبائی کی آنکھیں بھی بھیگ گئیں۔

خواجہ نظام الدین نے خسرو سے کہا۔ ”اب تم دونوں ایک دوسرے سے متعارف ہو جاؤ۔“ پھر خسرو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا۔ ”یہ ابوالحسن خسرو ہے اور تم؟“

نوجوان نانبائی نے جواب دیا۔ ”میرا نام نجم الدین اور تخلص حسن ہے...... حسن سنجری۔ میرے باپ کا نام علی ہے اور میں سادات گھرانے سے تعلق رکھتا ہوں۔“

خسرو اٹھ کر بغل گیر ہو گئے بولے۔ ”شاید انہی اوصافِ حمیدہ کی خوشبو نے مجھے مضطرب اور بے چین کر رکھا تھا۔ آج سے تو میرا دوست ہے، مرنے جینے کا ساتھی۔ میں تیری رفاقت پر ناز کروں گا۔“

حسن سنجری نے جواب دیا۔ ”تب پھر آپ بھی مجھے اپنا بہترین دوست پائیں گے۔“

خسرو نے کہا۔ ”اپنا پیشہ نانبائی ترک کر دو۔“

حسن سنجری نے پوچھا۔ ”پھر میں کروں گا کیا؟“

خسرو نے جواب دیا۔ ”میں سلطان محمد کے درِ دولت سے وابستہ ہو گیا ہوں، تمہیں بھی وابستہ کرا دوں گا۔“

حسن سنجری نے کہا۔ ”جب ایسا ہو جائے گا تو میں اپنا موجودہ کام چھوڑ دوں گا۔“

خسرو نے دوسرے ہی دن شہزادہ سلطان محمد سے حسن سنجری کا تعارف کرا دیا اور یہ بھی شہزادے کے درِ دولت سے وابستہ کر دیے گئے۔

شہزادہ سلطان محمد دہلی سے ملتان واپس گیا اور اپنے ساتھ خسرو اور حسن سنجری کو بھی لیتا گیا۔ شہزادہ علم پرور تھا۔ اس لیے اس کا دربار علماء و فضلاء اور مشائخ سے آباد رہتا تھا، وہ ان سب کی سرپرستی اور اعانت کرتا رہتا تھا...... لیکن جب خسرو اور حسن سنجری نے دربار میں قدم جمائے تو دوسروں کا کوئی خاص مقام نہیں رہا۔ اس طرح ان کے حاسدوں کی تعداد میں اضافہ ہونے لگا۔ وہ ہر وقت اس فکر میں لگے رہتے کہ خسرو اور حسن سنجری کی کوئی غلطی پکڑیں اور شہزادے کو اس سے آگاہ کریں۔ آخر بصد جستجو انہیں ایک بات مل گئی۔ حسن سنجری اور خسرو میں بڑا یارانہ تھا۔ چونکہ دونوں ہم مذاق تھے اور شاعری میں وہ بعض اوقات خسرو پر بھی سبقت لے جاتے تھے۔

حاسدوں نے ایک دن شہزادہ سلطان محمد کو اپنے گھیرے میں لے لیا اور ان میں سے ایک نے شہزادے سے کہا۔ ”شہزادہ معظم! آپ کو کچھ پتا ہے کہ حسن سنجری اور خسرو میں کس قسم کا تعلق ہے؟“

شہزادے نے جواب دیا۔ ”دونوں ہم مذاق ہیں، دونوں ہی بلند پایہ شاعر ہیں اور اس لیے دونوں ایک دوسرے کو بہت زیادہ پسند کرتے ہیں۔“

ایک حاسد نے عرض کیا۔ ”حضور والا! یہ بات نہیں ہے۔ کیا آپ نے وہ مثل نہیں سنی، المعاصرۃ اصل المنافرۃ (ہم عصر ہونا ہی

باہمی منافرت کی اصل ہے) اگر دونوں ہی شاعر ہیں تو ان دونوں میں ایک دوسرے کے خلاف حسد اور منافرت ہونی چاہیے۔"
شہزادے نے پوچھا۔ "آخر تم لوگ کہنا کیا چاہتے ہو؟"
جواب دیا گیا۔ "ہم لوگ جو کچھ کہنا چاہتے ہیں، آپ پر ظاہر ہے۔ آپ دیندار اور متقی انسان ہیں۔ کیا خسرو اور حسن سنجری کو یہ بات زیب دیتی ہے کہ وہ آپ کے دربار سے وابستگی کے باوجود اپنی گھناؤنی زندگی سے باز نہ آئیں؟"
شہزادے کو بڑا دکھ ہوا بولا۔ "کیا یہ بات درست ہے؟ کیا تم لوگ یہ سب کچھ یقین اور وثوق سے کہہ رہے ہو؟"
لوگوں نے عرض کیا۔ "ہم اتنا بڑا الزام لگا کر خدا کے مواخذے میں جانا کس طرح پسند کریں گے؟ ہمیں بھی اپنی عافیت عزیز ہے۔ حاشا وکلا۔ دونوں پر پابندیاں لگائی جائیں ورنہ ہم سب پر خدا کا عذاب نازل ہوگا۔"
شہزادے کو غصہ آ گیا۔ اس نے اسی وقت حسن سنجری اور خسرو کے نام الگ الگ ایک فرمان روانہ کر دیا۔ اس فرمان میں لکھوایا گیا تھا۔ "مابدولت کو تم دونوں (حسن سنجری اور خسرو) کے باہمی گھناؤنے تعلق کا علم ہوا۔ میں حیران ہوں کہ تم دونوں کو آخر ہو کیا گیا ہے۔ میں تم دونوں کا انتظار کروں گا لیکن تم دونوں کو میں یہ حکم دے رہا ہوں کہ آئندہ ایک دوسرے سے ملے تو میں اس کی بدترین اذیت ناک سزا دوں گا۔"
اس فرمان کی تین نقلیں تیار کرا کے ایک تو دفتر میں جمع کر لی گئی اور بقیہ دونوں خسرو اور حسن سنجری کو پہنچا دی گئیں۔ ان دونوں نے سلطانی حکم پڑھا اور سناٹے میں آ گئے۔
حسن سنجری اسی وقت جدا ہو کر جانے لگے مگر خسرو نے انہیں روک لیا، کہا۔ "حسن! کیا تم نے شہزادے کا حکم نہیں سنا؟"
حسن سنجری نے جواب دیا۔ "شہزادے کا حکم سن کر ہی تو جدا ہو رہا ہوں۔"
خسرو نے کہا۔ "کیا ہم دونوں کا اسی وقت شہزادے کے پاس اپنی صفائی میں کچھ عرض کرنا مناسب نہیں ہے؟"
حسن سنجری نے جواب دیا۔ "میرا خیال ہے یہ فضول ہے۔ شہزادے کو حاسدوں اور مفسدوں نے ہماری طرف سے بہت بدظن کر دیا ہے۔ شاید ہماری صفائی کا شہزادے پر کوئی اثر نہ ہو۔"
خسرو نے عذر پیش کیا۔ "اگر ہم دونوں شہزادے کا حکم مان لیں گے تو گویا اس بات کا اعتراف کر لیں گے کہ ہماری بابت شہزادے کو جو کچھ بتایا گیا ہے، درست ہے۔"
حسن سنجری نے پوچھا۔ "پھر ہمیں کیا کرنا چاہیے؟"
خسرو نے جواب دیا۔ "ہمیں ملنا جلنا برقرار رکھنا چاہیے۔ جو ہوگا دیکھا جائے گا۔"
حسن سنجری نے اس سے اتفاق کیا لیکن ملنے جلنے میں احتیاط سے کام لیا۔
شہزادے نے ان دونوں کے پیچھے مخبر لگا دیے تھے۔ آخر ایک دن شاہی مخبر نے حسن کو خسرو کے پاس جاتے دیکھ لیا اور اس کی خبر شہزادے تک پہنچا دی۔ شہزادے نے غصے میں حسن سنجری کو طلب کر لیا اور حسن سے پوچھا۔ "حسن! جب میں نے تم دونوں کی ملاقات پر پابندی لگا دی ہے تو تم خسرو کے پاس کیوں گئے تھے؟"
حسن نے جواب دیا۔ "شہزادے! ہمارے حاسدوں اور مفسدوں نے آپ کو ہمارے خلاف کر دیا۔ آپ کا فرمان سراسر زیادتی تھا اور جب ایک گھناؤنی بات کا سرے سے کوئی وجود ہی نہیں تو ہم دونوں اپنے اوپر کسی قسم کی پابندی کیوں عائد کریں؟"
شہزادے کو غصہ آ گیا، بولا۔ "لیکن وہ میرا فرمان تھا۔"
حسن نے جواب دیا۔ "ایک بندے کا فرمان۔ وہ خدا کا فرمان تو نہیں تھا۔ بندے کے فرمان کی تعمیل خدائی فرمان کی طرح تو نہیں ہو سکتی۔"
شہزادے نے طیش میں کہا۔ "حسن! تم حد سے تجاوز کر رہے ہو۔"
حسن نے جواب دیا۔ "حد سے تجاوز وہ کرتا ہے جو خدا کی حدود کو توڑتا ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ میں نے ابھی تک ایسا نہیں کیا۔"
شہزادے کے ہاتھ میں کوڑا تھا۔ اس نے غصے میں کوڑے برسائے، جنہیں حسن نے اپنے ہاتھ پر روک لیا۔
شہزادے نے غصے میں تنبیہ کی۔ "حسن! خبردار جو اب خسرو سے ملاقات کی۔"
حسن کوئی جواب دیے بغیر شہزادے کے پاس سے خسرو کے ہاں چلے گئے۔ شاہی مخبران کے ساتھ ساتھ تھا۔ اس نے شہزادے کو مطلع کیا کہ حسن پر کوڑوں نے کوئی اثر نہیں کیا۔ وہ اس وقت بھی خسرو کے پاس موجود ہیں۔

اس بار شہزادے نے حسن کے بجائے خسرو کو طلب کر لیا۔

خسرو کو دیکھتے ہی شہزادے نے غصے میں پوچھا۔ ''خسرو! یہ معاملہ کیا ہے؟ تم دونوں میرے فرمان کی نافرمانی پر کیوں تلے ہوئے ہو؟''

خسرو نے آستین کو اوپر چڑھاتے ہوئے اپنی کلائی اور ہتھیلی کی پشت شہزادے کے سامنے کردی اور آہستہ سے ایک مصرعہ پڑھا۔

گواہ عاشق صادق در آستیں باشد

شہزادے نے دیکھا کہ جس جگہ حسن کے کوڑے لگے تھے، خسرو کے ہاتھ میں اسی جگہ کوڑے کے نشان موجود تھے۔

خسرو نے کہا۔ ''شہزادہ معظم! حسن میرا ہم مشرب، ہم مذاق، عزیز ترین دوست، بلند پایہ شاعر اور ہم مسلک بھائی ہے۔''

شہزادہ بے حد شرمندہ تھا، وہ خسرو سے نظریں ملاتے ہوئے گھبرا رہا تھا۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ ''خسرو! میں نے جو کیا اس پر میں شرمندہ ہوں اور معافی چاہتا ہوں۔''

خسرو رونے لگے، بولے۔ ''شہزادے! میں اپنے حاسدوں اور مفسدوں پر آنسو بہا رہا ہوں۔ خدا انہیں معاف کرے۔''

اس واقعے کے کچھ عرصے بعد شہزادے کو خبر ملی کہ چنگیز خانی سپاہ دیپالپور سے لاہور کی طرف بڑھ رہی ہے۔ شہزادہ سلطان محمد اپنی فوج کے ساتھ لاہور کی طرف روانہ ہو گیا۔ فوج میں خسرو اور حسن سنجری بھی شامل تھے۔ شہزادہ چند گھنٹوں میں دریائے راوی کے کنارے جا کھڑا ہوا۔ اب دریائے راوی کے ایک طرف مغل فوج تھی اور دوسری طرف شہزادہ سلطان محمد اور اس کی فوج۔ مغلوں کے حوصلے بلند تھے۔ ان کے سردار نے حکم دیا کہ مغل دریا عبور کر کے شہزادہ سلطان محمد کی فوج پر حملہ آور ہو جائیں۔

مغلوں نے اپنے گھوڑے دریا میں ڈال دیے اور دیکھتے ہی دیکھتے دریا پار اتر گئے۔

دونوں فوجیں آپس میں الجھ گئیں، شہزادہ سلطان محمد بے جگری سے لڑتا مقابلہ کرتا، ادھر سے ادھر اور ادھر سے ادھر آ جا رہا تھا۔ چند گھنٹے بعد مغلوں نے اپنی روایتی جنگی چال چلی اور شکست کھا کر بھاگنے لگے اور شہزادے کی فوج کی اکثریت ان کے تعاقب میں دوڑی۔ یہاں تک کہ شہزادے کے پاس کل پانچ سو سپاہی رہ گئے۔ ظہر کا وقت ہو چکا تھا۔ شہزادہ اپنے ساتھیوں کو لے کر نماز ادا کرنے لگا۔ مغلوں کا ایک دو ہزاری دستہ کمین گاہ میں چھپا اس موقع کی فکر میں تھا۔ وہ باہر نکلا اور نمازیوں پر حملہ کر دیا۔ شہزادے اور اس کے ساتھیوں نے جلدی جلدی نماز پڑھی اور فارغ ہوتے ہی جنگ وجدل میں مشغول ہو گئے۔ دوسری طرف شکست خوردہ مغل بھی اچانک پلٹ کر تعاقب کرنے والوں پر حملہ آور ہو چکے تھے۔ شہزادے کی فوج بوکھلا گئی۔ کسی مغل کا تیر شہزادے کے دل میں پیوست ہو گیا جس سے وہ گھوڑے سے گر کر جاں بحق ہوا۔ شہزادے کی شہادت نے اس کی سپاہ کے پاؤں اکھاڑ دیے۔ مغلوں نے ان کا پیچھا کیا اور رگید رگید کر قتل کرنا شروع کر دیا۔ کچھ لوگ دریا میں کود گئے اور بہتوں نے خود کو مغلوں کے سپرد کر دیا۔ مغلوں کے سپرد ہو جانے والوں میں خسرو اور حسن سنجری بھی شامل تھے۔

جس مغل نے انہیں قید کیا تھا، وہ خسرو اور حسن سنجری کے مرتبے کو کیا جانتا۔ اس نے انہیں رسیوں سے باندھ کر اپنے گھوڑے کے ساتھ بھگانا شروع کر دیا۔ مغل اپنے گھوڑے پر سوار افغانستان کی طرف جا رہا تھا اور خسرو اور حسن سنجری لہولہان آبلہ پا یہ مسافت طے کر رہے تھے۔ وہ انہیں اسی طرح بلخ تک لے گیا۔

اس مغل نے اتنے صابر و شاکر انسان نہیں دیکھے تھے۔ اسے ان دونوں پر ترس آ گیا۔ بلخ پہنچ کر پوچھا۔ ''میں حیران ہوں کہ تم دونوں نے اتنے طویل سفر میں ایک جگہ بھی مزاحمت نہیں کی۔ آخر اس کی وجہ؟''

خسرو نے جواب دیا۔ ''کیونکہ ہمیں معلوم ہے کہ ہماری شکست اور تمہاری فتح میں خدا کی مشیت شامل ہے اور ہم تقدیر الٰہی سے جنگ کرنے کے قائل نہیں۔''

مغل ان کی بات نہیں سمجھ سکا۔ پوچھا۔ ''تم کام کیا کرتے ہو؟''

خسرو نے جواب دیا۔ ''بہت کچھ لیکن شعر و شاعری سے زیادہ شغف ہے۔''

مغل نے پوچھا۔ ''شعر و شاعری؟ یہ کون سا کام ہوتا ہے؟''

خسرو نے اس مغل کو شعروشاعری کا مفہوم سمجھایا تو وہ بہت ہنسا، ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو گیا، بولا۔ ”تو شاید تم بھی بخارا کے ان لوگوں جیسے ہو جو کتابیں لکھتے تھے اور کتابیں پڑھا کرتے تھے۔ غیر فوجی، نکمے، بیکار، فضول...... انہیں تلوار چلانا نہیں آتی تھی اور میرا خیال ہے کہ تم دونوں بھی تلوار نہیں چلا سکتے۔“

خسرو نے جواب دیا۔ ”تلوار تو ہم لوگ بھی چلاتے ہیں مگر فولادی تلوار نہیں، قلم کی تلوار۔“

مغل نے ہنس کر کہا۔ ”یہ قلم کی تلوار کیا چیز ہوتی ہے اور اس سے انسانوں کو کس طرح ہلاک یا قتل کیا جاتا ہے؟“

خسرو نے جواب دیا۔ ”افسوس کہ میں قلم کی تلوار کا طریقہ کار تمہیں نہیں سمجھا سکتا۔“

مغل کو بڑی ہنسی آرہی تھی۔ اس نے کہا۔ ”تو اس کا یہ مطلب ہوا کہ تم دونوں ہمارے کسی کام کے نہیں۔ نہ تو تم تلواریں بنا سکتے ہو اور نہ ہی تلواریں چلا سکتے ہو۔ تم کھیتی باڑی کا ہنر بھی نہیں جانتے۔ تم مکان بھی نہیں بنا سکتے۔ یعنی تم میرے کسی کام کے بھی نہیں۔“

خسرو کی جان نکل گئی۔ انہیں معلوم ہو گیا کہ جب کوئی شخص مغلوں کے کام کا نہیں ہوتا تو اس کا حشر کیا کیا جاتا ہے۔ شاید قتل کر دیا جاتا ہے۔

لیکن مغل نے ان دونوں کو قتل نہیں کیا، انہیں حکم دیا۔ ”تم دونوں بھاگ جاؤ، جلد از جلد...... جتنی جلدی ممکن ہو بھاگ جاؤ، کیونکہ دوسرے مغل بے کار آدمیوں کو قتل کر دیتے ہیں۔“

یہ بدشکل، چوڑے منہ، گندا دہن اور کچی ڈاڑھی مونچھ والا مغل دیکھنے میں ہیبت ناک اور خونخوار نظر آتا تھا مگر جب اس نے انہیں رہا کر دیا تو یہ بگٹٹ بھاگ کھڑے ہوئے۔

یہ سیدھے دہلی پہنچے اور ماں کے سینے سے لگ کر زار و قطار رونے لگے پھر حضرت نظام الدین اولیا کی خدمت میں حاضری دی۔ حضرت محبوب الٰہی خسرو کے کلام پر سر دھنا کرتے تھے۔ انہوں نے خسرو سے کلام سنانے کی فرمائش کی۔ خسرو نے آپ کی شان میں مدح سرائی کی۔ حضرت محبوب الٰہی اس سے بہت خوش ہوئے، پوچھا۔ ”خسرو! کیا صلہ چاہتے ہو؟“

خسرو نے جواب دیا۔ ”پیرومرشد کلام میں شیرینی۔“

حضرت محبوب الٰہی نے فرمایا۔ ”چارپائی کے نیچے طشت میں شکر رکھی ہے۔ اس کو نکالنا تو سہی۔“

خسرو نے شکر کا طشت کھینچ کر باہر نکالا۔

آپ نے حکم دیا۔ ”کچھ شکر اپنے سر پر چھڑک لو اور کچھ کھالو۔“

خسرو نے حکم کی تعمیل کی اور اسی دن انہیں یہ محسوس ہونے لگا کہ ان کے کلام میں کہیں زیادہ شیرینی پیدا ہو چکی ہے۔ آخری عمر میں خسرو بہت پچھتایا کرتے تھے کہ اس سے بہتر صلہ بھی مانگا جا سکتا تھا مگر بدقسمتی کہ نہیں مانگ سکا۔

کچھ عرصہ دہلی میں رہ کر خسرو مومن پورہ (پٹیالی) چلے گئے۔ یہاں ان کا مکان گنگا کے کنارے پر تھا۔ وطن میں انہیں بڑا سکون محسوس ہوا۔

اس وقت تک وہ خاصی شاعری کر چکے تھے۔ یہاں انہوں نے اپنے دیوان کی ترتیب کا کام شروع کر دیا۔ یہ ان کا دوسرا دیوان تھا اور انہوں نے اس کا نام رکھا تھا ”وسط الحیوٰۃ“۔ ان کے اس دیوان میں اٹھاون قصائد چھہتر ترجیعات، بیالیس قطعات دو مثنویاں، ایک سو ستاون رباعیات اور تین سو غزلیں ہیں۔ دیوان کے کل اشعار کی تعداد آٹھ ہزار چار سو اکتالیس ہے۔ اس وقت ان کی عمر چونتیس سال کی تھی۔

خسرو کو شہزادہ سلطان محمد کی شہادت کا اتنا دکھ تھا کہ انہوں نے اس سانحے کے زیر اثر ایک مرثیہ لکھا۔ یہ مرثیہ جب بلبن کے دربار میں سنایا گیا تو وہاں ایک کہرام برپا ہو گیا۔ سلطان غیاث الدین بلبن پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔ پھر بخار آ گیا اور اسی بخار میں سلطان کا انتقال ہو گیا۔

بلبن کے بعد اس کا پوتا کیقباد سلطان بن گیا۔ کیقباد نے خسرو کو ملک الشعرا بنا دیا مگر قسمت یہاں بھی ان کے ساتھ ساتھ تھی۔ کیقباد تین سال حکومت کر کے ایک ترک کے ہاتھوں قتل ہو گیا۔

کیقباد کے بعد جلال الدین خلجی بادشاہ بن گیا اور اس نے خسرو کو ”امیر“ کا لقب دے کر مصحف داری کا عہدہ بخش دیا۔ ابھی تک خسرو صرف خسرو تھے لیکن جلال الدین خلجی نے انہیں امیر کا خطاب دے کر امیر خسرو بنا دیا۔

پانچ چھ سال بعد جلال الدین خلجی کو اس کے بھتیجے اور داماد علاؤالدین خلجی نے الٰہ آباد میں کڑے نامی جگہ پر دھوکے سے قتل

کردیا اور خود بادشاہ بن گیا۔ خسرو کو جلال الدین خلجی سے بڑی محبت تھی۔ اس سانحے نے ان کے حساس دل کو مسل کر رکھ دیا۔

اس واقعے نے خسرو کو اتنا دل برداشتہ کردیا تھا کہ وہ اپنا زیادہ وقت حضرت محبوب الٰہی کی محبت میں گزارنے لگے تھے۔ علاؤالدین نے انہیں اپنے منصب پر بحال رکھا تھا۔ ایک ہزار تنکہ سالانہ بطور وظیفہ ملتا تھا۔

خسرو بے حد گداز قلب رکھتے تھے۔ اس گدازیت نے ان کی شاعری میں درد و سوز بھر دیا تھا۔ انہیں شاعری کے ساتھ ہی موسیقی میں بھی کمال حاصل تھا اور یہ بات مشہور تھی کہ موسیقی میں ان کا کوئی ثانی نہیں۔ موسیقی میں سب سے بڑا درجہ نایک کا ہوتا ہے۔ خسرو نے نایک کا مرتبہ حاصل کیا تھا۔ خسرو کے بعد آج تک یہ مرتبہ کوئی اور نہیں حاصل کرسکا۔

کہتے ہیں، خسرو کے عہد میں دکن کا گوپال نامی موسیقار نایک کا مقام حاصل کرچکا تھا۔ پورے برصغیر میں اس کا بڑا شہرہ تھا۔ دہلی میں علاؤالدین خلجی نے اس کے غیر معمولی شہرے کے پیش نظر اسے دکن سے بلوالیا۔

ادھر بادشاہ خسرو کی بابت یہ سن چکا تھا کہ علم و موسیقی میں بھی خسرو کا کوئی ثانی نہیں۔ بادشاہ نے خسرو سے کہا۔ ''خسرو! میں نے علم موسیقی کے ماہر گوپال کو دکن سے بلالیا ہے، سنتا ہوں گوپال اپنے فن میں یکتا ہے۔ کیا تم اس کا مقابلہ کرسکتے ہو؟''

خسرو نے جواب دیا۔ ''کیوں نہیں جہاں پناہ۔ میں گوپال کا مقابلہ کروں گا مگر مقابلے سے پہلے حضور کو میری ایک شرط پوری کرنا ہوگی۔''

بادشاہ نے پوچھا۔ ''کون سی شرط؟ بیان کرو۔''

خسرو نے عرض کیا۔ ''حضورِ والا! میں نے سنا ہے کہ گوپال نایک کے بارہ سو شاگرد ہیں جو اپنے استاد کے سنگھاسن (تخت) کو اپنے کاندھوں پر لیے پھرتے ہیں۔ میری حضور سے یہ درخواست ہے کہ گوپال نایک جب آپ کے روبرو اپنے فن کا مظاہرہ کرے تو مجھے خاموشی اور ہوشیاری سے اس کے تخت کے نیچے چھپا دیا جائے۔ بس میرے لیے اتنا ہی کافی ہے۔ میں گوپال کو وہ جواب دوں گا کہ وہ خود اور زمانہ اس مقابلے کو ہمیشہ یاد رکھے گا۔''

بادشاہ نے خسرو کی تجویز مان لی اور جب گوپال نایک کو علائی دربار میں لایا گیا تو خسرو کو اس کے سنگھاسن کے نیچے چھپا دیا گیا۔ گوپال نے راگ چھیڑا اور خسرو اسے ذہن نشین کرتے چلے گئے۔

اس طرح یکے بعد دیگرے چھ مجلسیں منعقد ہوئیں اور خسرو کو گوپال کا ہر راگ ازبر ہوتا چلا گیا۔

ساتویں بار بادشاہ نے خسرو کو حکم دیا کہ اب وہ بھی گوپال نایک کے مقابلے پر آجائیں۔ چنانچہ خسرو بھی اپنے شاگردوں کے ساتھ علائی دربار میں داخل ہوئے۔ گوپال بھی ان کا شہرہ سن چکا تھا۔ جب دونوں کا آمنا سامنا ہوا تو گوپال نے خسرو سے کہا۔ ''شریمان جی! میں نے آپ کا بڑا شہرہ سنا ہے، آج تو میں آپ سے کچھ سنوں گا۔''

خسرو نے جواب دیا۔ ''سنانے میں مجھے کوئی تامل نہیں لیکن میں چونکہ ترک ہوں اس لیے ہندوستانی گانا کچھ یوں ہی سا جانتا ہوں۔ پہلے آپ کچھ سنائیں پھر میں بھی کچھ عرض کردوں گا۔''

گوپال نے گانا شروع کیا۔ جب وہ گا چکا تو خسرو نے کہا۔ ''مہاراج! یہ تو میں بہت پہلے باندھ چکا ہوں۔''

گوپال نے حیرت سے کہا۔ ''اچھا ذرا سنانا تو۔''

خسرو نے گاکر بھی سنادیا۔ گوپال حیرت زدہ رہ گیا اور دوسرا راگ چھیڑا۔ خسرو نے پھر وہی بات دہرائی کہ میں اس کو بھی بہت پہلے باندھ چکا ہوں۔

گوپال پریشان ہوگیا، بولا۔ ''سنانا تو سہی۔''

خسرو نے پھر سنادیا۔ گوپال نے تیسرا، چوتھا، پانچواں اور چھٹا راگ چھیڑا اور ان سب کا یکساں حشر ہوا۔ آخر میں خسرو نے کہا۔ ''مہاراج! یہ سب اپنے ایجاد کردہ راگ تھے اور انہیں میں عام بازاری راگ سے زیادہ اہمیت دینے کو تیار نہیں۔ اب میں اپنی خاص ایجادات سناتا ہوں، سنیے۔''

اب جو خسرو نے گانا شروع کیا تو گوپال مبہوت رہ گیا۔ آخر میں بولا۔ ''شریمان جی! دھنیہ ہو، میں آپ کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ آپ میں فن کی مہارت کے علاوہ کچھ اور بھی ہے۔ اس کچھ اور کا میں کیا، دنیا کا کوئی شخص بھی مقابلہ نہیں کرسکتا۔''

بادشاہ، خسرو کے کمال فن اور فتح مندی سے بہت متاثر ہوا۔ اس نے تحسین آمیز لہجے میں پوچھا۔ ''خسرو! یہ کیا ہے؟ کیا یہ درست ہے کہ محبوب الٰہی کی شکر کا فیض تمہیں عطا ہوا ہے۔''

خسرو نے عرض کیا۔ ''حضورِ والا! میں جو کچھ بھی ہوں خواجہ نظام الدین کے طفیل ہوں۔''
گوپال نے درخواست کی۔ ''خسرو! میں موسیقی میں نایک کا درجہ رکھتا ہوں لیکن آپ کا مقام مجھ سے کہیں بلند ہے۔ کیا میں آپ سے کچھ سیکھ سکتا ہوں؟''
خسرو نے جواب دیا۔ ''میں تیار ہوں، مجھے کوئی اعتراض نہیں۔''
اس کے بعد گوپال نے خسرو سے موسیقی کی تعلیم حاصل کی اور کہیں زیادہ باکمال بن گیا۔

☆☆☆

انہی دنوں پانی پت میں شیخ شرف الدین بوعلی شاہ قلندر نے ایک خاص شہرہ حاصل کر رکھا تھا۔ قلندری دربار میں لوگ جانا تو چاہتے تھے مگر ہمت کسی کی بھی نہ پڑتی تھی۔ سلطان علاؤ الدین خلجی بھی بوعلی شاہ قلندر کو کچھ نذر پیش کرنا چاہتا تھا مگر وہ شخص نہیں مل رہا تھا جو بادشاہ کی نذر بوعلی شاہ قلندر تک پہنچا دے اور اس نذر کو قبول بھی کر لیا جائے۔
کسی امیر نے بادشاہ کو مشورہ دیا کہ جب حضورِ والا کو امیر خسرو جیسا آدمی میسر ہے تو پھر تلاش کی کیا ضرورت ہے۔
بادشاہ نے جواب دیا۔ ''بات تو درست ہے لیکن میں یہ بھی جانتا ہوں کہ امیر خسرو ہمارے کہنے سے بوعلی شاہ کے پاس نہیں جائیں گے۔ وہ اپنے پیر و مرشد خواجہ نظام الدین کی اجازت کے بغیر ایک قدم بھی نہیں اٹھائیں گے۔''
امیر نے مشورہ دیا۔ ''پھر محبوب الٰہی سے اجازت حاصل کر لی جائے۔''
بادشاہ نے ایک امیر حضرت محبوب الٰہی کی خدمت میں روانہ کر دیا۔ اس نے بادشاہ کا مافی الضمیر ان سے بیان کر دیا۔ آپ نے کچھ تامل کے بعد خسرو کو بلایا اور کہا۔ ''خسرو! تم بادشاہ کا نذرانہ لے کر بوعلی شاہ کے پاس چلے جاؤ۔''
خسرو کو کیا انکار ہو سکتا تھا۔ تیار ہو گئے۔ آپ نے خسرو کو سمجھایا۔ ''خسرو! تم قلندر بوعلی شاہ کے پاس اس طرح جاؤ گے کہ ان کی کسی بات پر اعتراض نہ کرنا۔ وہ جو کچھ فرمائیں سرِ تسلیم خم کر دینا۔ وہ اللہ کے عاشق ہیں۔''
خسرو بادشاہ کا نذرانہ لے کر پانی پت روانہ ہو گئے۔ تیسرے دن پانی پت میں داخل ہوئے۔ بوعلی شاہ قلندر کے آستانے پر پہنچ کر اطلاع کرائی۔ بوعلی شاہ کو جب یہ معلوم ہوا کہ حضرت محبوب الٰہی کی اجازت سے خسرو ان کے پاس آئے ہیں تو فوراً ہی اندر بلا لیا۔ خسرو نے ان کے روبرو جاتے ہی سلام کیا۔
بوعلی شاہ نے فرمایا۔ ''آ گا ترک۔ میرے قریب آ جا۔''
خسرو نے دوبارہ سلام کیا اور عرض کیا۔ ''حضرت! یہ آپ کی عنایت ہے جو مجھے مخاطب فرمایا ورنہ میں ایک ناچیز بندہ ہوں۔''
بوعلی شاہ نے فرمایا۔ ''اپنے کلام میں سے کچھ سناؤ۔''
خسرو نے نہایت خوش الحانی سے سنانا شروع کیا تو بوعلی شاہ قلندر بہت خوش ہوئے فرمایا۔ ''خسرو خوب کہتا ہے' خوش رہے گا' خوش جائے گا۔''
خسرو پر رقت طاری ہو گئی، وہ رونے لگے۔
بوعلی شاہ نے پوچھا۔ ''کچھ سمجھا بھی؟''
خسرو نے جواب دیا۔ ''حضرت! مجھے رونا اس قدر آیا کہ میں کچھ بھی نہیں سمجھا۔''
بوعلی شاہ بہت خوش ہوئے۔ فرمایا۔ ''خسرو! میں نے بادشاہ کی نذر قبول کر لی۔ اگر درمیان میں مولانا نظام الدین کا قدم نہ ہوتا تو میں اس کو ہرگز قبول نہ کرتا۔''
اس کے بعد آپ نے خدام کو حکم دیا۔ ''خسرو کو خانقاہ میں اعزاز و اکرام سے رکھو۔''
خسرو نے خانقاہ میں تین دن قیام کیا پھر اجازت لے کر واپسی کا ارادہ کیا۔ بوعلی شاہ نے انہیں دو خط دیے۔ ایک حضرت محبوب الٰہی کے نام اور دوسرا سلطان علاؤ الدین خلجی کے نام۔

☆☆☆

علاؤ الدین خلجی کو اس کے غلام ملک کافور نے سازش سے ہلاک کر دیا اور اس کی جگہ کمسن شہزادے شہاب الدین کو تخت نشین کر دیا لیکن ایک ماہ کے اندر اندر ملک کافور بھی قتل کر دیا گیا اور اس کی جگہ علاؤ الدین کا تیسرا بیٹا قطب الدین مبارک شاہ کو بادشاہ بنا دیا گیا۔ قطب الدین کو خسرو بے حد پسند آئے۔ خسرو نے بھی بادشاہ کو خوش کرنے کی خاطر مثنوی نہ سپہر لکھی۔ بادشاہ نے انہیں ہاتھی برابر وزن کر کے چاندی بطور انعام دی۔

پھر قطب الدین بھی قتل کر دیا گیا اور اس کی جگہ غیاث الدین تغلق برسرِ اقتدار آئے۔ غیاث الدین تغلق نے بھی انہیں ان کی جگہ پر برقرار رکھا لیکن اس آئے دن کے خون خرابے اور انتشار نے خسرو کو دل برداشتہ کر دیا تھا۔ انہوں نے اپنا زیادہ وقت اپنے پیر و مرشد کی صحبت میں گزارنا شروع کر دیا۔ حضرت محبوب الٰہی خسرو کو اس قدر پسند فرماتے تھے کہ دوسرے مرید خسرو کو وسیلہ بنا کر حضرت محبوب الٰہی تک پہنچتے تھے۔

حضرت محبوبِ الٰہی اکثر فرمایا کرتے تھے۔ ''میں اپنے وجود سے رنجیدہ ہوتا ہوں مگر اے ترک (خسرو) میں تجھ سے کبھی رنجیدہ نہیں ہوتا۔'' کبھی یہ فرماتے۔ ''میں اور سب سے اکتا جاتا ہوں لیکن خسرو سے کبھی نہیں اکتاتا۔''

ایک دن آپ نے فرمایا۔ ''جب قیامت کے دن مجھ سے سوال ہوگا کہ نظام الدین تو دنیا سے کیا لایا ہے؟ تو میں جواب میں خسرو کو پیش کر دوں گا۔''

اس طرح ایک اور موقع پر فرمایا۔ ''روزِ محشر امیدوارم کہ مرا بہ سوزِ سینہ ایں ترک بچہ بخشند (اس ترک بچے کے دل میں جو آگ سلگتی ہے۔ اس کی گرمی کے سبب میں بخشا جاؤں گا)۔''

اس طرح ایک اور موقع پر خسرو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا۔ ''الٰہی! بسوزِ سینۂ ایں ترک مرا بہ بخش (خدایا! اس ترک کے سوزِ دل کے طفیل مجھے بخش دے)۔'' اس کے بعد مزید فرمایا۔ ''اگر ایک قبر میں دو لاشوں کا دفن کرنا جائز ہوتا تو میں اپنی قبر میں خسرو کو دفن کرنے کی وصیت کر جاتا۔''

ایک مفلس و قلاش حضرت محبوب الٰہی کی خدمت میں پہنچا اور دستِ سوال دراز کیا۔ اس وقت آپ کے پاس کچھ بھی نہ تھا اور سوالی کو خالی واپس بھی نہیں کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ آپ نے فرمایا۔ ''بھائی! اس وقت تو میرے پاس میری نعلین کے سوا کچھ بھی نہیں، وہ لے سکتے ہو۔''

سائل نے اس کو غنیمت جانا۔ بولا۔ ''وہی عنایت ہو جائے۔''

آپ نے اپنی نعلین سائل کے حوالے کر دیں۔

یہ شخص دہلی سے اودھ کی طرف چلا گیا اور ایک سرائے میں قیام کیا۔ اس سرائے میں خسرو پہلے سے مقیم تھے۔ خسرو کو سرائے میں اپنے پیر و مرشد کی خوشبو محسوس ہوئی، یہ خوشبو کو سونگھتے ہوئے سائل تک پہنچ گئے اور اس سے پوچھا۔ ''میں اپنے پاس پیر و مرشد کی خوشبو محسوس کر رہا ہوں۔''

سائل نے پوچھا۔ ''تیرا پیر و مرشد کون ہے؟''

خسرو نے جواب دیا۔ ''حضرت نظام الدین محبوب الٰہی۔''

سائل نے برا سا منہ بنا کر کہا۔ ''ہاں، میں نے اس دربار کی بابت بہت کچھ سن رکھا تھا مگر جب میں ان کے پاس گیا اور اپنا دستِ طلب دراز کیا تو جانتے ہو کہ مجھے وہاں سے کیا ملا؟''

خسرو نے جواب دیا۔ ''نہیں، مجھ کو نہیں معلوم کہ تجھ کو وہاں سے کیا ملا لیکن میں یہ ضرور جانتا ہوں کہ تجھ کو وہاں سے جو کچھ ملا ہوگا، بہت قیمتی ہوگا۔''

درویش نے محبوب الٰہی کی جوتیاں خسرو کے سامنے رکھ دیں اور کہا۔ ''یہ تحفہ ملا تھا مجھ کو۔''

خسرو نے ان جوتیوں کو نہایت قیمتی تبرک سمجھ کر اٹھا لیا، فرمایا۔ ''اگر تو پسند کرے تو میں انہیں خرید لوں کیونکہ یہ ہفت اقلیم کی بادشاہت سے زیادہ قیمتی ہے۔''

درویش نے جواب دیا۔ ''بابا! میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ جوتیوں کو نقدی میں بدل لوں۔''

اس وقت خسرو کے پاس بہت کچھ تھا، مال و زر، لونڈیاں، کنیزیں۔ انہوں نے یہ سارا کا سارا درویش کے حوالے کر کے پیر و مرشد کی جوتیاں سر پر رکھ لیں، فرمایا۔

تاجِ خسرو ہے یہی تختِ سلیماں ہے یہی۔

☆☆☆

ایک دن بازار سے گزر ہوا تو دیکھا دُھنیا روئی دھنک رہا ہے، اس وقت کوئی صاحب خسرو کے ساتھ تھے۔ انہوں نے کہا۔ ''خسرو! کیا خیال ہے، ہر دُھنیا ایک ہی انداز میں روئی دھنکتا ہے۔ ایسا لگتا ہے گویا سارے دُھنیے ایک ہی استاد کے شاگرد ہیں۔''

کسی دوسرے نے کہا۔ ''لیکن میرا خیال ہے کہ دُھنیوں کی استاد قدرت خود ہے اور اس نے سب کو ایک ہی انداز پر سکھایا ہے۔''

خسرو کے ساتھی نے ان سے پوچھا۔ ''حضرت! اگر اس آواز کو لفظوں میں قید کیا جائے تو کیا آواز نکلے گی؟''

در پئے جاناں جاں ہم رفت جاں ہم رفت جاں ہم رفت
رفت رفت جاں ہم رفت ایں ہم رفت واں ہم رفت
آں ہم رفت آں ہم رفت ایں ہم آں ہم ایں ہم آں ہم رفت
رفتن رفتن رفتن وہ وہ رفتن وہ رف رف رفتن وہ رفتن وہ

اس میں کمال کی بات یہ ہے کہ جن لوگوں نے دُھنیے کو روئی دھنکتے دیکھا اور سنا ہے، وہ خسرو کی لفظی عکاسی میں اسے ہو بہو پائیں گے۔ دُھنیا تانت پر جب ضرب لگاتا ہے تو اس میں یہی آوازیں نکلتی ہیں۔

☆☆☆

خسرو اپنے عہد ہی میں اتنے مشہور ہو چکے تھے کہ جدھر سے بھی گزر جاتے، لوگ انہیں پہچان کر آپس میں اشاروں کنایوں میں باتیں کرنے لگتے۔ اس طرح یہ ایک دن گھومتے پھرتے پنگھٹ پر جا پہنچے۔ کنویں پر چار پنہاریاں پانی بھر رہی تھی۔ خسرو پیاسے تھے۔ کنویں کے پاس رک گئے اور ان میں سے کسی ایک سے پانی مانگا۔

ایک نے خسرو کو پہچان لیا، اس نے تینوں سے کہا۔ ''تم نے اسے پہچانا؟''

تینوں نے جواب دیا۔ ''نہیں تو، یہ کون ہے؟''

اس نے کہا۔ ''یہ کھسرو (خسرو) ہے۔''

ایک نے خسرو سے پوچھا۔ ''کیا تم سچ مچ کھسرو ہو۔''

دوسری نے کہا۔ ''وہی کھسرو، جس کا کلام مشہور ہے اور جو پہیلیاں بھی گھڑتا ہے۔''

خسرو نے جواب دیا۔ ''ہاں، میں خسرو ہوں، وہی شاعری اور پہیلیوں والا خسرو۔''

ایک نے کہا۔ ''پھر تم اپنی شاعری میں کھیر کی بات کرو۔''

دوسری نے کہا۔ ''چرخے کا ذکر بھی۔''

تیسری نے کہا۔ ''اور ڈھول کا بھی۔''

چوتھی بولی۔ ''اور کتے کا بھی۔''

خسرو نے کہا۔ ''میں سخت پیاسا ہوں، پہلے مجھے پانی پلا دو۔''

عورتوں نے جواب دیا۔ ''نہیں، پہلے ہماری خواہش پوری کرو، بعد میں پانی۔''

خسرو نے کہا لو سنو۔

کھیر پکائی جتن سے چرخہ دیا جلا
آیا کتا کھا گیا، تو بیٹھی ڈھول بجا
''لا پانی پلا۔''

☆☆☆

یہ ایک متفقہ رائے ہے کہ خسرو کے کلام میں سوز و گداز، رفعت خیالی، روانی، تنوع، ندرت اور نفاست پائی جاتی ہے۔ اس میں حضرت محبوب الٰہی کا فیضان پوری طرح شامل اور موجود ہے۔ وہ ایک طرف تو شاہی درباروں میں قصائد پڑھتے نظر آتے ہیں۔ بادشاہوں کی مدح سرائی کرتے دکھائی دیتے ہیں اور دوسری طرف حضرت محبوب الٰہی کے قدموں میں بیٹھے دکھائی دیتے ہیں۔ ان پر درباروں اور شاہوں کا رنگ نہیں چڑھ سکا، ہاں تصوف نے انہیں رنگ میں ضرور رنگ لیا۔ وہ بھری پُری دنیا میں رہ کر بھی اس سے الگ تھلگ رہے۔

خسرو ہر انسان کو آدمی نہیں مانتے تھے۔ کہتے تھے۔ ''اگرچہ آدمی بے حساب است ولیکن در دیوانِ آدمیت ہمہ را در حساب آدمیت نتواں شد۔''

(اگرچہ آدمی بے شمار ہیں لیکن زمرہ آدمیت میں سب شامل نہیں ہیں)

خسرو نے معاصرین کو مال وزر اور جاہ و منصب کی طرف بھاگتے دیکھا تو انہیں بہت افسوس ہوا۔ انہوں نے کہا۔

مرد گیر دہر در کہ نانت دہند　　درِ کعبہ زن تا امانت دہند

(رزق کی تلاش میں مارا مارا پھرا کر، خدا کے گھر کی جانب متوجہ ہو جا تا کہ تجھے امان مل جائے)

ضامن روزیٔ تو روزی رساں　　دیدۂ کور تو بسوئے جناں

(تیری روزی کا ضامن تو خدا ہے لیکن تو اپنی بے بصری کے سبب دنیا کی طرف دیکھ رہا ہے)

خسرو اپنے عشق میں شدت کے طالب رہے۔ وہ اس سلسلے میں غیر قانع اور حد درجہ حریص تھے۔

دلم در عاشقی آوارہ شد، آوارہ ترباد

تنم از بے دلی بے چارہ شد، بے چارہ ترباد

(میرا دل عاشقی میں آوارہ ہو گیا ہے، خدا کرے اور آوارہ ہو جائے۔ میرا جسم محبت میں بے چارہ ہو گیا ہے، خدا اس کی بے چارگی میں اضافہ کرے)

ہر کس کہ در قید عشق شد مجنوں تا قیامت زبند اور نہ رہید

(جو شخص قیدِ عشق میں ایک بار مجنوں ہو گیا، اسے تا قیامت رہائی نصیب نہیں ہو سکتی)

خسرو نے اپنی مثنوی شیریں فرہاد میں عشق کے اسرار و رموز کو بہ زبان فرہاد یوں بیان کیا ہے۔

بگفتش کیستی، درچہ سازی　　بگفتا عاشقم، درجاں گزاری

(پوچھا تو کون ہے اور کیا کرتا ہے　　جواب دیا کہ میں عاشق جانثار ہوں)

بگفتش عشق بازاں رانشاں چیست　　بگفتا آں کہ باید دربلازیست

(پوچھا عاشق کی پہچان کیا ہے؟　　جواب دیا، ان کی جان ہمیشہ آفت میں رہتی ہے)

بگفتش، عاشقاں زیں رہ چہ یوبند　　بگفتا، دل دہند و درد جویند

(پوچھا عاشق کس چیز کی تلاش میں سرگرداں رہتے ہیں، جواب دیا دل دیتے ہیں درد لیتے ہیں)

☆☆☆

سلطان غیاث الدین تغلق بنگال میں تھا، خسرو بھی بنگال ہی میں تھے۔ سلطان کا بیٹا بغرا خان خسرو کو بہت چاہتا تھا۔ بادشاہ بنگال سے واپس ہوا۔ مگر اس سفر میں خسرو سلطان کے ساتھ نہیں تھے۔ بادشاہ حضرت محبوب الٰہی کی شان میں گستاخیاں کرتے کرتے دنیا سے رخصت ہو چکا تھا۔ دوسری طرف حضرت محبوب الٰہی کو بھی کشف سے معلوم ہو چکا تھا کہ ان کا آخری وقت آچکا ہے چنانچہ ربیع الآخر 725 ہجری میں آپ کا وصال ہو گیا۔ خسرو کو یہ خبر بنگال میں ملی۔ یہ بھاگم بھاگ دہلی پہنچے، جب یہ مزار کی طرف بڑھے تو چند لوگوں نے آپ کو روک دیا۔ خسرو رو رہے تھے۔ رقت زدہ آواز میں کہا۔ ”تم لوگ مجھے حضرت محبوب الٰہی کے پاس کیوں نہیں جانے دیتے؟“

ایک شخص نے جواب دیا کہ حضرت محبوب الٰہی نے سختی سے منع کیا ہے کہ خسرو کو میرے مزار پر نہ آنے دیا جائے کیونکہ اگر خسرو میرے مزار پر آگیا تو ہو سکتا ہے کہ میں بھی قبر سے اٹھ کر باہر آجاؤں۔ بس اسی وجہ سے میں نے آپ کو اندر جانے سے روک دیا ہے۔

خسرو نے مزار کو دیکھتے ہی دور سے نعرہ بلند کیا۔ ”سبحان اللہ! آفتاب زیرِ زمیں و خسرو زندہ۔“

آخر غم نے جنون کی شدت اختیار کی اور خسرو کسی بات کی پروا کیے بغیر مزار پر پہنچ گئے۔ انہوں نے اپنے کپڑے پھاڑ ڈالے، منہ پر سیاہی مل لی اور یہ شعر پڑھا۔

گوری سوئے سیج پر مکھ پر ڈارے کیس

چل خسرو گھر اپنے سانجھ بھئی چودیس

(محبوب اپنے چہرے پر زلفیں ڈالے سو رہا ہے۔ اے خسرو ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔ شام ہو چکی ہے، اب تو اپنے گھر چل)

خسرو ہر ایک سے یہی کہتے پھر رہے تھے کہ اب میں زیادہ دنوں تک زندہ نہیں رہوں گا، بہت جلد چلا جاؤں گا۔

چنانچہ 18 شوال 725 ہجری کو یہ آفتاب ڈوب گیا۔

آپ کے عقیدت مندوں نے کوشش کی کہ انہیں محبوب الٰہی کے پہلو میں دفن کیا جائے مگر اس بار پھر مزار کے متولی نے ان سب کو روک دیا اور کہا۔ ''میں ایسا اس لیے نہیں ہونے دوں گا کہ آگے چل کر ان دونوں مزاروں کی پہچان تک مشکل ہوجائے گی۔''

آخر خسرو کو ان کے پیر و مرشد کے پائنتی دفن کردیا گیا۔

امیر خسرو کا مزار چوڑائی میں بیس فٹ سات انچ لمبائی میں اٹھائیس فٹ چھ انچ کے ایک قطعہ پر واقع ہے۔ احاطے کی دیوار سرخ پتھر کی بنی ہوئی ہے۔ احاطے کا فرش سنگ مرمر کا ہے۔

کہتے ہیں خسرو کے پیر و مرشد حضرت محبوب الٰہی کے عرس کا افتتاح آج بھی خسرو کے اس شعر سے ہوتا ہے۔

گوری سوئے سیج پر مکھ پر ڈارے کیس
چل خسرو گھر اپنے سانجھ بھئی چودیس

خسرو کی تصانیف کی تعداد بیالیس بتائی جاتی ہے۔

صوفی، عاشق، مصنف، شاعر، ماہر موسیقی، کہہ مکرنیوں، پہیلیوں کے موجد، نسبتوں کے باوا آدم، بہت ساری زبانوں کے عالم، منتظم، کئی سازوں کے موجد، خسرو کی معلوم نہیں کتنی حیثیتیں تھیں۔ ان کا احاطہ کرنا بہت مشکل ہے۔

کہہ مکرنیاں

برسا برس وہ دیس میں آوے منہ سے منہ لگا رس پیاوے
واخاطر میں خرچے دام اے سکھی ساجن نہ سکھی آم (آم)

☆☆☆

میں پڑی تھی اچانک چڑھ آیو جب اترو تو پسینا آیو
سہم گئی مکھ سے کچھ نہ پکار اے سکھی ساجن نہ سکھی بکھار (بخار)

☆☆☆

لپٹ لپٹ کے وا کے سوئی چھاتی سے پاؤں لگا کے روئی
دانت سے دانت بجے تو تاڑا اے سکھی ساجن نہ سکھی جاڑا (جاڑا)

☆☆☆

وہ آوے تو شادی آوے اس بن دوجا اور نہ کوئے
میٹھے لاگے وا کے بول اے سکھی ساجن نہ سکھی ڈھول (ڈھول)

☆☆☆

پہیلیاں

سب کوئی اس کو جانے ہے پر ایک نہیں پہچانے ہے
آٹھ دھڑی میں لیکھا ہے فکر کیا، ان دیکھا ہے (خدا)

☆☆☆

جل کر بنے جل میں رہے آنکھوں دیکھا خسرو کہے (کاجل)

☆☆☆

بالا تھا جب سب کو بھایا بڑا ہوا کچھ کام نہ آیا
خسرو کہہ دیا اس کا ناؤں بوجھے نہیں تو چھوڑو گاؤں (دیا)

☆☆☆

سُن سکھی بابل مورے اور اماں میری، ابا کو بھیجوری کہ ساون آیا...... جیسے مشہور زمانہ گیت بھی خسرو ہی کے ہیں۔

ماخذات

تاریخ فیروز شاہی، ضیاء الدین برنی۔ افضل الفوائد، امیر خسرو۔ تاریخ فرشتہ، محمد قاسم فرشتہ۔ حیات امیر خسرو، تقی محمد خورجوی۔ خسرو شیریں بیاں، اقبال صلاح الدین۔ بزم مملوکیہ، سید صباح الدین عبدالرحمٰن۔

مانوس اجنبی

فرحت جمیلہ

بعض اوقات نادانستگی میں سرزد ہوجانے والی غلطی ایسی بدنامی کا سبب بن جاتی ہے جس کی قید سے فرار ممکن نہیں ہوپاتا... وہ بھی ایک ایسی ہی اذیت میں مبتلا تھا جس میں اس کے ارادے کا کوئی دخل نہ تھا اور دیارِ غیر میں بھی غیروں کی مداخلت نے اس کی زندگی کا چراغ گل کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی... لیکن قسمت کا دھنی وہ مانوس اجنبی کچھ دلوں پر اس طرح راج کر بیٹھا جیسے وہ اس کی اپنی زندگی کا حصہ ہو اور کوئی اپنی زندگی ختم کرنے کا نہیں سوچ سکتا۔

آخری دنوں کی دھوپ میں محبت کا سائبان پانے والے ایک مسافر کی روداد

توپ کا گولہ میرے کمرے کے دروازے سے ٹکرایا اور اندر آگیا۔ وہ بیرن تھا جو نیوٹن کے چھوٹے سے قصبے کے واحد اخبار "نیوٹن ٹائمز" کا سبھی کچھ ہے۔ پرنٹر، پبلشر، ایڈیٹر اور دخل در معقولات کے لیے رپورٹر بھی۔ چنانچہ شہرت کے اعتبار سے لوگ اسے نیک نام سمجھتے ہیں تو کچھ بدنام...... مگر بہر صورت وہ قصبے کا اہم فرد تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس کی ایک سنسنی خیز خبر گھنٹے بھر میں بچے سے بوڑھے تک پہنچ جاتی ہے۔ حقیقت جاننے کے لیے لوگ بیرن سے رجوع کرتے ہیں، اسے فون کرتے ہیں یا اس سے ملنے جاتے ہیں اور وہ بے حد اہمیت اختیار کرلیتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ جب وہ اس طوفانی انداز میں اندر آیا تو میں سمجھ گیا کہ اگر کہیں کچھ ہوا نہیں ہے تو ہونے والا ہے۔

"یہ دیکھو!" ہیرن نے ایک اخبار میرے سامنے پٹخ کر کرسی گھسیٹی اور بیٹھتے ہی دروازے کی طرف منہ کر کے "کافی" کی صدا لگائی پھر اس نے اخبار میں ایک خبر پر انگلی رکھ دی۔ وہ اخبار نیویارک سے شائع ہوتا تھا۔

"پولیس کیا کر رہی ہے؟" ہیرن نے یہ آوازِ بلند پڑھنا شروع کیا۔ خبر کا خلاصہ یہ تھا کہ گزشتہ کئی برسوں میں ملک بھر کی پولیس اور ایف بی آئی مل کر بھی چند سنگین قسم کے جرائم کا کوئی سراغ نہیں لگا سکے تھے۔ مجرم تا حال روپوش ہیں اور یہ نااہلی کی انتہا ہے جس پر ٹیکس ادا کرنے والوں کو متعلقہ حکام سے یہ سوال کرنے کا حق حاصل ہے کہ یہ...... وغیرہ وغیرہ...... مثال کے طور پر رپورٹر نے چار افراد کی تصویریں شائع کی تھیں جو چار مختلف وارداتوں میں ملوث تھے اور بقول رپورٹر پولیس کی آنکھوں میں دھول جھونک کر فرار ہو گئے تھے۔ وہ اب تک بلا خوف و خطر دندناتے پھر رہے ہیں۔ بات اتنی تھی کہ فارغ اوقات میں رپورٹر موصوف نے پرانی فائلوں کی ورق گردانی کی اور گڑے مردے اکھاڑتے اکھاڑتے چار ایسے کیس نکال لیے جن سے ایک سنسنی خیز فیچر ترتیب دے دیا۔ وہ برائے عامہ کو چونکانے اور پولیس کو رسوا کرنے کے لیے کافی تھے۔ رائی کا پہاڑ بنانا کوئی مسئلہ نہیں بشرطیکہ رائی دستیاب ہو جائے۔

"کیا؟" ہیرن نے میری تفصیلی رائے کے بعد میز پر مکا مارا اور ساری کافی شربت کی طرح حلق سے اتار لی۔ "یہ سب اس رپورٹر نے سستی شہرت کے لیے کیا ہے؟ سام! تمہاری عقل اور نظر دونوں کی حالت پر مجھے رونا آتا ہے اگر میں تمہارا چیف ہوتا تو ابھی اسی وقت کہتا کہ چلو پنشن لو اور چھٹی کرو۔ ارے بھائی! یہ تصویر دیکھو، عینک کدھر ہے تمہاری؟ کون ہے یہ؟ پہچانو ذرا!"

میں نے اس تصویر کو غور سے دیکھا جس پر ہیرن نے انگلی رکھی تھی۔ صورت یقیناً جانی پہچانی لگتی تھی مگر ذہن میں کچھ بھی نہیں آ رہا تھا کہ اس احساس کی بنیاد کیا ہے؟ پرانے ریکارڈ سے نکالی ہوئی تصویر ہو بہو ایسی نہیں ہو سکتی تھی کہ میں دیکھتے ہی پہچان لیتا۔

"سنو!" ہیرن نے بے اختیار چیختے ہوئے کہا۔ "پانچ سال قبل جان کانگو نام کا ایک شخص برک لین میں ایک بینک کا اسسٹنٹ کیشیئر تھا۔ وہ دس لاکھ ڈالر لے کر فرار ہو گیا تھا۔ یہ غبن اس نے اس کامیابی کے ساتھ کیا کہ بینک والے منہ دیکھتے رہ گئے اور اس دن سے اب تک پولیس بغلیں جھانکتی پھر رہی ہے۔" اس نے ایک سانس میں خبر مع تبصرہ پڑھ دی تھی۔ ایک گہری سانس لے کر اس نے کہا۔ "مائی ڈیئر پولیس چیف! غور سے دیکھو یہ نیڈ گاربر ہے!"

میں اچھل پڑا۔ پولیس کے محکمے کی طویل ملازمت میں، میں ہر طرح کے متوقع اور غیر متوقع واقعات سے دوچار ہو چکا تھا۔ اگر یہ اطلاع ملتی کہ ایک عورت کے چار شوہر تھے جن کو اس نے بیک وقت دارِ فانی سے رخصت کر دیا تو میں کہتا اچھا پھر......؟ لیکن یہ بات ناقابلِ یقین ہی نہیں، جھوٹی بھی لگتی تھی کہ وہ تصویر نیڈ گاربر کی ہے۔ "تم پاگل ہو گئے ہو!" میں نے کہا۔

"ہاں! ہم سب پاگل ہیں کہ ہمارے درمیان ایک مجرم موجود ہے اور ہم اسے عزت سے کندھوں پر اٹھائے پھر رہے ہیں۔" ہیرن نے کہا۔

"ہیرن! تصویر کی مشابہت نے اگر تمہارے ذہن کے چھکڑے کو پٹری سے اتار دیا ہے تو دماغ صرف تمہارا خراب ہوا ہے۔" میں نے کہا۔ "یہ دیکھو کہ باقی تین میں سے کسی کی صورت مجھ سے تو نہیں ملتی۔ ایک ساتھ چلیں ہم سب۔"

"تم کو اس عمر میں تو سنجیدہ ہو جانا چاہیے۔ یہ دیکھو کہ میں مذاق کے موڈ میں بالکل نہیں ہوں۔" ہیرن نے برا مانتے ہوئے کہا۔ "مجھے معلوم ہے نیڈ گاربر ہمارے قصبے کا بے حد معتبر، قابلِ احترام، ہردلعزیز شہری ہے۔ تمہارا ہی نہیں میرا بھی دوست ہے اور ہمارا کیا، وہ تو سب ہی کا دوست ہے۔ مگر کیا اس سے حقیقت بدل سکتی ہے؟"

میں نے ایک بار پھر تصویر کو غور سے دیکھا۔ ہیرن کی بات شبہے سے بالاتر تھی۔ وقت نے اور فراغت کی زندگی نے گاربر کو صرف اس حد تک بدلا تھا کہ اب اس کا وزن دو سو پونڈ تھا اور تصویر میں نظر آنے والا مجرم جان کانگو دبلا پتلا آدمی تھا۔ مجرم جان کانگو کے چہرے پر مونچھیں نہیں تھیں مگر گاربر کے صحت مند چہرے پر گھنی مونچھیں روزِ اول سے موجود تھیں۔ روزِ اول سے میری مراد اس دن سے ہے جب تین چار سال قبل وہ ہمارے قصبے میں وارد ہوا تھا۔ آہستہ آہستہ اس کا وجود نمایاں ہونے لگا تھا اور اس نے اپنی خوش مزاجی، فراخ دلی اور دوستانہ طبیعت سے قصبے کے لوگوں کو اپنا گرویدہ بنا لیا تھا۔ چنانچہ اب اس کے دوست بچے بھی تھے جن کو وہ بتاتا تھا کہ مچھلی پکڑنے کے لیے کانٹا کیسے ڈالنا چاہیے اور جب وہ چھوٹے چھوٹے بچوں میں گھرا ہوا بچوں جیسی باتیں کر کے یا ان کو خوش کر کے خوش ہوتا تھا اور انہیں ہنسا ہنسا کر ہنستا تھا تو یوں لگتا تھا جیسے گلیور سفر کرتے کرتے بونوں کی دنیا میں پہنچ گیا

ہے مگر وہی گاربر بوڑھوں میں بیٹھ کر جنگ عظیم سے پہلے کی باتیں کرتا تھا تو ان کا ہم عصر ہو جاتا تھا اور جب نوجوانوں کو نازنینوں کے دل جیتنے کے گر سکھاتا تھا اور آداب عشق کی تعلیم دیتا تھا تو نوجوان نظر آتا تھا۔ اس کے بلند قہقہے محفلوں کی جان تھے اور ہر سماجی تقریب میں اس کی شرکت لازمی تھی۔ وہ تنہا تھا اور اس کے مشاغل کھانے پینے یا سونے، تفریح کی غرض سے شکار کرنے یا مچھلیوں کو پکڑنے اور لوگوں سے میل ملاقات کے سوا کچھ نہ تھے۔ گاربر کی زندگی کا ہر لمحہ ایک کھلی کتاب کی طرح سب کے سامنے تھا۔ چنانچہ میرا بیرن سے اتفاق نہ کرنا ایک فطری امر تھا۔

"تم اپنی صحافت کی دکان چمکانا چاہتے ہو تو مجھے اس میں کیوں گھسیٹتے ہو۔" میں نے کہا۔

"اس لیے کہ تحقیق و تفتیش کر کے مجرم کو پکڑنا تمہارا کام ہے، میرا نہیں ہے!" بیرن نے برہمی سے کہا۔

"تحقیق کس لیے، تفتیش کس بات کی؟" میں نے بھی سخت لہجے میں کہا۔ "تصویر کی اس مشابہت کو میں دستاویزی ثبوت تسلیم کروں اور گاربر کو ہتھکڑی لگا دوں...... دنیا میں درجنوں افراد کی صورتیں ملتی ہیں۔"

"میں صرف تفتیش کے لیے کہہ رہا ہوں۔" بیرن نے عادتاً میز پر مکا مارا۔ "آخر تم تفتیش سے پہلو تہی کیوں کر رہے ہو؟ کیا اس لیے کہ گاربر تمہارا دوست ہے؟ تم عدم اعتماد کا شکار ہو؟ میں کہتا ہوں کیا کسی کو کچھ بتائے بغیر حقیقت جاننے کی کوشش کرنے میں کوئی حرج ہے؟ نہ جانے کتنی بار تم نے محض شبہے کی بنا پر جھک ماری ہوگی اور نتیجہ کچھ نہیں نکلا ہوگا یا تمہاری توقعات کے برعکس نکلا ہوگا۔ فرض کرو یہ بھی ایسا ہی کیس ہے۔ زیادہ سے زیادہ میری...... میرا مطلب ہے اس تصویر سے گاربر کے تعلق کی بات غلط ثابت ہو جائے گی؟ ہونے دو۔ تمہارا کیا جاتا ہے۔" اس نے ایک گہرا سانس لیا اور اس غبارے کی طرح بیٹھ گیا جس کی ہوا نکل گئی ہو۔

"تمہاری تحقیقات مکمل ہونے تک میں اپنی زبان بند رکھوں گا۔" بیرن نے خاموشی کے طویل وقفے کے بعد قطعی بدلے ہوئے لہجے میں کہا۔ "لیکن خدانا خواستہ یہ بات درست ثابت ہوئی تو تمہیں یہ الزام لگانے کا حق حاصل نہیں ہوگا کہ میں صحافت کی دکان چمکا رہا ہوں۔ یہ دکانداری ہے تو اس کو چمکانے کی کوشش کرنے میں اخلاق یا قانون کے کسی اصول کی خلاف ورزی نہیں ہوتی۔ یہ میرا پیشہ ہی نہیں، فرض بھی ہے سام کہ اصل چہرے بے نقاب کروں۔ تمہارا بھی تو یہی کام ہے!"

میں اخبار اپنے سامنے رکھ کر بیٹھا رہا۔ گزشتہ کئی برس کی رفاقت کے ان گنت لمحے میری راہ میں دیوار چنتے جا رہے تھے۔ کتنی بار ہم اکٹھے جھیل کے کنارے بیٹھے گپ لگاتے رہے تھے۔ کتنی بار وہ میرے گھر کے برآمدے میں کرسی پر نیم دراز بیٹھا رہا تھا اور ہم نے چاندنی کے اجالے میں ایک ساتھ کھانا کھایا تھا اور ٹھنڈی بیئر کا لطف اٹھایا تھا۔ کتنی بار میں نے اس کے گھر کی بالکونی سے بادلوں کو جھیل پر برستے دیکھا تھا اور رات کو اسی کے گھر سو گیا تھا۔ ابھی چند روز پہلے اس نے مجھ سے کہا تھا۔ "سام! شاید تمہاری خواہش پوری ہونے کا وقت آ گیا ہے، آئرین نے مجھے قبول کر لیا ہے!" پھر وہ ہنسا تھا۔ "بالآخر میں نے پتھر کو موم کر لیا ہے۔" اور میں نے پورے خلوص اور نیک نیتی کے ساتھ کہا تھا۔

"گاربر! تمہارا سونا گھر تم سے زیادہ مجھے کاٹنے کو دوڑتا ہے لیکن دیر میں بھی قدرت کی مصلحت تھی۔ تمہیں آئرین جیسی بیوی اور اسے تم جیسا شوہر ملنا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ خوش نصیب کسے کہوں......!" گاربر نے ہنستے ہنستے اپنے ماضی کا ایک ورق الٹ دیا جس پر وہی لکھا تھا جو آئرین کی زندگی کا المیہ تھا۔

"ہم دونوں تو ایک جیسے بدنصیب ہیں سام! میری بیوی شادی کے چار ماہ بعد مر گئی تھی تو آئرین کا شوہر دوسرے مہینے ہی داغ مفارقت دے گیا تھا۔" میں نے بات کا رخ فوراً بدل دیا تھا۔

"فکر مت کرو، دو منفی مل کر مثبت ہو جاتے ہیں۔ تم دونوں ایک دوسرے سے پہلے ہرگز نہیں مرو گے۔ یہ انتظار کرتے کرتے سنچری مکمل کر لو گے کہ ایک رخصت ہو تو دوسرا ابھی رخت سفر باندھے۔"

"سام!" بیرن نے پھر کمرے کی بوجھل فضا کو ختم کیا۔ "تمہیں کچھ معلوم ہے گاربر کہاں سے آیا تھا؟"

مجھے معلوم تھا بیرن یہ سوال ضرور کرے گا کیونکہ خود میرے ذہن میں جنم لینے والا پہلا سوال یہی تھا۔ تین چار سال قبل گاربر اجنبی کی حیثیت سے وارد ہوا تھا۔ "مجھے صرف ماہ و سال یاد ہیں مئی 1953ء۔" میں نے کہا۔ "ابتدائی چند مہینے اس نے آئرین کے مہمان کی حیثیت سے گزارے تھے۔ اس مہمان خانے میں چار کمرے مستقل رہنے والوں کے لیے وقف تھے اور دو خود آئرین کے مصرف میں تھے۔ ان مہمانوں سے طعام و قیام کا معاوضہ وصول کر کے آئرین اپنے اخراجات پورے کرتی تھی۔ شوہر نے اس کے لیے یہی ذریعہ معاش چھوڑا تھا جس

سے اس کی گزراوقات آسانی سے تو نہیں مگر عزت آبرو کے ساتھ ہو رہی تھی۔ وہ کسی کی دستِ نگر نہیں تھی۔ گاربر جو گھومتا پھرتا نیوٹن آ پہنچا تھا، جب اس قصبے میں رکا تو یہیں کا ہو گیا۔ بقول اس کے نیوٹن میں حسنِ قدرت کی فراوانی تھی۔ چنانچہ گاربر جو پہلے ہی اجنبی تھا اب نیوٹن میں اتنا ہی معزز اور محترم تھا جتنے قصبے کا جدی پشتی ممبر......!"

"بیرن!" میں نے مزید کہا۔ "تم تو جانتے ہو، وہ کتنا اچھا آدمی ہے۔"

"ہاں......مگر اب وہ اچھا بن گیا ہے تو کیا ہوا؟" بیرن نے کہا۔ "ہوسکتا ہے اس کے ماضی پر شرافت کا یہ پردہ محض فریب نظر ہو۔"

"نہیں تم نہیں جانتے وہ......سچ مچ فرشتہ ہے۔" میں نے کہا۔ "آدمی اپنا ظاہر جیسا چاہے بنالے، اس کا باطن چھپا نہیں رہ سکتا۔ اندر کا آدمی کب تک نظروں سے اوجھل رہ سکتا ہے۔ بیرن! اداکاری سے وہ کتنے لوگوں کو کب تک بے وقوف بنانے میں کامیاب ہوسکتا ہے۔ دو چار دن...... دو چار ہفتے......مگر اب تو کئی سال ہو چکے ہیں اور تمہیں ایک راز کی بات بتاؤں، اس نے اپنی تمام دولت فلاحی کاموں کے لیے وقف کی ہے۔ میں نے یہ وصیت نامہ دیکھا ہے اور اس پر گواہ کی حیثیت سے دستخط بھی کیے ہیں۔ ایک لاکھ ڈالرز قصبے میں اسپتال کی توسیع کے لیے، پچاس ہزار ڈالرز اسکول اور لائبریری کے لیے، ایک لاکھ ڈالرز سے ایک ٹرسٹ قائم ہوگا جس کی آمدنی سے ہر سال دو ذہین بچوں کی اعلیٰ تعلیم کے اخراجات پورے کیے جائیں گے اور دو مستحق افراد کو وظیفہ دیا جائے گا!"

بیرن حیرت سے منہ کھولے بیٹھا تھا۔ "اتنا پیسا کہاں سے آ گیا اس کے پاس؟"

"اس نے اپنا کارخانہ بیچ دیا تھا جو اسے ورثے میں ملا تھا۔" میں نے کہا۔ "لکڑی چیرنے کا کارخانہ، کینیڈا میں کوئی جگہ ہے ایکس منسٹر! وہاں شیشم کے جنگلات ہوتے ہیں۔ گاربر کو کچھ زمین ورثے میں ملی تھی، جس پر شیشم کے درخت تھے مگر بعد میں وہاں یورینیم کی موجودگی کے آثار ملے تو زمین کے دام ایک دم چڑھ گئے اور کسی نے وہ زمین منہ مانگے معاوضے پر خرید لی تاکہ شیشم کے جنگل صاف کر کے یورینیم نکالا جائے۔"

"بظاہر تو کہانی ٹھیک ہے۔" بیرن نے پُرسوچ لہجے میں کہا۔ "لیکن سوچے سمجھے بغیر ہر بات کو مان لینا بھی تو غلط ہے۔"

"مجھے یقین ہے گاربر جھوٹ نہیں بولتا۔" میں نے کہا۔

"بات تمہارے یقین کی نہیں ہے سام!" بیرن نے سمجھاتے ہوئے کہا۔ "شبہے کو پالنے کے بجائے اس کے وجود کو ختم کر دینا بہتر ہوتا ہے، ورنہ سرطان کی طرح اس کا زہر پھیلتا جاتا ہے۔ زیادہ تردد کی ضرورت نہیں، ٹیلی فون اٹھاؤ اور ایکس منسٹر کی پولیس سے تصدیق کرلو۔ برک لین کے اس بینک سے بات کرلو جہاں یہ دس لاکھ ڈالرز کے ضمن کی واردات ہوئی تھی اور اپنے طور پر گاربر سے بھی پوچھ لو۔ اس طرح کہ وہ برا نہ مانے، اسے بالکل احساس نہ ہو کہ چکر کیا ہے۔"

بیرن نے میرے لیے فرار کے تمام راستے بند کر دیے تھے۔ ذہنی طور پر میں بیرن کی تجسس پسند فطرت کو سخت ناپسند کرتا تھا۔ میں نے بڑی مشکل سے بیرن کو آزین کے گاربر سے تعلق کا اسکینڈل بنانے سے روکا تھا۔ میں نے کہا تھا۔ "دیکھو بیرن! آزین بڑی مظلوم اور دکھی عورت ہے۔ شوہر کی موت کے بعد وہ کیا نہیں کرسکتی تھی مگر اس کے بارے میں تم نے کبھی کسی کی زبان سے کوئی بات سنی؟ گاربر اگر اس سے شادی کرلیتا ہے تو اس رشتے سے دو افراد کی خزاں رسیدہ زندگی میں بہار آجائے گی اگر تم کچھ اور نہیں کرسکتے تو خاموش ہی رہو تاکہ ان کی ازدواجی زندگی پر کسی رسوائی کا داغ نہ آئے اور یوں بھی کون نہیں جانتا کہ گاربر بالکل نیک نیتی کے ساتھ آزین کو شریکِ حیات بنانا چاہتا ہے۔ اس راز کو افشا کرنے سے کوئی افسانہ نہیں بنے گا۔ لوگ چاہتے ہیں کہ آزین اور گاربر کی تنہا زندگی سے اداسی اور ویرانی رخصت ہوجائے۔"

"ٹھیک ہے بیرن!" میں خیالات کے سلسلے سے باہر نکلا اور غیر جذباتی سپاٹ لہجے میں کہا۔ "میں اپنے فرض کی کوتاہی کا مجرم نہیں بنوں گا!" انٹرکام کا بٹن دبا کر میں نے اپنی سیکریٹری اور ٹائپسٹ اینی سے کہا کہ وہ کینیڈا میں ایکس منسٹر کے قصبے کی پولیس سے میری بات کرائے۔ آدھے گھنٹے بعد اینی کی آواز سنائی دی......

"چیف! کینیڈا میں اس نام کا کوئی قصبہ نہیں ہے، میں نے اچھی طرح تصدیق کرلی ہے۔"

میں چند سیکنڈ تک احمقوں کی طرح بیٹھا رہا۔ بیرن کی مسکراہٹ مجھے زہر لگ رہی تھی لیکن حقیقت اپنا وجود تسلیم کرانے پر مصر تھی۔

"اچھا اینی......!" میں نے کہا۔ "برک لین بینک کے کسی ذمے دار افسر سے میری بات کراؤ۔"

بیس منٹ بعد مسٹر ڈگلس نے مجھ سے فون پر بات

کی۔ وہ اب اس بینک کے منیجر ہو گئے تھے۔

"جان کانگو، گیارہ سال تک میرا ماتحت رہا ہے۔" مسٹر ڈگلس نے کہا۔ "میں اسے دیکھتے ہی شناخت کرلوں گا۔ میں کل پہلی ٹرین سے نیوٹن روانہ ہو رہا ہوں۔"

"چیف!" بیرن نے کہا۔ "اس سے پہلے تم اپنے طور پر گاربر سے بہت کچھ پوچھ سکتے ہو۔ خود اسے موقع دو کہ وہ اپنے ماضی کی کتاب سے وہ باتیں بتادے جو کسی نے اب تک نہیں سنیں!"

"اسے شبہ ہو گیا تو تمہاری ساری تگ و دو رائگاں چلی جائے گی۔" میں نے کہا۔ "وہ یہاں سے بھی غائب ہوسکتا ہے!"

"شبہ ہونے کا کوئی سوال نہیں۔" بیرن نے کہا۔ "میں خود تمہارے ساتھ چلوں گا۔ میں نے اپنے اخبار میں نیوٹن کے معزز شہریوں کے انٹرویوز اور حالاتِ زندگی شائع کیے ہیں۔ میں کہہ سکتا ہوں کہ یہ بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے کہا۔ "کل صبح کسی وقت آجاؤ۔" میں نے ٹالتے ہوئے کہا۔ بیرن نے فاتحانہ انداز میں مصافحہ کیا اور رخصت ہو گیا۔

اگلے دن میری گاربر سے ملاقات نہیں ہوئی۔ عمداً میں نے اس سے آمنا سامنا ہونے کی صورت ہی نہیں پیدا ہونے دی کہ کہیں میرے رویے کی کوئی غیر شعوری تبدیلی میری ذہنی کیفیت کا راز فاش نہ کردے۔ یا نادانستگی میں دل کی بات زبان پر نہ آجائے۔ بیرن نے میری مشکل آسان کردی تھی، ورنہ میرے لیے اس فرض کی ادائیگی کا تجربہ انتہائی ناخوشگوار ہوتا۔ اگر کوئی اور مجرم ہوتا تو اس کی نشاندہی پر میں بیرن کا شکر گزار ہوتا مگر اب مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے بیرن نے مجھ پر ظلم کیا ہے۔ اعتماد کے آئینے میں بال پڑ گیا تھا اور سنگِ الزام اٹھانے والا ہاتھ بیرن کا تھا لیکن حقیقت سے پہلو تہی میرے اختیار کی بات نہیں تھی۔

گاربر اپنے گھر کے باہر جھیل کے کنارے تک پھیلے ہوئے لان پر دراز تھا، اور نیلے آسمان سے اترنے والی روپہلی دھوپ کو آئرین کے گلابی رخساروں پر پھیلتے دیکھ رہا تھا۔ چاہت کا اقرار، پیمانِ وفا، مستقبل کے خواب اور اندیشے کہ یہ سب پھر بے ثمر خواہشات کا فریب نہ ہو اور زخم جو وقت کی چارہ گری نے مندمل کردیے ہیں، کہیں پھر سے ہرے نہ ہو جائیں۔ یہ سارے جذبے آئرین کے چہرے پر عیاں تھے۔ قناعت و آسودگی، نیک نیتی اور بے غرض و بے ریا محبت کے جذبے گاربر کے چہرے پر مسکرا رہے تھے۔ یہ بڑا خوبصورت اور رنگین منظر تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے میں شیطان ہوں اور کسی کی جنت میں سانپ بن کر مسرتوں کو ڈسنے کے لیے داخل ہو رہا ہوں۔

"ہیلو!" گاربر نے خوش دلی سے کہا۔ "میں آج تک طے نہیں کرسکا کہ تم دونوں دوست ہو یا دشمن! آؤ بیٹھو، بیئر پیو۔" اس نے ہمیں گھاس پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ بیئر کی بوتلیں برف سے بھری ہوئی بالٹی میں رکھی تھیں۔

"میں اب چلتی ہوں!" آئرین نے گھڑی دیکھ کر کہا۔ بالکل نوعمر لڑکیوں کی طرح جو چوری چھپے ملتے ہوئے پکڑی جائیں، وہ نروس ہو گئی تھی۔ حالانکہ ان کے معاملات کسی سے پوشیدہ نہ تھے اور وہ خود بھی یہ بات جانتے تھے۔ آئرین کی کار چلی گئی، ہم نے اپنا اپنا مگ منہ سے لگالیا اور سرور آمیز ٹھنڈک کو حلق سے اتارلیا تو بیرن نے اپنا مدعا بیان کیا۔

"نیوٹن کے رہنے والوں کو گاربر دی گریٹ کے شاندار ماضی، حال اور مستقبل سے متعارف کرانے کا سہرا میں اپنے سر باندھنا چاہتا ہوں۔ دنیا کے سب سے بڑے اخبار کا سب سے بڑا ایڈیٹر۔"

گاربر قہقہہ مار کر ہنسا۔ "نیوٹن کے لوگ مجھے مجھ سے بہتر طور پر جانتے ہیں اور میں حقیر فقیر سا شخص ہوں، مجھے گوشۂ گمنامی میں رہنے دو۔ یہ فیچر اور انٹرویو ہوتے ہیں وی آئی پی قسم کے لوگوں کے لیے۔"

"کامیاب لوگوں کا ماضی، دوسرے لوگوں کے لیے مستقبل کی راہنمائی کرتا ہے۔" بیرن نے کہا۔ "تم تو یوں کترا رہے ہو جیسے خدانخواستہ تمہارا ماضی تمہارے لیے باعثِ شرم ہے اور تم اس پر پڑے ہوئے پردے ہٹانے سے ڈرتے ہو!"

بات بیرن نے مذاق میں کہی تھی، مگر گاربر کے چہرے کے تغیرات میرے لیے حیرت کا باعث بن گئے۔ تردد، خوف اور شکوک کے سائے چند لمحوں میں اس کے چہرے پر سے گزر گئے۔ پھر اس نے خود کو سنبھال لیا اور ہنسا۔ مگر مجھے نہ جانے کیوں یہ ہنسی کھوکھلی لگی۔

"تم اخبار والے ہو۔" گاربر نے کہا۔ "میں انکار کروں گا تو تم میرا ایک ماضی ایجاد کرلو گے اور زبردستی مجھ سے منسوب کردو گے، تو میرے لیے تردید ناممکن ہو جائے گی۔ بہتر ہے میں خود بتادوں۔ پوچھو کیا پوچھنا چاہتے ہو۔"

بیرن کے سوالوں کے جواب میں گاربر نے جو کچھ بتایا، اس کا خلاصہ یہ تھا کہ وہ کینیڈا کے شہر انٹاریو کے قریب

چھوٹے سے قصبے ایکس منسٹر میں پیدا ہوا، پلا اور بڑھا تھا۔ باپ نے کچھ زمین ورثے میں چھوڑی تھی، جس پر شیشم کے جنگلات تھے اور درختوں کی لکڑی چیرنے کے لیے ایک کارخانہ تھا جو اس نے چند سال قبل خاصے منافع پر فروخت کردیا کیونکہ ارضی تحقیقات کرنے والوں کو اس علاقے میں یورینیم کی موجودگی کا شبہ ہوگیا تھا۔

''میں نے سارا سرمایہ سمیٹا اور باپ دادا کا گھر چھوڑ کر خدا کی بنائی ہوئی دنیا دیکھنے نکل کھڑا ہوا۔ جسے فکرِ معاش نہ ہو، وہ اور کیا کرے گا۔'' گاربر نے سکون سے اپنی بات جاری رکھی اور وقفے وقفے سے بیئر کے گھونٹ لیتا گیا۔

''کنویں سے نکل کر مینڈک کی جو حالت ہوتی ہے، وہی حالت میری اپنے آبائی گاؤں سے نکل کر ہوئی تھی۔ دنیا کی وسعت نے مجھے وحشت زدہ کردیا۔ یہ دنیا میرے تصور سے کہیں زیادہ بڑی ثابت ہوئی اور میں نے سوچا اگر زندگی کے بقیہ دن میں نے دوڑتے ہوئے گزار دیے، تب بھی میں دنیا کا عشرِ عشیر نہ دیکھ سکوں گا۔ پھر میں یہاں پہنچا۔ اس وقت تک کینیڈا اور امریکا کی خاک چھانتے مجھے چند مہینے ہی ہوئے تھے لیکن میں اتنا تھک گیا تھا کہ آرام کی ضرورت ہر خواہش پر غالب آچکی تھی۔ یہاں قدرت کے حسن کی فراوانی تھی جس نے میرے قدم پکڑ لیے۔ یہ سب تقدیر کے کھیل ہیں۔ میں کس ارادے سے نکلا تھا اور کہاں آپہنچا۔ نیوٹن کا نام تو میں نے پڑھا تھا مگر وہ سائنس دان تھا، یہ آئرین کا نیوٹن تھا جہاں پہنچ کر میرے سفر کو تمام ہونا تھا یہاں حسن قدرت کا دوسرا شاہکار آئرین کی محبت تھی جو میرے پاؤں کی زنجیر بن گئی۔ اس کے بعد میں کہاں جاسکتا تھا۔ میری جگہ تم ہوتے تو شاید اتنے ہی بے بس ہوجاتے۔'' وہ مسکرایا۔

''اب تک زندگی کا سفر تم نے اکیلے کیوں کیا گاربر؟'' بیرن نے سوال کیا۔

''میں نے ایک شریکِ سفر کا انتخاب کیا تھا۔'' گاربر نے خلا کی وسعت میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ''ستائیس سال کی عمر میں وہ لڑکی مجھے مل گئی تھی جو میرے تصورات کا پیکر تھی۔ میں نے فوراً اس سے شادی کرلی مگر قسمت بڑی ستم ظریف ہے۔ ہنی مون کی چاندنی کو زوال بھی نہ آیا تھا کہ اس کی زندگی کا آفتاب غروب ہوگیا۔ احساسِ محرومی و بدنصیبی نے ساری امنگوں کو بے حسی کا کفن پہنا دیا۔ پہلے میرا خیال تھا کہ میں اس صدمے سے جانبر نہ ہوسکوں گا لیکن آدمی بڑا سخت جان اور خودغرض ہوتا ہے۔ میں زندگی سے چمٹا رہا۔ شاید وقت کی گردش کے آگے سب بے بس ہیں۔ آئرین کو اور مجھے حالات اور حادثات کے بعد ملنا تھا۔''

''تمہارے خاندان کے دیگر افراد کہاں ہیں؟ بھائی بہن وغیرہ!'' بیرن نے کہا۔

گاربر نے آسمان کی طرف انگلی اٹھائی۔ ''تمہارے سوال کا صحیح جواب تو یہ ہے کہ دنیا میں میرا کوئی نہیں مگر میرے نقطۂ نظر سے صحیح جواب یہ ہوگا کہ ساری دنیا میری ہے اور میں ساری دنیا کا ہوں۔''

بیرن نے شارٹ ہینڈ میں لکیروں کی مدد سے یہ جواب لکھا۔ ''زندگی میں اور بھی تجربات ہوئے ہوں گے؟''

گاربر نے نفی میں سر ہلایا۔ ''جنگِ عظیم میں، میں فرانس کے محاذ پر تھا مگر اس کی نشانی نہ کوئی زخم ہے نہ میڈل۔ وہاں بھی میں گمنام سپاہی رہا اور ہیرو بن کر نہیں لوٹا۔ میرے پاس تو شجاعت کی کوئی داستان تک نہیں!''

''کام تو تم کچھ نہیں کرتے۔'' بیرن نے بالآخر وہ سوال کیا جس کا مجھے انتظار تھا۔ ''ظاہر ہے تمہارا اندوختہ تمہاری کفالت کرتا ہے۔ کیا تم یہ بتانا پسند کرو گے کہ عیش و آرام کی اس زندگی کا ضامن سرمایہ کتنا ہے؟''

گاربر ہنسا۔ ''میں اتنا سادہ لوح نہیں ہوں ڈیئر صحافی! اس سوال کا گول مول جواب یہ ہے کہ وہ رقم کافی ہے اور محفوظ ہے!''

''اچھا وہ زمین جس پر تمہارے شیشم کے جنگلات وغیرہ تھے، کس نے خریدی تھی؟'' بیرن نے کہا۔

''ایکس منسٹر ڈیولپمنٹ کارپوریشن نے!'' گاربر نے کہا۔ ''دو سال قبل وہ کارپوریشن دیوالیا ہوگئی۔ وہاں یورینیم وغیرہ کچھ نہیں نکلا!''

میں بظاہر انٹرویو سے بے تعلق بیٹھا تھا مگر میری نگاہ گاربر کے چہرے کا بغور معائنہ کررہی تھی۔ ابتدائی صدمے سے سنبھلنے کے بعد اب اس کا سکون اور اعتماد دیکھ کر مجھے احساس ہونے لگا تھا کہ شاید قصور میری نظر کا تھا جسے گاربر کے چہرے پر خوف اور تشویش کے آثار نظر آئے تھے اور انٹرویو سے گریز فی الحقیقت پبلسٹی سے بچنے کی کوشش تھی مگر شک کا جو کیڑا میرے ذہن میں کلبلانے لگا تھا، وہ نکلا نہیں تھا۔ چہرے دھوکا بھی تو دے جاتے ہیں۔ یہ اداکاری بھی تو ہوسکتی ہے۔ گاربر نے بالٹی میں ہاتھ ڈالا مگر آخری بوتل بھی نکالی جاچکی تھی۔ وہ بیئر کی بوتل لینے گھر کے اندر چلا گیا۔

بیرن مجھے آنکھ مار کر مسکرایا۔ ''اگر یہ انٹرویو جھوٹ کا پلندا ثابت ہوا تو ذرا سوچو کتنا بڑا دھماکا ہوگا۔ جب میں

حقیقت کو بے نقاب کردوں گا' دونوں طرف گواہ ہوگا نیوٹن کا پولیس چیف......!''

گاربر نے ہمیں دوپہر کے کھانے تک روکے رکھا۔ اس کے بعد میں اور بیرن اپنے دفتر کی جانب روانہ ہوگئے۔ دفتر میں ایک خبر میرے انتظار میں تھی۔ ایکس منسٹر کا پولیس چیف مجھ سے بات کرنا چاہتا تھا۔

''اچھی......!''میں نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے سر پکڑ کر کہا۔''یہ کیا تماشا ہے، تم نے تو کہا تھا......''

''یس سر!''سیکریٹری نے خفت سے کہا۔''میں نے وہی بتایا تھا جو مجھے بتایا گیا تھا۔ بعد میں انکشاف ہوا کہ جس قصبے کا نام پہلے ایکس منسٹر تھا، اس کا نام اب الزبتھ ہے۔ یہ نام ملکہ الزبتھ کی تاج پوشی کے موقع پر رکھا گیا تھا۔ جب ٹیلی فون والوں کو اپنی غلطی کا احساس ہوا تو انہوں نے الزبتھ میں پولیس کے چیف سے رابطہ قائم کیا اور ابھی کچھ دیر پہلے اس کا فون آیا تو میں نے کہا آپ آئیں گے تو بات کریں گے۔''

''ٹھیک ہے!''میں نے وضاحت سے مطمئن ہوکر تھکے ہوئے لہجے میں کہا۔''بات کراؤ میری......!''

پانچ منٹ بعد گھنٹی بجی اور میں نے ریسیور اٹھایا تو ایک شخص نے بھاری بھرکم آواز میں کہا۔''کیا حکم ہے میرے لیے!''

''میں پوچھنا چاہتا تھا......!''میں نے معذرت اور شکر گزاری کے ملے جلے جذبات کے ساتھ کہا۔''تمہاری طرف شیشم کے جنگلات ہوتے ہیں......اور لکڑی چیرنے کا کارخانہ۔''

''سوری سر!''اس نے کہا۔''کسی نے غلط کہا ہے آپ سے۔ یہاں شیشم کا ایک بھی درخت نہیں ہے، لکڑی چیرنے کا کارخانہ کہاں سے آئے گا۔ یہ سو فیصد میدانی علاقہ ہے جہاں صرف غلہ پیدا ہوتا ہے۔ جنگلات کا یہاں کوئی وجود نہیں۔''

''اچھا!''میں نے چند لمحات کی خاموشی کے بعد کہا۔''نیڈ گاربر نام کے کسی شخص کا کوئی ریکارڈ ہے؟''

''نو سر!''وہ سر کہنے کا عادی معلوم ہوتا تھا۔''ریکارڈ کا کیا سوال یہاں......اس نام کا کوئی شخص ہی نہیں گزرا۔''

''گزرا کیا مطلب؟''میں نے کہا۔''تم کیا سارے شہر سے واقف ہو اور واقف بھی ہو تو کب سے؟''

''گزشتہ اٹھتیس برس سے سر!''اس نے طنزیہ لہجے میں کہا۔''اور یہ شہر نہیں ہے، گاؤں ہے۔ آبادی چھ سو بیس افراد پر مشتمل ہے۔ ایک دو کی کمی بیشی ہوسکتی ہے اس سے زیادہ

اچھی بات

نیکی کر کے اسے بھول جایا کرو۔ جیسے گناہ کرتے وقت اپنے رب کو بھول جاتے ہو۔

☆☆☆

سب سے جلدی راضی ہونے والی ہستی اللہ کی ذات ہے۔

ہماری ندامت کا ایک آنسو اسے ہمارا قریبی دوست بنا سکتا ہے اور جس کے سب سے قریب اللہ ہو تو اس کا کوئی کام کیسے رک سکتا ہے۔

گناہ گار

گناہ کو پھیلانے کا ذریعہ مت بنو کیونکہ ہو سکتا ہے تم تو توبہ کرلو مگر جس کو تم نے گناہ پر لگایا، وہ تمہاری آخرت کی تباہی کا سبب نہ بن جائے۔

مرسلہ۔ صائمہ ساجد سحر، گاؤں بھابڑہ شریف، ضلع سرگودھا

نہیں۔ مزید یہ کہ مجھے اپنے حافظے پر اتنا ہی اعتماد ہے جتنا بڑے بڑے شہروں کی پولیس کو کمپیوٹر کے ریکارڈ پر ہوتا ہے۔''

''سوری!''میں نے کہا۔''میری پوزیشن بھی تم سے مختلف نہیں ہے......اس تعاون کا شکریہ!''

شک کا وہ کیڑا جو میرے ذہن میں کلبلا رہا تھا، یکلخت سانپ بن کر پھن پھیلائے میرے سامنے آگیا۔ پھر یہ سانپ سوالیہ نشان بن گیا اس کی آنکھیں زبان پر ایک ہی سوال تھا۔ گاربر نے جھوٹ کیوں بولا تھا؟ میرا تجربہ، میرا اعتماد اور مردم شناسی کا دعویٰ، سب غلط ثابت ہورہے تھے۔ بیرن سے یہ بات چھپائے رکھنا مشکل تھا کہ ایکس منسٹر نئے نام سے دریافت ہوچکا ہے۔ مگر اس سے گاربر کا انٹرویو واقعی جھوٹ کا پلندا بن گیا ہے۔ بیرن کے اپنے وسائل تھے اور مجھے یقین تھا کہ بالآخر وہ بھی حقیقت معلوم کرلے گا۔ اس کی پُرتجسس فطرت ایک شک کو دور کیے بنا مطمئن نہیں ہوگی اور بعد میں اگر اسے علم ہوا کہ میں نے عمداً اس سے حقائق کو پوشیدہ رکھ کر گاربر کی آبرو کا بھرم رکھنے کی کوشش کی تھی تو وہ میری عزت کا بھی جنازہ نکال دے گا۔ یہ رسوائی مول لینے سے کیا حاصل؟ مجھے غیر جذباتی انداز میں ایک پولیس آفیسر کی حیثیت سے سوچنا چاہیے۔ ایک سوال سے ان گنت سوال پیدا ہورہے تھے۔ یوں جیسے ایک سانپ کے سنپولیے

بل سے نکل کر ہر طرف رینگنے لگتے ہوں۔ اگر یہ سب جھوٹ ہے تو گاربر کے پاس دولت کہاں سے آئی؟ اور اب اس کا کل سرمایہ کیا ہے؟ کیا غبن کی رقم اتنی فراخ دلی سے نیوٹن کے شہریوں کو بخش دینے کا سبب یہ تھا کہ یہ مال حرام کا تھا۔ محنت سے کمائی ہوئی یا ورثے میں ملنے والی دولت نہیں تھی۔
پھر مجھے ایک اور خیال آیا۔ گاربر نیوٹن کا رہنے والا نہیں تھا اور واردات ریاست کی حدود سے باہر ہوئی تھی۔ یہ کیس پولیس کا نہیں ایف بی آئی کا تھا۔ میں نے یوں محسوس کیا جیسے مجھ پر سے فرض کا قرض اتر گیا ہو۔ میری کیفیت اس شخص جیسی تھی جسے اپنے ہی دوست کو الیکٹرک چیئر پر بٹھا کر بٹن دبانے کے عذاب سے سبکدوش کر دیا جائے کہ یہ فرض کسی اور کے سپرد کر دیا گیا ہے۔ گاربر اگر مجرم تھا تو قانون کی گرفت... اس کے لیے معتبر نہیں تھی مگر سزا دینے کی اذیت میرے لیے نہیں رہی تھی۔ جب اپنے خیالات سے نجات پا کر میں نے گھڑی کی طرف دیکھا تو مجھے اندازہ ہوا کہ برک لین سے مسٹر ڈگلس کے پہنچنے کا وقت تقریباً ہو چکا ہے۔ اس نے پہلی ٹرین پکڑلی ہوگی اور آدھے گھنٹے میں پہنچنے والا ہوگا۔ اسی وقت دروازہ کھلا اور گاربر اندر داخل ہوا۔ اس کے ساتھ آئرین بھی تھی۔
خلافِ معمول گاربر کا چہرہ بے جان اور افسردہ تھا۔ آئرین کا اڑا ہوا رنگ بھی مجھ سے پوشیدہ نہ رہ سکا۔ زندگی سے معمور مسکراہٹ اور شگفتہ لہجے کے ساتھ ”گڈ ایوننگ، چیف“ کہنے کے بجائے وہ خاموشی سے کرسی پر یوں بیٹھ گیا جیسے میلوں کا سفر پیدل کر کے تکان زدہ پہنچا ہے۔ میرا دل ڈوبنے لگا۔ اس کی یہ غم زدہ خاموشی اعترافِ جرم کے مترادف تھی۔ وہ دونوں مجھ سے نظر نہیں ملا رہے تھے۔
”سام!“ گاربر نے ایک منٹ بعد کہا۔ ”میں نے آج تک اپنے بارے میں جو کچھ بتایا ہے، جھوٹ تھا۔“
”گاربر نے میرے سامنے حقیقت کا اعتراف بھی آج ہی کیا ہے۔“ آئرین نے اس کی حوصلہ افزائی کے لیے بات آگے بڑھائی۔ ”میں نے کہا کہ سام تمہارا دوست ہے اسے حقیقت کا جلد از جلد علم ہو جانا چاہیے۔ ورنہ ہم سب رسوا ہوں گے سچ بالآخر سامنے آجائے گا۔“
”ٹھیک ہے گاربر!“ میں نے کہا۔ ”جو آدمی ضمیر پر بوجھ اٹھائے پھرتا ہے، اپنی نظر میں بھی تو رسوا رہتا ہے۔“
گاربر نے زیادہ اعتماد کے ساتھ کہنا شروع کیا۔
”بیرن سب کچھ معلوم کر لے گا اور پھر جو کچھ ہوگا سب کے لیے برا ہوگا۔ پہلی بات تو یہ کہ میرا تعلق ایکس فنس سے نہیں ہے

میں آریگون کی ریاست میں برپوٹ کے قصبے سے آیا تھا لیکن باقی سب درست ہے۔ میرا واقعی لکڑی چیرنے کا کارخانہ اور شیشم کا چھوٹا سا جنگل تھا جسے بیچ کر مجھے پانچ لاکھ ڈالرز ملے تھے!“
”کتنے؟“ میں نے چونک کر کہا۔ ”پانچ لاکھ ڈالرز؟“
”ہاں تقریباً! جس شخص کے پاس اتنی دولت ہو، اسے دنیا بہت حقیر لگتی ہے۔ بے مایہ اور کمزور...... جہاں دوستی سے دشمنی تک اور شراب سے شباب تک سب کچھ دولت کی قوت خرید میں یوں اسیر ہے جیسے کائنات کی ہر شے کششِ ثقل کی غلام ہے۔ میری دولت کو لہو سمجھ کر پینے کے لیے جونکیں مجھ سے لپٹ گئیں۔ عیار لوگ زر پرست مرد اور عورتیں...... زندگی شراب کے نشے میں غرق تھی۔ بڑی خوبصورت اور رنگین...... ہر صبح سورج مجھے سلام کرنے کے لیے طلوع ہوتا تھا اور مسرتوں سے بھرپور دن کی نوید دے کر گزر جاتا تھا تو کسی کے حسن کا ماہتاب نکل آتا تھا اور رات خواب کی صورت بسر ہو جاتی تھی۔ میری زندگی کا محور ہنگامے تھے۔ رقص و سرود کی محفلیں، کاک ٹیل پارٹیاں...... ڈنر...... نائٹ کلبس اور جوئے خانے...... نہ جانے کہاں اور کیسے شراب کے نشے میں ایک شخص سے میری تکرار ہوگئی اور انجام یہ ہوا کہ میں نے اسے ناک آؤٹ کر دیا۔ میں جھوٹ نہیں بول رہا چیف! حقیقت یہ ہے کہ میں بالکل ہوش میں نہ تھا۔ مجھے معلوم نہیں اس شخص کا نام کیا تھا اور کون سی جگہ تھی۔ میں نے فرار ہونے کی کوشش کی لیکن لوگوں نے مجھے پکڑ لیا۔ جب مجھے عدالت میں پیش کیا گیا تو مجھ پر ایک پولیس آفیسر کو پیٹنے کا الزام تھا۔ مجھے کچھ یاد نہیں تھا۔ چنانچہ میرے اس پہلے نادانستگی میں ہو جانے والے جرم پر مجھے کم سے کم سزا سنا دی گئی۔ یعنی دو سال کی جیل...... رہا ہونے کے بعد میرے لیے وہاں رہنا مشکل تھا۔ چنانچہ میں سب کچھ سمیٹ کر اس قصبے میں آگیا۔
”میں فطرتاً برا نہیں ہوں سام! میں برا ہوتا تو اس قصبے کے اتنے بہت سے اچھے لوگ مجھے قبول نہ کرتے۔ میرا جرم ایک حادثہ تھا اور حادثے ہمیشہ غیر متوقع ہوتے ہیں۔ اب میں کتنا ہی نیک اور پارسا، معزز اور محترم کیوں نہ ہو جاؤں، پولیس کے ریکارڈ کے مطابق میں ایک سزا یافتہ سابق مجرم ہوں۔ یہ میری زندگی کے دامن کا وہ داغ ہے جسے میں نے اب تک چھپائے رکھا تھا مگر اس کے علاوہ میں جو کچھ ہوں، وہی ہوں جیسے تم جانتے ہو اور اس قصبے کے سب رہنے والے جانتے ہیں۔

وہ خاموش ہوگیا۔ آئرین میز کے نیچے اپنے پیروں کو دیکھ رہی تھی اور فرش کرید رہی تھی۔ میں اپنے سامنے کھڑکی سے باہر شام کے ڈھلتے سایوں پر نظر جمائے بیٹھا تھا۔ گاربر کی نگاہ اپنے مقابل دیوار کو دیکھ رہی تھی۔ ہم میں سے کوئی کسی سے نظر نہیں ملا رہا تھا۔ کسی میں خاموشی کے اس جمود کو توڑنے کی ہمت نہیں تھی۔ ہم سب اپنے اپنے بوجھ سے سبکدوش ہوگئے تھے لیکن یہ بوجھ ہم سب کے درمیان لاوارث لاش کی طرح پڑا تھا۔

دروازہ کھلا تو ہم سب چونک گئے۔ دو افراد اندر داخل ہوئے۔ ان میں سے ایک بیرن تھا۔ ''یہ مسٹر ڈگلس ہیں۔'' اس نے نووارد کو متعارف کراتے ہوئے کہا۔ ''میرے دوست!''

میری نظریں ڈگلس کی طرف اٹھی ہوئی تھیں، اس نے معنی خیز انداز میں زیرلب مسکراتے ہوئے گاربر کو دیکھا اور پھر مجھے یوں محسوس ہوا جیسے اس نے گاربر کو ہلکے سے آنکھ ماری ہو۔ میں نے فوراً بیرن کی طرف دیکھا۔ وہ گاربر کے چہرے پر نظریں جمائے متوقع ردِعمل تلاش کررہا تھا۔ حیرت، پریشانی، بدحواسی یا خوف کے تاثرات مگر گاربر بالکل نارمل تھا۔ اس نے اجنبیوں کی طرح ڈگلس سے مصافحہ کیا، اس وقت بھی اس کے چہرے کے تاثرات تبدیل نہیں ہوئے۔ بیرن عیار شخص تھا، وہ غالباً ریلوے اسٹیشن سے ڈگلس کو اپنے ساتھ لایا تھا اور اسے سب کچھ بتاچکا تھا۔

''یہ برک لین سے آئے ہیں، کل واپس چلے جائیں گے۔ میں نے سوچا کہ یہاں کے ہراہم فرد سے ان کی ملاقات کروادوں۔'' بیرن نے کہا تو ہم سب ہنسنے لگے۔ میں نے کافی کا آرڈر دیا اور کچھ دیر بعد ڈگلس نے اجازت چاہی۔ گاربر سے مصافحہ کرتے ہوئے ڈگلس کے ہاتھ کی گرفت زیادہ مضبوط ہوگئی اور میں نے محسوس کیا کہ مصافحے کی طوالت ذرا سی بڑھ گئی تھی، یا شاید وہ بھی میرا وہم تھا مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے دو پرانے دوست تعلقات کی تجدید کررہے ہوں۔

بیرن، ڈگلس کو ہوٹل چھوڑنے چلا گیا، اس کے بعد گاربر اور آئرین بھی چلے گئے۔ بیس منٹ بعد بیرن واپس آگیا۔ ''سوری چیف!'' اس نے کہا۔ ''میرا خیال غلط ثابت ہوا۔''

میں نے اطمینان کا ایک گہرا سانس لیا۔ اس کا مطلب تھا کہ بیرن نے کوئی بات محسوس نہیں کی تھی۔ جب ڈگلس نے معنی خیز انداز میں زیرلب مسکراتے ہوئے ہلکے سے گاربر کو آنکھ ماری تھی تو بیرن اس وقت گاربر کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ باہمی اعتماد کے بھرم رکھنے کا حوصلہ دینے والی مسکراہٹ تھی۔

برسوں بعد پرانے دوستوں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اس عہد کی تجدید کی تھی لیکن شاید وہ میرا وہم تھا، شاید میرا تخیل بہک گیا تھا۔ میں خود اب پورے وثوق سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ آیا واقعی ان کے درمیان اس قسم کے اشاروں کا تبادلہ ہوا تھا۔

''چلو ٹھیک ہے، تمہارا اطمینان ہوگیا۔'' میں نے کہا۔

''لیکن چیف!'' بیرن نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ''تم نے شاید ایک بات نوٹ نہیں کی۔''

''کیا؟'' میں نے اس کی طرف دیکھا، میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔

''چلتے وقت جب انہوں نے ہاتھ ملایا تھا تو اس وقت میں نے محسوس کیا کہ جیسے دو گہرے دوست ایک دوسرے سے جدا ہورہے ہوں......!''

میں اچھل کر نشست سے کھڑا ہوگیا۔ میں نے غصے کی شدت سے کانپتی ہوئی انگلی سے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ ''دفع ہوجاؤ!'' میں نے چیختے ہوئے کہا۔ ''تم مجھے سکون سے بیٹھا ہوا نہیں دیکھ سکتے۔ جب ڈگلس نے گاربر کو مجرم کی حیثیت سے شناخت نہیں کیا تو اب تمہیں کیا تکلیف ہے؟''

بیرن میرے غصے سے ذرا بھی متاثر نہیں ہوا۔ چند لمحے وہ کچھ سوچتا رہا پھر اس نے بے پروائی سے کاندھے جھٹکے اور ہیٹ جھاڑتا ہوا میرے کمرے سے باہر نکل گیا۔

اس کے انداز سے واضح تھا کہ اس نے ہمیشہ کے لیے یہ معاملہ ذہن کے کسی گوشے میں دفن کردیا ہے۔ میں مطمئن ہوکر بیٹھ گیا۔ میں یقین کے ساتھ اب بھی کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن حقیقت کے بارے میں صرف قیاس آرائی ہی کرسکتا ہوں۔

غبن ہونے والی رقم دس لاکھ ڈالرز تھی مگر گاربر نے کچھ دیر پہلے کہا تھا کہ اس کا کل سرمایہ تقریباً پانچ لاکھ ڈالرز ہے۔ باقی پانچ لاکھ ڈالرز کہاں گئے؟

یہ سوال اس لیے زیادہ اہمیت اختیار کرجاتا ہے کہ مجرم کو شناخت کرنے والے واحد شخص ڈگلس نے گاربر کو مجرم کی حیثیت سے شناخت کرنے سے انکار کردیا تھا۔ پھر ڈگلس کا آنکھ مارنا...... ممکن ہے وہ میرا وہم ہو لیکن رخصت ہوتے وقت انہوں نے جس انداز سے مصافحہ کیا تھا، اس انداز کی شناسائی کو بیرن نے بھی محسوس کرلیا تھا...... وہ میرا وہم نہیں ہوسکتا تھا!

دہرے معیار کے اس معاشرے میں والدین کے لیے ایک عبرت اثر داستان

بے اعتنا

نشور ہادی

حساب کتاب چاہے رشتوں کا ہو یا دولت کا... کھرا ہو تو زندگی کا لطف دوبالا ہو جاتا ہے مگر جب... کھوٹ تعاقب کرتے کرتے اس طرح ہم قدم ہو جائے کہ صحیح اور غلط کا احساس تک مٹ جائے تو نتائج اتنے ہی خطرناک نکلتے ہیں جتنا خطرناک روپ اس کی فطرت نے دھارا تھا... جب کسی کے حقوق پر ڈاکا پڑتا ہے تو وہ انسان بھلا کس طرح حقائق کو مدِنظر رکھ سکتا ہے... اسے بھی خود سری ،پسند نا پسند اور اپنی ملکیت کے احساس نے ایسی دہری شخصیت میں قید کر دیا تھا کہ وہ چاہ کر بھی اس زندان سے باہر نہیں نکل سکی تھی کیونکہ... اپنوں نے اپنایت کا ایسا ناٹک کھیلا کہ وہ اپنے پن کے تقاضے ہی بُھلا بیٹھی اور... اس اپنے پن میں سب سے خوب صورت جذبہ محبت کا ہوتا ہے... جس میں غیر بھی سب سے زیادہ اپنا لگتا ہے مگر افسوس... اس کا وہ عشق جو کسی اور کی ملکیت تھا شراکت برداشت نہ کرسکا۔ جنون کی انتہا کو پہنچی اس کی محبت نے جو رخ اختیار کیا اس نے ہر ایک کو دنگ کر دیا... کیونکہ اس کی جارحیت کا ہر رنگ کچا ثابت ہوا، ایسے میں نہ کوئی رشتہ اس کا اپنا بنا اور نہ ہی کسی رستے میں اپنایت رہی۔

چاندنی رات اتنی اچھی لگی کہ خواب گاہ کی کھڑکی سے دیکھ کر فرح اور عماد باہر نکل آئے اور مہکتے ہوئے خوب صورت لان میں چہل قدمی کرنے لگے۔ ان کی شادی کو ابھی ڈیڑھ ماہ سے زیادہ نہیں ہوا تھا۔ شادی کے پانچویں دن وہ ہنی مون منانے بیرونِ ملک گئے تھے اور نہ چاہتے ہوئے بھی وہاں سے واپسی دو دن پہلے ہی ہوئی تھی۔ کیونکہ عماد کے آفس کی ذمے داریاں اتنی تھیں کہ زیادہ دن نہیں گزارے جاسکتے تھے۔ وہ ایک بینک میں خاصے بڑے عہدے پر فائز تھا۔ اسے وہ ملازمت انگلینڈ میں تعلیم کے حصول ہی کے دوران میں ملی تھی اور جب وہ تعلیم مکمل کر چکا تو اس کی خواہش پر اس کا تبادلہ اپنے ہی ملک اور اپنے ہی شہر میں کردیا گیا تھا جہاں اس بینک کی ایشیائی برانچ کی مرکزی برانچ تھی۔

یہاں آکر کے دو ماہ بعد ہی فرح سے اس کی شادی ہوگئی تھی جس نے دو سال تک بڑی بے چینی سے اس کا انتظار کیا تھا۔ انتظار اس لیے کہ ہائی اسکول کے زمانے ہی سے ان کی محبت نے پھلنا پھولنا شروع کردیا تھا اور کالج تک آتے آتے وہ اتنی جوان ہوگئی تھی کہ جذبات نے شدت سے بھڑکنا شروع کردیا تھا۔ اسی لیے سیکنڈ ایئر کے بعد عماد نے تعلیم حاصل کرنے کے لیے انگلینڈ جانے کا فیصلہ بہت مجبوری کے عالم میں کیا تھا اور وقتی طور پر فرح کی خفگی بھی مول لی تھی۔

دونوں کا تعلق ایک ہی خاندان سے تھا اس لیے .... الگ گھر ہونے کے باوجود انہیں روزانہ ہی ایک دوسرے سے ملنے یا کم از کم ایک دوسرے کو دیکھنے کا موقع ضرور مل جاتا تھا۔ اس کے بغیر وہ دونوں ہی چوبیس گھنٹے تک بے چین رہتے تھے۔ چین اس وقت آتا تھا جب دوسرے دن ملاقات ہوجاتی تھی۔ عہد وپیماں ہوئے تو ایک عرصہ گزر چکا تھا۔ دونوں کے بڑوں نے بھی یہ بات طے کرلی تھی کہ وہ دونوں اپنی تعلیم مکمل کرلیں گے تو ان کی شادی کردی جائے گی۔

لان میں چہل قدمی کرتے ہوئے فرح اچانک بولی۔

''آج تو میں پوچھ کر رہوں گی۔ ہمیشہ یہ کہہ کر ٹالتے رہے ہو کہ بتادوں گا کبھی۔''

''ہاں۔'' عماد نے ٹھنڈی سانس لی۔ ''بھولو گی نہیں کبھی؟''

''کیسے بھول سکتی ہوں۔ دو سال سے زیادہ وقت تڑپ تڑپ کر گزارا ہے۔''

''انگلینڈ سے میں تمہیں روزانہ ہی فون کرتا تھا۔ ایک ایک گھنٹے بھی بات کی ہے ہم نے۔''

''لیکن آنکھیں تو تمہیں دیکھنے کو ترس گئی تھیں...... اس زمانے میں وہ موبائل نہیں آئے تھے جو اب آگئے ہیں، جن پر ایک دوسرے کو دیکھا بھی جاسکتا ہے۔''

''اچھا یاد دلایا تم نے...... ایک بہت ہی عمدہ ماڈل آیا ہے بازار میں۔ خریدنا ہے وہ۔ کل شام ہی چلیں گے مارکیٹ۔''

فرح ٹہلتے ٹہلتے ایک جھٹکے سے رکی اور عماد کو گھورتے ہوئے بولی۔ ''تم پھر میرا سوال ٹال رہے ہو۔ آج تو میں پوچھ کر رہوں گی عماد!...... مجھے احساس ہے کہ تم بھی مجھے اتنی ہی شدت سے چاہتے ہو، جتنی شدت سے میں تمہیں چاہتی ہوں۔ اس کے باوجود تم دو سال کے لیے مجھ سے دور چلے گئے۔ آخر کیوں؟...... اگر آج بھی تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا تو میں اپنا سر پھوڑ لوں گی۔'' آخری فقرہ کہتے ہوئے وہ روہانسی ہوگئی تھی۔

عماد سنجیدہ ہوگیا۔ ''آج تو تم جذباتی ہوگئیں۔''

''ہمیشہ ہی خلش رہتی ہے دماغ میں۔ آخر کیا مجبوری تھی تمہیں؟''

''اچھا!'' عماد نے طویل سانس لی۔ ''تو سنو...... اگر میں چلا نہ جاتا تو ایک ایسا سانحہ ہوجاتا کہ پھر ہم دونوں کبھی ایک نہ ہوپاتے۔''

''کیا!'' فرح چونکی۔ ''سانحہ؟''

''ہاں۔ اس کے لیے میں یہی ایک لفظ استعمال کرسکتا ہوں۔''

''پوری بات بتاؤ۔'' فرح نے کہا اور عماد کا ہاتھ پکڑ کر گھاس پر ہی بیٹھ گئی۔

عماد کو بھی بیٹھنا پڑا۔ ''وہ سانحہ ایک لڑکی کی وجہ سے ہوتا۔''

''لڑکی!'' فرح پھر چونکی۔

''ہاں۔ ایک پاگل لڑکی۔ پاگل کہہ لو یا جنونی۔ وہ اسی کالج میں پڑھتی تھی جہاں میں پڑھتا تھا۔ اگر تم بھی اسی کالج میں ہوتیں تو دیکھتیں اسے۔ صرف اسی کی وجہ سے میں بھاگا تھا یہاں سے۔''

''لڑکی کی وجہ سے؟'' فرح کو تعجب ہوا۔

''ہاں۔'' عماد کی سنجیدگی میں فرق نہیں آیا۔

''وہ کالج میں پڑھتی تھی لیکن تم اسے پاگل کہہ رہے ہو؟''

''جنونی بھی تو کہا ہے میں نے۔ وہ اس قسم کی پاگل نہیں تھی جن کی جگہ پاگل خانہ ہوتی ہے۔''

''اچھا خیر!...... چھوڑو...... یہ بتاؤ کہ تم اس کی وجہ سے کیوں بھاگے؟''

''اب آج میں بتا ہی رہا ہوں تو سب کچھ تفصیل سے

ہی بتادوں گا۔" عماد نے کہا۔ "خدا کرے کہ اب وہ اس شہر میں نہ ہو۔ مجھے اس کا خیال ہی پریشان کردیتا ہے۔ وہ ایک بہت دولت مند شخص کی بیٹی ہے۔ مجھے آج بھی یہ ڈر رہتا ہے فرح کہ وہ کہیں کسی جگہ مجھے دیکھ نہ لے۔"

"تمہاری ان باتوں سے تو میرا ہیجان بڑھ رہا ہے... اب بتا بھی چکو کسی طرح!" فرح جھنجلا سی گئی۔ "آج میں پہلی بار سن رہی ہوں کہ کوئی مرد کسی لڑکی سے اتنا خوف زدہ بھی ہوسکتا ہے۔"

"وہ بہت ہی ضدی لڑکی تھی...... یا شاید ہے۔"

"ہے اور تھی کو چھوڑو۔ بات بتاؤ!"

عماد نے ٹھنڈی سانس لی۔ "اتنی ضدی کہ جب وہ کوئی چیز چاہے تو وہ اسے ہر قیمت پر مل جائے اور نہ ملنے کی صورت میں وہ کچھ بھی کرسکتی تھی۔ اسی نے مجھے بتایا تھا کہ اگر وہ چیز اسے نہ ملے تو وہ اس چیز کو تباہ کردیتی ہے تاکہ وہ کسی اور کے کام بھی نہ آسکے۔ حد ہے کہ...... اس نے خود بتایا تھا کہ...... اس نے ایک بلی پالی تھی۔ اس سے اتنی محبت کرتی تھی کہ اپنے بستر پر اپنے ساتھ ہی سلاتی تھی۔ ایک دن اس نے بلی کو اپنے بھائی کے قدموں میں لوٹتے دیکھ لیا۔ اس کا بھائی اس سے تین سال چھوٹا تھا۔ بلیاں گھر کے کسی شخص سے بھی مانوس ہوجاتی ہیں لیکن صبیحہ یہ برداشت نہیں کرسکی کہ جس بلی سے وہ محبت کرتی ہے، وہ کسی اور کے قدموں میں لوٹے۔ اس نے کہیں قریب ہی رکھا ہوا ایک وزنی ایش ٹرے اٹھا کر اتنی زور سے بلی کے سر پر مارا کہ وہ وہیں مرگئی۔"

"ارے!" فرح کے منہ سے نکلا۔ "اگر اسے سچ مان لیا جائے تو پھر وہ یقیناً پاگل ہی تھی۔"

"ہاں۔ اب دوسرا واقعہ سنو...... یہ تو میں بتا ہی چکا ہوں کہ وہ بہت دولت مند باپ کی بیٹی ہے۔"

"ہے؟" فرح کا لہجہ سوالیہ تھا۔

"ہاں بس منہ سے نکل گیا میرے۔ شاید یہی حقیقت ہو کہ وہ اب بھی ہے اور شاید اسی شہر میں ہو۔ تو میں بتا رہا تھا کہ اس کے چھوٹے بھائی نے اپنی پسند کی کوئی کار خریدی تھی۔ وہ صبیحہ کو بھی اچھی لگی۔ اس نے بھائی سے کہا کہ وہ کار اسے دے دے۔ بھائی نے کہا کہ ایسی ہی کاریں بازار میں بہت ہیں۔ وہ بھی ویسی ہی کار خرید لائے لیکن صبیحہ اڑ گئی کہ وہی کار لے گی۔ بھائی نے اس کی بات نہیں مانی۔ دو ہی دن بعد رات کے وقت گھر کے لوگوں نے دھماکے کی آواز سنی تو وہ جاگ گئے۔ معلوم ہوا کہ...... ہاں! ایک بات تو بتا دوں۔ اس کے گھر میں چار گیرج تھے۔ ایک میں وہ اپنی کار کھڑی کرتی تھی۔ دوسرے گیرج میں بھائی کی کار کھڑی ہوتی تھی۔ تیسرا اور چوتھا گیرج اس کے والد اور والدہ کا تھا۔ دھماکا اس گیرج میں ہوا تھا جہاں اس کے بھائی کی کار کھڑی ہوتی تھی۔ گیرج دھڑا دھڑ جل رہا تھا۔ فوراً فائر بریگیڈ کو فون کیا گیا۔ آگ جلدی بجھا دی گئی۔ پولیس بھی آگئی تھی۔ انہوں نے تفتیش کی، گیرج میں کھڑی ہوئی کار خودبخود کیسے تباہ ہوگئی لیکن انہیں کوئی سراغ نہیں ملا۔ کوئی ایسی بات سامنے نہیں آئی کہ کسی نے وہاں آگ لگائی ہوگی۔ ہماری پولیس زیادہ جان جوکھم میں تو پڑتی نہیں ہے۔ کوئی ایسا ویسا جواز بتا کر انہوں نے کیس بند کردیا۔ دوسرے دن ناشتے کی میز پر سب کی موجودگی میں اس نے کہا کہ وہ کار اسے نہیں ملی تھی، اس لیے وہ اس نے تباہ کردی۔ گیرج میں تالا تو لگتا نہیں تھا۔ اس نے دو بجے گیرج میں جا کر کار کی سیٹ پر تین چار جگہ جلتی ہوئی دیا سلائی لگا دی اور واپس اپنے کمرے میں آکر لیٹ گئی۔ آگ پھیلتی رہی ہوگی۔ چوکیدار وغیرہ سب سو رہے ہوں گے۔ کسی نے گیرج سے دھواں نکلتے نہیں دیکھا ہوگا۔ آگ پیٹرول کی ٹنکی تک پہنچ گئی ہوگی۔ شاید اسی کی وجہ سے دھماکا ہوا۔ صبیحہ سے یہ اعتراف سن کر اس کے گھر والے دم بخود رہ گئے۔"

فرح اپنا سوال بھول کر متجسس ہوگئی تھی۔ اس نے پوچھا۔ "گھر والوں نے اسے سرزنش نہیں کی؟"

"نہیں۔ گھر کا معاملہ تھا۔ پولیس کو تو وہ بتا نہیں سکتے تھے۔ ان کی سمجھ میں یہی آیا کہ صبیحہ ابنارمل ہے۔ انہیں گھر کے دوسرے چھوٹے موٹے واقعات بھی یاد آئے۔ وہ بچپن ہی سے اس قسم کی حرکتیں کرنے لگی تھی۔ ان حرکتوں کو اس کا بچپن سمجھ کر نظرانداز کیا جاتا رہا تھا لیکن اس کے بعد سوچا گیا کہ اس کے لیے کسی ماہرِ نفسیات کی خدمات حاصل کی جائیں۔ جب اسے یہ معلوم ہوا تو وہ بھڑک اٹھی۔ چیخنا چلانا شروع کردیا کہ اسے پاگل کیوں سمجھا جارہا ہے۔ مختصر یہ کہ اسے کوئی ماہر نفسیات نہیں دیکھ سکا۔ بس اس کے گھر والے محتاط ہوگئے۔ اس کی ہر خواہش پوری کردی جاتی تھی۔"

"یہ واقعہ تو جھوٹ معلوم ہوتا ہے۔ اس نے آخر تمہیں کیوں بتایا؟"

"مجھے ڈرانے کے لیے۔ چلو یہ جھوٹ سہی لیکن ایک معاملہ تو میرے سامنے کا ہے۔ کالج میں اسے ایک لڑکی بہت اچھی لگتی تھی۔ وہ اسے باقاعدہ لپٹا کر پیار کرنا چاہتی تھی لیکن جب بھی اس نے اپنی اس خواہش کا اظہار کیا، وہ لڑکی بری طرح چراغ پا ہوجاتی۔ شکایت پرنسپل تک پہنچی تو اس

نے کہہ دیا کہ یہ محض الزام ہے، اس پر تہمت لگائی گئی ہے۔ اس کے خلاف کوئی ثبوت تو تھا نہیں۔ معاملہ رفع دفع ہو گیا لیکن اس کے بعد صبیحہ اس لڑکی کو بہت غصے سے دیکھا کرتی تھی۔ یہ سب کچھ تو میرے سامنے ہی ہوتا رہا تھا۔ پھر کوئی پندرہ دن بعد معلوم ہوا کہ جب وہ اپنی کار میں کالج آ رہی تھی تو کسی جانب سے چلنے والی دو گولیوں نے اس کی کار کے ٹائر برسٹ کر دیے۔ کار بے قابو ہو کر ایک ٹرالر سے جا ٹکرائی اور تباہ ہو گئی۔ لڑکی بھی مر گئی۔ صبیحہ نے مجھ سے کہا کہ اس کی بات نہ ماننے والوں کا انجام تو یہی ہو سکتا ہے۔"

"یعنی صبیحہ نے ہی چلائی تھیں اس کی کار پر گولیاں؟" فرح نے تیزی سے پوچھا۔

"اس نے الفاظ میں تو مجھ سے اس کا اعتراف نہیں کیا لیکن مسکراہٹ کے ساتھ چہرے سے یہی تاثر دیا کہ یہ اسی نے کیا تھا۔"

"پولیس نے تفتیش تو کی ہوگی کہ گولیاں کس نے چلائیں؟"

"ظاہر ہے۔ تفتیش تو ہوئی تھی لیکن پولیس کو کچھ معلوم نہیں ہو سکا تھا۔"

"شاید میں نے وہ خبر کہیں پڑھی تھی۔" فرح نے بڑبڑانے والے انداز میں کہا۔ "لیکن اس نے تمہیں یہ سب کچھ کیوں بتایا؟"

"اس نے دو ایک چھوٹے موٹے اور واقعات بھی سنائے تھے۔"

"مگر کیوں؟"

"بتا تو چکا ہوں، مجھے ڈرانے کے لیے۔"

"لیکن تمہیں ڈرانے کی اسے ضرورت کیا تھی؟"

عماد جواب دینے کے بجائے، کسی سوچ میں پڑ گیا۔

"بتاؤ نا عماد! میرا اصل سوال تو یہی ہے۔"

"آؤ!" عماد کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔ "اب کچھ ٹھنڈک بڑھ گئی ہے۔ کمرے میں چلتے ہیں۔ چار تو بج گئے۔"

"چلو۔" فرح کھڑی ہو گئی۔ "لیکن اپنے سوال کا جواب تو میں آج ہی لوں گی۔ کل تمہاری چھٹی ہے۔ کل دیر تک سو لیں گے۔ لیکن بات آج پوری ہوگی۔"

عماد پھیکے سے انداز میں مسکرا دیا۔ اپنے کمرے میں آ کر وہ دونوں بستر پر لیٹ گئے۔

"ہاں!" فرح کروٹ لے کر اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔

"اب جو باتیں ہیں، وہ سن سکو گی؟" عماد نے کہا۔

"کیوں نہیں سن سکوں گی؟"

"باتیں کچھ ایسی ہی ہیں۔"

"میں سب کچھ سن لوں گی۔"

عماد کچھ توقف سے بولا۔ "وہ مجھے چاہنے لگی تھی۔"

"اوہ!" فرح مسکرا دی۔ "یہ تو کوئی خاص بات نہیں۔ وہ کوئی بدذوق لڑکی ہی ہو سکتی ہے جو تمہیں پسند نہ کرے۔"

"ہو تو تم بھی ایسی ہی۔" عماد نے پیار سے اس کے گلے میں باہیں ڈال دیں۔ "کیا تمہیں کسی نے پسند نہیں کیا؟"

"وہ بھی بتا دوں گی میں تمہیں لیکن پہلے میری بات کا جواب دو۔ اگر وہ تمہیں چاہنے لگی تھی تو اس میں خوف زدہ ہونے کی کیا بات تھی؟"

"خوف ناک بات...... اب بتاؤں گا تمہیں!...... کالج میں جب بھی ذرا تنہائی ملتی تھی، وہ اپنی چاہت کا اظہار ضرور کرتی تھی اور میرا جواب بھی چاہتی تھی لیکن میں اسے یہ کہہ کر ٹال جایا کرتا تھا کہ میری منگنی ہو چکی ہے۔ اس پر وہ کہتی تھی کہ توڑ دو منگنی۔ میں مختلف جواز دے کر اپنی مجبوری ظاہر کیا کرتا تھا۔ آخر ایک دن اس نے کہہ دیا کہ وہ جو چیز حاصل کرنا چاہتی ہے، حاصل کر کے رہتی ہے ورنہ اسے تباہ کر دیتی ہے۔ اسی موقع پر اس نے مجھے وہ سب قصے سنائے جو میں ابھی تمہیں سنا چکا ہوں۔ اس نے مجھ سے واشگاف الفاظ میں کہا کہ اگر میں اس کا نہ ہوا تو کسی دن بھی میرے چہرے کی خوب صورتی تیزاب کی نذر ہو جائے گی۔"

فرح چونکی۔ "دھمکی دے ڈالی اس نے؟"

"ہاں۔"

"اور تم خوف زدہ ہو گئے؟"

"جو کچھ میرے سامنے آ چکا تھا، اس کی روشنی میں کیا مجھے ڈرنا نہیں چاہیے تھا؟ وہ کچھ بھی کر سکتی تھی فرح!"

"اسی لیے تم نے ملک چھوڑنے کا فیصلہ کیا؟"

"ہاں کیونکہ اس دن کے بعد اس نے مجھ سے بات کرنی ہی چھوڑ دی تھی۔ جب بھی آمنا سامنا ہوتا تھا، وہ مجھے غصے سے دیکھنے لگتی تھی۔ میں نے اسے ٹھنڈا کرنے کے لیے ایک روز تنہائی میں خود اس سے بات کی۔ اسے بے وقوف بنانے کے لیے میں نے اس سے اس قسم کی باتیں کیں کہ میں اس کے جذبات کی قدر کرتا ہوں اور اب مجھے یقین آ گیا ہے اس لیے میں منگنی توڑ دوں گا اور گریجویشن کرنے کے بعد اس سے شادی کر لوں گا۔"

"اوہ!"

"تم جانتی ہو کہ مجھے جھوٹ بولنا سخت ناپسند ہے لیکن

اسے رام کرنے کے لیے مجھے یہ سب کچھ کہنا پڑا تھا جواب میں اس نے جو کچھ کہا، اس نے تو میرے پیروں تلے سے زمین نکال دی۔ اس نے کہا تھا کہ منگنی توڑنے کی بات تو اس نے بس رواروی میں کی تھی اور یہ کہ وہ مجھے اپنانا چاہتی ہے، مجھ سے شادی نہیں کرنا چاہتی۔''

''کیا!'' فرح کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

''ہاں۔ اس کا کہنا تھا کہ شادی کے بعد اسے کوئی اور بھی پسند آسکتا ہے۔ وہ اسے بھی حاصل کرنا چاہے گی۔ اگر مجھے اس کی اس بات پر کوئی اعتراض نہ ہو تو وہ مجھ سے شادی کرنے کے لیے بھی تیار ہے لیکن بچے وہ کسی صورت میں برداشت نہیں کرے گی۔''

''کیا فاحشہ ہے وہ؟''

''اب تم اسے جو بھی نام دو۔ بہرحال میں نے اسے پھر ٹالنے کی کوشش کی تھی اور اس سے کہا تھا کہ وہ مجھے ایک ہفتے کی مہلت دے۔ میں سوچ کر جواب دوں گا۔ مجھے اپنانے کی اس کی خواہش اتنی شدید تھی کہ وہ ایک ہفتے انتظار کرنے لگی اور میں بھی چاہتا تھا۔''

''کیوں؟''

''میں نے اپنے طور پر تو انگلینڈ بھاگ نکلنے کی تیاری فوراً شروع کردی تھی لیکن ڈیڈی وغیرہ کو بھی آمادہ کرنا تھا کہ وہ مجھے انگلینڈ جانے دیں۔ میں نے ان سے اس سلسلے میں بات بھی شروع کردی تھی۔ ممی خاص طور سے نہیں مان رہی تھیں اور میں انہیں منانے میں لگا ہوا تھا۔ اسی دوران میں ایک چھٹی کے دن میں ساحل سمندر میں اپنی ہٹ کی طرف جانکلا۔ یہ تو تم جانتی ہی ہو کہ مجھے بانسری بجانے کا بہت شوق ہے اور رات کے سناٹے میں بانسری کی آواز مجھے بہت اچھی لگتی ہے۔ اسی بہانے میں کچھ دیر کے لیے اپنی ذہنی پراگندگی سے بھی نجات حاصل کرنا چاہتا تھا لیکن اور پراگندہ ہوگیا۔''

''وہ کیسے؟'' فرح نے جلدی سے پوچھا۔

''مجھے وہاں دس منٹ ہی گزرے تھے کہ اچانک صبیحہ اندر گھس آئی۔ میں دروازہ بند کرنا بھول گیا تھا۔''

''وہ وہاں کیسے پہنچ گئی؟''

''تعاقب کیا ہوگا اس نے میرا۔'' عماد نے کہا۔

''کہیں دیکھا ہوگا تو پیچھے لگ گئی ہوگی۔''

''اور تمہیں پتا ہی نہیں چلا کہ اس کی کار پیچھے لگی ہوئی ہے؟''

''رات کا وقت تھا۔ ساڑھے دس بجے تھے۔ اس وقت لوگ وہاں سے لوٹتے ہیں۔ آتا کوئی کوئی ہے۔ میں نے صرف ایک گاڑی اپنے پیچھے دیکھی تو تھی لیکن فاصلہ بہت زیادہ تھا۔ اندھیرے میں اسے پہچاننا ممکن نہ ہوتا۔''

''اچھا پھر؟...... وہ آگئی ہٹ میں...... اس کے بعد......؟''

''میں اسے دیکھ کر چونک گیا تھا۔ میرے منہ سے کوئی لفظ نہیں نکل سکا تھا۔ بانسری بھی میرے ہاتھ سے گر گئی تھی۔'' عماد چپ ہوگیا۔

''پھر؟'' فرح کی بے تابی بڑھی۔

''اس کے بعد جو کچھ ہوا، وہ خوش گوار نہیں ہوا تھا۔ وہ نہ پوچھو فرح میری جان!''

''اوہ!'' فرح کی نظریں جھک گئیں۔ ''تو...... تو!'' وہ اپنی بات پوری کیے بغیر خاموش ہوگئی۔

''نہیں فرح!'' عماد جلدی سے بولا۔ ''جو کچھ تمہارے دماغ میں آیا، بات اس حد تک آگے نہیں بڑھی تھی۔''

''میرے دماغ میں جو کچھ آیا ہے، وہ تم نے کیسے سمجھ لیا؟''

''تمہارے لہجے سے، تمہارے تاثرات سے اور تم نے بات بھی پوری نہیں کی۔ اسی سے سمجھا ہے میں نے کہ تمہارے دماغ میں کیا آیا ہے۔ میں پھر کہتا ہوں کہ بات اتنی نہیں بڑھی تھی جو تم نے سوچ لی۔''

''پھر کیا ہوا تھا جسے تم ناخوشگوار کہہ رہے ہو؟''

''اس حد تک بھی میرے لیے ناخوشگوار ہی تھا۔''

''کس حد تک؟''

عماد نے ایک طویل سانس لی۔ ''تم جانتی ہو کہ میں جھوٹ بولنے سے گریز کرتا ہوں۔ تم سے تو میں بھی جھوٹ بول ہی نہیں سکتا۔'' وہ پھر چند لمحے خاموش رہنے کے بعد بولا۔ ''وہ میرے قریب آئی اور اس نے میری گری ہوئی بانسری اٹھائی۔ مجھ سے پوچھنے لگی، تمہیں یہ بانسری بہت پسند ہے؟ میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اس نے بانسری کے دو ٹکڑے کردیے اور بولی۔ میں ایسی کسی چیز کا وجود برداشت نہیں کرسکتی جسے تم میرے علاوہ پسند کرو۔ میں چپ رہا۔ میں بیٹھا ہی رہا تھا۔ وہ مسکرا کر بولی، کھڑے تو ہو جاؤ۔ میں کھڑا ہوگیا اور اس وقت میں نے اس سے کہا کہ جب میں اس سے چند دن کی مہلت لے چکا ہوں تو اب وہ اس تنہائی میں میرے پاس کیوں آئی ہے۔ جواب میں اس نے کہا، اس لیے آئی ہوں اور......''

''اور؟'' فرح کی بے چینی بڑھ رہی تھی۔

''اور۔'' عماد ہچکچاتے ہوئے بولا۔ ''وہ مجھ سے لپٹ گئی۔''

اس مرتبہ فرح کے منہ سے ایک لفظ نہ نکل سکا۔ وہ

پلکیں جھپکائے بغیر عماد کی طرف دیکھتی رہی۔

"میں بہرحال ایک مرد ہوں فرح! میں نے زندگی میں پہلی مرتبہ کسی لڑکی کا جسمانی لمس محسوس کیا تھا۔ میرے جسم میں سنسناہٹ پھیل گئی۔ اس نے...... اس نے...... اپنے ہونٹ میرے ہونٹوں پر رکھ دیے۔ میری کچھ عجیب سی کیفیت ہو گئی تھی۔ میں نے اسے بری طرح بھینچ لیا۔"

کوئی خیال تھا کہ فرح کے ہونٹ لرزنے لگے۔ "یہی خیال تو آیا تھا میرے دماغ میں۔"

"نہیں۔ جو کچھ تمہارے دماغ میں آیا تھا، ویسا نہیں ہوا۔ یکایک مجھے تمہارا خیال آ گیا تھا۔ تمہارے ان حقوق کا خیال آ گیا تھا جو شادی کے بعد تمہیں مجھ پر حاصل ہوتے اور حاصل ہوئے ہیں۔ بس اسی خیال سے میرے دماغ کو جو جھٹکا لگا، اس سے میرا وہ ہیجان یکلخت ختم ہو گیا جو اس کے لپٹ جانے کی وجہ سے میرے جسم میں پیدا ہوا تھا۔ میں نے غصے میں ایک جھٹکے سے خود کو اس سے الگ بھی کیا اور اس کے منہ پر ایک زوردار تھپڑ بھی رسید کر دیا۔ اتنا زوردار تھپڑ تھا کہ وہ ذرا دور جا گری۔"

فرح نے بے اختیار ایک طویل سانس لی، جیسے اس کے دل و دماغ سے کوئی بہت بڑا بوجھ ہٹ گیا ہو۔

"اور اس وقت ایک عجیب بات ہوئی۔" عماد بولا۔ "میرا خیال تھا کہ وہ غصے میں زخمی شیرنی کی طرح مجھ پر جھپٹے گی لیکن اس کے برخلاف وہ وہیں پڑی رہی جہاں گری تھی۔ اس نے ایسی سسکاری لی جیسے کسی چیز سے لطف اندوز ہوئی ہو۔ کہنے لگی اور مارو مجھے عماد! اور مارو۔ مجھے غصہ تو آیا ہوا تھا ہی۔ میں نے آگے بڑھ کر اس پر جھکتے ہوئے ایک تھپڑ اور رسید کیا۔ اس کی وہ عجیب سی سسکاریاں اور بڑھ گئیں۔ آنکھوں میں ایسی سرخی چھانے لگی جیسے اسے نشہ ہو گیا ہو۔"

"تو وہ......" فرح یکایک پُرجوش ہوئی۔ "وہ...... وہ بھی ہے...... میں نے کہیں پڑھا ہے...... مساکسٹ کی اصطلاح ہے اس کے لیے۔ جو آدمی کسی قسم کی تکلیف اٹھا کر اس سے لذت حاصل کرتا ہے، اسے مساکسٹ کہتے ہیں۔"

"ہاں فرح! میں بھی جانتا ہوں لیکن اس وقت میرے دماغ میں یہ خیال نہیں آیا تھا۔ اس وقت تو بس دماغ میں یہ سمائی تھی کہ اس موقع کو غنیمت جانوں اور وہاں سے بھاگ نکلوں اور میں نے ایسا ہی کیا۔ میں دوڑتا ہوا ہٹ سے نکلا اور کار میں بیٹھ کر وہاں سے اس طرح روانہ ہوا جیسے موت سے فرار حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے اتنی تیز رفتاری سے کار کبھی نہیں چلائی تھی۔"

"فاحشہ بھی ہے وہ!" فرح نے دانت پیسے۔

عماد اس کی بات پر دھیان دیے بغیر کہتا رہا۔ "واپس آتے ہوئے مجھے یہ خیال بھی آیا تھا کہ اگر آئندہ بھی ایسا کوئی موقع آیا اور اس نے کوئی ایسی حرکت کی کہ میں ہی اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکا تو بات اس حد سے آگے بھی نکل سکتی ہے جس کا خیال تمہیں آ چکا ہے۔ میں ہر قیمت پر اس سے بچنا چاہتا تھا۔ میں تم سے بے وفائی کا مرتکب نہیں ہونا چاہتا تھا۔ ہاں کسی حد تک بے وفائی تو مجھ سے سرزد ہو ہی گئی تھی۔"

"میں سمجھ سکتی ہوں عماد!" فرح نے کہا۔ "مجھے کوئی عملی تجربہ تو نہیں لیکن میں نے پڑھا تو ہے۔ میں سمجھ سکتی ہوں کہ...... بلکہ سمجھ لیا ہے۔ جو کچھ بھی ہوا، اس پر مجھے تم سے کوئی شکایت نہیں ہے۔"

"شکر ہے۔" عماد نے مسکراتے ہوئے طویل سانس لی۔ "میں تو اب تک اس خیال سے تمہیں ٹالتا رہا تھا کہ تمہارے دل پر جانے کیا گزرے گی۔"

"اتنا بے شعور سمجھ لیا تھا مجھے!" فرح نے شاکی لہجے میں کہا۔

"عورت کی فطرت کچھ ایسی ہی ہوتی ہے فرح! کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کب، کس بات کا اثر لے بیٹھے۔"

"کیا وہ اب بھی اس شہر میں ہے؟"

"میں نے کہا تو تھا کہ مجھے اس کا علم نہیں۔ امکان تو یہی ہے کہ وہ ہو گی۔ اس کے باپ کا نام سننے میں آتا رہتا ہے۔"

"اگر اس سے پھر آمنا سامنا ہو گیا تو؟"

"کچھ بہتر نہیں ہو گا۔ خدا کرے کہ ان دو سالوں میں اس کا دماغ کچھ ٹھیک ہو گیا ہو اور اس نے شادی کر لی ہو۔"

☆☆☆

دوسرے ہی دن شام کو صبیحہ اپنے باپ حشمت اللہ خاں سے کہہ رہی تھی۔ "میں شادی تو ہرگز نہیں کروں گی ڈیڈی!"

اس وقت حشمت اللہ خاں، ان کی بیوی رابعہ حشمت اور صبیحہ کا بھائی اشرف گھر کے ٹی وی لاؤنج میں بیٹھے تھے۔ رات کا کھانا کھایا جا چکا تھا۔ اس وقت حشمت اللہ خاں نے یہ بات اس دن پہلی بار نہیں چھیڑی تھی۔ صبح سے کئی بار یہ بات ہو چکی تھی۔ غالباً میاں بیوی نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اب صبیحہ پر دباؤ بڑھانا ہی پڑے گا۔ وہ اب ستائیس سال کی ہو چکی تھی۔ خاندان میں اس کی شادی نہ ہونے پر باتیں بننے لگی تھیں۔

"آخر کب تک نہیں کرو گی؟" حشمت اللہ خاں کچھ

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

بگڑ کر بولے۔ ”جب بھی کوئی رشتہ آتا ہے، تم اس میں کیڑے نکالنے لگتی ہو۔“

”کیڑے ہوں گے تو نکلیں گے بھی۔“ صبیحہ کے لہجے میں سرکشی تھی۔

”کل جو رشتہ آیا ہے، اس میں کیا کیڑے ہیں؟“ رابعہ حشمت بول پڑیں۔ ”اچھا خاصا خوب صورت نوجوان ہے، تعلیم یافتہ بھی ہے۔ اچھے ادارے میں اچھی پوسٹ پر ملازم بھی ہے۔“

”خوب!“ صبیحہ نے نوکیلے لہجے میں کہا۔ ”اب حشمت اللہ خاں کی بیٹی کی شادی ایک ملازمت پیشہ سے ہوگی۔“

”جب اچھے رشتے آرہے تھے تو بھی تم تیار نہیں ہو رہی تھیں۔ اب تمہاری عمر ویسے تو ستائیس سال ہے مگر جانے کیوں اس سے زیادہ عمر کی لگنے لگی ہو۔ اب تو ایسے ہی رشتے آئیں گے۔“

”اسی لیے تو کہا میں نے، میں شادی نہیں کروں گی۔“

”تو پھر اپنے چچا کے پاس امریکا چلی جاؤ۔ وہاں کے معاشرے میں ماں باپ کو لڑکیوں کی شادی کی فکر نہیں ہوتی، یہ فکر ہوتی ہے کہ اب تک ان کی بیٹی کا کوئی بوائے فرینڈ کیوں نہیں ہے۔ تمہارے چچا کی بیٹیاں بھی بوائے فرینڈ بدلتی رہتی ہیں۔“ حشمت اللہ خاں نے زہریلے لہجے میں کہا۔

”میں کہیں نہیں جاؤں گی۔“ صبیحہ ایک جھٹکے سے کھڑی ہوگئی۔ ”یہیں رکوں گی۔“

”تمہیں دو میں سے ایک کام کرنا پڑے گا یا تو امریکا چلی جاؤ یا یہاں رہو تو شادی کرو...... تیسرا کوئی راستہ نہیں۔ میں تمہیں سوچنے کے لیے زیادہ وقت بھی نہیں دے سکتا۔ آج رات سوچ لو۔ صبح مجھے جواب چاہیے۔“ حشمت اللہ خاں نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

صبیحہ کوئی جواب دیے بغیر مڑی اور تیزی سے اوپری منزل کے زینے طے کیے جہاں اس کی خواب گاہ تھی۔ وہ کپڑے تبدیل کیے بغیر بستر پر اس طرح لیٹی جیسے ڈھیر ہوگئی ہو۔ چہرے سے جھنجلاہٹ صاف ظاہر ہو رہی تھی۔ یہ اس کے لیے ممکن نہیں تھا کہ وہ امریکا یا کسی دوسرے ملک چلی جاتی۔ اسے یہیں رہ کر عماد کا انتظار کرنا تھا جسے اس کے خیال کے مطابق واپس تو آنا ہی تھا۔

عماد کے اچانک غائب ہوجانے سے وہ بہت بُری طرح جھنجلا گئی تھی۔ یہ اس کے لیے ناقابلِ برداشت تھا کہ اس کی کوئی بھی پسندیدہ چیز اس کے ہاتھ سے نکل جائے۔ اس نے چھان بین کر کے یہ معلوم کر ہی لیا تھا کہ وہ تعلیم کی غرض سے لندن چلا گیا تھا۔

لندن میں اس کے ایک ماموں رہتے تھے۔ انہی سے ملنے کے بہانے وہ بھی لندن پہنچ گئی تھی۔ سیکنڈ ایئر کے بعد اس نے کالج چھوڑ ہی دیا تھا۔ وہ ہر صورت میں عماد کو تلاش کرنا چاہتی تھی لیکن جلد ہی اسے احساس بھی ہوگیا تھا کہ لندن میں عماد کی تلاش اس کا جذباتی اور احمقانہ فیصلہ تھا۔

ایک ترقی یافتہ ملک کے سب سے اہم شہر لندن میں کالجوں اور یونیورسٹیوں کی بہتات ہے۔ صرف یونیورسٹی کالج لندن، کنگسٹن کالج اور امپیریل کالج ہی کے طلبہ کی چھان بین میں صبیحہ کا اتنا وقت گزر گیا جتنے دن کا وہ ویزا لے کر وہاں پہنچی تھی۔ اسے مایوس ہو کر لوٹنا پڑا۔

دو سال گزر جانے کے بعد سے اب تک وہ عماد کے گھر کے کئی چکر لگا چکی تھی لیکن اسے عماد نظر نہیں آیا تھا۔ اس کے باوجود وہ مایوس نہیں ہوئی تھی۔ اسے یقین تھا کہ کچھ دیر سے سہی، لیکن عماد اسے مل تو جائے گا لیکن اب باپ کا اٹل فیصلہ ایک اچانک آفت کی صورت میں اس کے سامنے آیا تھا۔

وہ دو بجے تک جاگتی رہی، پھر یک بہ یک اس کے ہونٹوں پر ایسی مسکراہٹ آگئی جیسے اس نے کوئی تدبیر سوچ لی ہو۔ اٹھ کر اس نے شب خوابی کا لباس پہنا اور بڑے سکون سے سوگئی......

دوسری صبح جب وہ ناشتے کی میز پر تھی تو ناشتا شروع کرتے وقت ہی اس کے باپ کی سوالیہ نگاہیں اس کی طرف اٹھ گئی تھیں۔ صبیحہ نظریں جھکائے ناشتا کرتی رہی۔ نظریں جھکانے کے بعد بھی وہ محسوس کرتی رہی کہ رابعہ حشمت اور اس کا بھائی اشرف کبھی ایک دوسرے کی طرف، کبھی اس کی طرف اور کبھی حشمت اللہ خاں کی طرف دیکھنے لگتے تھے۔

حشمت اللہ خاں باقی افراد سے پہلے ناشتے سے فارغ ہوگئے لیکن خاموش بیٹھے صبیحہ کی طرف دیکھتے رہے۔ اس دن سے پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا تھا کہ ناشتے کی میز پر ایسی مکمل خاموشی چھائی رہی ہو۔

ناشتا کر چکنے کے بعد صبیحہ نے چائے کے دو تین ہی گھونٹ لیے تھے کہ اعصابی تناؤ پیدا کرنے والا سکوت ٹوٹ گیا۔

”میں تمہارے جواب کا منتظر ہوں۔“ حشمت اللہ خاں بول پڑے تھے۔

”مجھے آپ کا فیصلہ منظور ہے۔“ صبیحہ نے جواب دیا۔

"مبہم جواب ہے تمہارا۔ امریکا جاؤ گی یا......"

"امریکا تو میں ہرگز نہیں جاؤں گی۔" صبیحہ نے بات کاٹی۔

"تو پھر شادی کرنی پڑے گی۔"

"ٹھیک ہے۔ کرلوں گی۔"

رابعہ حشمت اور اشرف چونک پڑے تھے اور حشمت اللہ خاں کے چہرے کا تناؤ بھی یک لخت ختم ہو گیا تھا۔ ان کے ہونٹوں پر بہت ہلکی سی مسکراہٹ آگئی۔ انہوں نے کہا۔ "تمہارا جواب میرے لیے خوش کن لیکن غیر متوقع ہے۔ میرا خیال تھا کہ تم پھر ضد کرو گی، بحث کرو گی لیکن تم نے مثبت فیصلہ کیا ہے۔ ہم تمہارے دشمن تو نہیں ہو سکتے۔ بیٹی ہو تم ہماری۔ ہم تمہاری بھلائی ہی چاہیں گے۔"

"لیکن میری ایک شرط ہے۔" صبیحہ نے کہا۔ اس جواب سے ایک بار پھر سب چونک گئے اور خوشگوار ہو جانے والے ماحول میں پھر تناؤ آ گیا۔

صبیحہ نے بات جاری رکھی۔ "آپ نے میرے مستقبل کے لیے جو انتخاب کیا ہے، ان کی فیملی بہت بڑی ہے۔ میں اتنی بھیڑ بھاڑ میں رہنے کی عادی نہیں ہوں۔ گیارہ افراد ہیں اس گھر میں۔ میں ان سب سے الگ رہنا چاہوں گی۔"

"اوہ!" حشمت اللہ خاں کے منہ سے نکلا۔ "یعنی الگ گھر؟"

"جی۔"

"اور ظاہر ہے کوئی بنگلا۔ کسی چھوٹے موٹے مکان میں تو تم رہ نہیں سکتیں۔"

"جی۔"

"مگر وہ لوگ مالی اعتبار سے اتنے آسودہ نہیں ہیں کہ شادی کے اخراجات کے ساتھ تمہارے لیے بنگلا بھی خرید سکیں لیکن خیر! خدا خدا کر کے تو تم تیار ہوئی ہو شادی کے لیے۔ میں ہی اس کا حل نکالوں گا۔ تمہیں جہیز میں ایک بنگلا دے دوں گا۔ ان لوگوں سے بات کرلی جائے گی۔ میں یہ شرط ان لوگوں کے سامنے تمہاری طرف سے نہیں بلکہ اپنی طرف سے رکھوں گا کہ میری بیٹی اپنے شوہر کے ساتھ الگ گھر میں رہے گی اور بنگلا اسے میں جہیز میں دے دوں گا۔ مجھے یقین ہے کہ ان لوگوں کو اس پر اعتراض نہیں ہوگا۔ ان کے لیے تو یہ بھی ایک اعزاز ہوگا کہ ان کے گھر کی بہو حشمت اللہ خاں کی بیٹی ہے۔ ایک کروڑ کا بنگلا بھی ان کے لیے ایک نعمت ہوگا۔ فیصل کو بھی بنگلا ملنے کی خوشی ہوگی۔"

فیصل سے صبیحہ کی شادی طے کی جا رہی تھی۔

"میں یہ بھی چاہوں گی کہ وہ بنگلا میں شادی سے پہلے دیکھ لوں۔" صبیحہ بولی۔

"یہ بھی ہو جائے گا۔ میں آج ہی یہاں کے ایک سب سے بڑے اسٹیٹ ایجنٹ سے رابطہ کرتا ہوں۔ وہ تمہیں کئی بنگلے دکھا دے گا جو برائے فروخت ہوں گے۔ تم ان میں سے کوئی بنگلا پسند کر لینا۔ چند ہی دن میں اسے ڈیکوریٹ بھی کروا دوں گا۔ شادی کے لیے وہ لوگ جلدی بھی کر رہے ہیں۔ دس دن کے اندر اندر تمہاری شادی ہو جائے گی۔" حشمت اللہ خاں بہت خوش نظر آ رہے تھے۔

"آپ مجھے بتا دیجیے گا کہ بنگلے دیکھنے کب جانا ہے۔"

"آج ہی بتا دوں گا۔ گھر پر ہی رہنا۔"

"بہتر ہے۔" صبیحہ نے کہا اور ناشتے کی میز سے اٹھ گئی۔

دو گھنٹے بعد حشمت اللہ خاں نے اسے اپنے دفتر سے فون کیا، اسٹیٹ ایجنسی اور اس کے مالک کا نام بتا کر کہا۔ "تم ابھی جا کر اس سے مل لو۔"

"جی میں فوراً جا رہی ہوں۔"

اس دن صبیحہ نے چھ بنگلے دیکھے لیکن کسی خاص وجہ سے اسے کوئی پسند نہیں آیا۔ اسٹیٹ ایجنٹ نے کہا کہ اگلے روز وہ اسے پانچ بنگلے اور دکھا سکتا ہے۔

اگلے دن صبیحہ نے وہ بنگلے بھی دیکھے اور اسے ان میں سے ایک پسند بھی آ گیا۔

"شکر ہے۔" حشمت اللہ خاں کے منہ سے نکلا۔

اس کے اگلے دن وہ بنگلا خرید لیا گیا۔ شادی کی تیاریاں بھی شروع ہو گئیں۔ فیصل اور اس کے گھر والوں نے خوشی خوشی حشمت اللہ خاں کی شرط مان لی تھی۔

بارہ دن بعد ان کی شادی بھی ہو گئی۔ صبیحہ بیاہ کر اسی بنگلے میں گئی۔ فیصل کے گھر والے ہی اسے لے گئے تھے لیکن شرط کے مطابق ایک گھنٹے بعد وہ سب رخصت ہو گئے۔ صبیحہ دلہن بنی اس کمرے میں بیٹھی تھی جسے خاص طور سے سجایا گیا تھا۔ جلد ہی فیصل اس کمرے میں داخل ہوا۔

"خوش قسمت ہوں کہ مجھے تم جیسی خوب صورت بیوی ملی۔" وہ صبیحہ کے قریب بستر پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

"آپ بھی کچھ کم تو نہیں ہیں۔" صبیحہ نے کہا لیکن بڑے جلے دل سے۔

فیصل اس کی طرف جھکا۔ اس کا ارادہ صاف ظاہر تھا۔ صبیحہ جلدی سے کھڑی ہو گئی۔ "میں سلیپنگ سوٹ پہن لوں۔ ان بھاری کپڑوں سے تو شدید الجھن ہو رہی ہے۔"

"ہاں ہاں، ضرور۔" فیصل بہت مسرور تھا۔

صبیحہ باتھ روم میں چلی گئی۔ واپسی میں اسے کچھ دیر لگی۔

"اتنا وقت لگا دیا۔" وہ صبیحہ کو باتھ روم سے نکلتے دیکھ کر بولا۔

"ان بھاری کپڑوں سے نجات اور پھر پارلر کا کیا ہوا میک اپ ختم کرنا آسان تو نہیں ہوتا۔" صبیحہ بولی۔

اس نے ایسی حریری نائٹی پہنی تھی جو مرد کے جذبات کو شدت سے برانگیختہ کر سکتی تھی۔ فیصل نے اسے اپنی آغوش میں بھرنے کی کوشش کی تو وہ پیچھے ہٹی "ذرا تو صبر کرو!" وہ بڑے محبت آمیز لہجے میں بولی تھی۔ پھر اس نے فیصل کا ہاتھ پکڑا اور اسے لیے ہوئے بستر کی طرف بڑھی۔

اس نے ایک طائرانہ نظر دیوار گیر کلاک پر بھی ڈالی تھی پھر وہ دونوں بستر پر بیٹھے ہی تھے کہ اندھیرا چھا گیا۔

"ارے!" فیصل کے منہ سے نکلا۔ "لائٹ چلی گئی...... اور یہاں...... کوئی ایمرجنسی لائٹ بھی نہیں لگوائی گئی۔"

"ٹھہرو فیصل! ٹارچ ہے میرے پاس، پنسل ٹارچ۔"

صبیحہ نے بستر کی سائڈ دراز کھولی۔ وہ اس کے قریب ہی بیٹھی تھی۔ اس نے ٹارچ نکال کر جلائی اور اس کی شعاع فیصل پر ڈالی۔

"کچھ بندوبست کرنا ہوگا۔" فیصل بولا۔

پنسل ٹارچ کی روشنی ہی کتنی...... وہ کمرے میں ملگجا سا اجالا کر سکی تھی۔ اس وقت کمرے کا دروازہ آہستہ آہستہ کھل رہا تھا جو فیصل کے دائیں ہاتھ کی جانب تھا۔

"وہ جو کہا ہے کسی نے۔" صبیحہ ہلکی سی ہنسی کے ساتھ بولی۔ "خوشی کی بزم میں کیا کام جلنے والوں کا، تو چراغوں کو بجھنا ہی چاہیے تھا نا فیصل!"

"لیکن......" فیصل جانے کیا کہنا چاہتا تھا مگر اس کی بات پوری نہیں ہو سکی۔

دروازہ تو بہت آہستگی سے کھلا تھا لیکن پھر اندر آنے والا سیاہ پوش نہایت برق سرعت سے قریب آیا اور اس نے اپنے دستانہ پوش ہاتھوں سے فیصل کی گردن دبوچ لی تھی۔ فیصل کے منہ سے بڑی گھٹی گھٹی سی مدھم آواز نکل سکی تھی۔

اس کے دونوں ہاتھ اپنی گردن پر گئے۔ اس نے زور لگا کر دستانہ پوش ہاتھوں کی گرفت سے اپنی گردن نکالنا چاہی لیکن سیاہ پوش اس سے خاصا زیادہ طاقتور تھا۔

پنسل ٹارچ کی روشنی میں صبیحہ خاموشی سے سارا منظر دیکھ رہی تھی۔ اس کا چہرہ جذبات سے عاری تھا۔ بہت جلد فیصل کی سانس گھٹ گئی۔ سیاہ پوش نے اسے چھوڑا تو وہ کٹے ہوئے شہتیر کی طرح فرش پر گرا۔

"ختم ہو گیا؟" صبیحہ نے پوچھا۔

"بچنے کا کیا سوال ہے؟" سیاہ پوش کے دھیمے لہجے میں بھی کرختگی تھی پھر بھی اس نے جھک کر اپنا مزید اطمینان کرنے کے لیے فیصل کی نبض اور دل کی دھڑکن چیک کی۔

"ختم۔" وہ کہتا ہوا سیدھا ہو گیا۔

"ایک منٹ۔" صبیحہ نے کہا اور تیزی سے باتھ روم میں چلی گئی۔ اس نے اپنے زیورات وہیں اتارے تھے۔ وہ سب اٹھا لائی۔ بیڈ کی دراز میں سے زیورات کے ڈبے نکالے۔ ٹارچ ہی کی روشنی میں اس نے سب زیورات قرینے سے رکھے۔ اس دوران میں سیاہ پوش خاموش کھڑا رہا تھا۔

"یہ سب لے جانا تم!" صبیحہ نے اس سے کہا۔ "اور وہ...... بے ہوشی......"

سیاہ پوش نے اپنے لباس سے ایک چھوٹی سی شیشی نکالی۔

"میں آدھے گھنٹے سے زیادہ بے ہوش نہ رہوں۔" صبیحہ بولی۔

"زیادہ بے ہوشی کا سوال ہی کیا ہے۔" سیاہ پوش کو شاید اسی قسم کے الفاظ بولنے کی عادت تھی۔

"تو جلدی کرو۔" صبیحہ بستر پر لیٹ گئی۔

سیاہ پوش نے اس کے قریب آتے ہوئے شیشی کا کارک نکالا اور شیشی صبیحہ کی ناک کے قریب کر کے بولا۔ "طویل سانس!"

صبیحہ نے طویل سانس لی اور اس کے ساتھ ہی اس کے دماغ پر تاریکی چھا گئی۔

جب اسے ہوش آیا تو اس نے سر میں ہلکا سا بھاری پن محسوس کیا۔ وہ چند لمحے پلکیں جھپکا کر اٹھ بیٹھی۔ اس وقت کمرے میں روشنی تھی۔ صبیحہ نے فرش پر پڑی ہوئی فیصل کی لاش پر ایک نظر ڈالی اور پھر سائڈ ٹیبل پر رکھا ہوا اپنا موبائل فون اٹھایا۔ اس نے حشمت اللہ خاں سے رابطہ کیا جو کئی گھنٹیوں کے بعد ہو سکا تھا۔

"ڈیڈی!" وہ کمال کی روہانسی آواز میں بولی۔

"اس وقت!" حشمت اللہ خاں کے لہجے میں حیرت تھی۔ "خیریت؟"

"نہ جانے کیا ہوا ڈیڈی!" اس مرتبہ صبیحہ کی آواز میں کپکپاہٹ بھی تھی۔

"کیا ہو گیا؟" حشمت اللہ خاں کے لہجے میں بے تابی تھی۔

"یہاں...... یہاں...... میں تو...... بے ہوش ہو گئی تھی...... اس نے مجھے نہ جانے کیا سونگھایا تھا۔" صبیحہ اٹک اٹک کر بولی۔

''فیصل نے؟'' حشمت اللہ خاں چونکے۔
''نہیں۔ میں اس کی شکل نہیں دیکھ سکی۔ ابھی ہوش آیا ہے......مجھے......اور......اور یہاں......فیصل کی لاش پڑی ہے۔''
''کیا!'' حشمت اللہ خاں اچھل ہی پڑے۔
''میں کیا کروں ڈیڈی!'' اس مرتبہ صبیحہ کا انداز ایسا تھا جیسے رو پڑے گی۔
''میں......آرہا ہوں......فوراً آرہا ہوں۔ پولیس کو بھی فون کردوں گا۔ تم برآمدے میں آجاؤ۔''
حشمت اللہ خاں اتنے گھبرا گئے تھے کہ جواب کا انتظار کیے بغیر انہوں نے فون بند کردیا۔
اب صبیحہ کے ہونٹوں پر زہریلی سی مسکراہٹ تھی۔ اس نے نفرت کی ایک نظر فیصل کی لاش پر ڈالی اور الماری سے ایک چادر نکالی۔ نائٹی پر اس نے چادر اوڑھ لی اور دروازے کی طرف بڑھی۔
ابھی بنگلے میں ملازمین نہیں رکھے گئے تھے۔ پھاٹک پر صرف ایک چوکیدار تھا۔

☆☆☆

دوسرے دن عماد اپنے دفتر میں تھا۔ اگر کسی وقت کچھ فرصت ہوتی تو وہ اپنے موبائل پر خبریں سن لیا کرتا تھا۔ اس دن اس نے ایک ایسی خبر سنی کہ اس کا سارا جسم سنسنا گیا۔
خبر کے مطابق حشمت اللہ خاں کی بیٹی صبیحہ کے شوہر فیصل کو اس وقت قتل کردیا گیا تھا جبکہ ان کی شادی ہوئے چند ہی گھنٹے گزرے تھے۔ قاتل نے صبیحہ کو بے ہوش کرکے فیصل کو گلا گھونٹ کر مار ڈالا تھا اور قیمتی زیورات لے کر فرار ہوگیا تھا۔ صبیحہ کا باپ حشمت اللہ خاں، فیصل کے گھر والے اور پولیس جائے واردات پر بہت جلد پہنچی تھی کیونکہ صبیحہ نے ہوش میں آتے ہی اپنے باپ کو فون پر اس کی اطلاع دی تھی۔ پولیس اب تفتیش کررہی تھی۔ اس معاملے میں فوری طور پر کچھ اور نہیں بتایا گیا تھا۔
اس خبر نے عماد کو ہیجان میں مبتلا کردیا۔ اس نے فوراً فرح کو فون کیا۔
''کیا کررہی ہو؟'' عماد نے پوچھا۔
''سر میں ہلکا سا درد تھا۔ چائے بنا کر پی رہی ہوں۔ کیا بات ہے عماد! تم کچھ پریشان سے لگ رہے ہو۔''
''کچھ ایسی ہی بات ہے۔ میں ایک ضروری فائل دیکھ کر ابھی گھر آتا ہوں۔ تم ذرا ٹی وی کھول لو۔ ابھی ایک خبر سنی ہے۔ وہ دوبارہ بھی آسکتی ہے۔ خاصا غیر معمولی واقعہ ہوا ہے۔ خبر صبیحہ کے بارے میں ہے۔''

''کیا؟'' فرح چونکی۔ ''صبیحہ کے بارے میں؟''
''ہاں۔ کل رات جب ہم اس کے بارے میں باتیں کررہے تھے، اس وقت وہ واقعہ ہوچکا تھا۔''
''کیسا واقعہ؟''
''تفصیلی بات ہے۔ فون پر نہیں ہوسکتی۔ آکر بتاؤں گا۔ تم ٹی وی تو کھول لو۔''
''اچھا میں دیکھتی ہوں۔''
عماد نے رابطہ ختم کرکے پانی پیا۔ گلاس میز پر ہی رکھا ہوا تھا۔ اس کے سامنے ایک فائل بھی کھلی ہوئی تھی لیکن اس نے محسوس کیا کہ اس وقت فائل دیکھتے ہوئے اس کا دماغ حاضر نہیں رہ سکے گا۔ اس نے فائل بند کردی اور اپنے اسسٹنٹ کو بلا کر اسے کچھ ہدایات دیں اور بتایا کہ اس کی طبیعت کچھ خراب ہورہی ہے اس لیے وہ گھر جارہا ہے۔
ذرا دیر بعد ہی اس کی کار سڑکوں پر فراٹے بھر رہی تھی۔ ابھی دوپہر ہی تھی اس لیے ٹریفک زیادہ نہیں تھا۔ وہ جلد ہی گھر پہنچ گیا۔ فرح بے چینی سے اس کی منتظر تھی۔ اس نے بتایا کہ مختلف ٹی وی چینلز پر وہ خبر اب بھی آرہی ہے۔
''لیکن یہ کیا معاملہ ہوسکتا ہے عماد؟'' وہ پریشان لہجے میں بولی۔
''ابھی کچھ بھی واضح نہیں لیکن مجھے ایک شبہ ضرور ہے۔''
''وہ کیا؟''
''صبیحہ شادی تو کرنا ہی نہیں چاہتی تھی۔ میرا خیال ہے کہ اس نے یہ شادی اپنے والدین کے مجبور کرنے پر کی ہوگی لیکن کیونکہ وہ شادی شدہ زندگی نہیں گزارنی چاہتی تھی لہٰذا اس نے فیصل کو پہلی ہی رات مار ڈالا۔''
''یعنی قتل کردیا۔'' فرح تیزی سے بولی۔
''ہاں۔ اسے قتل ہی کہا جاسکتا ہے۔''
''لیکن صبیحہ تو بے ہوش تھی۔''
''یہ تو اس کا اپنا بیان ہے نا۔''
''تم نے شاید بس ابتدائی خبر سنی ہے۔ بعد کی خبروں میں کچھ تفصیل بھی آئی ہے۔ کمرے میں پولیس کو ایک چھوٹی سی شیشی بھی ملی ہے۔ اس میں کوئی ایسی چیز تھی جس نے صبیحہ کو بے ہوش کیا......خود صبیحہ کا بھی یہی بیان ہے کہ اس نے ڈاکو کی بس ایک جھلک ہی دیکھی تھی جب وہ اسے شیشی سونگھا رہا تھا۔ پھر جب اسے ہوش آیا تو فیصل کی لاش پڑی دیکھی۔ اتنی جلدی پوسٹ مارٹم رپورٹ تو نہیں آسکتی لیکن پولیس نے بھی خیال ظاہر کیا ہے کہ فیصل کو گلا گھونٹ کر مارا گیا تھا۔''
''یہ بات تو ابتدائی خبر ہی میں آگئی تھی۔''

''تو پھر سوچو نا عماد! کیا ایک لڑکی کسی مرد کو گلا گھونٹ کر مار سکتی ہے؟''

''ہاں، یہ بات واقعی الجھی ہوئی ہے۔ تفتیش آگے بڑھے گی تو معاملہ کھلے گا۔ اگر فی الحال یہی فرض کرلیا جائے کہ فیصل کو گلا گھونٹ کر مارا گیا ہے اور یہ قتل صبیحہ کی خواہش کے مطابق ہوا ہے تو پھر یہ بھی ماننا پڑے گا کہ اس معاملے میں کسی مرد نے بھی اس کی مدد کی ہے۔ رہی بے ہوشی کی بات تو وہ جھوٹ بھی ہوسکتی ہے۔''

''وہاں ایک شیشی پڑی ملی ہے۔ لیبارٹری کی رپورٹ سے معلوم ہوہی جائے گا کہ اس میں کیا تھا۔''

''اگر یہ بھی معلوم ہوجائے کہ اس میں بے ہوش کرنے والا کوئی مادہ تھا، تو وہ کہیں پھینک کر شیشی وہاں ڈال دی گئی ہوگی۔ پولیس کو دھوکا دینے کے لیے۔ صبیحہ بے ہوش نہیں ہوئی ہوگی اس سے۔''

''تم آخر اسی پر کیوں اڑے ہوئے ہو کہ اسے صبیحہ ہی نے قتل کیا ہوگا یا کسی سے قتل کروایا ہوگا۔''

''پہلی بات تو میں بتا ہی چکا ہوں۔ وہ شادی کرنا ہی نہیں چاہتی تھی۔ مجبوراً کی ہوگی اس نے یہ شادی اور وہ واقعہ تو میں بتا ہی چکا ہوں کہ کالج کی ایک لڑکی بھی اسی طرح موت کا شکار ہوئی تھی اور صبیحہ نے مجھے یہ تاثر بھی دیا تھا کہ اس نے اس لڑکی کو مروایا تھا۔ اس کا سارا قصہ میں تمہیں کل رات سنا ہی چکا ہوں۔''

''تمہاری ان باتوں نے تو مجھے پریشان کردیا۔ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ صبیحہ بہت سفاک ہے۔''

''سفاک بھی، عیار بھی، ضدی بھی اور اذیت پسند بھی۔ تم کل اس کے لیے مساکسٹ کی اصطلاح استعمال بھی کر چکی ہو۔''

''اگر وہ تمہارے خیال کے مطابق اتنی ہی ضدی ہے تو تمہارے اچانک غائب ہوجانے سے اس پر کیا گزری ہوگی۔''

''کھسیائی بھی ہوگی اور اسے غصہ بھی آیا ہوگا۔ اس نے مجھے تلاش کرنے کی بھی کوشش کی ہوگی۔ شاید اس نے کسی طرح یہ بھی معلوم کرلیا ہو کہ میں پڑھنے کے لیے انگلینڈ چلا گیا ہوں۔ اس صورت میں اسے یہ یقین بھی ہوگا کہ میں واپس تو آؤں گا۔ وہ مستقل میری تاک میں رہی ہوگی۔ اس نے میرے گھر کے چکر بھی لگائے ہوں گے کہ میں انگلینڈ سے واپس آؤں تو وہ مجھے دیکھ لے۔ یہ میری خوش قسمتی ہے کہ واپس آنے اور تم سے شادی کرنے کے بعد بھی ہم دونوں اسی گھر میں رہے تھے لیکن میں صبیحہ کی نظر میں نہیں آیا۔''

عماد کے والد بہت ذہین اور سلجھے ہوئے انسان تھے۔ ان کے بڑے بیٹے کی بیوی بہت تنک چڑھی تھی۔ انہوں نے دس بارہ ہی دن میں محسوس کرلیا ہوگا کہ اپنی جیٹھانی سے فرح کی بن نہیں سکے گی اور کسی موقع پر شاید تلخی بھی ہوجائے لہٰذا انہوں نے فیصلہ کیا کہ ایسا کوئی موقع آنے سے پہلے ہی عماد اپنی بیوی کے ساتھ ان کے گھر سے الگ ہوجائے۔ یہ ان کے علم میں پہلے ہی سے تھا کہ عماد کو بینک کی طرف سے بنگلا مل سکتا ہے۔ خود عماد چاہتا تھا کہ وہ شادی کے بعد بھی اپنے والدین وغیرہ کے ساتھ رہے لیکن اس کے والد نے اسے سمجھایا کہ صورتِ حال کسی وقت خراب بھی ہوسکتی ہے۔ انہوں نے یہاں تک کہا تھا کہ فاصلہ بڑھ جائے تو محبت کم نہیں ہوتی بلکہ بڑھ جاتی ہے۔ آخر عماد کو ان کی بات ماننا ہی پڑی تھی۔ اس نے بینک سے یہ بنگلا لے لیا تھا اور فرح کے ساتھ یہاں منتقل ہوگیا تھا۔ وہ خود اپنے والدین سے ملنے کبھی کبھی تھوڑی دیر کے لیے چلا جاتا تھا اور ایک آدھ مہینے میں فرح بھی اس کے ساتھ وہاں ہو آتی تھی۔

فرح بولی۔ ''وہاں سے الگ ہونے کے بعد بھی ہم کبھی کبھی وہاں جاتے تو رہے ہیں۔''

''اسے میں خوش قسمتی ہی کہوں گا کہ اس کے باوجود صبیحہ کی نظر میں نہیں آیا۔ نہ جانے کیا ہوجاتا اگر وہ مجھے دیکھ لیتی اور اگر اس نے واقعی فیصل کو قتل کیا ہے اور کرایا ہے اور یہ ثابت بھی ہوگیا تو اس کا ٹھکانا جیل ہی ہوگا۔ اس کے بعد مجھے کوئی پریشانی نہیں رہے گی۔''

''کیا تم اس سے اتنے خوف زدہ ہو عماد؟'' فرح نے اسے غور سے دیکھا۔

''ہاں، میں خوف زدہ ہوں لیکن اپنے لیے نہیں، تمہارے لیے۔ وہ یہ برداشت نہیں کرے گی کہ میں تمہارا ہوچکا ہوں۔ وہ تمہیں بھی کسی قسم کا نقصان پہنچا سکتی ہے۔ تمہیں یاد نہیں؟ میں نے تمہیں بتایا تھا۔ اس نے میری پسندیدہ بانسری تک توڑ کے پھینک دی تھی۔''

فرح چند لمحے خاموش رہی پھر بولی۔ ''کیا وہ مجھے قتل......''

''خدا نہ کرے!'' عماد جلدی سے بول پڑا۔ ''میں اپنے جیتے جی تو تم پر کوئی آنچ نہیں آنے دوں گا لیکن کوئی گڑبڑ تو ہو کر رہے گی اگر اسے سزا نہ ہوئی اور اس نے مجھے دیکھ لیا۔''

فرح پھر ذرا سی دیر چپ رہی پھر کھڑے ہوتے

ہوئے بولی۔ ”چلیں اب کھانا کھالیں۔ آج ایک بجے سے پہلے ہی گھر آگئے ہو۔ دفتر میں تو لنچ کیا نہیں ہوگا۔“

”اس خبر نے بھوک بالکل اڑادی ہے۔“

”تو کیا اب کھانا پینا چھوڑ کر اسی کے بارے میں سوچنا اور باتیں کرنی ہیں۔ جب کچھ ہوگا تو دیکھا جائے گا۔ چلو اٹھو۔“

”آج احساس ہوا کہ تم بہت باہمت بھی ہو۔“ عماد نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا اور کھڑا ہوگیا۔ ”تمہاری جگہ کوئی عام سی لڑکی ہوتی تو وہ بہت گھبرا جاتی۔“

”پریشان تو خیر میں بھی ہوئی ہوں لیکن اس کی وجہ سے کھانا پینا تو نہیں چھوڑا جاسکتا عماد!“

وہ دونوں ڈائننگ روم کی طرف بڑھے۔

☆☆☆

صبح ہونے تک پولیس اپنا کام مکمل کر کے جاچکی تھی۔ جاتے جاتے پولیس آفیسر نے کہا تھا۔ ”کیونکہ صبیحہ صاحبہ نے کسی پر شک ظاہر نہیں کیا ہے اور مقتول کے گھر والے بھی کہہ رہے ہیں کہ ان کے بیٹے کی کسی سے دشمنی نہیں تھی اس لیے یہ مقدمہ کسی نامعلوم شخص ہی کے خلاف درج کیا جاسکے گا جس نے قتل کیا اور ڈاکا ڈالا، تاہم ابھی تفتیش تو جاری رہے گی۔“

کیونکہ گھر میں فیصل کے سبھی گھر والے موجود تھے اس لیے ماحول پر شدید غمزدگی تھی۔ صبیحہ کے چہرے پر بھی افسردگی تھی جو حشمت اللہ خاں کے علاوہ ان کے گھر کے باقی دونوں افراد کے لیے بھی تعجب خیز تھی۔

آخر تنہائی میں حشمت اللہ خاں بول ہی پڑے۔

”تمہارا غم زدہ چہرہ میرے لیے تعجب خیز ہے صبیحہ!“

”کیوں!“ صبیحہ نے غم ناک آنکھوں سے ان کی طرف دیکھا۔ یقیناً وہ ایک اچھی اداکارہ بھی تھی۔

حشمت اللہ خاں نے کہا۔ ”ایک تو میرے اندازے کے مطابق تم نے یہ شادی میرے دباؤ کی وجہ سے کی تھی، دوسرے یہ کہ فیصل کے ساتھ تمہارا بہت کم وقت گزرا ہے۔ اتنی جلدی اس کے لیے تم جیسی لڑکی کی افسردگی میرے لیے ناقابلِ فہم ہے۔“

”وہ بہت اچھے انسان تھے ڈیڈی!“ صبیحہ نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ”ان کی ذرا دیر کی باتوں ہی نے میرا دل موہ لیا تھا۔ اتنے اچھے انسان کے اس طرح چلے جانے کا افسوس کیا غیر فطری بات ہے؟“

”نہیں، غیر فطری تو نہیں لیکن تمہارے مزاج کے خلاف ہے۔“ حشمت اللہ خاں نے کہا۔ ”اتنی جلدی تمہارا دل موہ لینے سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ فیصل غیر معمولی صلاحیتوں کا مالک تھا۔“

صبیحہ کچھ نہیں بولی۔ فیصل کی لاش پولیس والے اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ پوسٹ مارٹم کے بعد تین بجے لاش ورثاء کے حوالے کردی گئی۔ شام تک تدفین بھی ہوگئی۔ فیصل کے گھر والے بھی دس بجے تک رخصت ہوگئے۔

”اب تمہارا کیا ارادہ ہے؟“ حشمت اللہ خاں نے صبیحہ سے پوچھا۔

”عدت کے دن تو مجھے اسی گھر میں گزارنے ہوں گے۔“

اس جواب پر رابعہ حشمت نے چونک کر اس کی طرف اور پھر معنی خیز نظروں سے اپنے شوہر کی طرف دیکھا۔ حشمت اللہ خاں کی نظر بھی ان کی طرف اٹھی تھی۔ پھر انہوں نے صبیحہ سے کہا۔ ”لیکن یہاں کوئی ملازم تو ہے نہیں۔ بس چوکیدار ہے۔ میں نے بس اسی کا بندوبست کیا تھا۔ فیصل کی خواہش تھی کہ گھریلو کام کاج کے لیے ملازمین وہ اپنی مرضی سے رکھے۔“

”جی۔“ صبیحہ نے آہستہ سے کہا۔ ”اگر وہ زندہ ہوتے تو آج کچھ بندوبست کرتے۔“

”کتنے ملازمین کی ضرورت پڑے گی؟“

”دو ہی کافی ہوں گے۔ ایک خانساماں، ایک گھر کا سودا سلف لانے اور گھر کی صفائی کے لیے۔“ صبیحہ نے کہا۔ ”آپ نے شاید بتایا تھا کہ چوکیدار ہی مالی کا کام بھی کرلے گا۔“

”ہمارے گھر میں ملازمین کچھ زیادہ ہی ہیں۔ میں ان ہی میں سے دو کو یہاں بھجوا دیتا ہوں۔“

”جیسا آپ مناسب سمجھیں۔“

”اشرف سے کہہ دوں کہ وہ بھی اتنے عرصے تمہارے ساتھ یہیں رہے؟“

”اس کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے اکیلے میں ڈر نہیں لگے گا۔ دو ملازمین بھی تو آہی جائیں گے۔“

”ہوں۔“ حشمت اللہ خاں نے کچھ سوچا پھر کہا۔ ”اچھا، تو اب ہم جاتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ پولیس تو ابھی آئے گی یہاں کچھ تفتیش کرنے...... تم سے کسی قسم کے سوالات بھی ہوسکتے ہیں۔ تم مجھے فون کرکے بلالینا۔“

”ایسی تو کوئی بات نہیں ہے کہ میں پولیس کے سوالوں کا جواب نہ دے سکوں۔ جو بیان میں دے چکی ہوں، وہ اس کے علاوہ کیا پوچھیں گے؟“

”تفتیش ہوتی ہے، تو نئے نئے سوال ابھرتے ہیں۔“

خیر! میں نے ایک بڑے پولیس آفیسر کو فون کر دیا ہے۔ تفتیش کرنے والے اپنے روایتی انداز میں تنگ نہیں کریں گے تمہیں!"

"جی!"

"میں فون کر کے دو ملازمین کو تو ابھی بلوا لیتا ہوں۔"

صبیحہ چپ رہی۔ حشمت اللہ خاں نے اپنے گھر فون کر کے دو ملازمین اسی وقت بلوا لیے۔ ان میں ایک خانساماں تھا۔ خانساماں کو صبیحہ نے ہدایت کر دی کہ وہ سرونٹ کوارٹر میں رہے۔ دوسرے ملازم کے لیے اس نے ڈرائنگ روم کے قریب کا ایک چھوٹا سا کمرا وقف کر دیا۔

بارہ بجے کے قریب حشمت اللہ خاں اپنی بیوی اور بیٹے اشرف کے ساتھ رخصت ہو گئے۔ اس کے بعد صبیحہ نے خواب گاہ کا رخ کیا۔ جب وہ بستر پر لیٹی تو اس کے ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ تھی۔

"شادی۔" وہ زیر لب بڑبڑائی پھر عجیب سے انداز میں دھیرے سے ہنس کر اس نے اپنا موبائل فون اٹھایا۔ کسی سے رابطہ کر کے اس نے انگریزی میں کہا۔ "کارلوس!...... دو تین روز اپنی نقل وحرکت محدود رکھنا۔"

"جیسا آپ کا حکم میڈم!" دوسری طرف سے بھی انگریزی میں جواب دیا گیا۔ لہجے سے ظاہر ہوا کہ اس کی مادری زبان انگریزی نہیں ہو سکتی تھی۔ آواز میں کرختگی بھی تھی۔

صبیحہ نے موبائل آف کر دیا۔ جلد ہی اسے نیند آ گئی لیکن صبح اس کی آنکھ دیر سے کھلی۔ اس نے انٹر کام پر خانساماں کو ناشتا تیار کرنے کی ہدایت کی اور باتھ روم میں جا گھسی۔ غسل تین منٹ کا تھا۔ جب وہ کپڑے تبدیل کر کے باہر نکلی تو ناشتا تیار تھا۔

گیارہ بج چکے تھے جب اس کے موبائل فون پر پولیس آفیسر جعفری کی کال آئی۔ گزشتہ صبح تفتیش کر کے وہی گیا تھا اور صبیحہ سے اس کا موبائل نمبر معلوم کر گیا تھا۔

"معاف کیجیے گا۔" وہ بولا۔ "میں نے آپ کی نیند تو خراب نہیں کی؟"

"نہیں۔ میں جاگ رہی ہوں۔"

"میں جلدی فون کرتا لیکن اس خیال سے نہیں کیا کہ رات آپ دیر سے سوئی ہوں گی اس لیے شاید جاگیں گی بھی دیر سے۔"

"بات کیا ہے؟"

"حاضر ہونا چاہتا تھا۔ کل تو گھر کا ماحول ایسا تھا کہ زیادہ بات کرنا میں نے مناسب نہیں سمجھا۔"

"آجائیے! میں منتظر ہوں۔" صبیحہ نے جواب دے کر رابطہ منقطع کر دیا۔

بیس منٹ بعد ہی پولیس آفیسر جعفری ڈرائنگ روم میں اس کے سامنے بیٹھا تھا۔

"لیبارٹری کی رپورٹ مل گئی ہے۔" وہ بولا۔ "اسی میں بے ہوش کر دینے والا محلول تھا۔ قاتل نے وہ آپ کو سونگھانے کے بعد فیصل صاحب کو بھی سونگھانا چاہا ہوگا۔ میں قیاس کر سکتا ہوں کہ انہوں نے ہاتھ مار کر قاتل کے ہاتھ سے شیشی گرا دی تھی۔ وہ محلول فرش پر گرا تھا جو میں اٹھا لے گیا تھا۔ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ سے معلوم ہوا ہے کہ جب انہیں گلا گھونٹ کر مارا گیا، وہ اس وقت اس محلول کے زیر اثر نہیں تھے۔ قاتل انہیں بھی بے ہوش کر کے ہی گلا گھونٹتا لیکن اسے اس کا موقع نہیں مل سکا۔ جس طرح گلا گھونٹا گیا ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ کوئی بہت طاقت ور شخص تھا۔ فیصل صاحب خود کو اس سے بچا نہیں سکے۔ بہر حال سب سے پہلے ذہن میں یہ سوال کھڑا ہوتا ہے کہ وہ گھر میں آیا کیسے؟ چوکیدار نے تو بہت یقین سے بیان دیا ہے کہ اس طرف سے کوئی اندر نہیں آیا۔ اس کے داخلے کا دوسرا راستہ عقبی دروازہ ہو سکتا ہے۔ میں وہاں کا جائزہ بھی لے چکا ہوں اور ایک اہم بات معلوم بھی ہوئی ہے۔"

"وہ کیا ہے؟" صبیحہ نے بے تابی کا اظہار کیا۔

"قاتل نے غالباً اسفنج کی چپلیں پہنی ہوئی تھیں۔ آپ کے کمرے تک اس کے آنے جانے کے نشانات ملے ہیں۔"

"وہ نشانات تو میرے بھی ہو سکتے ہیں۔"

"وہ کیسے؟ کیا مطلب؟"

"غسل کرنے کے بعد میں عموماً اسفنج کی چپلیں ہی استعمال کرتی ہوں۔ رات غسل کرنے کے بعد اپنا اطمینان کرنے کے لیے میں عقبی دروازے تک گئی تھی۔ یہ بنگلا خریدا بھی گیا ہے حال ہی میں، اس لیے میں نے احتیاط ضروری سمجھی تھی۔"

"اوہ! کیا میں آپ کی چپل دیکھ سکتا ہوں؟"

"ضرور! میں لاتی ہوں۔" صبیحہ کھڑی ہوئی۔

"ملازم سے منگوا لیجیے۔" جعفری جلدی سے بولا۔

"ملازم کو میں اسی وقت کمرے میں بلاتی ہوں جب میں خود بھی وہاں موجود ہوں۔" صبیحہ نے جواب دیا۔ "میں آتی ہوں لے کر۔"

وہ اپنے کمرے میں گئی۔ اسے یقین تھا کہ جعفری کو کارلوس ہی کے قدموں کے نشانات ملے ہوں گے۔ نہایت

توانا ہونے کے باوجود اس کے پیر چھوٹے تھے۔ بالکل وہی سائز تھا جو صبیحہ کی چپل کا تھا۔ وہ پہلے ہی اندازہ لگا چکی تھی کہ پولیس وہ نشانات تلاش کرلے گی اور اسی لیے اس نے کارلوس کو ہدایت کی تھی کہ وہ اسفنج کی چپل پہن کر آئے۔

صبیحہ کی لائی ہوئی چپلیں دیکھ کر جعفری نے قدرے ہچکچاہٹ سے کہا۔ ”اگر آپ برا نہ مانیں تو ایک بات عرض کروں۔“

”فرمایئے۔“

”آپ یہ چپلیں پہن کر اس دروازے تک جایئے اور آیئے۔ میں ان کے نشانات بھی لوں گا۔ اگر نشانات میں فرق ہوا تو یقین کیا جاسکے گا کہ جو نشانات مجھے کل ملے تھے، وہ قاتل ہی کے قدموں کے تھے۔“

”ضرور۔“ صبیحہ اپنی سینڈلیں اتارنے لگی۔

”میں آپ سے یہ عمل کرواتے ہوئے بہت شرمندہ ہوں۔“

”قانون کی مدد کرنا میرا فرض ہے اور پھر معاملہ میرے شوہر کے قاتل کا ہے۔ میں تو چاہوں گی کہ وہ جلد از جلد گرفتار ہوکر اپنے انجام کو پہنچے۔“

”آپ کا جذبہ قابلِ قدر ہے۔“ جعفری نے کہا اور اپنے موبائل پر کسی سے رابطہ کرتے ہوئے بولا۔ ”آپ کو بس پندرہ بیس منٹ انتظار کرنا ہوگا۔ میں پرنٹ سیکشن کے لوگوں کو بلا رہا ہوں۔“

”کوئی حرج نہیں۔ میں انتظار کرلوں گی۔ میں نے کہا نا کہ قانون کی مدد کرنا تو ہر شہری کا فرض ہے۔“

بیس منٹ میں ہی پرنٹ سیکشن کے تین آدمی آگئے۔ جعفری کے ساتھ ہی صبیحہ بھی کھڑی ہوگئی۔ وہ سیاہ ساڑی باندھے ہوئے تھی۔ اس کے ساتھ اسفنج کی چپلیں بڑی عجیب سی لگ رہی تھیں۔ وہ اطمینان سے جعفری کے ساتھ چلتی ہوئی عقبی دروازے تک پہنچی۔ پرنٹ سیکشن کے آدمی ان کے پیچھے اس احتیاط سے آرہے تھے کہ ان کے قدم جعفری اور صبیحہ کے قدموں کے ساتھ گڈمڈ نہ ہوسکیں۔

”یہ تو میں بتا ہی چکی ہوں کہ یہ آٹو لاک ہے۔“ صبیحہ نے کہا۔ ”اسے باہر سے کھولنے کے لیے چابی کی ضرورت پڑتی ہے، اندر سے نہیں۔“

”جی آپ نے بتایا تھا۔ آیئے اب واپس چلیے۔“

وہ دونوں واپسی کے لیے مڑے۔ پرنٹ سیکشن کے آدمیوں نے اپنے کام کا آغاز دروازے ہی سے کردیا۔

جعفری اور صبیحہ ڈرائنگ روم میں آبیٹھے۔ صبیحہ چپلیں اتار کر سینڈل پہننے لگی۔ جعفری اس کی چپلیں دیکھتے ہوئے بولا۔ ”جو نشانات مجھے مل چکے ہیں، ان کے اور آپ کی چپل کے سائز میں بہت کم فرق معلوم ہوتا ہے لیکن اگر یہ مان لیا جائے کہ وہ نشانات آپ ہی کی چپلوں کے نہیں تھے تو پھر کس کے تھے۔“

”یہ تو آپ ہی کو سمجھنے کی ضرورت ہے، یا جب وہ قاتل مل جائے گا تو اسی سے پوچھیے گا۔“ صبیحہ نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

”اچھا یہ بتایئے کہ فیصل صاحب سے کسی کو دشمنی تو نہیں تھی؟“

”میں ان کے ساتھ بہت کم وقت گزار سکی۔ اگر کوئی دشمن ہوگا بھی تو وہ مجھ سے اس کا ذکر نہیں کرسکے۔“

”میں ان کے گھر والوں سے تو پوچھ گچھ کرچکا ہوں۔ ان کے بیان کے مطابق فیصل صاحب اس قسم کے آدمی ہی نہیں تھے کہ ان کی کسی سے دشمنی ہوتی۔ اگر ان کے بیان کو درست مان لیا جائے تو یہ معاملہ کتنا عجیب ہوجاتا ہے کہ کسی نے انہیں عین شادی کی رات گھر میں گھس کے قتل کیا۔“

”آپ شاید بھول رہے ہیں کہ وہ میرے سارے زیورات لے گیا۔“

”پولیس کو ہر زاویے سے دیکھنا پڑتا ہے صبیحہ صاحبہ!......واردات کو ڈاکے کا رنگ دینے کے لیے بھی لوٹ مار کی جاتی ہے۔“

”ٹھیک ہے۔ آپ ہر زاویے سے دیکھیے۔ بس قاتل کا سراغ لگنا چاہیے۔“ اس وقت صبیحہ کی آواز پھر بھرائی ہوئی تھی۔

”ہم کوئی کسر نہیں اٹھا رکھیں گے۔“

”دروازے کے باہر بھی دیکھے آپ نے نشانات؟“ صبیحہ نے پوچھا۔

”کل یہی دیکھنے کے لیے میں نے آپ سے چابی لی تھی۔ باہر اس قسم کا کوئی نشان نہیں ملا۔“

”پھر تو آپ کو ملنے والے نشانات میرے ہی قدموں کے ہوں گے۔ اگر وہ قاتل کے ہوتے تو باہر بھی ہوتے۔“

”آپ کی دلیل مضبوط ہے لیکن امکان یہ ہے کہ قاتل نے دروازے کے باہر قدم ہی نہیں رکھا ہوگا۔ دروازے کے بالکل قریب کار کے ٹائروں کے نشانات ملے ہیں۔ دروازے کے باہر اس کا قدم کار ہی میں گیا ہوگا۔ ان ٹائروں کے نشانات بھی لے لیے گئے ہیں۔ وہ یقیناً کسی کار ہی میں آیا تھا۔ بالکل دروازے کے قریب ان نشانات کا ملنا بھی ظاہر کرتا ہے۔ ادھر سے گزرنے والی دوسری گاڑیوں

کے نشانات دروازے کے بالکل قریب نہیں تھے۔"

"ان نشانات سے اس گاڑی کا سراغ مل سکتا ہے؟"

"ان نشانات کا بہت باریک بینی سے جائزہ لیا جارہا ہے۔ اگر ان ٹائروں میں کوئی ایسی بات ہوئی جو دوسرے عام ٹائروں میں نہیں ہوتی تو مجھے آج شام تک اس بارے میں رپورٹ مل جائے گی۔"

"خدا کرے کوئی خاص بات مل جائے۔" صبیحہ نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا لیکن وہ قدرے سوچ میں پڑ گئی تھی۔

جعفری اور پرنٹ سیکشن کے آدمیوں کے رخصت ہوتے ہی صبیحہ نے کارلوس کو فون کیا۔

"تمہاری گاڑی کے ٹائروں میں کوئی خاص نشان تو نہیں ہے؟" اس نے پوچھا۔

"خاص نشان تو نہیں ہے میڈم! بس ایک ٹائر تھوڑا سا کٹا ہوا ہے لیکن ایسی تو شہر میں بہت سی گاڑیاں ہوں گی جن کا کوئی ٹائر کسی وجہ سے کٹ گیا ہوگا۔"

"ہمیں دوسری گاڑیوں سے کوئی غرض نہیں ہے۔" صبیحہ کا لہجہ غصیلا ہو گیا۔

"جی...... جی...... جی میڈم!" کارلوس تھوڑا سا ہکلایا۔

"تم فوراً وہ ٹائر تبدیل کروالو بلکہ چاروں ہی تبدیل کروالو۔ ہوسکتا ہے کسی اور ٹائر میں بھی ایسی کوئی خرابی ہو جس کا علم تمہیں بھی نہ ہو۔"

"ٹھیک ہے میڈم! میں ابھی جا کر تبدیل کرواتا ہوں۔" اس ساری گفتگو میں کارلوس کا انداز فدویانہ ہی رہا تھا، جیسے وہ صبیحہ کا غلام ہو۔

☆☆☆

فرح نے بے چینی سے گھڑی پر نظر ڈالی۔ چند دنوں سے عماد نے کہیں بھی آنا جانا چھوڑ رکھا تھا۔ گھر سے دفتر اور دفتر سے گھر، بس! اور دفتر سے واپسی میں بھی تاخیر نہیں ہوتی تھی لیکن اس روز کیونکہ اسے بیس منٹ کی تاخیر ہو گئی تھی اس لیے فرح اضطراب کا شکار ہوئی تھی۔ آخر اس سے رہا نہ گیا۔ اس نے عماد کا نمبر ملایا۔ دوسری طرف سے کئی گھنٹیوں کے بعد کال ریسیو کی گئی۔

"میں فوری طور پر تم سے زیادہ بات نہیں کرسکوں گا فرح!" عماد کی آواز میں کچھ پریشانی تھی۔ "میں بہت تیزی سے ڈرائیونگ کر رہا ہوں۔ کوشش کروں گا کہ ایک گھنٹے کے اندر گھر پہنچ جاؤں۔"

پھر اس سے پہلے کہ فرح کچھ کہتی، دوسری طرف سے رابطہ منقطع کر دیا گیا۔ اس سے فرح کی بے چینی میں مزید اضافہ ہوا۔ کئی سوال اس کے ذہن میں بل کھانے لگے۔ عماد پریشان کیوں تھا؟ وہ اتنی تیزی سے ڈرائیونگ کیوں کر رہا تھا کہ موبائل پر زیادہ بات بھی نہ کرسکتا ہو؟ کیا وہ کسی وجہ سے خوف زدہ تھا؟

فرح پریشانی میں سوچتی ہوئی برآمدے تک آگئی اور وہیں ٹہل ٹہل کر عماد کا انتظار کرتی رہی۔

فیصل کے قتل کو پانچ دن گزر چکے تھے۔ اس سلسلے میں اگر پولیس کی جانب سے کوئی پیش رفت ہوئی بھی تھی تو وہ میڈیا کے ذریعے سامنے نہیں آئی تھی۔ صرف دو دن تک ٹی وی چینلز پر اس کا تذکرہ رہا تھا، پھر کوئی اور بڑی واردات ہوئی تھی اور چینلز والے اس کے پیچھے لگ گئے تھے۔ تقریباً ہر معاملے میں ٹی وی چینلز کا وتیرا یہی رہتا ہے، اِلّا یہ کہ کوئی بہت بڑا واقعہ ہوجائے۔

عماد نے کہا تھا کہ وہ ایک گھنٹے کے اندر گھر پہنچنے کی کوشش کرے گا لیکن وہ سوا گھنٹے میں آیا۔ اس کے چہرے پر پسینے کی چمک تھی، حالانکہ اس کی کار ایئر کنڈیشنڈ تھی۔ وہ رومال سے چہرہ خشک کرتے ہوئے فرح کے قریب پہنچا۔

"یہاں تم کب سے......"

"جب سے بات ہوئی ہے تم سے فون پر۔" فرح نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "آخر......"

اس مرتبہ عماد نے اس کی بات کاٹ دی۔ "اندر آؤ!"

فرح کا خیال تھا کہ وہ ڈرائنگ روم میں داخل ہو کر رکے گا لیکن وہ فرح کو ساتھ لئے ہوئے خواب گاہ تک آ گیا۔

"بس دو منٹ۔" اس نے کہا۔ "میں ذرا شاور لے کر کپڑے تبدیل کرلوں، ہلکا پھلکا ہوجاؤں پھر بتاؤں گا کہ......"

"ابھی بتاؤ!" فرح نے پھر اس کی بات کاٹی اور اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے تقریباً زبردستی بستر پر بٹھا دیا۔ "میں ڈیڑھ گھنٹے سے پریشان ہوں اور تمہیں شاور لینے کی سوجھ رہی ہے۔"

"اچھا!" عماد نے طویل سانس لی اور اپنا کوٹ اتارنے لگا۔ "آج صبیحہ نے مجھے دیکھ لیا ہے۔" اس نے کوٹ بستر پر ہی ڈال دیا۔

"صبیحہ...... صبیحہ...... صبیحہ۔" فرح جھنجلا سی گئی۔ "تم پر اس کا اتنا خوف سوار ہوگیا ہے جیسے وہ ملک الموت ہو۔"

"میں کہہ چکا ہوں کہ تمہاری وجہ سے پریشان ہوں۔" عماد نے جواب دیا۔ "وہ تمہیں کوئی نقصان نہ پہنچا دے۔"

”ابھی اس نے تمہیں کہاں دیکھ لیا؟“ فرح نے پوچھا۔

”سڑک پر ہی دیکھا تھا۔“ عماد نے جواب دیا۔

”مجھے دیکھ لینے ہی کی وجہ سے اس نے مجھے اوورٹیک کیا اور رفتار کم کر کے مجھے روکنے کی کوشش کی۔ اس وقت میں نے بھی اسے دیکھ لیا تھا۔ میرے دماغ نے اس وقت بڑی تیزی سے کام کیا۔ میں اس سے کترا کر آگے نکل سکتا تھا لیکن میں نے کار روک دی۔ اس نے بھی کار روکی اور نیچے اتری۔ دروازہ کھول کر وہ میری ہی طرف بڑھی تھی۔ میں نے کار کا انجن اسٹارٹ کر رکھا تھا۔ جیسے ہی وہ دو قدم آگے بڑھی، میں کار بڑی تیزی سے حرکت میں لے آیا اور اس کی کار سے بچ کر آگے نکل گیا۔ یہ حرکت میں نے اس لیے کی تھی کہ جب تک وہ دوبارہ اپنی کار میں بیٹھ کر اسے حرکت میں لائے، میں دور جا چکا ہوں لیکن مجھے اس میں کامیابی نہیں ہو سکی۔ جلد ہی میں نے دیکھ لیا کہ اس کی کار میرے تعاقب میں لگی ہوئی تھی۔ میں نے اسے ڈاج دینے کے لیے جلدی جلدی موڑ کاٹنے شروع کیے۔ رفتار بھی بہت تیز رکھی تھی۔ مجھے اس وقت یہ اندازہ بھی نہیں رہا تھا کہ میں کس طرف جا رہا ہوں۔ یہ میری سمجھ میں اس وقت آیا جب میں لارنس روڈ پر جا نکلا۔ اس وقت بھی میری رفتار خاصی تیز تھی۔ اسی وقت تمہاری کال آ گئی۔ کسی اور کی کال ہوتی تو میں ریسیو بھی نہیں کرتا۔ تیز رفتاری کے باعث ایک ہاتھ سے اسٹیئرنگ... سنبھالنا خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔ بہرحال تمہیں مختصر جواب دے کر میں نے رابطہ منقطع کر دیا۔ اسی وقت میں نے دیکھا کہ صبیحہ کو ڈاج دینے میں ناکام رہا ہوں۔ وہ اب بھی تعاقب میں تھی لیکن پھر میں نے اور تیزی سے ڈرائیونگ کی۔ موڑ بھی بار بار کاٹے اور آخر اسے ڈاج دینے میں کامیاب ہو گیا۔ اس کے بعد میں نے یہاں کا رخ کیا۔ دراصل میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ میرا تعاقب کر کے ہمارا گھر دیکھ لے۔“

سب کچھ پوری وضاحت سے بتانے کے بعد عماد اس طرح لمبی لمبی سانس لینے لگا جیسے تھک گیا ہو۔

”لعنت ہے اس پر۔“ فرح نے نفرت سے کہا۔ ”اس سے تمہارا یہ خوف تو مجھے بھی خوف زدہ رکھنے لگے گا۔ ابھی تو میں اس کی وجہ سے خوف زدہ نہیں ہوں۔ دیکھ لوں گی میں اس کو جب بھی سامنا ہوا۔“

”میں کل سے ہی کوشش کروں گا کہ میرا تبادلہ کہیں اور کر دیا جائے۔ وہ مجھے واپس انگلینڈ ہی بھجوا دیں تو زیادہ بہتر ہے۔“

”میں تمہیں اتنا بزدل نہیں سمجھتی تھی عماد!“

”بزدل نہیں ہوں میں۔“ عماد نے جھنجلا کر کہا۔ ”تمہاری وجہ سے پریشان ہوں۔ آخر کب سمجھو گی تم میری بات!“

”اچھا جاؤ، شاور لے لو۔“ فرح نے اسے تیز ہوتے دیکھ کر کہا۔ ”اس طرح کچھ پُرسکون ہو جاؤ گے۔ میں چائے تیار کرواتی ہوں۔“

عماد فوراً اٹھ کر باتھ روم میں چلا گیا۔ جب وہ شاور لے کر اور ہلکے پھلکے گھریلو لباس میں باہر آیا تو چہرے سے فکر کا اظہار تو ہو رہا تھا لیکن وہ پریشانی نہیں تھی جو فرح نے اس وقت دیکھی تھی۔ چائے کمرے ہی میں منگوالی گئی تھی۔

”نہ جانے پولیس کیا کر رہی ہے۔“ وہ چائے پیتے ہوئے بولا۔ ”اتنے دن میں کوئی پیش رفت تو ہونی چاہیے تھی۔“

”ہماری پولیس ماشاء اللہ ہر زمانے میں جھک ہی مارتی رہی ہے۔“ فرح نے پُراطمینان لہجے میں جواب دیا۔

”ابھی شاور لیتے ہوئے دو باتیں آئی ہیں میرے دماغ میں۔“ عماد نے کہا۔

فرح سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھتی رہی۔

عماد بولا۔ ”ابھی تک میں نے صبیحہ کے بارے میں تمہارے علاوہ کسی کو کچھ نہیں بتایا ہے لیکن اب اس بارے میں سوچ رہا ہوں۔ میرا ایک بیسٹ فرینڈ دوست ہے۔ میں جب انگلینڈ گیا تھا، اسی زمانے میں وہ کسی خفیہ ایجنسی میں ملازم ہوا تھا۔ اب معلوم نہیں، وہ کہاں ہوگا۔ بہرحال! تلاش تو کرلوں گا اسے۔ صبیحہ کے بارے میں اسی کو بتانا چاہیے۔ وہ اس سلسلے میں پولیس کی مدد ضرور کرے گا۔ دوسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ میں براہ راست پولیس آفیسر جعفری ہی سے بات کروں اور صبیحہ کے بارے میں اپنے شبہات کا اظہار کر دوں لیکن یہ دوسرا قدم خاصا سوچ سمجھ کر اٹھانا پڑے گا۔ فی الحال تو میں اس فیصلے پر عمل کروں گا کہ کل صبح دفتر فون کر دوں گا کہ میری طبیعت خراب ہو گئی ہے، دو تین روز دفتر نہیں آسکوں گا۔ یہی بہتر ہے کہ میں ابھی دو تین روز تک گھر سے ہی نہ نکلوں۔“

فرح کچھ نہیں بولی۔ اسے عماد کا اتنا پریشان اور خائف ہونا اچھا نہیں لگ رہا تھا۔

☆☆☆

اس رات صبیحہ کروٹ پر کروٹ بدل رہی تھی لیکن اسے چین ہی نہیں مل رہا تھا۔ وہ بہت بری طرح جھنجلائی ہوئی تھی۔ اس روز اس کا ”شکار“ جو اسے بہت دن بعد دکھائی دیا تھا، اس کے ہاتھ سے نکل گیا تھا۔ اس کو یہ یقین تو

تھا کہ دوسرے دن وہ عماد کا سراغ لگا لے گی لیکن اس دن کی ناکامی سے اس پر جو جھنجلاہٹ سوار ہوئی تھی، اس میں کسی طرح کمی نہیں آرہی تھی۔ اس کی دانست میں نیند آنے کا تو کوئی سوال ہی نہیں تھا۔

تو اب ایک ہی صورت ہے۔ اس نے سوچا اور موبائل اٹھا کر کارلوس کا نمبر ملایا۔ دوسری طرف کئی گھنٹیاں بجیں، پھر کال ریسیو کی گئی۔

''ہیلو!'' کارلوس کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔

''کہاں مر گئے تھے؟'' صبیحہ نے غصے سے کہا۔ ''اتنی گھنٹیاں بجنے کے بعد فون اٹھایا۔''

''وہ...... وہ بس...... آنکھ لگ گئی تھی۔'' کارلوس گھگیایا۔

''آنکھ لگ گئی تھی۔'' صبیحہ نے دانت پیسے۔ ''اور مجھے نیند نہیں آرہی ہے۔''

''جی!'' کارلوس اس کی بات نہیں سمجھ سکا۔

''سلاؤ مجھے آکر۔'' صبیحہ نے کہا۔

''میں...... میں آجاؤں؟'' کارلوس یکایک بہت خوش ہو گیا۔

''تمہیں تو کیا تمہارے فرشتے آئیں گے مجھے سلانے!'' اس وقت صبیحہ کی جھنجلاہٹ عجیب ہی تھی۔

''میں...... میں آتا ہوں میڈم!'' کارلوس نے جلدی سے کہا۔

''ایک بج چکا ہے۔ پیچھے کی سڑک اب ویران ہی ہو گی لیکن احتیاط سے، ذرا دیکھ بھال کر۔''

''آپ فکر نہ کریں میڈم!''

صبیحہ نے رابطہ منقطع کر دیا۔

کارلوس کی عمر چالیس سال کے قریب تھی۔ وہ افریقا کے کسی ملک کا رہنے والا تھا۔ وہ قحط کا مارا ہوا ایک چھوٹا سا ملک تھا۔ اس کے والدین قحط زدگی کی حالت میں مر گئے تھے۔ دو چھوٹے بہن بھائی تھے جن کی حالت اس سے دیکھی نہ جاتی تھی۔ بھوک سے خود اس کا حال بھی تباہ تھا۔ دونوں بہن بھائی اسی کے ہاتھوں قتل ہوئے۔ اس کے کہنے کے مطابق اس نے ان دونوں کو اذیت سے بچا لیا تھا۔

کارلوس کی اس کہانی سے صرف صبیحہ ہی واقف تھی۔

بہن بھائی کو قتل کرنے کے بعد اس نے چھری سے اپنی گردن بھی کاٹنے کا فیصلہ کیا تھا لیکن یہ عمل جب اس سے ہو نہیں سکا تو وہ گھر سے فرار ہو کر کسی طرح سمندر تک پہنچا اور سمندر میں چھلانگ لگا دی۔ اسے تیرنا نہیں آتا تھا اس لیے اسے اپنی موت کا یقین تھا لیکن اس کی زندگی باقی تھی۔

وہ نیم مردہ حالت میں ایک لانچ والوں کے ہاتھ لگ گیا۔ وہ اسمگلروں کی لانچ تھی۔ ان لوگوں نے کسی طرح اس کی حالت سنبھالی۔ وہ اس سے کچھ معلوم کرنے میں اس لیے کامیاب نہیں ہو سکے کہ وہ اس کی زبان نہیں جانتے تھے۔ انہوں نے اس پر یہ کرم بھی کیا کہ اسے کھانے پینے کے کچھ سامان کے ساتھ ایک ساحل پر لانچ سے اتار دیا۔

سمندر میں کودنے کے بعد کارلوس جس اذیت سے گزرا تھا، اس کی وجہ سے وہ موت سے ڈر گیا۔ اب وہ زندہ رہنا چاہتا تھا۔ وہ ساحل پر ایک جانب چلتے چلتے دو دن میں ایک چھوٹی سی بستی تک پہنچ گیا۔

وہ مکران کا علاقہ تھا۔ بستی بھی مکرانیوں کی تھی۔ کارلوس کی رنگت اور اس کے بالوں کی بناوٹ بھی کچھ ایسی تھی کہ وہ مکرانی ہی معلوم ہوتا تھا۔ بستی کے لوگوں نے اسے اپنی ہی نسل کا فرد سمجھا جو نہ جانے کہاں سے بھٹکتا بھٹکتا ان تک پہنچا تھا۔ کارلوس ان کے لیے گونگا بن گیا تو ان لوگوں کو اس پر اور ترس آیا۔ انہوں نے اسے اپنے ساتھ رکھ لیا۔ وہ مچھیرے تھے۔ جب وہ مچھلیاں پکڑنے جاتے تو اسے بھی اپنے ساتھ رکھتے اور وہ ہر معاملے میں ان کی مدد کرتا۔

اس وقت اس کی عمر تیس سال تھی۔ اس نے پانچ سال وہیں گزارے۔ کسی سے بات کیے بغیر وہ ان کی بولی سمجھنے لگا۔ جب وہ اکیلا ہوتا تو خود بھی بول کر مشق کیا کرتا۔ شہر سے اردو بولنے والے بھی بستی میں آیا کرتے تھے۔ ان کا کام مچھلیاں وہاں سے شہر لے جانا تھا۔ ان لوگوں کی وجہ سے اس نے ٹوٹی پھوٹی اردو بھی سیکھ لی۔

شہر کے لوگوں سے شہر کے حالات سن کر اس کا جی چاہا کہ وہ شہر جائے۔ خود کالا ہونے کے باوجود اسے صاف رنگ کے لوگ بہت اچھے لگتے تھے۔ خود اپنے ملک میں تو اس نے سفید فام لوگ بھی دیکھے تھے جن کی عورتیں اسے بہت اچھی لگتی تھیں۔

انہی سفید فام لوگوں کی وجہ سے اسے انگریزی تو اچھی خاصی آگئی تھی لیکن جس لانچ میں وہ مکران آیا تھا، اس لانچ کے لوگ انگریزی بھی نہیں جانتے تھے۔

جب وہ مچھیروں کی بستی سے فرار ہو کر شہر آگیا تو صرف انگریزی سے واقف ہونے ہی کے باعث اسے ایک چھوٹے سے کارخانے میں ملازمت مل گئی۔ کوئی معقول ملازمت اسے اس لیے نہیں مل سکتی تھی کہ اس کے پاس کوئی ڈگری نہیں تھی۔

سب اسے عمرانی ہی سمجھتے تھے۔ اس نے اپنا نام بھی دادل رکھ لیا تھا۔ کارخانے دار کوئی اچھا آدمی نہیں تھا۔ ملازمین سے اس کا رویہ خاصا ہتک آمیز ہوتا تھا، ہتک آمیز ہی نہیں بلکہ جارحانہ اور ظالمانہ بھی۔ وہ کسی بات پر غصے میں آتا تو اسے پیٹ کر رکھ دیتا۔ ملازمین اپنی غربت کی مجبوری کے ساتھ ساتھ کارخانے دار سے خوف زدہ بھی رہتے تھے کیونکہ وہ ایک وڈیرے کا خاص آدمی تھا۔

ایک مرتبہ اس نے کارلوس کی پٹائی بھی کر ڈالی۔ جواب میں کارلوس اس کے منہ پر ایک تھپڑ بھی رسید کر دیتا تو اس کے کئی دانت ٹوٹ جاتے۔ کارلوس کے جسم میں ایسی ہی بلا کی طاقت تھی۔ اس نے صرف ایک وجہ سے ضبط کیا۔ اس نے یہ قصہ سنا تھا کہ ایک مرتبہ کسی ملازم نے کارخانے دار سے بدتمیزی کی تھی تو دوسرے دن اس کے گھر میں اس کی لاش پائی گئی تھی۔ سب ملازمین کا خیال تھا کہ اسے کارخانے دار ہی نے مروایا تھا لیکن پولیس کچھ بھی نہیں کر سکی تھی۔ اگر پولیس نے کچھ معلوم بھی کر لیا ہوگا تو وڈیرا آڑے آ گیا ہوگا۔

کارلوس نے ضبط سے تو کام لیا لیکن وہ ملازمت چھوڑ دی۔ اس کے بعد وہ ملازمت کی تلاش میں مارا مارا پھر رہا تھا تو کسی طرح اس کی رسائی ایک کالج کی پرنسپل تک ہو گئی۔ اسے ایک ''مضبوط محافظ'' سمجھ کر کالج میں چپراسی کی حیثیت سے ملازم رکھ لیا گیا۔

ان دنوں صبیحہ اسی کالج میں تھی اور سیکنڈ ایئر میں آئے، اسے چند ہی مہینے گزرے تھے۔ ایک روز جب اس کا کوئی پیریڈ خالی تھا یا کوئی اور وجہ تھی کہ وہ کالج کے لان کی گھاس پر جالیٹی۔ گھاس کی ٹھنڈک اسے اتنی اچھی لگی کہ اس نے پیروں سے چپل اتار کر ایک طرف ڈال دی اور پیر گھاس پر رگڑنے لگی۔ وہ اسے اتنا اچھا لگا کہ اس کی آنکھ لگ گئی۔ اس نے خواب میں دیکھا کہ وہ اپنے بستر پر لیٹی ہوئی تھی اور اس کے گھر کا ایک پالتو کتا اس کے پیر چاٹ رہا تھا۔ اس عمل سے صبیحہ کو ایک انجانی سی تسکین مل رہی تھی۔ پھر یکایک اس کی آنکھ کھل گئی اور اس نے دیکھا کہ اس کے پیر چاٹے جا رہے تھے... لیکن یہ سب کچھ کوئی کتا نہیں بلکہ کارلوس کر رہا تھا۔

صبیحہ گھبرا کر جلدی سے اٹھی اور کارلوس پر بگڑنے لگی۔ کارلوس گڑگڑانے لگا کہ اس کی شکایت پرنسپل سے نہ کی جائے ورنہ اسے ملازمت سے ہاتھ دھونے پڑیں گے۔

''دفع ہو جاؤ۔'' وہ غصے سے بولی۔

کارلوس معافی مانگتا ہوا لان سے چلا گیا۔ یہ اتفاق تھا کہ اس وقت لان میں سناٹا تھا۔

صبیحہ نے پرنسپل سے واقعی اس کی شکایت نہیں کی۔ شکایت کرتی تو کارلوس کو یقیناً ملازمت سے ہاتھ دھونا پڑتے جواب صبیحہ بھی نہیں چاہتی تھی۔ اسے کارلوس کی وجہ سے جو تجربہ ہوا تھا، وہ اسے بھول نہیں سکتی تھی۔ ایک عجیب سی تسکین ملی تھی اسے۔ ایک اجنبی تسکین! اور وہ ایک بار پھر وہی تجربہ کرنا چاہتی تھی۔

مگر کیسے؟ یہ ایک الجھن تھی۔ وہ اس بارے میں دو دن تک سوچتی رہی۔ ان دو دنوں میں اس نے محسوس کیا کہ کارلوس اس سے کچھ ڈرا ڈرا سا رہا۔ اس سے نظریں تک نہیں ملا رہا تھا۔

آخر صبیحہ ایک تدبیر سوچنے میں کامیاب ہو گئی اور اس پر عمل کر کے اس نے کارلوس کو اپنا بندۂ بے دام بھی بنا لیا۔

تو پھر کیسے ممکن تھا کہ رات کا ایک بجا ہو یا دو بجے ہوں، یا کوئی بھی وقت ہو، وہ صبیحہ کے حکم کی تعمیل نہ کرے۔ وہ آدھے گھنٹے سے بھی پہلے صبیحہ کے کمرے میں تھا۔ صبیحہ نے اسے عقبی دروازے کی ایک چابی دے دی تھی۔ وہاں سے صبیحہ کے کمرے تک پہنچنے کے لیے اسے ڈرائنگ روم کے قریب سے گزرنے کی بھی ضرورت نہیں تھی جہاں ایک کمرا صبیحہ نے ملازم کو دے رکھا تھا۔

''اوہ! تم یہ بلور کیوں لائے ہو؟'' صبیحہ نے اس کے ایک ہاتھ میں پکڑے ہوئے بلور کی طرف دیکھا۔

''یہ ضروری ہے میڈم کہ اب یہاں پولیس کو میرے قدموں کے نشان نہ ملیں۔ میں دروازے سے ہی اس کی ہوا سے اپنے قدموں کے نشان مٹاتا ہوا آیا ہوں۔ یہ جدید ترین بلور ہے میڈم! آواز اتنی کم ہے کہ دو تین فٹ سے آگے تک نہیں جاتی۔ یہ میں نے خریدا ہی اس لیے تھا۔''

''گڈ!'' صبیحہ نے اسے تحسین آمیز نظروں سے دیکھا پھر بولی۔ ''گاڑی کہاں کھڑی کی ہے؟''

''ایک ڈیڑھ فرلانگ دور جہاں اور گاڑیاں بھی کھڑی ہوتی ہیں۔'' جواب دیتے ہوئے اس کی نظر بستر پر پھیلے ہوئے صبیحہ کے پیروں کی طرف گئی تھی۔

''کل ایک اہم کام اور ہے تمہارے لیے۔'' صبیحہ نے کہا۔

''حکم میڈم!'' کارلوس نے کہا۔ وہ کالج ہی کے زمانے سے پرنسپل اور دیگر خواتین ٹیچرز کو ''میڈم'' کہنے کے علاوہ طالبات کو بھی اسی طرح مخاطب کرتا تھا، یا کبھی ''مس'' کہتا تھا۔ یہ شاید اتفاق ہو کہ صبیحہ کو اس نے کبھی ''مس'' نہیں کہا تھا، ہمیشہ میڈم ہی کہا تھا۔

کارلوس سوالیہ لیکن مودبانہ نظروں سے صبیحہ کی طرف دیکھتا رہا۔

''کل۔'' صبیحہ سوچتے ہوئے بولی۔ ''میں اپنی کار پریس کلب کے برابر کی گلی میں کھڑی کر کے چلی آؤں گی۔ گیارہ بارہ بجے کے درمیان۔ اس وقت وہاں سناٹا ہی ہوتا ہے، پھر بھی تم احتیاط سے کام لینا۔ ایک چھوٹی سی شیشی میں پیٹرول لے جانا۔ وہ کار پر چھڑک کر اس پر دور ہی سے دیا سلائی پھینک دینا۔''

کارلوس نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

''یا جیسا تم مناسب سمجھو!'' صبیحہ نے بات مکمل کی۔ ''بس تباہ ہو جانا چاہیے کار۔''

''جی...... جی...... بہتر......'' کارلوس کے لہجے میں لکنت آ گئی لیکن یہ سوال کرنے کی اس میں ہمت نہیں تھی کہ صبیحہ اپنی کار اس طرح کیوں تباہ کروانا چاہتی تھی۔

''بس یہی کہنا تھا۔ جب میں سو جاؤں تو جس طرح خاموشی سے آئے ہو، اسی طرح خاموشی سے چلے جانا۔'' صبیحہ نے کہا اور آنکھیں بند کر لیں۔

وہ بستر پر چت لیٹی ہوئی تھی۔ اس نے اپنے پھیلے ہوئے پیر ایک دوسرے کے قریب کر دیے۔ ایک منٹ بھی نہیں گزرا تھا کہ اس نے پیروں کی انگلیوں پر کسی لجلجی سی چیز کا لمس محسوس کیا...... وہ لجلجی سی چیز کارلوس کی زبان تھی جس کے لمس سے یکایک صبیحہ کا سارا جسم سنسنا گیا۔

پھر یکایک ایسا معلوم ہوا جیسے وہ بری طرح تھک گیا ہو، نڈھال ہو گیا ہو۔ اب اس نے صبیحہ کی طرف دیکھا اور اپنے سابقہ تجربے کے باعث سمجھ گیا کہ صبیحہ سو چکی تھی۔

☆☆☆

صبح کا ناشتا کرنے کے بعد عماد نے اپنے دفتر فون کر دیا کہ اس کی طبیعت کچھ خراب ہو گئی ہے اور ڈاکٹر کے خیال کے مطابق اس کو سنبھلنے میں دو تین روز لگیں گے اس لیے وہ دفتر نہیں آ سکے گا۔

اس کے بعد دونوں میاں بیوی معمول کے مطابق ٹی وی لاؤنج میں جا بیٹھے۔ فرح نے ٹی وی کھول لیا۔ خبریں آنے میں چند منٹ باقی تھے۔

''آواز ذرا ہلکی ہی رکھنا۔'' عماد نے اپنا موبائل

جیب سے نکالتے ہوئے کہا۔ ''دو ایک فون کرنا ہیں مجھے۔ مجھے اپنے اس دوست کو ٹریس کرنا ہے جس کا میں نے کل تم سے ذکر کیا تھا۔''

''وہی...... خفیہ ایجنسی میں جو ہیں؟''

''ہاں۔''

پھر فرح نے کچھ نہیں کہا۔ گزشتہ روز سے اب تک اس کی کوشش یہی رہی تھی کہ صبیحہ کے بارے میں کوئی گفتگو نہ ہو۔ اسے صبیحہ کے نام ہی سے چڑ ہونے لگی تھی۔

پانچ چھ منٹ میں عماد نے تین فون کیے اور پھر موبائل بند کر دیا۔ اس کے چہرے سے مایوسی ظاہر ہو رہی تھی۔ وہ بولا۔ ''ابھی تو کچھ پتا نہیں چل سکا۔ ذرا سوچنا پڑے گا کہ اب کسے فون کیا جائے۔''

فرح نے جواب دینے کے بجائے ٹی وی کی آواز بڑھا دی۔ وہ اس بارے میں بات ہی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ خبریں شروع ہو رہی تھیں۔ ہیڈ لائنز سے ہی اندازہ ہو گیا کہ کوئی خاص خبر نہیں تھی۔ گزشتہ رات کی خبریں دہرائی گئی تھیں۔

موبائل کی گھنٹی کی آواز نے عماد کی توجہ اس طرف کی۔ اس نے اسکرین پر نظر ڈالی اور پھر اس کے منہ سے نکلا۔ ''اوہو، ڈاکٹر زید! اسے آج اتنے دن بعد میری یاد کیسے آگئی۔''

''اچھا وہ!'' فرح بولی۔ ''آپ کے سائیکاٹرسٹ دوست؟''

''ہاں۔'' عماد نے جواب دیتے ہوئے کال ریسیو کی۔ ''ہاں زید کہو...... آج کیسے یاد کر لیا اپنے بھولے ہوئے دوست کو۔''

''فضول باتیں نہ کرو۔ تم جانتے ہو میری مصروفیت۔ بقول شخصے، سر کھجانے کی فرصت نہیں ملتی۔ ایک گھنٹے بعد تمہارے گھر کے قریب ایک کام سے آ رہا ہوں۔ اسی لیے خیال آیا کہ تم سے بھی مل لوں اگر گھر پر ہو۔ ویسے امکان تو یہ ہے کہ دفتر میں ہو گے۔''

''نہیں۔ گھر پر ہی ہوں۔ کسی وجہ سے آج دفتر نہیں گیا۔ آجاؤ۔ میں انتظار کروں گا۔''

''بھابی سے میرا اسلام کہنا۔''

''اب آ رہے ہو تو خود ہی کر لینا۔'' عماد نے ہنس کر کہا۔

دوسری طرف ڈاکٹر زید بھی ہنسا اور پھر اس نے رابطہ منقطع کر دیا۔

عماد نے موبائل بند کرتے ہوئے فرح سے کہا۔ ''تمہیں سلام کہہ رہا تھا۔ میں نے کہہ دیا کہ......''

''سن چکی ہوں۔'' فرح نے اس کی بات کاٹی۔

''بہت عرصے بعد آ رہے ہیں۔''

''ہاں۔ بہت مصروف رہتا ہے۔ ملک میں اس پائے کے سائیکاٹرسٹ دو تین ہی ہیں۔''

سوا گھنٹے بعد زید ان کے گھر پر تھا۔ فرح اور عماد اس سے ڈرائنگ روم میں ملے۔ اس کی خاطر مدارات کا انتظام فرح نے پہلے ہی کر لیا تھا۔ وہ عماد کے سبھی قریبی دوستوں کا احترام کرتی تھی۔

چند رسمی باتوں کے بعد عماد نے اس سے کہا۔ ''آج تم آگئے، یہ بہت اچھا ہوا ورنہ دو ایک روز میں خود میں تمہارے پاس آتا۔ کام ایسا ہے کہ مجھ سے بات کرنے کے لیے تمہیں اپنی مصروفیت میں سے کچھ وقت نکالنا ہی پڑتا۔''

''ایسا کیا کام ہے؟'' زید نے پوچھا۔

''ایک لڑکی ہے۔ میرا خیال ہے کہ اسے کوئی نفسیاتی مرض لاحق ہے۔ اسی کے بارے میں بات کرنا چاہتا ہوں تم سے۔''

فرح نے چونک کر عماد کی طرف دیکھا اور پھر سپاٹ چہرے کے ساتھ دوسری طرف دیکھنے لگی۔

زید ہنسا۔ ''سنا آپ نے بھابی! آپ کے ہوتے ہوئے موصوف کو دوسری لڑکیوں کا خیال رہنے لگا ہے۔''

''شکایت نہ داغو میری۔'' عماد بولا۔ ''فرح کو بھی معلوم ہے اس لڑکی کے بارے میں۔ وہ میرے ساتھ کالج میں تھی۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب میں انگلینڈ نہیں گیا تھا۔ واپس آنے کے بعد بھی اس سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ ابھی بس دو دن پہلے ایک ہوٹل میں مل گئی۔ اب بھی وہ ویسی ہی ہے جیسی پہلے تھی۔''

''کیسی تھی پہلے؟''

''بلا کی ضدی!...... میں نے ساری زندگی میں اتنے ضدی مزاج کا کوئی شخص نہ تو دیکھا ہے اور نہ کبھی ملا ہوں۔ اب بھی اس کی ضد کا یہ عالم ہے کہ جو چیز پسند آجائے اسے ہر قیمت پر حاصل کرنے کی کوشش کرتی ہے اور ناکامی کی صورت میں اس چیز کو برباد ہی کر دیتی ہے۔ خواہ اس کے لیے کوئی خطرہ ہی مول لینا پڑے۔''

''ایسا کوئی واقعہ؟'' زید نے سنجیدگی سے پوچھا۔

زید کو ساری باتیں بتانا عماد نے مناسب نہیں سمجھا، بس اشرف کی کار کا قصہ بیان کر دیا جس کو صبیحہ نے آگ لگا کر تباہ کر دیا تھا۔

''اوہو!'' زید کے منہ سے نکلا۔ ''خاصا سنگین کیس ہے۔ اس قسم کے معاملات کی تہہ میں عموماً متعلقہ شخص کا ماضی یا

اس کا بچپن کھنگالنے سے ہی ملتی ہے۔ اس سلسلے میں ایک اصطلاح ٹرانس پرسنل سائیکالوجیکل کیس بھی مروج ہے لیکن جب تک اس لڑکی سے مل کر اس کی سائیکالوجیکل اینالائسز، یعنی تحلیل نفسی نہ کی جائے، صحیح نتیجے تک نہیں پہنچا جاسکتا۔ یہ کیس یقیناً دلچسپ ہوگا۔ کیا تم مجھے اس لڑکی سے ملواسکتے ہو؟''

''یہ تو شاید ممکن نہ ہو۔''

''تو پھر بس کوئی قیاس آرائی ہی کی جاسکتی ہے۔ شاید بچپن میں اس لڑکی کی بہت معمولی خواہشات بھی پوری نہ کی جاتی ہوں اور اس کے برخلاف بہت زیادہ مارا پیٹا جاتا ہو۔ اس کی وجہ سے بھی عمر کے ساتھ ساتھ اس ضدی پن میں اضافہ ہوتا رہتا ہے اور جنون کی شکل اختیار کرلیتا ہے۔''

''اس کے ماں باپ اتنے جاہل تو نہیں ہیں کہ اس کی معمولی خواہشات پر بھی اسے مارا پیٹا جاتا ہو۔''

''اس کا تعلق ہمیشہ جہالت ہی سے نہیں ہوتا میرے دوست!...... سوتیلی ماں یا سوتیلا باپ بھی اس قسم کی حرکتیں کرگزرتا ہے، خواہ وہ کتنا ہی پڑھا لکھا ہو۔''

''میرے خیال سے تو اس کے والدین میں سے کوئی بھی سوتیلا نہیں ہے لیکن یہ بات میں پورے وثوق سے بھی نہیں کہہ سکتا۔''

''کوشش کرنا کہ معلوم ہوجائے، پھر بتانا مجھے۔''

یکایک فرح بول پڑی۔ ''کیا ہم کوئی اور بات نہیں کرسکتے زید بھائی!''

''ہاں۔'' زید ہنسا۔ ''اتنے دن بعد ملے ہیں تو کچھ اپنی باتیں کی جانی چاہئیں۔ یہ حضرت کسی لڑکی کا قصہ لے بیٹھے۔''

''آپ کی منگنی میں تو ہم شریک ہوئے تھے۔ شادی کب کررہے ہیں آپ؟'' فرح نے پوچھا۔

اس طرح گفتگو کا موضوع بدل گیا۔ عماد تھوڑا سا کھسیایا بھی لیکن کچھ بولا نہیں۔ خود اس کے دماغ پر تو صبیحہ مسلط ہوگئی تھی لیکن اسے یہ اندازہ بھی ہوگیا تھا کہ فرح اس کے ذکر سے ہی چڑنے لگی ہے۔

تھوڑی دیر بعد زید رخصت ہوگیا۔

عماد نے اس دن کوشش کی کہ کسی طور پر بھی صبیحہ کا ذکر نہ کرے۔ وہ فرح کو جھنجلاہٹ میں مبتلا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس کے اس رویے کے باعث فرح کا موڈ بھی بحال ہوگیا جو ڈاکٹر زید سے باتیں کرتے ہوئے خاصا بگڑ گیا تھا۔ وہ مطمئن اور خوش نظر آنے لگی۔ عماد کی خوشی بھی اسی میں تھی کہ فرح خوش رہے لیکن کب تک؟ اسے شدت سے تو کیا، شاید پرواہی نہیں تھی کہ اگر اس سے اس کا شوہر چھین لیا گیا تو کیا ہوگا لیکن عماد کو یہ فکر لاحق تھی کہ صبیحہ کہیں فرح ہی کو کوئی سنگین نقصان نہ پہنچا بیٹھے۔

گزشتہ روز تو وہ بچ نکلا تھا لیکن اب اسے یہ اندیشہ ہوگیا تھا کہ وہ پھر کسی وقت صبیحہ کی نظر میں آجائے گا۔ اس کی خواہش تھی کہ وہ جلد از جلد اپنا تبادلہ کہیں اور کرالے لیکن عجلت میں وہ یہ فیصلہ کر بیٹھا تھا کہ دو تین روز دفتر ہی نہیں جائے گا۔ وہ دفتر جاتا، تبھی اپنے تبادلے کی کوششیں کرسکتا تھا۔ اسے اپنی غلطی محسوس ہونے لگی تھی، بلکہ وہ اسے اپنی حماقت سمجھ رہا تھا۔ دو تین روز بعد اسے دفتر جانا ہی پڑتا۔

فرح سے اس نے صبیحہ کا ذکر نہیں چھیڑا لیکن خود اس کا دماغ تو صبیحہ کے خیال سے غافل نہیں ہوسکتا تھا۔ وہ اس کے بارے میں سوچتا رہا۔ زید کی باتیں بھی اس کے دماغ میں گردش کرتی رہیں۔ شاید بچپن میں صبیحہ کے ساتھ زیادتیاں ہوتی رہی تھیں اور زید کے خیال کے مطابق کوئی سوتیلا باپ یا سوتیلی ماں ہی ایسا کرسکتی تھی لیکن اسے علم نہیں تھا کہ صبیحہ کی ماں سوتیلی تھی یا اس کا باپ! وہ اب جس انداز میں عیش وعشرت کی زندگی گزار رہی تھی، اس سے تو یہی ظاہر ہوتا تھا کہ کم از کم اس کا باپ تو سوتیلا نہیں ہوگا۔ وہ اگر سوتیلا ہوتا تو صبیحہ ایسی زندگی نہیں گزار سکتی تھی۔

عماد کے دماغ میں یہ خیال بھی آیا کہ وہ صبیحہ کے باپ سے ہی مل کر یہ جاننے کی کوشش کرے کہ ایسا تو نہیں کہ صبیحہ کے بچپن ہی میں اس کی ماں مرگئی ہو اور باپ نے دوسری شادی کرلی ہو۔

عماد شدت سے صبیحہ کے خلاف رہا تھا لیکن زید سے باتیں کرنے کے بعد اسے صبیحہ سے ہمدردی محسوس ہونے لگی تھی۔ وہ کسی مرض کا شکار ہوگئی تھی، کسی نفسیاتی مرض کا۔ اگر کسی طرح اسے اس مرض سے نجات دلائی جاسکتی تو وہ ایک عام انسان کی طرح زندگی گزار سکتی تھی۔

انہی سب خیالات میں اس کا دن تو گزرا ہی تھا، رات کو بھی دیر سے نیند آئی۔

دوسرا دن اس کے دماغ کو ایک اور دھچکا لگا بیٹھا۔ اخبار میں خبر تھی کہ رات ایک بجے کے قریب کسی نے صبیحہ کی کار میں اس وقت آگ لگادی تھی جب وہ پریس کلب کے قریب کی کسی گلی میں کھڑی تھی۔ خبر میں یہ حوالہ بھی دیا گیا تھا کہ یہ وہی صبیحہ حشمت ہے جس کے شوہر فیصل کو شادی کی پہلی ہی رات قتل کردیا گیا تھا۔

خبر پڑھتے وقت عماد کے چہرے کی رنگت بدل گئی تھی۔ یہ بات فرح نے بھی محسوس کرلی اور پوچھ بیٹھی۔ ''کیا

کوئی بڑی خبر آئی ہے؟"

عماد نے اخبار اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "خود ہی پڑھ لو۔ اخبار کے نیچے کا ہاف!...... چوتھا کالم...... سرخی دو کالمی ہے۔"

فرح نے وہ خبر پڑھی اور ایک طویل سانس لے کر اخبار ایک طرف ڈال دیا۔ "آخر اس بے وقوف لڑکی نے اپنی کار اس ویران جگہ کھڑی ہی کیوں کی تھی؟"

"پولیس تفتیش کر رہی ہوگی۔ اس کی تفصیل شاید آج آئے۔ میرا خیال ہے کہ ضرور آئے گی۔ کسی وقت ٹی وی کی خبروں میں آنا چاہیے۔ یہ ٹی وی والے گرما گرم خبروں کا پیچھا ضرور کرتے ہیں۔"

"یہ کوئی ایسی بڑی خبر تو نہیں ہے۔"

"صبیحہ کے شوہر کے قتل کی وجہ سے ٹی وی والے اسے ضرور اہمیت دیں گے۔"

"کیا ٹی وی کھولوں؟" فرح نے غور سے عماد کی طرف دیکھا۔

"خبروں کا وقت تو نکل ہی چکا ہے۔ اب آدھے گھنٹے بعد آئیں گی خبریں۔"

وہ دونوں اس وقت ٹی وی لاؤنج ہی میں بیٹھے تھے۔ عماد اخبار دیکھنے لگا تھا اس لیے فرح نے ٹی وی نہیں کھولا تھا اور عماد کی وہ قمیصیں لے کر بیٹھ گئی تھی جن کے بٹن ٹوٹ جانے کی وجہ سے وہ کافی دن سے پہنی ہی نہیں جا رہی تھیں۔

خبروں کا وقت ابھی نہیں ہوا تھا لیکن فرح نے ٹی وی کھول لیا۔ کئی چینل بدلے مگر کسی میں بھی اس وقت خبریں نہیں آرہی تھیں۔ کہیں کوئی بریکنگ نیوز بھی نہیں چل رہی تھی۔

اس وقت عماد کے دماغ میں خیال آیا کہ صبیحہ کی طرف سے فرح اتنی بھی غافل نہیں تھی جتنا ظاہر کر رہی تھی ورنہ وہ اس وقت ٹی وی کھولنے میں عجلت نہ کرتی۔

عماد نے پھر اخبار اٹھا لیا اور دوسری خبریں دیکھنے لگا۔ آخر وہ وقت آگیا جب لگے ہوئے ٹی وی چینل سے خبریں شروع ہوئیں۔ دوسری ہی سرخی صبیحہ کی کار کے بارے میں تھی۔ سرخیوں کے بعد اشتہارات کا وقفہ آیا، پھر وضاحت سے خبریں سنائی جانے لگیں۔ عماد کی توقع کے مطابق صبیحہ کی کار کے معاملے کو اہمیت دی گئی تھی۔

اس خبر سے معلوم ہوا کہ رات کو صبیحہ جب پریس کلب سے گزر رہی تھی تو اس کی گاڑی اچانک بند ہوگئی۔ وہ اس کی خرابی بھی نہیں سمجھ سکی۔ یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ اسے اتنی رات کے وقت مزدور قسم کے دو آدمی مل گئے۔ ان سے دھکا لگوا کر اس نے کار ایک جانب کھڑی کر دی۔ پھر کچھ دور چلنے کے بعد اسے ایک ٹیکسی مل گئی جس میں وہ گھر آگئی۔ اس نے سوچا تھا کہ صبح وہ کسی مکینک کو بھیج کر معلوم کروا لے گی کہ گاڑی میں کیا خرابی ہوئی تھی۔

اینکر پرسن نے اس خبر پر بات کرنے کے لیے ایک تجزیہ کار سے رابطہ کیا اور اس سے کہا۔ "اس واقعے سے چند دن پہلے صبیحہ حشمت صاحبہ کے شوہر کو قتل کیا گیا تھا۔ اگر فرض کر لیا جائے کہ اس قتل کو ڈاکے کا رنگ دینے کی کوشش کی گئی تھی اور قتل کا اصل سبب دشمنی تھی تو اس پس منظر میں صبیحہ حشمت کی کار میں آگ لگنے کو کیا سمجھا جائے۔ پولیس یہ بھی کہہ رہی ہے کہ آگ خود بخود تو لگ نہیں سکتی، کسی نے لگائی ہے۔ تو کیا اس معاملے کو ایک ہی زنجیر کی دو کڑیاں کہا جا سکتا ہے؟"

"اگر وہ قتل دشمنی کا نتیجہ تھا تو یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ کسی کو دراصل صبیحہ حشمت سے کوئی دشمنی ہے اور وہ انہیں مختلف انداز سے نقصان پہنچاتا رہنا چاہتا ہے لیکن مفروضوں پر اس قسم کی قیاس آرائیاں مناسب نہیں۔ اس وقت کا انتظار کیا جانا چاہیے جب پولیس اس معاملے کی چھان بین کر لے۔"

اینکر پرسن کو تو اس خبر کے سہارے کچھ وقت گزارنا تھا اس لیے اس نے ایک اور زاویے سے بات چھیڑی۔ سلسلہ دو منٹ سے زیادہ نہیں چل سکا کیونکہ سیاسی نوعیت کی ایک بریکنگ نیوز آگئی تھی۔

"فضول۔" عماد نے منہ بنایا۔ "یہ لوگ معمولی باتوں کو بریکنگ نیوز بنا دیتے ہیں۔ دل ہی نہیں چاہتا اب بریکنگ نیوز سننے کو اور اس کی وجہ سے اہم خبر پر بھی کم از کم میں تو اس وقت دھیان دے پاتا ہوں جب کئی جملے نکل چکے ہوتے ہیں۔"

"ایک بیماری اور بھی ہے ان ٹی وی والوں کو۔" فرح نے کہا۔ "ہر ایک یہ دعویٰ کرتا نظر آتا ہے کہ یہ خبر سب سے پہلے اس نے بریک کی ہے۔"

"دفع کرو، بند کرو ٹی وی، چل کے کچھ دیر آرام کرتے ہیں پھر میں کہیں جاؤں گا۔"

"شکر ہے کہ تم نے باہر نکلنے کی بات کی۔ مجھے یہ بہت برا لگ رہا تھا کہ تم ایک لڑکی کے خوف سے گھر میں دبک گئے ہو لیکن جانا کہاں ہے؟"

"کل متعدد فون کیے لیکن اس دوست کا پتا نہیں چل سکا۔"

"وہ...... خفیہ ایجنسی والے کا؟"

"ہاں۔ اب معلومات کرنے کے لیے ایک صاحب کے پاس جاؤں گا۔ مجھے ان کا دفتر تو معلوم ہے لیکن موبائل

نمبر نہیں معلوم۔ اسی لیے جا کر ہی بات کرنی پڑے گی۔"

"گویا وہی صبیحہ کا معاملہ۔" فرح نے طویل سانس لی۔

عماد کی خاموشی کے باعث اس معاملے میں بات آگے نہیں بڑھ سکی۔

☆☆☆

گزشتہ رات کار میں آگ لگانے کے بعد کارلوس نے موبائل فون پر صبیحہ کو اس کی اطلاع بھی دی تھی۔

"اب میرے گھر آجاؤ۔ آج تم سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔" صبیحہ نے کہا تھا۔

اس کے بعد جب وہ کارلوس کا انتظار کر رہی تھی تو ماضی کے واقعات بھی اس کے ذہن میں چکراتے رہے تھے۔

کالج میں دو دن بعد ہی صبیحہ کو کارلوس سے باتیں کرنے کا موقع اس وقت ملا تھا جب وہ لائبریری کی صفائی کر رہا تھا۔ اس دن کالج پہنچنے والی پہلی لڑکی صبیحہ ہی تھی اس لیے لائبریری میں کوئی اور نہیں تھا۔

کارلوس گھبرا کر لائبریری سے نکل جاتا لیکن صبیحہ نے اسے روک لیا۔

"پریشان نہ ہو۔" صبیحہ نے مسکرا کر کہا تھا۔ "میں تم سے ناراض نہیں ہوں۔ ناراض ہوتی تو تمہاری شکایت کر چکی ہوتی۔"

کارلوس پلکیں جھپکاتا ہوا اس کی طرف دیکھتا رہا۔

"کیا تم ایک اچھی زندگی گزارنے کے خواہش مند نہیں ہو؟" صبیحہ کا سوال تھا۔

"اچھی زندگی ...... کون نہیں گزارنا چاہتا میڈم! ...... لیکن مجبوری ہے۔ یہ ملازمت بھی بڑی مشکل سے ملی تھی۔"

"میں چاہتی ہوں کہ تم اچھی زندگی گزارو۔ چھوڑ دو یہ ملازمت۔ فی الحال کوئی مناسب گھر لے لو اور کوئی چھوٹا موٹا کام کر لو۔" یہ کہتے ہوئے صبیحہ نے اپنے پرس سے بڑے نوٹوں کی ایک گڈی نکال لی تھی جو اس نے کارلوس کی طرف بڑھا دی۔ "فی الحال یہ تو رکھو۔"

"جی ...... جی ......" کارلوس پریشانی سے نوٹوں کی گڈی کی طرف دیکھنے لگا۔

"جلدی سے رکھ لو۔ کوئی آنہ جائے۔"

کارلوس نے تذبذب کے ساتھ نوٹوں کی گڈی لے کر اپنی جیب میں ٹھونس لی۔

"یہ میرا موبائل نمبر ہے۔" صبیحہ نے کاغذ کی ایک چٹ بھی اسے دی اور کہا۔ "تم بھی آج ہی ایک موبائل خرید لینا... دو ایک دن میں تم کرائے پر... کوئی مکان لے لو۔ یہ دو ایک دن تم کسی معمولی ہوٹل میں بھی گزار سکتے ہو۔ اگر کوشش کرو تو شاید آج ہی مکان مل جائے۔ کل اس کے لیے سامان وغیرہ بھی خرید لینا۔ میں بھی تمہیں ماہانہ اخراجات کے لیے کچھ نہ کچھ دیتی رہوں گی لیکن دکھاوے کے لیے تم کوئی چھوٹا موٹا کاروبار بھی شروع کر دو۔"

کارلوس کی سانسیں ناہموار ہو گئیں۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا ہوگا کہ صبیحہ کی اس مہربانی کو کیا سمجھے۔

"بس۔" صبیحہ نے مزید کہا تھا۔ "آج پرنسپل صاحبہ سے کہہ دینا کہ تمہیں کوئی اچھی ملازمت مل گئی ہے اس لیے کل سے تم کالج نہیں آؤ گے اور وہ تمہارا آج تک کا حساب کر دیں۔ اگر وہ نہ بھی کریں تو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ کل سے تم کالج نہ آنا۔"

اسی وقت کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دی تھی اور صبیحہ جلدی سے کتابوں کی ایک الماری کی طرف متوجہ ہو گئی تھی۔ کارلوس کو بھی مزید کوئی بات کرنے کا موقع نہیں مل سکا تھا۔

صبیحہ اس دن نوٹوں کی گڈی لے کر بہت جلدی کالج اسی لیے پہنچی تھی کہ کارلوس سے بات کر سکے۔ اس کے علم میں تھا کہ کالج کے تینوں چپراسی کالج جلدی پہنچتے تھے اور اس وقت کارلوس کی پہلی ڈیوٹی یہ ہوتی تھی کہ وہ لائبریری کی صفائی کرے۔

اسی دن شام کو صبیحہ کے موبائل کی گھنٹی بجی۔ اس نے اسکرین پر ایک اجنبی نمبر دیکھا۔ اس کے خیال کے مطابق وہ کال کارلوس کی بھی ہو سکتی تھی۔ اس نے کال ریسیو کی۔ دوسری طرف کارلوس ہی تھا۔ اس نے بتایا کہ مکان اسے آج ہی مل گیا ہے اور کل وہ گھر کے لیے سامان کی خریداری کرے گا۔

پھر اس سے اگلے دن شام کو بھی کارلوس کا فون آیا تھا۔ بولتے ہوئے اس کی سانس پھولی ہوئی تھی۔ "آج ہی میں نے خریداری بھی کی اور آج ہی گھر میں سب کچھ قاعدے سے لگا بھی دیا۔ ابھی فارغ ہوا ہوں۔"

"پتا بتاؤ۔" صبیحہ نے کہا اور کارلوس کا بتایا ہوا پتا اپنے پاس نوٹ کر لیا، پھر پوچھا۔ "کھانا وغیرہ کہاں کھاتے رہے؟"

"ہوٹل میں میڈم!"

"ابھی سات بجے ہیں۔ رات کا کھانا تو نہیں کھایا ہوگا؟"

"بس اب جاؤں گا کھانے۔ میں نے سوچا پہلے آپ کو فون کر دوں۔"

"کھانا کھا کے گھر کب لوٹو گے؟"

"آج بہت محنت کی ہے۔ جلدی بھوک لگنے لگی۔ ابھی جاؤں گا اور ایک گھنٹے بعد واپس آجاؤں گا پھر آرام کر دں گا، بہت تھک گیا ہوں۔"

"کتنی دیر آرام کر کے نارمل ہو جاؤ گے۔"

"گھنٹے دو گھنٹے میں میڈم!" کارلوس نے جواب دیا پھر پوچھا۔ "کیوں میڈم؟"

"میں چاہتی ہوں کہ تم آرام کر لو تو میں آ کر تمہارا گھر دیکھ لوں۔"

"ایک گھنٹے بعد آپ کسی وقت بھی آجایئے۔" کارلوس جلدی سے بولا۔ "آپ کو دیکھ کر ہی میری سب تھکن دور ہو جائے گی۔"

"نہیں۔" صبیحہ مسکرائی۔ "میں اس بستی سے واقف ہوں۔ وہاں کے لوگوں کا مزاج جانتی ہوں۔ گیارہ بجے کے بعد ہی وہاں سناٹا ہوتا ہے۔ میں ساڑھے گیارہ بجے تک آؤں گی۔"

اور ساڑھے گیارہ بجے صبیحہ اس کے گھر پہنچ ہی گئی تھی۔ وہ تین کمروں کا مکان تھا۔ سامان دو کمروں میں آیا تھا۔ تیسرا کمرا خالی پڑا تھا۔ سامان لگانے میں سلیقہ مندی نہیں تھی۔ کارلوس جس قسم کی زندگی گزار چکا تھا، اس کی وجہ سے سلیقہ مندی آ بھی نہیں سکتی تھی لیکن صبیحہ نے اس پر کوئی تنقید نہیں کی۔ اس نے سوچا تھا کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ کارلوس سلیقہ مند بھی ہو جائے گا۔ وہ بے تکلفانہ انداز میں کارلوس کے بستر پر بیٹھ گئی اور مسکرا کر بولی۔

"لائبریری میں تم مجھ سے کچھ سوالات ضرور کرتے۔ اب پوچھ لو۔"

"میں بڑی الجھن میں ہوں میڈم!" کارلوس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا تھا۔ "آپ کی اس مہربانی کی وجہ میری سمجھ میں نہیں آرہی ہے۔"

"تمہاری ادا مجھے پسند آگئی۔"

"ادا؟"

"ہاں۔ وہ حرکت جو تم نے لان میں کی تھی۔"

کارلوس کی نظر فوراً اس کے پیروں کی طرف گئی۔ سینڈلوں سے جھانکتی ہوئی صبیحہ کی گوری سبک انگلیاں دیکھ کر کارلوس کے کالے چہرے پر بھی کوئی رنگ سا آگیا۔

"بڑا سکون ملا تھا مجھے تمہاری اس حرکت سے۔" صبیحہ نے بات آگے بڑھائی۔ "اور سکون حاصل کرنے کے لیے انسان کچھ بھی خرچ کر سکتا ہے۔ میں ایک دولت مند باپ کی بیٹی ہوں داول...... ! سکون حاصل کرنے کے لیے

میں کیا نہیں کر سکتی۔"

اس وقت تک وہ کارلوس کو داول ہی کے نام سے جانتی تھی۔

کارلوس نے اپنے ہونٹوں پر زبان پھیری اور بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ "میں آپ کو اچھا لگا ہوں میڈم!"

صبیحہ نے اس کے سراپا پر مسکراتے ہوئے نظر ڈالی۔ وہ قدآور شخص نہ صرف کالا تھا بلکہ اس کے نقوش بھی اچھے نہیں تھے۔ یہ ایک غیر معمولی بات تھی کہ اتنے قدآور شخص کے پیر چھوٹے چھوٹے تھے۔ صبیحہ کو اس وقت خیال آیا تھا کہ خود اس کے پیر بھی کارلوس کے پیروں کے تقریباً برابر ہی ہوں گے۔ یہ بات تو کچھ دن بعد سامنے آئی تھی کہ دونوں کے پیروں کے سائز میں ذرا بھی فرق نہیں تھا۔

اپنے پیروں کی وجہ سے بھی کارلوس کی شخصیت مضحکہ خیز سی تھی۔ ممکن ہی نہیں تھا کہ صبیحہ جیسی خوب صورت لڑکی اسے پسند کرتی لیکن اس نے کارلوس کا دل نہیں توڑا اور کہا۔ "تم واقعی مجھے اچھے لگے ہو۔"

کارلوس کی آنکھوں میں چمک آگئی۔

"آج۔" صبیحہ بولی۔ "اس وقت میں تمہارے پاس اس لیے بھی آئی ہوں کہ تم مجھے اپنے ماضی کے بارے میں سب کچھ بتا دو۔"

"بتا دوں گا میڈم! محسن ہیں آپ میری۔ میں کچھ بھی نہیں چھپاؤں گا۔"

اور اس رات صبیحہ کو پہلی بار معلوم ہوا تھا کہ اس کا نام داول نہیں بلکہ کارلوس تھا اور وہ ایک افریقی ملک کا باشندہ تھا۔

کارلوس نے اپنی پوری کہانی سنا دی۔ اس نے یہ قصہ بھی سنا دیا کہ جب وہ مچھیروں کی بستی میں تھا تو قریب کے ایک چھوٹے سے پہاڑی علاقے میں اپنا ڈیرا جمائے کچھ جرائم پیشہ افراد نے بھی اسے اپنا آلۂ کار بنا لیا تھا۔ اسے فائرنگ کرنی بھی سکھائی تھی۔ کئی وارداتوں میں بھی اسے اپنا شریک کار بنایا تھا۔ وہ اسے اس کے عوض کچھ پیسا بھی دیتے تھے لیکن ان کاموں میں کارلوس کا دل نہیں لگتا تھا۔ مچھیروں کی بستی سے اس کے نکل جانے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ ان لوگوں سے پیچھا چھڑانا چاہتا تھا۔

صبیحہ نے بیچ میں دو ایک ہی سوال کیے تھے۔ زیادہ تر خاموشی سے اس کی ساری کہانی سنی تھی...... اور پھر کچھ سوچنے لگی تھی۔

قدرے توقف سے کارلوس بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ "میں برا آدمی ہوں نا میڈم!...... میں نے اپنے

چھوٹے بہن بھائی بھی قتل کیے۔ تھے اور ان جرائم پیشہ افراد کے ساتھ بھی کچھ وقت گزارا تھا۔"

"نہیں کارلوس!" صبیحہ نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "تم برے آدمی ہرگز نہیں ہو۔ اپنے بہن بھائی تو تم نے اس لیے قتل کیے تھے کہ وہ فاقوں کی اذیت سے نجات پالیں اور جرائم پیشہ لوگوں کے چکر میں تو بعض اوقات انسان مجبوراً بھی پھنس جاتا ہے۔"

"تو آپ مجھے برا نہیں سمجھتیں؟" کارلوس خوش ہوگیا۔

"ہرگز نہیں لیکن ایک بات بتاؤ۔ اگر میں تم کو بتاؤں کہ فلاں شخص میرے لیے نقصان دہ ثابت ہوسکتا ہے لہٰذا تم اسے قتل کردو تو کیا تم ایسا کرسکو گے؟"

"آپ کے لیے تو میں ساری دنیا کو قتل کرسکتا ہوں میڈم!" کارلوس پرجوش ہوگیا۔

"ہوں۔" صبیحہ مسکرائی۔ "خیر! یہ بتاؤ کہ اب تم کام کیا شروع کروگے؟"

"باہر سے آنے والے ریڈی میڈ کپڑوں کی دکان کھول لوں گا۔"

"ہاں۔ دنیا دکھاوے کے لیے تمہیں کچھ تو کرنا پڑے گا۔ آگے چل کر میں تمہیں زیادہ بہتر مقام دلادوں گی لیکن ظاہر یہ ہوگا کہ تم نے اپنے معمولی کاروبار کو ترقی دے کر اپنا مقام بنایا ہے۔"

"لیکن آپ میرے ساتھ ایسا کیوں کرنا چاہتی ہیں میڈم؟ کیا آپ مجھ سے......" وہ یکایک گھبرا کر اس طرح چپ ہوگیا جیسے اس کے منہ سے کوئی بہت ہی غلط بات نکلنے والی تھی لیکن وہ بروقت سنبھل گیا تھا۔

صبیحہ پھر مسکرادی۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ کارلوس اس سے کیا کہنا چاہتا تھا۔

"میڈم!" کارلوس نے بات گھمائی۔ "آپ تو مجھے اسی دن سے اچھی لگنے لگی تھیں جب میں نے کالج میں آپ کو پہلی بار دیکھا تھا۔"

"کیا میں کچھ دیر کے لیے تمہارے بستر پر آرام کرلوں؟" صبیحہ نے پوچھا۔

"یہ آپ کیوں پوچھ رہی ہیں میڈم؟ میں تو غلام ہوں آپ کا۔"

صبیحہ مسکراتی ہوئی بستر پر لیٹ گئی۔ اس نے اپنی سینڈلیں اتار دیں اور کن انکھیوں سے دیکھا تھا کہ کارلوس کی للچائی ہوئی نگاہیں اس کے پیروں کی طرف اٹھ گئی تھیں۔

صبیحہ اس وقت وہاں آئی بھی اس لیے تھی کہ کالج کے لان کی گھاس پر ہونے والے نامکمل تجربے کی تکمیل سے آشنا ہوسکے۔ اس بہانے اسے کارلوس کے بارے میں اہم معلومات بھی حاصل ہوگئی تھیں اور اسے خیال آیا تھا کہ کارلوس تو اس کے لیے کئی معاملوں میں کارآمد ثابت ہوسکتا ہے۔

اور ایسا ہوتا بھی رہا تھا۔ صبیحہ نے اس سے کئی دوسرے کام بھی لیے تھے۔ اس رات اس نے کارلوس سے اپنی کار میں آگ بھی لگوائی تھی اور اطلاع مل جانے کے بعد اسے طلب کیا تھا۔

اور یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ صبیحہ اسے طلب کرے اور وہ حاضر نہ ہو۔

"سب طریقے سے ہوگیا میڈم!" اس نے آتے ہی کہا تھا۔ "بالکل سناٹا تھا جب میں نے آپ کی کار میں آگ لگائی تھی۔"

"مجھے یقین ہے۔" صبیحہ نے کہا۔ "میں نے اندازہ لگالیا ہے کہ تم بہت ہوشیار ہو۔ اس وقت میں نے تمہیں اس لیے بلایا ہے کہ تم سے دو ایک باتیں بھی ہوجائیں اور......"

اس نے بات ادھوری چھوڑی اور اپنے سینڈل اتارنے لگی۔

کارلوس نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔

صبیحہ بولی۔ "مجھے یاد ہے۔ تم نے بتایا تھا کہ جرائم پیشہ لوگوں میں پھنس جانے کی وجہ سے تمہیں فائرنگ کرنا بھی آگئی تھی۔"

"جی ہاں میڈم!...... پھر ایک مرتبہ آپ نے کہا تھا کہ ایک ریوالور خرید لو۔ میں نے وہ بھی خرید لیا تھا مگر لائسنس نہیں ہے میرے پاس!"

"اس کی پروا نہ کرو۔ شہر میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں جن کے پاس بغیر لائسنس کا اسلحہ ہے۔ ہمارا ملک اس معاملے ہی میں تو بہت ترقی یافتہ ہے۔"

اس کے لہجے میں طنز کی جو لہر تھی، وہ کارلوس محسوس نہیں کرسکتا تھا۔ اس رات اس نے صبیحہ کی کار جلانے کا جو "کارنامہ" سرانجام دیا تھا، اس کی خبر دوسرے دن کے اخبارات میں آگئی تھی۔

☆☆☆

اخبارات اور پھر ٹی وی سے عماد اور فرح کو اس کے بارے میں معلوم ہوا تھا جس کے بعد کچھ دیر آرام کرکے عماد روانگی کے لیے تیار ہوا۔

"کب تک واپس آؤ گے؟" فرح نے پوچھا۔

"زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ گھنٹے میں۔" عماد نے

جواب دیا۔ ''میں خود چاہوں گا کہ دیر نہ لگے۔''

عماد نے فرح سے تو یہی کہا تھا کہ اسے اپنے اس دوست کا پتا لگانا ہے جس کا تعلق کسی خفیہ ایجنسی سے ہے لیکن اس وقت وہ اس سلسلے میں کہیں نہیں جا رہا تھا۔ وہ سید ھا صبیحہ کے والد حشمت اللہ خاں کے دفتر پہنچ گیا۔ اس نے حشمت اللہ خاں کے پی اے کو اپنا وزیٹنگ کارڈ دیا۔

''سر!'' پی اے نے کارڈ دیکھ کر کہا۔ ''میرے سامنے ان چند افراد کے نام ہیں جنہیں آج صاحب سے ملاقات کرنی ہے۔ ان میں آپ کا نام نہیں ہے۔ کیا آپ نے ملاقات کے لیے وقت نہیں لیا؟''

''جی نہیں۔'' عماد نے جواب دیا۔ ''اچانک ہی کسی وجہ سے ضروری ہوگیا ہے کہ میں ان سے اسی وقت ملوں۔''

''میں کارڈ پر آپ کا منصب بھی دیکھ چکا ہوں۔ آپ سے ملنے کے لیے بھی لوگوں کو پہلے وقت لینا پڑتا ہوگا۔ آپ کی شخصیت کی اسی اہمیت کے باعث میں صرف اتنا کر سکتا ہوں کہ انٹرکام پر انہیں آپ کے بارے میں بتا دوں۔''

عماد کو اندازہ تھا کہ اس طرح بات نہیں بن سکے گی۔ حشمت اللہ خاں اتنی ہی بڑی کاروباری شخصیت تھا کہ وہ عماد سے کہیں زیادہ بڑے بینک آفیسر کو بھی ٹرخا سکتا تھا اس لیے اس نے ''ترپ کا پتا'' کھیلنا ضروری سمجھا...... پی اے انٹرکام کا ریسیور اٹھانے ہی والا تھا کہ عماد بول پڑا۔

''ان سے یہ ضرور کہہ دیجیے گا کہ میں ان سے بینک آفیسر کی حیثیت سے ملنے نہیں آیا۔ یہ ان سے میری ایک نجی ملاقات ہوگی جس کا تعلق ان کے ایک گھریلو مسئلے سے ہے۔''

''اوہ!'' پی اے کے چہرے پر کچھ عجیب سے تاثرات ابھرے لیکن اس نے عماد سے مزید کوئی سوال کرنے کے بجائے انٹرکام کا ریسیور اٹھایا اور حشمت اللہ خاں کو وہ سب کچھ بتانے لگا۔ پھر اس نے دوسری طرف سے کچھ سنا اور قدرے توقف سے بولا۔ ''جی، بہتر ہے۔''

اس نے انٹرکام کا ریسیور رکھ دیا اور عماد سے بولا۔ ''تشریف رکھیے سر! آپ کو پندرہ بیس منٹ انتظار کرنا ہوگا۔ دراصل اس وقت کوئی صاحب کمرے میں ہیں۔ ان سے گفتگو ختم ہونے کے بعد صاحب آپ سے ملاقات کرلیں گے۔''

''شکریہ۔'' عماد نے کہا پھر ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ ''یہ آپ نے خوب کہا کہ تشریف رکھیے۔ میں بیٹھا ہوا تو ہوں۔ اب مزید تشریف کہاں رکھی جا سکتی ہے؟''

''سوری سر!'' پی اے جلدی سے بولا۔ ''بس کچھ عادت پڑگئی ہے یہ جملہ بولنے کی۔ کیا آپ کے لیے چائے یا......''

مختصر مختصر...

مینڈک

بچپن میں ماں باپ ڈراتے تھے کہ مینڈک کو پتھر مارا تو گونگی بیوی ملے گی...... بہت ڈر لگتا تھا......

اب سوچتا ہوں کہ پتھر مار ہی دیا ہوتا۔

خواہش

کیا تمہیں کسی عورت کو دیکھ کر یہ خواہش ہوتی ہے کہ کاش تمہاری شادی نہ ہوئی ہوتی۔

''ہاں!''

''کسے؟''

''اپنی بیوی کو۔''

مرسلہ۔ وزیر محمد خان، بٹل ہزارہ

''کسی تکلف کی ضرورت نہیں۔'' عماد نے اس کی بات کاٹ دی۔

کوئی فون آگیا تو پی اے اس کی طرف متوجہ ہوگیا۔ عماد یہاں چلا تو آیا تھا لیکن اس کی یہ الجھن برقرار تھی کہ وہ بات کس طرح کرے گا۔ اس کے دماغ میں بس یہ خیال چکرا رہا تھا کہ اگر وہ اپنے دوست ڈاکٹر زید کی مدد سے صبیحہ کا علاج کروا سکے تو صبیحہ کی وجہ سے لاحق نہ صرف اس کی پریشانی ختم ہوجائے گی بلکہ صبیحہ بھی ایک نارمل زندگی گزار سکے گی۔

بیس منٹ بعد اس کی ملاقات حشمت اللہ خاں سے ہوگئی۔ وہ خاصی حد تک متکبر المزاج شخص تھا، تاہم اس کے چہرے سے کچھ فکر مندی اس لیے ظاہر ہو رہی تھی کہ ایک اجنبی شخص اس سے اس کے کسی گھریلو مسئلے میں ملنے آیا تھا۔

''فرمایئے۔'' اس کے ہونٹوں پر ہلکی سی جبری مسکراہٹ آئی۔

''میں پہلے تو اپنا تعارف کرادوں۔ نام تو آپ کے علم میں آہی گیا ہے لیکن مکمل تعارف اس جملے کے ساتھ ہوگا کہ میں آپ کی بیٹی صبیحہ کا ہم جماعت رہ چکا ہوں۔''

''اوہ!'' حشمت اللہ خاں کے منہ سے بس اتنا ہی نکلا۔

''اسی لیے۔'' عماد نے بات آگے بڑھائی۔ ''صبیحہ کے مزاج سے بھی بہت اچھی طرح واقف ہوں۔ اس کے بارے میں میری وضاحت غیر ضروری ہوگی کیونکہ مجھ سے

زیادہ تو آپ واقف ہوں گے۔ میں دو ڈھائی سال پہلے انگلینڈ چلا گیا تھا۔ کچھ دن ہوئے واپس آیا ہوں اور صبیحہ کی صرف ایک حرکت کی وجہ سے میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اس کے مزاج میں اب بھی کوئی تبدیلی نہیں آئی ہے۔ اگر میں غلط کہہ رہا ہوں تو مجھے ٹوک دیجیے۔"

"کیا آپ کے ساتھ بھی...... میرا مطلب ہے...... کیا اس کا مزاج آپ کے لیے بھی کسی پریشانی کا سبب بن چکا ہے؟"

"جی ہاں لیکن میں اس کی وضاحت نہیں کروں گا۔ اس طرح تو بات کچھ یوں ہوجائے گی جیسے میں اس کی شکایت ہی کرنے کے لیے آپ کے پاس آیا ہوں۔ میرا اصل مقصد تو یہ ہے کہ صبیحہ ایک نارمل زندگی گزار سکے۔ ایک سائیکاٹرسٹ میرا دوست ہے۔ میں اس بارے میں اس سے خاصی بات کر چکا ہوں۔ اس سلسلے میں مجھے آپ کے تعاون کی ضرورت ہے۔"

"میں سمجھا نہیں۔" حشمت اللہ خاں خود کچھ کھل کر بات کرنے سے گریزاں تھا۔

عماد نے کہا۔ "ڈاکٹر زید...... میرا دوست بہت کامیاب سائیکاٹرسٹ ہے۔"

"میں شاید یہ نام سن چکا ہوں۔"

"جی ہاں۔ اس معاملے میں اس کی شہرت خاصی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ جب تک وہ صبیحہ صاحبہ کی تحلیلِ نفسی نہ کرے، ان کا علاج نہیں کرسکتا۔"

"میں کئی مرتبہ یہ کوشش کر چکا ہوں عماد بیٹے! معاف کرنا، میں تمہیں اب اس لیے اتنی بے تکلفی سے مخاطب کر رہا ہوں کہ تم میری بیٹی کے دوست ہو۔"

"آپ کو حق ہے کہ آپ مجھے اس طرح مخاطب کریں بلکہ مجھے خوشی ہوئی کہ آپ نے میرے لیے اپنایت محسوس کی۔"

"ہاں تو میں کہہ رہا ہوں کہ میں کئی مرتبہ یہ کوشش کر چکا ہوں لیکن سائیکاٹرسٹ کا نام ہی سن کر اسے غصہ آجاتا ہے۔ آپے سے باہر ہونے لگتی ہے۔ کیا تم اس کے غصے کا شکار ہوچکے ہو؟"

"جی نہیں۔ ابھی تک تو ایسا نہیں ہوا۔ اس کے بس ضدی مزاج سے آشنا ہوں جو خطرناک حد تک بڑھا ہوا ہے۔"

"مجھ سے تم اس سلسلے میں کیا تعاون چاہتے ہو؟"

"دراصل ڈاکٹر زید ابتدائی طور پر ایک بات تو معلوم کرنا ہی چاہتا ہے۔ وہی سوال میں آپ سے کروں گا۔ اگر آپ برا نہ مانیں۔"

"پوچھو۔"

"صبیحہ کی والدہ کا نام جاننا چاہتا ہوں۔"

"عتیقہ۔" حشمت اللہ خاں کے منہ سے بے اختیار نکلا پھر اس نے ایک طویل سانس لی۔ "یہ نام بہت طویل عرصے بعد میری زبان پر آیا ہے۔ بس بے اختیار آگیا۔ صبیحہ تک یہ بات نہیں جانتی کہ میری موجودہ اہلیہ رابعہ اس کی والدہ نہیں ہیں۔"

عماد کو یوں محسوس ہوا جیسے ایک بوجھ کا ایک بڑا حصہ اس کے دماغ سے اتر گیا ہو۔

حشمت اللہ خاں نے بات جاری رکھی۔ "تم بینک میں ایک اہم منصب پر فائز ہو۔ یقیناً تم خاصے ذمے دار ہو گے۔ پھر یہ کہ صبیحہ کے ہمدرد بھی ہو۔ میں تم سے یہ توقع کرسکتا ہوں کہ تم صبیحہ کو یہ بات نہیں بتاؤ گے۔"

"میں یہ بات صرف ڈاکٹر زید کو بتاؤں گا، اگر آپ اجازت دیں۔ اگر زید نے صبیحہ کے علم میں یہ لانا ضروری سمجھا تو؟"

حشمت اللہ نے قدرے سوچتے ہوئے کچھ توقف سے کہا۔ "اگر ایک سائیکاٹرسٹ یہ ضروری سمجھے گا تو میرا خیال ہے کہ مجھے اس پر اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔"

"شکریہ! کیا آپ یہ بھی بتانا پسند کریں گے کہ صبیحہ آج تک اس بات سے کیوں ناواقف ہیں؟"

حشمت اللہ خاں نے سر ہلایا۔ "وہ صرف ایک سال کی تھی جب ایک خطرناک مرض کا شکار ہو کر اس کی ماں کا انتقال ہوگیا۔ اس کے بعد ہی میں نے دوسری شادی کی تھی۔ رابعہ سے...... یعنی اپنی موجودہ بیوی سے یہ وعدہ لے لیا تھا کہ وہ صبیحہ پر کبھی ظاہر نہیں ہونے دے گی یہ راز!...... اور وہ اپنے وعدے پر آج تک قائم ہے۔ میری موجودہ بیوی سے میرا ایک بیٹا ہے، اشرف۔ وہ بھی اس بات سے واقف نہیں کہ صبیحہ اس کی سگی بہن نہیں ہے۔"

"ہوں۔" عماد نے بھی سر ہلایا پھر پوچھا۔ "صبیحہ سے ان کا رویہ کیسا رہا؟ آپ کی دوسری اہلیہ کا؟"

"وہ...... وہ تو...... وہ تو ٹھیک ہی رہا۔"

حشمت اللہ خاں نے جس تذبذب کے ساتھ جواب دیا تھا، اس سے عماد نے یہی سمجھا کہ یہاں غلط بیانی کی گئی تھی اور اس کا مطلب یہی تھا کہ صبیحہ کے ساتھ حشمت اللہ خاں کی دوسری بیوی کا رویہ ٹھیک نہیں تھا لیکن ایسی صورت میں حشمت اللہ خاں نے دخل اندازی کیوں نہیں کی؟ عماد یہ سوال کرنے کی ہمت نہیں کرسکا۔

حشمت اللہ خاں نے کہا۔ "کیا تم مجھے اپنے دوست

ڈاکٹر زید سے ملوا سکتے ہو؟ وہ صبیحہ سے بات کرنے کے بجائے مجھ سے حالات پوچھ لیں۔ ممکن ہے کہ ان باتوں کی روشنی میں صبیحہ کا علاج کیا جاسکے۔"

"میں آپ کی بات ڈاکٹر زید تک پہنچا دوں گا لیکن میرا خیال ہے کہ اس سے بات نہیں بنے گی۔ غالباً سائیکاٹرسٹ اپنے مریض سے باتیں کرکے ہی اس کے دماغ میں پڑ جانے والی گرہ کھولتا ہے۔ جہاں تک میرے علم میں ہے، اس سلسلے میں میڈیسن نہیں دی جاتیں۔ ویسے زیادہ بہتر تو ڈاکٹر زید ہی بتا سکے گا۔ وہ بہت مصروف رہتا ہے لیکن میں کوشش کروں گا کہ وہ آپ سے ملاقات کرلے۔"

"ہوسکتا ہے کہ اس طرح بہتری کی کوئی صورت نکل سکے۔ یہ تو ممکن نہیں ہے کہ صبیحہ کسی سائیکاٹرسٹ سے بات کرنے کے لیے تیار ہوجائے۔"

"بہرحال ہمیں بہتری کی توقع رکھنا چاہیے۔ میں آپ کا شکرگزار ہوں کہ آپ نے مجھ پر خاصی حد تک اعتماد کرلیا۔ دراصل میں زیادہ فکرمند اس لیے ہوگیا ہوں کہ صبیحہ نے اپنے اس ضدی مزاج کی وجہ سے کسی کو اپنا دشمن بنالیا ہے۔ ان کے شوہر کا قتل شاید اسی دشمنی کی وجہ سے ہوا ہو۔"

"دیکھتے ہیں کیا سامنے آتا ہے۔ پولیس تفتیش تو کر رہی ہے۔"

"کل کسی نے ان کی کار بھی جلادی۔ میں آج یہ خبر سن چکا ہوں۔ اس سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کہ کوئی انہیں نقصانات پہنچانے پر تلا ہوا ہے۔"

"کار کا تباہ ہوجانا کوئی بڑا نقصان نہیں ہے۔ وہ انشورڈ تھی۔ کمپنی وہ نقصان تو پورا کردے گی اور اگر نہ بھی کرے تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ خدا نے مجھے اتنا نوازا ہے کہ یہ نقصان کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ صبیحہ آج ہی دوسری کار بھی خرید لے گی۔"

اتنی گفتگو کے بعد عماد نے وہاں مزید رکنا بے کار سمجھا۔ اپنے گھر پہنچ کر اس نے فرح کو بتایا کہ وہ اب بھی اپنے دوست کا پتا لگانے میں ناکام رہا ہے۔

"لنچ میں کیا کھانا پسند کرو گے؟ خانساماں سے میں کہہ تو چکی ہوں کہ وہ شلجم گوشت ضرور بنائے۔" فرح نے کہا۔ وہ اس موضوع پر بات ہی نہیں کرنا چاہتی تھی جو عماد کی بات پر کچھ کہنے کے باعث چھڑ جاتا۔

عماد نے بھی صبیحہ کے موضوع پر کوئی بات نہیں چھیڑی۔ اس نے اس دن بھی اپنے اس دوست کا سراغ لگانے کے لیے فون کرنے کا سلسلہ جاری رکھا اور آخر اپنے مقصد میں کامیاب بھی ہوگیا۔ اسے اپنے دوست کا موبائل نمبر بھی مل گیا۔ اس نے موبائل پر اس سے بات کی۔

"بڑی مشکل سے ہاتھ لگ سکے ہو تم۔" عماد نے کہا اور پھر شکایتی لہجے میں کہا۔ "تمہیں مجھ سے کسی وقت تو رابطہ کرنا چاہیے تھا۔"

"اب کیا بتاؤں تمہیں! اس ملازمت میں مصروفیت بڑھتی ہے تو بڑھتی ہی چلی جاتی ہے۔ اتفاق ہے کہ آج ہی فارغ ہوا ہوں ایک کیس سے اور آج ہی تمہارا فون آگیا۔"

"تو آج فارغ ہو؟"

"ہاں...... کیوں؟"

"کچھ بہت ہی ضروری باتیں کرنی ہیں تم سے۔ آج رات کھانا تم میرے ساتھ کھاؤ۔"

"وہ تو خیر میں آجاؤں گا لیکن ضروری باتیں کیا ہیں۔"

"فون پر نہیں کی جاسکتیں۔"

"چلو ٹھیک ہے۔ آتا ہوں میں۔"

عماد نے رابطہ منقطع کردیا۔ صبیحہ کے معاملے میں کوئی بات کرکے وہ فرح کو نہیں چھیڑنا چاہتا تھا مگر کیونکہ رات کو دعوت کر بیٹھا تھا اس لیے فرح کو بتانا ہی پڑا۔

"شوجی کا سراغ لگا ہی لیا میں نے۔" اس نے فرح کو بتایا۔ وہ اپنے اس دوست کو شوجی ہی کہا کرتا تھا۔ "بات بھی کرلی ہے اس سے فون پر۔ رات کو کھانے پر بلالیا ہے اور ابھی خیال آیا ہے کہ اسی وقت زید کو بھی مدعو کرلوں اگر وہ مصروف نہ ہو تو۔"

فرح نے طویل سانس لی۔ "ٹھیک ہے۔ میں خانساماں کو ہدایات دے دیتی ہوں۔"

"دعوت اچھی ہونی چاہیے میری جان!"

"اس کی فکر نہ کرو لیکن اس پر اصرار نہ کرنا کہ میں بھی کھانے میں تم لوگوں کے ساتھ شامل ہوں۔"

"کیوں؟"

"میں سمجھ رہی ہوں نا، کیا باتیں ہوں گی۔ تم اندازہ لگا چکے ہو کہ مجھے اب صبیحہ کے نام سے ہی چڑ ہوگئی ہے۔"

"اور بلاوجہ ہوگئی ہے۔"

اس سے پہلے کہ فرح کچھ کہتی، عماد کے موبائل کی گھنٹی بج اٹھی۔ عماد نے موبائل جیب سے نکالا۔ اسکرین پر اسے ایک اجنبی نمبر دکھائی دیا لیکن اس نے کال ریسیو کرہی لی۔

"ہیلو!"

"مجھ سے تم بچ نہیں سکتے ڈیئر!" دوسری طرف سے

چیختی ہوئی نسوانی آواز سنائی دی۔

عماد چونک گیا۔ اس نے صبیحہ کی آواز پہچان لی تھی۔ اس نے جلدی سے موبائل کا اسپیکر کھول دیا۔ وہ چاہتا تھا کہ فرح بھی ان کی باتیں سن لے۔

''کون ہیں آپ؟'' عماد نے بڑی سنجیدگی سے پوچھا۔

دوسری طرف سے ہنسی کی آواز کے بعد کہا گیا۔

''ناممکن ہے کہ تم نے میری آواز نہ پہچانی ہو۔ نہیں ڈیئر! اس طرح بات نہیں بنے گی۔ داد تو دو کہ میں نے تمہارا پتا لگا لیا۔ صبیحہ ہے میرا نام ڈیئر!...... اور صبیحہ کے لیے کچھ ناممکن نہیں۔ تم مجھے دیکھ کر بھاگ تو نکلے تھے لیکن تمہاری کار کا نمبر میرے ذہن میں رہ گیا تھا۔''

عماد نے کن انکھیوں سے فرح کی طرف دیکھا۔ وہ نظریں جھکائے بیٹھی تھی لیکن چہرے کے تاثرات سے صاف ظاہر تھا کہ وہ موبائل سے آنے والی آواز توجہ سے سن رہی تھی۔

''نمبروں کی وجہ سے معاملہ آسان رہا۔'' صبیحہ کہہ رہی تھی۔ ''کل ہی معلوم ہو گیا تھا کہ وہ تمہارے بینک کے نام پر رجسٹرڈ ہے۔ آج یہ بھی معلوم ہو گیا کہ بینک نے وہ کار تمہارے استعمال کے لیے وقف کی ہے۔ دفتر ہی سے تمہارا فون نمبر بھی معلوم ہو گیا۔ یہ بھی پتا چلا کہ تمہاری طبیعت کچھ ناساز ہے اور تم نے چھٹی لے لی ہے جبکہ میرا خیال ہے تمہاری چھٹی کا سبب کچھ اور ہے۔ ڈر گئے ہو تم۔''

''میں کس بات سے ڈروں گا؟'' عماد بولا۔

''اس سے کہ کہیں پھر میری نظر میں نہ آجاؤ لیکن تم نے احمقانہ انداز میں سوچا۔ آخر کب تک چھٹی کر سکو گے۔ خیر چھوڑو ان باتوں کو۔ ملاقات کرنی ہے مجھے تم سے۔ آج ہی ملو۔ کہاں آؤ گے؟''

فرح نے اچانک عماد کے ہاتھ سے موبائل جھپٹ لیا اور صبیحہ سے کہا۔ ''جب تم نے فون نمبر معلوم کر لیا ہے تو گھر کا پتا بھی معلوم کر لیا ہوگا اور اگر نہیں معلوم ہوا تو میں بتا دیتی ہوں۔ یہیں آ کر مل لو عماد سے۔''

موبائل کا اسپیکر اس وقت بھی کھلا ہوا تھا۔ عماد نے صبیحہ کے ہنسنے کی آواز سنی پھر وہ بولی۔ ''گھر بھی معلوم ہو گیا ہے اور یہ بھی کہ عماد کی شادی ہو چکی ہے۔ تم عماد کی بیوی ہی ہو گی۔''

''ہاں۔'' فرح نے کہا۔ ''آ کر میرے سامنے ہی مل لو عماد سے۔''

''ٹھیک ہے میں آجاتی ہوں۔ اچھا ہے، تمہیں دیکھ بھی لوں گی۔ میں آدھے گھنٹے میں پہنچ رہی ہوں۔''

پھر اس نے مزید کچھ سنے بغیر رابطہ منقطع کر دیا تھا۔

''یہ کیا کیا تم نے۔'' عماد فکرمندی سے بولا۔ ''یہاں کیوں بلا لیا اسے؟''

''میں چاہتی ہوں، آج اس سے میرا آمنا سامنا ہو ہی جائے۔ دیکھوں تو وہ کتنی خوف ناک ہے جس سے تم اتنا ڈرتے ہو اور جس کی خواہش یہ ہوگی کہ تمہیں مجھ سے چھین لے۔'' فرح کے چہرے پر غصے کے تاثرات تھے۔

عماد نے بات آگے بڑھانا مناسب نہیں سمجھا۔ اسے اندازہ تھا کہ فرح کو اس سے محبت ہی اتنی شدید تھی کہ صبیحہ کے ارادے جان کر جنون میں مبتلا ہو سکتی تھی۔

عماد کو اب یہ ڈر بھی ہو گیا تھا کہ ان دونوں کا آمنا سامنا ہونے سے بات نہ جانے کس حد تک آگے بڑھ جائے۔

☆☆☆

آدھے گھنٹے بعد ہی صبیحہ، عماد کے گھر پر تھی۔ اس نے کسی اچھے بوتیک کا نہایت یونیک قسم کا لباس پہنا ہوا تھا۔ گھر میں داخل ہوتے وقت اس کے ہونٹوں پر جس قسم کی مسکراہٹ تھی، اسے فاتحانہ مسکراہٹ ہی کہا جا سکتا تھا۔ وہ اسے اپنی فتح سمجھ رہی تھی کہ اس نے ''مفرور عماد'' کو ڈھونڈ لیا تھا۔ فرح کی طرف دیکھتے ہوئے اس کے تیور بھی بڑے تیکھے تھے۔ عماد اسے فوری طور پر ڈرائنگ روم میں لے آیا تھا ورنہ شاید دروازے پر ہی فرح کی اس سے جھڑپ ہو جاتی۔

''تمہیں شاید خواہش تھی مجھ سے ملنے کی۔'' صبیحہ ہی نے گفتگو کا آغاز کیا۔ وہ فرح سے مخاطب تھی۔

عماد جلدی سے بول پڑا۔ ''بہت افسوس ہوا آج ایک خبر سن کر۔ کل کسی نے تمہاری کار میں آگ لگا دی۔ کوئی تمہارا دشمن ہو گیا ہے۔''

''اگر کوئی میرا دشمن بنے گا تو اسے وہ دشمنی بہت مہنگی پڑے گی۔'' صبیحہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''کار میں آگ تو میں نے خود لگائی تھی۔''

''کیوں؟'' عماد نے تعجب کا اظہار کیا۔

''جو چیز میرا ساتھ نہ دے سکے، تباہی اس کا مقدر تو بنے گی۔'' صبیحہ نے جواب دیا۔ ''اس روز تم میری نظر میں آنے کے بعد بھاگ نکلے۔ میری کار تمہارا تعاقب جاری نہ رکھ سکی۔ یہی قصور تھا اس کا۔ جھنجلا گئی تھی میں لہٰذا ختم کر دیا اسے۔''

اس جواب پر عماد تو اس کا صرف منہ تکتا رہ گیا تھا لیکن فرح بول پڑی۔ ''تو کیا بالکل ہی پاگل ہو تم؟''

"پاگل۔" صبیحہ ہنس پڑی۔ "ہاں پاگل تو ہوں میں لیکن جس معنی میں پاگل ہوں، وہ تمہاری سمجھ میں ابھی نہیں آیا ہوگا لیکن ابھی، اسی وقت چند منٹ میں آجائے گا تمہاری سمجھ میں۔"

بات آگے بڑھ جانے کے پیشِ نظر عماد جلدی سے بول پڑا۔ "تم تو مجھ سے ملنے آئی ہونا صبیحہ! مجھ سے بات کرو تم۔"

"میں تم سے ہی بات کر رہی تھی۔ یہ محترمہ خود ہی کود پڑیں بیچ میں!" فرح نے اسے بڑی سخت نظروں سے دیکھا مگر کچھ بولی نہیں۔

"تم انگلینڈ چلے گئے تھے نا عماد!" صبیحہ نے بات جاری رکھی۔ "اچھا نہیں کیا تھا تم نے! بڑی بے چینی سے انتظار کرتی رہی ہوں میں تمہارا۔ میری کوئی پسندیدہ چیز مجھ سے دور ہو جائے، میری نظروں سے اوجھل ہو جائے تو بہت بے سکون ہو جاتی ہوں۔ خیر چھوڑو۔ جو ہوا سو ہوا۔ اب تم آہی گئے ہو۔ چلو کہیں چلتے ہیں۔ کسی ایسی جگہ جہاں صرف ہم دونوں ہوں۔"

فرح تیز لہجے میں بول پڑی۔ "یہ تم میرے ہی سامنے کہہ رہی ہو؟ عماد کی بیوی کے سامنے!"

اس سے پہلے کہ صبیحہ اسے کوئی جواب دیتی، عماد جلدی سے بولا۔ "تم مجھ سے بات کرو صبیحہ!...... تم کو معلوم ہو چکا ہے کہ میری شادی ہو چکی ہے۔ اب یہی مناسب ہوگا کہ تم مجھے بھول جاؤ۔"

"یہ تو خیر ممکن ہی نہیں۔" صبیحہ نے بڑے اطمینان سے کہا۔ "جو چیز مجھے پسند آجائے، میں اسے بھول نہیں سکتی۔ تم نے شادی کرلی لیکن میں تمہاری یہ غلطی نظرانداز کرسکتی ہوں۔ تم اسے......" صبیحہ نے فرح کی طرف اشارہ کیا۔ "طلاق دے دو۔"

"کیا!" فرح اچھل کر کھڑی ہوگئی۔ "تم میرے گھر میں بیٹھ کر ایسی بات کر رہی ہو۔"

"دیکھا تم نے!" صبیحہ نے شکایتی نظروں سے عماد کی طرف دیکھا۔ "میں تم سے بات کر رہی ہوں۔ یہ پھر بیچ میں کود پڑیں۔"

"تم نے بات ہی غلط کی ہے۔" اس مرتبہ عماد نے قدرے تیز لہجے میں کہا۔ "یہ ناممکن ہے کہ میں فرح کو طلاق دے دوں۔"

"اگر یہ ناممکن ہے تو پھر اس کی ایک اور صورت بھی ہوسکتی ہے۔" صبیحہ بڑے اطمینان سے اس طرح بات کر رہی تھی جیسے وہ موضوع کسی خاص اہمیت کا حامل نہ ہو۔ وہ

فرح کی طرف متوجہ ہوئی۔ "اگر عماد تمہیں طلاق دینے کے لیے تیار نہیں تو تم ہی خلع کا مطالبہ کردو۔"

"یقیناً تم بالکل پاگل ہو چکی ہو۔" فرح نے جواب دے کر سختی سے دانت پر دانت جما لیے۔

صبیحہ نے اس کے جواب پر جیسے دھیان ہی نہیں دیا اور بولی۔ "اگر تمہارا مطالبہ رد کیا جائے تو تم عدالت کا سہارا بھی لے سکتی ہو۔ مقدمے کے تمام اخراجات میں برداشت کروں گی۔"

"چلی جاؤ یہاں سے!" فرح گرجی۔

"یہ تو غیر اخلاقی بات ہوئی۔" صبیحہ کے ظاہری سکون میں کوئی فرق نہیں آیا۔ "تم نے خود مجھے بلایا اور اب اس طرح میری توہین کر رہی ہو۔ یہ تو بہت بری بات ہے۔"

"کیا اچھا ہے اور کیا برا، یہ سمجھانے کی تمہیں کوئی ضرورت نہیں۔" فرح کا چہرہ سرخ ہونے لگا۔

عماد اس صورتِ حال سے خاصا پریشان نظر آنے لگا تھا۔ اس کے خیال مطابق فرح بہت کھل کر صبیحہ کو اپنا دشمن بنا رہی تھی۔ وہ اس موقع پر دخل اندازی کرنا چاہتا تھا لیکن صبیحہ پھر بول پڑی۔

"اگر تم نے خلع نہ لیا تو یہ سمجھ لو کہ۔" صبیحہ نے فرح کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "تمہاری باقی زندگی بیوگی میں گزرے گی۔"

"تم...... تم......" غصے کی زیادتی کے باعث فرح کے لیے بولنا مشکل ہو گیا، تاہم اس نے اپنی بات مکمل کی۔ "تم میرے شوہر کو قتل کرنے یا کروانے کی دھمکی دے رہی ہو۔"

"مجبوری ہے۔" صبیحہ نے شانے اچکائے۔ "میرا مزاج ہی یہی ہے۔ مجھے جو چیز پسند آجائے، اسے میں حاصل کرتی ہوں یا اسے فنا کر دیتی ہوں اور جو چیز مجھے نقصان دے جائے، تباہی اس کا مقدر بنتی ہے، جیسے میں نے اپنی کار تباہ کردی۔ میں کچھ بھی کرسکتی ہوں۔ اگر تم نے میری بات نہ مانی تو جلد ہی تمہیں یقین بھی آجائے گا کہ میں جو کہتی ہوں، وہ پتھر کی لکیر ہوتا ہے۔"

"میں تمہارے خلاف پولیس میں رپورٹ درج کراؤں گی۔" فرح کے تنفس کی رفتار بڑھ گئی۔

"اچھا!" صبیحہ ہنسی۔ "کیا رپورٹ درج کراؤ گی؟"

"یہی کہ تم نے میرے شوہر کو قتل کی دھمکی دی ہے۔"

"کیا ثبوت دوگی کہ میں نے دھمکی دی ہے؟" صبیحہ ہنستی رہی جس سے فرح کا غصہ اور عماد کی پریشانی بڑھتی رہی۔

"یہ تمہیں وقت بتائے گا۔" فرح اب غصے سے

کانپنے لگی تھی۔

''ٹھیک ہے عماد؟'' صبیحہ نے سنجیدگی سے عماد کی طرف دیکھا۔ ''دیکھ لی تم نے اپنی محبوب بیوی کی محبت؟ وہ تمہاری زندگی داؤ پر لگانے کے لیے تیار ہے۔''

''بکواس۔'' فرح بول پڑی۔

صبیحہ نے اس کی طرف توجہ نہیں دی، عماد کی طرف دیکھتی رہی۔

عماد بولا۔ ''یہ ساری باتیں غصے اور جذبات میں ہوتی رہی ہیں۔ بہتر ہوتا کہ اس معاملے میں ٹھنڈے دل و دماغ سے بات کی جاتی۔''

''میں نے پوری طرح ٹھنڈے دل و دماغ سے باتیں کی ہیں اور اب یہ بھی غیر جذباتی انداز میں کہہ رہی ہوں کہ میری پسند کی جو چیز میری نہیں ہو سکتی، وہ کسی کی نہیں ہو سکتی۔'' وہ کھڑی ہو گئی۔ ''ضائع کرنے کے لیے میرے پاس وقت نہیں ہوتا۔ جو کچھ کہنا تھا، وہ میں کہہ چکی ہوں۔''

وہ جانے کے لیے دروازے کی طرف مڑ گئی۔

''میں تمہاری اس دھمکی سے بالکل خوف زدہ نہیں ہوں صبیحہ!'' عماد بھی کھڑا ہو گیا۔ ''اور یہ میرا اخلاقی فرض ہے کہ تمہیں دروازے تک تو چھوڑ آؤں۔''

''کوئی ضرورت نہیں اس کی۔'' فرح تڑخی۔

صبیحہ تیزی سے چلتی ہوئی ڈرائنگ روم کے بیرونی دروازے تک پہنچ چکی تھی۔

''سمجھا کرو بات۔'' عماد نے فرح کا ہاتھ دبا کر دھیمی آواز میں کہا۔ ''میں بس اطمینان کرنا چاہتا ہوں کہ وہ ہمارے گھر سے چلی گئی۔''

پھر وہ فرح کے جواب کا انتظار کیے بغیر صبیحہ کے پیچھے لپکا جو ڈرائنگ روم سے باہر نکل چکی تھی۔

''بات تو سنو تم!'' عماد نے صبیحہ کے قریب پہنچ کر کہا۔ ''یہ میں پھر دہراؤں گا کہ میں تمہاری دھمکی سے ڈرا نہیں ہوں لیکن بہتر ہوگا کہ ہم اس معاملے میں پھر گفتگو کر لیں۔ میں فون کر کے تمہیں بتاؤں گا کہ ہم کب اور کہاں ملیں گے۔''

''بات اب ختم ہو چکی۔'' صبیحہ نے سنجیدگی سے کہا۔ ''اب میں تم سے اسی وقت مل سکتی ہوں جب مجھے علم ہو جائے کہ تم اپنی بیوی کو طلاق دے چکے ہو۔ جو چیز کسی اور کے استعمال میں ہو، وہ میرے استعمال میں نہیں آ سکتی۔''

''ہم اس مسئلے پر بات کریں گے۔''

''میں اب کوئی بات نہیں کرنا چاہتی۔''

''اگر تم نے اس قسم کا خطرناک کھیل کھیلا تو وہ تمہیں بہت مہنگا پڑے گا۔''

وہ دونوں یہ بحث کرتے ہوئے برآمدے تک آ گئے۔ صبیحہ اپنی بات پر اڑی رہی تھی۔ وہ اپنی کار کی طرف بڑھ گئی۔ مگر وہ یہ کار نہیں تھی جس میں اس نے عماد کا تعاقب کیا تھا اور عماد کو حشمت اللہ خاں کی بات یاد تھی کہ آج وہ دوسری کار خرید لے گی۔

عماد واپس لوٹا۔ فرح ابھی ڈرائنگ روم ہی میں تھی اور بے چینی سے ٹہل رہی تھی۔ عماد کو دیکھ کر وہ چھوٹتے ہی بولی۔ ''پولیس اسٹیشن چلو۔''

''دھیرج رکھو ڈیئر!...... اس نے ٹھیک کہا تھا۔ پولیس ثبوت مانگے گی جو نہ تم دے سکتی ہو، نہ میں دے سکتا ہوں۔''

''تو کیا ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھے رہیں؟''

''رات کے کھانے پر شوجی آ رہا ہے۔ وہ ایجنسی کا آدمی ہے۔ تجربہ کار ہے۔ وہ ضرور کوئی مفید مشورہ دے سکے گا۔ ہم اس کے مشورے کے مطابق کوئی اقدام کریں گے۔ سمجھنے کی کوشش کرو تم میری بات!''

فرح نے جواب میں کچھ کہے بغیر عماد کی طرف دیکھا تو اس کی آنکھوں میں آنسو جھلملا رہے تھے۔

''جذباتی نہ ہو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' عماد نے جواب دیتے ہوئے اسے اپنے سینے سے لگا لیا۔

☆☆☆

فرح نے جو کہا تھا، اس کے مطابق وہ تینوں دوستوں کی دعوت میں ان کے ساتھ نہیں بیٹھی۔ اس پر شوجی اور زید، دونوں ہی کو تعجب ہوا۔

''وجہ ہے اس کی۔'' عماد نے کہا۔ ''بعد میں بتاؤں گا۔''

''تم دونوں کا آپس میں کوئی جھگڑا تو نہیں ہوا؟'' زید ہنس کر بولا۔

''ایسی کوئی بات نہیں ہے یار! کھانا، بعد میں بتاؤں گا۔ پہلے شوجی کو بتا دوں کہ میں نے اسے آج کیوں بلایا ہے۔''

شجاعت بولا۔ ''میرے ذہن میں بھی خلش ہے کہ تم آج مجھ سے ملنے کے لیے اتنا بے چین......''

''بے چینی کا سبب ایک صاحب زادی ہیں۔'' زید بول پڑا۔

''صاحب زادی؟ یعنی بھابی کے علاوہ کوئی اور ہے؟''

''ہاں، ہے ایک پاگل لڑکی۔'' عماد نے کہا پھر زید سے بولا۔ ''میں نے آج یہ تو معلوم کر لیا ہے کہ حشمت اللہ خاں کی موجودہ بیوی صبیحہ کی سگی ماں نہیں ہیں۔ سگی ماں کا

انتقال اس وقت ہوگیا تھا جب وہ ایک سال کی تھی اور اسے آج بھی علم نہیں کہ رابعہ حشمت اس کی سگی ماں نہیں ہے۔"

عماد نے حشمت اللہ خاں سے اپنی ملاقات کا حال تفصیل سے بیان کردیا۔

"ہوں۔" زید نے سر ہلایا۔ "تو میرا خیال درست ہی ثابت ہوتا نظر آرہا ہے۔ اس کا امکان ہے کہ صبیحہ کی شخصیت مسخ کرنے میں اس کی سوتیلی ماں کا ہاتھ ہو۔"

"لیکن حشمت اللہ خاں نے یہ نہیں بتایا کہ اس نے اس معاملے میں دخل اندازی کیوں نہیں کی۔"

"تم دونوں کی باتیں مجھے الجھن میں ڈال رہی ہیں۔" شجاعت بولا۔ "آخر قصہ کیا ہے یہ؟"

"وہی بتانے کے لیے تو بلایا ہے تمہیں!"

"تو اب کچھ بتاؤ بھی۔ تم تو زید کے شعبے میں پھنسے ہوئے ہو۔"

"یہ لڑکی۔" عماد نے اس کی طرف دیکھتے اور سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ "کالج میں میری ہم جماعت رہی ہے۔"

اس نے شروع سے آخر تک سارا قصہ سنا ڈالا مگر اسی دن کا واقعہ نہیں بتایا۔ وہ اس بارے میں بعد میں بات کرنا چاہتا تھا۔

شجاعت نے ساری کہانی بالکل خاموشی سے سنی۔ سننے کے بعد بھی ذرا دیر چپ رہا پھر بولا۔ "تو اپنے شوہر کو بھی اسی نے قتل کروایا ہے؟"

"یہ میرا ذاتی خیال ہے۔"

"تو میں اس سلسلے میں تمہاری کیا مدد کرسکتا ہوں؟"

"دو کام چاہتا ہوں میں تم سے۔ ایک تو یہ کہ حشمت اللہ خاں کی دوسری شادی آخر کن حالات میں ہوئی تھی۔ یہ معلوم ہوجانے کی صورت میں یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اس نے...... فی الحال یہ بھی قیاس ہے۔ اگر صبیحہ سوتیلی ماں کی زیادتیوں کا شکار ہوئی ہے تو حشمت اللہ خاں اس میں دخل اندازی کیوں نہیں کرسکا اور دوسرا کام یہ معلوم کرنا ہے کہ انسپکٹر جعفری نے فیصل کے قتل کی تفتیش کس حد تک کی ہے۔"

"یہ دوسرا کام تو میرے لیے مشکل ہے عماد!" شجاعت نے کہا۔ "ایک سبب تو یہ کہ کل سے میں کچھ بہت مصروف ہوسکتا ہوں۔ تمہارا فون آنے کے ایک گھنٹے بعد ہی مجھے اطلاع ملی ہے کہ ڈائریکٹر جنرل صاحب نے مجھے کل صبح نو بجے بلایا ہے اور ان کے بلانے کا مطلب اس وقت یہی ہوسکتا ہے کہ وہ کوئی کیس مجھے سونپنا چاہتے ہیں۔ مصروفیت یقیناً بڑھے گی۔ دوسری بات یہ کہ مجھے پولیس کے معاملات میں دخل اندازی کا کوئی حق نہیں۔ جعفری کو میں جانتا بھی نہیں ہوں ورنہ اس سے ذاتی طور پر بات کرلیتا۔ البتہ تمہارا پہلا کام بہرحال ہوجائے گا۔ وہ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ کسی ذریعے سے کل ہی معلومات کرلوں گا۔ تمہیں فون پر بتادوں گا کہ حشمت اللہ خاں کی شادی کن حالات میں ہوئی۔ اس کا سارا ماضی ...معلوم ہوجائے گا۔"

"چلو یہی ایک کام کر ڈالو۔" عماد نے کہا۔ "جعفری سے تو میں خود ہی ملنے کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔"

"کیوں سوچ رہے ہو ملنے کی؟ اور کس حیثیت سے ملو گے؟"

"ایک عام شہری کی حیثیت سے جو قانون کی مدد کرنا چاہتا ہے۔"

"کیا مدد کرو گے تم اس کی؟"

"اسے صبیحہ کی شخصیت کے بارے میں بتاؤں گا۔ اس کی نسبت سے اپنے سارے تجربات اس کے علم میں لاؤں گا۔ یہ بھی بتاؤں گا کہ آج اس نے مجھے قتل کی دھمکی بھی دی ہے۔"

"قتل کی دھمکی؟" شجاعت چونک گیا۔

کچھ ایسی ہی کیفیت زید کی بھی ہوئی تھی۔ اب عماد نے اس دن کا سارا قصہ بھی بیان کر ڈالا اور بولا۔ "جب اس نے فرح سے کچھ اس قسم کی بات کی کہ وہ بیوی کی زندگی گزارنے کے لیے تیار ہوجائے تو اس کا مطلب یہی ہوا نا کہ وہ مجھے قتل کروا دے گی۔"

"یہ تو پھر خاصی سنگین صورت حال پیدا ہوگئی۔" شجاعت نے تشویش ظاہر کی۔ "اگر واقعی وہ اتنی ضدی لڑکی ہے کہ لوگوں کو قتل بھی کرواسکتی ہے تو اب تمہیں بہت محتاط رہنا ہوگا۔ پولیس تو فوری طور پر اس کے خلاف کوئی ایکشن لے نہیں سکتی۔ اس کا تمہارے پاس کوئی ثبوت نہیں ہے کہ اس نے تمہیں قتل کی دھمکی دی ہے۔ وہ کسی معمولی گھر کی لڑکی ہوتی تو پولیس اپنے مخصوص انداز میں اس کی گوشمالی کرسکتی تھی لیکن وہ ایک بڑے بزنس مین کی بیٹی ہے۔ پولیس کسی ثبوت کے بغیر اس پر ہاتھ نہیں ڈال سکتی۔"

"ان حالات میں تم مجھے کیا مشورہ دے سکتے ہو؟"

"تمہیں محتاط تو رہنا ہوگا۔" زید بول پڑا۔

عماد سوالیہ نظروں سے شجاعت کی طرف دیکھتا رہا۔

"یہ تو میں بھی کہہ چکا ہوں ابھی۔" شجاعت نے کہا پھر عماد کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "جعفری سے تو تم مل ہی

لو کیونکہ تمہارے پاس ان باتوں کا کوئی ثبوت نہیں ہے اس لیے جعفری صبیحہ کے خلاف کوئی ایکشن تو نہیں لے سکتا مگر ان باتوں سے اسے فیصل کے قتل کی تفتیش میں مدد تو ملے گی۔ تمہاری ان باتوں کی روشنی میں کوئی شک تو کیا ہی نہیں جاسکتا کہ وہ ایک پاگل لڑکی ہے۔''

''میں اسے صرف نفسیاتی مریضہ کہوں گا۔'' زید بول پڑا۔

''یہ تو تمہارے پیشے کا تقاضا ہے۔ دوسرے لوگ تو اسے پاگل ہی کہیں گے۔'' شجاعت نے کہا۔

''مجھے اس کی وجہ سے پریشان تو بہت ہونا پڑا ہے۔'' عماد نے کہا۔ ''مگر اس کے باوجود مجھے اس سے ہمدردی ضرور ہوگئی ہے۔''

''کیا بھابی فرح سے زیادہ خوب صورت ہے؟'' شجاعت مسکرایا۔

''مذاق نہ اڑاؤ شوجی!'' عماد نے سنجیدگی سے کہا۔

''مجھے یہ جاننے کے بعد اس سے ہمدردی ہوئی ہے کہ اسے کس قسم کے حالات نے ایسا بنایا ہے اور وہ عام اصطلاح کے مطابق پاگل نہیں بلکہ نفسیاتی مریضہ ہے۔'' پھر وہ یکایک زید سے مخاطب ہوا۔ ''کیا تم حشمت اللہ خاں سے ملنے کے لیے کچھ وقت نکال سکو گے؟''

''تمہاری خاطر اتنا تو میں کر ہی سکتا ہوں اور اگر مجھے ان سے صحیح جوابات مل سکے تو شاید اس لڑکی کا کیس بھی سمجھ لوں مگر اس کا علاج اگر ممکن ہے تو ایسی صورت میں جب وہ خود بھی اپنے اس مرض سے نجات حاصل کرنا چاہے۔ یعنی وہ مجھ سے تعاون کرے۔ میرے ساتھ اس کی کچھ نشستیں ہوسکیں۔''

''یہ تو مجھے ممکن نظر نہیں آتا۔ ہاں ایک بات اور...... یہ خیال مجھے ابھی ابھی آیا ہے۔ وہ شادی نہیں کرنا چاہتی۔ آخر کیوں؟''

''ہاں۔'' زید نے سر ہلایا۔ ''اس کی بھی کوئی نفسیاتی وجہ ہوگی۔''

''یہی خیال آیا تھا مجھے۔'' عماد نے کہا پھر بولا۔ ''فرح تو اس لڑکی کے نام سے بھی چڑنے لگی ہے۔ اسی لیے وہ ہم لوگوں کے ساتھ کھانے میں شریک نہیں ہوئی۔ وہ جانتی تھی کہ میں تم دونوں سے اسی کے معاملے میں بات کروں گا۔''

اسی گفتگو کے دوران میں صبیحہ کے ''مساکسٹ'' اور ''سیڈسٹ'' ہونے کا ذکر بھی آیا تھا اور زید نے کہا تھا۔

''زیادہ تر نفسیاتی امراض کی جڑیں لوگوں کے بچپن ہی میں ملتی ہیں۔ ایسا کم ہوتا ہے کہ زیادہ عمر کا کوئی واقعہ کسی نفسیاتی مرض کا شاخسانہ بنے۔''

پھر کھانے اور گفتگو کے اختتام پر بس یہی طے پاسکا کہ عماد کو اب بہت محتاط رہنا ہوگا اور جعفری سے ملاقات بھی ضرور کرے گا۔ زید نے بھی اس پر آمادگی ظاہر کردی تھی کہ وہ حشمت اللہ خاں سے ملاقات کرلے گا جس کا بندوبست عماد کو جلد از جلد کرنا تھا۔

جب دونوں دوست جانے لگے تو فرح بھی سامنے آگئی۔ اس نے عماد کے ساتھ ہی ان دونوں کو رخصت کیا پھر وہ دونوں خواب گاہ میں آگئے۔ فرح نے دوستوں کی اس ملاقات کے بارے میں عماد سے کوئی استفسار نہیں کیا۔ وہ صبیحہ کا ذکر سننے کی بھی روادار نہیں رہی تھی۔ عماد نے بھی مناسب نہیں سمجھا کہ اس بارے میں کوئی بات کرے۔

''کل سے دفتر جانا تو شروع کرنا ہی پڑے گا۔'' وہ بولا۔ ''زیادہ چھٹیاں تو خود میرے لیے مصیبت بن جائیں گی۔ اب بھی خاصی فائلوں کا ڈھیر لگ چکا ہوگا۔''

''میں نے تم سے پولیس میں رپورٹ درج کرانے کی بات کی تھی۔'' فرح نے اپنی ہی بین بجائی۔

''میں نے کہا تھا ناکہ اس بارے میں شوجی سے مشورہ کروں گا۔ اس کا بھی یہی خیال ہے کہ ثبوت کے بغیر پولیس صبیحہ کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھاسکے گی اس لیے مجھے بس زیادہ سے زیادہ یہ کرنا چاہیے کہ جعفری سے ملاقات کرلوں، اسے بتادوں صبیحہ کے مزاج کے بارے میں۔''

فرح کے نہ چاہتے ہوئے بھی باتوں میں صبیحہ کا نام آہی گیا تھا۔

''صرف مزاج کے بارے میں؟'' وہ بولی۔ ''اس کی دھمکی کے بارے میں نہیں؟''

''ظاہر ہے کہ وہ بھی۔'' عماد نے جواب دیا۔ ''ویسے تو جعفری بھی اس دھمکی کے باعث صبیحہ کے خلاف کوئی اقدام نہیں کرسکتا لیکن یہ ممکن ہے کہ فیصل کے قتل کی تفتیش میں اسے کچھ مدد مل جائے۔''

''ہوں۔'' فرح کسی سوچ میں ڈوبی رہی۔ صبیحہ کی آمد کے بعد سے ہی وہ اس کیفیت میں تھی۔

عماد مسکرا کر بولا۔ ''مجھے خوشی ہے کہ تم میرے دفتر جانے کے خیال سے پریشان نہیں ہوئیں۔''

''میں اس سے کیوں پریشان ہوتی؟...... میں نے تو پہلے بھی چھٹیاں لینے کی حمایت نہیں کی تھی۔''

''لیکن مجھے بزدل ضرور سمجھا تھا۔''

''ایسی بھی کوئی بات نہیں تھی عماد!''

''میں تو صرف اس وجہ سے پریشان تھا کہ اگر وہ مجھ تک پہنچ گئی تو تمہارے لیے ضرر رساں ثابت ہو سکتی ہے لیکن وہ پہنچ ہی گئی۔ کار کے نمبر سے ہی اس نے سب کچھ پتا لگا لیا۔ بہر حال اب میں تمہارے لیے فکر مند نہیں ہوں۔ وہ تو مجھے ہی قتل کرنے کا فیصلہ کر چکی ہے، تو یہ میرے لیے کوئی پریشانی کی بات نہیں۔''

''کوئی مذاق نہیں قتل کرنا یا کروانا۔''

''اگر میرا خیال غلط نہیں تو وہ دو قتل تو کروا چکی ہے۔''

''اگر یہ درست بھی ہے تو کسی کو کسی کے گھر میں قتل کروا دینا تو زیادہ مشکل نہیں۔ وہ سرِ راہ تو تم پر حملہ نہیں کروا سکتی...... بس تمہیں یہ خیال رکھنا ہوگا کہ کسی وقت بھی کسی ویران جگہ کا رخ نہ کرو۔''

''احتیاط تو بہر حال کرنا ہوگی۔''

لیکن کتنی احتیاط کی جا سکتی تھی اور کس طرح کی جا سکتی تھی؟ اس بارے میں نہ عماد نے سوچا تھا، نہ فرح نے!......

فرح کا تو یہ خیال تھا کہ سرِ عام تو صبیحہ کچھ نہیں کروا سکتی۔

مگر جو کچھ ہوا، وہ سرِ عام ہی ہوا۔ دوسرے دن جب وہ دفتر جا رہا تھا تو اس کے خیال کے مطابق وہ اس گولی سے بال بال بچا جو اس پر چلائی گئی تھی۔ گولی چلنے کی آواز سے وہاں بھگدڑ مچ گئی۔

خود عماد نے بھی گھبرا کر بریک لگاتے ہوئے کار سڑک کے کنارے روک دی تھی اور اس وقت اس کے دل کی دھڑکن خاصی بڑھ گئی تھی۔

ایک پولیس موبائل کا سائرن سنائی دیا۔ عماد نے دیکھا کہ سائرن بجاتی ہوئی وہ موبائل تیز رفتاری سے اس سمت جا رہی تھی جدھر سے عماد آ رہا تھا۔ شاید موبائل میں بیٹھی ہوئی پولیس نے اس گاڑی کو دیکھ لیا تھا جس سے گولی چلائی گئی تھی۔

☆☆☆

فرح کو ٹی وی کی خبریں سننے سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی، صرف عماد کی وجہ سے وہ اس کے ساتھ بیٹھ جاتی تھی لیکن اس روز اس کی چھٹی حس نے اسے نہ جانے کس بات سے خبردار کیا تھا کہ عماد کے جانے کے بعد وہ ٹی وی کھول کر لاؤنج میں ہی بیٹھ گئی۔ وہ ذہنی طور سے پراگندہ تھی اس لیے بار بار چینل بھی بدلتی رہی پھر نہ جانے کتنا وقت گزرا تھا کہ اس کا سارا جسم سنسنا گیا۔ ایک چینل پر اس کا رپورٹر کسی سڑک پر کھڑا کہتا نظر آیا تھا کہ گولی اس بھری پری سڑک پر چلائی گئی ہے۔ اس کار کے مالک کے بارے میں صرف اتنا معلوم ہوا ہے کہ وہ کوئی بینک آفیسر ہے۔

''نہیں۔'' فرح کے منہ سے کانپتی ہوئی آواز نکلی۔

اسے عماد ہی کا خیال آیا تھا حالانکہ رپورٹر نے عماد کا نام نہیں لیا تھا۔ اس نے جلدی سے اپنا موبائل نکالا۔

اس وقت رپورٹر کہہ رہا تھا۔ ''کوئی جانی نقصان نہیں ہوا ہے۔ گولی ڈرائیونگ سیٹ کے شیشے کی کھڑکی کے قریب لگی تھی۔''

یہ جملہ سن کر فرح نے کچھ سکون محسوس کیا۔ وہ موبائل پر عماد سے رابطہ کر رہی تھی۔ دوسری طرف سے فوراً کال ریسیو کی گئی اور عماد کی آواز آئی۔ ''ہاں فرح!...... خیریت؟''

''میں نے تمہاری خیریت معلوم کرنے کے لیے فون کیا ہے۔'' فرح تیزی سے بولی۔ ''ابھی میں نے ٹی وی سے خبر سنی ہے۔ کسی سڑک پر کسی بینک آفیسر کی کار پر گولی چلائی گئی ہے۔ رپورٹر نے بینک آفیسر کا نام تو نہیں لیا مگر بس تمہارا خیال آ گیا مجھے۔''

''میں بالکل خیریت سے ہوں ڈیئر! وہ گولی مجھ پر ہی چلائی گئی تھی لیکن مجھ پر آنچ بھی نہیں آئی۔ بس کار کو تھوڑا سا نقصان پہنچا ہے۔''

''اب کہاں ہو تم!'' فرح نے جلدی سے پوچھا۔

''میں اسی علاقے کے پولیس اسٹیشن میں ہوں۔ اپنا بیان ریکارڈ کروا چکا ہوں۔ نامعلوم حملہ آور کے خلاف مقدمہ درج کیا گیا ہے۔''

''صبیحہ کا نام کیوں نہیں لکھوایا تم نے؟'' فرح چیخ پڑی۔

''ابھی میں گھر آ کر بتاؤں گا تفصیل سے۔''

''میں خود وہاں آ رہی ہوں۔ کس پولیس اسٹیشن میں ہو تم!''

''گھبراؤ نہیں ڈیئر!...... تم کیا کرو گی آ کر۔ میں اب یہاں سے روانہ ہونے ہی والا ہوں۔ بینک کے کچھ لوگ بھی آ گئے ہیں یہاں۔ میں بس پندرہ بیس منٹ میں پہنچ رہا ہوں گھر۔ ایک پولیس موبائل آئے گی مجھے چھوڑنے۔''

''اچھا۔'' فرح نے کہا۔ ''جلدی آؤ۔ میں بہت بے چین ہوں۔''

''بس زیادہ سے زیادہ پچیس منٹ میں آ جاؤں گا۔ اطمینان سے بیٹھو!''

لیکن ممکن نہیں تھا کہ صورتِ حال جاننے کے بعد فرح پُرسکون یا مطمئن ہو جاتی۔ عماد سے بات ختم کرنے کے بعد وہ لاؤنج میں ہی ٹہلنے لگی۔

رپورٹر اس وقت کہہ رہا تھا۔ ''دو عینی شاہدین کے

مطابق وہ کوئی کالا آدمی تھا جس نے اپنی کار سے گولی چلائی تھی اور یہ اتفاق تھا کہ کچھ فاصلے پر ایک پولیس موبائل موجود تھی جو اس کار کے تعاقب میں گئی تھی۔ ابھی یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ وہ کار پکڑی جاسکی ہے یا نہیں۔"

فرح نے ٹی وی بند کر دیا۔ عماد کی خیریت معلوم ہونے کے بعد اسے ایسی خبر سے کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی جس میں بار بار یہ کہا جارہا تھا کہ "ابھی یہ نہیں معلوم ہوسکا...... ابھی وہ نہیں معلوم ہوسکا۔"

وہ جھلتی رہی اور دل ہی دل میں صبیحہ کو برا بھلا کہتی رہی۔ اس کے یقین کے مطابق عماد پر حملہ اسی نے کروایا تھا۔

"کوئی کالا آدمی ہے اس کم بخت کا آلۂ کار۔" وہ زیر لب بڑبڑائی۔ اس وقت اسے خود پر بھی غصہ آرہا تھا۔ وہ سمجھ رہی تھی کہ صبیحہ سر عام ایسی کوئی حرکت نہیں کرواسکتی جبکہ واقعہ اس کے برخلاف سامنے آیا تھا۔ اسے عماد کی یہ بات بھی اچھی نہیں لگی تھی کہ اس نے رپورٹ میں صبیحہ کا نام کیوں نہیں لکھوایا تھا۔

بیس منٹ بعد ہی عماد آگیا۔ اسے پولیس موبائل ہی لے کر آئی تھی۔ بینک کے کسی بڑے آفیسر کی سفارش پر دو موبائلیں عماد کی سیکیورٹی ہی پر مامور کر دی گئی تھیں۔

عماد آیا تو فرح اس سے لپٹ کر رونے لگی۔ عماد نے اسے کسی نہ کسی طرح چپ کرایا۔ پھر اس کے سوال کے جواب میں کہا۔ "اپنا بیان ریکارڈ کرانے سے پہلے میں نے فون پر شوجی سے بات کی تھی۔ اس نے پھر بھی مشورہ دیا ہے کہ میں وہ سب باتیں پہلے جعفری کے علم میں لے آؤں۔ عام انداز میں پولیس سے بات کرنے کا مطلب یہ ہوگا کہ صبیحہ محتاط ہوجائے گی۔ فی الحال اس کے خلاف کوئی ثبوت تو ہے نہیں۔"

"وہ تو بہت خطرناک ثابت ہورہی ہے۔" فرح نے کہا۔ "میں نے اس انداز میں نہیں سوچا تھا۔ ہماری پولیس تو ٹامک ٹوئیاں ہی مارتی رہے گی، کرے گی کچھ نہیں۔ بڑے لوگوں کے خلاف آج تک کبھی کچھ نہیں ہوا۔ بڑے باپ کی بیٹی تو ہے وہ!"

"ہمیں اپنی سی کوشش تو جاری رکھنی ہی ہوگی فرح!"

"یہ کوشش جانے کب تک جاری رہے۔ اگر تمہیں کچھ ہوگیا تو میں جیتے جی مرجاؤں گی عماد! ...... بہتر ہے کہ۔" وہ پھر عماد کے سینے سے لپٹ کر روتے ہوئے بولی۔ "تم مجھے طلاق دے دو۔"

"کیا بکواس کررہی ہو؟" عماد نے بگڑ کر کہا۔ "اس طرح تم زندہ تو رہو گے۔ میں تمہیں دیکھ تو سکوں گی۔" فرح کی سسکیاں تیز ہوگئیں۔

"پاگل نہ بنو۔ کچھ نہیں ہوگا مجھے!" عماد نے محبت سے اس کے شانے تھپکے۔

"چلو واش روم میں جاکر منہ دھو۔ خود کو نارمل رکھو۔ پھر چائے پیتے ہیں بیٹھ کر۔ میں جعفری کو فون بھی کروں گا۔ شوجی نے اس کا فون نمبر نہ جانے کیسے معلوم کیا ہوگا۔ بہرحال مجھے بتادیا ہے اس نے!"

فرح کو واش روم میں بھیجنے کے بعد عماد نے اپنے موبائل پر جعفری سے رابطہ کیا۔

"میرا نام عماد ہے۔" رابطہ ہوجانے پر عماد نے جعفری سے اپنا تعارف کرایا۔ "میں ایک بینک میں ملازم ہوں۔"

"عماد؟" جعفری چونکا۔ "آپ وہی تو نہیں؟ میں نے خبر سنی تھی کہ ایک بینک آفیسر کی کار پر گولی چلائی گئی تھی۔"

"جی میں وہی ہوں۔" عماد نے کہا۔ "آپ سے ملنا چاہتا ہوں۔ ملاقات اس لیے نہیں ہوگی کہ مجھ پر گولی چلائی گئی ہے۔ میں آپ کو کچھ ایسی باتیں بتانا چاہتا ہوں جو فیصل کے قتل کے سلسلے میں آپ کے کام آسکتی ہیں۔"

"یعنی۔" جعفری چونکا۔ "صبیحہ حشمت کے شوہر کے قتل......"

"جی اسی کی بات کررہا ہوں۔" عماد نے اس کی بات کاٹی۔ "اور اس معاملے کا کچھ تعلق مجھ پر چلائی جانے والی گولی سے بھی ہے۔"

"اوہ!"

"میں آپ سے کہاں مل سکتا ہوں؟"

"آپ نہ آئیے۔ فی الحال آپ کو باہر نکلنے سے گریز کرنا چاہیے۔ مجھے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ آپ کو سیکیورٹی مہیا کردی گئی ہے۔ آپ مجھے اپنا پتا بتائیے۔ میں فوراً آتا ہوں آپ کے پاس۔"

عماد نے اپنا پتا بتادیا۔

"بس میں آدھے گھنٹے کے اندر آرہا ہوں۔" دوسری طرف سے جعفری نے کہہ کر رابطہ منقطع کردیا تھا۔ فیصل کے قتل اور صبیحہ کا نام آجانے کی وجہ سے اس کی بے چینی یقیناً بہت بڑھ گئی ہوگی۔

عماد جب اپنا پتا بتا رہا تھا، اس وقت فرح بھی آگئی تھی۔ اس نے منہ دھو کر کپڑے بھی تبدیل کرلیے تھے۔ اب وہ روتی ہوئی سی تو نظر نہیں آرہی تھی لیکن سنجیدہ بہت تھی۔

"جعفری سے بات ہورہی تھی؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں۔ وہ آرہا ہے آدھے گھنٹے میں۔"

لیکن وہ آدھے گھنٹے سے کچھ پہلے ہی آ گیا۔ عماد نے اسے ڈرائنگ روم میں بٹھایا۔ اس وقت فرح نے بھی نہ جانے کیوں، وہاں اپنی موجودگی ضروری سمجھی۔ رسمی تعارف کے بعد عماد نے جعفری سے کہا۔

''صبیحہ میری ہم جماعت رہی ہے۔''

''خوب!'' جعفری نے کہا اور استفہامیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔

عماد نے ابتدا ہی سے بات چھیڑی۔ اس کی کوشش تھی کہ کوئی جزوی نکتہ بھی بیان کرنے سے نہ رہ جائے۔ جیسے جیسے وہ بتاتا رہا، جعفری کے چہرے سے ظاہر ہوتا رہا کہ ان باتوں سے اس کی دلچسپی بڑھتی جارہی تھی۔ عماد سب کچھ اتنی وضاحت سے بیان کررہا تھا کہ جعفری کو کسی قسم کا سوال کرنے کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی۔ آخر عماد کے خاموش ہونے پر اس نے ایک طویل سانس لی۔

''یہ میری زندگی کا پہلا نہایت عجیب و غریب کیس ہے۔'' وہ بولا۔ ''تو آپ کا خیال ہے کہ آپ پر یہ حملہ صبیحہ حشمت ہی نے کروایا ہوگا۔''

''ان حالات میں اور کیا سمجھا جاسکتا ہے انسپکٹر صاحب!'' فرح بول پڑی۔ ''وہ قتل کی دھمکی دے کر گئی تھی۔''

عماد جعفری سے مخاطب ہوا۔ ''شاید آپ کے علم میں ہوگا کہ مجھ پر جس کار سے فائر کیا گیا تھا، اسے پکڑا جاسکا یا نہیں...... ایک پولیس موبائل نے اس کا تعاقب تو کیا تھا۔''

''جی۔'' جعفری نے سر ہلایا۔ ''مجھے علم ہے۔ وہ کار تو پولیس کے ہاتھ لگ گئی لیکن اسے چلانے والا پکڑا نہیں جاسکا۔ وہ کار ایک جگہ کھڑی کرکے کہیں غائب ہوگیا۔ بہرحال! اب مجھے آپ کے اس معاملے میں بھی پوری دلچسپی لینی پڑے گی۔ صبیحہ حشمت سے اس کا تعلق ظاہر ہوگیا ہے۔''

''کب گرفتار کررہے ہیں آپ اسے؟'' فرح بول پڑی۔

''اب دیکھیے کب سراغ ملتا ہے اس کا۔ امکانی طور پر یہ ایک اہم کامیابی ہے۔ کار میں اس کی انگلیوں کے نشانات تو ملے ہوں گے اور یہ بھی معلوم ہوجائے گا کہ وہ کار کس کے نام پر رجسٹرڈ ہے۔''

''میں صبیحہ کے بارے میں کہہ رہی تھی۔'' فرح بولی۔

''اوہ!'' جعفری خفیف سا مسکرایا۔ ''میں اندازہ لگا سکتا ہوں کہ صبیحہ حشمت کے خلاف آپ کے دل میں شدید نفرت ہوگی لیکن صرف آپ دونوں کے بیان کی بنیاد پر ایک نہایت دولت مند شخص کی بیٹی کو گرفتار نہیں کیا جاسکتا۔ اس کے لیے ثبوت ضروری ہے۔ وہ آپ کے بیان کو الزام تراشی قرار دے دے گی۔''

''بڑے باپ کی بیٹی۔'' فرح نے منہ بنایا۔ ''ہمارے ملک میں یہ دہرا قانون آخر کب تک چلے گا انسپکٹر صاحب!...... اگر کسی معمولی لڑکی کا معاملہ ہوتا ہے تو پولیس اسے بلاتکلف اٹھا لیتی ہے۔''

''پولیس اس طرزِ حکومت کے آگے بے بس ہے مسز عماد!'' جعفری نے سنجیدگی سے کہا۔ ''اور اسی طرزِ حکومت کی وجہ سے گالیاں ہم پولیس والوں کا مقدر بنی ہوئی ہیں۔''

''بے تکی بحث چھیڑ دی تم نے!'' عماد نے فرح سے کہا۔ ''ہمیں اس وقت صرف اپنے معاملے تک محدود رہنا چاہیے۔''

''میں نے بھی دوسرا معاملہ کب چھیڑا ہے۔''

عماد اس سے بحث کرنے کے بجائے جعفری کی طرف متوجہ ہوا۔ ''معاف کیجیے گا جعفری صاحب! میری اہلیہ بہت جذباتی ہوچکی ہیں اس معاملے میں۔ میں ان کی طرف سے معافی چاہتا ہوں۔''

''کوئی ضرورت نہیں ہے معافی کی۔'' جعفری نے ہنس کر کہا۔ ''ہم پولیس والے اس قسم کی باتیں سننے کے عادی ہوچکے ہیں۔ بہرحال میں آپ کی مہیا کی ہوئی معلومات کے لیے آپ کا شکر گزار ہوں۔ مجھے ان باتوں سے بہت مدد ملے گی۔''

''اب تک آپ کی تفتیش کہاں تک پہنچی ہے؟ میرا مطلب ہے فیصل کے قتل کے معاملے میں۔''

''میں دوسرے ہی دن ایک نہایت اہم بات معلوم کرنے میں کامیاب ہوچکا ہوں اور کچھ ایسی باتیں بھی میرے علم میں آگئی ہیں جنہیں آپ کے اس بیان سے بہت سپورٹ ملی ہے۔ اب مجھے محسوس ہورہا ہے کہ یہ معاملہ جلد ہی اپنے اختتام کو پہنچے گا۔''

''آپ نے کیا کامیابیاں حاصل کی ہیں؟'' فرح پھر بول پڑی۔

''سوری مسز عماد!...... میں ابھی کسی سے بھی ان باتوں کا اظہار نہیں کرسکتا۔ پولیس کو بہت سی معلومات اپنی حد تک رکھنی پڑتی ہیں۔''

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' عماد بول پڑا۔

''میں اب اجازت چاہوں گا۔'' انسپکٹر جعفری کھڑا ہوا۔ ''مجھے اب فوری طور پر اس کار کے حوالے سے معلومات حاصل کرنی ہیں۔''

''آپ ہمیں حالات سے اس حد تک ضرور آگاہ رکھیے گا جس حد تک مناسب ہو۔''

"ضرور۔"
عماد اور فرح اسے رخصت کرنے کے لیے بیرونی دروازے تک گئے۔

☆☆☆

کارلوس اس وقت صبیحہ کے گھر میں تھا اور بہت اداس تھا کیونکہ صبیحہ اس سے سخت ناراض تھی۔ صبیحہ کی ناراضگی کا سبب کارلوس کی حماقت تھی لیکن اسے یہ خیال بھی تھا کہ اس نے کارلوس کو واضح ہدایات نہیں دی تھیں۔ وہ چاہتی تھی کہ کارلوس کسی ایسی جگہ عماد کی کار پر گولی چلائے کہ خود بہ آسانی فرار ہو سکے لیکن کارلوس نے یہ کام ایک بارونق سڑک پر کیا تھا۔ پولیس کو ایسے شاہد بھی مل گئے جن کی نظر اتفاقاً ہی کارلوس کی کار پر اس وقت پڑی ہوگی جب وہ فائر کر رہا تھا۔ اس اتفاق کے باعث پولیس کو یہ بھی معلوم ہو گیا کہ فائر کرنے والا ایک کالا آدمی تھا۔ ان عینی شاہدین کی یادداشت کی مدد سے پولیس کارلوس کا خاکہ بھی تیار کروا سکتی تھی لیکن صبیحہ کے خیال کے مطابق اس کی ضرورت پولیس کو اس لیے نہیں رہی تھی کہ کارلوس ایک اور حماقت بھی کر بیٹھا تھا۔ پولیس موبائل اس کے پیچھے لگی تھی تو وہ کسی جگہ کار ہی چھوڑ کر بھاگ نکلا تھا۔ اس کار کے ذریعے تو پولیس کارلوس کے بارے میں بھی کچھ معلوم کر سکتی تھی۔ کارلوس یقیناً گرفتار کر لیا جاتا لیکن اگر اسے عقل مندی کہا جا سکے تو وہ کارلوس نے یہ کی کہ کار چھوڑ کر بھاگ نکلنے کے بعد فوراً ہی موبائل فون پر صبیحہ کو ان حالات سے آگاہ کر دیا۔ صبیحہ پر اس وقت جیسے بجلی گر پڑی تھی۔ اس کے دماغ نے فوری طور پر کارلوس کی حماقت کے نتائج اخذ کر لیے اور اسے حکم دیا کہ وہ اب اپنے گھر کا رخ کرنے کی حماقت نہ کرے اور عقبی راستے سے اس کے گھر آ جائے۔

اور جب کارلوس آیا تھا تو وہ اس پر برس پڑی تھی۔ اسے احساس دلایا تھا کہ کار میں پولیس کو اس کی انگلیوں کے نشانات بھی مل جائیں گے اور کار کے نمبر کی وجہ سے وہ اس کے گھر بھی پہنچ جائے گی۔

"اب تجھے زندگی بھر میرے گھر میں ہی قید رہنا ہوگا۔" صبیحہ اردو میں بول پڑی تھی۔ "باہر نکلے گا تو کسی وقت بھی پکڑا جائے گا لیکن تیرا میرے گھر میں رہنا کسی وقت میرے لیے ضرور مشکلات پیدا کرے گا اگر پولیس کسی طرح یہ سراغ لگانے میں کامیاب ہو گئی کہ تو یہاں ہے۔"

کارلوس اردو سمجھ ہی سکتا تھا۔ وہ سر جھکائے صبیحہ کی جھاڑ پھٹکار سنتا رہا۔ صبیحہ نے اسے اپنے قریب کا ایک کمرا دے دیا تھا جہاں وہ اس وقت اداس بیٹھا نہ جانے کن خیالات میں کھویا ہوا تھا۔

صبیحہ اپنے کمرے میں پریشان لیٹی تھی اور اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس پریشانی سے کس طرح نجات حاصل کر سکتی ہے۔ ایک مسئلہ اس کے لیے یہ بھی تھا کہ کارلوس کے خورونوش کا بندوبست اسے خود ہی کرنا پڑتا۔ وہ بازار سے ہی کچھ لا کے کارلوس کو دے سکتی تھی۔ خانساماں کو زیادہ کھانا پکانے کی ہدایت دینے کا اس کے پاس کوئی جواز نہیں تھا۔ وہ کسی ملازم سے بھی کھانے پینے کا سامان کارلوس کے کمرے میں نہیں بھجوا سکتی تھی۔ اسے تو ہر آنکھ سے دور رکھنا تھا کارلوس کو۔ گویا اب اسے خود ہی کارلوس کی خدمت گار بننا تھا۔

دوپہر کو اسے بھوک نہیں تھی لیکن جب ملازم اس سے کھانے کے لیے پوچھنے آیا تو اس نے کھانے کی ٹرالی اپنے کمرے ہی میں منگوائی۔ ملازم کو اس نے ہدایت کر دی کہ وہ ٹرالی لینے نہ آئے کیونکہ وہ کھانا کھا کر فوراً سو جائے گی۔ پھر ملازم کے جانے کے بعد اس نے وہ ٹرالی کارلوس کے کمرے میں پہنچا دی۔

"منہ لٹکائے کیا بیٹھے ہو۔ کھانا کھا لو۔" صبیحہ نے اس سے کہا۔ "اب مجھے تمہاری خدمت گار بھی بننا ہے۔"

"یہ نہ کہیے میڈم!" کارلوس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ "اس سے تو اچھا ہے کہ میں بھوکا ہی مر جاؤں۔"

"بکومت، کھانا کھا لو۔"

"نہیں میڈم! میں آپ سے یہ نہیں کروا سکتا۔ اس سے تو یہ اچھا ہے کہ ریوالور کی ایک گولی میں اپنی کنپٹی میں اتارلوں۔"

"ایسی کوئی حماقت کر کے تم مجھے ہی مصیبت میں ڈال دو گے۔ یہیں لاش سڑے گی اور جب اس کی بدبو پھیلے گی تو پولیس بھی یہاں پہنچ جائے گی۔ میں کیسے بتا سکوں گی کہ تم یہاں کیوں تھے۔"

"پھر میں کیا کروں میڈم!" کارلوس کی آنکھوں سے باقاعدہ آنسو بہنے لگے۔ "یہ مجھ سے نہیں دیکھا جائے گا کہ آپ میرے لیے......" وہ ایک ہچکی لے کر خاموش ہو گیا۔

اس کے اس طرح رونے سے صبیحہ کا غصہ ختم ہو گیا۔ اسے اندازہ تھا کہ کارلوس اس سے مخلص بھی تھا اور اس سے محبت بھی کرتا تھا۔ جو حماقت اس سے ہوئی تھی، اس پر وہ پشیمان بھی تھا۔

"رونا دھونا بند کرو اور منہ دھو کر کھانا کھا لو۔" وہ نرم

لہجے میں بولی۔ ''میں جب تک کوئی مناسب تدبیر نہ سوچ لوں، یہ سب تو ہوگا۔ جاؤ منہ دھولو!''

واش روم اس کمرے میں بھی تھا۔ کارلوس اٹھ کر منہ دھونے چلا گیا۔ جب وہ واش روم سے نکلا تو صبیحہ نے کہا۔ ''میں گھنٹے بھر بعد آکر ٹرالی لے جاؤں گی۔''

اس نے کارلوس کے کچھ بولنے کا انتظار نہیں کیا اور وہاں سے اپنے کمرے میں لوٹ آئی۔ اس نے کارلوس کو یہ نہیں بتایا کہ اس نے اپنا ہی کھانا اسے دے دیا تھا۔ اگر بتا دیتی تو کارلوس کسی طور بھی وہ کھانا کھانے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔

جب اس کا دماغ سوچ سوچ کر بری طرح تھک گیا تو اس نے دھیان بٹانے کے لیے ٹی وی کھول لیا۔ وہ خبریں بھی سننا چاہتی تھی۔ بیس منٹ بعد خبریں شروع ہوگئیں۔ اس میں یہ خبر بھی دہرائی گئی کہ پولیس نے عماد کی سیکیورٹی کے لیے ایک موبائل وقف کردی تھی۔

اس خبر کو سن کر صبیحہ کے ہونٹوں پر استہزائیہ مسکراہٹ آجاتی تھی کیونکہ حقیقتاً عماد کے لیے فی الحال تو کوئی خطرہ ہی نہیں تھا۔ اس وقت تک صبیحہ نے عماد کو ختم کرانے کا فیصلہ نہیں کیا تھا۔ اسی کی ہدایت پر کارلوس نے گولی اس طرح چلائی تھی کہ عماد پر آنچ بھی نہ آئے مگر لوگ یہی سمجھیں کہ عماد کو ختم کرنے کی کوشش کی گئی تھی اور خود عماد بھی یہی سمجھے۔

یہ اقدام صبیحہ نے عماد اور اس کی بیوی کو ڈرانے کے لیے کیا تھا۔ اس کی سوچ یہی تھی کہ عماد خوف زدہ ہوکر اس کا بننے کے لیے تیار ہوجائے اور اپنی بیوی کو طلاق دے دے۔ اسے یہ خوف بالکل نہیں تھا کہ عماد اس کے خلاف رپورٹ کردے گا تو وہ کیا کرے گی۔ وہ اسے الزام تراشی قرار دے دیتی۔ اس کے خلاف کوئی ثبوت تو ہوتا نہیں۔ خبروں میں اس نے سن بھی لیا تھا کہ مقدمہ کسی نامعلوم فرد کے خلاف درج کیا گیا ہے۔ اس کا صریح مطلب یہی تھا کہ عماد نے اس کے خلاف کوئی بات نہیں کی تھی۔

خبروں میں یہ بات بھی آچکی تھی کہ پولیس کارلوس کے گھر پہنچ گئی تھی۔ پولیس کے کسی افسر نے یہ بیان بھی صحافیوں کو دیا تھا کہ فی الحال اس کے علاوہ کچھ نہیں معلوم ہوسکا کہ اس کالے شخص کا نام دادل ہے۔

کارلوس بدستور دادل ہی کے نام سے زندگی گزار رہا تھا۔ صبیحہ کے خیال کے مطابق پولیس کی معلومات کچھ زیادہ بھی ہوسکتی تھیں جو معلومات چھپائی گئی ہوں لیکن صبیحہ اپنی دانست میں خود کو محفوظ سمجھ رہی تھی۔ اس کے خیال کے مطابق پولیس اگر کالج تک بھی پہنچ جاتی تو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ کالج میں کوئی نہیں جانتا تھا کہ کارلوس نے وہاں کی ملازمت صبیحہ کے کہنے پر چھوڑی تھی۔

ان معاملات کے بعض پہلو ایسے بھی تھے جو صبیحہ کے حق میں نہیں تھے لیکن وہ اس کے دماغ میں اس لیے نہیں آئے کہ وہ کوئی پیشہ ور جرائم پیشہ نہیں تھی۔ بس اپنے ضدی مزاج کی وجہ سے سب کچھ کرتی رہی تھی۔

کبھی کبھی اس کا دماغ اس الجھن کا شکار یقیناً ہوا تھا کہ وہ ایسی کیوں تھی، عام لڑکیوں سے یکسر مختلف۔

لیکن اب اس کی یہ الجھن بھی باقی نہیں رہی تھی۔ اس نے خود ہی اپنا نفسیاتی تجزیہ کرلیا تھا۔ وہ بچپن سے محرومیوں کا شکار رہی تھی۔ معمولی خواہشات کے اظہار پر بھی اسے اپنی سوتیلی ماں کی مار کھانی پڑتی تھی۔

حشمت اللہ خاں کا یہ خیال بالکل غلط تھا کہ صبیحہ اس حقیقت سے بے خبر تھی، دس بارہ سال ہی کی عمر میں اس نے ایک مرتبہ حشمت اللہ خاں اور رابعہ حشمت کی باتیں سن لی تھیں جن سے اس پر یہ راز کھل چکا تھا کہ رابعہ حشمت اس کی سگی ماں نہیں تھی۔

لیکن دس بارہ سال ہی کی عمر میں وہ اتنی سنجیدہ ہوچکی تھی کہ اس نے کسی پر ظاہر نہیں کیا کہ وہ حقیقت جان چکی تھی۔ اس کے بعد اس کے دل میں اپنے باپ کے لیے بھی کوئی جگہ نہیں رہی تھی۔ اس کے دل ودماغ میں اچھی طرح بیٹھ گیا تھا کہ مرد ذات بڑی بے وفا ہوتی ہے۔ یہ خیال اس کے دماغ میں اس لیے بیٹھا کہ حشمت اللہ خاں نے دوسری شادی کرکے اس کی مرحومہ ماں سے بے وفائی کی تھی۔ اسی لیے اس نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ کبھی شادی نہیں کرے گی، کسی مرد کو اپنی زندگی کا مالک نہیں بنائے گی۔

لیکن جوانی کی خواہشات نے اسے بے راہ روی کی طرف بھی مائل کردیا تھا۔ عماد سے پہلے بھی کئی نوجوان اسے پسند آچکے تھے اور اس نے انہیں حاصل بھی کرلیا تھا مگر ان سے شادی نہیں کی تھی۔ عماد سے بھی اس نے کہہ دیا تھا کہ وہ اس سے شادی نہیں کرنا چاہتی۔

کارلوس سے اس نے جو کچھ کروایا تھا، اب اسے اس کے نتیجے کا بھی انتظار تھا، لیکن ساتھ ہی وہ کارلوس کی وجہ سے پریشانی میں بھی پڑ گئی تھی۔ اس کے رات کے کھانے کے لیے وہ آٹھ بجے کے قریب بازار بھی گئی اور برگر، پیزا ٹائپ کی چیزیں خرید لائی جو اس نے کارلوس کے کمرے میں بھی پہنچا دیں جس کے چہرے پر اداسی بدستور قائم تھی۔

خود کھانا کھانے کے بعد وہ اپنے باپ کے گھر بھی گئی۔ حشمت اللہ خاں سے کوئی لگاؤ تو اسے اب نہیں تھا لیکن پیسے کے لیے، اپنی آسودہ زندگی کے لیے وہ اس کی مرہونِ منت رہنے پر مجبور تھی۔

اس کا تعلق ایک الٹرا ماڈرن گھرانے سے تھا اس لیے اس کی کوئی اہمیت ہی نہیں تھی کہ شوہر کی موت کے بعد وہ عدت کے دن اسی گھر میں رہ کر گزارتی۔

وہاں کچھ وقت گزار کر وہ واپس لوٹی تو کچھ دیر کے لیے اس مارکیٹ میں بھی رکی جہاں چوری کے موبائل فون خریدے اور بیچے جاتے تھے۔ اس نے دو موبائل فون خریدے اور ان میں سمیں بھی ڈلوائیں۔ اب وہ اپنے موبائل فون کے ذریعے عماد سے رابطہ نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ اب حالات بدل چکے تھے اس لیے اسے محتاط رہنے کی ضرورت تھی۔

گھر پہنچنے کے بعد وہ اب سونا ہی چاہتی تھی لیکن ذہنی انتشار کے باعث وہ کروٹیں ہی بدلتی رہی اور دو بج گئے۔ وہ جھنجلا کر بستر سے اٹھی اور ٹہلنے لگی۔ پھر ٹہلتے ہی میں اسے خیال آیا کہ سکون حاصل کرنے کا ایک ذریعہ تو اب اس کے قریب ہی ہے۔

☆☆☆

دوسرے دن وہ دیر... سے جاگی۔ پھر ناشتے سے فارغ ہوئی ہی تھی کہ اس کے موبائل فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ اس نے اسکرین پر عماد کا نام دیکھا۔ اس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آگئی۔ وہ کسی ردِ عمل ہی کی منتظر تھی لیکن اس نے کال نہیں ریسیو کی۔ محتاط رہنے کا فیصلہ اس نے گزشتہ روز ہی کرلیا تھا۔ وہ چوری کا خریدا ہوا موبائل فون لے کر گھر سے نکلی۔ اس کے فون کی گھنٹی بند ہو چکی تھی۔ عماد نے خود ہی رابطہ منقطع کیا تھا۔

صبیحہ جب اپنی کار کا انجن اسٹارٹ کر رہی تھی، اس کے موبائل فون کی گھنٹی پھر بجی۔ کال کرنے والا عماد ہی تھا۔ صبیحہ نے اب بھی کال ریسیو نہیں کی۔ یہ خیال اسے گزشتہ روز ہی آچکا تھا کہ شاید اب وہ کسی وجہ سے پولیس کی نظر میں مشکوک ہو چکی ہو اور پولیس اب اسے عماد ہی کے ذریعے ٹریپ کرنے کی کوشش کرے۔

اس کی کار تیز رفتاری سے فاصلہ طے کرنے لگی۔ اس وقت اس کی کوئی منزل نہیں تھی۔ بس وہ اپنے گھر سے کچھ دور نکل آنے کے بعد چوری کے موبائل سے عماد کو میسیج کرنا چاہتی تھی۔ اگر اپنے گھر سے کرتی اور عماد کی کال میں پولیس ہی کا ہاتھ ہوتا تو بذریعہ کمپنی کے ذریعے پولیس یہ بھی معلوم کر لیتی کہ وہ میسیج کس مقام سے کیا گیا تھا۔

چند میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد اس نے ایک الیکٹرانک مارکیٹ کے سامنے کار روکی جہاں اور بھی کاریں کھڑی کی گئی تھیں۔ وہاں اس نے اپنے موبائل سے عماد کا نام ڈیلیٹ کر دیا۔ نمبر وہ ذہن نشین کر چکی تھی۔ اسے یہ خیال بھی آیا کہ یہ کام اسے گزشتہ روز ہی کر لینا چاہیے تھا۔

یہ کام کرنے کے بعد اس نے چوری کا موبائل نکالا ہی تھا کہ اس کے اپنے فون پر میسیج آ گیا۔ وہ میسیج بھی عماد نے کیا تھا۔ اسکرین پر اس کے موبائل کا نمبر آ گیا تھا۔ صبیحہ نے پیغام پڑھا۔

''تم میری کال ریسیو کیوں نہیں کر رہی ہو؟'' پیغام میں لکھا تھا۔ ''تمہاری شرط پوری کر دی ہے میں نے۔ اب بتاؤ، کیا چاہتی ہو؟''

صبیحہ کے ہونٹوں پر طنزیہ سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس پیغام نے اسے یقین دلا دیا کہ اسے ٹریپ کرنے کی ابتدا ہو چکی ہے۔ یہ اس کے خیال میں ممکن ہی نہیں تھا کہ عماد اتنی جلدی اپنی بیوی کو طلاق دے دیتا جبکہ اسے پولیس کی سیکیورٹی بھی مل چکی تھی۔

صبیحہ نے اس میسیج کا بھی کوئی جواب نہیں دیا اور کار پھر حرکت میں لے آئی۔ اب وہ عماد کو کچھ دیر بعد میسیج کرنا چاہتی تھی۔ پندرہ منٹ بعد اس نے کار ایک ریسٹورنٹ کے پارکنگ لاٹ میں روکی۔

ریسٹورنٹ میں اس نے کافی پی۔ اس میں بیس منٹ اور گزر گئے۔ اب اس نے چوری کے موبائل سے عماد کو میسیج کیا۔ ''اب کیا ارادہ ہے عماد؟ فی الحال تو زندگی بچ گئی تمہاری۔ جواب میرے پہلے ہی نمبر پر دینا۔''

میسیج کرنے کے بعد اس نے کافی کا بل ادا کیا پھر وہ اٹھنا ہی چاہتی تھی کہ اس کے اپنے موبائل پر عماد کا پیغام آ گیا۔ لکھا تھا۔

''تم نے میرا ارادہ پوچھا ہے۔ میں آج فرح کو طلاق دے چکا ہوں۔ کیا اب تم سے ملنے آ جاؤں؟''

صبیحہ نے چوری کے فون سے جوابی میسیج بھیجا۔ ''فوری طور پر طلاق نامے کی کاپی اور اپنے شناختی کارڈ کی کاپی بھی مجھے میل کر دو۔ اگر اس میں دیر لگی تو میں سمجھ لوں گی کہ جعلی طلاق نامہ اور جعلی شناختی کارڈ تیار کرنے میں وقت لگ رہا ہے۔''

یہ میسیج کرنے کے بعد صبیحہ نے موبائل فون سے اس

کی سم نکال لی۔ اب وہ موبائل فون اور سم، دونوں ہی چیزیں ضائع کر دینا چاہتی تھی۔ اس کے بعد اگر اسے پھر موبائل استعمال کرنا پڑتا تو وہ اس کے لیے بھی تیار تھی۔ گزشتہ روز اس نے دو موبائل خریدے تھے۔

ریسٹورنٹ سے نکل کر وہ تیزی سے گھر پہنچی۔ اس نے اپنا کمپیوٹر کھولا۔ میل باکس میں گئی۔ کوئی میل نہیں تھی۔ اس کے اعصاب میں تناؤ آ گیا۔ اب اس کے دماغ میں ایک اور سوال ابھرا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ عماد اپنے طور پر اس کے ساتھ کوئی کھیل کھیلنا چاہتا ہو۔

لیکن وہ کھیل کیا ہوتا؟ صبیحہ اس کا اندازہ نہیں لگا سکتی تھی۔

اس نے کمپیوٹر بند کر کے اپنے موبائل پر جعفری سے رابطہ کیا۔ دوسری طرف سے کال ریسیو کرنے میں دیر نہیں لگائی گئی تھی۔

"جی صبیحہ صاحبہ!" اس نے کہا تھا۔

"میں ایک الجھن میں پڑ گئی ہوں۔ کیا آپ فوری طور پر مجھ سے ملنے آ سکتے ہیں؟"

"کیا الجھن پیش آ گئی؟"

"آپ آئیں گے تو بہتر طور پر سمجھ سکیں گے۔"

"مجھے کچھ وقت لگے گا۔ ایک کام میں مصروف ہوں۔"

"کب تک کی مصروفیت ہے؟"

"تیس چالیس منٹ لگیں گے۔ پھر آپ کے گھر کی طرف روانہ ہو سکوں گا۔ اس میں ایک گھنٹے سے کچھ زیادہ لگ سکتا ہے۔"

"میں انتظار کروں گی۔ دراصل میرے موبائل پر کچھ ایسے میسج آ رہے ہیں جو میں سمجھنے سے قاصر ہوں۔"

"کس قسم کے میسج؟"

"آپ خود دیکھیں گے تو صحیح طور پر سمجھ سکیں گے۔"

"اچھا۔ میں کوشش کرتا ہوں کہ جلد از جلد آ سکوں۔"

"میں انتظار کروں گی۔"

صبیحہ نے رابطہ منقطع کیا اور ٹہلنے لگی۔ اس وقت اس کے ذہن میں خاصا بھونچال آ چکا تھا۔ اس کی سوچ کے مطابق اگر عماد نے خود اس سے کوئی کھیل کھیلنے کی کوشش نہیں کی تھی تو پھر یہی سمجھا جا سکتا تھا کہ اس کے ذریعے پولیس نے ہی اسے ٹریپ کرنا چاہا تھا۔ جواب میں صبیحہ بھی ایک چال چل گئی تھی لیکن اسے اطمینان نہیں تھا کہ اس کے نتائج اس کے حق میں ہی نکلیں گے لہٰذا اسے ہر قسم کی صورتِ حال کے لیے تیار رہنا چاہیے۔

جعفری تقریباً ڈیڑھ گھنٹے میں اس کے گھر پہنچا۔

"کیا میسج آ رہے ہیں صبیحہ صاحبہ؟" اس نے پوچھا۔

صبیحہ نے اپنے موبائل پر آئے ہوئے تینوں میسج دکھائے۔

"خوب!" میسج دیکھنے کے بعد جعفری نے سوچتے ہوئے کہا پھر بولا۔ "پہلے میسج سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کی کال بھی آئی تھی؟"

"جی ہاں۔ اسی نمبر سے جس سے میسج کیے گئے ہیں لیکن میں نے واقعی کال ریسیو نہیں کی تھی۔ میں عموماً اجنبی نمبر سے آنے والی کال ریسیو نہیں کرتی۔ اپنے شوہر کے قتل کے بعد اور محتاط ہو گئی ہوں۔"

جعفری کچھ سوچنے لگا۔ صبیحہ غور سے اس کی طرف دیکھتی رہی۔ وہ اندازہ لگانا چاہتی تھی کہ اس نے جو کچھ کہا تھا، جعفری پر اس کا کیا ردِعمل ہوا تھا لیکن وہ کوئی اندازہ لگانے سے قاصر تھی۔

"میں ایک فون کروں گا۔" جعفری بولا۔

"ہاں ہاں۔"

جعفری اپنے موبائل پر کسی سے رابطہ کرتے ہوئے صوفے سے اٹھ کر چند قدم ایک طرف بڑھ گیا۔

اس کا کیا مطلب سمجھا جائے؟ صبیحہ سوچنے لگی۔ وہ کیوں چاہتا ہے کہ میں اس کی باتیں نہ سن سکوں؟

جعفری نے کسی سے کوئی طویل بات نہیں کی۔ شاید مختصر سے دو ایک ہی جملے کہے ہوں گے۔ اس کے بعد وہ اپنا موبائل بند کرتا ہوا اس صوفے پر آ بیٹھا۔

"ایک میسج میں۔" جعفری بولا۔ "کہا گیا ہے کہ اس نے اپنی بیوی فرح کو طلاق دے دی ہے۔"

"جی!"

"میں ایک ایسے شخص کو جانتا ہوں جس کی بیوی کا نام فرح ہے۔ کل وہ اپنی کار میں کہیں جا رہا تھا تو اس پر گولی چلائی گئی تھی۔"

"میں نے ٹی وی پر سنی تھی یہ خبر! وہ کوئی بینک آفیسر ہے۔"

"اس کا نام عماد ہے۔"

"رات کی خبروں میں یہ نام آیا تھا۔"

"کیا آپ کے لیے یہ نام اجنبی ہے؟"

"کچھ محسوس تو ہوتا ہے کہ یہ نام میں پہلے کہیں سن چکی ہوں۔ شاید زمانہ طالب علمی میں اس نام کا کوئی طالب علم میرے کالج میں ہو۔"

"لیکن وہ عماد آپ کو اس قسم کے میسج کیوں بھیجے گا؟"

"یہی تو آپ کو معلوم کرنا چاہیے۔ آپ کو فون کر کے میں نے اسی لیے تو بلایا ہے۔"

اسی وقت صبیحہ نے ایسی آواز سنی جیسے بنگلے کے باہر کوئی ٹرک آکر رکا ہو۔ انجن کی وہ آواز کسی کار کی نہیں ہو سکتی تھی۔

"یہ کون آگیا؟" صبیحہ چونک کر بولی۔

"پولیس ہے۔ انہی لوگوں کو فون کیا تھا میں نے۔" جعفری نے کہا۔ "آپ کی باتوں سے مجھے اندازہ ہوا تھا کہ آپ اپنے گھر میں کسی کی موجودگی سے بے خبر ہیں لیکن مجھے کسی وجہ سے شبہ ہوا تھا کہ عماد پر فائر کرنے والا آپ ہی کے گھر میں چھپا ہوا ہے۔"

صبیحہ کا سارا جسم سنسنا گیا۔

اسی وقت وزنی جوتوں کی دھمک سنائی دی۔ مسلح پولیس والے دوڑتے ہوئے اندر آئے تھے۔

"سارے گھر میں پھیل جاؤ۔" جعفری نے انہیں حکم دیا۔ "ایک ایک گوشہ دیکھ ڈالو۔ وہ ضرور ملے گا۔"

"یہ میرے لیے حیران کن بات ہے۔" صبیحہ بولی۔ "کوئی میرے گھر میں آچھپا ہے اور مجھے اس کی خبر ہی نہیں۔"

ایک اے ایس آئی اور ایک کانسٹیبل ڈرائنگ روم ہی میں رک گئے تھے۔

صبیحہ کو یقین ہو گیا کہ اب کارلوس پکڑا ہی جائے گا لیکن اسے یہ یقین ضرور تھا کہ وہ اس کے خلاف کوئی بیان نہیں دے گا۔

"سمجھ میں نہیں آتا۔" جعفری نے بڑبڑانے والے انداز میں کہا۔ "عماد آپ کو اس قسم کے پیغام کیوں بھیجے گا۔"

"میں خود الجھ گئی تھی۔ اسی لیے آپ کو بلایا تھا۔"

اسی وقت ایک گولی چلنے کی آواز سنائی دی۔ اس کے بعد پے در پے دھماکے ہونے لگے۔

"اوہ!" جعفری کے منہ سے نکلا۔ "وہ مقابلے پر آمادہ ہو گیا ہے۔"

صبیحہ نے بھی یہی اندازہ لگایا تھا۔ پولیس کو دیکھ کر پہلی گولی غالباً کارلوس ہی نے چلائی تھی۔ اس کے بعد پولیس نے پے در پے فائرنگ شروع کر دی تھی۔ پہلے فائر کی آواز ریوالور کی تھی جبکہ پولیس والوں کے پاس رائفلیں تھیں۔ دھماکے انہی رائفلوں کے ہو سکتے تھے۔

صبیحہ نے بے چینی سے پہلو بدلا۔

"کتنا بھی ایمونیشن ہو اس کے پاس۔" جعفری بولا۔ "وہ یہاں سے بچ کر تو نہیں نکل سکے گا۔"

"مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے جیسے میں کوئی بھیانک خواب دیکھ رہی ہوں۔" صبیحہ کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔ اس وقت وہ اعصابی دباؤ بھی محسوس کر رہی تھی۔

فائرنگ کی آوازوں کا سلسلہ پانچ منٹ بھی جاری نہیں رہ سکا۔ اب سناٹا تھا۔

"پکڑا گیا۔" جعفری کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آگئی۔

لیکن اسی وقت ایک سب انسپکٹر تقریباً دوڑتا ہوا ڈرائنگ روم میں آیا اور جعفری سے بولا۔ "ہم اسے گرفتار نہیں کر سکے سر!"

"کیا!" جعفری تیزی سے کھڑا ہو گیا۔

"جی سر! وہ مقابلے کے لیے سامنے ہی آگیا تھا۔ مارا گیا۔ اس کے سامنے آجانے کی وجہ سے جوابی فائرنگ اندھادھند کرنی پڑی تھی۔ اس کا جسم چھلنی ہو گیا ہے۔"

"اوہ!" جعفری نے ایک طویل سانس لی۔

"اس کی ایک گولی سے ہمارا ایک کانسٹیبل بھی مارا گیا ہے۔" سب انسپکٹر نے بتایا۔

"یہ یقیناً ایک بری خبر ہے۔"

صبیحہ اس وقت اس طرح بیٹھی ہوئی تھی جیسے اسے سکتہ ہو گیا ہو۔

"کارروائی مکمل کرو۔" جعفری نے سب انسپکٹر سے کہا۔ "اور لاشیں بھجواؤ یہاں سے۔"

"یس سر!" سب انسپکٹر واپس چلا گیا۔

جعفری بیٹھ گیا اور صبیحہ کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "تو آپ اپنے گھر میں اس کی موجودگی سے بے خبر تھیں؟"

"ظاہر ہے۔ میں اپنے گھر میں کسی ایسے آدمی کی موجودگی کیسے برداشت کر سکتی ہوں جو چوری چھپے میرے گھر میں گھسا ہو۔"

"وہ افریقی ہے۔" جعفری نے بتایا۔ "اصل نام کارلوس ہے لیکن یہاں وہ دادل کے نام سے زندگی گزار رہا تھا۔ خود کو اس نے مکرانی ظاہر کیا تھا۔"

"دادل۔" صبیحہ نے یہ نام اس طرح دہرایا جیسے سوچتے ہوئے بولی ہو۔ "شاید اس نام کا کوئی چپراسی میرے کالج میں تھا۔"

"بعد میں آپ اس سے کبھی نہیں ملیں؟"

"مجھے تو یاد نہیں کہ میں نے اسے کبھی دیکھا بھی ہو۔"

"لیکن اسی نے فیصل کو قتل کیا تھا۔"

"ہو سکتا ہے آپ ٹھیک کہہ رہے ہوں لیکن اس کا یقین کیوں ہے آپ کو؟"

"عقبی دروازے سے آپ کے کمرے تک اس کے قدموں کے نشانات؟"

"میں آپ کو بتا چکی ہوں کہ وہ نشانات میرے قدموں کے ہوں گے۔"

"میں یقین کرچکا ہوں کہ وہ نشان آپ کے قدموں کے نہیں تھے۔"

"کیسے؟"

"میں نے اپنے سامنے بھی آپ کے قدموں کے نشانات بنوائے تھے۔"

"یاد ہے مجھے۔ یہ کوئی ایسی بات تو نہیں کہ میں بھول جاؤں۔"

"اس گرانڈیل افریقی کے پیر بہت چھوٹے تھے۔ اتفاق سے آپ کے اور اس کے پیروں کا سائز بالکل ایک ہے۔ اس کے اور آپ کے قدموں کا سائز یکساں ہونے کے باوجود دونوں میں ایک فرق بہرحال تھا۔ اس کے نشانات خاصے واضح تھے کیونکہ اس کا جسم بھاری ہے۔ آپ کے وزن سے ڈیڑھا تو ضرور ہوگا۔"

"یہ باریکیاں میں نہیں سمجھ سکتی۔"

"اچھا ابھی آپ نے یہ بھی کہا ہے کہ آپ عماد سے واقف نہیں۔"

"میں نے یہ کہا تھا کہ اس نام کا کوئی طالب علم شاید میرے کالج میں تھا۔"

"بعد میں آپ اس سے بھی کہیں نہیں ملیں؟"

"ظاہر ہے ورنہ بتا دیتی۔" صبیحہ نے جواب دیا لیکن وہ محسوس ضرور کرچکی تھی کہ اس قسم کے سوالات کا مطلب ایک ہی ہوسکتا ہے۔ معاملہ اس کی ذات کے حوالے سے بھی گڑبڑ ہوچکا ہے۔

"لیکن عماد کا بیان تو کچھ اور ہے۔" جعفری نے کہا۔

"اس کا کیا بیان ہے؟" صبیحہ نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔

جعفری نے اسے وہ سب کچھ بتا دیا جو اسے عماد سے معلوم ہوا تھا۔

"سراسر بکواس۔" صبیحہ نے جواب میں پُرجوش انداز اختیار کرنے کی کوشش کی۔ "الزام تراشی ہے مجھ پر!"

"ہاں اس کا کوئی ثبوت تو نہیں ہے۔ اسی کا ثبوت حاصل کرنے کے لیے میں نے عماد کو استعمال کرنا چاہا تھا۔ اس سے میسیج کروائے تھے آپ کو...... لیکن آپ نے خاصی ہوشیاری کا ثبوت دیا۔ کوئی دوسرا موبائل فون بھی ہے آپ کے پاس.... جو آپ نے اس موقع پر استعمال کیا۔"

"نہ جانے آپ کس قسم کی باتیں کرنے لگے۔" صبیحہ کچھ بگڑ جانے والے انداز میں بولی۔

"آپ بازی ہار چکی ہیں صبیحہ حشمت!" جعفری نے سکون سے کہا۔ "ایک تو آپ فیصل کے قتل میں شامل ہیں۔ بند دروازے سے کارلوس آپ کے گھر میں داخل نہیں ہوسکتا تھا۔ آپ نے اس کی ایک چابی اسے بھی دی تھی۔ وہ ہمیں اس کے گھر سے مل چکی ہے۔"

اس لمحے صبیحہ کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔

"اس کے علاوہ۔" جعفری نے بات جاری رکھی۔ "کارلوس ڈائری بھی لکھا کرتا تھا۔ وہ بھی ہمارے ہاتھ لگی ہے۔ وہ اس نے اپنی زبان میں لکھی تھی لیکن کل رات ہمیں ایک ایسا آدمی بھی مل گیا جو وہ زبان جانتا ہے۔ اس طرح ہمیں کارلوس سے آپ کے تعلق کا علم بھی ہوگیا۔ اس نے پوری وضاحت سے ایک ایک بات لکھی ہے۔ یہ بھی لکھا ہے کہ ایک مرتبہ آپ اس کے گھر بھی گئی تھیں۔ وہ آپ سے جنون کی حد تک محبت کرنے لگا تھا اس لیے اس نے وہ بستر پھر کبھی استعمال نہیں کیا جس پر آپ لیٹی تھیں۔ وہ اس بستر کو سونگھ کر آپ کی قربت کا احساس کیا کرتا تھا۔ اپنے لیے اس نے دوسرے بستر کا بندوبست کرلیا تھا۔ جس بستر پر آپ لیٹی تھیں، اس پر ہمیں انگلیوں کے نشانات بھی ملے ہیں جو کارلوس کی بھاری انگلیوں کے نہیں ہوسکتے۔ وہ آپ ہی کے ہوں گے۔ انہیں آپ کی انگلیوں کے نشانات سے ملا کر دیکھ لیا جائے گا۔"

اب صبیحہ کا چہرہ زردی مائل ہوچکا تھا۔

جعفری نے اب بھی اپنی بات جاری رکھی۔ "میں بہت احتیاط سے آپ کی نگرانی بھی کروا رہا ہوں۔ کل آپ نے بازار سے برگر وغیرہ خریدے تھے۔ ظاہر ہے کہ آپ کو کارلوس کی بھوک کا بھی خیال رکھنا تھا اور ملازم کو آپ بتانا نہیں چاہتی ہوں گی۔ اسی سے مجھے یہ شبہ ہوا کہ کارلوس کو آپ نے اپنے ہی گھر میں چھپایا ہے۔ ان تمام باتوں کے باوجود میں عماد ہی کو آلۂ کار بنا کے آپ پر ہاتھ ڈالنا چاہتا تھا لیکن جب آپ اس طرح میرے جال سے بچ گئیں تو میں نے ڈائریکٹ ایکشن میں دیر لگانا مناسب نہیں سمجھا۔ جب آپ نے ابھی مجھے فون کیا تھا تو میری معروفیت یہی تھی کہ یہاں کی تلاشی کے لیے سرچ وارنٹ حاصل کررہا تھا۔ اگر میرا شبہ غلط ثابت ہوتا اور کارلوس مجھے یہاں نہ ملتا تو بھی کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اسے بعد میں کہیں نہ کہیں سے پکڑ ہی لیا جاتا۔ یہاں آنے کا اولین مقصد تو ایک ہی تھا اس لیے میں آپ کی گرفتاری کا وارنٹ بھی حاصل کرچکا ہوں۔"

اب صبیحہ کا اعصابی تناؤ یکلخت اس لیے ختم ہوا کہ اسے اپنے ہار جانے کا یقین ہو چکا تھا اور شبہ تو اسی وقت ہو گیا تھا جب اس نے میل باکس میں عماد کی میل نہیں دیکھی تھی۔

”تو آپ مجھے ابھی گرفتار کریں گے؟“ صبیحہ نے سنجیدگی سے پوچھا۔

”نہیں۔“ جعفری ہنسا۔ ”دو چار دن بعد آجاؤں گا۔“

”اس وقت میں گرفتار ہونے کے لیے تیار نہیں ہوں۔“

”خوب!“ جعفری نے منہ بنایا۔ ”میں تو چاہتا تھا کہ آپ کے ہتھکڑیاں نہ لگائی جائیں اور آپ ہمارے ساتھ چلی چلیں لیکن......“ اس نے اے ایس آئی کی طرف دیکھا۔ ”ہتھکڑیاں لگاؤ۔“

اسی وقت صبیحہ نے بڑی پھرتی کے ساتھ اپنی ساڑی میں چھپا ہوا ریوالور نکال لیا۔ شبہات کا شکار ہونے کے بعد اس نے یہ تیاری بھی کر لی تھی۔ ریوالور کی نال اس نے اپنی کنپٹی سے لگا لی۔

”مجھے فوری طور پر گرفتار کرنے کی کوشش کی گئی تو میں خود کو ہلاک کر لوں گی۔“

جعفری کے چہرے سے ایسا معلوم ہوا جیسے وہ سناٹے میں آ گیا ہو۔ غالباً اسے توقع نہیں تھی کہ صبیحہ کے پاس ریوالور بھی ہوگا۔

”تو مرنا چاہتی ہو تم!“ وہ قدرے توقف سے بولا تو اس کے لہجے میں سختی تھی۔

”نہیں۔“ صبیحہ نے کہا۔ ”میں خود کو قانون کے حوالے کرنے کے لیے تیار ہوں لیکن میری ایک شرط ہے۔“

”میں شرط سنے بغیر کہوں گا کہ تمہاری کوئی شرط نہیں مانی جا سکتی۔“

”تو پھر یقین کر لو آفیسر! یہاں سے تم میری لاش ہی لے جا سکو گے۔“

جعفری اور اے ایس آئی کی آنکھیں ملیں۔ اے ایس آئی نے کچھ عجیب سے انداز میں سر ہلایا۔ اشارہ جعفری ہی سمجھ سکتا تھا۔

”کیا شرط ہے تمہاری؟“ جعفری نے پوچھا۔

”میں یہیں، اسی وقت اپنے والدین سے ملنا چاہتی ہوں۔ خود کو قانون کے حوالے کرنے کے بعد تو میں کبھی کسی سے نہیں ملوں گی۔“

”مگر وہ تو اس وقت یہاں نہیں ہیں۔“

”انہیں فون کیا جا سکتا ہے۔ وہ فوراً آجائیں گے۔“

”کرو فون!“

صبیحہ نے ریوالور کنپٹی سے لگائے لگائے تپائی پر رکھا ہوا اپنا موبائل فون اٹھایا اور حشمت اللہ خاں سے رابطہ کیا۔

”ڈیڈی!“ اس نے کہا۔ ”آپ اور ممی فوراً میرے گھر آجائیں۔“

”کیوں؟ آخر بات کیا ہے؟“

”معاملہ بہت سنگین ہے، یہاں آ کر دیکھ لیجیے گا۔“

”مگر کچھ تو بتاؤ!“

”بس آجایئے آپ دونوں!“ صبیحہ نے کہا اور رابطہ منقطع کر دیا۔

”کیا دکھانا چاہتی ہو تم اپنے والدین کو؟“ جعفری نے پوچھا۔

”آخری مرتبہ ملنا چاہتی ہوں میں ان سے۔ وہ دونوں زیادہ سے زیادہ آدھے گھنٹے میں یہاں پہنچ جائیں گے۔ مجھے گرفتار کرنے سے پہلے آپ کو ان کا انتظار تو کرنا ہی پڑے گا۔“

جعفری مجبور تھا کہ انتظار کرے۔ صبیحہ کے چہرے سے اس کا یہ عزم صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ اگر اسے فوری طور پر گرفتار کرنے کے لیے کوئی چال چلنے کی کوشش کی گئی تو وہ خود کو ہلاک کر لے گی۔

حشمت اللہ خاں اور رابعہ حشمت گھبرائے ہوئے سے ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے تھے کیونکہ انہوں نے باہر بھی پولیس دیکھ لی ہوگی۔

پھر ڈرائنگ روم کا منظر دیکھ کر تو وہ بھونچکا ہی رہ گئے کیونکہ صبیحہ اس وقت بھی ریوالور کی نال اپنی کنپٹی پر رکھے ہوئے تھی۔

”یہ کیا کر رہی ہو!“ حشمت اللہ خاں نے بوکھلا کر کہا۔

”خود کو فوری گرفتاری سے بچانے کے لیے ریوالور لگایا ہے میں نے اپنی کنپٹی سے۔“ صبیحہ نے بڑے سکون سے جواب دیا۔ ”اگر آپ دونوں سے ملنے سے پہلے ہی مجھے گرفتار کرنے کی کوشش کی جاتی تو میں خود کو گولی مار لیتی۔“

”یہ کیا معاملہ ہے انسپکٹر؟“ حشمت اللہ خاں کی بوکھلاہٹ میں کمی نہیں آئی تھی۔

”معاملہ آپ کو میں بتاتی ہوں ڈیڈی!“ صبیحہ کے چہرے پر اچانک وحشت سی نظر آنے لگی۔ ”سب کچھ میرے ضدی مزاج کی وجہ سے ہوا ہے۔“

”کیا مطلب؟“

صبیحہ نے اس سوال کا جواب دینے کے بجائے کہا۔

''آپ دونوں میرے کچھ قریب آجائیے۔ میں بتاتی ہوں آپ کو۔''

وہ دونوں اس کے قریب ہو گئے۔ حشمت اللہ خاں صرف پریشان اور بوکھلاہٹ کا شکار تھا لیکن رابعہ حشمت کے چہرے سے کچھ خوف بھی ظاہر ہو رہا تھا۔

صبیحہ بولی۔ ''پولیس کو معلوم ہو گیا ہے کہ فیصل کو میں نے قتل کروایا تھا۔''

''کیوں؟ کیوں؟'' حشمت اللہ خاں کی بوکھلاہٹ میں اضافہ ہوا۔

''اس لیے کہ اس شادی کے لیے مجھے آپ نے مجبور کیا تھا۔ شادی تو میں کرنا ہی نہیں چاہتی تھی۔'' صبیحہ نے جواب دیا۔ ''اس کے علاوہ کچھ اور باتیں بھی ہیں جن کی وجہ سے پولیس مجھے گرفتار کرنا چاہتی ہے۔ وہ سب کچھ بھی میرے ضدی مزاج کی وجہ سے ہوا ہے۔''

جعفری اور باقی دونوں پولیس والے خاموشی سے ان تینوں کی طرف دیکھ رہے تھے۔

''اور۔'' صبیحہ نے اپنی بات جاری رکھی۔ ''میرے اس ضدی مزاج کا ذمے دار کون ہے ڈیڈی؟...... کیا آپ ہی دونوں نہیں ہیں؟ میں خود ہی اپنا نفسیاتی تجزیہ کر چکی ہوں۔ یہ میری سوتیلی والدہ میرے ساتھ زیادتیاں کرتی رہیں اور آپ نے خاموشی سے وہ سب کچھ گوارا کر لیا۔ اسی لیے مجھے مردوں سے اتنی نفرت بھی ہو گئی کہ میں کسی سے شادی کرنے کے لیے تیار نہیں تھی۔ میری نفرت مرد ذات سے ہے اور اس میں آپ بھی شامل ہیں لہٰذا......'' وہ ذرا سا رکی، پھر بڑے وحشیانہ انداز میں بولی۔ ''میرا نشانہ بہت اچھا نہیں ہے اس لیے میں نے آپ دونوں کو اپنے قریب بلایا ہے۔''

پھر اس نے ریوالور اپنی کنپٹی سے ہٹایا۔ اس سے پہلے کہ جعفری یا کوئی بھی کچھ سمجھ سکتا، ریوالور سے پے در پے پانچ فائر ہوئے۔ ان میں سے دو گولیاں حشمت اللہ خاں کے سینے پر اور ایک گولی رابعہ حشمت کی کنپٹی پر لگی۔ دو گولیوں کا نشانہ خطا گیا تھا۔

وہ دونوں فرش پر گرے اور بے حس و حرکت ہو گئے۔

''ابھی میرے ریوالور میں ایک گولی اور باقی ہے انسپکٹر!'' صبیحہ نے لرزتے ہونٹوں اور کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ ''لیکن میں خود کو ہلاک نہیں کروں گی۔ میں نے جو وعدہ کیا تھا، وہ میں پورا کروں گی۔ مجھے اب اپنی زندگی سے کوئی دلچسپی نہیں لیکن میں اس لیے زندہ رہنا چاہتی ہوں کہ عدالت میں ایک بیان دے سکوں۔ ایک ایسا بیان جس سے مردوں کو شاید یہ نصیحت مل جائے کہ دوسری شادی اسی صورت میں کرنا چاہیے جب اولاد کو سوتیلی ماں کی زیادتیوں سے بچانے کی ہمت ہو، ورنہ مجھ جیسی صبیحہ کوئی اور بھی پیدا ہو سکتی ہے۔''

جعفری اور اس کے ساتھی ایسے نظر آرہے تھے جیسے انہیں سکتہ ہو گیا ہو۔

''اب بے شک مجھے گرفتار کیا جا سکتا ہے۔'' صبیحہ نے کہا اور ریوالور جعفری کے قدموں میں پھینک دیا۔

☆☆☆

رات کی خبروں میں ہر ٹی وی چینل کی ٹاپ اسٹوری صبیحہ ہی کے بارے میں تھی۔ عماد اور فرح بھی وہ خبر سن رہے تھے لیکن اس سے پہلے انہیں دن ہی میں جعفری سے فون پر سب کچھ معلوم ہو چکا تھا۔

خبر ختم ہوتے ہی فرح سسکتی ہوئی عماد سے لپٹ گئی۔

''شکر ہے کہ تم میرے لیے ہو، اب بھی میرے لیے ہو اور ہمیشہ میرے رہو گے۔''

وہ جعفری سے حالات معلوم ہونے کے بعد عماد سے لپٹ کر کئی مرتبہ رو چکی تھی لیکن اس دن اس کے آنسو خوشی کے آنسو تھے۔

اور عماد دن میں کئی مرتبہ کہہ چکا تھا کہ صبیحہ نے آخر وقت میں جو کچھ کیا، ٹھیک ہی کیا۔ وہ جیسی بھی ہو گئی تھی، اس کی ذمے داری حشمت اللہ خاں اور رابعہ حشمت ہی کی تھی۔

اسی دن فون پر عماد کو شوجی سے یہ بھی معلوم ہو چکا تھا کہ صبیحہ کے ساتھ ہونے والی زیادتیوں پر حشمت اللہ خاں کی خاموشی کا سبب یہ تھا کہ اس کی دولت مندی رابعہ حشمت ہی کی وجہ سے تھی۔ اس شادی کی وجہ سے رابعہ حشمت کے مرحوم باپ کا بہت بڑا کاروبار حشمت اللہ خاں کے ہاتھ میں آیا تھا کہ اس سارے کاروبار کی درپردہ مالک وہی رہی تھی۔

عماد اور فرح اس دن بھی عدالت میں تھے جب صبیحہ اپنا وہ بیان دے رہی تھی جس کا ذکر اس نے جعفری سے کیا تھا۔

عماد نے اس دن بھی صبیحہ سے ہمدردی محسوس کی پھر جس روز عدالت نے صبیحہ کو سزا سنائی، وہ سزا سن کر بھی صبیحہ کا چہرہ بالکل پُرسکون تھا...... اس نے آخری خواہش یہ ظاہر کی تھی کہ وہ ذرا دیر کے لیے کارلوس کے مدفن پر جانا چاہتی تھی۔

بس وہی ایک مرد تھا جس سے صبیحہ کو نفرت نہیں تھی۔